حسین کمپوزنگ، نادر و نایاب قدیم و
تصویروں کے ساتھ پہلی بار شائع شدہ جدید اید

اُردو زبان میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جامع ترین کتاب

سِیرۃُ النّبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
علامہ سید سُلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

(حصّہ چہارم)

اردو کتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

(تصحیح شدہ، جدید ایڈیشن)

اُردو زبان میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جامع ترین کتاب

سِیرۃُ النّبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد سوم

خوبصورت کمپوزنگ _ اعلیٰ کاغذ و طباعت
اور نادر و نایاب قدیم و جدید رنگین تصویروں اور نقشوں
کے ساتھ پہلی بار ... تصحیح شدہ، جدید ایڈیشن

اُردو زبان میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر جامع ترین کتاب

سِیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

جلد سوم

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

• ——— دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور
فون [illegible] فیکس [illegible]

• ——— ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان
فون [illegible]

• ——— موہن روڈ
چوک اردو بازار، کراچی فون [illegible]

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ
©
کمپوزنگ۔ ڈیزائننگ۔ تصاویر
اورنقشوں کے جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں۔
کوئی حصہ یا تصویر بلا اجازت استعمال نہیں کی جاسکتی۔

سیرۃ النبی ﷺ

(تصحیح شدہ جدید ایڈیشن)

اشاعت اول: جمادی الثانی ۱۴۲۳ھ ستمبر ۲۰۰۲ء

باہتمام : اشرف برادران سلمہم الرحمٰن

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴- دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور فون ۷۳۲۴۴۱۲ فیکس ۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲+
۱۹۰- انارکلی، لاہور- پاکستان.........فون ۷۲۴۳۹۹۱-۷۳۵۳۲۵۵
موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی- پاکستان......فون ۲۷۲۲۴۰۱

ملنے کے پتے
ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴
مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر ۱۴
ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، چوک لسبیلہ، کراچی
دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر ۱
بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر ۱
بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

فہرست مضامین

سیرت النبی ﷺ (حصہ چہارم)

مضمون	صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
مقدمہ، منصب نبوت	۲۱	وہبی استعداد	۴۷
آپ ﷺ کے پیغمبرانہ کارنامے	۲۱	غیبی علم	۴۹
نبی اور مصلح اور حکیم	۲۲	علم انسانی کے ماخذ	۴۹
نبوت کی حقیقت اور خصوصیات	۲۲	ذرائع علم کے حصول کے زمانے اوران کے مراتب	۵۱
نبوت ورسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ	۲۴	غیر مادی علم	۵۲
تفصیلی ثبوت کے تین طریقے	۲۴	علم غیب	۵۶
پہلا طریقہ	۲۴	غیب کی حقیقت	۵۷
دوسرا طریقہ	۲۵	وحی اور ملکۂ نبوت	۶۰
تیسرا طریقہ	۲۵	کتاب اور سنت	۶۱
نبی کی ضرورت	۲۷	وحی متلو اور وحی غیر متلو	۶۲
نبی کی عصمت	۲۷	احادیث قرآن کا بیان ہیں	۶۴
نبی کی محبوبیت	۲۸	الہام واجتہاد وحکمت	۶۴
مصلحین	۲۸	اجتہادِ نبوت	۶۵
مصلحین کی اقسام	۲۸	علوم نبوی کی اقسام	۶۷
نبی کی دو بعثتیں	۲۹	عصمت اور بے گناہی	۷۰
بعثت کے لئے کسی قوم کا انتخاب	۳۰	بعض شبہات کا ازالہ	۷۶
بعثت کا زمانہ	۳۰	نکتہ	۷۸
نبی کی یقینی کامیابی	۳۱	نبی کی بشریت	۸۱
ایک شبہ اور اس کا جواب	۳۸	اجتہاد نبوی میں خطا	۸۷
نبی اور غیر نبی کے امتیازات	۴۱	اس خطا کے معنی	۸۸
نبوت کے لوازم اور خصوصیات	۴۶	پانچ اجتہادی علوم پر تنبیہ الٰہی	۸۹

مضمون	صفحہ نمبر
پہلا واقعہ	۸۹
دوسرا واقعہ	۹۰
تیسرا واقعہ	۹۳
چوتھا واقعہ	۹۳
پانچواں واقعہ	۹۴
ایک غلط استدلال	۹۶
عقل بشری	۹۷
ملکہ نبوت یا عقل نبوت کا شرعی ثبوت	۹۹
حکمت	۱۰۰
کتاب و حکمت کی تعلیم	۱۰۹
علم	۱۱۰
علم و حکم	۱۱۲
شرح صدر	۱۱۴
تبیین کتاب	۱۱۸
ارأت	۱۱۹
رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے	۱۲۱
تزکیہ	۱۲۲
نور	۱۲۲
آیات و ملکوت کی روایت	۱۲۳
سماع غیب	۱۲۴
تبلیغ و دعوت	۱۲۴
ایک شبہ کا ازالہ	۱۲۶
انبیاء کی تعلیم کا امتیازی نتیجہ	۱۲۹
نبوت کی غرض و غایت	۱۳۰
تائید و نصرت	۱۳۲

مضمون	صفحہ نمبر
خاتمہ	۱۳۳
شبِ ظلمت	۱۳۵
پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت	۱۳۵
مجوسِ فارس	۱۳۶
عیسائی روم	۱۳۹
ہندوستان	۱۴۵
یہود	۱۴۷
ظہور اسلام کے وقت عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت	۱۵۵
خدا کا اعتقاد	۱۵۵
ملائکہ کی الوہیت	۱۵۶
جنات کی الوہیت	۱۵۷
بت پرستی	۱۵۸
جن و شیاطن اور بھوت پریت	۱۶۳
کہانت	۱۶۴
اوہام پرستی	۱۶۷
جنگ جوئی	۱۶۷
شراب خوری	۱۶۸
قمار بازی	۱۷۷
سود خوری	۱۷۸
لوٹ مار	۱۷۹
چوری	۱۸۰
سفاکی و بے رحمی و وحشت	۱۸۲
زنا اور فواحش	۱۸۲

مضمون	صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
بے شرمی و بے حیائی	۱۸۳	قبائل کی خانہ جنگیاں	۲۰۳
عورتوں پر ظلم	۱۸۴	سیاسی مشکلات	۲۰۶
وحشت و جہالت	۱۸۶	ذریعۂ معاش	۲۰۸
عربوں کی خصوصیات اور خیر الامم بننے کی اہلیت	۱۸۷	رفع شک	۲۱۰
صحتِ نسب	۱۸۷	تبلیغ نبویؐ اور اس کے اصول اور اس کی کامیابی کے اسباب	۲۱۲
کسی پہلے مذہب میں داخل نہ تھے	۱۸۸		
محکوم نہ تھے	۱۸۹	فریضۂ تبلیغ	۲۱۲
کتابی فاسد تعلیم سے ناآشنا تھے	۱۸۹	تبلیغ کی اہمیت	۲۱۳
وہ زمین کے وسط میں آباد تھے	۱۸۹	اس کی وسعت	۲۱۳
بعض اخلاقی خوبیاں	۱۸۹	تبلیغ کے اُصول	۲۱۵
شجاع و بہادر تھے	۱۹۰	قول لین	۲۱۶
پرجوش تھے	۱۹۰	اعراض اور قول بلیغ	۲۱۷
حق گو تھے	۱۹۰	تیسیر و تبشیر	۲۱۷
عقل و دانش والے تھے	۱۹۰	تدریج	۲۱۷
ذہن اور حافظہ کے تیز تھے	۱۹۰	تالیف قلب	۲۱۸
فیاض تھے	۱۹۱	دعوتِ عقل	۲۱۸
مساوات پسند تھے	۱۹۱	مذہب میں زبردستی نہیں	۲۲۰
عملی تھے	۱۹۱	میدانِ جنگ میں تبلیغ	۲۲۲
ان اوصاف کی مصلحت	۱۹۲	مسلح تبلیغی جماعتیں	۲۲۵
صبح سعادت	۱۹۳	تبلیغ و دعوت کی تنظیم	۲۲۶
ایک قوم کا انتخاب	۱۹۳	مبلغوں کی تعلیم و تربیت	۲۲۷
اصلاح و ہدایت کی مشکلات	۱۹۴	دعوت بالقرآن	۲۲۷
جہالت	۱۹۴	اشاعت اسلام کی قدرتی ترتیب	۲۲۷
آبائی دین و راہ و رسم کی پابندی	۱۹۸	قبول اسلام کے لئے کیا چیز درکار تھی؟	۲۲۸
توہم پرستی	۲۰۱	اشاعتِ اسلام کے اسباب و ذرائع	۲۳۰

مضمون	صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
ایک ضروری نکتہ	۲۳۵	توحید اور اس کے ایجابی اصول وارکان	۲۷۷
موانع کا ازالہ	۲۳۵	اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل	۲۷۷
اسلام یا محمد رسول ﷺ کا پیغمبرانہ کام	۲۴۱	توحید پر عقلی دلیلیں	۲۸۴
تعلیماتِ نبوی کی ہمہ گیری	۲۴۳	توحید کی تکمیل	۲۸۶
اسلام کے چار حصے	۲۴۳	خدا کی حقیقی عظمت	۲۸۶
عقائد	۲۴۵	انسان کا مرتبہ	۲۸۸
عقائد کی حقیقت اور اہمیت	۲۴۵	خدا کا جامع اور مانع تخیل	۲۹۱
اللہ تعالیٰ پر ایمان	۲۵۱	اسماء وصفات	۲۹۳
اصلاح عقائد	۲۵۱	صفاتِ جمالی	۳۰۲
تعدّدِ خدا کا ابطال	۲۵۲	صفاتِ جلالی	۳۰۴
بزرگوں کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا	۲۵۳	نکتہ	۳۰۴
درمیانی واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد	۲۵۵	صفاتِ کمالی	۳۰۵
خوارق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں	۲۵۶	صفاتِ وحدانیت	۳۰۵
حرام وحلال کرنا خدا کا کام ہے	۲۵۷	صفاتِ وجودی	۳۰۵
غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم	۲۵۸	علم	۳۰۶
صفاتِ الٰہی کی توحید	۲۵۹	قدرت	۳۰۶
مخفی قوتوں کا ابطال	۲۶۰	نکتہ	۳۰۷
اوہام وخرافات کا ابطال	۲۶۲	تنزیہہ	۳۰۸
کفارہ اور شفاعت کے معنی کی تردید	۲۶۴	ان تعلیمات کا اثر اخلاقِ انسانی پر	۳۰۸
اجرام سماوی کی قدرت کا انکار	۲۶۹	خدا کا ڈر اور پیار	۳۱۴
غیر خدا کی قسم سے روکنا	۲۷۰	محبت کے ساتھ خوف وخشیت کی تعلیم	۳۱۴
خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں	۲۷۱	محبت کے جسمانی اصطلاحات کی ممانعت	۳۱۷
مشتبہات شرک کی ممانعت	۲۷۲	تعلیماتِ اسلامی میں محبت الٰہی کے مظاہر	۳۱۹
قبر پرستی اور یادگار پرستی سے روکنا	۲۷۳	**فرشتوں پر ایمان**	۳۳۱
ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہے	۲۷۳	ملائکہ کے معنی	۳۳۱

مضمون	صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
ملائکہ کا تخیل مذاہب قدیمہ میں	۳۳۱	انبیاء کی باہمی ترجیح کا مسئلہ	۳۵۲
ملائکہ کا تخیل فلسفہ میں		کتبِ الٰہی پر ایمان	۳۵۳
یونانی مصری فلسفہ میں		کتابِ الٰہی پر ایمان لانے کا مقصد	
قدیم یونانی فلسفہ میں		اس عقیدہ کا تکمیلی پہلو	
صائبیوں میں ملائکہ کا تخیل	تا	تمام کتبِ الٰہی پر ایمان لانا ضروری ہے	تا
اسلام میں فرشتوں کی حقیقت		انبیاءِ قدیم کے غیر معلوم الاسم صحائف	
اس عقیدہ کی عقلی حیثیت		چار معلوم الاسم آسمانی صحائف	
آیات واحادیث میں ملائکہ کا ذکر		اس عقیدہ کا اثر سیاسیات عالم پر	
ملائکہ کے فرائض		اقوامِ عالم کی قانونی تقسیم اور ان کے حقوق	۳۵۵
فلسفہ و مذاہب کی ملائکہ کے متعلق بے اعتدالی		مسلمان	۳۵۶
فرشتوں پر ایمان لانے کا مقصد	۳۴۳	اہل کتاب	۳۵۶
رسولوں پر ایمان	۳۴۴	شبہ اہل کتاب	۳۵۶
ایک عام غلط فہمی کا ازالہ		کفار اور مشرکین	۳۵۶
نبوت کسی ملک یا قوم سے مخصوص نہیں		وحدۃ الادیان	۳۵۷
تمام دنیا میں پیغمبر آئے		تمام سچے مذاہب ایک ہیں	
تمام پیغمبروں کی صداقت کا اعتراف		دین اور شرعۃ، منسک منہاج کا فرق	
پیغمبروں میں تفریق کی ممانعت		صحیفے وقتاً فوقتاً کیوں نازل ہوئے؟	
پیغمبروں کی غیر محدود تعداد	تا	وحدتِ دین پر قرآن کی شہادت	
مختلف فیہ پیغمبروں کی رسالت کا اقرار		وحدتِ دین کی دعوتِ عامہ	
پیغمبری کی واضح حقیقت کا اظہار		دین قیم، اسلام اور مذہب قدیمہ کا اتحاد	تا
پیغمبروں کا منصب اور فرائض		دین ہمیشہ ایک رہا	
پیغمبروں کی عصمت		شرعہ اور منہاج میں تبدیلی ہوئی، اس کی مثالیں	
قرآن میں پیغمبروں کا جامع تذکرہ		تبدیل قبلہ	
وہ انبیاء جن کا تذکرہ قرآن میں نہیں ہے		خانہ کعبہ کے حج کی تعیین	
ایسے انبیاء کی شناخت کا اصول	۳۵۲	یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنی کتابوں پر عمل کرنے کی ہدایت	

مضمون	صفحہ نمبر
مسلمانوں کو شریعت اسلام پر عمل کرنے کا حکم	
صحیفہ محمدی نے اگلی کتابوں کی تصدیق کی	
اہل کتاب نے اپنی کتابوں کو چھوڑ کر اہل اہوا کی پیروی کی	
حدود میں شریعتوں کا اختلاف غیر اہم ہے	
یہود و نصاریٰ فروعی اختلاف پر ایک دوسرے کو برسر باطل کہتے تھے	
وہ مسلمانوں کو یہودیت و نصرانیت کی دعوت دیتے تھے	
اسلام کی دعوت اصل دین ابراہیمی کی جانب	
اسلام کا تمام اہل مذاہب کو یکساں خطاب	
قبول عمل کے لئے ایمان شرط ہے	تا
ایمان و عمل کے لئے نبی کی تصدیق ضروری ہے	
اسلام کامل تمام رسولوں کی تصدیق ہے	
یہود و نصاریٰ انبیاء کی تکذیب کرتے رہے اس لئے اصل اسلام سے ہٹ گئے	
یہود و نصاریٰ کا ''حسن عمل''	
اسلام کا اصل الاصول، توحید کامل اور رسالت عمومی	
اسلام کا ہدایت تامہ ہونا	
توحید کامل کے بغیر نجات کلی کا کوئی مستحق نہیں	
نبوتِ محمدی کا دعویٰ	
دعوتِ محمدی میں ہدایت کی بشارت	
اہل مذاہب اور تمام انسانوں کو دعوتِ محمدی کیوں پیش کی گئی	
تکمیل دین	۳۶۹

مضمون	صفحہ نمبر
قرآن کے سوا کسی صحیفہ نے دین الٰہی کی تکمیل کا دعویٰ نہیں کیا	۳۶۹
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بشارت ایک آنے والے نبی کے لئے	
موعود الامم ﷺ کی آمد اور اس کا دعویٰ	تا
وحی الٰہی کی جانب سے تکمیل دین کا اعلان	
تکمیل دین کے اثرات مظاہر	
قرآن کا مہیمن ہونا	۳۷۰
قرآن کا تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہونا	
قرآن محفوظ ہے اور رہے گا	
اگلی کتابیں تحریفات و تصرفات سے بری نہیں	
قدیم مذاہب دائمی نہ تھے اس لئے دائمی حفاظت کا وعدہ نہ تھا	تا
قرآن کی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر	
قرآن کے لفظ و عبارت و معنی کی حفاظت کے لئے وعدۂ الٰہی	
قرآن کا غالب ہونا	
ختم نبوت	۳۷۱
وحدتِ ادیان اور دین اسلام	۳۷۱
تمام مذاہب سابقہ کا اصل دین	"
صحیفہ محمدی نے اہل کتاب کو وحدتِ دین کی دعوت دی	۳۷۲
وحدتِ دین کی حقیقت صحیفہ محمدی میں	۳۷۳
پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان	۳۷۴
یہ اسلام کے سلسلہ ایمانیات کی آخری کڑی ہے	۳۷۴

مضمون	صفحہ نمبر
آخرت کے لفظی معنی اور مفہوم	
آخرت سے مراد عالم بعد الموت ہے	
قرآن میں ایمان باللہ کے بعد سب سے زیادہ زور ایمان آخرت پر ہے	تا
آئندہ زندگی کے دو دور یعنی برزخ و بعثت	
توراۃ وانجیل میں برزخ و بعثت کی تفصیل نہیں	
اسلام میں تین دور ہائے حیات دنیا، برزخ اور قیامت، ان تینوں دوروں میں فرق	
(۱) برزخ	۳۷۷
قرآن مجید میں لفظ برزخ اور اس کے معنی	"
قبر، برزخ کا عرف عام ہے	"
موت و حیات کی منزلیں	۳۷۷
قرآن میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر	۳۷۸
دونوں موتوں اور حیاتوں کی تشریح	"
عالم برزخ کی کیفیت	"
نیند اور موت کی مشابہت	۳۷۸
نیند اور موت کا فرق	
قرآن میں موت کی تشبیہ نیند سے	تا
برزخ کی زندگی کی تعبیر نیند سے	
قرآن میں دوسری زندگی کے لئے بعثت کا لفظ	
خواب میں لذت والم	۳۸۰
خواب کی خیالی دنیا کا جسم پر اثر انداز ہونا	
عالم خواب کی لذت والم کا خاتمہ عالم خواب میں	تا
عالم خواب کے لذائذ و آلام کے فلسفیانہ اسباب و علل	

مضمون	صفحہ نمبر
بھولے ہوئے احساسات و معلومات کا خواب میں متشکل ہو کر نظر آنا	
اچھے اور برے اعمال کے نقوش ذہن انسانی کے گوشوں میں	
تمثیلی خواب اور اس کی مثالیں	
جسم انسانی میں مختلف مادوں کی کمی بیشی سے خواب میں ان کے متناسب مجسم شکلیں اور اس کی مثالیں	تا
اعمال انسانی کا خواب میں اپنے متناسب قالب میں مجسم ہونا اور ان کی مثالیں	
اعمال کی تمثیلات قرآن مجید میں	
اعمال کی تمثیلات احادیث میں	
گناہوں کی تمثیلی سزائیں	۳۸۳
آنحضرت ﷺ کے ایک رویائے صادقہ میں مختلف گناہوں کی مختلف تمثیلی سزاؤں کے مناظر	
ان تمثیلات کی تعبیر و تشریح	
علم النفس سے انسان کی لاعلمی	
تصوری یقین اور خارجی وجود کا باہمی تعلق	
قرآن میں یقین کی دو قسمیں	تا
علم الیقین اور عین الیقین	
علم الیقین کے حصول کا ذریعہ ایمان ہے	
علم الیقین کے ذریعہ دوزخ کا مشاہدہ دنیا میں	
موت کے بعد حجاب مادیت کا اٹھنا اور اعمال کے تمثیلی نتائج کو کسی حد تک دیکھنا	
قیام روز جزا پر تمام رازہائے سربستہ کا فاش ہو جانا	
احوال برزخ کا عین الیقین	۳۸۷

مضمون	صفحہ نمبر
موت کے بعد عالم برزخ کی ابتداء	۳۸۷
عالم برزخ میں جزا اور سزا کے پس پردہ مشاہدہ کی شہادتیں قرآن مجید میں	"
موت کے بعد خدا کی طرف روح کی بازگشت	۳۸۸
موت کے بعد قرآن مجید میں خدا کی طرف بازگشت کی اصطلاح اور اُس کا مفہوم	۳۸۹
اس وقت کا سماں	۳۹۰
موت کے سماں کا خاکہ قرآن مجید میں	"
جسم سے روح کی علیحدگی کے بعد سزا کا دور	"
سزا قانون عمل کے مطابق انسانی اعمال کا نتیجہ ہے	"
نیکوکاروں کو بشارتیں	"
برزخ کا عذاب وراحت	۳۹۱
برزخ میں عذاب وثواب کے مناظر	
برزخ اور اس کے عذاب وثواب کا تذکرہ قرآن مجید میں	
قبر کی اصطلاح	
احادیث میں برزخ کا اصطلاحی نام قبر ہے	
قبر کا مفہوم	
قبر ارواح ونفوس کی دنیا ہے	تا
قبر کی روحیں جسم خاکی کے بجائے جسم مثالی میں متشکل ہوتی ہیں	
جسم خاکی کی طرح جسم مثالی میں بھی لذت والم کا احساس ہوتا ہے	
بعض سعید روحیں جسم خاکی کی شکل کی قید سے آزاد کردی جاتی ہیں	

مضمون	صفحہ نمبر
مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات	۳۹۶
سوال وجواب	۳۹۶
قبر میں فرشتوں کا توحید ورسالت کے متعلق سوال	
قبر کے سوال وجواب کا ذکر قرآن مجید میں	تا
سوال وجواب کا اصل مفہوم	
برزخ میں ارواح کا مسکن	
(۲) آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل	۴۰۰
قیامت اور جزائے اعمال	۴۰۰
کیا کبھی دنیائے حیات پر بھی موت طاری ہوگی	
نظام کائنات کی بربادی کی پیشین گوئی	
اہل سائنس کی طرف سے	تا
قیامت کا عقیدہ مختلف آسمانی کتابوں میں	
قیامت	
قیامت کے نام قرآن میں	۴۰۱
قیامت کے اوصاف	
قیامت میں فساد نظام ہوگا اس کی شہادتیں قرآن مجید سے	تا
بعد قیامت ایک نئے آسمان اور نئی زمین کی تعمیر	
پچھلی دنیا کے نتائج پر اس کی بنا	
قیامت کی حقیقت	۴۰۵
صور قیامت	۴۰۶
عربوں کا انکار قیامت سے، اسی لئے اسلام میں توحید کے بعد سب سے زیادہ زور قیامت کے عقیدہ پر دیا گیا	۴۰۸
عقیدہ قیامت اصول دین کیوں ہے؟	۴۰۹

مضمون	صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
قیامت پر قرآنی دلائل	۴۱۰	اصولِ فطرت صرف مادیات تک محدود نہیں	۴۲۴
حشر جسمانی	۴۱۵	اعمال کے لوازم ونتائج، اصولِ جزا	۴۲۵
روحانی زندگی کا تصور نئی جسمانی زندگی سے زیادہ دشوار ہے		عقاب وثواب ردِ عمل ہے	۴۲۵
		حصولِ راحت کا اصول	۴۲۶
حشر جسمانی ہوگا		نامۂ عمل	۴۲۸
جسم وجسد	تا	کوئی چیز پیدا ہونے کے بعد فنا نہیں ہوتی	
کیا کوئی نیا جسمانی پیکر ہوگا		اعمال کے ریکارڈ ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں	تا
نیا جسمانی پیکر جسم خاکی کے خصوصیات ولوازم سے الگ ہوگا		قرآن مجید میں اس اصول کی تشریح اوراس پر شہادتیں	
’’خلق جدید‘‘	۴۱۶	اعضاء کی شہادت	۴۳۰
ذمہ داری روح پر ہے	۴۱۷	میزان	۴۳۱
دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے	۴۱۸	حساب	۴۳۲
اُخروی جسم کیسا ہوگا؟	۴۱۹	جنت ودوزخ	۴۳۲
جزا اور سزا	۴۲۰	جنت انسان کی وراثت ہے	۴۳۲
جزا اور سزا دیگر مذاہب میں	۴۲۰	حضرت آدم علیہ السلام کا زمین پر آنا ان کی پیدائش سے پہلے مقدر ہو چکا تھا	"
عالم آخر کا فہم وادراک	۴۲۳		
عالم آخر کو مادی دنیا کی زبان محاورات میں سمجھایا گیا ہے	"	آدمؑ اور بنو آدم کی اصلی جگہ جنت ہے	۴۳۳
اس طرز افہام سے فلسفی وعامی دونوں تشفی پاتے ہیں	"	جنت کے دو درخت، نیک وبد کی پہچان کا، اور زندگی جاوید کا	
اُخروی وقائع کے سمجھانے کیلئے مادی الفاظ کا استعمال	"	آدمؑ کو نیک وبد کی شناخت کے درخت سے روکا گیا	تا
مادی دنیا کے قوانین فطرت	"	شیطان نے حیاتِ جاوداں کا درخت کہہ کر نیک وبد کی شناخت کے درخت کو بتا دیا	
وجود کے موجودہ قوانین فطرت اوران کے خصوصیات ولوازم	"	حیاتِ جاوداں سے مقصود کیا ہے؟	۴۳۴
علت ومعلول اسی مادی عالم کے ہیں	"	نیک وبد کی تمیز ہی شرعی تکلیف کا باعث ہے	تا
ضروری نہیں کہ موجودہ قوانین فطرت وہاں کارفرما ہوں	۴۲۴	آدمؑ کو نیک وبد کی تمیز کا فطری الہام	

مضمون	صفحہ نمبر
انسان کا تکلیف شرعی کی امانت کو قبول کرنا اور حیاتِ جاوداں کا حصول سعی وعمل پر موقوف ہونا	۴۳۵
زمین پر بنو آدمؑ کی چار چیزوں کھانے پینے پہننے اور اوڑھنے کی ضروریات کا پیدا ہونا	تا
مذہب نے ان ضروریات اربعہ کے جائز طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے احتراز کی تلقین کی	
جنت کی وراثت کا وعدۂ الٰہی	۴۳۶
انسانی جزا وسزا کے تین گھر	۴۳۶
انسان کا پہلا دار الخیر	۴۳۶
مگر یہ دار الجزاء فانی ہے	۴۳۹
یہ دار الجزا دار الاصلاح بھی ہے	۴۴۰
انسان کی تنبیہ واصلاح کے مراتب	''
نیکی سے برائی کا کفارہ	''
توبہ کفارہ ہے	۴۴۱
مصائب کی تنبیہ اور کفارہ	۴۴۳
عذابِ الٰہی کا مقصد	۴۴۴
عذاب برزخ بھی کفارہ ہے	۴۴۵
عذابِ دوزخ کفارہ گناہ ہے	۴۴۷
عذاب، انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے	۴۴۸
انسان کی تخلیق رحمت کے لئے ہے	۴۴۹

دوزخ

مضمون	صفحہ نمبر
دوزخ قید خانہ نہیں شفا خانہ ہے	۴۵۰
گناہ روحانی بیماری کا اور عذاب اس کے نتیجۂ بد کا اصطلاحی نام ہے	۴۵۱
دوزخ کی مثال شفا خانہ ہے	تا
دوزخ سے بالآخر نجات ہوگی	۴۵۲
گویا دوزخ بھی ایک نعمت ہے	
دوزخ میں رحمت الٰہی کا ظہور اور نجات	
اس کی تصریحات احادیث میں	
شرک وکفر کی بخشائش نہیں	
کیا دوزخ کی انتہا ہے؟	
دوزخ رحمتِ الٰہی کی چھینٹوں سے بالآخر سرد ہو جائے گی	
اللہ کے غضب پر رحمت کی سبقت	
دوزخ کی انتہا قرآن مجید میں مشیت پر ہے	تا
کفار ومشرکین کے عذاب کی انتہا مشیتِ الٰہی پر موقوف ہے	
قرآن مجید کی کوئی آیت دوزخ کے تسلسل وجود پر دلالت نہیں کرتی	
قرآن مجید میں بہشت کے عدم انقطاع کی تصریح کی گئی	
قرآن مجید سے اس کی تشریح	
اس کی شہادت حدیثوں میں	
دفع شبہ	۴۶۰
قرآن مجید کی بعض آیتوں سے دوزخ کے دوام کا شبہ	
اس شبہ کا ازالہ	
چند آیتوں میں کفار کے دوزخ سے الگ نہ ہونے کی تشریح	تا
ان آیات کا مفہوم	
اللہ تعالیٰ کے وعدہ ثواب وعذاب میں فرق	

مضمون	صفحہ نمبر
مشرکین وکفار کی معافی کی تصریح کیوں نہیں؟	
عقیدۂ کفار اور عقیدہ کرم اور عقیدۂ مغفرت	
عذاب طویل کا سبب	۴۶۳
جمہور کے نزدیک عذاب دوزخ کا دوام	۴۶۶
بہشت ودوزخ کی جزا وسزا بھی تمثیلی ہے	۴۶۸
تمثیلی سزا کے معنی اس کی مثالیں قرآن مجید اور احادیث سے	۴۶۹
دوزخ کی جسمانی سزائیں	۴۷۱
جسمانی سزاؤں کی تصریح قرآن مجید سے	"
دوزخ میں روحانی سزائیں ان کی تصریح قرآن مجید سے	۴۷۲
جنت	۴۷۴
جنت کے نام	۴۷۴
جنت کا دوام اس کی تصریح قرآن مجید میں	۴۷۴
دائمی قیام سے اہل جنت کا جنت میں گھبرانا ان کی جبلت وفطرت کے خلاف ہوگا	تا
جنت کے عیش ومسرت کی تعبیر آسمانی بادشاہی سے	
عیسوی پیغام میں آسمانی بادشاہی	
آسمانی بادشاہی کے اجمال کی تفصیل	
جنت کیلئے باغ کا استعارہ کیا عرب کے لئے ہے؟	
استعارہ میں ایک نکتہ	
سامانِ جنت کے دنیاوی نام	۴۸۰
جنت میں دنیاوی الفاظ کے معانی سے بلند تر حقائق اس کی شہادت قرآن مجید اور احادیث سے	"
جنت کی مسرتیں اعمال کی تمثیل ہیں اس کی شہادت قرآن مجید اور احادیث سے	۴۸۱
لطف ومسرت کا تصور	۴۸۵
لطف ومسرت کا اعلیٰ ترین تخیل	۴۸۶
جنت میں انسان کی ہر خواہش پوری ہوگی	۴۸۷
جنت جہاں کوئی جسمانی وروحانی آزار نہیں	۴۸۷
جنت جہاں رشک وحسد نہیں	۴۸۸
وہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی؟	۴۸۸
جنت ارتقائے روحانی ہے	۴۸۹
مسئلہ ارتقاء کے اصول بقائے اصلح کا عمل روحانی مدارج کے ارتقاء ہیں	۴۸۹
امن وسلامتی کا گھر	۴۹۱
مقام رحمت	۴۹۲
مقامِ نور	۴۹۲
مقامِ رضوان	۴۹۳
مقام طیب وطاہر	۴۹۴
مقام تسبیح وتہلیل	۴۹۵
مقام قرب	۴۹۶
دیدارِ الٰہی	۴۹۶
ان تعلیمات کا عملی اثر	۴۹۷
عرب کا ایمان ویقین اور صحابہؓ کی خشیت الٰہی	۴۹۹
قضاوقدر	۵۰۱
کیا عقیدہ قضاوقدر ایمانیات میں ہے؟	
عقیدہ قضاوقدر کا ماحصل	تا
اس عقیدہ کی تعلیم قدیم مذاہب میں	

مضمون	صفحہ نمبر	مضمون	صفحہ نمبر
خاتم النبیینؑ کی تعلیم نے اس کی کیا تکمیل کی اور کیا اثرات پیدا ہوئے		صحیفہ محمدی میں ان دونوں صداقتوں کی تفصیل اور ان کی تشریح	
اصلاح قضاوقدر کی تشریح		ہدایت وضلالت کے الفاظ سے پیدا شدہ غلط فہمی کا ازالہ	تا
اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت	تا	خیر شر کا مفہوم اسلام میں	
عقیدہ قضاوقدر کی توضیح		اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت دیتا کی تفسیر	
عقیدہ قضاوقدر کا نتیجہ پستی، سستی و دونِ ہمتی نہیں اس کا نتیجہ بلندی، استقلال اور صبر وثبات ہے		بندہ کی مشیت	
غلط فہمی کا ازالہ		اللہ کی گمراہی کن کے لئے ہے؟	
قضاوقدر اور سعی عمل کی باہمی تطبیق		نتیجہ بحث	۵۱۲
جبر وقدر	۵۰۶	ایمان کے نتائج	۵۱۳
پہلے فسق اور نافرمانی ہوتی ہے اس کے نتیجہ میں خدا کی طرف سے ضلالت کا ظہور ہوتا ہے		ایمان کا مقصد دل کی اصلاح ہے	
		ایمان میں ایمان وعمل کی جامعیت	
جبر وقدر کا لاینحل مسئلہ		درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے	
قدیم مذاہب میں اس کے حل کی دو صورتیں	تا	اہل ایمان کی عملی شناخت	تا
یا تو خاموشی یا جبر کی تلقین		تمام نیکیاں صرف ایک جزاور ایمان کی شاخیں ہیں	
آنحضرت ﷺ نے اس راز کو ظاہر کیا		ایمان ملزوم اور اعمال اس کے لوازم ہیں	
بیک وقت دو صداقتیں		خاتمہ	۵۱۶

* * *

دیباچہ

طبع اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ﴾

اے باز کن درِ معانی برما بکلیدِ آسمانی
ہرچہ از تو گمان برم بچونی آن من بوم تواز آن برونی
شاہِ رسل و شفیع مرسل خورشید پسیں و نورِ اوّل
سلطانِ ممالک رسالت طغرائے صحیفۂ جلالت (خسرو)

پیش نظر کتاب سیرۃ النبی ﷺ کے سلسلہ کی چوتھی جلد ہے۔ اس کا موضوع ''منصب نبوت'' ہے۔ اس تقریب سے سب سے پہلے اس میں ایک مقدمہ ہے جس میں نبوت کی حقیقت اور اس کے لوازم وخصوصیات کی تشریح ہے۔ اس کے بعد دیباچہ ہے جس میں آنحضرت ﷺ کی ولادت اور ظہور اسلام کے وقت دنیا کی مذہبی واخلاقی حالت کا مرقع دکھایا گیا ہے بالخصوص آنحضرت ﷺ سے پہلے ملک عرب کی جو مذہبی واخلاقی حالت تھی اور اس کی اصلاح میں جو دقتیں درپیش تھیں شرح وبسط کے ساتھ ان کی تفصیل کی گئی ہے۔ اس کے بعد آپ کی تعلیمات وارشادات کی تفصیل سے اصل کتاب کا آغاز ہوا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو پیش گاہ باری سے جو شریعت کاملہ اور قانون ابدی عطا ہوا وہ درحقیقت چار عنوانوں پر منقسم ہے۔ ا۔ عقائد' ۲۔ عبادات' ۳۔ اخلاق اور ۴۔ معاملات۔ خیال تھا کہ عقائد وعبادات کی ایک جلد ہو اور اخلاق ومعاملات دوسری جلد میں ہوں مگر جوں جوں مسافر قلم اس دشوار گذار مرحلہ میں آگے بڑھتا گیا راستہ اس قدر وسیع اور مسافت اتنی ہی بعید نظر آنے لگی۔ ناچار اس جلد کو صرف عقائد کے بیان پر محدود رکھا گیا۔ دوسری جلد میں عبادات اور ان کی حقیقت اور فرائض چہارگانہ کے حقائق وفوائد سے بحث ہوگی اور تیسری جلد کا عنوان اخلاق ومعاملات ہوگا جس میں ہم انشاء اللہ بہ تفصیل بتائیں گے کہ تمدن ومعاشرت بالخصوص قوانین نکاح' طلاق' وراثت' حقوق نساء' غلامی' جہاد، اصول حکومت اور اقتصادیات وغیرہ کے متعلق تمام دنیا کے مذاہب کے کیا اصول اور تمام سلطنتوں اور قوموں کے کیا قوانین تھے؟ اور آج مغرب نے اس انتہائی تہذیب تک پہنچ کر کس حد تک ان امور میں ترقی کی ہے؟ پھر موازنہ کر کے ہم دکھائیں گے کہ شریعت اسلام کے مقابلہ میں مغرب کا معراج ترقی شریعت اسلام کا پایہ اولین ہے۔

حضرت الاستاذ مرحوم نے اس جلد کا کام شروع ہی کیا تھا اور مذکورۂ بالا مباحث میں سے صرف عرب جاہلیت کے مذہبی واخلاقی حالات کے پچیس تیس صفحے لکھنے پائے تھے کہ وفات پائی۔ یہ صفحے بھی ان اوراق میں شامل ہیں مگر چونکہ

ان میں بکثرت اضافہ اور ترمیم کی ضرورت پیش آئی ہے اس لئے ان صفحات کو ان کے اسم گرامی کی طرف منسوب کرنے میں احتیاط کرتا ہوں۔ بقیہ پوری کتاب کی ذمہ داری خاکسار ہی کے خطا کار قلم پر ہے۔

کوشش کی ہے کہ ان اوراق میں پیغمبر علیہ السلام کے پیغام و تعلیم کو پوری تشریح' استناد' استدلال اور دلچسپی کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ قرآن پاک کے استناد کو ہر موقع پر سب سے آگے رکھا گیا ہے اور اسی کے پرتو میں احادیث صحیحہ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے مناظرانہ پہلو سے بچ کر ہر پیش نظر مسئلہ میں اسلام کا دوسرے مذاہب سے اس غرض سے موازنہ کیا گیا ہے تا کہ اسلام کی تکمیلی شان نمایاں ہو جائے۔

ان اوراق کے لکھنے والے کے نزدیک نسخ شریعت کے معنی کسی حکم کو اس کے غلط یا غیر مفید ہونے کے سبب سے سرے سے مٹا کر کسی دوسرے حکم کو نافذ کرنے کے نہیں ہیں بلکہ محرف احکام کی جگہ پر اصل احکام کے دوبارہ نازل ہونے اور دنیا کے حسب حال ناقص کی جگہ کامل اور کامل کے بدلہ کامل تر تعلیمات دینے کے نہیں بلکہ ان کی تکمیل کرنے والے کے ہیں۔ مذاہب کی تاریخ جب سے شروع ہوتی ہے ہر مذہب اور اس کی کتاب انسانی عروج و ترقی کی ایک ایک منزل ہے اور اسلام اس عروج و ترقی کی وہ انتہائی منزل مقصود ہے جس کے بعد تکمیل دین کی سرحد ختم ہو جاتی ہے جیسا کہ خود اس کا دعویٰ ہے اور اس دعویٰ میں کوئی اور دین اس کا شریک نہیں ہے کہ ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ﴾

ان کی تکمیلی مباحث میں سے یہ جلد صرف عقائد پر مشتمل ہے اور کون نہیں جانتا کہ مذاہب میں اعتقادات کی حیثیت کتنی اہم اور ان کی بحث کتنی نازک ہے؟ اس لئے اس خارزار سے کسی آبلہ پا کا بسلامت گذر جانا کس قدر مشکل ہے تاہم میں نے جدوجہد اسی کی کی ہے کہ کسی آبلہ کو ٹھیس لگے بغیر اس راستہ کو طے کرلوں، چلنے والا تو تھک کر چور ہے۔ اب یہ دیکھنے والوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس نے رہروی کی یہ شرط کہاں تک پوری کی؟

ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ اسلامی فرقوں میں سے کسی فرقہ کے مطابق بھی اگر عقائد کی کتاب لکھی جاتی تو یہ منزل نہایت آسان تھی کہ ان میں سے ہر ایک کی مدوّن و مرتب کتابیں سامنے ہیں لیکن مجھے اس جلد میں کسی خاص فرقہ کے نہیں بلکہ اسلام کے وہ عقائد لکھنے تھے جن پر ایمان لانے کا قرآن نے ہم سے مطالبہ کیا ہے اور جن کی تعلیم محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو دی تھی۔ چنانچہ ان اوراق میں چند عقائد کی تشریح ہے اور یہ وہی ہیں جو ﴿اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی﴾ میں مذکور ہیں یعنی خدا' اس کے فرشتوں' اس کی کتابوں' اس کے رسولوں اور آخری دن اور قضا و قدر پر ایمان، چنانچہ اس جلد میں مقدمہ و دیباچہ کے بعد ان ہی چھ باتوں کی تفصیل و تشریح ہے۔

میں نے اپنے جانتے اس کی پوری احتیاط کی ہے کہ کسی مسئلہ کی تشریح میں قلم' صراط مستقیم سے تجاوز نہ کرے لیکن عالم الغیب جانتا ہے کہ قدم نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے، اس لئے اس کی بارگاہ میں نہایت عجز سے دعا ہے کہ خداوند میری لغزش کو دوسروں کی لغزش کا سبب نہ بنانا، اور ہم سب کو سیدھی راہ دکھانا۔

﴿مَنْ یَّھْدِ اللّٰہُ فَھُوَ الْمُھْتَدِیْ﴾ (اعراف۔۲۲)

جس کو خدا راہ دکھائے وہ راہ پایا ہوا ہے۔

﴿ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ﴾ (زمر)

اور جس کو خدا راہ دکھائے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ﴾ (بقرہ)

ہمارے پروردگار ہماری بھول چوک کی باز پرس ہم سے نہ فرمانا۔

این نامہ کہ خامہ کرد بنیاد   توقیع قبول روزیش باد

طالبِ رحمت
سلیمان ندوی
دارالمصنفین اعظم گڑھ
(۲۵ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ)

دیباچہ طبع ثانی

سیرت النبی ﷺ جلد چہارم

سیرت جلد چہارم کو جو اسلام کے اصول وعقائد پر ہے جس وقت پہلی دفعہ ناظرین کرام کے ہاتھوں میں دے رہا تھا، میرا دل اضطراب کے عالم میں تھا کہ ایسے مشکل اور پیچیدہ راستہ میں معلوم نہیں، میرا قلم کہاں کہاں بہکا اور قدم نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی؟ لیکن الحمدللہ والمنۃ کہ سوائے دوزخ کی ابدیت وغیر ابدیت کے ایک مسئلہ جس میں جمہور کی رائے ہمارے ساتھ نہ تھی، ہر مسئلہ میں اس کتاب کی تحریر کو قبولیت عام حاصل ہوئی، جن جن حوصلہ افزا طریقوں سے خواص علماء اور عام مسلمانوں نے اپنی تحسین وآفرین کی عزت بخشی، اس سے جی چاہتا تھا کہ یہ قیاس کروں کہ ملا اعلیٰ کی خوشنودی ورضا مندی بھی اس حقیر مؤلف کے شامل حال ہے۔

اس کتاب کی طبع ثانی چھوٹی تقطیع پر چھاپی جا رہی ہے۔ اس میں طبع اوّل کے مطبعی اغلاط کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ کہیں کہیں عبارت کی خوبی و شستگی کے لیے لفظی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں اور مسئلہ ابدیتِ نار میں جمہور کے خیال کی ترجمانی کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے تاکہ ناظرین کو اس کے دونوں پہلوؤں سے واقفیت ہو جائے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچائے تاکہ ناچیز مؤلف کو اپنی مغفرت کا وسیلہ ہاتھ آئے۔

کتاب کی طبع اوّل چونکہ بڑی تقطیع پر چھپی تھی اس لئے ۶۸۶ صفحوں کی ایک جلد رہنے دی گئی لیکن چھوٹی تقطیع پر اس کی ضخامت ۸۸۸ صفحوں تک پہنچ گئی ہے جس کا ایک جلد میں سمانا مشکل تھا، اس لئے گو صفحوں کا شمار مسلسل رکھا گیا ہے مگر صفحہ ۴۰۵ سے کتاب دو حصوں میں علیحدہ بھی کر دی گئی ہے تاکہ اگر کسی کا جی چاہے تو اس کو دو جلدوں میں کر لے تاکہ پڑھنے میں اور سفر میں ساتھ رکھنے میں آسانی ہو۔

جامع
سیّد سلیمان ندوی
۲۷/رجب ۱۳۵۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

منصب نبوت

کتاب کا موضوع‘ آپ کے پیغمبرانہ کارنامے:

سیرت کی عام کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے واقعاتِ زندگی کے اندر جو چیز سب سے زیادہ ممتاز ہو کر نظر آتی ہے وہ غزوات اور لڑائیاں ہیں لیکن یہ غزوات اور لڑائیاں ظاہر ہے کہ مقصود بالذات نہ تھیں بلکہ وہ سلسلہ دعوت میں اتفاقاً پیش آ گئیں۔ آنحضرت ﷺ نے عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو انہوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا اور نہ صرف انکار کیا بلکہ اس کے مٹانے کی پرزور کوشش کی، اس کے قبول کرنے والوں کو ستایا اور ان کو ان کے گھروں سے نکال دیا۔ وہ اپنی جان بچا کر دوسرے شہر کو چلے گئے، وہاں ان کی دعوت نے فروغ پایا، اور بہت بڑی تعداد نے ان کی سچائی کو قبول کیا۔ یہ دیکھ کر مخالفوں نے ہر طرف سے یورش کی، اور چاہا کہ اس جماعت کو بزور شمشیر مٹا دیں۔ اس نے اپنی جان کے بچاؤ کی تدبیریں کیں اور ان کی پرزور سازشوں اور کوششوں کے سیلاب کو پہاڑ بن کر روکا۔ اس کشمکش نے خونریز لڑائیوں کا ایک سلسلہ چھیڑ دیا جو مسلسل دس سال تک قائم رہا۔ رفتہ رفتہ اعجاز نبوت‘ حسن تدبیر لطف اخلاق سے تمام معرکے سر ہوئے اور پھر ایک پرامن نظام قائم ہو گیا۔ بے شبہ یہ کارنامہ بھی کچھ کم مستوجب منقبت نہیں لیکن ناظرین اس نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوں گے کہ ہم کس (ذات اقدس) کے سوانح لکھ رہے ہیں۔

یہ جو کچھ ہوا اور پیش آیا وہ گو نہایت عجیب، حیرت انگیز اور کرشمہ ربانی کا پورا مظہر ہے تاہم وہ در حقیقت آنحضرت ﷺ کا اصلی براہ راست اور مقصود بالذات کارنامہ نہیں، وہ اتفاقی حوادث ہیں، جو اسلام کی دعوت واشاعت کی راہ میں دشمنوں کی مخالفت سے پیش آ گئے۔ آپ کے اصلی پیغمبرانہ کارنامے وہ ہیں جو اگر یہ اتفاقی واقعات رونما نہ ہوئے ہوتے تب بھی ظاہر ہی ہوتے اور وہی آپ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ کے اصلی وقائع اور سوانح ہیں یعنی عرب میں سرتاپا روحانی واخلاقی انقلاب پیدا کر دینا‘ تمام عالم کے سامنے کامل ترین اور اخیر شریعت کو پیش کرنا، دنیا کے گوشہ گوشہ کو ترانہ توحید اور سرور ومحبت سے معمور کرنا‘ ظلمت کدہ عالم کو سراج منیر بن کر بقعہ نور بنا دینا‘ گمراہوں کو راستہ بتانا‘ بھولوں کو یاد دلانا‘ بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا‘ غلط اوہام کو مٹانا‘ اخلاقِ فاضلہ کا سکھانا‘ گناہوں کے دفتر کو دھونا‘ انسانوں کو شیطانوں کے دام فریب سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کرنا‘ دنیا کو رفق ومحبت، لطف وشفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دینا‘ حکمت ودانائی پند وموعظت اور تہذیب وتمدن کے رموز سکھانا، روحانیت کی برباد شدہ دنیا کی دوبارہ تعمیر اور قلوب وارواح کے ویران گھروں کی از سر نو آبادی‘ الغرض خاتم النبیین کا اصلی کام ایک شریعت ابدی کی تاسیس‘ مذاہب عالم کی اصلاح‘ فن اخلاق کی علمی وعملی تکمیل‘ قانون الٰہی کا اظہار وعرض اور تہذیب نفوس کی معراج اخیر تھی اور یہ سب اُسی پر آشوب زمانہ میں ہوتا رہا جس کے لیل ونہار بظاہر صرف حملوں کے تیر باراں کے روکنے میں صرف ہو گئے۔ پیش نظر جلد

آنحضرت ﷺ کی سیرت مبارکہ کے انہیں واقعات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔

نبی اور مصلح اور حکیم:

بظاہر نظر آتا ہے کہ اس قسم کے کچھ کام ایسے لوگوں سے بھی انجام پاتے ہیں جو نبوت اور رسالت کے منصب پر فائز نہیں ہوتے۔ وہ اپنی قوم و ملک کے سامنے اپنی اصلاح کی دعوت پیش کرتے ہیں اور سعی و محنت اور متواتر جدوجہد سے ان میں کوئی سیاسی، اجتماعی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی انقلاب پیدا کرتے ہیں اور ان کو قعرِ مذلت سے نکال کر ترقی کی سطح مرتفع تک پہنچادیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو مصلح اور ریفارمر کہتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے منہ سے اخلاق و حکمت اور پند و موعظت کے موتی جھڑتے ہیں جن کو حکیم کہتے ہیں۔ اس حالت میں ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کیا فرق ہوگا؟ اس التباس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے کوتاہ نظر ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کوئی امتیاز نہیں کرتے۔ اس بناء پر اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں، اس فرق و امتیاز کو نمایاں کردینا ضروری سمجھتے ہیں۔

نبوت کی حقیقت اور خصوصیات:

اس فرق کو پوری طرح واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے نبوت کی حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرلی جائے۔ نبوت کی فلسفیانہ حقیقت کی بہترین تشریح امام غزالی نے معارج القدس[۱] میں اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے۔ یہ دونوں بزرگ تصوف، فلسفہ اور نقلیات تینوں کوچوں سے باخبر ہیں اس لئے یہ جو کچھ بتائیں گے اس میں کچھ کچھ ذاتی ذوق و مشاہدہ کا حصہ بھی شامل ہوگا۔

امام صاحب فرماتے ہیں۔

> ''نبوت انسانیت کے رتبہ سے بالاتر ہے، جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے۔ وہ عطیہ الٰہی اور موہبت ربانی ہے، سعی و محنت اور کسب و تلاش سے نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
>
> ﴿اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسٰلَتَهٗ﴾ (انعام۔۱۵)
>
> اللہ بہتر جانتا ہے کہ جہاں وہ اپنی پیامبری کا منصب بنائے۔
>
> ﴿وَكَذٰلِكَ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ رُوۡحًا مِّنۡ اَمۡرِنَا مَا كُنۡتَ تَدۡرِىۡ مَا الۡكِتٰبُ وَلَا الۡاِيۡمَانُ وَلٰـكِنۡ جَعَلۡنٰهُ نُوۡرًا نَّهۡدِىۡ بِهٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا﴾ (شوریٰ۔۵)[۲]
>
> اور اسی طرح ہم نے تیرے پاس اپنے حکم سے ایک روح بھیجی، تو پہلے نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا؟ لیکن اس کو ہم نے ایک نور بنایا ہے جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں راہ بھائیں۔
>
> اس موقع کے لئے صریح آیت یہ ہے:
>
> ﴿ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ﴾ (جمعہ۔۱)

---

[۱] معارج القدس کا یہ حصہ حضرت الاستاذ مرحوم نے الکلام کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع کردیا ہے۔

[۲] امام صاحب نے آیت پوری نہیں لکھی ہے، میں نے اپنی طرف سے آیت پوری کردی ہے۔

یہ (نبوت) خدا کا فضل ہے جس کو چاہے دے۔

گو یہ صحیح ہے کہ وہ عبادات و ریاضات جو فکر و مراقبہ پر مشتمل اور ریا اور شہرت طلبی سے پاک ہوں، نفس میں آثار وحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں، تاہم نبوت کا منصب خاص محض اتفاقی نہیں جو محنت اور کوشش سے کسی کو حاصل ہو جائے بلکہ جس طرح نوعِ انسان کا انسان اور فرشتوں کا فرشتہ بن جانا ان کے افراد کی سعی و محنت کا مرہون منت نہیں اسی طرح نوع انبیاء کا نبی بن جانا' ان کے افراد کی کوشش اور محنت سے ممکن نہیں' ہر انسان کا بچہ اپنی ذاتی محنت سے نہیں بلکہ فیاض عالم کی بخشش سے انسانیت کا رتبہ حاصل کرتا ہے مگر انسانیت کے ممکن کمالات کو بالفعل حاصل ہو جانے کے لئے اس کو یقیناً کچھ نہ کچھ جد و جہد کرنی پڑتی ہے، اسی طرح نبوت نوع انبیاء کے لئے اکتسابی چیز نہیں لیکن منشائے نبوت کے مطابق ریاضت اور عمل' قبول وحی کی استعداد اور تیاری کے لئے البتہ ضروری ہیں۔

چنانچہ اسی اصول کے مطابق اکثر پیغمبروں کے آغاز وحی کے حالات میں آپ کو یہ ملے گا کہ انہوں نے ایک زمانہ تک عبادت و مراقبہ میں بسر کی۔ ایک ایک مہینہ ایک ایک چلہ اس طرح گذارا کہ وہ مادی دنیا کی آلائشوں سے یکسر الگ ہو گئے۔ توراۃ میں حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے کہ کتاب ملنے سے پہلے وہ چالیس روز تک کوہ طور پر روزہ کی حالت میں رہے۔ اسی طرح انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے کہ وہ ایک سنسان جنگل میں چالیس روز تک روزہ رکھ کر عبادتوں میں مصروف رہے اور وحی سے پہلے آنحضرت ﷺ کا غار حرا میں مہینوں عزلت گزیں رہنا اور فکر و مراقبہ اور عبادت اور ریاضت میں مصروف رہنا سب کو معلوم ہے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ نبوت سے پہلے حرا میں جا کر جب عبادت میں مشغول ہوئے تو رویائے صادقہ دیکھنے لگے جس کی سچائی مثل سپیدۂ صبح کے صاف نمایاں ہوتی تھی۔ وحی کے بعد آپ اس قدر عبادت میں مصروف رہتے تھے کہ آپ کے دونوں پاؤں سوج جاتے تھے۔ اسی لئے قرآن نے آپ کو خطاب کر کے کہا۔

﴿ طٰهٰ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى ﴾ (طہ۔۱)

اے پیغمبر میں نے یہ قرآن تجھ پر اس لئے نہیں اتارا کہ تو تکلیف اٹھائے۔

اس عبادت و ریاضت کے ساتھ نبوت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے حامل میں حسن صورت' اعتدالِ مزاج' نشوونما کی پاکی' حسن تربیت' طہارت نسب' کرم اخلاق' نیک طینتی' متانت' سنجیدگی، دوستان الٰہی کے ساتھ نرم خوئی اور تواضع اور دشمنان حق کے ساتھ شدت قوت پائی جائے' علاوہ بریں وہ راست گفتار، امانت دار، تمام برائیوں سے پاک، فضائل و محاسن سے آراستہ اور ذلیل باتوں سے مبرا ہوتا ہے۔ وہ ظلم کرنے والوں کو معاف اور اپنے ساتھ برائی کرنے والوں کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے۔ قرابت مندوں اور ہمسایوں کے ساتھ احسان' مظلوموں کی اعانت' فریاد خواہوں کی فریادرسی' اس کی طینت اور نیکی سے محبت اور بدی سے نفرت اس کی فطرت ہوتی ہے۔ اس کی شان جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے یہ ہوتی ہے کہ:

﴿ مَاضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَاغَوٰى ﴾ (نجم۔۲)

تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ گمراہ ہوا اور نہ بہکا۔

اس کی یہ صفت اس دنیاوی عالم میں ہے کہ وہ ہر گمراہی و بے راہروی سے پاک ہوتا ہے۔

﴿ مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی ﴾ (نجم۔۱۰)

اس کی نگاہ نہ کج ہوئی اور نہ سرکش ہوئی۔

یہ اس دنیا کے مناظر اور مشاہدات کے متعلق اس کی کیفیت ہوتی ہے۔

تمام دنیا کی قوتیں، اس کی قوت کے سامنے بالآخر طوعاً وکرہاً سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ بایں ہمہ وہ مغرور، جابر، جفا پیشہ، بدخواہ اور درشت مزاج نہیں ہوتا۔ وہ پیغمبری اور رسالت کے بارِ عظیم کو اٹھاتا ہے اور اس کا پورا حق ادا کرتا ہے اور تمام عالم میں اپنی رحمت کا فیض جاری کرتا ہے۔

نبوت ورسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ:

نبوت کے ثبوت کے دو طریقے ہیں۔ ایک اجمالی اور دوسرا تفصیلی۔ اجمالی طریقہ یہ ہے کہ جس طرح انسان کو حیوان پر نفس ناطقہ کی بناء پر فضیلت حاصل ہے کہ یہ عقلی و دماغی خصوصیت حیوان میں نہیں پائی جاتی جس کے بل پر انسان حیوان پر حکمرانی کرتا ہے اور اس کا مالک بنا ہوا ہے اور اس کو اپنے کام میں لگائے ہوئے ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو اپنے نفوس قدسیہ کی بناء پر تمام انسانوں پر برتری حاصل ہے۔ وہ اپنے ان قدسی نفوس اور پیغمبرانہ قوت سے دوسروں کو راہ راست بجھاتے اور خود راہ راست پر قائم رہتے ہیں۔ ان کی پیغمبرانہ عقل وفہم تمام انسانی عقلوں سے بالاتر ہوتی ہے اور ان کو وہ ربانی خصوصیت حاصل ہوتی ہے جس کی بناء پر وہ تمام انسانی نفوس کی تدبیر کا فرض انجام دیتے اور ان پر قابو پاتے اور ان کو کام میں لگاتے ہیں۔ اور جس طرح انسانوں کے عجیب وغریب کام حیوانوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں اسی طرح پیغمبروں کے عجیب وغریب کام انسانوں کو معجزہ نظر آتے ہیں۔

اگرچہ نبی عام انسانوں کے ساتھ بشریت اور انسانیت میں برابر کا شریک ہوتا ہے مگر عقلیت ومعنویت میں وہ ان سے بالکل الگ ہوتا ہے کیونکہ اس میں وحی کے قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی اسی مفہوم کو قرآن نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

﴿ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ ﴾ (کہف۔۱۱۰)

میں تمہاری ہی طرح بشر ہوں۔ مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

دیکھو کہ بشریت میں گو پیغمبر کو دوسرے انسانوں کے مثل کہا ہے مگر ساتھ ہی وحی کے فرق وامتیاز کو دونوں میں حد فاصل قرار دے دیا ہے۔

نبوت کے تفصیلی ثبوت کے تین طریقے ہیں۔

پہلا طریقہ:

انسان میں تین قسم کے اختیاری حرکات پائے جاتے ہیں۔ فکری، قولی، عملی۔ ان تینوں سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ فکر یعنی رائے صحیح بھی ہوتی ہے اور غلط بھی، قول سچ بھی ہوتا ہے اور جھوٹ

بھی، عمل اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح اور غلط، سچ اور جھوٹ اور اچھے اور برے میں تمیز کیونکر ہو؟ پھر کیا یہ تمیز ہر شخص کر سکتا ہے یا کوئی نہیں کر سکتا، یا بعض کر سکتے ہیں اور بعض نہیں۔ پہلے دو احتمال بداہتہً غلط ہیں۔ اب رہ گیا تیسرا احتمال یعنی بعضے انسان ایسے ہوتے ہیں جو ان حدود کو متعین کر سکتے ہیں کہ فلاں رائے و عقیدہ صحیح اور فلاں غلط ہے، فلاں قول سچ فلاں جھوٹ ہے اور فلاں فعل اچھا اور فلاں برا ہے۔ جس شخص کو خالق فطرت اپنے فضل و کرم سے یہ قوت عطا فرماتا ہے، وہی پیغمبر اور صاحب شریعت ہوتا ہے۔

دوسرا طریقہ:

نوع انسان کو اپنے اختیاری اعمال و حرکات اور مصلحتی معاملات میں باہمی اجتماع اور تعاون کی ضرورت ہے۔ اگر انسانوں میں باہم یہ اجتماع اور تعاون نہ ہو تو نہ انسان کا کوئی فرد زندہ رہے، نہ جان و مال اور عزت آبرو کی حفاظت ہو سکے۔ اسی بقائے نفس اور جان و مال و آبرو کے تحفظ کے اصول و آئین کا نام شریعت ہے۔ انسان کو اس کے لئے دو قسم کے کاموں کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ اچھے کاموں میں سب مل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں، اس کو تعاون کہتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ برے کاموں سے ایک دوسرے کو باز رکھنے کی کوشش کریں، اس کو تمانع کہتے ہیں۔ اسی تعاون کے ذریعہ سے انسان کھانے پینے پہننے اور رہنے کے لئے سامان و اسباب فراہم کرتا ہے۔ تعاون کے ذریعہ نکاح و قرابت اولاد و اعزہ اور احباب و دوست کے حقوق و تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور تمانع کے ذریعہ سے نوع انسانی اور افراد انسانی کی زندگی اور ان کی دولت و جائیداد اور عزت و آبرو کے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ اس تعاون اور تمانع کے اصول ضرور ہے کہ مرتب، محدود اور معلوم ہوں اور وہ اس طرح بنائے جائیں جن میں کسی خاص شخص، خاندان، قبیلہ، قوم اور ملک کے فوائد کی ترجیح نہ ہو بلکہ ان میں سب کا برابر فائدہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسا قانون انسانوں کے ذریعہ نہیں بلکہ وحی ربانی اور تعلیم الٰہی سے بن سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ محض کسی انسان کی عقل سے جو بہرحال کوئی خاص شخص، یا کسی خاص خاندان، قبیلہ، قوم اور ملک کا ہوگا ایسا غیر جانبدارانہ قانون جس میں تمام مخلوقات کی حیثیت یکساں ہو اور کسی طرف پلہ جھکنے نہ پائے اور تمام عالم کے لئے یکساں واجب العمل ہو، محال ہے اس لئے ضروری ہے کہ یہ اصول اس کی طرف سے وحی ہوں جس کے ہاتھ میں نظام عالم کی باگ ہے اور جو پورے نوع انسان کے اندرونی و بیرونی احوال و کیفیات کے رموز سے باخبر ہے۔ یہ اصول خلاقِ عالم کی طرف سے جس شخص پر وحی ہوتے ہیں، وہی پیغمبر اور رسول ہوتا ہے۔

تیسرا طریقہ:

یہ وہ طریقہ ہے کہ جس نے اس کو نہیں جانا اس نے نبوت کی حقیقت نہیں پہچانی۔ پہلے یہ جاننا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے دو کام ہیں۔ خلق (پیدا کرنا، نیست سے ہست کرنا) اور امر (جو موجود و ہست ہے، اس کو اپنی مصلحت کے مطابق حکم دینا) کائنات انہی دو چیزوں سے عبارت ہے۔ تو جس طرح فرشتے خالق اور مخلوق کے درمیان خلق و ایجاد و

پیدائش اور پیغام رسانی میں واسطہ ہیں اسی طرح پیغمبر خدا اور بندہ کے درمیان احکام کے پہنچانے میں واسطہ ہیں اور جس طرح خدا پر بحیثیت خالق اور آمر (پیدا کرنے والے اور حکم دینے والے) کے ایمان لانا واجب ہے اسی طرح فرشتوں پر اس حیثیت سے کہ وہ خالق و مخلوق کے درمیان ایجاد و پیدائش اور پیغام رسانی کے واسطہ ہیں، ایمان لانا ضروری ہے اور اسی طرح پیغمبروں پر اس حیثیت سے ایمان لانا فرض ہے کہ وہ خدا اور بندہ کے درمیان حکم کے پہنچانے میں واسطہ ہیں۔

اس کے بعد حسب ذیل مقدمات ذہن نشین رکھنے چاہئیں۔

۱۔ چونکہ ممکن کا وجود اور عدم برابر ہے اس لئے ممکن ہے کہ وجود میں آنے کے لئے ایک مرجح کا ہونا ضروری ہے جس کی وجہ سے وجود کو عدم پر ترجیح ہو اور وہ شے عدم سے وجود میں آ سکے۔ یہی امر مرجح ممکن کی علت ہوتا ہے۔

۲۔ ہر قسم کے حرکات کے لئے ایک محرک کی ضرورت ہوتی ہے جو دم بدم حرکت کی تجدید کرتا رہے۔ حرکات کی بھی دو قسمیں ہیں طبعی اور ارادی۔ ارادی حرکت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے محرک میں ارادہ اور اختیار پایا جائے، اسی طرح طبعی حرکت کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ اس کا محرک عقل اور تدبیر والا ہو۔ آفتاب و ماہتاب اور دوسری آسمانی مخلوقات کی حرکات گو طبعی ہیں تاہم ان کو حرکت دینے کے لئے کسی عاقل و مدبر کی ضرورت ہے، اسی لئے قرآن نے ان کے لئے کہا۔

﴿ وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ﴾ (حم السجدہ۔ ۱۲)

خدا نے ہر آسمان میں اس کا فرض اور کام وحی کیا۔

۳۔ اب جس طرح انسانی حرکات کو ارادہ اور اختیار کی حاجت ہے یعنی ارادہ اور اختیار کے بغیر وہ وقوع میں نہیں آ سکتیں اسی طرح ان حرکات کو ایک ایسے رہنما کی ضرورت ہے جو ان اعمال و حرکات کا ٹھیک راستہ اور صحیح طریقہ بتائے اور حق کو باطل سے، سچ کو جھوٹ سے اور خیر کو شر سے ممتاز کر دے۔

۴۔ خدا کے حکم دو قسم کے ہیں، تدبیری اور تکلیفی۔ پہلا حکم تمام نظامِ عالم میں جاری ہے جس کی بناء پر تمام عالم میں تدبیر اور انتظام کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ ط اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ط ﴾ (اعراف۔ ۵۴)

اور سورج اور چاند اور ستارے اس کے حکم کے تابعدار ہیں۔ اسی کا کام ہے بنانا اور حکم فرمانا۔

تکلیفی حکم صرف انسان کے لئے ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ﴾ (بقرہ۔ ۴)

اے انسانو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا۔

مقدمات مذکورۂ بالا سے ثابت ہوا کہ انسان کے تمام حرکات ممکن ہیں، اس لئے مرجح کی ضرورت ہے۔ اختیاری ہیں، اس لئے عقل کی ضرورت ہے۔ خیر و شر کے متحمل ہیں، اس لئے رہنما کی ضرورت ہے۔ اسی رہنما کا نام پیغمبر ہے۔

نظام عالم میں خدا کا جو تدبیری حکم نافذ ہے وہ ملائکہ کے ذریعہ سے ہے۔ اسی قیاس سے انسانوں پر خدا کا جو

تکلیفی حکم نافذ ہے وہ بھی ایسے ہی نفوس کے ذریعہ سے ہوگا اور انہیں کا نام پیغمبر ہے۔

شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے چھٹے مبحث کے دو ابتدائی بابوں میں اس پر بحث کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ کمال نکتہ سنجی سے کی ہے۔ شاہ صاحب کی تقریر کو ہم اپنے الفاظ میں لکھتے ہیں۔

نبی کی ضرورت:

انسان میں دو قسم کی قوتیں ہیں، بہیمی اور ملکوتی۔ کھانا، پینا، شہوت، حرص وطمع، استیلاء و جبر وغیرہ افعال بہیمی قوت کے آثار ہیں۔ اور غور وفکر، علم ومعرفت، حسن اخلاق، صبر وشکر، عبادت وطاعت وغیرہ ملکوتیت کے نتائج ہیں۔ انسان کی روحانی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی بہیمی قوت اس کی ملکوتی قوت کے تابع ہو۔ اگرچہ عقل سلیم ان اصول اور طریقوں کو معلوم کر سکتی ہے جن کے ذریعہ سے بہیمیت کے تابع ملکوتیت ہونے کے فائدے اور گناہ وعصیاں کے نقصانات ظاہر ہوں۔ عقل سلیم کے اس علم سے انسان فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کر سکتا ہے مگر یہ تو امکان عقلی ہے۔ عملی کیفیت یہ ہے کہ انسان کی آنکھوں پر موجودہ دنیاوی لذائذ، حرص وطمع، اور بے جا خواہشوں اور غفلتوں کے اتنے تو بر تو پردے پڑ جاتے ہیں کہ اس کے اصلی اور فطری وجدان اور قوت احساس کا مادہ فاسد ہو جاتا ہے جیسے بیماری میں انسان کی زبان کا ذائقہ جب بدل جاتا ہے تو میٹھی سے میٹھی چیز اس کو کڑوی معلوم ہوتی ہے، اسی طرح اندرونی وجدان واحساس کے فاسد ہو جانے سے بھی وہ حق وباطل خیر وشر اور نیک وبد کی تمیز کو بھول جاتا ہے، اس لئے نوع انسان کو ایسے صحیح رہنماؤں اور روحانی معلموں کی ضرورت ہے جن کے احساس و وجدان کا آئینہ گرد آلود نہ ہو۔

اگر افراد، جماعات اور اہل ملک کو ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اپنی سیاست کے زور سے ان میں صلح وآشتی اور امن وامان پیدا کر دے تو ایک قوم کی قوم بلکہ کل دنیا کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت کیوں نہ ہو جو ہر گروہ کی استعداد کو پیش نظر رکھ کر اس کے مطابق، اس کے حقوق وفرائض کی تعیین کرے۔ ایسے لوگ جو ایسے اہم فریضہ کو انجام دے سکیں، اسی طرح کم ہیں جس طرح دوسرے اصناف کے اہل کمال۔ انسانوں کے معمولی پیشوں، نجاری اور لوہاری کو دیکھو کہ کس قدر معمولی ہیں مگر ان کو کرنا بھی ہر شخص کا کام نہیں۔ یہ پیشے بھی ایسے لوگوں کے بغیر وجود میں نہیں آئے جن کو ان کاموں کا خاص ذوق و وجدان تھا اور ان کو ان کاموں کی خاص فطری استعداد ملی تھی جس کے ذریعہ سے انہوں نے اس فن کو تکمیل تک پہنچایا اور اس کے اصول وقواعد وضع کئے اور بعد کے آنے والوں نے ان کی تقلید کی اور اس تقلید سے مدارج علیا تک پہنچے پھر اخلاق اور روحانیت اور ملک وملت کے مصالح وفوائد عامہ کا فن جس قدر اہم اور نازک ہے، کیا اس کو سمجھنا اور وضع کرنا ہر کس وناکس کا کام ہو سکتا ہے؟

نبی کی عصمت:

پھر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص اس رہنمائی کے منصب کا مدعی ہو، وہ اپنی نسبت یہ بھی ثابت کرے کہ وہ ان اصول وقواعد سے بخوبی واقف ہے اور وہ اپنے علم اور تعلیم میں غلطی اور گمراہی سے محفوظ ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے علم اور تعلیم کا ماخذ اور سرچشمہ غلطیوں سے پاک اور محفوظ نہ ہو۔ اس کو ان امور کا علم اسی

طرح وجدانی ہو جس طرح انسان کو بھوک اور پیاس کا وجدان ہوتا ہے۔ کیا کسی کو اس علم میں کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہوتی ہے کوئی غلطی ہو سکتی ہے؟ اسی طرح اس کو حق و باطل، خیر و شر، اور نیک و بد امور کے درمیان فیصلہ اسی طرح قطعی معلوم ہوتا ہے جس میں نہ دلیل کی حاجت ہوتی ہے اور نہ عقل معاش کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر بھوک اور پیاس ہونے کا علم اس طرح رکھ دیا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی معاند کتنی ہی دلیلیں پیش کرے کہ ہم کو بھوک یا پیاس نہیں ہے، ہم کبھی اس وجدانی یقین سے جس کو خدا نے ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے، اس معاند کے ان عقلی دلائل سے متاثر ہو کر دست بردار نہیں ہو سکتے اور اپنے یقین کو غلط نہیں کہہ سکتے، بعینہ اسی طرح ان نفوس قدسیہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے خاص قسم کا وجدان و ذوق سلیم رکھ دیا ہے جس کا عمل ہمیشہ صحیح اور جس کا احساس ہمیشہ درست اور جس کا فیصلہ ہمیشہ ناطق ہی ہوتا ہے۔

نبی کی محبوبیت:

ایسا شخص جب لوگوں کے سامنے آتا ہے اور لوگوں کو بار بار کے تجربہ سے اس کی صداقت‘ سچائی اور راست بازی کا یقین ہو جاتا ہے اور اس کے ہاتھ سے جو تصرفات صادر ہوتے ہیں، ان سے اس کا مقرب بارگاہ الٰہی ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے تو ہر طرف سے لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس کی محبت کی راہ میں جان و مال اور اہل و عیال سب کو قربان کر دیتے ہیں۔

شاہ صاحب اس کے بعد دوسری فصل میں اسی ’’بحث نبوت‘‘ کو ایک اور انداز سے لکھتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے۔

مصلحین:

فضل و کمال اور علم و عمل کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا درجہ مفہمین کا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی قوت ملکیہ نہایت بلند ہے اور جن میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ سچے اور صحیح جذبہ سے ایک خاص نظام کو دنیا میں قائم کر دیں اور ان پر بارگاہ الٰہی سے ایسے علوم اور احوال کا ترشح ہوتا ہے جن میں ربانی آثار نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگ معتدل مزاج اور اپنی صورت و سیرت میں درست اور عقل و ذکاوت میں متوسط ہوتے ہیں۔ نہ اس قدر بلید کہ جزئیات سے کلیات تک ان کا پہنچنا مشکل ہو، نہ اس قدر تیز کہ جزئیات اور محسوسات سے قطع نظر کر کے ہمیشہ ذہنیات اور تخیلات میں مبتلا رہیں۔ صحیح فطرت پر وہ قائم رہتے ہیں، طور و طریق ان کے پسندیدہ ہوتے ہیں، خدا کے ساتھ ان کا تعلق عبادت و اطاعت سے اور بندوں کے ساتھ عدل و انصاف سے قائم رہتا ہے۔ وہ اپنے فیصلوں میں شخصی اور جزئی بھلائی اور منفعت کا لحاظ نہیں کرتے بلکہ منفعت عامہ اور تدبیر کلی کا لحاظ کرتے ہیں، وہ براہ راست کسی کو تکلیف نہیں دیتے الّا یہ کہ منفعت عامہ کا حصول اور بڑی تعداد کا فائدہ چھوٹے سے نقصان سے حاصل ہو تو وہ اس جزئی تکلیف اور شخصی نقصان کو گوارا کر لیتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنے کاروبار میں عالم غیب کی طرف مائل رہتے ہیں جس کا اثر ان کی بات چیت‘ کام کاج اور معاملات میں نمایاں ہوتا ہے کارکنانِ عالم ان کی تائید و نصرت میں رہتے ہیں، معمولی ریاضت سے ان کے لئے قرب و سکینت کے وہ دروازے کھل جاتے ہیں جو دوسروں کے لئے نہیں کھلتے۔

مصلحین کی اقسام:

مفہمین کی درجہ بدرجہ مختلف اصناف ہیں اور ان کی مختلف استعدادیں ہیں اور اس بناء پر ان میں سے ہر ایک کے الگ الگ اصطلاحی نام ہیں۔ جو زیادہ تر عبادات کے ذریعہ سے تہذیب نفس کے علوم پاتا ہے وہ کامل ہے اور جو اخلاق فاضلہ اور تدبیر منزل کے اصول حاصل کرتا ہے وہ حکیم ہے، جو عمومی تدبیر و سیاست کے علوم کا فیض پاتا ہے اور ان کے مطابق اس کو لوگوں میں عدل کے قیام اور ظلم کے دور کرنے کی توفیق ملتی ہے وہ خلیفہ ہے اور جس پر ملاء اعلیٰ کا نزول ہو اور وہ اس سے تعلیم پائے اور وہ اس کو مخاطب کرے اور مختلف قسم کے تصرفات اس سے صادر ہوں، وہ موید بروح القدس کہلاتا ہے اور وہ جس کی زبان اور دل میں وہ نور ہو کہ لوگ اس کی صحبت اور پند و موعظت سے نفع اٹھائیں اور وہ نور اس سے منتقل ہو کر اس کے رفقائے خاص میں منتقل ہو جس سے وہ بھی کمال کے درجہ تک پہنچ جائیں، اس کا نام ہادی اور مزکی (پاک کرنے والا) ہے اور جس کے علم کا بڑا حصہ ملت کے اصول و قواعد اور اس کی مصلحتوں کی واقفیت ہو اور ملت کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کرنے کی طاقت ہو، وہ امام کہا جائے گا اور جس کے قلب میں یہ ڈالا جائے کہ وہ لوگوں کو ان کی اس مصیبت عظمیٰ سے خبردار کرے جو اس دنیا میں ان کے لئے ان کے اعمال کے نتیجہ کے طور پر مقدر ہے اور ان کی بداعمالی کے سبب ان سے حق تعالیٰ کی رحمت کی جو دوری یا قبر اور حشر میں ان پر جو مصیبتیں آنے والی ہیں، اس کا نام منذر (ڈرانے والا، ہوشیار کرنے والا) ہے۔

اور جب حکمت الٰہی کا یہ اقتضا ہوتا ہے کہ مخلوق کی ہدایت و اصلاح کے لئے ان مفہمین میں سے کسی کو بھیجے تو اس کی آمد مخلوق کی تاریکی سے نکل کر روشنی میں آنے کا سبب ہو جاتی ہے اور وہ بندوں پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ دل و جان سے اس کی اطاعت کریں اور بارگاہ الٰہی میں تاکید ہوتی ہے کہ جو اس کی اطاعت کرے، اس سے خوشنودی اور جو اس کی مخالفت کرے، وہ اسے ناخوشی ظاہر کرے۔ یہی شخص نبی ہوتا ہے۔

نبی کی دو بعثتیں:

نبیوں میں بڑا درجہ اس کا ہوتا ہے جس کو اس پیغمبرانہ بعثت کے ساتھ ایک اور بعثت ملتی ہے اور وہ یہ کہ مراد الٰہی یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کے ذریعہ سے اس کی قوم اور اس کی قوم کے ذریعہ سے دوسری قومیں ظلمت سے نکل کر نور میں آئیں تو اس نبی کی ذاتی بعثت کا نام بعثت اولیٰ اور اس کی قوم کی دوسری قوموں کی ہدایت کے لئے نامزدگی بعثت ثانیہ ہے۔

نبی کی پہلی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیَاتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (جمعہ۔۲)

وہی خدا جس نے ان پڑھوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا اور ان کو پاک بناتا اور ان کو کتاب اور دانائی سکھاتا ہے۔

اور دوسری بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

﴿ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ﴾ (آل عمران۔۱۱۲)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے وجود میں لائی گئی، نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے باز رکھتے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی پیغمبرانہ بعثت ان کی امت کے لئے ہوئی، ویسی ہی ان کی امت کی بعثت دوسری قوموں کی طرف ہوئی اور اسی معنی میں قرآن پاک کی یہ آیت بھی ہے۔

﴿ لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ (حج۔۷۸)

تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔

اسی لئے احادیث میں ہے کہ آپ نے صحابہ کو فرمایا ﴿فا نما بعثتم میسر ین و لم تبعثو ا معسر ین﴾ تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، سختی کرنے والے بنا کر نہیں۔ آنحضرت ﷺ سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام آئے وہ ان مختلف مذکورہ بالا مناصب میں سے ایک یا دو منصب کے ساتھ مبعوث ہوئے لیکن آنحضرت ان تمام منصبوں پر ایک ساتھ سرفراز ہوئے اور یہ تمام فنون آپ کی واحد ذات میں جمع کر دیئے گئے اور آپ کو یہ دونوں بعثتیں بھی بکمال استحقاق عطا ہوئیں۔

بعثت کے لئے کسی قوم کا انتخاب:

یہ بھی واضح ہو کہ رسول کی بعثت کے لئے حکمت الٰہی کا اقتضا اس لئے ہوتا ہے کہ عالم کی عمومی تدبیر و نظم و نسق میں جو اضافی خیر معتبر ہے، وہ ان دنوں اسی رسول کی بعثت میں منحصر ہوتا ہے اور اس بعثت کے حقیقی سبب کا علم اسی دانائے غیب کو ہے مگر اتنی بات ہم قطعاً جانتے ہیں کہ کچھ اسباب ایسے ہیں جو بعثت کے ساتھ ضرور پائے جاتے ہیں اور امت پر اس رسول کی اطاعت اسی لئے فرض ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی تمام قوموں سے جس قوم کی نسبت یہ جانتا ہے کہ اس میں خدا کی اطاعت و پرستش کی استعداد اور اس میں اللہ تعالیٰ کے فیضان اٹھانے کی صلاحیت زیادہ ہے، اس میں وہ رسول مبعوث ہوتا ہے اور چونکہ اس قوم کی اصلاح اسی پیغمبر کی پیروی اور اتباع میں منحصر ہوتی ہے اس لئے بارگاہ الٰہی کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت سب پر واجب کی جائے۔

بعثت کا زمانہ:

اس موقع پر چند باتیں اور قابل لحاظ ہیں کیونکہ یہ وقت وہ وقت ہوتا ہے کہ کوئی نئی حکومت اس لئے قائم کی جائے تا کہ اس کے ذریعہ سے ان دوسری حکومتوں کو جو دنیا میں فساد اور شر کا موجب بنی ہوئی ہیں مٹا دیا جائے تو ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھیجتا ہے جو پہلے اس قائم ہونے والی سلطنت کی قوم کی اصلاح کرے اور اس کے دین کو درست کرے تا کہ اس کے ذریعہ سے دوسری قوموں کی اصلاح ہو جس طرح ہمارے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی زندگی کی بقا اور اس کو اپنا برگزیدہ بنانا چاہتا ہے تو اس میں وہ ایک ایسے شخص کو بھیجتا ہے جو اس کی کجی کو دور کر دے اور اس کو کتاب الٰہی کی تعلیم دے کر اس کو اس کا مستحق بنا دے جیسے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بنی اسرائیل میں بعثت ہوئی، یا کسی قوم کے متعلق قضائے الٰہی کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو مزید زندگی ملتی رہے اور اس کا دین و

سلطنت برقرار رہے تو یہ مجددین نبوت پیدا ہوتے ہیں جیسے بنی اسرائیل کے مختلف زمانوں میں حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور پیغمبروں کے ایک گروہ کی بعثت ہوتی رہی۔

نبی کی یقینی کامیابی:

ہر نبی کی بعثت کے دور میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کو اور اس کے دوستوں کو کامیابی دے، اور اس کے دشمنوں کو پے در پے ناکامی ہو (یہاں تک کہ حق استوار اور دعوت مکمل ہو جائے) قرآن پاک میں ہے۔

﴿ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴾ (والصّٰفّٰت ۔ ۱۷۱)

اور ہماری بات اے پیغمبر بندوں کے متعلق پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ انہی کی مدد کی جائے گی اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوگا۔

ان دونوں بزرگوں (امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب) نے اپنے اپنے الفاظ میں جو کچھ کہا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے احوال مبارکہ اور سوانح مقدسہ پر جس کی نظر عمیق و وسیع ہوگی ان کو ان اصول کے تسلیم کرنے میں ذرہ بھر شک نہیں ہو سکتا اور ان پر استدلال، واقعات اور حوادث سے اسی طرح کیا جا سکتا ہے جس طرح نفسیاتِ اجتماع (سائیکالوجی آف پیپل) یا نفسیات رہنمائی (سائیکالوجی آف لیڈر شپ) پر واقعات کے تسلسل اور تواتر سے کرتے ہیں۔ اسی طرح امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب نے اوپر کے صفحات میں جو کچھ کہا ہے ہم مجازاً کہہ سکتے ہیں کہ وہ ''نفسیات نبوت'' کے گویا ابواب ہیں۔

موجودہ زمانہ میں خیالات، طرز گفتار، اسلوب تحریر اور طریقہ استدلال غرض ہر چیز میں فرق ہو گیا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اہل زمانہ سے ان کی اصطلاح میں گفتگو کی جائے اور جو اصول قائم کیا جائے، اس پر قرآن مجید سے بھی ساتھ ساتھ استدلال کیا جائے کہ عقل و نقل دونوں درباروں میں کہنے والے کی بات کا اعتبار ہو۔

غور کرنے سے یہ معلوم ہوگا کہ دنیا کا ذرہ ذرہ جس غرض و مقصد کے لئے پیدا ہوا ہے۔ وہ اپنے ذاتی ارادہ اور قصد کے بغیر خود بخود اس کو پورا کر رہا ہے اور اس کے خالق نے اس کے روز پیدائش سے اس کو جو حکم دے دیا ہے اس کی تعمیل سے وہ سرمو انحراف نہیں کرتا۔ آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہے۔ آفتاب دنیا کو گرمی اور روشنی دینے پر مامور ہے اور وہ ہر آن اور ہر لحظہ اس میں مصروف ہے، زمین کو سرسبزی اور شادابی کا کام سپرد ہے اور وہ اس کو انجام دے رہی ہے، ابر کو سیرابی اور گوہر باری کا حکم ہے اور وہ اس کی تعمیل کر رہا ہے، درخت پھل دینے پر مقرر ہیں اور وہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں، حیوانات جن کاموں پر مامور ہیں وہ بخوشی ان کو کر رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان بھی اس دنیا میں کسی کام پر اسی طرح مقرر ہو کر آیا ہے یا نہیں؟ اگر آیا ہے تو کیا اس کو انجام دے رہا ہے؟

آؤ انسان کو غور سے دیکھیں۔ بظاہر وہ بھی کھاتا پیتا چلتا پھرتا اٹھتا بیٹھتا زندگی گذارتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ کیا

اس کی زندگی کا بس اسی قدر مقصد ہے؟ اگر یہی ہے تو پھر انسان اور حیوان میں کیا پہچان؟ اور ذی ارادہ اور غیر ذی ارادہ میں کیا امتیاز؟ اور صاحب عقل اور بے عقل میں کیا فرق؟ چنانچہ قرآن پاک اسی لئے انسانوں سے سوال کرتا ہے اور بجا سوال کرتا ہے۔

﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا ﴾ (مومنون۔۱۱۵)

کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا۔

﴿ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًی ﴾ (قیامہ۔۳۶)

کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی غرض ومقصد کے لئے پیدا ہوا ہے لیکن وہ غرض ومقصد کیا ہے؟

انسان کی پوری ہستی اگر کائنات کے صفحہ سے مٹ جائے تو بھی آفتاب اسی طرح چمکتا رہے گا‘ سمندر اسی طرح ابلتے رہیں گے‘ ہوائیں اسی طرح چلتی رہیں گی‘ پانی اسی طرح برستا رہے گا‘ سبزے اسی طرح اگتے رہیں گے اور درخت اسی طرح پھلتے رہیں گے۔ لیکن اگر درخت نہ پھلیں تو انسان کی ہستی معرض خطر میں پڑ جائے‘ سبزیاں نہ اگیں تو انسان بھوکا مر جائے‘ پانی نہ برسے تو انسان پیاسا تڑپ جائے‘ اگر ہوا نہ چلے تو انسان گھٹ کر مر جائے‘ اگر زمین نہ ہو تو انسان کو کھڑے ہونے کی جگہ نہ ملے‘ اگر آفتاب نہ چمکے تو انسان کی ہستی کا چراغ فوراً بجھ جائے‘ سمندر نہ ہو تو نہ پانی برسے، نہ سبزیاں اگیں نہ انسانی غذا میسر آئے، نہ پانی برس کر پھر زمین کو خشک ہونا نصیب ہو‘ الغرض دنیا کی کوئی اہم ہستی اپنے وجود کے لئے انسان کی محتاج نہیں لیکن انسان اپنے وجود کے لئے کارخانہ ہستی کے ایک ایک پرزہ کا حاجت مند ہے تو پھر کیا یہ نتیجہ صحیح نہیں کہ اس کارخانہ کے ہر پرزہ کی غرض وغایت انسان کا وجود اور اس کی بقا ہے لیکن خود انسان کے وجود کی غرض کوئی دوسری ہے جو دیگر موجودات کے وجود کی غرض سے زیادہ اہم ہے۔

قرآن پاک دوسرے موجودات ومخلوقات کی نسبت یہ کہتا ہے۔

﴿ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ﴾ (بقرہ۔۲۹)

اسی نے تمہارے لئے (اے انسانو) وہ سب پیدا کیا جو زمین میں ہے۔

پھر یہ بھی بتایا۔

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ ﴾ (حج۔۶۵)

(اے انسان!) کیا تو غور نہیں کرتا کہ زمین میں جو کچھ ہے ان سب کو تمہارے کام میں اس نے لگا رکھا ہے۔

زمین کے بعد آسمان کی نسبت بھی اس نے اعلان کیا۔

﴿ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ﴾ (نحل۔۱۲)

اور (اے انسانو) اس نے رات اور دن کو سورج اور چاند کو تمہارے کام میں لگایا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔

ہستیاں دو ہی ہیں‘ خالق کی اور اس کی مخلوقات کی۔ مخلوقات کے حالات پر غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ ان میں

ادنیٰ چیز اپنے سے اعلیٰ چیز کے کام آ رہی ہے۔ جمادات نباتات کے‘ نباتات جمادات کے اور جمادات اور نباتات اور حیوانات تینوں انسان کے کام آ رہے ہیں۔ آخر انسان کو بھی اپنے سے کسی اعلیٰ ہستی کے کام آنا چاہئے۔ مخلوقات میں تو اب اس طرح کی کوئی اعلیٰ ہستی نہیں تو لامحالہ اس کی تخلیق خود خالق کے لئے ہوئی ہے۔

الغرض دنیا کی ساری چیزوں کی غرض و غایت بواسطہ یا بلاواسطہ انسانوں کی بقا‘ زندگی اور آسائش ہے لیکن خود انسان کی زندگی اس کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے ہے، جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے۔

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴾ (ذاریات۔۵۶)
اور میں نے جن اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری اطاعت کریں

عقل وفہم اور ارادہ واختیار کے لحاظ سے مخلوقات کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ ایک وہ جو ان صفات سے یکسر محروم ہیں جیسے آفتاب‘ ماہتاب‘ زمین‘ مٹی‘ پتھر‘ پھل‘ پھول‘ درخت

۲۔ دوسری وہ جو صرف ابتدائی احساس اور علم وفہم رکھتے ہیں لیکن قیاس واستقراء وتمثیل اور حاضر پر غائب کو قیاس کر کے کسی نئے علم کا استخراج کرنا ان کی قدرت سے باہر ہے۔ ان کا ارادہ واختیار بھی صرف ظاہری محسوس اشیاء تک محدود ہے جیسے حیوانات۔

۳۔ تیسری وہ مخلوق ہے جو عقل وادراک رکھتی ہے، قیاس آرائی کرتی ہے، استقراء اور تمثیل کے ذریعہ سے استنباط کرتی ہے، جزئیات سے کلیات بناتی اور کلیات سے جزئیات پر حکم لگاتی ہے، بدیہیات سے نظریات تک پہنچتی اور غائب کو حاضر پر قیاس کرتی ہے۔

پہلی قسم کی مخلوقات سے جو حرکات اور آثار پیدا ہوتے ہیں وہ اضطراری اور غیر ارادی ہوتے ہیں اور کبھی ان میں تخلف نہیں ہوتا، اسی لئے ان کو فطری آثار اور طبعی خصائص کہتے ہیں جن کا صدور ان مخلوقات سے ہمیشہ یکساں اور بلا ارادہ ہوتا رہتا ہے۔ دوسری قسم کی مخلوقات سے جو آثار اور حرکات پیدا ہوتے رہتے ہیں وہ گو ارادہ اور احساس اور ابتدائی فہم کے ماتحت صادر ہوتے ہیں لیکن ان کے ہر فرد سے صرف ایک ہی قسم کے افعال‘ حرکات اور آثار جبلت فطرت اور طبیعت کہتے ہیں ان کے صدور میں بھی وہ مخلوقات اپنی فطرت اور طبیعت کے تقاضے سے مجبور ہیں جیسے حیوانات کے افعال اور ان کے مختلف انواع کے الگ الگ نوعی کام کہ وہ ازل سے قیامت تک یکساں ایک ہی طرح اور وہ بھی کسی غایت اور انجام ومآل کے پہلے سے سوچے بغیر ان سے صادر ہوتے ہیں۔

تیسری مخلوق کے بعض افعال گو طبیعت وجبلت کے مطابق ہوتے ہیں جو دیگر مخلوقات کی طرح ویسے ہی بے ارادہ اور اضطراراً سرزد ہوتے ہیں مگر اس کے اور دوسرے افعال وحرکات تمام تر اس کے ارادہ اختیار اور فہم سے صادر ہوتے ہیں۔ صرف یہی آخری قسم کے افعال وہ ہیں جن پر خیر وشر اور نیک وبد کا حکم جاری ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے تمام عاقلانہ کام، عاقبت بینی‘ انجام اور مآلِ کار کو خیال کر کے اس کے ارادہ سے صادر ہوتے ہیں اور یہیں سے اس کی ذمہ داری کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔

جن وانس کے علاوہ تمام دوسری مخلوقات خیر وشر کی ذمہ داری سے بری ہیں۔ جمادات ونباتات تو اس لئے کہ

ان کے افعال وحرکات تمام تر مجبورانہ، بے ارادہ اور فکر انجام کے بغیر صادر ہوتے ہیں یا یوں کہو کہ ان احکام کے بموجب ہمیشہ ہوتے ہیں جو خدا نے ان کو اوّل ہی دن دے دیئے ہیں۔ حیوانات بھی اس لئے اس ذمہ داری سے بری ہیں کہ ان کے افعال وحرکات بھی تمام تر جبلی وطبعی ہیں اور وہ جبلت وطبیعت پر مجبورانہ بے ارادہ اور انجام کے خیال کے بغیر عامل ہیں یا یوں کہو کہ وہ اپنے خالق کے احکام پر ہمیشہ اضطرارًا عمل پیرا ہیں۔ اسی طرح فرشتے بھی اس تکلیف سے سبکدوش ہیں کیونکہ وہ بھی اپنی خلقت اور جبلت سے اطاعت پر مجبور ہیں اور اسی لئے ان سے عصیاں نہیں سرزد ہوتا۔ صرف ایک انسان ایسی مخلوق ہے جو بہت سی باتوں میں ارادہ واختیار اور علم رکھتا ہے، نیکی بدی اور خیر وشر ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کے اختیار پر قطعی مجبور نہیں ہے بلکہ وہ عقل وفہم سے سوچ سمجھ کر مآل کار اور انجام پر غور کر کے یا اپنے جذبات کے تحت کوئی کام کرتا ہے اس لئے وہی خیر وشر کے امتیاز اور حق و باطل کے فرق کے لئے پیغام الٰہی کا محتاج قرار پایا ہے۔

جمادات ونباتات اور دیگر مخلوقات سے احکام الٰہی کی مجبورانہ اطاعت یعنی جبلت یا فطرت یا خاصیت کو قرآن پاک یوں ادا کرتا ہے۔

﴿ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴾ (نحل ۴۹)

اور خدا ہی کے آگے سر جھکاتے ہیں جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے جانداروں میں سے' اور فرشتے' وہ سرکشی نہیں کرتے' اپنے پروردگار کا اوپر سے ڈر رکھتے ہیں اور کرتے ہیں جو حکم پاتے ہیں۔

اسی فطری اطاعت الٰہی کا دوسرا نام فطری وحی بھی رکھ لو جیسا کہ قرآن میں ہے

﴿ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ﴾ (نحل۔ ۶۹)

اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں پر وحی بھیجی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور جہاں چھت ڈالتے ہیں' اپنے لئے گھر بنائے پھر ہر پھل میں سے کھا' پھر اپنے پروردگار کی راہوں پر (مقررہ احکام پر) چل' مطیع ہو کر۔

دیکھو اس آیت پاک میں طبعی الہام کی مجبورانہ پیروی کو اطاعت الٰہی کہا گیا ہے اور دوسری جگہ ان کی اپنے خالق اور پیدا کرنے والے کے حکم کی۔ اسی طبعی اطاعت اور فطری تعمیل کو ان کی زبان حال کی نماز اور تسبیح فرمایا گیا ہے۔

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ط كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴾ (نور ۴۰)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین میں جو کوئی ہے وہ اڑتے جانور پر کھولے اس کی یاد کرتے ہیں۔ ہر ایک نے جان رکھی ہے اپنی طرح کی نماز اور اس کی پاکی کی یاد اور خدا کو معلوم ہے جو وہ کرتے ہیں۔

لیکن انسان کو دوسرے موجودات ومخلوقات کی طرح مجبور محض پیدا نہیں کیا گیا ہے بلکہ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے وہ احساس اور ارادہ جو جمادات میں معدوم' نباتات میں محل بحث اور حیوانات میں متحرک ہے، وہ انسان میں پوری طرح بیدار

اور کارفرما ہے۔ اسی طرح وہ ارادی قوت واختیار جو جمادات میں معدوم، نباتات میں مفقود اور حیوانات میں محدود ہے وہ انسان میں ایک حد تک وسیع ہے۔ علاوہ ازیں ہر کام میں عاقبت بینی اور مال اندیشی صرف انسان کا خاصہ ہے اسی لئے تمام مخلوقات میں وہی ارادی ''تکلیف'' کا مستحق قرار پایا اور غیر ذی ارادہ مخلوقات کی طرح بالاضطرار اور مجبورانہ اطاعت الٰہی کے لئے نہیں بلکہ بالارادہ اطاعت کے لئے اس کی تخلیق ہوئی۔ فرمایا

﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ﴾ (احزاب۔۷۲)

ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔

یہ امانت، اس کی نیکی و بدی کی تمیز اور خیر و شر کا فرق ہے جس کے نتیجہ کے طور پر شریعت الٰہی کا نزول ہوا ہے انسان کو اپنی اس امانت سے عہدہ برآ ہونے کے لئے باارادہ اور بااختیار افعال میں بھی بے ارادہ اور بے اختیارانہ افعال کی طرح احکام الٰہی کی اطاعت کرنا ضروری ہے یعنی جس طرح بے اختیارانہ افعال میں فطرت و جبلت کی مجبورانہ اطاعت کر کے حکم الٰہی کی تعمیل کی جاتی ہے اسی طرح باارادہ اور اختیاری افعال میں بھی شریعت کی بالارادہ اطاعت کر کے حکم الٰہی کی تعمیل ضروری ہے۔

اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ غیر ارادی افعال و حرکات میں جس طرح ہم اپنے فطری الہام و وحی کی مجبورانہ پیروی کرتے ہیں، اسی طرح ارادی افعال میں بھی شرعی الہام و وحی کی بالارادہ پیروی کریں۔

لیکن کسی کی اطاعت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے احکام و امر سے ہم کو واقفیت نہ ہو۔ انبیاءؑ اور رسول وہی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اپنے ان احکام اور اوامر کی شریعت کو وحی کرتا ہے اور وہ ان ذی ارادہ بندوں کو اس سے آگاہ و باخبر کرتے اور اس کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں۔

یہ نکتہ کہ انسان کے علاوہ تمام دیگر بے ارادہ مخلوقات خدا کی اطاعت پر طبعاً مجبور ہیں اور کسی قدر بااختیار انسان کے افراد اپنے اسی تھوڑے سے اختیار اور ارادہ کے بل پر اپنے خالق سے سرکشی کرنے پر آمادہ ہیں، خود قرآن پاک کے الفاظ میں موجود ہے، فرمایا۔

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ﴾ (حج۔۱۸)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی کے آگے سر جھکاتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان، اور بہت سے (انسان) ہیں جن پر عذاب ٹھہر چکا ہے۔

دیکھو کہ انسان کے علاوہ تمام دوسری بے ارادہ اور بے عقل مخلوقات کی کلی اطاعت اور سرافگندگی کا اعلان ہے لیکن خاص باارادہ اور باعقل اور انجام میں انسانوں کی دو قسمیں کر دی گئیں ہیں، مطیع اور سرکش۔

کائنات کے صحیفہ کا تدریجی مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ جمادات‘ نباتات‘ حیوانات اور انسان میں سے جس صنف مخلوقات میں احساس، ارادہ اور اختیار کا دائرہ اصناف ہستی میں بڑھتا جاتا ہے اسی قدر معلم فطرت اپنے فرائض سے کنارہ کش ہوتا جاتا ہے اور وہ صنف کائنات اپنی ذمہ داری آپ قبول کرتی جاتی ہے۔ جمادات اپنی نشوونما کے لئے بیرونی غذا کے محتاج نہیں‘ نباتات جن میں ان اوصاف کی ہستی صرف اپنی آنکھیں کھولتی ہے، ان کی غذا خود ان کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے اور وہ خود اڑ کر اور چل کر ان تک پہنچ جاتی ہے۔ حیوانات جن میں یہ اوصاف جاگ کر کروٹیں بدلتے ہیں ان کی غذا بے جوتے، بے بوئے‘ بے چنے نکھارے، بن پکے پکائے ہر قدم پر ہر وقت تیار ملتی ہے لیکن انسان جس میں یہ تینوں اوصاف بیٹھ کر حکمران اور کارفرما ہوتے ہیں، اس کے منہ تک غذا کا ایک دانہ بھی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کی جدوجہد محنت اور جانفشانی کے پسینہ کا گرم قطرہ پیشانی سے چل کر اس کے پاؤں تک نہیں پہنچتا۔

جہاں احساس‘ ارادہ اور اختیار جیسے جیسے کم ہے اسی قدر طبیعت‘ فطرت اور جبلت کی اضطراری حکومت زیادہ قائم ہے لیکن جیسے جیسے ان تینوں اوصاف کی ترقی و تکمیل ہوتی جاتی ہے طبیعت‘ فطرت اور جبلت کی حکومت کا دائرہ تنگ ہو کر احساس‘ ارادہ اور اختیار کی شہنشاہی قائم ہوتی جاتی ہے اور حرکات و اعمال کی باگ فطرت و جبلت کے مضبوط اور ناممکن التغیر ہاتھوں سے نکل کر اختیار و ارادہ کے کمزور اور ہر آن بدل جانے والے ہاتھوں میں آ جاتی ہے۔ جمادات ہمیشہ وہی کریں گے جو ان کو کرنا چاہئے، نباتات عموماً وہی بنیں گے جو ان کو بننا چاہئے، حیوانات وہی کام انجام دیں گے جو ان کے سپرد کر دیا گیا ہے، لیکن انسان کسی قدر اختیار اور ارادہ پا کر اکثر اپنی راہ سے ہٹ جاتا ہے اور حدود اعتدال سے قدم باہر نکال دیتا ہے اور اپنے اس اختیار و ارادہ کی ذمہ داری کی امانت کو بھول جاتا ہے۔ انبیاءؑ اور رسولؑ وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس ذی ارادہ اور با اختیار مخلوق کو اس کی ذمہ داری کے فرائض سمجھانے کے لئے آتے ہیں۔

اس اختیار اور ارادہ کے مرکز کا نام مذاہب کی زبان میں ”دل“ ہے جو انسان کے سر سے لے کر پاؤں تک کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ کی ایک ایک ارادی جنبش و حرکت پر حکمران ہے اور اسی کے حکم سے اس جسم کے اندرونی عالم میں سب کچھ ہوتا اور سر انجام پاتا ہے۔ انبیاءؑ اسی دل کے نظام کو درست کرنے کے لئے آتے ہیں۔

انسان کو اپنے وجود‘ بقا‘ ترقی اور تکمیل کی ہر منزل میں قدم قدم پر ہزاروں چیزوں کی احتیاج ہوتی ہے۔ ان چیزوں کے مہیا اور تیار کرنے کے لئے ہر انسان میں استعداد و قوت الگ الگ ہوتی ہے اور یہ استعداد و قوت فیاض قدرت کی طرف سے پیدائش بلکہ پیدائش سے پہلے ہی آب و گل کے عالم میں اس میں ودیعت رکھی جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر انسان میں جس قسم کا میلان ہوتا ہے اسی کی استعداد اس میں پائی جاتی ہے اور پھر بعد کو خاص خاص فنی الہامات کے ذریعہ سے جن کو تم ایجادات اور اختراعات کہتے ہو، ہر پیشہ ور اپنے متعلقہ کام کو بڑھاتا ہے اور ترقی دیتا ہے اور تمہاری ضرورت کے مطابق تمہارے لئے سامان فراہم کرتا ہے۔

ان مادی ضروریات کے بنانے والوں کے حسب استعداد اور حسب حیثیت مختلف درجے اور مرتبے ہیں۔ بعض ان میں سے محض مقلد ہوتے ہیں جو وہی بنا سکتے ہیں جو بنانا سیکھا ہے‘ بعض چابک دست اور ذہین ہوتے ہیں جو اچھے کاریگروں کے صرف نمونوں کو دیکھ کر اچھی چیزیں تیار کر سکتے ہیں، بعض ایسے ذہین اور فطین ہوتے ہیں کہ وہ نئی نئی چیزیں

بناتے، دریافت کرتے اور ایجاد کرتے ہیں اور بعد کے آنے والے مدت تک انہیں کی تقلید کرتے رہتے ہیں، کاشتکاری کے اصول، ازالہ مرض کی تدبیریں، کھانے پکانے کے طریقے، سواری کی ضروریات، رہنے سہنے کے سامان، پہننے کے کپڑے، لڑنے کے آلات، ان میں سے ہر شے کی ضرورت ہے اور ان میں ہر ضرورت کے لئے خالق فطرت نے ایک ایک گروہ پیدا کر دیا ہے۔ وہ اپنے اپنے کام کو انجام دیتے رہتے ہیں۔ ان ضرورتوں کے فراہم ہو جانے سے انسان کی مادی زندگی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اب اس کے بعد اس کی روحانی اور اخلاقی زندگی کی ضروریات کا جن کو تم اصول تمدن، طریقہ معاشرت، آئین عدل و انصاف، اخلاق حسنہ اور دین و تقویٰ کے نام سے موسوم کرتے ہو، دور شروع ہوتا ہے۔ اگر یہ اصول اور تعلیمات انسانوں کے سامنے نہ ہوں تو آدم کے بیٹوں کی یہ جنت دوزخ ہو جائے اور اشرف المخلوقات کی یہ جماعت جانوروں کا گلہ اور درندوں کا جھنڈ بن جائے۔

جو تمہارے لئے غلہ پیدا کرتا ہے وہ کاشتکار ہے، اور جو اوزار بناتا ہے وہ لوہار ہے، جو زیور گھڑتا ہے وہ سونار ہے، جو تمہارے کپڑے بناتا ہے وہ جولاہا ہے، جو تمہارے مکان بناتا ہے وہ معمار ہے، جو تمہاری حفاظت کرتا ہے وہ سپاہی ہے، جو تمہاری نگہبانی کرتا ہے وہ حاکم ہے، جو تمہارے آپس کے جھگڑے چکاتا ہے وہ قاضی ہے، جو تمہارے ملک کے اندر امن و امان کا ضامن ہے وہ بادشاہ ہے، جو تمہاری جسمانی بیماریوں کا معالج ہے وہ طبیب ہے، جو اپنی صناعیوں سے تمہاری ضرورتوں کے لئے کاریگری کی چیزیں بناتا ہے وہ صناع ہے، اور جو تمہارے لئے مادی کائنات کے چہرہ سے اسرار کا پردہ ہٹا کر تم کو ہر چیز سے باخبر کرتا ہے وہ حکیم ہے۔

اسی طرح جو برگزیدہ افراد تمہارے روحانی و اخلاقی و اجتماعی حالات کے معلم و نگران ہیں، ان کی بھی ایک جماعت ہے لیکن جس طرح تمہارے مادی ضروریات کے بنانے والوں کے لئے حسب استعداد اور حسب حیثیت درجے ہیں اسی طرح ان روحانی ضروریات کے فراہم کرنے والوں میں بھی مرتبے اور درجے ہیں۔ بعض وہ ہیں جو صرف اگلے روحانی معلمین کی نقل و تقلید کرتے ہیں یہ عام علماء ہیں، بعض وہ ہیں جو اچھے روحانی نمونوں کو دیکھ کر خود بھی ان کی عمدہ نقل اتارتے ہیں اور دوسروں کو بھی بتاتے ہیں یہ مجددین ہیں، بعض ایسے ہیں جو الہام ربانی سے فیض پا کر روحانیت کے نئے نئے اصول وضع کرتے اور دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں یہ انبیاء ہیں۔ ان کے مقدس ہاتھ تمہارے لئے غلہ پیدا کرنے، مکان بنانے، کپڑا بنانے، اوزار بنانے اور صناعی کرنے کے لئے نہیں بلکہ ان سے بدرجہا بلند تر اور بہتر کام کے لئے ہیں۔ ان کی مبارک انگلیاں تمہارے ان تاروں پر پڑتی ہیں جن سے صدہا قسم کے نغمے نکل رہے ہیں یعنی تمہارے دل کی رگوں پر۔ غور کرو کہ یہ اصل مرکز جس پر تمہارے اعمال و افعال اور ہر قسم کی حرکات و سکنات اور ہر طرح کی جدوجہد کا مدار ہے یعنی ''دل'' کیا انبیاءؑ اور اس کے متبعین کے سوا نوع انسانی کوئی طبقہ اس کی نشو و نما، حفاظت، ترقی تکمیل اور اصلاح کے لئے بھی کام کر رہا ہے اور کیا خالق فطرت کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ مادی ترقی و اصلاح کی طرح، تمہاری روحانی ترقی و اصلاح کی بھی فکر کرتا ہے اور ایسا سمجھنا کہ اس نے اس کی ترقی و تکمیل و اصلاح کی خدمت نوع انسانی کے کسی کارکن طبقہ سے متعلق نہیں کی ہے، کیا اس کی شان ربوبیت کے ساتھ سوءظن نہیں ہے؟

یہی وہ طبقہ ہے جو تمام متفرق اور مختلف انسانی طبقوں کو باہم جوڑ کر ایک عام انسانی تمدنی سطح پر لایا ہے، وہ ان

سب کو جو تمہارے لئے روٹی تیار کرتے ہیں، کپڑے بنتے ہیں، جھونپڑے بناتے ہیں اور سامان اور اوزار درست کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مشارکت اور معاونت اور نیکی پر آمادہ کر کے ان میں روحانی برادری پیدا کرتے ہیں اور مٹی سے پیدا ہونے والے ایک آدم کے بیٹوں کو جن کو دولت وغربت، سوسائٹی اور مجلس، اور حکومت اور اقلیم اور جغرافی وقومی تقسیم نے پارہ پارہ کر رکھا ہے باہم جوڑ دیتے ہیں اور ان تمام مصنوعی امتیازات کو مٹا کر پوری زمین کو ایک ملک، تمام اقوام عالم کو اولادِ آدم اور کل بلند و پست طبقوں کو ایک انسانی طبقہ قرار دیتے ہیں اور ان کے اخلاقی و روحانی عالم میں اصلاح و ترقی اور امن وامان پیدا کر دیتے ہیں، ان کے دلوں سے بغض وکینہ کو نکال کر اخوت ومحبت کا نور بھرتے ہیں، ان کے احساس، ارادہ اور اختیار کی باگ پر ان کے دل کو قابو حاصل کرنے کی تدبیر بتاتے ہیں اور ان کو اعتدال کی حد بتا کر صحیح وغلط کی تمیز عطا کرتے ہیں۔

یہی وہ طبقہ ہے جس کو ہم نبی رسول اور پیغمبر کہتے ہیں ان کو گو براہ راست جسم وجسمانیات سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ صرف دل اور قلب وروح کے عالم سے سروکار رہتا ہے تاہم اس دل اور قلب وروح کی اصلاح کے لئے جسم وجسمانیات کی کسی قدر اصلاح بھی اس حد تک ان کے فرائض میں داخل ہے جہاں تک ان کو دل اور قلب وروح کے کاموں کی اصلاح کے لئے اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب:

اس مقام پر ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ افرادِ انسانی کے درمیان، امن وامان اور اطمینان پیدا کرنے کا کام تو بادشاہ بھی کرتے ہیں، اخلاق کا کام ایک معلّم بھی کرتا ہے، ایک فلسفی اور اجتماعیات کا ایک حکیم بھی کرتا ہے مگر ان کے کاموں کے درمیان جو عظیم الشان فرق ہے اس کو سمجھ لینا ہی اس شبہ کا ازالہ ہے۔ علمی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ مختلف فنون کے ماہر ایک ہی چیز پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالتے ہیں اور اسی اختلافِ نظر سے ان کا فن بھی علیحدہ علیحدہ ہو جاتا ہے۔ کسی جسم کے اجزائے ترکیبی سے اگر بحث کی جائے تو کیمسٹری ہے، اگر اس کی زندگی اور اسبابِ زندگی پر غور کیا جائے تو بیالوجی (علم الحیات) ہے، اگر اس کے دماغی قویٰ اور ان کے آثار کی تحقیق کی جائے تو سائیکالوجی (علم النفس) ہے اور اگر اس کے جذبات اور جذبات کے مطابق اس کے شخصی افعال واعمال کے حدود اور ان کے اسباب وعلل اور غرض وغایت پر نظر ڈالی جائے تو یہ اتھکس (فلسفہ اخلاق) ہے، اگر اس کے جماعتی خصائص اور لوازم کی تفتیش کی جائے تو یہ سوشیالوجی (علم اجتماع ومعاشرت) ہے، اگر جسم کی صحت ومرض کے اسباب کی جستجو کی جائے تو یہ طب ہے۔ دیکھو کہ ایک ہی جسم یا متعلق جسم پر کتنی حیثیتوں سے بحثیں کی گئی ہیں اور ان سے کتنے مختلف علوم پیدا ہو گئے ہیں؟ تاہم وہ سب کے سب جسم اور جسمانیات ہی سے متعلق اور وابستہ ہیں اور بایں ہمہ ان میں سے ہر ایک علم وفن علیحدہ اور ہر ایک علم وفن کے جاننے والے علیحدہ ہیں۔

اسی طرح ایک نبی اور ایک رسول کا کام بھی بادشاہوں، فلاسفروں اور حکیموں کی طرح انسانوں ہی کی اصلاح ہے مگر ان میں سے کسی ایک کا کام بھی دوسرے سے ملتا جلتا نہیں ہے، بادشاہ صرف اس کا ذمہ دار ہے کہ وہ اپنے زور وقوت

سے بازاروں، گلیوں، آبادیوں اور میدانوں میں امن وامان اور انصاف کو قائم رکھے، فلاسفر انسانوں کے تمام اعمال و خیالات کے اسباب وعلل کی تفتیش اور ان میں نظم وتسلسل اور علت ومعلول کا ربط پیدا کرنے کا کفیل ہے، فلسفہ اخلاق کے معلم تمہارے اخلاق و عادات کے اسباب وعلل تم کو بتاتے اور ناقابل فہم جذبات کی تشریح کرتے ہیں، اس سے آگے ان کا کوئی کام نہیں، حکیم اور واعظ تمہارے اعمال واخلاق کی اصلاح کے لئے نہایت شیریں خوشگوار اور ڈھلے ہوئے فقرے سناتے ہیں مگر ان میں سے کوئی نہیں جو تمہارے دلوں کا رہنما ہو۔ جو تمہارے احساس، ارادہ اور اختیار کے قدم کو غلط روی سے روک سکے۔ وہ نہ صرف تمہارے اخلاق و عادات اور جذبات کے اسباب وعلل بتائے بلکہ تمہارے اخلاق و عادات اور جذبات میں خیر وشر کی تمیز کرے اور خیر کے حصول اور شر سے حفاظت کی تدبیر بتائے بلکہ اس کے ہاتھ اور زبان میں یہ قوت ہو کہ اپنی تعلیم وتلقین وفیض صحبت سے تمہارے اخلاق و عادات و جذبات بلکہ احساس، ارادہ اور اختیار کی غرض و غایت بلکہ پورے دل کی قوتوں میں انقلاب پیدا کردے اور شر کے تخم کو دلوں کی سرزمین سے نکال کر خیر کا برگ وبار پیدا کردے۔ البتہ نبی یہ تمام کام سرانجام دیتا ہے۔ وہ انسانوں کو اس کے احساس ارادہ اور اختیار کی بھولی ہوئی ذمہ داری یاد دلاتا ہے اور ان قویٰ کے مرکز یعنی دل کو خدا کے حکم سے درست کردیتا ہے۔

وہ بادشاہوں کی طرح صرف بازاروں، مجمعوں اور آبادیوں کا امن واطمینان نہیں چاہتا بلکہ وہ لوگوں کے دلوں کے اندر کا امن واطمینان چاہتا ہے۔ وہ معلمین اخلاق کی طرح اسباب وعلل کی تلاش وجستجو کی تشریح کی پروا نہیں کرتا بلکہ اخلاق سیئہ خواہ کسی سبب سے ہوں، وہ ان کی بیخ کنی کرتا ہے اور اخلاق حسنہ خواہ کسی علت کے معلول ہوں، وہ ان کو انسانوں کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ انسانی اوہام کے طلسم کو توڑ دیتا ہے اور غلط رسوم ورواج کی بندشوں کو کھولتا ہے اور انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کر کے صرف خدا کی غلامی میں دیتا ہے۔

﴿ يَـأۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهٰهُمۡ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِىۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ ﴾ (اعراف۔۱۵۷)

وہ ان کو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے اور اچھائیوں کو ان کے لئے حلال اور خبیث چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے اور ان کے اس بندھن اور زنجیروں کو جو ان پر ہوتی ہیں ان سے اتارتا ہے۔

﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ لِئَلَّا يَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ ﴾ (نساء۔۶۵)

ایسے رسول بھیجے جو نیکوں کو خوشخبری دیتے اور بدکاروں کو ہوشیار کرتے ہیں تاکہ رسولوں کو اس وعظ وتذکیر کے بعد پھر انسانوں کو خدا پر الزام دینے کا موقع نہ ملے (کہ ہم بھولے تھے تو خدا نے ہم کو کیوں نہ یاد دلایا)

﴿ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَيِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِيۡزَانَ لِيَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ﴾ (حدید۔۶۵)

ہم نے رسولوں کو کھلی ہدایتیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو، تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں اور (دنیا میں امن واطمینان کی زندگی بسر کریں)

نوع انسانی کے دوسرے تمام خدام اور کارکن اپنے فرائض کو جن اغراض سے انجام دیتے ہیں ان کا دائرہ موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی سے آگے نہیں بڑھتا مگر انبیاءؑ اور رسول نوع انسانی کی خدمت کے یہ کام بھی اس کی

موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی کو اس لحاظ سے سامنے رکھ کر کرتے ہیں کہ ان کا اثر اس کی دوسری دائمی و پائدار زندگی پر کیا پڑے گا۔ وہ جسم کی خدمت، جسم کے لئے نہیں بلکہ روح کے لئے کرتے ہیں اور مخلوق کی خدمت خالق کے منشاء کے مطابق بجالاتے ہیں۔ وہ صرف ایک مخلوق کو دوسری مخلوق ہی سے نہیں بلکہ مخلوق کو خالق سے اور خالق ہی کے لئے ایک مخلوق کو دوسری مخلوق سے جوڑتے ہیں۔

وہ صرف اچھی اچھی اور میٹھی میٹھی باتیں لوگوں کو نہیں سناتے بلکہ خود بہتر سے بہتر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کا عامل بناتے ہیں۔ وہ خیال آراء شاعروں اور جھوٹے حکیموں کی طرح نہیں ہوتے جو کہتے ہیں اور کرتے نہیں، دماغ ہوتے ہیں مگر دل نہیں ہوتے، زبانیں ہوتی ہیں مگر ہاتھ نہیں ہوتے۔

﴿ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ o اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ o وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَالَا يَفْعَلُوْنَ ﴾ (شعراء۔۲۴۔۲۵)

اور شاعروں کے پیروکار گم کردہ راہ ہوتے ہیں۔ تم دیکھتے نہیں کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور وہ وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔

وہ اس دعوٰی کے ساتھ انسانوں میں آتے ہیں کہ ان کے خالق نے جس نے ان کے ذرہ ذرہ کا سامان راحت فراہم کیا ہے وہی ان کے قلب و روح کا سامان راحت بھی بہم پہنچاتا ہے، ان کو اس لئے بھیجا ہے کہ انسانوں کے قلب و روح کو اس سامان کو برتنا سکھائیں اور ان کے رب کا پیغام ان کو سنائیں اور بتائیں کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اپنے احساس، اپنے ارادہ اور اپنے اختیار کو کس طرح اس عالم میں صرف کریں کہ وہ پریشانی و بے اطمینانی کی تاریکی سے نکل کر سکون واطمینان اور امن وسعادت کی روشنی میں داخل ہوں۔

﴿ هُوَالَّذِیْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ط وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (حدید۔۹)

وہی خدا جو اپنے (رسول) بندے پر کھلی آیتیں اتارتا ہے کہ تم کو (اے انسانو!) وہ تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائے (اور اللہ نے ایسا اس لئے کیا) کہ وہ تم پر شفقت کرنے والا مہربان ہے

انبیاء بھی ایک بادشاہ کی طرح جماعتوں کا انتظام کرتے ہیں مگر ملک کے خراج اور زمین کی آبادی کے لئے نہیں بلکہ خدا کے لئے، وہ بھی جان و مال کی حفاظت کے لئے مقنن کی طرح قانون بناتے ہیں اور قاضی کی طرح سزا و جزا کا حکم سناتے ہیں مگر انعام شاہی اور تنخواہ ماہانہ پا کر کسی دنیاوی بادشاہ کے فرمان کی تعمیل کے لئے نہیں بلکہ جسم و جان کے شہنشاہ اور کائنات کے مالک کے فرمان کی تعمیل میں، وہ بھی فلاسفر کی طرح رموز و اسرار کا پردہ فاش کرتے ہیں مگر تجربہ استقراء اور قیاس سے نہیں بلکہ عالم الاسرار کے مبدء علم سے فیض پا کر، وہ بھی حکیم وواعظ کی طرح پرتاثیر کلام کرتے ہیں مگر ان کے مانند اپنے دل سے جوڑ کر نہیں بلکہ خدا سے سن کر، اور وہ صرف کہتے نہیں بلکہ جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں اور جو کرتے ہیں وہ دوسروں سے کراتے ہیں۔ وہ خدا سے ہیں، خدا سے پاتے ہیں اور اسی سے سنتے ہیں اور وہی اوروں کو سناتے ہیں۔ غرض اوپر آسمان سے ان کو جو کچھ ملتا ہے وہی نیچے زمین پر سب کو بانٹتے ہیں۔

﴿ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی o مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی o وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی o اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰی o عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰی o ذُوْمِرَّةٍ فَاسْتَوٰی o وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی o فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰی o مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَارَاٰی o اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَايَرٰی o مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی o لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی ﴾ (وا لنجم۔۱۔۱۸)

قسم ہے اس ستارہ کی جب وہ نیچے گرے، کہ تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ بھولا، نہ بھٹکا‘ اور نہ وہ نفس کی خواہش ہی سے بات کرتا ہے۔ وہ تو وہ ہے جو اس کو وحی کے ذریعہ سے کہا جاتا ہے۔ اس کو بڑی بڑی قوتوں والے ہی نے سکھایا‘ طاقت والا‘ تو وہ سیدھا ہوا درآنحالیکہ وہ آسمان کے سب سے اوپر کناروں میں تھا تو اس نے اپنے بندہ پر وحی کی۔ جو وحی کی نہ اس کے دل نے جو اس نے دیکھا‘ اس کو جھوٹ کہا‘ کیا وہ جو دیکھتا ہے تم اس پر اس سے جھگڑتے ہو، نہ بینائی نے کجی کی اور نہ سرکشی کی‘ اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے دیکھا۔

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰی اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾
(سورۃ اعراف۔۲۴)

کہہ دے (اے پیغمبر) کہ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے، یہ (اے انسانو!) تمہارے رب کی طرف سے بصیرتیں ہیں اور ان کے لئے جو ایمان رکھتے ہیں ہدایت اور رحمت ہیں۔

﴿ وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ o عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ o بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴾ (شعراء۔۱۹۲۔۱۹۵)

یہ تو عالم کی پرورش کرنے والے کی طرف سے اتارا گیا ہے‘ اس کو امانت والی روح نے تیرے دل پر اتارا تا کہ فصیح عربی زبان میں تو ہشیار کرنے والوں میں سے ایک ہو۔

نکتہ:۔ بالکل ممکن‘ بلکہ واقعہ ہے کہ ایک ہی قسم کا کام مختلف لوگ مختلف غرض ونیت سے کرتے ہیں۔ کسی قوم کی اصلاح ہی کا کام ہے کہ اس کو مختلف لوگ مختلف غرض ونیت سے کرتے ہیں۔ خودغرضی کے غیر مخلصانہ اغراض سے قطع نظر کر کے صرف مخلصانہ اغراض کو لو‘ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ قوم کی مالی حالت کی درستی سے قوم بن سکتی ہے‘ کوئی اصلاح کی جڑ تعلیم کو قرار دیتا ہے‘ کوئی رسم ورواج اور معاشرت پر زور دیتا ہے‘ کوئی ظاہری تمدن پر مدار رکھتا ہے‘ کوئی جسمانی قوت پر بھروسہ رکھتا ہے، کوئی سیاسی کامیابی کو قومی اصلاح کا مرکز ٹھہراتا ہے‘ لیکن انبیاءؑ کے نزدیک یہ سب ثانوی درجہ کی باتیں ہیں وہ اپنی بنیاد صرف قلب کی اصلاح پر رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی اصلی چیز ہے اور تمام دوسری ترقیوں اور اصلاحوں کو وہ یکسر اسی ایک اصل کی فروع اور اسی ایک جڑ کی شاخیں جانتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ ان کی دعوت کی کامیابی سے قوموں کو سلطنت بھی ملتی ہے‘ دولت بھی ہاتھ آتی ہے‘ علم بھی حاصل ہوتا ہے‘ زور اور قوت بھی پیدا ہوتی ہے‘ اور دنیاوی عظمت وجلال کا ہر منظر خادمانہ اس کے استقبال کے لئے آگے بڑھتا ہے‘ مگر یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ سیاسی مصلحین کی طرح قوت وطاقت ان کا مطمع نظر نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ ان کے سامنے ہوتا ہے وہ صرف خدا کی اطاعت‘ خدا کی محبت اور خدا کی خوشنودی ہوتی ہے، باقی تمام چیزیں ان کی نگاہ میں فرعی‘ ثانوی اور ضمنی ہوتی ہیں۔

نبی اور غیر نبی کے امتیازات:

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ انبیاءؑ اور ان کے مشابہ اشخاص میں کتنا عظیم الشان فرق ہے۔ یہ فرق چار حیثیتوں سے نمایاں ہے۔ مبدا اور منبع کا فرق‘ غرض و غایت کا فرق‘ طریق دعوت کا فرق اور علم و عمل کا فرق۔ نبی کے علم کا مبدا‘ منبع‘ ماخذ اور سرچشمہ جو کچھ کہو وہ تعلیم ربانی‘ شرح صدر اور وحی والہام ہوتا ہے اور حکیم کے علم کا ماخذ و منبع تعلیم انسانی‘ گذشتہ تجربہ استقراء اور قیاس سے ہوتا ہے یعنی حکیم عقل سے جانتا ہے اور نبی خالق عقل سے۔ اسی طرح ایک حکیم کے تمام اقوال اور جدوجہد کا منشاء اپنی شہرت طلبی‘ علم کا اظہار‘ قوم یا ملک کی محبت کی خاطر اس کی اصلاح ہوتا ہے مگر ایک نبی کا مقصد خدا کے حکم کا اعلان اور خالق کی رضامندی کے لئے مخلوق کی بھلائی ہوتا ہے۔ طریق دعوت کا فرق یہ ہوتا ہے کہ حکیم اپنی دعوت کی عمارت تمام تر حکمتوں‘ مصلحتوں اور علل و اسباب کے ستونوں پر کھڑا کرتا ہے لیکن نبی اپنی دعوت کو زیادہ تر خالق کی اطاعت‘ محبت اور رضا جوئی پر قائم کرتا ہے۔ حکیم کہتا ہے لیکن اس کا کرنا اس کے لئے ضروری نہیں۔ نبی جو کہتا ہے وہ کرتا ہے اور اس کا کر کے دکھانا اس کے لئے ضروری ہے۔ وہ صرف جلوت کے منبر پر جلوہ نما نہیں ہوتا بلکہ وہ جلوت و خلوت اور ظاہر و باطن میں یکساں حسنات سے آراستہ اور برائیوں سے پاک ہوتا ہے۔ دنیا میں سقراط‘ افلاطون‘ ارسطو‘ دیوجانس وغیرہ ایک طرف اور ابراہیمؑ ‘ موسیٰؑ ‘عیسیٰؑ ‘ محمد ﷺ دوسری طرف ہیں اور دونوں کے سوانح اور سیرتیں اور کارنامے بالکل نمایاں اور ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں کہ ان میں ذرا التباس نہیں۔

بادشاہ اپنی تلوار کے زور اور اپنی فوج ولشکر کی قوت سے رعایا کو اپنے قانون کا پابند بناتے ہیں تاکہ فتنہ وفساد رک جائے‘ فلاسفر اپنے دعوؤں کو صرف استدلال کی قوت اور عقل کے خطاب سے ثابت کرنا چاہتے ہیں تاکہ لوگ ان کی بات تسلیم کریں‘ لیکن پیغمبرؑ اپنے پیرووں کے قلب کو اس طرح بدل دینا چاہتے ہیں کہ وہ ازخود برائی کو چھوڑ کر نیکی اختیار کرلیں وہ اگر کبھی قانون وحدوسزا کو اختیار کرتے ہیں یا ساتھ ساتھ عقل کو بھی مخاطب کرتے ہیں تو ان کا یہ ضمنی یا ثانوی کام ہوتا ہے اولین نہیں۔ ان کی اولین غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کے پیرووں کو خدا کی قدرت اور اس کے حاضر وناظر ہونے کا اتنا محکم اور پختہ یقین ہو جائے کہ وہ اس کے حکموں اور نصیحتوں کو جو ان کے ذریعہ آتی ہیں، بے چون وچرا تسلیم کرلیں۔

دنیا کے بادشاہ اور فاتح اور کشور کشا اپنے زور بازو اور تلوار کی قوت سے دنیا کے تختے الٹ دیتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کبھی چار دانگ عالم پر حکمرانی کی‘ قوموں کی جان و مال پر اپنا قبضہ اقتدار جمایا، ان کی تلواروں کی دھاک نے آبادیوں اور مجمعوں کے مجرموں کو روپوش کردیا، اور بازاروں اور راستوں میں امن وامان پیدا کردیا لیکن کیا انہوں نے دلوں کے طبقے بھی الٹے؟ اپنی سلطنت کے دائرہ سے باہر کسی کمزور سے کمزور انسان سے اپنے حکم کو منوا سکے؟ وہ لوگوں کے دلوں کو بھی اپنے قبضہ اقتدار میں لا سکے؟ وہ آبادیوں اور مجمعوں کے روپوش مجرموں کو بھی فنا کرسکے؟ وہ دلوں کی بستیوں میں بھی امن وامان پیدا کرسکے؟ وہ روحوں کی مملکتوں کا بھی نظم ونسق قائم کرسکے؟

حکماء اور فلاسفر جو اپنی عقل رسا کے ذریعہ سے عجائبات عالم کی طلسم کشائی اور کائنات کے مخفی اسرار کے فاش کرنے کے مدعی ہیں، کیا وہ قلب وروح کے عجائبات کو دریافت کرسکے؟ وہ ماورائے مادہ اسرار ورموز کو بھی حل کرسکے؟ وہ

انسانوں کی اصلاح و ہدایت کا بھی کوئی سامان اپنی تحقیق وتفتیش سے فراہم کر سکے؟ ان کی دقیق نکتہ سنجیوں اور خیال آرائیوں کے پیچھے ان کے ذاتی حسن عمل کا بھی کوئی نمونہ ہے؟ ارسطو نے فلسفہ اخلاق کی بنیاد ڈالی، دوسرے حکماء نے اخلاق کے اسباب وعلل کے حدود، ظہور، اثر اور نتیجہ کے ایک ایک حرف کی تحقیق کی، مگر کیا اس سے کسی انسان کے دل سے برائی کا تخم دور ہوا، اچھائی کے بیج نے نشوونما پائی، ان کے اخلاق وتعلیمات کے فلسفیانہ رموز واسرار کا دائرہ ان کی درسگاہوں کی چہار دیواریوں سے کبھی آگے نہ بڑھ سکا؟ کیونکہ وہ اپنے درس کے کمروں سے نکل کر جب انسانی صحبتوں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی اخلاقی زندگی اور قلبی صفائی عام انسانی افراد سے ایک انچ بھی بلند نہیں ہوتی۔ حکمائے یونان میں سقراط سے بڑھ کر کوئی نہیں، مگر کیا یہ وہی نہیں، ہے جو بازار کی فاحشہ عورتوں سے ارتباط رکھتا تھا اور ان میں ایک پیشہ کے فروغ اور کامیابی کے لئے کوشاں رہتا تھا۔ یہی یونان کے دوسرے حکماء کا حال تھا اور توحید وخدا پرستی تو اس سے بدرجہا بلند ہے جس کی ان کو ہوا بھی نہیں لگی تھی۔

ان سطروں سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ہر شیریں نوا واعظ، ہر موثر البیان خطیب، ہر دقیقہ رس مقنن، ہر کشورکشا فاتح اور ہر نکتہ دان حکیم اس لائق نہیں کہ نبوت ورسالت کا اہم اور بلند اور مقدس منصب اس سے منسوب کیا جائے۔ اس منصب کے ساتھ کچھ ایسے شروط، لوازم اور خصوصیات بھی وابستہ ہیں جو اس کے ضروری اجزاء اور عناصر ہیں:-

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس کا تعلق پراسرار عالم غیب سے ہو۔ وہ عالم غیب کی آوازیں سنتا ہو، غیب کی چیزیں دیکھتا ہو، غیب سے علم پاتا ہو، علم ملکوت کی تائید اس کے ساتھ ہو، روح القدس اس کا ہم سفر وہم نوا ہو۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام بندوں میں سے اس کے لئے چنا ہو کہ وہ اس بلند منصب پر سرفراز ہو۔

۳۔ اس سے خدا کے حکم سے عجیب وغریب اور حیرت انگیز تصرفات صادر ہوں جن سے اس کا مقبول بارگاہ ہونا ثابت ہو۔

۴۔ فضائل واخلاق کے پھولوں سے اس کا دامن بھرا ہو اور ہر قسم کے گناہ کے خس وخاشاک سے پاک و صاف ہو کہ گندے ہاتھوں سے میلے کپڑے پاک وصاف نہیں ہو سکتے۔

۵۔ وہ لوگوں کو خدا اور عالم غیب پر یقین کی دعوت اور فضائل واخلاق کی تعلیم دے اور روز الست کا بھولا ہوا عہد ان کو یاد دلائے۔

۶۔ نہ صرف تعلیم بلکہ اس میں قوت ہو کہ وہ شریروں کو نیک اور گمراہوں کو راست رو بنا دے اور جو خدا سے بھاگے ہوں ان کو پھیر کر پھر اس کے آستانہ پر لے آئے۔

۷۔ اپنے سے پہلے خدا کی طرف سے آئے ہوئے صحیح اصول کو انسانی تصرفات سے پاک وصاف کر کے پیش کرے۔

۸۔ اس کی دعوت وجدوجہد اور تعلیم وتلقین سے مقصود کوئی دنیاوی معاوضہ، شہرت، جاہ طلبی، دولت مندی، قیام سلطنت وغیرہ نہ ہو بلکہ صرف خدا کے حکم کی بجا آوری اور خلق خدا کی ہدایت ہو۔

یہ نبوت ورسالت کے وہ اوصاف اور لوازم ہیں جو دنیا کے تمام پیغمبروں میں یکساں پائے جاتے ہیں۔ مذاہب

عالم کے صحیفوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف اور آشکارا ہو جاتی ہے، خصوصاً قرآن پاک نے، جو دنیا کی نبوت کا سب سے آخری اور سب سے مکمل صحیفہ ہے اور جس نے نبوت و رسالت کی حقیقت اور شرائط و لوازم کی سب سے بہتر تشریح کی ہے۔ سورۂ انعام میں اکثر پیغمبروں کا ذکر کر کے یہ حقائق ان الفاظ میں بیان کئے ہیں۔

﴿وَتِلْكَ حُجَّتُنَا اٰتَيْنٰهَاۤ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ؕ قُلْ لَّاۤ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ﴾ (انعام۔ ۸۴۔ ۹۱)

اور یہ تھی ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے مقابلہ میں دی۔ ہم جس کو چاہتے ہیں کئی درجے بلند کرتے ہیں، بے شبہ تیرا پروردگار تدبیر والا خبردار ہے۔ اور ہم نے ابراہیمؑ کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ بخشے اور ہر ایک کو ہدایت دی اور نوحؑ کو اس سے پہلے ہدایت دی تھی اور اس کی اولاد میں داؤدؑ اور سلیمانؑ اور ایوبؑ اور یوسفؑ اور موسیٰؑ اور ہارونؑ کو، اور اسی طرح ہم نیکوکاروں کو بدلہ دیتے ہیں، اور زکریا اور یحییٰؑ اور عیسیٰؑ اور الیاسؑ کو ہر ایک نیکوکاروں میں سے، اور اسمٰعیلؑ اور الیسعؑ اور یونسؑ اور لوطؑ کو ہر ایک کو بزرگی بخشی دنیا والوں پر، اور ان کے باپ دادوں اور بھائیوں میں سے، اور ہم نے ان کو چن کر پسند کیا اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے، اس پر وہ چلاتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا برباد ہو جاتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حق و باطل میں فیصلہ کرنا (حکم) اور نبوت دی تو اگر کوئی ان باتوں سے انکار کرے تو ہم نے ان باتوں پر ایسے دوسروں کو مقرر کیا ہے جو ان کا انکار نہیں کرتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے ہدایت دی۔ اے محمد! تو بھی انہیں کی رہنمائی کی پیروی کر اور کہہ میں اپنے کام کی تم سے مزدوری نہیں چاہتا، یہ قرآن تو دنیا والوں کو یاد دلانا ہے۔

ان آیتوں میں اکثر پیغمبروں کے نام لے کر ان کے پیغمبرانہ اوصاف گنائے ہیں۔ اگر ہم ان کو یکجا کر دیں تو نبوت و رسالت کے عام اوصاف خصوصیات اور لوازم واضح ہو جائیں۔

۱۔ فرمایا ”ہم نے ابراہیمؑ کو دلیل دی“ اور ہم نے ان کو ہدایت بخشی جس سے معلوم ہوا کہ ان کے علم اور ہدایت کا سرچشمہ عالم ملکوت سے ہوتا ہے۔

۲۔ ارشاد ہوا کہ ”ہم نے ان کو سیدھی راہ چلایا“ اور ”یہ سب نیکوکار تھے“ اس سے ثابت ہوا کہ وہ معصوم اور گناہوں سے بے داغ ہوتے ہیں۔

۳۔ یہ بھی کہا کہ ”ہم نے ان کو چن کر پسند کیا“ اور ”جس کو چاہیں اپنے بندوں میں سے یہ ہدایت عطا کریں“

جس سے یہ مقصود ہے کہ یہ منصب سعی و محنت سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی اور انتخاب سے ملتا ہے۔

۴۔ فرمایا کہ "ہم نے ان کو کتاب حق و باطل کے فیصلہ کی طاقت (حکم) اور احکام غیب کی تعلیم (نبوت) دی" اس سے معلوم ہوا کہ اس منصب والوں کو کیا کیا چیزیں عطا ہوتی ہیں۔

۵۔ حکم ہوا کہ "ان کی رہنمائی کی پیروی کر" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی اور دعوت پر مامور ہوتے ہیں اور لوگ ان کی پیروی سے نیکوکار اور صالح بنتے ہیں۔

۶۔ فرمایا کہ "اے پیغمبر! یہ کہہ دے کہ میں اپنے کام کا کوئی معاوضہ یا بدلہ تم سے نہیں چاہتا۔ یہ تو اہل دنیا کے لئے نصیحت اور یاد دلانا ہے" اس سے ثابت ہوا کہ خالق کی خوشنودی اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی خیر خواہی اس کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا مقصود اور مطمع نظر نہیں ہوتا۔

دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ خاص محمد رسول اللہ ﷺ کے تعلق و نسبت سے ان حقیقتوں کو قرآن پاک نے کئی دفعہ بتصریح بیان کیا ہے جن میں سے چار باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں:-

۱۔ اشیائے غیب، امور خیر اور فلاح و سعادت کے اسباب پر اس کا علم خدا کی تعلیم سے کامل ہو۔

۲۔ وہ اپنے علم کے مطابق اپنے عمل میں کامل اور راست باز ہو۔

۳۔ وہ دوسروں کو ان امور کی تعلیم دیتا ہو۔

۴۔ اور ان کو بھی اپنی تعلیم اور صحبت کے فیض سے حسب استعداد کامل بناتا ہو۔

قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر آپ کی نسبت یہ فرمایا گیا۔

﴿ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (بقرہ و جمعہ)

وہ رسول ان پڑھوں کو خدا کی باتیں سناتا اور ان کو پاک و صاف بناتا، اور ان کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔

اس مختصر سی آیت میں ان چاروں مذکورۂ بالا امور کو یکجا ذکر کیا ہے۔ جاہلوں کو آیات الٰہی پڑھانے اور کتاب و حکمت سکھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ خود اس کو آیات الٰہی پڑھائی اور کتاب و حکمت سکھائی گئی ہوں، اور دوسروں کو پاک و صاف بنانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود پاک و صاف ہو کہ ایک جاہل اپنے ہی جیسے دوسرے جاہل کو عالم، اور ایک ناپاک اپنے ہی جیسے دوسرے ناپاک کو پاک نہیں بنا سکتا۔ ایک دوسری آیت میں ہے۔

﴿ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ۝ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ﴾ (اعلیٰ ۶۔۱۱)

ہم تجھے پڑھائیں گے تو تو نہیں بھولے گا، مگر جو اللہ چاہے۔ وہ جانتا ہے پکار اور چھپا، اور ہم تجھے آہستہ آسانی تک پہنچائیں گے، اور تو سمجھا، اگر تیرا سمجھانا فائدہ دے، جس کو خدا کا لحاظ ہوگا وہ سمجھے گا اور جو بدبخت ہوگا وہ اس سے پرہیز کرے گا۔

ایسا پڑھانا جس میں بھول نہ ہو "پیغمبر کی روحانی تعلیم ہے" اور آسانی کی منزل کی طرف اس کو آہستہ آہستہ لے چلنا اور اس کے لئے اس کٹھن منزل کو آسان کر دینا اس کے ذاتی عمل کو کمال درجہ تک اس طرح پہنچا دینا ہے کہ تمام امور

خیر اس سے بسہولت از خود صادر ہونے لگیں پھر اس کو دنیا کے ”سمجھانے“ پر مامور کرنا اس رمز کو آشکارا کرنا ہے کہ دوسروں کی تعلیم و تذکیر کا منصب اس کو ملا ہے، اس کے بعد یہ فرمانا کہ ”متقی اس نصیحت سے فیض پائیں گے اور بد بخت محروم رہیں گے“ اس کی تشریح یہ ہے کہ ناقصوں کی تکمیل اور ذی استعداد لوگوں کو ان کی استعداد کے مطابق فیض پہنچانا بھی اس کا فرض ہے۔ [1]

نبوت کے لوازم اور خصوصیات:

نبوت کی شرح حقیقت اور اس کے ضروری لوازم اور خصوصیات کے اجمالی بیان کے بعد ضرورت ہے کہ نبوت کے چند اہم خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کی جائے تا کہ وقت کی بہت سی غلط فہمیوں کا سد باب ہو، لیکن ان خصوصیات کے ذکر سے پہلے خود ہم کو ”خصوصیت“ کو سمجھنا ہے کہ اس سے مقصود کیا ہے؟

دنیا میں ہر نوع اور ہر نوع کے ماتحت ہر صنف میں کچھ نہ کچھ مخصوص صفات ہوتی ہیں۔ یہ مخصوص صفات اس نوع اور صنف کے ہر فرد میں یکساں پائی جاتی ہیں۔ انہیں کو ہم لوازم اور خصوصیات کہتے ہیں۔ پھل، پھول، چوپائے، پرندے اور انسان تمام انواع میں کچھ نہ کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور انہیں خصوصیات کی بناء پر ہر نوع دوسرے سے ممتاز اور ہر صنف دوسرے سے علیحدہ ہے۔ گلاب میں خاص قسم کا رنگ، خاص قسم کی خوشبو، خاص قسم کے پتے ہوتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی گلاب ہو اور اس میں یہ چیزیں نہ پائی جائیں۔ لیکن گلاب کی بھی مختلف صنفیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسی لازمی صفات ہوتی ہیں جن سے گلاب کی ہر صنف (قسم) دوسری صنف (قسم) سے علانیہ الگ نظر آتی ہے۔

اسی طرح انسانیت کے کچھ خاص لوازم ہیں۔ دو ہاتھ، دو پاؤں، سید ھا قد، بولنے کی طاقت، سمجھ و بوجھ اور غور و فکر کی اہلیت، ایجاد و اختراع کی قوت، انجام بینی اور مآل اندیشی کی صلاحیت وغیرہ اس کے خواص ہیں اور جس طرح شہد میں مٹھاس، حنظل میں کڑواپن، آگ میں گرمی اور برف میں ٹھنڈک نوعی خواص کی حیثیت سے خود بخود پیدا ہو گئی ہیں اسی طرح انسان میں انسانیت کی مذکورۂ بالا خاصیتیں فطرتاً ودیعت ہیں لیکن اس وصفِ انسانیت میں اشتراک کے ساتھ گلاب کے اصناف کی طرح نوع انسانی کے بھی مختلف اصناف ہیں جیسے ہندی، چینی، حبشی، رومی، ایشیائی اور یورپین وغیرہ۔ دیکھو کہ ان میں سے ہر ایک صنف میں انسانیت کے اشتراک کے باوجود قد و قامت، چہرہ مہرہ، رنگ و روغن، صورت و شکل اور اخلاق و عادات وغیرہ بیسیوں چیزوں کا نمایاں امتیاز ہوتا ہے اور یہ تمام اصناف انسانی جو مختلف آب و ہوا، مختلف مرز و بوم، مختلف نسل اور مختلف ماحول سے تعلق رکھتے ہیں انسان ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے صریحاً ممتاز ہیں۔

اسی طرح ہر صنف انسانی کے اندر مختلف افراد ہیں۔ خلاق فطرت نے ان میں سے ہر ایک کو مختلف قابلیتیں عطا کی ہیں۔ شاعری، زبان دانی، فلسفہ، ریاضی، صناعی، باغبانی، معماری، پہلوانی، سینکڑوں مختلف قسم کی انسانی استعداد کی

---

[1] یہ تشریح اور طریقہ استدلال امام رازی نے اپنی تفسیر اور بعض کتب کلامیہ میں اختیار کیا ہے۔

خصوصیتیں دوسروں سے الگ ہیں۔ ایک تخیل پسند شاعر اور ایک حقیقت شناس ریاضی دان میں عظیم الشان فرق ہوتا ہے ادب و انشاء کے خیالی بلند پرواز' عموماً ریاضیات جیسے ٹھوس اور واقعی علوم سے کورے ہوتے ہیں اور واقعیات سے لبریز ریاضیات کے جاننے والے' ادب و شاعری سے بیگانہ' پہلوانی کے جوہر باغبانی سے الگ ہیں اور ایک صناع کی طبیعت ایک فلسفی سے متضاد ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ صنف شعراء میں خاص دماغی قابلیت کا اتحاد ہوتا ہے۔ نظم کی قوت' تخیل کی بلندی' محاکات کی قدرت' الفاظ کا زور' معانی کا جوش' یہ تمام شعراء کی مخصوص صفات ہیں، اسی طرح تمام فلسفیوں کی ایک خاص دماغی کیفیت ہوتی ہے۔ خاموشی' غور و فکر' دقت نظر' خارجی عالم سے بے پروائی' تصور میں انہماک' خلوت گزینی' اخلاق کی خشکی' الغرض مرز و بوم اور آب و ہوا کے اختلاف کی بناء پر جو اصناف انسانی پیدا ہوتے ہیں ان میں بھی یہ اختلاف و امتیاز نظر آتا ہے۔

ہنی بال و نپولین و چنگیز دم کے دم میں آبادی کو ویرانہ اور ویرانہ کو آبادی پہاڑ کو میدان اور میدان کو پہاڑ بنا سکتے تھے مگر وہ بیٹھ کر فلسفہ اخلاق پر چند صفحے نہیں لکھ سکتے تھے، افلاطون تنہائی میں بیٹھ کر جمہوریت کا فلسفیانہ خاکہ تیار کرسکتا تھا، مگر ایتھنز کے تخت پر بیٹھ کر ایک لمحہ حکمرانی کا فرض انجام نہیں دے سکتا تھا، سلطان محمود کے درباری شاعر فردوسی نے اپنی طبیعت کے زور سے سینکڑوں خیالی سومنات کے معرکے فتح کیے لیکن پتھر کی ایک چٹان پر بھی کلہاڑی نہ مار سکا، اس کے برخلاف سلطان محمود فوجوں کے دل کے ساتھ پہاڑوں کو چیرتا' دریاؤں کو پھاڑتا' اور ریگستانوں میں پانی بہاتا ہوا' غزنی سے چل کر گجرات کے کناروں تک پہنچ گیا اور سومنات کے سنگی قلعہ اور مجسمہ کو چکنا چور کر ڈالا مگر فردوسی کی طرح تنہا بیٹھ کر وہ خیالی شاہنامہ کا ایک معرکہ بھی فتح نہیں کرسکتا تھا۔

ان مثالوں سے یہ ثابت ہوا کہ نوع انسانی میں اشتراک کے باوجود اصناف انسانی کی ہزاروں قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر قسم و صنف کے الگ الگ خصوصیات' صفات اور لوازم ہیں۔ انہیں مختلف اصناف انسانی میں انبیاء علیہم السلام کی بھی ایک صنف ہے اور نوع انسانی کی اس مقدس صنف کے بھی چند خاص اوصاف خصوصیات اور لوازم ہیں جو ان کو دوسرے اصناف انسانی سے علانیہ ممتاز بناتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب ہم کو اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنی چاہئے کہ نبوت و رسالت کے اہم لوازم اور خصوصیات کیا ہیں۔

وہبی استعداد:

ان میں سب سے پہلی چیز وہبی استعداد ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ مختلف انسانوں میں مختلف قسم کی فطری استعدادیں پائی جاتی ہیں اور انہیں کی طرف ان کا طبعی میلان ہوتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں ان کی استعداد اور میلان طبع کا جوہر برگ و بار پیدا کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک خاص مقررہ مدت میں جا کر وہ پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔ جس طرح ہر درخت سے آم کا پھل پیدا نہیں ہوسکتا بلکہ اسی سے ہوگا جس کو خدا نے آم کا درخت بنایا ہے پھر آم کے درخت کے آثار و خواص' پھل' اس کا مزہ، اس کا رنگ و بو، غرض جملہ خصوصیات خود اس درخت میں اسی وقت موجود ہوتے ہیں جب وہ ہنوز تخم کی صورت میں ہوتا ہے۔ وہی تخم پودا بنتا ہے' پودا بڑھتا ہے، کونپل اور شاخیں پیدا کرتا

ہے اور چند سال میں پھل دینے لگتا ہے لیکن اپنی ترقی کے ہر دور میں وہ اپنی مخفی خصوصیات وہی رکھتا ہے جو ایک دن اس سے آخر میں ظاہر ہونے والے ہیں اور اس پھل کی صفت ہمیشہ اس میں بالقوہ موجود تھی۔

اسی تمثیل کے مطابق یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر انسان کوشش سے نبی نہیں ہوسکتا بلکہ وہی ہوسکتا ہے جس کو خدا نے نبی بنایا ہے اور نبوت کے یہ آثار و خواص اور کیفیات اس میں بالقوہ اور استعداد کی صورت میں اسی وقت سے موجود رہتے ہیں جب وہ ہنوز آب و گل کے عالم میں ہوتا ہے۔ شاید آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا کہ ''میں اس وقت نبی تھا جب آدم ہنوز آب و گل میں تھا[1] اسی قسم کا مطلب ہوگا۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ عرصہ وجود میں قدم رکھتے ہیں اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار ان سے ظاہر ہونے لگنے سے ہیں۔ وہ حسب و نسب اور سیرت وصورت میں ممتاز ہوتے ہیں، شرک و کفر کے ماحول میں ہونے کے باوجود اس کی گندگی سے بچائے جاتے ہیں، اخلاق حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں، ان کی دیانت، امانت، سچائی، راست گفتاری مسلم ہوتی ہے اور یہ تمہیدیں اس لئے ہوتی ہیں تاکہ منصب ملنے کے بعد ان کے دعوائے نبوت کی تصدیق اور لوگوں کے میلان خاطر کا سامان پہلے ہی سے موجود رہے حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان، حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ اور محمد رسول اللہ صلوٰت اللہ علیہم کے حالات و واقعات قبل نبوت پڑھو تو ہمارے اس دعویٰ کی سچائی تم کو نظر آئے گی حضرت ابراہیمؑ کا نبوت پانے سے پہلے ہی آسمان و زمین کے خالق کی تلاش، سورج، چاند اور ستاروں پر متفکرانہ نظر اور بت پرستی کے خلاف نفرت کا شدید جذبہ کس بات کی شہادت ہے؟ حضرت اسمٰعیلؑ کا بے آب و گیاہ میدان میں پرورش پانا، چاہ زمزم کا ظہور، آنے جانے والے قافلوں کا اس کی آبادی کی طرف میلان، چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو مقدس باپ کے ساتھ مقدس سفر کی تیاری اور اس کمسنی میں باپ کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پوری آمادگی اور صبر و شکر اور تسلیم و رضا کا اظہار کس مستقبل کی خبر دیتا ہے؟ حضرت اسحاقؑ کا فرشتوں کی بشارت سے پیدا ہونا اور پیدائش سے پہلے ہی غلام علیم (حجر۔۴) کا خطاب پانا پھر مقدس باپ کی جانشینی اور یروشلیم کی مسجد کی پاسبانی کے لئے انتخاب کس مقصود کا دیباچہ ہے؟

حضرت یوسفؑ کا بچپن میں رویائے صادقہ اور صبر و شکر اور پاکدامنی کس بات کی گواہی دیتی ہے؟ حضرت موسیٰ کی عین خطرہ میں پیدائش، حفاظت، پرورش اور نبوت سے پہلے فرعونیوں سے تن تنہا مجاہدانہ آویزش کس مبتداء کی خبر ہے؟ حضرت سلیمانؑ کا آغاز عمر میں علم و فہم، فصل مقدمات کی قوت کس نتیجہ کے آثار ہیں؟ حضرت یحییٰؑ کی دعائیہ پیدائش بچپن ہی میں ان کی نیکی، سعادت مندی، نرم خوئی اور پاکی کس مقصد کی تمہید ہے؟ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش اور بچپن ہی میں نیکی، سلامت روی، توراۃ کی حقیقت رسی کس روز روشن کی صبح ہے؟ اور خود محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے دعائے خلیل، نوید مسیحا، رویائے آمنہ اور احوال ولادت و تربیت، مراسم شرک سے اجتناب، اخلاق حسنہ، دیانت، امانت، آثار خیر و برکت نبوت سے پہلے ہی تنہائی پسندی، خلوت گزینی، حقیقت کی تلاش اور غور و فکر کس خورشید جہانتاب کا مطلع انوار ہے۔

---

[1] جامع ترمذی مناقب نبوی و مستدرک حاکم، مناقب محمدی، جلد دوم، صفحہ ۶۰۰، حیدر آباد۔

حضرت اسمٰعیلؑ کا یہ حال ہے۔

﴿ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ○ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾

(الصّٰفّٰت۔۱۰۱۔۱۰۲)

تو ہم نے ابراہیمؑ کو ایک بردبار لڑکے کی خوشخبری دی' تو جب وہ اس کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا تو اس نے کہا کہ اے میرے بیٹے میں خواب میں دیکھتا ہوں' کہ تجھ کو میں ذبح کر رہا ہوں' اس نے جواب دیا اے میرے باپ کر ڈال جو تجھ سے کہا گیا' تو مجھے خدا نے چاہا تو صبر کرنے والوں میں پائے گا۔

حضرت موسیٰؑ کو یہ خطاب ہے۔

﴿ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰى ○ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰى ﴾ (طٰہٰ۔۳۷۔۳۸)

اور ہم نے تجھ پر دوسری دفعہ احسان کیا جب (تیری حفاظت اور پرورش کے متعلق) تیری ماں کے دل میں وہ بات ڈال دی جو ڈالی گئی۔

حضرت یحییٰؑ کی نسبت یہ ارشاد ہے۔

﴿ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ○ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ؕ وَكَانَ تَقِيًّا ○ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ○ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ ﴾ (مریم۔۱۲۔۱۵)

اے یحییٰ کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ اور ہم نے اس کو فیصلہ کرنے کی قوت بچپن ہی میں دے دی' اور اپنے پاس سے رحم و مہر اور ستھرائی' اور تھا پرہیزگار اور اپنے ماں باپ کا فرمان بردار' اور نہ تھا زبردستی کرنے والا نافرمان۔ سلامتی ہو اس پر جس دن پیدا ہوا۔

نیز حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے۔

﴿ كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ○ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ○ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ﴾ (مریم۔۲۹۔۳۰)

ہم کیسے اس سے بات کریں جو ہنوز گہوارہ میں بچہ ہے؟ عیسیٰؑ نے کہا میں خدا کا بندہ ہوں' اس نے مجھے کتاب الٰہی دی اور مجھے نبی ٹھہرایا اور مبارک بنایا، میں جہاں ہوں۔

اور مکہ کا ''الامین'' نبوت کے پہلے کی اپنی پوری زندگی موقع شہادت میں بے خطر پیش کر دیتا ہے۔

﴿ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ (یونس۔۱۶)

تو اس (پیغمبری کے دعویٰ) سے پہلے میں تم میں ایک عمر گذار چکا ہوں، کیا تم نہیں سمجھتے۔

انبیاء علیہم السلام کے احوال مبارکہ کے یہ جزئیات باہم مل کر اپنی نسبت خود کلیہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔

غیبی علم:

نبوت کا دوسرا سب سے اہم خاصہ اس کا غیبی علم ہے یعنی وہ علم جو عام انسانوں کی طرح وجدان' احساس یا عقل و قیاس سے

نہیں، بلکہ براہ راست صدائے غیب یا رویائے صادقہ یا فرشتوں کے ذریعہ سے خدائے پاک سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی کے آغاز سے نبوت کی استعداد بالقوۃ کا عملی ظہور شروع ہو جاتا ہے۔ اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھنے کے لئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

علم انسانی کے ماخذ:

علم انسانی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو بلا واسطہ ہوتا ہے اور دوسرے وہ جو کسی واسطہ سے حاصل ہوتا ہے۔ بے واسطہ علم کی بھی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ **وجدان** انسان کو اپنے جسمانی وجود اور اس جسمانی وجود کے اندرونی کیفیات کا علم سب سے زیادہ یقینی طور سے ہوتا ہے۔ ہر شخص کو اپنے وجود کا یقین ہے اور اس کے اندر بھوک، پیاس، بیماری، صحت، غم، خوشی، خوف وغیرہ اندرونی تغیرات کا علم اس کو بلا واسطہ از خود ہو جاتا ہے۔

۲۔ **فطرت** اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ ہر نوع مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسی نوعی خصوصیتیں عطا ہوتی ہیں جو دوسری نوعوں میں نہیں پائی جاتیں اور انہیں سے باہم نوعوں کا اختلاف اور امتیاز ظاہر ہوتا ہے۔ ان نوعی خصوصیتوں کا علم ہر نوع کے افراد کو بلا کسی ذریعہ اور واسطہ کے از خود ہوتا ہے اور اسی کو بعض علماء کی اصطلاح میں فطری یا نوعی الہام اور اہل فلسفہ کی اصطلاح میں ’’جبلت‘‘ کہتے ہیں۔ حیوانات کو اپنے متعلق بہت سی باتوں کا علم از خود فطرتاً ہوتا ہے، پرندوں کے بچوں کو دانہ چگنا اور اڑنا کون سکھاتا ہے؟ آبی جانوروں کو تیرنے کی تعلیم کون دیتا ہے؟ شیر کے بچہ کو درندگی کا سبق کس معلم نے پڑھایا؟ انسان کے بچہ کو پیدا ہوتے ہی رونا، سونا، دودھ پینا کون سکھا دیتا ہے؟

۳۔ **بداہت** انسان کے کچھ ہوش وتمیز آنے کے بعد بلا دلیل بعض ایسی باتیں از خود یا بادنیٰ تامل اس طرح معلوم ہو جاتی ہیں کہ ان میں پھر کسی قسم کا شک وشبہ راہ نہیں پاتا۔ دو اور دو چار ہوتے ہیں، برابر کا برابر، برابر ہوتا ہے، ایک وقت ہی میں ایک ہی چیز سیاہ وسپید دونوں نہیں ہو سکتی، ہر بنی ہوئی چیز کا کوئی بنانے والا ہوتا ہے، وغیرہ۔ بہت سے ایسے ضروری مقدمات اور کلیات جن پر انسان کے استدلال کا تمام تر مدار ہے اس کو بداہتاً معلوم ہو جاتی ہیں۔

یہ تو بلا واسطہ علم کی تین قسمیں تھیں۔ اس کے بعد علم انسانی کی وہ قسمیں ہیں جن کا علم اس کو کسی واسطہ سے ہوتا ہے انسان کے پاس اس قسم کے دو واسطے ہیں، ایک احساس اور دوسرا عقل۔ پہلے سے وہ گرد وپیش کی مادی چیزوں کا اور دوسرے سے ان مادی چیزوں کا جو سامنے موجود نہیں یا سرے سے خارج میں موجود نہیں بلکہ عالم غیب میں ہیں یا صرف ذہن میں ہیں، علم حاصل کرتا ہے۔

۴۔ انسان کے جسم کے اندر پانچ قسم کی جسمانی قوتیں ہیں۔ باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ۔ باصرہ دیکھتی، سامعہ سنتی، شامہ سونگھتی، ذائقہ چکھتی، اور لامسہ چھوتی ہے، انہیں کا نام حواس خمسہ ہے۔ انسان کے پاس یہی پانچ آلات ہیں جن کے ذریعہ سے وہ ان مادی چیزوں کے متعلق علم حاصل کرتا ہے جو اس کے ان آلات سے آ کر ٹکراتی ہیں، اسی کا نام احساس ہے۔ ہم چکھ کر مزہ پاتے، سن کر آواز پہچانتے، دیکھ کر صورت جانتے، چھو کر سختی ونرمی دریافت کرتے اور سونگھ کر بو

معلوم کرتے ہیں۔ ان حواس کے ذریعہ سے بھی جو علم ہم کو ہوتا ہے وہ اکثر یقینی اور شاذ و نادر غلط بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ کبھی کبھی کسی سبب سے دھوکا بھی کھا جاتے ہیں اور دریافت کرنے میں غلطی بھی کرتے ہیں اور دلائل سے ان کا یہ دھوکا اور ان کی غلطی ثابت ہوتی ہے۔ بیماری میں قوت ذائقہ بدل جاتی ہے اور اس نے میٹھے کو کڑوا بتایا ہے' تیز حرکت میں قوت باصرہ نے ہم کو دھوکا دیا ہے' ریل میں ہم کو ساکن اور ٹھہری ہوئی چیز چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، چلتے ہوئے جہاز میں جہاز ہم کو ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے متحرک چنگاری کا نقطہ تیز سیدھی حرکت میں ہم کو آتشیں خط اور گول حرکت میں آتشیں دائرہ معلوم ہوتا ہے، آسمان کے چمکتے ہوئے بڑے بڑے ستارے کتنے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں لیکن کیا درحقیقت وہ ایسے ہی چھوٹے ہیں؟

۵۔ علم بالواسطہ کی دوسری قسم وہ ہے جس کو ہم اپنی عقل و قیاس غور و فکر اور استدلال کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں۔ ان کی بنیاد درحقیقت انہیں معلومات پر ہوتی ہے جن کا علم ہم کو اپنے وجدان الہام فطری (یا جبلت) بداہت اولیہ اور احساس سے پہلے ہو چکا ہے اور انہیں معلوم شدہ امور پر غیر معلوم امور کو تمثیل یا استقراء کے ذریعہ سے قیاس کر کے ان معلوم شدہ امور کے خصوصیات اور آثار کا حکم ان غیر معلوم لیکن مشابہ و مماثل امور پر لگا کر نیا نتیجہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ غیر معلوم امر جس پر معلوم امر کے ذریعہ ہم کوئی حکم لگاتے ہیں، اگر مادی ہوتا ہے تو نتیجہ چنداں غیر مشکوک نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ جزئیات کا استقراء پورا نہ کیا گیا ہو یا تمثیل تام نہ ہو یا تجربہ و مشاہدہ نے دھوکا دیا ہو' یا کوئی اور اصولی غلطی ہو گئی ہو۔ طبعیات اور سائنس کے مسائل اکثر اسی طرح معلوم کئے گئے ہیں لیکن اگر وہ امر مجہول غیر مادی ہے تو مادی امور پر اس غیر مادی کو قیاس کر کے اس کی نسبت جو کچھ کہا جائے گا اس کا مرتبہ ظن و تخمین سے آگے نہیں بڑھتا' مگر یہ کہ وہ تمام تر فطریات و بدیہیات و محسوسات پر علانیہ منتہی ہو مابعد الطبیعیہ اور فلسفہ الٰہیات کے مسائل اسی طریقہ استدلال سے حاصل ہوتے ہیں اور اسی لئے ان میں اختلاف کی بڑی گنجائش نکلتی ہے کہ ان کے آخری نتیجہ اور ابتدائی بنیادی وجدانی یا بدیہی یا حسی مقدمات کے درمیان قیاسات کی کئی منزلیں ہیں اور ان میں سے ہر منزل خطروں سے لبریز ہے۔ مشابہت و مماثلت میں دھوکا ہو سکتا ہے، عقلی اور وجدانی اور حسی اشیاء کے خواص کے درمیان اختلاف اور فرق ہو سکتا ہے، غور و فکر بحث و نظر تحقیق و جستجو اور ترتیب مقدمات جو اس قیاس کے عقلی کارکن اور فاعل ہیں، وہ اپنے کام میں دھوکا کھا سکتے ہیں اسی لئے یہ علوم شکوک و شبہات سے لبریز ہیں۔

ذرائع علم کے حصول کے زمانے اور ان کے مراتب:

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ ہمارے سب سے زیادہ یقینی علوم ہمارے وجدانیات اور فطریات ہیں جو ہم کو قدرت کی طرف سے سب سے پہلے عنایت ہوتے ہیں کہ ہمارے وجود کی بقا اس علم پر موقوف ہے جیسے بھوک اور پیاس کا احساس اور اس علم کا یقینی ہونا بھی ضروری ہے ورنہ ہم اپنا وجود قائم نہ رکھ سکیں گے ہم کو جو بھوک یا پیاس لگتی ہے، کیا اس کے یقینی اور قطعی علم میں ہم سے غلطی ہو سکتی ہے اور کیا کسی کے شک دلانے سے یہ ممکن ہے کہ تم کو بھوک نہ ہو یا ممکن ہے کہ تم کو پیاس نہ ہو؟ کبھی بھوکے یا پیاسے کو اپنی بھوک اور پیاس کے متعلق شک ہو سکتا ہے؟ اور یہ احساس اور علم وجود کے ساتھ ساتھ انسان کو ملتا ہے یہاں تک کہ آج کا پیدا شدہ بچہ بھی اس کا احساس کرتا اور علم رکھتا ہے ورنہ وہ اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے۔

وجدانیات وفطریات کے بعد محسوسات کا علم انسان کو ملتا ہے۔ دیکھنا‘ سننا‘ چکھنا‘ سونگھنا‘ چھونا یہ ہمارے پانچ حواس ہیں جو ہمارے مادی علم کے آلات ہیں اور جن کے بغیر کوئی باہر کا علم ہمارے اندر نہیں آ سکتا۔ یہ احساسات بھی ایک ہی دفعہ نہیں کمال پا جاتے بلکہ ضرورت کے مطابق حسب استعداد ملتے اور ترقی پاتے ہیں اور پیدائش کے چند ماہ بعد یہ تکمیل کو پہنچتے ہیں کیونکہ وجود کی بقا اور ضروریات کی تکمیل ابھی سے ان پر رفتہ رفتہ موقوف ہوتی جاتی ہے۔

محسوسات کے بعد بدیہیات اوّلیہ کا درجہ آتا ہے۔ انسان کو اپنے اس علم میں بھی وہی اذعان وقطعیت ہوتی ہے۔ دو دو چار ہوتے ہیں، دس پانچ کا دونا ہے‘ ایک چیز ایک ہی وقت میں دو جگہ نہیں ہو سکتی‘ ایک چیز ایک ہی وقت میں سیاہ و سپید نہیں ہو سکتی‘ ان بدیہی علوم کو ہر شخص مانتا ہے اور تسلیم کرتا ہے مگر اس کا علم انسان کو بچپن میں نہیں ہوتا بلکہ تمیز و رشد کے بعد ہوتا ہے کیونکہ اسی وقت اس کی ضرورت پیش آتی ہے‘ اگر یہ علوم اس سن میں اس کو عطا نہ ہوں تو وہ دنیا کے ضروری کاروبار چلانے کے لائق نہ ہو اور نہ دوسرے علوم کی دریافت کی اس میں استعداد پیدا ہو۔ فطری احمق اور بے وقوف انہیں کو کہتے ہیں جن میں ان بدیہیات کا علم کم یا بالکل نہیں ہوتا۔

سب سے اخیر میں اس علم کا درجہ آتا ہے جو وجدانیات‘ فطریات‘ بدیہیات اور محسوسات پر قیاس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور جس کو معقولات کہتے ہیں۔ اسی علم اور اسی کی قوت کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے کہ انسانی عقلیں درجہ اور مرتبہ میں متفاوت ہوتی ہیں۔ ایک طرف تو (کمی کی سمت میں) وہ حماقت تک پہنچ جاتی ہیں اور دوسری طرف (سمت کمال میں) عاقل‘ عاقل تر اور عاقل ترین طبقہ تک اونچی ہو جاتی ہے یہاں تک کہ وہ درجہ بھی آتا ہے کہ کسی کی عقل اس مرتبہ تک جا پہنچتی ہے جہاں کوئی اس کا دوسرا حریف اور ہمسر نہیں ہوتا۔ ایک جاہل حبشی سے لے کر ارسطو اور بوعلی سینا تک سب انہیں عقلی مدارج کے مختلف انسانی نظائر ہیں۔ بایں ہمہ یہ ظاہر ہے کہ اس علم کا طریقہ نہایت پر خطر اور منزل مقصود ہمیشہ مشکوک رہتی ہے۔

عام طور سے انسانی علم کے پانچ ذریعے اور طریقے سمجھے جاتے ہیں لیکن درحقیقت ایک اور ذریعہ بھی ہے جس کا تعلق تمام تر ماورائے مادہ سے ہے۔ غور کیجئے کہ آپ کا سب سے پہلا علم یعنی وجدانیات‘ آپ کے اندرونی حواس کا نتیجہ ہے‘ دوسرا یعنی فطریات کا علم‘ خالق فطرت خود آپ کے اندر ودیعت رکھتا ہے‘ تیسرا علم یعنی محسوسات کا علم آپ کے ان ظاہری حواس کا نتیجہ ہے جو گو باہر ہیں مگر آپ کے جسم کے اندر ہیں، آپ کا چوتھا ذریعہ علم یعنی بدیہیات اوّلیہ آپ کے حواس اور ذہن کا ایک مشترکہ فیصلہ ہیں، پانچواں ذریعہ علم جو آپ کی عقل و ذہن کی قیاس آرائی ہے وہ آپ ہی کے اندر کے دماغی قویٰ کا عمل ہے۔ تھوڑے سے تامل سے معلوم ہوگا کہ آپ کا علم وجدان سے لے کر ذہن تک بتدریج مادیت سے ترقی کر کے ماورائے مادہ کے قریب تک پہنچتا ہے‘ وجدان تمام تر ہماری اندرونی جسمانی مادیت ہے جس میں کوئی شک نہیں‘ محسوسات بھی ہمارے ہی جسم کے مادی آلات علم کے نتائج ہیں، بدیہیات ہمارے حواس سے جو مادی ہیں اور ہمارے ذہن سے جو غیر مادی ہیں مشترک تعلق رکھتے ہیں یعنی بدیہیات مادی اور غیر مادی ذرائع علم کے بین بین ہیں اور معقولات تمام تر ذہنی اور غیر مادی ہیں تاہم اس غیر مادی قوت کا مرکز ہمارا مادی جسم ہی ہے اور اس حد تک اس غیر مادی قوت کا مادہ سے تعلق بہر حال ہوتا ہے۔

غیر مادی علم:

اب اس کے بعد اس علم کا درجہ آتا ہے جس کی سرحد اس کے بعد آتی ہے اور جس کا تعلق مادہ سے اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا معقولات اور ذہنیات کا ہے۔ وہ تمام تر مادہ اور مادیات سے پاک ہوتا ہے۔ اس کو مادہ سے اسی قدر لگاؤ ہوتا ہے کہ وہ علم مادی، دل ودماغ کے آئینہ پر اوپر سے آ کر اپنا عکس ڈالتا ہے۔

اس غیر مادی علم کے بھی بہ ترتیب مختلف درجے ہیں جن کو فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی کہتے ہیں اور جس طرح انسانی علم کے مذکورۂ بالا پانچوں ذریعے انسان کے جسمانی قویٰ سے متعلق تھے اسی طرح یہ غیر مادی ذرائع انسان کے روحانی قویٰ سے وابستگی رکھتے ہیں اور جس طرح آپ نے دیکھا ہے کہ وجدانیات سے لے کر عقلیات تک بہ ترتیب ہمارا ذریعہ علم خالص مادی، کامل مادی، کم مادی اور برائے نام مادی تک ترقی کرتا چلا گیا ہے اسی طرح فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی بھی برائے نام مادی اور روحانی سے لے کر پھر روحانی، کامل روحانی اور خالص روحانی کے ذریعہ تک ترقی کرتے چلے گئے ہیں۔

فراست کے لفظی معنی "تاڑ جانے" کے ہیں۔ تاڑ لینے کی قوت ہر شخص میں نمایاں نہیں ہوتی مگر جس میں نمایاں ہوتی ہے اس کی یہ کیفیت ایک ملکہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے جو تجربہ کی کثرت اور عمل کی مہارت اور کمال کے بعد انسان کو حاصل ہو جاتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے دیکھنے، سننے، چکھنے، سونگھنے یا چھونے کے ساتھ ہی صرف بعض علامتوں کے جان لینے سے دوسری متعدد ضروری علامتوں پر تفصیلی نظر ڈالے بغیر اتنی جلدی سے انسان صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ غیب کی بات بیان کر رہا ہے حالانکہ اس کا علم تمام تر ظاہری علامتوں اور نشانوں پر مبنی ہوتا ہے جن کو ہر شخص دیکھ سکتا تھا مگر دیکھتا نہ تھا۔ ایسے ماہر فن اور ذی فراست اشخاص برابر ہر شخص کے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں۔ جس کو جس چیز یا فن میں یہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے اس کی فراست اس کو حاصل ہو جاتی ہے جرائم کے پتہ لگانے والے ماہرین اور جاسوس اپنے فن کی فراست میں یہ کمال رکھتے ہیں کہ صورت دیکھی اور تاڑ گئے۔ اسی طرح ہر علم وفن کے ماہروں کو اپنے اپنے فن کے اندر یہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اخیار اور نیکوکاروں کو اپنی جماعت کے افراد کے پہچان لینے اور جان لینے کی طاقت بھی اسی طرح حاصل ہوتی ہے اور اسی کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔

﴿ اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله ﴾ (ترمذی)

مومن کے تاڑ لینے سے ڈرو کہ وہ خدا کی روشنی سے دیکھتا ہے۔

۲۔ فراست کے بعد حدس کا درجہ ہے۔ فراست کے ابتدائی مقدمات حواس پر مبنی ہوتے ہیں، لیکن حدس کے ابتدائی مقدمات ذہنی اور عقلی ہوتے ہیں، اور انہیں ذہنی اور عقلی مقدمات کے غور وفکر، تلاش اور ترتیب سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے مگر فطری کمال یا فن کی حاصل کردہ مہارت کے سبب سے غور ونظر، فکر وتلاش اور ترتیب مقدمات کے منطقیانہ مرحلوں کو ذہن رسا اس تیزی اور سرعت کے ساتھ طے کر کے آخری نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ خود اس کو بھی اس کا احساس نہیں ہوتا کہ اس نتیجہ کے حاصل کرنے میں اس نے کوئی دماغی عمل بھی کیا ہے۔ یہ چیز بھی ایک کامل العقل اور صائب الرائے انسانوں کو

فطرتاً عطا ہوتی ہے اور دنیا کے مشہور عقلاء اور دانایانِ روزگار کے واقعات میں اس کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں۔

۳۔ کشف کے لفظی معنی کھولنے اور پردہ اٹھانے کے ہیں، مگر اس سے مقصود یہ ہے کہ مادیت کے ظلمانی پردہ کو چاک کر کے مادی چیز روحانی عالم میں مشاہدہ کے سامنے آ جاتی ہے۔ وہ کبھی اصلی صورت میں اور کبھی اپنی مثالی صورت میں نظر آتی ہے۔ عام لوگوں کو سمجھنے کے لئے اس کی بہترین مثال خواب کی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ خواب عالم خواب کی بات ہے اور کشف عالم بیداری کی۔ جس طرح عام لوگوں کو خواب میں جب ظاہری حواس بیکار ہو جاتے ہیں تو ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں جو کبھی کبھی عین واقعہ ثابت ہوتی ہیں اسی طرح خاص لوگوں پر بیداری ہی میں ظاہری حواس کے تعطل سے ایسا سماں پیش آتا ہے۔ ہر شخص کے تجربہ میں ایسے متعدد حیرت انگیز واقعات گذرتے رہتے ہیں۔

۴۔ الہام کے لفظی معنی ''دل میں ڈالنے'' کے ہیں اور اس سے مراد وہ علم ہے جو محنت، تلاش، تحقیق، غور اور ترتیب مقدمات کے بغیر دل میں آ جاتا ہے اور ممکن ہے کہ اس کی صحت بعد کو حسی تجربوں اور عقلی دلیلوں سے بھی ثابت ہو جائے مگر خود وہ علم پہلے پہل ذہن میں کسی حسی تجربہ یا عقلی دلیل کے نتیجہ کے طور پر نہیں آتا بلکہ خود بخود دل میں آ جاتا ہے، کیوں آتا ہے اور کہاں سے آتا ہے؟ اس کے جوابات مختلف ہو سکتے ہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ آتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کی ابتدائی اور معمولی مثالیں وہ خیالات ہیں جو محققین علماء شعراء اور موجدین کے ذہن میں پردۂ عدم سے پہلے پہل آتے ہیں اور وہ ان کو دنیا کے سامنے اپنی ایجادات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

۵۔ وحی کے لغوی معنی کسی کا اپنے دلی منشاء کو لبوں کو جنبش دیئے بغیر اخفاء اور آہستگی کے ساتھ دوسرے پر ظاہر کر دینا ہے اور اصطلاحاً اس کے معنی خدا کا اپنے دلی منشاء سے اپنے خاص بندوں کو کسی غیبی ذریعہ سے مطلع کرنا ہیں۔ یہ علم و اطلاع کے روحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے۔

جس طرح علم کی تین جسمانی قسمیں یعنی وجدانیات، حسیات اور بدیہیات عام انسانوں کے لئے ذریعہ یقینی ہیں، اسی طرح روحانی ذرائع علم کے یہ تین ذریعے کشف، الہام اور وحی انبیاء علیہم السلام کے لئے یقینی ہیں اور جس طرح علم کے مادی ذریعوں میں سے یقین کا سب سے پہلا ذریعہ وہ ہے جو تمام تر مادی ہے یعنی وجدان پھر حس ظاہر اور پھر بدیہیات اسی طرح علم کے روحانی واسطوں میں سب سے زیادہ یقینی وہ ہے جو تمام تر روحانی ہے یعنی وحی، پھر الہام، پھر کشف۔

ہم نے علم کے روحانی ذرائع کی جو تین قسمیں کی ہیں یعنی وحی، الہام اور پھر کشف یہ قرآن پاک کی اصطلاحیں نہیں ہیں اس کی اصطلاح میں روحانی ذریعہ علم کا نام مکالمہ الٰہی (خدا سے بات کرنا) اور اس کی حسب ذیل تین قسمیں بیان کی ہیں۔

۱۔ وحی (اشارہ) سے بات کرنا، یعنی دل میں کسی معنی کا بغیر آواز اور الفاظ کے آ جانا۔ اگر یہ حالت بیداری میں ہے تو کشف ہے اگر خواب میں ہے تو رویا ہے۔

۲۔ خدا کا پردہ کے پیچھے سے بات کرنا یعنی متکلم نظر نہیں آتا مگر غیب سے آواز آتی ہے اور الفاظ سنائی دیتے ہیں اس کو الہام کہہ لو۔

۳۔ فرشتوں کے ذریعہ سے بات کرنا، یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے نظر آتا ہے اور اس کے منہ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں جن کو نبی سن کر محفوظ کر لیتا ہے اسی کو عام طور سے وحی کہتے ہیں کیونکہ قرآن پاک کا نزول اسی آخری طریقہ سے ہوا ہے لیکن اس شہرت عام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اور دوسرے دو طریقے وحی کی قسمیں نہیں ہیں۔ وحی کی ان اقسام کا ذکر سورۂ شوریٰ میں ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ﴾ (شوریٰ)

اور کسی آدمی کو یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے، لیکن وحی (اشارہ) سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کسی قاصد کو بھیجے تو وہ خدا کے حکم سے، خدا جو چاہے اس کو وحی کر دیتا ہے، بے شک اللہ بلند حکمت والا ہے۔

مکالمہ الٰہی کے یہ تینوں طریقے یعنی وحی (اشارہ) سے بات کرنا، پردہ کے پیچھے سے بات کرنا اور فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا، وحی کی یہ تین مختلف قسمیں بھی ہیں اور پھر ان تینوں کا اجمالاً مشترک نام بھی وحی ہے یعنی یہ منقسم بھی ہے اور اپنی تین قسموں میں سے بھی ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسی آیت میں دیکھو کہ فرشتہ کے ذریعہ سے کلام کو بھی وحی فرمایا گیا اور تینوں مذکورہ بالا طریقوں میں جس طریقہ سے بھی آنحضرت ﷺ کو غیبی تعلیم و اطلاع دی گئی ہے اس کو بھی وحی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ عام مکالمہ الٰہی کے مرادف بھی مستعمل ہوا ہے۔

﴿مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ (نجم-۱)

نبی خواہش نفس سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔

الغرض اسی امتیاز کے لئے علمی اصطلاح میں ان تینوں طریقوں کے لئے کشف الہام اور وحی کے تین علیحدہ علیحدہ الفاظ وضع کر دیئے گئے ہیں تاکہ بول چال میں ہر روحانی طریقہ گفتگو دوسرے سے ممتاز ہو جائے۔ بیداری میں اشارہ سے بات کرنا کشف ہے اور خواب کے عالم میں رویا ہے، پردہ کے پیچھے سے آواز کا آنا الہام ہے اور فرشتہ کی درمیانگی سے بات کرنا وحی ہے۔[1]

نکتہ:۔ اوپر کی آیت میں جہاں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے بات کرے لیکن ان تینوں طریقوں سے، اس کے آخر میں فرمایا ہے کہ وہ سب سے بلند اور حکیم ہے یعنی اس کی بلندی و برتری کا اقتضا تو یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے مکالمہ کے شرف کا مستحق نہ سمجھے مگر اس کی حکمت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے بندگانِ خاص کو عام بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ان تین غیر معمولی طریقوں میں سے کسی طریقہ سے گفتگو فرما لے۔

بہر حال غیبی ذریعہ اطلاع کی یہ سب سے بلند قسم جس کو اصطلاح میں وحی کہتے ہیں اس کا تجربہ عام لوگوں کو نہیں، لیکن اس سے نیچے درجہ کے غیبی ذرائع اطلاع کا تجربہ ہر شخص کو تھوڑا بہت ہے اور ہر انسان کی زندگی میں جو بعض پر اسرار اور ناقابل فہم واقعات پیش آتے ہیں ان پر غور کرنے سے غیب کے اس اعلیٰ ترین ذریعہ علم کا دھندلا سا خاکہ ذہن

---

[1] ان اصطلاحات کی بحث کے لئے اصول فقہ کی اہم کتابوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے، کم از کم اس موقع پر تحریر ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ کی شرح التقریر والتحریر لابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ جلد سوم ص ۲۹۵ مطبوعہ امیریہ بولاق مصر ۱۳۱۷ھ دیکھنی چاہیے۔

میں آ سکتا ہے جس سے غیر جسمانی اور غیر حسی مادی ذرائع علم کے سمجھنے اور باور کرنے میں جو استبعاد معلوم ہوتا ہے وہ دور ہوسکتا ہے خصوصاً اس عہد میں جب سائیکالوجی کی تحقیقات سے نفس کی بہت سی نامعلوم طاقتوں کا پتہ چل رہا ہے اور اسپریچولزم کے ذریعہ ارواح سے خطاب وکلام کی سلسلہ جنبانی ہو رہی ہے اور جدید روحانیات کا فن ایک مستقل سائنس کی صورت اختیار کر رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کو اپنے کشف، الہام اور وحی پر اتنا ہی یقین ہوتا ہے جس قدر عام انسانوں کو اپنے وجدانیات، محسوسات، فطریات اور بدیہیات پر۔ انبیاء کا یہ روحانی علم ایسا ہی اندرونی ہوتا ہے جیسا عام انسانوں میں وجدانیات، فطریات اور بدیہیات ومحسوسات کا علم ہوتا ہے۔ جس طرح کسی شخص کو اس علم میں دھوکا نہیں ہوسکتا کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہو رہی ہے یا اس کو غم یا خوشی ہے، اسی طرح نبی کو بھی اپنے روحانی وجدانیات میں دھوکا نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے فطریات میں یہ مغالطہ نہیں ہوتا کہ دو اور دو چار نہیں ہوتے اسی طرح اس کو بھی پیغمبرانہ فطریات میں مغالطہ واقع نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے محسوسات شبہ نہیں ہوا کرتا غرض وہ اپنے ان جملہ غیبی اور روحانی ذرائع علم میں ہر لغزش، فریب، خطا اور غلطی سے اسی طرح پاک ہوتا ہے جس طرح تم اپنے وجدانیات، فطریات، محسوسات اور بدیہیات میں غلطی اور خطا سے پاک ہوتے ہو۔

علم غیب:

اسلام کے عقیدہ میں غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ قرآن میں بار بار آنحضرت ﷺ کو اس اعلان کی ہدایت ہوئی ہے۔

﴿فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ﴾ (یونس۔۲)

تو کہہ دے اے پیغمبر کہ غیب خدا کے لئے ہے۔

﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ (نمل۔۵)

کہہ دے کہ آسمانوں میں اور زمین میں خدا کے سوا کوئی نہیں جس کو غیب کا علم ہو۔

رسول کہتے ہیں۔

﴿وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ﴾ (انعام۔۵)

اور میں غیب نہیں جانتا۔

لیکن اسی کے ساتھ دو موقعوں پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ بایں ہمہ خدا اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی اطلاع دیتا ہے۔

سورۂ جن میں ہے۔

﴿فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ (جن)

تو اللہ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا لیکن اس پیغمبر پر جس کو پسند کرے۔

دوسری جگہ سورۂ آل عمران میں ہے۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾

اور نہ تھا اللہ کہ غیب کی باتوں پر تم کو مطلع کرتا' لیکن یہ کہ اللہ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہے چن لیتا ہے۔

ان دو آیتوں میں سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی باتوں کی اطلاع دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں غیب دانی کی کلیتاً اور قطعاً نفی کی گئی ہے اس سے مراد ذاتی اور حقیقی علم ہے یعنی خدا کے سوا بالذات کسی کو غیب کا علم نہیں' البتہ خدا کے واسطہ اور ذریعہ سے اور اس کی تعلیم و اطلاع سے پیغمبروں کو اس کا علم حاصل ہوتا ہے۔ ساتھ ہی آیت الکرسی میں فرمادیا گیا۔

﴿ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَاشَآءَ ﴾ (بقرہ۔۳۴)

اور وہ خدا کے ایک ذرہ علم کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے لیکن اتنے کا جتنے کا وہ چاہے۔

یعنی اپنے علوم غیب سے جتنا اور جس قدر وہ پسند کرتا ہے اور مصلحت سمجھتا ہے وہ ان کو بذریعہ وحی ان سے واقف کرتا رہتا ہے۔ بایں ہمہ بعض باتوں کی نسبت جیسا کہ سورۂ ہود اور لقمان میں ہے اللہ تعالیٰ نے قطعی طور سے یہ فیصلہ کر دیا کہ ان کا علم کسی کو نہیں مثلاً قیامت' بارش' موت' شکم مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی' کل کیا ہوگا ان باتوں کو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا' اسی طرح بعض آیتوں میں آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اس کا تم کو علم نہ تھا جیسا کہ غزوۂ تبوک میں عدم شرکت کے بعض عذر خواہ اصحاب کے متعلق سورۂ توبہ میں ہے کہ انہوں نے جھوٹی قسمیں کھا کر اجازت حاصل کر لی۔ خدا نے فرمایا

﴿ عَفَا اللّٰہُ عَنْکَ لِمَ اَذِنْتَ لَھُمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکَ الَّذِیْنَ صَلعَوُا وَتَعلَمَ الْکٰذِبِیْنَ ﴾ (توبہ۔۷)

خدا نے تجھ سے درگذر کیا۔ کیوں تو نے ان کو اجازت دی' تا آنکہ تجھے معلوم ہو جائے جو سچ بولے اور جھوٹوں کو جان لیتا

﴿ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَۃَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَکَ الْاُمُوْرَ حَتّٰی جَآءَ الْحَقُّ وَظَھَرَ اَمْرُ اللّٰہِ وَھُمْ کٰرِھُوْنَ ﴾ (توبہ)

انہوں نے پہلے فتنہ پیدا کرنا چاہا' اور تیرے سامنے واقعات الٹ دیئے' یہاں تک کہ حق بات آ گئی' اور خدا کی بات کھل گئی اور وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔

آگے چل کر ہے۔

﴿ مَرَدُوْا عَلَی النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُھُمْ نَحْنُ نَعْلَمُھُمْ ﴾ (توبہ۔۱۳)

یہ نفاق پر اڑے ہیں' تو ان کو نہیں جانتا ہم جانتے ہیں۔

ان آیتوں سے یہ واضح ہے کہ پیغمبروں کو غیب کا کلی علم نہیں ملتا بلکہ ان کو غیب کی اطلاع دیئے جانے کے موقع کی دونوں آیتوں میں ''رسول'' ہی کا لفظ استعمال کرنا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جن امور غیب کی اطلاع پیغمبروں کو دی جاتی ہے ان کا تعلق فریضۂ رسالت اور اس کی مصلحتوں اور شریعتوں سے ہے۔

غیب کی حقیقت:

علم غیب کے اس نادیدہ راستہ میں اتنی منزل طے کر لینے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں غیب کس کو کہتے ہیں؟ قرآن مجید کے اس الفاظ کے استعمال کے تمام مواقع پر غور کرنے سے اس کے اجمالی

اور تفصیلی دونوں معنی واضح ہوتے ہیں۔ اجمالاً اس کا اطلاق ان امور پر ہوتا ہے جن کا علم انسان اپنے علم کے عام اور طبعی و فطری ذریعوں سے حاصل نہیں کرسکتا۔ گذر چکا ہے کہ انسانی علم کے طبعی ذریعے وجدان، حواس اور عقل و استدلال وغیرہ ہیں۔ ان طبعی ذریعوں سے جو ہر انسان کو ملے ہیں جو علم حاصل نہیں ہوتا، اس کو علم غیب کہتے ہیں یعنی اس شے یا ان اشیاء کا علم جو انسان کے ظاہری و باطنی حواس اور دماغی قویٰ کی نگاہوں کے سامنے غائب ہیں، اس کا مقابل لفظ شہادت ہے جس کے معنی حاضر ہونے کے ہیں یعنی وہ اشیاء جو ہر انسان کے حواس اور قوائے دماغی کے سامنے ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے کو بار بار عالم الغیب والشہادۃ کہا ہے (انعام، رعد، حشر، تغابن) یعنی انسانوں کے طبعی ذرائع علم کے سامنے جو حاضر ہے اور جو غائب ہے ان سب کا عالم اور واقف کل وہی ہے۔ الغرض اجمالاً علم غیب اسی غیبی طریقہ علم کا نام ہے جو عام انسانوں کو نہیں ملا ہے۔

تفصیلی حیثیت سے قرآن پاک میں غیب کا اطلاق چار چیزوں پر ہوا ہے۔

”زمانہ ماضی کے واقعات جن کا علم بعد کو نہ تو حواس کے ذریعہ ہوسکتا ہے کہ حواس سے صرف شاہد (سامنے موجود) کا علم ہوتا ہے اور نہ عقل و فکر کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔ اگر ہوسکتا ہے کہ تو تحریر و روایت کے ذریعہ لیکن جس کے لئے تحریر و روایت کا ذریعہ یقینی طور سے مسدود ہو اس کے لئے ان کا علم اگر ہوسکتا ہے تو غیبی ہی ذریعہ سے ہوسکتا ہے“

حضرت نوحؑ کے مختصر قصہ کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

﴿ تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَآ اِلَیْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ﴾ (ھود۔۴)

یہ غیب کی بعض خبروں میں سے ہے، ہم ان کو وحی کرتے ہیں تیری طرف۔ تو تو ان کو پہلے سے جانتا ہی نہ تھا، اور نہ تیری قوم جانتی تھی۔

حضرت مریمؑ کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

﴿ ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ ﴾ (آل عمران۔۵)

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے اس کو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور نہ تو ان کے پاس موجود تھا جب وہ اپنے قلم (قرعہ کے طور پر) ڈال رہے تھے کہ کون مریم کو پالے اور نہ تو ان کے پاس اس وقت تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے۔

دیکھو کہ محسوس واقعات کے علم کا طبعی طریقہ اس وقت موجود رہ کر دیکھنا اور سننا تھا اس کی آنحضرت ﷺ سے نفی کی گئی کہ آپ وہاں یقیناً اس وقت موجود نہ تھے، اب رہ گیا کسی دوسرے انسانی ذریعہ سے سننا اس کی بھی نفی پہلے ہی سے ہے کہ تیری قوم میں سے بھی کسی کو معلوم نہ تھا اور نہ دوسروں سے معلوم کیا۔ اب اس کا علم جس غیر طبعی طریقہ سے رسول کو دیا گیا وہ وحی کا ذریعہ ہے۔

اسی طرح حضرت یوسفؑ کے پورے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا۔

﴿ ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ یَمْكُرُوْنَ ﴾

(یوسف۔۱۱)

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے ہم اس کو تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو اس وقت ان کے پاس نہ تھا جب وہ اپنا کام

طے کرنے لگے اور چال چل رہے تھے۔

اس میں بھی علم شاہد کی نفی کر کے علم غائب کو ثابت کیا گیا۔ بہر حال ان تینوں آیتوں سے واضح ہے کہ ماضی کے واقعات کے غیر طبعی طریقہ علم کو بھی علم غیب کہا گیا ہے۔

۲۔ اسی طرح آئندہ مستقبل میں جو واقعات ہونے والے ہیں ان کو بھی غیب کہا گیا ہے۔ ان کا علم دلائل و قیاس کے طبعی ذرائع کے علاوہ غیر طبعی ذریعہ سے ہوا ہو تو اس کو بھی علم غیب کہیں گے۔ قرآن پاک میں ایک موقع پر ان کفار کے جواب میں جو نشانیوں کے طالب تھے یہ کہا گیا۔

﴿ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّیْ مَعَکُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ﴾ (یونس)

تو کہہ دے کہ غیب کا علم خدا ہی کے لئے ہے' انتظار کرو' میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں

مستقبل کے منتظرہ واقعات کو اس آیت میں غیب کہا گیا ہے، اسی طرح قیامت کو بار بار غیب کہہ کر غیر خدا سے اس کے علم کی نفی کی گئی ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ﴾ (لقمان۔۴)

خدا ہی کے پاس قیامت کا علم ہے

﴿ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ ﴾ (اعراف۔۲۳)

وہ قیامت کو پوچھتے ہیں' کہہ دے کہ اس کا علم میرے پروردگار کے پاس ہے۔

اسی طرح مستقبل کے دوسرے واقعات کے علم کی بھی انسانوں سے نفی کی گئی ہے۔

﴿ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّا ذَا تَکْسِبُ غَدًا وَّمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ ۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ﴾ (لقمان۔۴)

کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا اور نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا؟

۳۔ ان چیزوں پر بھی غیب کا اطلاق کیا گیا ہے جو گو ماضی اور مستقبل نہیں بلکہ زمانہ حال میں موجود ہیں تاہم انسان کے حواس خمسہ اور عقل کی محدود طاقت سے ان کا علم نہیں ہو سکتا۔ ہم کو دیکھنے اور سننے کی طاقت دی گئی ہے مگر اس کے لئے کسی نہ کسی مسافت' عدم حجاب اور دیگر چند شرائط کی قید لگا دی گئی ہے جن کے بغیر ہماری یہ طاقت بالکل بے کار ہے۔ ہم دلی میں بیٹھ کر بمبئی کے پیش نظر مناظر کو نہیں دیکھ سکتے اور نہ بغیر آلات کے ہم یہاں سے وہاں کی آواز آج بھی سن سکتے ہیں اس لئے زمانہ حال کے علم کے لئے بھی جو طبعی شرائط اور قیود ہیں ان کے بغیر جو علم حاصل ہو گا وہ غیب ہو گا۔

حاملہ عورت سامنے موجود ہے مگر اس کے بطن کے پے در پے حجابات کے اندر جن کو آنکھیں چاک نہیں کر سکتیں کیا ہے؟ کس کو معلوم ہے؟

﴿ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ﴾ (لقمان۔۴)

اور اللہ جانتا ہے رحموں کے اندر جو ہے۔

آسمان وزمین میں اس وقت جو کچھ ہے وہ سب زمانہ حال میں سب کے سامنے موجود ہے' تاہم اس کا علم

ہمارے حواس اور عقل کی محدود دسترس سے اس وقت تک باہر ہے، جب تک ہمارے دیکھنے اور سننے اور جاننے کے لئے خدا نے جو طبعی شرائط بتادیئے ہیں وہ پورے نہ ہوں۔

﴿ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (ہود۔۱۰)

اور خدا ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (حجرات)

بے شک خدا جانتا ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔

۴۔ عالم غیب کی آخری چیز وہ امور ہیں جو غیر مادی ہونے کی وجہ سے ہمارے حواس اور عقل کے تنگ دائرہ علم سے قطعاً باہر ہیں۔ ہم فرشتوں کو نہیں دیکھتے‘ خدا کی رؤیت کی صلاحیت نہیں رکھتے‘ جنت دوزخ ہم کو یہاں نظر نہیں آسکتی۔ یہ تمام امور غیب ہیں۔

﴿ اَلَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ ﴾ (انبیاء۔۴)

جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں غیب میں۔

﴿ اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ﴾ (بقرہ۔۱)

وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں غیب میں۔

﴿ جَنّٰتِ عَدْنِ ۨ الَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ﴾ (مریم۔۴)

وہ جنت جس کا وعدہ اس مہربان خدا نے اپنے بندوں سے کیا ہے غیب میں ہے۔

’’غیب میں‘‘ کے معنی ہیں‘ بے جانے‘ بن دیکھے‘ حواس سے علم حاصل کئے بغیر اور باوجود اس کے کہ وہ چیزیں اس عالم میں دیکھی نہیں جاسکتی ہیں۔

پیغمبر کو اللہ تعالیٰ غیب کی جن باتوں سے آگاہ کرتا ہے وہ ان چاروں قسم کے امور غیب ہوتے ہیں۔ بعض گذشتہ قوموں اور پیغمبروں کے عبرت انگیز اور نصیحت آموز حالات سے بھی روایت اور تحریر کے ذریعہ کے بغیر وحی کے واسطہ سے ان کو مطلع کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید کے حوالوں سے اوپر گذر چکا‘ آئندہ مستقبل میں دنیا کے فتنوں‘ امت محمدیہ کے انقلاب‘ قیامت کے مناظر اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کا علم آپ کو دیا گیا جیسا کہ ان دنیاوی پیشین گوئیوں اور قیامت ومحشر کے ان مناظر سے ظاہر ہے جو قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں بتصریح مذکور ہیں، اسی طرح حال کے ان مناظر واحوال کا علم بھی ثابت ہے جو باوجود سامنے موجود ہونے کے احساس وتعقل کے طبعی شرائط نہ پائے جانے کے سبب سے عالم انسانوں کو نظر نہیں آتے۔ قبروں کا انکشاف‘ پس پردۂ رویت‘ دوسروں کے سامنے موجود احوال سے واقفیت وغیرہ اس علم غیب میں سے بھی پیغمبروں کو عطا ہوتا ہے اور سب سے آخر میں وہ مغیبات ہیں جن کا احساس وتصور ہمارے مادی ذرائع علم سے قطعاً خارج ہے تاہم وہ بھی اس کو دکھائے اور بتائے جاتے ہیں۔ خود خدا کا دیدار اور فرشتوں کی رویت‘ جنت ودوزخ کا مشاہدہ وغیرہ ان تمام امور غیب میں سے اللہ تعالیٰ جس رسول کے لئے جس قدر مناسب اور سزاوار سمجھتا ہے اس کا علم وحی کے مختلف اقسام کے ذریعہ سے اس کو عطا فرماتا ہے۔

وحی اور ملکۂ نبوت:

حکمائے اسلام نے وحی کی حقیقت ''ملکۂ نبوت'' کے لفظ سے ظاہر کی ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ ترتیب کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں علم اور تعقل نے پستی سے بلندی کی طرف رفتہ رفتہ ترقی کی ہے۔ جمادات بے حس ہیں، ان کے اوپر نباتات ہیں جن میں صرف محدود احساس ہوتا ہے اور وہ دماغی قویٰ حافظہ، تذکر اور غور و فکر کی قوت سے وہ محروم ہیں، ان سے اونچے حیوانات ہیں جن میں یہ تمام قوی ناقص طریقے سے نمودار ہوتے ہیں اور آخر میں ان سے بالاتر ہستی یعنی انسان میں جا کر یہ قوی پورے کمال میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان قویٰ کی ترقی یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ جس طرح نباتات میں قوت احساس ہے جس سے جمادات محروم ہیں اور حیوانات میں حافظہ تصور تعقل وغیرہ کی وہ قوتیں ہیں جو نباتات میں نہیں، انسان میں وہ دماغی و ذہنی قویٰ ہیں جو حیوانات میں نہیں اسی طرح انبیاء میں علم و تعقل کی ایک ایسی قوت موجود ہوتی ہے جو عام انسانوں میں نہیں ہوتی اور اسی کا نام ملکۂ نبوت ہے۔

حواس صرف مادیات کو دریافت کرتے ہیں، دماغی قویٰ مادیات سے بلند ذہنیات اور عقلیات کو اور ملکۂ نبوت اس سے بھی اونچا جاتا ہے۔ وہ ذہنیات و عقلیات سے بلند تر حقائق یعنی غیبیات کو دریافت کرتا ہے۔ اس ذریعہ علم میں غور و بحث اور منطقیانہ فکر و نظر اور ترتیب مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ہیں جس طرح وجدانیات، فطریات اور بدیہیات اور محسوسات سامنے آتے ہیں اور انہیں کی طرح وہ یقینی بھی ہوتے ہیں اور چونکہ اس ذریعہ میں علم انسانی کے عام ذریعے اور طریقے یعنی وجدان، فطرت نوعی، بداہت اولیہ، احساس اور غور و فکر سے معلومات حاصل نہیں کئے جاتے بلکہ خود علام الغیوب وہ علم ان انسانی وسائط کے بغیر ان کو عطا کرتا ہے۔ شرع کی زبان میں اسی کو وحی والہام کہتے ہیں۔ علم کلام کی اصطلاح میں ملکہ نبوت اور عام محاورہ میں اس کو غیبی علم کہہ لیجئے۔

لیکن اہل نقل کی اصطلاح میں وحی کی یہ صورت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو وقتاً فوقتاً احکام اور ارادوں سے براہ راست فرشتوں کے ذریعہ سے مطلع کرتا رہتا ہے۔ یہی وحی ہے۔

امعان نظر سے معلوم ہوگا کہ اہل عقل و نقل کے اختلاف کا منشا یہ ہے کہ آیا یہ وحی خود پیغمبر کے مافوق اور غیر معمولی وہبی علم و فہم کا نتیجہ ہوتی ہے یا خود براہ راست وقتاً فوقتاً تعلیم ربانی کا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ جس طرح عام انسانوں میں علم و فہم کی قوت آغاز پیدائش ہی میں فطرتاً ودیعت کر دی جاتی ہے اسی طرح انبیاء میں منشائے الٰہی جاننے کی قوت بھی شروع ہی میں ودیعت کر دی جاتی ہے یا یہ کہ وہ فطرتاً تو ویسے ہی عام انسانی طریقہ کا طبعی علم و فہم رکھتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نبوت کے بعد اپنے منشائے الٰہی سے ان کو کسی غیبی ذریعہ سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتا رہتا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت، عقل کی نقل اور نقل کی عقل سے علیحدگی میں نہیں بلکہ اتحاد میں ہے۔ وہ لوگ جو عقل و نقل دونوں کے جامع ہیں وہ ان دونوں کو مجتمع کرتے ہیں۔

یار ما ایں وار دو آں نیز هم

انبیاء علیہم السلام میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بدء فطرت اور آغاز پیدائش سے ان امور کے متعلق جن کا ان

کی رسالت و نبوت سے تعلق ہے اور جس کو دین کہتے ہیں وہ کلی استعداد اور عمومی فہم ہوتی ہے جس سے غیر انبیاء محروم ہیں اور اس پوشیدہ قوت کا عملی ظہور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ نبوت کے منصب پر عملاً سرفراز ہوتے ہیں۔ اسی کا نام ”ملکہ نبوت“ ہے اور اہم امور دین کے متعلق ان کو وقتاً فوقتاً جو غیبی اطلاع ملتی رہتی ہے اس کا نام ”وحی“ ہے۔

آج کل قرآن فہمی اور عقل کے مدعیوں اور نقل کے لفظی پابندوں میں جو اختلاف ہے وہ دراصل انہیں دو قوتوں کے درمیان تمیز نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ نقل کے لفظی پابند یہ سمجھتے ہیں کہ ہر لفظ جو نبی کے منہ سے نکلتا ہے وہ اس معنی میں وحی ہے جس معنی میں قرآن ہے کہ وہ براہ راست خدا کی غیب کی اطلاع ہے اور عقل کے مدعی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن بے شک خدا کی براہ راست وحی ہے مگر اس کے ماسوا رسول جو کچھ کہتا ہے وہ اس کے پیغمبرانہ نہیں بلکہ انسانی و بشری علم وفہم کا نتیجہ ہے لیکن حقیقت ان دونوں کے ماوراء ہے۔ جیسے قرآنی وحی براہ راست ہے اسی طرح نبی کے دوسرے احکام اس کے عام انسانی و بشری علم وفہم کا نہیں بلکہ اس کی پیغمبرانہ وہبی قوت علم وفہم کا نتیجہ ہے جو وحی کی ایک دوسری قسم اس لئے کہی جا سکتی ہے کہ اس کا منشاء ”ملکہ نبوت“ کے ذریعہ وحی ربانی کی ترجمانی ہے، اس لئے پیغمبر کی وحی اور ملکہ نبوت دونوں کے احکام واجب الاتباع ہیں۔

کتاب اور سنت:

اس تقریر کا منشاء یہ ہے کہ پیغمبر کو جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وحی حقیقی یعنی وہ علم جس کو اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے خاص الفاظ میں پیغمبر پر نازل کرتا رہتا ہے اور جس کے مجموعہ کو کتاب الٰہی، صحیفہ ربانی، تورات، انجیل، زبور اور قرآن کا نام دیا گیا ہے، دوسرا وہ علم جو پیغمبر کے ملکہ نبوت یا نور نبوت یا فہم نبوت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پہلا علم اصلی اور دوسرا ضمنی ہے یا یوں کہو کہ پہلا اصولی اور دوسرا فروعی ہے یعنی علم اول پیغمبر پر شریعت کے غیر متبدل اور ازلی احکام کلیہ اور مہمات کو واضح کرتا ہے اور دوسرا علم پہلے علم کے غیر متبدل کلی اصول کے ماتحت اس کے مقصود کی صحیح تشریح اور اس کے جزئیات کی ضروری تفصیل کرتا ہے اور غیر اہم متبدل امور کے متعلق ہنگامی اوقات میں مصلحتی احکام بتاتا ہے، اور اسی دوسری قسم کا علم ہے جو روایات اور احادیث کی صورت میں ہے اور جس کو اہل اصول اصطلاحاً سنت کہتے ہیں۔ کتاب اصولی احکام ہیں اور سنت ان اصولی احکام کی عملی تشریح اور بیان ہے کتاب براہ راست وحی الٰہی کا نتیجہ ہے اور سنت ملکہ نبوت اور فہم نبوی کا۔ کتاب بلفظہ وحی ہے اور سنت بالمعنی۔

وحی متلو اور وحی غیر متلو:

بعض علمائے اصول نے کتاب اور سنت دونوں کو وحی مانا ہے اور ان دونوں کے درمیان تفریق یہ کی ہے کہ کتاب اس وحی کا نام ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور سنت اس وحی کو کہتے ہیں جس کی تلاوت نہیں کی جاتی۔ اس تشریح کا مقصود حقیقتاً تلاوت و عدم تلاوت کا فرق نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ کتاب میں معنی کے ساتھ الفاظ بھی وحی کئے گئے ہیں اور وہ الفاظ بھی محفوظ ہیں۔ ان کا حرف حرف اور نقطہ نقطہ ﴿وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ﴾ کی پیشین گوئی میں داخل ہے اور اس لئے اس میں الفاظ کی کمی بیشی اور حذف و اضافہ محال ہے اور سنت میں الفاظ کی نہیں بلکہ صرف معانی کی حفاظت ہے اسی لئے کتاب

کی وحی مدون، مکتوب اور محفوظ کی گئی اور نماز میں اس کی قرات کا حکم ہے اور یوں بھی عام طور سے اس کی تلاوت مسنون ہے اور سنت کی وحی بالفاظہا مقصود نہیں اس لئے اس کی لفظی حفاظت کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی اور نہ نماز میں اس کے الفاظ قرات کئے جاسکتے ہیں اور نہ ان کی تلاوت کی جاتی ہے اور نہ اس کو کتاب الٰہی کہا جاسکتا ہے مگر معناً اصولی حیثیت سے ان کی حفاظت خود قرآن نے اپنے اندر کرلی ہے اور جزئیات کی حیثیت سے گو الفاظ میں نہیں مگر عمل میں خود رسول اور اس کے پیروؤں اور پھر ان کے پیروؤں کے مسلسل تعامل سے، یہاں تک کہ آج بھی تمام مسلمانوں کے عمل درآمد سے عملی تواتر کی صورت میں محفوظ ہے اور بعد کے اماموں نے اچھی طرح تحقیق کر کے الفاظ اور کتب حدیث کے اوراق میں بھی ان کو محفوظ کردیا ہے۔

سنت کو وحی کہنا اس لحاظ سے ہے کہ اس کے جزئیات اصولاً وحی حقیقی یعنی کتاب کے اندر داخل ہیں اور اس کی کلیت میں سنت کے تمام احکام مندرج ہیں۔ بنابریں چونکہ سنت وحی کے کلی منشا کے اندر داخل ہے، وہ بھی ضمنی حیثیت سے وحی کہی جاسکتی ہے لیکن چونکہ اس میں الفاظ کی تعیین خدا کی طرف سے نہیں اس لئے وہ غیر متلو ہے۔

اس فرق کا راز یہ ہے کہ کتاب کی اصلی حیثیت کلی قانون کی ہے۔ قانون کے اصل منشا کی حفاظت اور وضاحت کے لئے نہ صرف اس کے ایک ایک لفظ کے محفوظ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اس کے ایک ایک نقطہ، شوشہ، وقف، وصل، فصل، عطف، قطع، تقدم، تاخیر یعنی آج کل کی اصطلاح میں ایک ایک ڈیش اور کامے کی بعینہٖ حفاظت کی ضرورت ہے ورنہ ذرا سے تغیر میں قانون کا مطلب کچھ کا کچھ ہوجاسکتا ہے اور سنت کی یہ کلی قانونی حیثیت نہیں ہے بلکہ وہ اس کلی قانون کی تشریحات، تفصیلات اور جزئیات ہیں جو درحقیقت اس کلی قانون کے اندر مندرج تھے مگر چونکہ عام لوگوں کے فہم میں نہیں آتے تھے یا عام لوگ ان کو نہیں سمجھتے تھے اس لئے صحابہ کے دریافت پر یا خود حضور ﷺ نے اس کی ضرورت محسوس فرما کر اس کو کھول کر بیان فرمادیا کہ پھر اشتباہ نہ رہ جائے۔

اسی مقام پر ایک نکتہ اور بھی ہے کہ کتاب الٰہی میں جو حکم جن الفاظ میں ادا ہوا ہے وہ اگر بعض کم فہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا اور انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس کی تشریح چاہی اور انہیں نہیں معلوم ہوا کہ اس خاص جزئی واقعہ کا کیا حکم ہے اور قرآن پاک کی کس اصل سے ماخوذ و مستنبط ہوگا اور اس لئے انہوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا، تو اس کے جواب میں اگر آنحضرت ﷺ قرآن پاک کے بعینہٖ انہیں الفاظ کو بے کم و بیش دہرادیتے تو یہ بیکار ہوتا کہ انہیں الفاظ کے نہ سمجھ سکنے کے سبب تو سوال کی نوبت آئی اس لئے ضرور تھا کہ آنحضرت ﷺ الفاظ کو بدل کر اور طریقہ تعبیر کو تغیر دے کر ان الفاظ کی تشریح فرمائیں اور یہی احادیث ہیں۔

درحقیقت احادیث میں قانون الٰہی اور کتاب ربانی ہی کے مفہوم و منشا کو رسول ﷺ نے سمجھنے کی سہولت، گمراہوں کی تکمیل ہدایت اور اصل منشائے الٰہی کی پوری توضیح اور کہیں پوری تاکید کی خاطر مختلف لفظوں، مختلف عبارتوں اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا ہے اس لئے اصل مفہوم و منشاء کے لحاظ سے احادیث کے معانی ضمناً وحی ہیں لیکن الفاظ، عبارت اور تعبیر کی حیثیت سے یعنی لفظاً وحی نہیں ہیں بلکہ فہم نبوی، اجتہاد نبوی اور ملکہ نبوت کے غیر خطا پذیر نتائج ہیں۔ اسی لئے ان کو اصطلاح میں ''وحی غیر متلو'' کہتے ہیں۔

ہم اس فرق کی ایک مثال دے کر اپنے مطلب کو زیادہ واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ قرآن پاک میں والدین کی خدمت اور اطاعت کا حکم ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہے کہ والدین کی رضامندی گناہوں کی مغفرت کا سبب[1] ہے۔ یہ وحی الٰہی کا حقیقی منشاء ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس منشائے الٰہی کو ان الفاظ اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا ''ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے'' کبھی ارشاد ہوا ''رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے'' ایک صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ ''فرمایا'' تیری ماں' تیری ماں' تیری ماں' ایک دفعہ آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے۔ صحابہؓ حضوری کے شرف سے ممتاز تھے کہ زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے ''وہ ذلیل ہوا' وہ ذلیل ہوا' وہ ذلیل ہوا'' حاضرین نے عرض کی یا رسول اللہ! کون؟ ارشاد ہوا ''وہ جس نے اپنی ماں یا باپ کی ضعیفی پائی اور پھر ان کی خدمت گذاری کر کے جنت نہ حاصل کر لی'' ایک اور مجلس میں صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ نیکی کے کاموں میں خدا کو سب سے زیادہ کون سا کام پسند ہے؟ فرمایا ''وقت پر نماز ادا کرنا'' دریافت کیا اس کے بعد۔ فرمایا ''ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا''

ان تمام احادیث پر معمولی سی غور و فکر کی نظر بھی یہ راز ظاہر کر دے گی کہ یہ کل حدیثیں ذیل کی آیتوں کی تشریح و بیان ہیں۔

﴿ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ﴾ (بقرہ۔۹، نساء۔۶)
ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو

﴿ وَلَا تَقُلْ لَّهُمَا أُفٍّ ﴾ (اسرائیل۔۳)
وہ بوڑھے ہو جائیں تو اُن کو اُف نہ کہو

﴿ وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ ﴾ (احقاف۔۲)
یہ (ماں باپ کے خدمت گذار) وہ ہیں جن کی بدیوں سے ہم درگذر کرتے ہیں

یہی حال دوسرے قرآنی احکام کے بیانات و تشریحات کا ہے۔[2]

احادیث، قرآن کا بیان ہیں:

قرآن پاک اور احادیث دونوں پر جن کی عمیق اور وسیع نظر ہے ان کو یہ برملا معلوم ہوتا ہے کہ احادیث صحیحہ کے تمام فرعی اور ثانوی احکام قرآن پاک کے عمومی اور کلی احکام کے تحت میں مندرج ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اپنے الفاظ میں صرف ان کی تشریح فرمائی ہے۔ اس قسم کی حدیثوں کی عموماً تین شکلیں ہیں۔ ایک وہ جن میں آنحضرت ﷺ نے

---

[1] مجھے یہی شبہ تھا کہ میں اس رائے میں منفرد ہوں مگر بحمد اللہ کہ تلاش و تفحص سے ثابت ہوا ہے کہ دیگر متعدد علمائے اصول کا یہی مسلک ہے۔ چنانچہ یہ خیال اجمالاً سب سے پہلے امام شافعی کی کتاب الرسالۃ (ص ۲۔ ۲۹۔ ۶۲) مطبوعہ علمیہ مصر ۱۳۱۴ھ میں اور سب سے زیادہ مفصل امام شاطبی اندلسی المتوفی ۷۹۰ھ کی اہم تصنیف الموافقات فی اصول الاحکام جلد اول ص ۷۵، ۲۲۱ مطبوعہ سلفیہ ۱۳۴ھ میں موجود ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ میں بھی اس کا ایک باب ہے۔

[2] کتاب الرسالہ امام شافعی صفحہ ۸۔

اپنے الفاظ میں حکم بیان فرمانے کے بعد خود قرآن پاک کی کوئی آیت اس کے ساتھ پڑھ دی۔ اس قسم کی حدیثوں کے بیان ہونے میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے؟ دوسری شکل یہ ہے کہ آپ نے آیت نہیں پڑھی مگر خود اس حکم میں ایک دو لفظ ایسے فرما دیئے ہیں جو کسی آیت کا جز ہیں جس سے یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ حکم فلاں آیت کی تشریح ہے۔ اس صورت میں بھی اصل وفروع کی تمیز اہل علم کے لئے آسان ہے۔ تیسری شکل یہ ہے کہ آپ نے کسی آیت یا اشارہ کے بغیر صرف حکم بیان فرما دیا ہے۔ اس قسم کی حدیثوں کے ماخذ کی تلاش دقت نظر کا کام ہے ان کا پتہ زبان نبوت اور فہم رسالت کے طرز واسلوب کے سمجھنے والے راسخین فی العلم ہی پا سکتے ہیں۔

الہام واجتہاد وحکمت:

امام شافعیؒ نے کتاب الرسالہ میں احادیث وسنن کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک وہ جو بعینہٖ قرآن پاک میں مذکور ہیں، دوسری وہ جو قرآن پاک کے مجمل حکم کی تشریح ہیں، تیسری وہ جن کا ذکر (بظاہر) قرآن پاک میں نہ تفصیلاً ہے نہ اجمالاً یہی تیسری قسم قابل بحث ہے۔ امام صاحب نے اس کے متعلق آئمہ سلف کے چار نظریئے نقل کیے ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کی کلی اطاعت فرض کی ہے اور اس کے علم میں پہلے ہی سے یہ ہے کہ رسول جو کچھ کہے اور کرے گا اس میں رضائے الٰہی کی توفیق اس کے ساتھ شامل ہوگی (حاصل یہ ہے کہ پہلے ہی رسول کو یہ توفیق ربانی عنایت کی گئی ہے کہ وہ رضائے الٰہی کو دریافت کر لے)

۲۔ رسول نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا ہے جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو (مقصود یہ ہوا کہ اس قسم کے احکام بھی دراصل کتاب اللہ ہی سے ماخوذ ہیں گو بظاہر کم بینوں کو ایسا نظر نہ آئے)

۳۔ تمام احادیث نبوی القاء فی الروع ہیں (یعنی رسول ﷺ کے دل میں خدا نے ڈال دیئے ہیں) اور یہ اس حکمت کا نتیجہ ہیں جو آپ کے دل میں ڈالی گئی۔

۴۔ اس قسم کے تمام امور جو احادیث میں ہیں کتاب الٰہی سے جداگانہ مستقل پیغام ربانی کے ذریعہ رسول کو معلوم ہوئے ہیں۔

چوتھے نظریہ کو چھوڑ کر بقیہ تین آراء میرے خیال میں تقریباً ایک ہی ہیں۔ پہلے نظریہ کا منشاء یہ ہے کہ صریح وحی کے علاوہ جو وقتاً فوقتاً نبی پر آتی رہتی ہے اس کو ابتداء ہی سے ایک توفیق ازلی عنایت ہوتی ہے جس سے وہ پیش آمدہ امور میں رضائے الٰہی کو دریافت کر کے فیصلہ کرتا ہے، تیسرے نظریہ میں اسی توفیق علم کو الہام، القاء فی الروع اور دل میں ڈال دینے سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرے نظریہ کا منشاء یہ ہے کہ رسول کے جو احکام بظاہر کتاب اللہ میں نہ ہوں ان کی اصل بھی درحقیقت کتاب اللہ میں ہے اور رسول اسی اصل سے اپنے احکام کو مستنبط کرتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ استنباط عام انسانی و بشری فہم سے نہیں ہوتا ورنہ اس کا غلطی سے پاک ہونا مشتبہ رہے گا بلکہ وہ پیغمبرانہ قوت فہم کا نتیجہ ہوگا اور جب ایسا ہے تو اس پیغمبرانہ قوت فہم کی تعبیر خواہ الہام سے کرو، القاء سے کرو یا اس کو حکمت نبوی کا نتیجہ کہو یا توفیق الٰہی کہو، بات ایک ہی ہوئی۔

میرے نزدیک صحیح مسلک یہ ہے کہ رسول کے تمام صحیح ربانی احکام بھی عموماً اس کے صحیفہ ربانی سے ماخوذ ومستنبط

ہیں اور ان کے جزئیات کتاب الٰہی کے کلیات کے تحت میں مندرج ہیں اور رسول کا یہ اخذ' استنباط اور فہم اس کی پیغمبرانہ قوت علم کا نتیجہ ہیں جس کو حکماء ملکہ نبوت اور اہل شرع حکمت' الہام اور شرح صدر وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اور جو خطا اور غلطی سے یکسر پاک ہے۔

اجتہادِ نبوت:

اس موقع پر علمائے اصول کی ایک اور اصطلاح اجتہاد نبوی کی تشریح ضروری ہے۔ علمائے اصول لکھتے ہیں کہ جب کوئی نیا واقعہ آنحضرت ﷺ کے سامنے پیش آتا اور وحی نازل نہ ہوتی تو آنحضرت ﷺ اجتہاد فرماتے یعنی گذشتہ وحی شدہ احکام کے تطابق سے آپ حکم دے دیتے تھے (یہ فقہاء کا طریقہ تعبیر ہے ورنہ یوں کہنا چاہئے کہ رسول اپنی اس حکمت ربانی کے فیض سے مدد لے کر جو خدا نے ان کے سینہ میں ودیعت رکھی تھی گذشتہ وحی کے کلیات کی روشنی میں اس کا فیصلہ فرماتے تھے) بہرحال خواہ فقہاء کے طریقہ پر اجتہاد نبوی کو نصوص قرآنی سے مستنبط سمجھئے یا شاہ ولی اللہ صاحب کے نظریہ کے مطابق رسول کے علم سینہ اور وحی شدہ اصول کلی کے جزئیات تسلیم کیجئے، ہرحال میں وہ نتیجہ امت کے لئے واجب العمل اور خطا سے پاک ہے کیونکہ یہ مقدمہ اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ انبیاء گناہوں سے معصوم' ضلالت و گمراہی سے پاک اور ہوائے نفسانی سے مبرا ہوتے ہیں اس لئے امور رسالت اور امور دین میں ان کی کوئی رائے غلط نہیں ہو سکتی کہ ان کی غلطی سے پوری امت کا غلطی پر قائم ہو جانا مسلم ہے' حالانکہ ان کی بعثت کی غرض ہدایت ہے' ضلالت نہیں' ان وجوہ سے ان کا اجتہاد اگر کبھی کسی ایسے نتیجہ پر پہنچ جائے جو مصلحت الٰہی کے مطابق نہیں ہوتا تو ہمیشہ اللہ تعالیٰ اس پر تنبیہ فرما کر ان کو اپنی مرضی سے مطلع فرما دیتا ہے (اس کی مثالیں آئندہ آئیں گی) الغرض بعض امور میں خیر کے کسی خاص پہلو کو پیش نظر رکھ کر اس سے بہتر پہلو سے تغافل ہونے' یا غیب اور مستقبل سے عدم واقفیت کے سبب سے نبی کا اجتہادی خطا کرنا ممکن ہے مگر اس خطا پر نبی کا قائم رکھا جانا ناممکن ہے۔ ایسی صورت میں نبی کا ہر ایسا اجتہادی حکم جس پر وحی الٰہی نے فوراً کوئی تنبیہ نہیں کی یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ حکم علم الٰہی کے منشاء کے مطابق اور خطا و غلطی سے مبرا ہے اور اس کے دوسرے معنی وحی خفی یا باطنی وحی کے ہیں۔ [1]

میری رائے میں یہ اصطلاح بھی معنی گذشتہ اصطلاحوں کے قریب قریب ہے اس لئے اس اجتہاد نبوی کے معنی الہام' حکمت' ملکہ نبوت' فہم نبوی وغیرہ گذشتہ اصطلاحات سے عملاً الگ نہیں کہ اس کی حیثیت بھی وحی ثانوی کی قرار پا جاتی ہے۔

اس مبحث پر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں جو خیال ظاہر فرمایا ہے اس کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

---

[1] سطور بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے' اس کے حوالہ کے لئے دیکھو شرح تحریر ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ مسمی بہ التقریر و التحبیر للعلامہ ابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ھ ج ۳ ص ۲۹۴۔ ۲۹۹ مطبوعہ امیریہ مصر ۱۳۱۷ھ اور التلویح فی کشف حقائق التنقیح والتوضیح فی حل غوامض التنقیح ج ۲ ص ۴۵۲ مطبع مکتب صنائع قسطنطنیہ ۱۳۱۰ھ بحث الرکن الثانی فی السنۃ۔

ساتواں مبحث احادیثِ نبوی سے شریعت کے اخذ کرنے میں

علوم نبوی کی اقسام

رسول اللہ ﷺ کی جو روایتیں حدیث کی کتابوں میں جمع کی گئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔

ا۔ ایک تو وہ جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے ہے اور یہ آیت:

﴿مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (حشر)

پیغمبر تم کو جو کچھ دے اس کو لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز آؤ۔

اسی قسم کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

علوم معاد یعنی قیامت اور آخرت کے احوال یہ جزا و سزا اور عجائب الملکوت (یعنی دوسرے عالم کے احوال و کیفیات) اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سب کا دارومدار صرف وحی پر ہے اور ان اصول کے مطابق جن کا ذکر اوپر گذر چکا، قوانین شریعت اور عبادات و معاملات کی جزئیات کا ضبط بھی اسی قسم میں داخل ہے، لیکن ان میں سے بعض چیزوں کا دارومدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کا اجتہاد بھی وحی کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو غلط رائے قائم کرنے سے محفوظ رکھا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کا ہر اجتہاد کسی خاص نص و آیت سے استنباط کا نتیجہ ہو، جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے بلکہ آپ کے اجتہاد کی زیادہ تر صورت یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے شریعت اور وضع قانون کے مقاصد، انسانوں کی آسانی اور بھلائی اور اصولی مقاصد کا قانون آپ ﷺ کو تعلیم کر دیا تھا۔ وہ مقاصد جن کا ماخذ وحی تھا آپ اس کلی و اصولی قانون کے ذریعہ سے جو آپ کو سکھایا گیا تھا، ان کی تشریح فرما دیا کرتے تھے۔ حکمت کی متفرق باتیں اور عام مصلحتیں جن کے لئے آپ نے نہ کوئی وقت مقرر کیا، نہ ان کے حدود بتائے مثلاً اخلاق صالحہ اور اخلاق غیر صالحہ کا بیان بھی تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتا ہے لیکن ان میں اکثر کا دارومدار اجتہاد پر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو باہمی معاملات و اجتماع کا کلی قانون تعلیم کر دیا تھا اور آپ نے حکمت کی باتیں اسی کلی قانون سے جو آپ کو تعلیم کر دیا گیا تھا مستنبط کیں اور ان کے متعلق ایک کلیہ بنایا۔ فضائل، اعمال اور ان پر عمل کرنے والوں کے مناقب بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور میرے خیال میں ان میں بعض کا دارومدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے۔ ان قوانین کا بیان اوپر گذر چکا ہے اور ہم اسی قسم کی شرح کرنا اور ان کے معانی کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

۲۔ دوسری وہ روایتیں ہیں جو تبلیغ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ ”میں صرف ایک آدمی ہوں جب میں تمہارے دین کے متعلق تم کو کوئی حکم دوں تو اس پر عمل کرو اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو یہ سمجھو کہ میں صرف ایک آدمی ہوں“۔ اور چھوہاروں کے جوڑ لگانے کے واقعہ میں آپ کا یہ فرمانا کہ ”میں نے ایک خیال قائم کیا تھا۔ میرے خیال پر تم لوگ عمل نہ کرو البتہ جب خدا کی کوئی بات بیان کروں تو اس پر عمل کرو کیونکہ میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا“ اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ طب کے متعلق حدیثیں اور آپ کا یہ ارشاد کہ ”تم سیاہ رنگ اور ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس کی پیشانی میں تھوڑی سی سفیدی ہو“۔ اسی قسم میں داخل ہے اور اس کا دارومدار تجربہ پر ہے۔

آپ نے جو کچھ عادتاً کیا عبادتاً نہیں، اتفاقاً کیا قصداً نہیں، وہ بھی اسی قسم میں داخل ہے۔ آپ نے جو واقعات ایسے بیان کئے جن کا تمام قوم میں چرچا تھا مثلاً ام زرع اور خرافہ کے قصے، وہ بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی بات کو حضرت زید بن ثابتؓ نے جب ان سے چند لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی اس طرح بیان کیا کہ ”میں آپ کا پڑوسی تھا اور جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ ﷺ مجھ کو بلا بھیجتے تھے اور میں آپ کے حکم سے اس کو لکھا کرتا تھا لیکن جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر فرماتے تھے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے تو کیا میں ان تمام چیزوں کو بطور حدیث بیان کروں؟“

اسی میں وہ چیزیں بھی داخل ہیں جن کو آپ ﷺ نے اپنے زمانہ کے جزئی و عارضی مصلحت کے طور پر کیا ہے اور وہ تمام امت کے لئے ضروری نہیں مثلاً فوجوں کی آراستگی اور جنگی علامت کی تعیین کے وہ احکام جن کو خلیفہ دیتا ہے اور حضرت عمرؓ کے اس قول کے کہ ”اب ہم کو حج میں اکڑ کر چلنے کی کیا ضرورت؟ ہم ایک قوم (کفار قریش) کے سامنے اس کی نمائش کرتے تھے لیکن اب خدا نے اس کو ہلاک کر دیا“ بھی یہی معنی ہیں کہ وہ اس کو ایک خاص جزئی و عارضی مصلحت سمجھتے تھے لیکن چونکہ اپنے اس اجتہاد پر پورا اطمینان نہ تھا اس لئے ان کو یہ خوف ہوا کہ شاید اس کا سبب کوئی اور ہو، اس لئے اس میں دست اندازی نہیں کی۔ اسی طرح دوسرے احکام بھی اسی پر محمول کئے گئے ہیں مثلاً آپ کا یہ ارشاد کہ ”جو شخص جس کو قتل کرے اس کا ہتھیار اسی کا حق ہے“ نیز آپ کے مخصوص فیصلے بھی اسی قسم میں داخل ہیں کہ آپ مقدمات کے ان فیصلوں میں گواہوں اور قسموں کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو یہ فرمایا تھا کہ ”واقعہ میں حاضر جو کچھ دیکھتا ہے اس کو غائب نہیں دیکھتا اس کے معنی بھی یہی ہیں“۔ (انتہی کلامہ)

شاہ صاحب کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کا تعلق پیغمبرانہ فرائض، تبلیغ رسالت اور مہمات امور دین سے ہے، یہ تمام باتیں براہ راست وحی و تعلیم الٰہی سے ماخوذ ہیں، دوسری وہ جو عام انسانی باتیں ہیں، اس کی متعدد صورتیں ہیں۔

۱۔ کسی جزئی عارضی مصلحت کی بناء پر کوئی حکم جیسے حج میں آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ قریش کے سامنے اکڑ کر سعی کریں تاکہ قریش یہ نہ سمجھیں کہ مدینہ کی آب و ہوا نے ان کو کمزور کر دیا ہے۔

۲۔ وہ امور جن کو دین و رسالت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں بلکہ زمانہ کے حالات کے ساتھ وہ بدلتے رہتے ہیں مثلاً جنگ کا طریق، ہتھیار کے اقسام، حکومت کے صیغوں کی ترتیب وغیرہ۔

۳۔ وہ امور جن کو آپ اپنی شخصی، قومی یا ملکی عادت کے مطابق کرتے تھے جن کو دین و رسالت سے کوئی واسطہ نہیں مثلاً وضع و لباس، فرش پر نشست، کمبل اوڑھنا، دسترخوان، چمچوں کا عدم استعمال، عمامہ باندھنا، تہبند پہننا، اونٹ پر سوار ہونا وغیرہ۔

۴۔ وہ امور جو عرب میں بطور قصہ کے مشہور تھے اور آپ نے بھی ان کو اسی طرح تفنن طبع کے لئے یا کسی اخلاقی نتیجہ کی خاطر بیان فرمایا مثلاً ام زرع اور اس کی نو سہیلیوں کی کہانی، خرافہ کی داستان، بنی اسرائیل کی بعض حکایتیں۔

۵۔ عربوں کے بعض تجربی مسلمات اور علاج و معالجہ کی بعض باتیں۔

۶۔ زراعت وغیرہ کے متعلق بعض ذاتی رائیں، مثلاً مدینہ میں قاعدہ تھا کہ فصل کے موقع پر نر چھوہاروں کے پھول مادہ چھوہاروں کے درختوں میں ڈالے جاتے تھے۔ آپ نے یہ طریقہ دیکھا تو اس کو محض رسمی بات سمجھ کر فرمایا کہ ''اگر ایسا نہ کرو تو کیا ہو'' مدینہ والوں نے آپ کے اس ہلکے سے اشارہ کو حکم کے طور پر مانا اور اس سال یہ ترکیب چھوڑ دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال پیداوار کم ہوگئی۔ لوگوں نے آ کر عرض کی۔ فرمایا ''میں نے ایسا خیال کیا تھا ﴿انتم اعلم بامور دنیاکم﴾ کہ تم اپنے دنیاوی کاروبار اور معاملات سے زیادہ واقف ہو'' یہ اس تغیر اور رد و بدل کے قابل ہو سکتے ہیں۔

الغرض یہ وہ امور ہیں جن میں رسول کے ارشادات کی حیثیت انسانی باتوں کی ہے لیکن ان کے دوسرے امور جن کا تعلق دین و رسالت و نبوت سے ہے مثلاً عقائد، عبادات، اخلاق اور اخبار معاد اور معاملات کے بعض ضروری حصے، یہ سب کے سب وحی اور تعلیم ربانی سے ہیں جو دائمی اور ناقابل تغیر ہیں۔

ان ناقابل تغیر امور کی تعلیم و اطلاع کی دو صورتیں ہیں، ایک براہ راست وحی الٰہی جو وقتاً فوقتاً پیغمبر کی تعلیم و اطلاع کے لئے خدا کی طرف سے آیا کرتی تھی اور دوسری اجتہاد نبوی یہاں بحث اسی دوسری چیز سے ہے۔ شاہ صاحب اس کے متعلق دو باتیں فرماتے ہیں:۔

۱۔ ایک یہ کہ اجتہاد نبوی کی صورت و حقیقت مجتہدین کے اجتہاد کی طرح نہیں ہے۔ مجتہدین کا اجتہاد کسی خاص نص سے استنباط کا نام ہے اور پیغمبروں کے اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اجمالی طور سے شریعت کے کلی اصول و قواعد کا علم منصب نبوت کے ساتھ عطا فرما دیا ہے۔ اسی علم کے مطابق آپ وحی کی توضیح، احکام منصوصہ کی تفصیل، کسی کلی کے جزئیات مسائل کی تشریح اپنے الفاظ میں فرما دیا کرتے تھے۔

۲۔ پیغمبروں کا یہ اجتہاد دوسرے عام انسانی مجتہدین کے اجتہادات کے برخلاف خطا و غلطی سے یکسر پاک و منزہ ہوتا ہے کیونکہ ان کی رائے خطا و غلطی پر باقی رکھے جانے سے محفوظ بنائی گئی ہے، اس لئے ''ان کا پیغمبرانہ اجتہاد بھی بمنزلہ وحی کے ہے''

''پیغمبرانہ اجتہاد'' کی جو تشریح شاہ صاحب نے فرمائی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر یہ فیصلہ نہایت آسان ہے کہ دوسرے لوگ ملکہ نبوت، الہام، القاء، حکمتِ ربانی، فہم نبوی سے جو کچھ مراد لیتے ہیں اس میں اور ''اجتہاد نبوی'' میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے کہ اس اجتہاد سے مقصود وہ قوت علمیہ یا الہامیہ یا نبویہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ خاص پیغمبر کے سینہ میں ودیعت رکھتا ہے اسی لئے مجتہدانہ اجتہاد اور پیغمبرانہ اجتہاد کے درمیان صرف لفظ کی مشارکت ہے معنی کی نہیں۔ مزید بحث آگے آئے گی۔

ایک نکتہ کی طرف یہاں اور اشارہ کر دینا ہے، آنحضرت ﷺ کے سوا اور جتنے صاحب کتاب انبیاء آئے ان کی وحی کتاب اور نتائج حکمت نبوی میں فرق و امتیاز باقی نہیں رہا۔ چنانچہ توراۃ و انجیل و زبور میں یہ سب باتیں ملی جلی ہیں جیسا کہ ان کے پڑھنے سے ہر شخص کو نظر آ سکتا ہے مگر محمد رسول اللہ ﷺ چونکہ آخری اور غیر منسوخ کتاب لے کر آئے تھے اس لئے آپ کی کتاب کی ہر طرح حفاظت کی گئی اور ہر تخلیط اور آمیزش سے محفوظ رکھی گئی بلکہ اسی لئے آغاز اسلام میں آپ

نے نتائج حکمت نبوی کی تحریر سے لوگوں کو باز رکھا تا کہ کتاب کے ساتھ ان کی آمیزش نہ ہو۔ بعد کو جب یہ خطرہ باقی نہ رہا تو اکثروں کے نزدیک یہ ہے کہ آپ نے ان کی تحریر کی اجازت دے دی اور بعض متشدد صحابہ اور علماء کے نزدیک یہ اجازت مخصوص لوگوں کے لئے تھی، عام نہیں۔ لیکن یہ اختلاف تحریر و کتابت میں ہے ان کی صحیح طور سے حفاظت و روایت و تبلیغ میں نہیں، اس لئے اس خدمت کو تمام صحابہ نے تابعین، تبع تابعین اور تمام علمائے صالحین نے ہمیشہ ادا کیا۔

عصمت اور بیگناہی:

نبی کی تیسری اہم خصوصیت اس کی معصومی اور بے گناہی ہے۔ یہود میں چونکہ پیشین گو ہونے کے علاوہ نبی کا کوئی صحیح تخیل نہیں، اس لئے ان کی کتابوں میں انبیاء کرام علیہم السلام کی طرف ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جو ان کی شان نبوت کے سراسر منافی ہیں۔ عیسائیوں میں صرف ایک مسیحؑ کی ذات معصوم مانی جاتی ہے لیکن اسلام میں یہ عقیدہ ہر نبی اور رسول کی نسبت عام ہے اس کے نزدیک تمام انبیاء اور رسول گناہوں سے پاک اور معصوم تھے ان سے بتقاضائے بشریت بھول چوک ہو سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی وحی سے ان کی ان غلطیوں کی بھی اصلاح کرتا رہتا ہے۔ نبوت کے متعلق عقلی حیثیت سے بھی جب تک عصمت کا اصول مان نہ لیا جائے نبی اور عام حکیم و مصلح میں فرق نمایاں نہیں ہو سکتا اور نہ نبیوں اور رسولوں کی کامل صداقت اور صحت پر اعتبار کیا جا سکتا، اسی لئے اسلام نے اس عقیدہ کا بھی بڑا اہتمام کیا ہے۔ ایک ایک کر کے تمام پیغمبروں کے مقدس احوال کا تذکرہ کیا ہے اور ان واقعات کی تردید کی ہے جو شان عصمت کے خلاف ہیں اور جن کو لوگوں نے ان کے سوانح میں شامل کر دیا ہے۔

عرب کے مشرکوں کا یہ عقیدہ تھا کہ کاہن جو غیب کا حال بتاتے ہیں اور شاعر جو پر جوش اور پر تاثیر کلام نظم کرتے ہیں یہ شیطانوں سے سیکھ کر بتاتے اور کرتے ہیں اور یہی بات وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نسبت بھی (نعوذ باللہ) کہتے تھے قرآن نے ان کے جواب میں کہا درخت اپنے پھل سے اور شے اپنے آثار سے پہچانی جاتی ہے۔

﴿ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ٥ اِنَّمَا سُلْطَانُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴾ (نحل۔۱۳)

شیطان کا زور ایمان والوں پر نہیں چلتا، اور نہ ان پر جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اس کا زور انہیں پر چلتا ہے جو اس سے دوستی کرتے ہیں، اور اپنے رب کا شریک ٹھہراتے ہیں

اس کے بعد آخر تک اس خیال کی تردید کی ہے اور پھر خاتمہ اس پر ہے۔

﴿ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ٥ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴾ (نحل۔۱۶)

اور صبر کر، اور تیرا صبر کرنا بھی خدا ہی کی مدد سے ہے، اور نہ تو ان پر غمگین ہو اور نہ ان کے فریب سے تنگدل ہو۔ بے شک خدا ان کے ساتھ ہے، جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکوکار ہیں۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ انبیائے کرام شیطانوں کے فریب سے آزاد، متقی، پرہیزگار اور نیکوکار ہوتے ہیں۔

سورۂ شعراء میں اسی شبہ کا جواب تمام پیغمبروں کے حالات کو سنا کر آخر میں یہ کہہ کر دیا ہے۔

﴿ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ۝ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ يُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴾ (شعراء۔۱۱)

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں۔ ان پر اترتے ہیں، جو جھوٹ گھڑتے ہیں، گنہگار ہوتے ہیں۔ لوگوں کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ وہ غیب کی باتیں سن رہے ہیں کان ڈالتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔

سورۂ جاثیہ میں مخالفین کے جواب میں کہا گیا۔

﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ج فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ (جاثیہ۔۱)

پھٹکار ہو اس پر جو جھوٹ گھڑنے والا گنہگار ہے، خدا کی آیتوں کو جو اس کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، وہ سنتا ہے اور پھر اپنے غرور پر اڑا ہی رہتا ہے گویا کہ اس نے سنا نہیں، تو اس کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ انبیاء علیہم السلام جھوٹ گھڑنے والے اور گنہگار نہیں ہوتے کہ اگر ایسے ہوں تو فرشتوں کے بجائے وہ شیطانوں کے قرین و رفیق ثابت ہوں اور ان کی سچائی اور صداقت مشتبہ ہو جائے، اور نیز یہ کہ نبوت کی حقیقت کذب و گنہگاری کے صریح منافی ہے۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا۔

﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ (آل عمران۔۸)

اس آدمی کے جس کو اللہ کتاب اور فیصلہ اور نبوت دے، یہ شایاں نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔

یعنی پیغمبروں کی دعوت کا منشاء خدا کی بندگی کا اعلان ہے نہ کہ لوگوں کو اپنا بندہ اور پرستار بنانا اور یہ گناہ ان سے سرزد نہیں ہوتا۔

اور ایک آیت میں فرمایا۔

﴿ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ط وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ج ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰهُ جَهَنَّمُ ط وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ (آل عمران۔۱۷)

کسی پیغمبر کا یہ کام نہیں کہ وہ جو کچھ چوری سے چھپالے، اور جو کوئی چھپالے گا قیامت کے دن لے کر اس کو حاضر ہوگا، پھر اس وقت ہر شخص کو اس کے کام کا پورا بدلہ ملے گا، اور ان پر ظلم نہ ہوگا، کیا جو خدا کی خوشنودی کی پیروی کرے، وہ اس کے جیسا ہو سکتا ہے جو خدا کا غضب کمائے، اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے، انسانوں کے خدا کے نزدیک کئی درجے ہیں، اور خدا ان کے کام سے خبردار ہے۔ بے شبہ اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں

ایک ایسے رسول کو بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، اور ان کو پاک وصاف بناتا اور کتاب وحکمت سکھاتا ہے، اور وہ بے شک اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

ان آیتوں میں گو ہر نبی سے غلول (مال چھپانے) کی نفی کی ہے اور فرمایا ہے کہ نبی جو خدا کی خوشنودی کی ہمیشہ پیروی کرتے ہیں وہ ان کے مانند نہیں ہوسکتے جو خدا کی خفگی کماتے ہیں، مگر خصوصیت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ اس سے ایسا جرم سرزد ہوسکے، کیونکہ اللہ کی رضامندی کا طالب اس کی ناخوشی کے کام کا مرتکب نہیں ہوسکتا، اور جو دوسروں کو احکام الٰہی سنائے خود اس سے ان احکام کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور جو دوسروں کو پاک وصاف کرنے پر مامور ہے وہ خود گنہگار وناپاک نہیں ہوسکتا۔

انبیاء علیہم السلام کے لئے بار بار قرآن نے ''چن کر پسند کرنا'' کا لفظ استعمال کیا ہے جو سرتاسر ان کی عصمت اور گناہوں سے محفوظ وپاک رہنے پر دلالت کرتا ہے۔ عام پیغمبروں کے متعلق یہ آیت ہے۔

﴿اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ (حج۔۱۰)

خدا فرشتوں میں سے اپنے پیغمبر کو چن کر پسند کرتا ہے، اور آدمیوں سے

چند مخصوص پیغمبروں کی شان میں ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ﴾ (آل عمران۔۴)

اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام اہل دنیا پر چن کر پسند کیا۔

خاص حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ارشاد ہوا۔

﴿وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا﴾ (بقرہ)

ہم نے اس کو دنیا میں چن کر پسند کیا۔

حضرت موسیٰ کی نسبت فرمایا:

﴿اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَبِكَلَامِیْ﴾ (اعراف۔۱۷)

میں نے تجھ کو اپنے کلام اور پیغاموں کے لئے لوگوں پر چن کر پسند کیا۔

ایک آیت میں پیغمبروں کے لئے اصطفاء کے ساتھ خیر (بہتر اور نیکوکار) کی صفت کی ظاہر کی گئی ہے۔

﴿وَاذْکُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ اُولِی الْاَیْدِیْ وَالْاَبْصَارِ ۝ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِکْرَی الدَّارِ ۝ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَیْنَ الْاَخْیَارِ﴾ (ص۔۴)

ہمارے خاص بندوں ابراہیمؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ کو یاد کرو جو ہاتھوں والے (قوت عمل) اور آنکھوں والے (قوت علم) تھے۔ ہم نے ان کو آخرت کی خالص نصیحت کے لئے خالص کیا اور وہ ہماری بارگاہ میں چنے ہوئے نیکوکاروں میں تھے۔

سورۂ انبیاء میں اکثر پیغمبروں کے تذکرہ کے بعد فرمایا:

﴿وَکُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِیْنَ ۝ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَیْنَآ اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ

وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴾ (انبیاء۔۵)

ان میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا' اور ہم نے ان کو وہ پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو راہ دکھاتے تھے' اور ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے کی اور نماز کھڑی کرنے اور زکوۃ دینے کی وحی کی' اور وہ ہمارے پرستار تھے۔

کیا اس سے زیادہ ان کی عصمت اور بے گناہی کی شہادت ہو سکتی ہے کہ وہ امام و پیشوا اور صالح اور خدا کے نیک پرستار بنائے گئے۔

سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر سب کو صالح فرمایا گیا

﴿ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ (انعام۔۱۰)

یہ سب صالحوں میں تھے۔

پھر آگے چل کر فرمایا۔

﴿ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (انعام۔۱۰)

ہر ایک کو دنیا والوں پر فضیلت دی۔

پھر ان کا ذکر کر کے فرمایا۔

﴿ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾

''اور ہم نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا''

صالح ہونا برگزیدہ ہونا اور راہ راست پر ہونا سراسر عصمت اور بے گناہی ہے۔

شقی و سعید اور گنہگار و نیکوکار دونوں کی سیرتوں اور زندگیوں کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ ان میں التباس و اشتباہ ممکن نہیں۔ تاریخ و سیر کی خاموش اور خلق کی گویا زبانیں چیخ چیخ کر اس فرق و امتیاز کی منادی کرتی رہتی ہیں۔ اس اصول کو قرآن پاک نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴾ (جاثیہ۔۲)

کیا وہ جو گناہوں کے مرتکب ہیں' یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان کی طرح جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے، بنائیں گے' ان دونوں کی زندگی اور موت یکساں ہو' یہ ان کا فیصلہ کتنا برا ہے۔

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کی زندگی اور موت دونوں ممتاز ہوتی ہیں۔

انبیاءؑ کے وصف میں فرمایا:

﴿ اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ﴾ (احزاب۔۵)

جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں' اور اس سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

آنحضرت ﷺ کے اہل بیت اور بیویوں کو جو عزت اور شرف حاصل ہے وہ نبوت و رسالت ہی کی نسبت سے ہے۔ ازواج مطہراتؓ کی شان میں ہے۔

﴿ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ ﴾ (احزاب۔۴)
اے پیغمبر کی بیویو! تم عام عورتوں میں سے کسی ایک کی طرح نہیں ہو‘ اگر تم متقی ہو۔

پھر اہل بیت نبوی کو خطاب کر کے فرمایا کہ ارادۂ ربانی یہ ہے کہ وہ تم کو برائی سے پاک اور صاف ستھرا بنائے۔

﴿ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا ﴾ (احزاب)
اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کر دے اے نبی کے گھر والو! اور تم کو بالکل صاف ستھرا بنا دے

ظاہر ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام کے ازواج واولاد کی شرافت کے لئے گناہ اور بدی کی نجاست مخل ہے تو خود انبیاء علیہم السلام کا کیا ذکر ہے۔ ایک دوسری آیت میں حضرت عائشہؓ کو تہمت سے بری کر کے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

﴿ اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَالْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثٰتِ ۚ وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ اُولٰٓئِکَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا یَقُوْلُوْنَ ﴾ (نور۔۳)
گندیاں‘ گندوں کے واسطے‘ اور گندے گندیوں کے لئے‘ اور ستھریاں ستھروں کے واسطے‘ اور ستھرے ستھریوں کے واسطے‘ یہ ان کی تہمت سے پاک ہیں۔

یہاں طیب‘ پاک اور ستھرے سے ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ ہے اور اسی ستھرے پن‘ پاکی اور طہارت سے ازواج مطہرات کے اخلاقی ستھرا پن‘ پاکی اور طہارت پر استدلال کیا گیا ہے۔

انبیاء درحقیقت مقتدیٰ اور پیشوا اور نمونہ بن کر اس دنیا میں بھیجے جاتے ہیں، اسی لئے فرمایا:

﴿ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ ﴾ (احزاب۔۳)
تمہارے لئے خدا کے رسول میں اچھی پیروی ہے۔

نیز ان کی اطاعت واجب ہے۔

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ ﴾ (نساء۔۹)
ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن اس لئے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

اور خاص آنحضرت ﷺ کی نسبت تصریح ہے کہ آپ کی پیروی خدا کا محبوب بننے کا مستحق ٹھہراتی ہے۔

﴿ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ ﴾ (آل عمران۔۳)
’’اگر تم خدا کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم کو چاہے گا۔

کیا کسی گنہگار اور عصیاں کار کی زندگی‘ پیروی‘ اتباع اور نمونہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ تاریکی سے کبھی روشنی نکلی اور گندگی سے پاکی کبھی پیدا ہوئی‘ اور گنہگاروں کی دعوت سے کبھی نیکوکاری پھیلی ہے؟ برائی اور گنہگاریوں کا اصلی سرچشمہ اور منبع شیطان یا انسان کی خود قوت شر ہے لیکن خدا کے خاص بندے اس کے دام فریب سے آزاد ہیں۔

﴿ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ وَکَفٰی بِرَبِّکَ وَکِیْلًا ﴾ (اسرائیل۔۷)
یقیناً میرے بندوں پر تیرا (اے شیطان) کوئی زور ہے نہیں‘ تیرا پروردگار اپنے بندوں کی طرف سے سب کچھ کر دینے کو بس ہے۔

کیا انبیائے کرام علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی بندۂ رب ہو سکتا ہے؟

انسانوں کی گمراہی اور عصیان کاری، وسوسہ شیطانی کا نتیجہ ہوتی ہے، خواہ یہ شیطان خود اپنے دل کے اندر (خناس) چھپا ہو یا انسان اور جن کی صورت میں ہو، ہر ایک کے فتنہ سے ان کی ذات پاک اور بلند ہے۔

آنحضرت ﷺ کو بعض خود غرض لوگوں نے بعض مشوروں میں پھسلانا چاہا مگر خدا نے پھسلنے نہ دیا اور فرمایا کہ میری رحمت اور مہربانی تجھ پر مبذول ہے، وہ ہر وقت تیری دستگیر ہے اور گمراہی سے تیری نگہبان ہے اور کتاب الٰہی اور حکمت و دانائی جو تجھے عطا ہوئی وہ تیری پاسبان ہے۔

﴿ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴾ (نساء۔۱۷)

اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی، تو ایک گروہ نے تیرے گمراہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، اور وہ گمراہ نہیں کریں گے۔ لیکن خود اپنے آپ کو، اور تجھے کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے، اور اس نے وہ سکھایا ہے جو تو نہیں جانتا تھا، اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے۔

اور یقیناً موقع محل کی شہادت سے اس سب سے بڑے فضل سے یہاں مراد عصمت ہے۔

خود نفس انسانی بھی اپنی جھوٹی تمناؤں اور خود غرضانہ آرزوؤں اور خوش نما خیالوں سے لوگوں کو دھوکا دیتا ہے لیکن انبیاء علیہم السلام اس فریب تمنا سے بھی پاک ہیں۔ بشریت کے اقتضاء سے یہ تو ممکن نہیں کہ خود اپنے مشن اور جس دعوت حق کو لے کر وہ آئے ہیں اس کی جلد از جلد کامیابی اور لوگوں کے بسرعت قبول ایمان کے متعلق ان کے دل میں تمنائیں اور آرزوئیں نہ پیدا ہوتی ہوں لیکن وہ مصلحت الٰہی کے مطابق نہیں ہوتیں اس لئے اللہ تعالیٰ ان خیالات اور تمناؤں کو ان کے دلوں سے نکال دیتا ہے اور اپنے فیصلہ کو برجا رکھتا ہے، فرمایا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَآ تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ (حج۔۷)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا، لیکن یہ کہ جب وہ خیال باندھتا ہے، تو شیطان اس کے خیال میں کچھ ملا دیتا ہے، تو خدا شیطانوں کی ملاوٹ کو مٹا دیتا ہے، اور اپنے حکموں کو مضبوط کر دیتا ہے، اور خدا دانا اور حکمت والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرامؑ غلط خیال آرائی کے گناہ سے بھی محفوظ رکھے جاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے متعلق فرمایا گیا ہے۔

﴿ مَاضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ﴾ (نجم۔۱)

(اے مسلمانو) تمہارا صاحب نہ گمراہ ہوا، نہ بھٹکا۔

اس عدم گمراہی اور عدم ضلالت کا تعلق کسی خاص عہد اور وقت سے نہیں ہے بلکہ اس آیت میں آنحضرت ﷺ کے ہر عہد سابق اور زمانہ ماضی سے ضلالت اور غوایت کی پوری نفی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کا دامن سدا ان کانٹوں سے پاک رہا۔

بعض شبہات کا ازالہ:

قرآن پاک میں بعض ایسے الفاظ ہیں جن سے ایک ظاہر بین کو یہ دھوکا ہوسکتا ہے کہ بعض پیغمبروں کے دامن پر عدم معصومیت کے بھی داغ ہیں مگر علمائے محققین نے ان میں سے ہر ایک شبہ کا تشفی بخش جواب دے دیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ علامہ ابن حزم اندلسی نے الفصل فی الملل والنحل (جلد چہارم) میں اور قاضی عیاض مالکی نے شفا (قسم ثالث، باب اول) میں، خفاجی نے شرح شفا (جلد چہارم) میں اور متاخرین میں مُلا دوست محمد کابلی نے تحفۃ الاخلاء فی عصمۃ الانبیاء میں ایک ایک شبہہ کو پوری طرح رد کیا ہے جس سے ظاہر بینی کا پردہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور اصل حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ ان میں سے ہر شبہہ کا ذکر کرنا اور اس کا رد کرنا ایک طویل عمل ہے۔ مختصراً اصولی طور سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس مسئلہ میں جو غلط فہمیاں کسی کو پیش آتی ہیں ان کے دو اسباب ہیں اور ان اسباب کی تشریح کر دینا ہی ان غلط فہمیوں کو دور کر دینا ہے۔

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام کا پایہ بندوں میں بلکہ تمام مخلوقات میں خواہ کس قدر بلند ہو، اور ان کا دامن گناہ و عصیاں کے گرد و غبار سے کتنا ہی پاک ہو، تاہم اس ذوالجلال والاکرام کے سامنے ان کی حیثیت ایک عبد ایک بندہ اور ایک عاجز مخلوق کی ہی ہے۔ ایک عبد و غلام خواہ کسی قدر اطاعت کیش، کتنا ہی وفا شعار اور مطیع و فرمانبردار ہوتا ہم اپنے آقا کے سامنے اس کو اپنے قصور کا معترف، اپنی تقصیر کا مقر، اپنی کوتاہیوں پر خجل اور اپنی فروگذاشتوں پر نادم ہی ہونا چاہیے اسی لئے حضرت ابراہیمؑ جن کی نیکی اور پاکی کی شہادت سے قرآن بھرا ہوا ہے وہ خدا کی عظمت و جلال اور اس کی رحمت و شفقت کے ذکر میں فرماتے ہیں:

﴿ وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَلِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴾ (شعراء۔۵)

اور وہ خدا جس سے جزا کے دن اپنی بھول چوک کی معافی کی پوری امید رکھتا ہوں۔

نبی کا یہ اعتراف و اقرار اور خجالت و ندامت اس کا نقص نہیں بلکہ اس کی بندگی اور عبودیت کا کمال ہے اور آقا کو حق پہنچتا ہے کہ اس کے غلام، اطاعت و فرمانبرداری کے جس حیرت انگیز رتبہ تک بھی پہنچتے ہیں وہ ان سے اطاعت کیشی اور وفا شعاری کے اس سے بھی بلند رتبہ کا مطالبہ کرے کہ اس کے دربار میں ان کے عروج و ترقی کی کرسی اور بھی اونچی ہوتی جائے۔ بعض آیتوں میں اگر کسی پیغمبر کو خدا سے مغفرت مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے تو اس کا سبب گناہ کا وجود نہیں بلکہ ہر قدم پر گذشتہ رتبہ اطاعت پر قناعت کر لینے پر تنبیہ اور مزید اطاعت کا مطالبہ ہے تاکہ وہ اس کے مزید تقریب کا ذریعہ بن سکے آنحضرت ﷺ کو خطاب ہوتا ہے:

﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ط اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ﴾ (نصر)

جب اللہ کی مدد آچکی اور (مکہ) فتح ہو چکا اور لوگوں کو اللہ کے دین میں گروہ در گروہ جاتے دیکھ چکا تو اپنے پروردگار کی پاکی بیان کر اور اس سے معافی چاہ کہ وہ بندہ کے حال پر رجوع کرنے والا ہے۔

غور کرو کہ خدائی مدد آنا، مکہ فتح ہونا، بت پرستی کی بیخ کنی، اور لوگوں کا مسلمان ہو جانا کوئی جرم ہے جس سے کوئی

معافی چاہے۔ اسی طرح سورۂ فتح میں فرمایا:

﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ○ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ○ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ﴾ (فتح۔۱)

ہم نے تجھ کو کھلی فتح دی، تا کہ اللہ تیری اگلی پچھلی خطا کو معاف کرے، اور اپنا احسان تجھ پر پورا کرے، اور تجھ کو سیدھی راہ چلائے، اور تجھ کو مضبوط مدد دے۔

دوبارہ غور کرو کہ مکہ کی فتح کامل نصیب ہونے کو حضور کی معافی سے بجز اس کے کیا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے حسن خدمت کو قبول فرما کر اپنی خوشنودی کا اظہار فرماتا ہے۔

اس استغفار سے مقصود نعوذ باللہ پیغمبر کی گنہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ اس کی عبدیت کاملہ کا اظہار ہے۔

حضرت عیسیٰؑ جن کے خدا کے بیٹے ہونے کے عیسائی، اور فرشتے جن کے خدا کی بیٹیاں ہونے کے اہل عرب قائل تھے اور ان کو خدا کا درجہ دیتے تھے، ان کے متعلق قرآن نے کہا:

﴿ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ط وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴾ (نساء۔۲۴)

مسیحؑ کو ہرگز اس سے عار نہ آئے گا کہ وہ خدا کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتوں کو، اور جو اس کی بندگی سے عار کرے گا اور بڑائی چاہے گا تو خدا ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔

اس سے مقصود نعوذ باللہ حضرت عیسیٰؑ کی توہین نہیں بلکہ ان کی عبدیت اور بندگی کا اعلان ہے

الغرض انبیاءؑ کا خدا کے حضور میں اپنی کوتاہی کا اعتراف، ان کی گنہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ ان کی عبدیت کاملہ کا اظہار ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی پیغمبر کی نسبت یہ فرمانا کہ میں نے تجھے معاف کیا اس کی گنہگاری کا اعلان نہیں بلکہ اپنی پسندیدگی رضا اور قبول تام کی بشارت ہے۔ سورۂ فتح کی جو آیتیں اوپر گذریں ان کو پڑھو تو ظاہر ہوگا کہ چونکہ بت پرستی کی آلائش سے مکہ کی تطہیر اور کل جزیرۂ عرب میں حق و باطل کی تمیز مکہ کی فیصلہ کن فتح پر موقوف تھی اس لئے جب وہ پیغمبرؑ اور مسلمانوں کی مسلسل کوششوں اور جان فروشیوں سے حاصل ہوئی تو خدا نے اعلان فرمایا کہ آج اس فتح سے نبوت کے فرض کی اور تجھ پر میرے سلسلہ احسانات کی تکمیل ہوئی، پھر خدا آپ سے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کا اور اپنی زبردست مدد کا وعدہ کرتا ہے حالانکہ ان میں سے ہر چیز آپ کو پہلے ہی عنایت ہو چکی تھی۔ کیا فتح مکہ سے پہلے آپ صراط مستقیم یعنی اسلام پر نہ تھے یا آپ کو زبردست مدد نہیں مل چکی تھی، یہ سب مرتبے حاصل تھے، مگر ان باتوں کے یہاں ذکر سے اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اس موقع پر اس طرح اپنی مزید رضامندی کا اظہار فرمائے اور رسول کی اگلی پچھلی تمام فروگذاشتوں پر (اگر ہوں) خط عفو پھیرنے کا اعلان کر کے ان کو نیا خلعت فاخرہ عطا اور نئے مراتب جلیلہ عنایت فرمائے۔

عبدیت کاملہ کا یہی راز و نیاز ہے جو حضرت مسیحؑ کے اس فقرہ میں نمایاں ہے۔ ایک سردار ان کو "اے نیک استاذ" کہہ کر خطاب کرتا ہے، اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں۔

"تو کیوں مجھ کو نیک کہتا ہے؟ کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا" (لوقا ۱۸۔۱۹)

حضرت مسیحؑ کے اس فقرہ سے کسی کا یہ قیاس کرنا کہ وہ نیک نہ تھے کس قدر غلط ہوگا، اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کا

اپنی مشہور دعا میں یہ کہنا کہ

اور جس طرح ہم اپنے قرض داروں کو بخشتے ہیں تو اپنا دین ہم کو بخش دے (متی۔۶۔۱۲)

ان کی گنہگاری کی دلیل نہیں بلکہ عبدیتِ کاملہ کے اظہار کا ثبوت ہے۔

نکتہ:

عربی زبان میں گناہ کے لئے مختلف الفاظ ہیں مثلاً ذنب، اثم، حنث، جرم وغیرہ۔ ان میں سے ذنب کے سوا دوسرے الفاظ کا اطلاق اس حقیقی گناہ پر کیا جاتا ہے جو بالقصد اور جان بوجھ کر کیا جائے لیکن ذنب کا اطلاق ہر غلط فعل پر ہوتا ہے خواہ وہ جان بوجھ کر کیا جائے یا بن جانے غلط فہمی سے ہو یا سوچ سمجھ کر، بھول چوک سے ہو، یا قصداً اور ان کاموں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو درحقیقت عام امت کے لئے گناہ نہیں لیکن انبیاء کے حق میں اتنی غفلت بھی مواخذہ کے قابل ہے اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ حسنات الابرار سیئات المقربین (نیکوں کی نیکیاں، مقربین کی برائیاں ہیں)

ع جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

انبیاء علیہم السلام کے استغفار کے موقع پر ہمیشہ ''ذنب'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جرم، اثم یا حنث کا نہیں۔ ذنب کا لفظ بھول چوک اور غفلت سے لے کر عصیاں تک کو شامل ہے[1] اس لئے کسی نبی کو اگر خدا کی طرف سے استغفار ذنب کی ہدایت کی گئی تو اس کے معنی صریح عصیاں و گناہ کے نہیں، بلکہ یہی انسانی بھول چوک اور فروگذاشت ہے جس کی اصلاح و تنبیہ اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم و لطف عنایت سے فرماتا رہتا ہے اور اسی کے لئے استغفار کا حکم ان کو ہوتا رہتا ہے

اسی سے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بھول چوک اور بلا ارادہ غفلت گو امت کے حق میں قابل مواخذہ نہیں، مگر انبیاء علیہم السلام کے بلند مرتبہ کے لحاظ سے یہ چیزیں بھی گرفت میں آتی ہیں کیونکہ ان کا قول و فعل شریعت بن جاتا ہے اس لئے شریعت کی حفاظت کے لئے ان کے ہر قول و فعل کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ اس بناء پر اگر ان سے احیاناً کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے تو فوراً اس پر تنبیہ کی جاتی ہے اور ان کو ہوشیار کر دیا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ان کی یہ چیز معاف کر کے ان کو بشارت سنا دی جاتی ہے اور اس طرح ہر چھوٹے بڑے دانستہ اور نادانستہ تمام گناہوں سے ان کا دامن پاک وصاف رکھا جاتا ہے۔

﴿ فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ﴾ (بقرہ۔۴)

تو آدم نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں تو وہ اس کی طرف رجوع ہوا

﴿ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ ﴾ (طہ۔۷)

---

[1] اس فرق کو عام لغت نویسوں نے ملحوظ نہیں رکھا ہے، مگر جن علمائے لغت نے الفاظ کے فرق پر کتابیں لکھی ہیں، انہوں نے اس کی تصریح کی ہے۔ ہم یہاں پر بیروت کے مشہور عیسائی لغت نویس و ادیب الاب ہنریکوس لا کی کتاب فرائد للغۃ فی الفروق کی عبارت نقل کرتے ہیں، الاثم الذنب الذی یستحق العقوبۃ علیه ولا یوصف به الا المجرم، وبین الاثم و الذنب فرق من حیث ان الذنب مطلق الحرم عمدا کان او سهوا بخلاف الاثم فانه مایستحق فاعله العقاب، فیختص بمایکون عمدا، والحنث ابلغ من الذنب، لان الذنب یطلق علی الصغیرہ، والحنث علی الکبیرۃ والجرم لایطلق الاعلی الذنب الغیظ (صفحة ۹۶۔۹۷) مطبوعه کاثولیکیه، ۱۸۸۹ء۔

پھر خدا نے آدم کو برگزیدہ کیا پھر اس کی طرف رجوع ہوا۔

﴿ لَقَدْ تَّابَ اللّٰہُ عَلَى النَّبِيِّ ﴾ (توبہ۔۱۴)

یقیناً اللہ نبی کی طرف رجوع ہوا۔

﴿ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ﴾ (انبیاء۔۶)

پھر ہم نے یونس کی دعا قبول کی اور اس کو غم سے رہائی دی۔

﴿ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ﴾ (فتح۔۱)

تا کہ اللہ تیری اگلی پچھلی سب فروگذاشت معاف کرے۔

کامل اور عام عفو و مغفرت کا یہ مرتبہ بلند خود بندہ کی زندگی میں انبیاءؑ کے سوا کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔

۲۔ انبیاء کی معصومیت کے مسئلہ میں غلط فہمی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ انبیاء کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعل کا جو فرق ہے اس کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ علم اور جہل، ضلالت اور ہدایت اضافی الفاظ میں سے ہیں، علم کی ہر حد کو علم کے مافوق درجہ کے لحاظ سے جہل اور ہدایت کے بلند سے بلند رتبہ کو اس سے بھی اوپر کے مرتبہ کے لحاظ سے ضلالت کہہ سکتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعلیت کا فرق ہے۔ جس طرح تخم میں تمام برگ و بار پوشیدہ ہوتا ہے لیکن وہ اس وقت درخت نہیں ہوتا اور نہ اس میں تنا، شاخیں، پتے، پھول اور پھل ہوتے ہیں اور نہ اس کا عالم پناہ سایہ ہوتا ہے لیکن ایک وقت آتا ہے جب وہی تخم بڑھ کر ایک نیا درخت بن جاتا ہے، اس کے پتے آنکھوں میں ہریالی پیدا کرتے ہیں، اس کے پھول مشام جان کو معطر کرتے ہیں، اس کے پھل کام و دہن میں شہد ٹپکاتے ہیں، اس کے سایہ میں تھکے ماندے مسافر آرام پاتے ہیں، اسی طرح نبوت کی سابقہ اور لاحقہ زندگیوں میں عظیم الشان فرق ہے اور اسی فرق کی بناء پر اس کی قبل از نبوت زندگی ظہور نبوت کے بغیر تاریکی اور ضلالت اور بعد کی زندگی نور اور ہدایت معلوم ہوتی ہے، جس طرح عام افراد کی زندگی اسلام و ایمان کے بغیر ضلالت اور اسلام و ایمان کے بعد ہدایت بن جاتی ہے اسی طرح انبیاءؑ کی زندگی ان کی نظر میں نبوت کے بغیر ضلالت اور نبوت کے بعد ہدایت ہوتی ہے۔ غرض یہ ہے کہ ظہور نبوت سے پہلے کا زمانہ ان کی ضلالت کا اور بعد کا زمانہ ان کی ہدایت کا عہد کہلاتا ہے لیکن ضلالت اور ہدایت کا یہ مفہوم اس مفہوم سے بالکل مختلف ہے جو غیر انبیاءؑ کے حق میں مستعمل ہے۔ اللہ تعالیٰ جہاں آنحضرت ﷺ پر اپنے احسانات گناتا ہے فرماتا ہے۔

﴿ اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ٥ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ٥ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ﴾ (ضحیٰ۔۱)

کیا اللہ نے تجھ کو یتیم نہ پایا پھر پناہ دی، اور اس نے تجھ کو بھولا پایا تو رہنمائی کی، اور تجھ کو محتاج پایا تو بے نیاز کیا۔

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ یہاں ہدایت سے نبوت اور ضلالت سے قبل نبوت کی زندگی مراد ہے جو نبوت کے بعد کی زندگی کے مقابلہ میں نسبتاً ضلالت ہی ہے۔

ضلالت کے معنی عربی میں صرف صریح گمراہی ہی کے نہیں بلکہ نادانستہ بھولنے، بھٹکنے اور غفلت کرنے کے بھی

ہیں۔ عورتوں کی شہادت کے موقع پر ہے۔

﴿ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰھُمَا فَتُذَکِّرَ اِحْدٰھُمَا الْاُخْرٰی ﴾ (بقرہ۔ ۳۹)

کہ بھول جائے ایک عورت تو یاد دلا دے اس کو دوسری۔

ایک اور آیت میں علم الٰہی کی تعریف میں ہے۔

﴿ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسٰی ﴾ (طہٰ۔ ۲۰)

نہ چوکتا ہے میرا رب، نہ بھولتا ہے۔

ان آیتوں میں لفظ ضلالت کا استعمال بتاتا ہے کہ ''ضال'' کے معنی عربی میں اور محاورۂ قرآن میں صرف گمراہ کے نہیں بلکہ بھول چوک کے بھی ہیں' اسی طرح اس حالت کے بھی ہیں جس میں گمراہی گو گمراہی معلوم ہوتی ہے لیکن ہنوز ہدایت الٰہی کا نور اس کے سامنے نہیں چمکا' غلطی کا احساس ہوتا ہے' مگر اس غلطی کی جگہ ہنوز صحت نظر نہیں آتی' جہل کی برائی تو معلوم ہوگئی ہے مگر ہنوز علم کا دروازہ نہیں کھلا ہے' اور یہی قبل نبوت کی کیفیت ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی نبوت سے پہلے ایک ستم شعار قبطی کو گھونسہ مارا تھا جس کے صدمہ سے وہ اتفاقاً مر گیا تھا۔ نبوت پا کر جب لوٹے تو فرعون نے ان کو طعنہ دیا کہ تم تو میرے فراری مجرم ہو۔ حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا:

﴿ فَعَلْتُھَا اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّیْنَ ﴾ (شعراء)

میں نے اس حالت میں کیا تھا' کہ میں چوکنے والوں میں سے تھا۔

اس چوک اور ضلالت سے مقصد صرف یہی ہے کہ اس وقت میں نبوت کی عزت سے سرفراز نہ تھا اور نہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے نبوت سے پہلے کوئی گمراہی کی بات نہیں کی تھی، نہ بت کو پوجا تھا، نہ فرعون کو سجدہ کیا تھا' نہ کوئی اور شرک کیا تھا۔ کسی کے طمانچہ مارنے سے اتفاقیہ کسی کمزور کا مر جانا مارنے والے کا بالقصد گناہ نہیں جس کو ضلالت کہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کا اپنے کو اس وقت ضال کہنے سے مراد نبوت سے سابقہ زندگی ہے۔ اس قبل نبوت کی زندگی کو بعد نبوت کی زندگی کے لحاظ ہوتا ہے جسے یہاں ''ضلالت'' کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ اس کو ''غفلت'' (بے خبری) سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے قصہ میں آپ کو خطاب ہے۔

﴿ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْکَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ وَاِنْ کُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ ﴾ (یوسف۔ ۱)

ہم تجھے بہترین قصہ سناتے ہیں' کیونکہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن اتارا' اگرچہ اس قرآن کی وحی سے پہلے تو بے خبروں میں تھا۔

اس بے خبری کے عالم کی تفسیر دوسری آیت میں ہے جس میں پیغمبر کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت کی زندگی کا فرق ظاہر فرما دیا ہے۔

﴿ وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ط وَاِنَّکَ لَتَھْدِیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴾ (شوریٰ۔ ۵)

اور اسی طرح ہم نے اپنے (خلوت خانہ) راز سے ایک روح تیری طرف وحی کی، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے؟ اور نہ ایمان، لیکن ہم نے اس کو نور بنا دیا جس سے جس کی چاہتے ہیں اپنے بندوں میں سے رہنمائی کرتے ہیں، اور بے شک تو سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

''کتاب و ایمان'' کے نور و ہدایت ملنے سے پہلے کی یہی وہ کیفیت حالت ہے جس کو کہیں ضلالت اور کہیں غفلت کہا گیا ہے۔ اس سے مقصود حقیقی گنہگار، عصیاں کاری اور باطنی گمراہی نہیں ہے بلکہ طلب حق تلاش، معرفت اور انتظار حقیقت ہے کہ وہی ان کے حق میں ضلالت اور غفلت کا حکم رکھتا ہے۔ آخر وہ وقت آتا ہے جب روشنی چمکتی ہے، روحانی سکون کا چشمہ بہتا ہے اور منزل رسی کے بعد دوسروں کی رہنمائی کا منصب عطا ہوتا ہے۔ یہ ہدایت کا دور ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر انبیاءؑ کے نبوت ملنے کو ہدایت کے لفظ سے ادا فرمایا گیا ہے۔

﴿ وَوَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ ﴾ (انعام۔۱۰)

اور ہم نے ابراہیم کو اسحاقؑ اور یعقوبؑ بخشے، اور ان میں ہر ایک کو ہدایت دی، اور ان سے پہلے نوح کو ہدایت دی۔

اس ہدایت دینے سے اگر نبوت عطا کرنا مراد ہے تو ظاہر ہے کہ عدم نبوت کا عہد ''ضلالت'' ہی کہلائے گا مگر اس سے مقصد صرف وہ حالت ہوگی جس میں ان کو ہنوز نبوت نہیں ملی تھی اور اس مرتبہ بلند کا انتظار تھا۔

اس تشریح سے یہ واضح ہو گیا کہ انبیاء کے حق میں ضلالت سے مقصود گنہگاری، عصیاں کاری اور گمراہی نہیں بلکہ عدم نبوت کا دور اور رسالت کی زندگی سے پہلے کا عہد ہے جو نبوت اور رسالت کی ہدایت کے مقابلہ میں نسبتاً ضلالت ہے۔

نبی کی بشریت:

نبی کی معصومیت اور اس کے دوسرے مقدس خصوصیات کے باوجود اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ نبی خدا کی مخلوق، خدا کا بندہ اور آدمی ہی ہوتا ہے، وہ خدا، خدا کا اوتار، دیوتا یا فرشتہ نہیں ہوتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جن کی اصل حقیقت محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے افراط و تفریط کی تاریکی میں گم تھی اور آپ کے فیض علم سے وہ روشن ہوئی۔ اسلام سے پہلے یہودیوں کی طرح ایسے اہل مذہب بھی تھے جو پیغمبروں کو ایک پیشین گوئی کی صفت کے علاوہ ہر حیثیت سے معمولی انسان سمجھتے تھے، وہ ہر قسم کے گناہ بھی کرتے تھے اور وہ بداخلاقیوں کے بھی مرتکب ہوتے تھے، وہ کفر بھی کرتے تھے تاہم وہ پیغمبر سمجھے جاتے تھے، دوسری طرف عیسائی بھی تھے جو اپنے ''نجات دہندہ'' کو انسانیت سے پاک، خود خدا یا خدا کا جز یا ناسوت و لاہوت کا ایک مجموعہ سمجھتے تھے، اور ہندو بھی تھے جو اپنے رہنماؤں کو دیوتا اور اوتار یعنی مجسم خدا یا انسان کے بھیس میں خدا سمجھتے تھے اور جن کو ہر قسم کی خدائی طاقتیں حاصل تھیں۔

اسلام نے اپنی تعلیم ان دونوں کے وسط میں پیش کی، وہ ایک طرف رسولوں کو مخلوق محض، صرف انسان اور پورا بندہ اور خدا کے حکم کے سامنے عاجز و درماندہ تسلیم کرتا ہے لیکن دوسری طرف وہ ان کو خدا کا برگزیدہ، معصوم، نیک اور خدا کی قدرت سے فیض پا کر برکتوں، سعادتوں، اور ہدایتوں کا مرکز اور اس کی اجازت سے عجیب و غریب امور صادر کرنے والا بتاتا ہے اور بے اعتدالی کے ان دونوں خیالات کی جو غلط فہمی پر مبنی ہیں، علانیہ تردید کرتا ہے۔ اہل عرب بھی ہندوؤں، یونانیوں، اور عیسائیوں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ انسان کی رہنمائی کے لئے خود انسان نہیں بلکہ انسان سے مافوق ہستی ہونی

چاہئے اور وہ ہستی صرف فرشتوں کی ہے۔ قرآن نے ان کے اس خیال کی بار بار تکذیب کی ہے اور کہا ہے کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو فرشتہ کو ان کے پاس رسول بنا کر بھیجا جاتا' اور انسانوں میں فرشتہ بھی آتا تو انسانیت ہی کے پیکر میں آتا تو ایسی حالت میں تم اس فرشتہ کو فرشتہ کب مانتے؟

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ بشریت کے جامہ میں ہوتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے، چلتے' پھرتے' سوتے' جاگتے' شادی بیاہ کرتے اور پیدا ہوتے اور مرتے ہیں، دوسری طرف وہ اپنی روحانیت' بے گناہی' پاکدامنی اور اختصاص نبوت میں انسانوں سے بلند تر ہیں۔ یہودیوں کی طرح جن کی نظر ان کے انسانی رخ پر پڑتی ہے وہ ان کو ہر طرح معمولی انسان سمجھتے ہیں اور عیسائیوں کی طرح جن کی نظر ان کے مافوق انسانی خصائص پر پڑتی ہے وہ ان میں الوہیت کے اوصاف ثابت کرنے لگتے ہیں حالانکہ حق ان دونوں کے بیچ میں ہے۔ وہ اپنے بشری اوصاف کے لحاظ سے بلاشبہ انسان ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے مافوق بشری خصوصیات کی بناء پر مافوق البشر ہوتے ہیں۔ یہی مغالطہ اپنے اپنے پیغمبروں کے متعلق کفار کو ہوتا تھا۔ پیغمبر ان کے سامنے جب اپنی نبوت اور خدا کی طرف سے آنے کا دعویٰ پیش کرتے تھے، تو وہ ان کی بشری خصوصیتوں کو دیکھ کر کہتے تھے کہ تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو تم خدا کے قاصد اور پیامبر کیسے ہو سکتے ہو؟ چنانچہ کفار نے بار بار پیغمبروں سے کہا:

﴿ اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴾ (اسرائیل۔۱)

کیا خدا نے بشر کو قاصد (رسول) بنا کر بھیجا۔

وہ بشریت کو رسالت کے منافی سمجھتے تھے اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا۔

﴿ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴾ (اسرائیل۔۱)

میں تو نہیں ہوں مگر انسان رسول۔

ان کو شبہ تھا کہ کیا گمراہ انسانوں کی انسان ہی رہنمائی کرسکتا ہے۔

﴿ اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ﴾ (تغابن۔۱)

کیا انسان ہماری رہنمائی کریں گے؟

یہ وہی شبہ تھا جس میں پھنس کر عیسائی حضرت عیسیٰؑ کی انسانیت سے منکر ہوئے کہ موروثی گنہگار انسان کو انسان کا بیٹا کیونکر نجات دلاسکتا ہے اور یہ نہیں سمجھتے کہ انسان موروثی گنہگار نہیں بلکہ وہ گنہگار بھی ہوسکتا ہے اور بے گناہ بھی' بے گناہی اور معصومیت کے لئے انسانیت سے پاک ہونا ضروری نہیں۔ یہی بات اور کفار کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی' اور انبیاءؑ کو ظاہری اور جسمانی طور سے اپنی ہی طرح انسان سمجھ کر ان کو نبوت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے۔

﴿ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ (ابراہیم۔۲)

تم تو نہیں ہو لیکن ہماری ہی طرح ایک بشر۔

دوسروں کو نبی کے انکار کرنے پر اس طرح آمادہ کرتے تھے کہ:

﴿ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ (انبیاء۔۱)

نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔

﴿ مَاهٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ (مومنین۔۲)

نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔

انبیاء کے سامنے وہ یہی دلیل پیش کرتے تھے۔

﴿ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ (شعراء۔۸)

تم تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔

﴿ مَآ اَنْتُمْ اِلَّابَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ (یٰسین۔۲)

تم لوگ تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔

اور وہ اپنے اس دعویٰ کی صداقت کو ہدایت اور مشاہدہ سے ثابت کرتے تھے۔

﴿ مَا نَرٰكَ اِلَّابَشَرًا مِّثْلَنَا ﴾ (ہود۔۳)

ہم تو تم کو اپنی ہی طرح بشر دیکھتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ ہاں تمہاری ہی طرح ہم بشر ہیں لیکن خدا کے فضل و کرم سے سرفراز ہیں اور یہی تم میں اور ہم میں فرق ہے، فرمایا

﴿ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّابَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ﴾ (ابراہیم۔۲)

ان کے رسولوں نے جواب دیا کہ ہم تمہاری ہی طرح بشر ہیں، لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے۔

ان کفار کی نظر صرف ان کے ایک رخ یعنی عام انسانی پہلو پر پڑتی تھی۔ انبیاءؑ نے جواب میں اس پہلو کے ساتھ اپنے دوسرے رخ کو بھی ان کے سامنے پیش کر دیا اور کہا کہ ہاں ہم انسان ہیں لیکن ایسے انسان جن پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بارش ہے یعنی نبوت سے سرفراز اور اس کی خصوصیتوں سے ممتاز ہیں۔

دوسرے نبیوں کی طرح ختم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ بار بار ارشاد فرمایا بلکہ وحی الٰہی نے آپ کی زبان سے یہ اعلان کر دیا کہ ''کہہ دو کہ میں تو تمہاری ہی طرح ایک آدمی اور بشر ہوں''۔ اس اعلان نے جو در حقیقت اس غلط عقیدہ کے مٹانے کے لئے تھا جو انبیاءؑ کی شان الوہیت کے متعلق عیسائیوں کے اثر سے لوگوں میں پھیل گیا تھا اور افسوس ہے کہ اس قسم کا غلط خیال اس نبی کی اُمت کے ایک گروہ میں بھی پایا جاتا ہے جو دنیا میں خدا کی توحید کامل کا مبلغ بن کر آیا تھا، دوسری طرف اس اعلان سے ایک تفریط پسند گروہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ پیغمبر اور عام انسانوں میں کوئی فرق اور امتیاز نہیں اور نہ پیغمبروں کی عام انسانوں پر کوئی بلندی و برتری حاصل ہے الا یہ کہ پیغمبروں پر وحی آتی رہتی ہے اور عام انسان اس سے محروم ہیں، گویا اس کا منشاء یہ ہے کہ پیغمبر صرف اس لمحہ اور آن میں منصب نبوت کا امتیاز پاتا جاتا ہے جب اس پر کسی قسم کی وحی نازل ہوتی ہے اور اس کے پہلے اور اس کے بعد وہ عام انسان ہوتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اسی لئے ایک اور مختصر سے فرقہ نے یہ دعویٰ کیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ حکم صرف وہی ہے جو وحی قرآنی کی صورت میں آیا اس کے

علاوہ آپ کے تمام احکام جو قرآن سے باہر ہیں وہ صرف حاکمانہ اور انتظامی امور ہیں جن کی پیروی کرنا نہ اسلامی شریعت ہے اور نہ اسلام کا جز ہے۔ یہ خیالات حقیقت میں دوسرے فرقہ کے مفرطانہ کے مقابلہ میں تفریطانہ ہیں اور یہ دونوں اعتدال کی حد سے باہر ہیں اور حقیقت ان کے بیچ میں ہے۔

قرآن پاک میں تین جگہ وہ آیتیں ہیں جن میں خاص آنحضرت ﷺ کی بشریت کا اعلان ہے مگر ہر جگہ توحید کامل کے بیان اور خدا کے مقابلہ میں رسولوں کی عبدیت کی تشریح اور اس عقیدۂ باطل کی تردید میں ہے کہ رسولوں کے ہاتھوں میں یہ قوت ہونی چاہئے کہ وہ خدا سے زبردستی کسی بات کو منوالیں اور سعی و سفارش کر کے قصور معاف کرا دیں۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ ان کو جو کچھ حاصل ہے وہ خدائے تعالیٰ کی اجازت، اذن اور عطا سے ہے۔

سورۂ کہف میں ان مشرکوں کا ذکر ہے جو خدا کے بندوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

﴿ اَفَحَسِبَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنْ یَّتَّخِذُوْا عِبَادِیْ مِنْ دُوْنِیْٓ اَوْلِیَآءَ ط اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ نُزُلًا ﴾ (کہف۔۱۲)

کیا وہ جنہوں نے کفر کیا، یہ سمجھے ہیں کہ وہ میرے بندوں رسول اور فرشتوں کو میرے سوا اپنا حمایتی بنائیں گے۔ ہم نے ان کافروں کے لئے جہنم تیار کی ہے۔

قرآن اس خیال کو کفر قرار دیتا ہے۔ یہ رکوع کا شروع ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے غیر محدود اوصاف و کمالات کا ذکر ہے، پھر ارشاد ہے۔

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ (کہف۔۱۲)

کہہ دے کہ میں تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔

دوسری جگہ یہی تعلیم بعینہ سورۂ حم السجدہ (فصلت) میں ہے۔

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِیْمُوْٓا اِلَیْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ وَوَیْلٌ لِّلْمُشْرِكِیْنَ ﴾ (حم السجدہ۔۱)

کہہ دے کہ میں تو تمہاری طرح بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے، اس کی طرف سیدھے رہو، اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو، خرابی ہے شرک کرنے والوں کے لئے۔

اس آیت کا منشاء بھی یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں رسول اسی طرح ایک بندہ ہے جس طرح خدا کے دوسرے بندے۔ دعائیں خدا ہی سے مانگنی چاہئیں اور اسی سے اپنے گناہوں کی معافی کی درخواست کرنی چاہئے۔ یہ اختیارات خاص خدا کے بندوں کے نہیں، اس تعلیم سے مقصود حقیقت میں عیسائیوں کے مسئلہ کفارہ اور ان کے اس عقیدہ کی تردید ہے کہ گناہوں کا معاف کرنا، حضرت عیسیٰؑ کے اختیار میں ہوگا اور مسلمانوں کو اپنے رسول کی نسبت اس قسم کی باطل عقیدت مندیوں سے بچانا ہے۔ چنانچہ تیسری جگہ قرآن پاک میں جہاں آنحضرت ﷺ سے کفار کا یہ مطالبہ مذکور ہے کہ تم خدا کے پیغمبر ہو تو ہمارے لئے سونے کی چھت بنا دو، اپنے ساتھ جلو میں فرشتوں کے پرے لے کر چلو، ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے ہاتھ میں کتاب لے کر سامنے اترو۔

﴿ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا o اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا o اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا o اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِى السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ﴾ (بنی اسرائیل۔۱۰)

اور انہوں نے کہا کہ ہم تم پر ایمان اس وقت تک نہیں لائیں گے، جب تک تم ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ نہ بہا دو یا تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ نہ ہو جائے یا جیسا تم کہتے ہو آسمان کے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گراؤ یا خدا کو اور فرشتوں کو ضامن بنا کر نہ لے آؤ یا تمہارے سونے کا ایک گھر نہ ہو جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہاں تمہارے آسمان پر چڑھنے کا ہم کو اس وقت تک یقین نہ آئے گا جب تک تم وہاں سے ایک نوشتہ نہ ہم پر اتار لاؤ جس کو ہم پڑھ لیں۔

یہ امور مشکل ومحال نہ تھے لیکن نبوت کے اوصاف کو ان بازیگرانہ تماشوں سے تعلق نہ تھا اور اس سے زیادہ یہ کہ اس غلط عقیدہ کو ابطال کرنا تھا کہ پیغمبر میں براہ راست کچھ خدائی اختیارات ہوتے ہیں اس لئے آپ کو یہ جواب سکھایا گیا کہ آپ فرمائیں۔

﴿ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا o وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا o قُلْ لَّوْ كَانَ فِى الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴾ (اسراء)

کہہ دے اے پیغمبر! سبحان اللہ میں تو ایک بشر ہوں رسول، اور لوگوں کو جب ان کے پاس ہدایت آئی، ایمان لانے سے باز نہیں رکھا، مگر اس خیال نے کہ کیا خدا نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ کہہ دے کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر ان پر اتارتے۔

آنحضرت ﷺ سے بحکم خدا معجزات بھی صادر ہوئے اور ان کی حیرت انگیزی کو انہوں نے تسلیم بھی کیا پھر بھی یہ خیال کہ ایک بشر رسول کیونکر ہو سکتا ہے، قائم رہا۔

کفار نے معجزات دیکھنے کے بعد بھی یہی کہا۔

﴿ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ﴾ (انبیاء)

یہ تو تمہاری ہی طرح بشر ہے، کیا تم دیکھ بھال کر بھی جادو کے پاس آتے ہو۔

معجزات کی حیرت انگیزی کو جادو کہہ کر تسلیم کیا مگر پھر بھی ان کو بشریت رسالت کے منافی ہی معلوم ہوئی، انہیں کہا گیا کہ نبوت و رسالت کے اوصاف و خصائص تم سے زیادہ ان کو معلوم ہیں، جن کو تم پہلے سے آسمانی کتابیں عطا ہوئیں یعنی یہود، ان سے پوچھ لو کہ رسول اور نبی بشر ہی ہوتے ہیں۔

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (انبیاء)

اور ہم نے نہیں بھیجا رسول بنا کر تم سے پہلے لیکن انسانوں ہی کو، جن کو ہم وحی کرتے تھے۔ جاننے والوں سے پوچھو، اگر تم نہیں جانتے۔

یہی جواب سورۂ یوسف میں دیا گیا۔

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰی ﴾ (یوسف)

اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے وہ بشر ہی تھے، آبادیوں کے رہنے والے ہم ان پر وحی کرتے تھے۔

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ نحل میں ہے۔

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بِالْبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ط وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ (نحل۔۶)

اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے لیکن انسانوں کو جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، تو پوچھ لو کتاب والوں سے اگر تم نہیں جانتے، کھلی نشانیاں اور کتابیں دے کر، اور ہم نے تم پر کتاب (ذکر) اتاری تاکہ تم کھول کر لوگوں سے بیان کرو جو ان کی طرف اتاری گئی اور تاکہ وہ سوچیں۔

ہر شخص جو مثلیت اور بشریت کی ان آیتوں پر ایک نگاہ ڈالے گا وہ یہی سمجھے گا کہ ان آیتوں میں جس قسم کی مثلیت اور بشریت کا ذکر ہے اس کا تعلق ظاہری جسمانیت اور جسمانی قویٰ اور مخلوقیت سے ہے ورنہ اخلاقی، روحانی، دماغی، قلبی، علمی اور عملی حیثیت سے وہ انسان رہ کر بھی، غیر نبی انسانوں سے بلند تر اور علانیہ ممتاز ہوتا ہے۔ نبی اور غیر نبی میں صرف وحی کے امر فارق ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی القائے ربانی سے متصف ہونے کے علاوہ بقیہ تمام اوصاف و کمالات یا عیوب و نقائص میں عام انسانوں کے برابر ہوتا ہے۔ یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے اگر کوئی یہ کہے کہ عالم و جاہل میں صرف علم کا فرق ہے ورنہ دونوں برابر کے انسان ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ علم و جہل کے علاوہ علم و جہل کے علانیہ ممتاز و متضاد اوصاف میں بھی وہ دونوں برابر ہیں اور ان میں عقل، اخلاق، تہذیب، سلیقہ، رائے اور حکمت و دانائی کا کوئی فرق نہیں، حالانکہ ان میں علم و جہل کا فرق کہہ کر درحقیقت ان دونوں کے درمیان علم اور جہل کے سینکڑوں اوصاف، لوازم اور خصائص کا فرق و امتیاز تسلیم کرنا ہے۔

اسی طرح نبی اور غیر نبی میں وحی کا فرق مان کر وحی والے اور بے وحی والے انسانوں میں خود وحی اور عدم وحی کے سینکڑوں لوازم، خصائص اور اوصاف کا فرق تسلیم کرنا پڑے گا۔ وحی و رسالت کو چھوڑ دو، دوسرے انسانی کمالات کو مثالاً لو تو بھی یہی ماننا پڑے گا۔ انسان کے لئے جتنے اوصاف و کمالات ممکن ہیں ان سب کی اعلیٰ سے اعلیٰ جانب کمال تک پہنچنا ممکن ہے اور جو وہاں تک پہنچ جاتے ہیں وہ اپنے جسمانی اوصاف و خصائص کے لحاظ سے انسان ہونے کے باوجود اپنے دوسرے قویٰ میں عام انسانوں سے یقیناً بلند اور ممتاز ہوتے ہیں، کوئی کہہ سکتا ہے کہ جسمانی قوت کا ایرانی ہیرو رستم انسان نہ تھا، علم و عقل کا یونانی مجسمہ ارسطو انسانیت سے پاک تھا اور موجودہ دنیا کی بہت سی حیرت انگیز ایجادوں کا مخترع اڈیسن بشر نہیں لیکن اس انسانیت اور بشریت کے اشتراک کے باوجود اپنے اپنے دائرہ میں وہ عام انسانوں سے بلند تر اور ممتاز تر ہیں اور بایں ہمہ وہ اپنے جسمانی خصائص، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، دیکھنے بھالنے، صورت شکل، ہاتھ پاؤں، ہر ایک چیز میں ویسے ہی انسان ہیں، اور مخلوق انسان بلکہ مجبور انسان ہیں جیسے دوسرے کمزور، جاہل اور بلید الذہن انسان۔ یہی مثال ایک معنی میں انبیاء کرام علیہم السلام کی بھی ہے۔ وہ غیر نبی انسانوں کے ساتھ بہت سے انسانی

اوصاف میں شریک ہونے کے باوجود وحی اور اس کے خصائص اور لوازم میں ان سے صریحاً الگ، بلند اور اعلیٰ بلکہ بعض جسمانی خصائص میں بھی ان سے ممتاز ہوتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو صوم وصال رکھتے دیکھ کر جب صحابہ بھی آپ کی پیروی میں کئی کئی دن تک کا مسلسل روزہ رکھتے ہیں تو آپ ان کو منع کرتے ہیں اور اپنی نسبت فرماتے ہیں ﴿ اَیُّکُمْ مِثْلِیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَ یَسْقِیْنِیْ ﴾[1] ”تم میں کون میری مثل ہے؟ میں رات گذارتا ہوں تو میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے“ کیا عام انسانوں کو بھی یہ روحانی غذا اور روحانی سیرابی میسر آتی ہے اور وحی کے علاوہ بعض دوسری حیثیتوں سے بھی مثلیت کی اس میں نفی نہیں ہے؟

اسی طرح نیند کی حالت میں بھی نبی کے قلب اور اس کے احساسات کا غافل نہ ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے آپ نے فرمایا میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا ﴿وَ کَذٰلِکَ الْاَ نْبِیَاءُ تَنَامُ اَعْیُنُھُمْ وَ لَا تَنَامُ قُلُوْ بُھُمْ ﴾[2] اور اسی طرح انبیاء کی آنکھیں سوتی ہیں مگر ان کے دل نہیں سوتے۔ کیا یہی کیفیت عام انسانوں کی نیند کی بھی ہے؟ آنحضرت ﷺ لوگوں کو نماز میں صفوں کو درست رکھنے کی تاکید کرتے ہیں تو فرماتے ہیں ”کہ میں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی ویسے ہی دیکھتا ہوں جیسے سامنے سے“ کیا عام انسانوں کی قوت بصارت کا یہی عالم ہوتا ہے؟ قرآن پاک میں ہے ﴿اَفَتُمٰرُوْ نَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی ﴾ کیا پیغمبر جو دیکھتا ہے تم اس میں اس سے جھگڑتے ہو؟ ﴿ وَ لَقَدْ رَاٰہُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ ﴾ ”اور اس نے فرشتہ کو آسمانوں کے کناروں میں دیکھا“ کیا عام انسان بھی یہ مشاہدہ کرتے ہیں آنحضرت ﷺ کے انتساب سے امہات المؤمنین کو جو شرف حاصل ہوا اس کا اقتضاء یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے امہات المومنین کو خطاب کر کے فرمایا ﴿ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ ﴾(احزاب۔۴) ”اے پیغمبر کی بیویو! تم ایسی نہیں ہو جیسی ہر عورت اگر خدا کا ڈر رکھو“ تو اگر پیغمبر کی بیویاں تقویٰ کے بعد عام عورتوں کی مثل نہیں ہیں تو خود پیغمبر تو بدرجہا اس کا سزاوار ہے کہ وہ کَاَحَدٍ مِّنَ الرِّجَالِ نہ ہو اور اپنے خصائص میں عام انسانوں سے بدرجہا بلندتر اور ممتاز ہو۔

الغرض نبی اور غیر نبی میں صرف وحی ونبوت کا جو فرق ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ان دونوں میں وحی ورسالت کے تمام لوازم، خصوصیات اور ضروری اوصاف میں فرق اور امتیاز ہے اس لئے کسی انسان کو صاحب وحی ماننے کے ساتھ ہی اس کو ان تمام اوصاف ولوازم اور خصوصیات کا مالک بھی ضرور ہی ماننا پڑے گا۔

اجتہاد نبوی میں خطا:

شبہ کا ایک اور سبب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بعض جگہ آنحضرت ﷺ کو آپ کی چند فروگذاشتوں پر متنبہ کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاص وحی الٰہی کے علاوہ آپ اپنی عقل و مصلحت سے جو حکم دیتے تھے وہ غلطیوں سے پاک نہیں ہوتا تھا اس سلسلہ میں یہ بات تمام مسلمانوں کو تسلیم ہے کہ جن بعض امور میں آپ پر وحی قرآن نازل نہیں ہوتی تھی ان میں آپ اپنے پیغمبرانہ علم وحکم اور فہم نبوی سے فیصلہ فرماتے تھے لیکن غور کے قابل یہ بات ہے کہ اگر آپ کو آپ کے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصوم۔

[2] صحیح بخاری باب الاسراء۔

اس فیصلہ پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے کبھی کوئی تنبیہ نہ ہوئی تھی تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ آپ کے تمام فیصلے صحیح اور منشائے الٰہی کے مطابق ہوتے تھے مگر یہ بھی کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ اجتہاد نبوی کے فیصلوں کی صحت و خطا کی ذمہ داری خدا نے نہیں لی تھی اس لئے تنبیہ نہ فرمائی گئی مگر واقعہ ان دونوں کے خلاف ہے۔ صورت یہ ہے کہ بعض فیصلوں پر تنبیہ کی گئی ہے اور بعض پر نہیں۔ اس سے بداہتاً ثابت ہوتا ہے کہ اجتہاد نبوی میں غلطی ہو جانا ممکن ہے مگر اس غلطی پر چند لمحوں کا قرار بھی ممکن نہیں۔ ادھر لغزش ہوئی اور ادھر علام الغیوب کی بے خطا وحی نے اس کی تنبیہ اور اصلاح کی۔ اس واقعہ سے دوسرا نتیجہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام امور و احکام جن کو آپ نے اپنے پیغمبرانہ اجتہاد و علم و حکمت سے ارشاد فرمایا، ان پر عمل کیا اور وحی الٰہی نے ان پر خاموشی برتی تو منشائے الٰہی نے گویا ان کی صحت و صداقت پر اپنی خاموشی سے مہر کر دی اور ان کی حیثیت بمنزلہ وحی کے ہو گئی۔

آنحضرت ﷺ کی نبوت کی عمر ۲۳ سال ہے۔ ان پورے تیئس سالوں میں ہزاروں واقعات اور امور پیش آئے جن پر آپ نے اپنے اجتہاد اور شرح صدر سے فیصلے صادر کئے مگر ان میں سے کل پانچ باتیں ایسی ہیں جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی اور عجیب تر یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کا تعلق حکم دینی' شریعت ابدی' اعتقاد' عبادات یا شرعی معاملات میں سے ہو بلکہ وہ کل کے کل ایسے امور ہیں جن کی حیثیت تمام تر شخصی یا جنگی ہے۔ اس سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دین و شریعت میں آپ کے یہ پیغمبرانہ اجتہادی فیصلے خطا اور غلطی سے تمام تر پاک تھے۔

اس خطا کے معنی:

عام انسانوں کے اجتہادات میں جن اسباب سے غلطیاں واقع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ جن مقدمات پر ان کا اجتہاد مبنی ہوتا ہے وہ غلط ہوتے ہیں، یا ان کا علم ان کو قطعی طور سے نہیں ہوتا' یا استقراء تام نہیں ہوتا' تمثیل پوری نہیں ہوتی' علت مشترکہ صحیح نہیں معلوم ہوتی مگر یہ تمام صورتیں اجتہاد نبوی میں نہیں ہیں کیونکہ اجتہاد نبوی نہ ان طریقوں پر مبنی ہوتا اور نہ وہ غور و فکر، نظر و استدلال اور استقراء و تمثیل کے منطقی و اصولی ذرائع پر قائم ہوتا ہے بلکہ وہ نور رسالت' فہم نبوت' حکم ربانی اور شرح صدر پر مبنی قائم ہوتا ہے جن میں یہ بیچ کی منزلیں سرے سے نہیں ہوتی ہیں، اسی لئے لفظ اجتہاد جو عام طور پر پہلے معنی میں مستعمل اور مشہور ہے اس سے اس مقام پر التباس سے بچنے کی خاطر احتراز کرنا بہتر ہے۔

ایک اور نکتہ بھی پیش نظر رہے' آنحضرت ﷺ کے پیغمبرانہ اجتہاد میں اگر غلطی ہوئی ہے تو اس غلطی کا مفہوم یہ نہیں ہے آپ نے جو پہلو اختیار فرمایا وہ کوئی گناہ یا بدی یا بداخلاقی کا پہلو تھا بلکہ یہ ہے کہ دو بہتر راستوں میں سے آپ نے بہترین راستے کو چھوڑ کر بہتر راستے کو اختیار کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور بہتر کی جگہ بہترین کی تلقین کی۔

اس قسم کے جو چند واقعات پیش آئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ بہترین کو چھوڑ کر جس بہتر کو آپ نے اختیار فرمایا اس کا منشاء ہمیشہ امت پر رحم و کرم اور شفقت کی نگاہ تھی اللہ تعالیٰ نے اس ظاہری یا عارضی رحم و کرم و شفقت کی جگہ ان احکام کی تلقین فرمائی جن میں گو بظاہر سختی معلوم ہوتی ہے مگر علام الغیوب کی دائمی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہی سخت پہلو اختیار کیا جائے۔

ذیل میں ہم ان اجتہادی امور کی تشریح کرتے ہیں جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی ہے۔

پانچ اجتہادی امور پر تنبیہ الٰہی:

جن اجتہادی امور پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی ہے، ان میں

ا۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے قبل مکہ معظمہ میں جب آنحضرت ﷺ اپنی دعوت کی تبلیغ فرما رہے تھے تو ایک دن قریش کے بڑے بڑے روساء آپ کی مجلس میں آ کر بیٹھے۔ آپ ان کو سمجھا بجھا رہے تھے، بت پرستی کی برائیاں اور توحید کی خوبیاں ان پر ظاہر فرما رہے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ اس دعوت کو قبول کر لیں کہ اتنے میں ایک مخلص لیکن غریب اور نابینا مسلمان عبداللہ بن ام مکتومؓ بھی آ کر بیٹھ گئے اور کچھ دریافت کرنا چاہا۔ قریش کے یہ روساء بے حد مغرور اور خود پسند تھے۔ وہ آپ کے جلسوں میں صرف اس لئے آنا پسند نہیں کرتے تھے کہ آپ کی مجلس میں بدحال، بے حیثیت اور ادنیٰ درجہ کے لوگ آیا کرتے ہیں۔ اس لئے اس موقع پر جب آنحضرت ﷺ کو ان رئیسوں کی اثر پذیری کے کچھ امکانات نظر آ رہے تھے، عبداللہ بن ام مکتوم کا آ جانا اور پوچھنا ناگوار ہوا کہ ان کے آنے سے ان رئیسوں کی خود پسندی اور بڑائی کے جذبہ کو اشتعال ہوا اور راستہ سے بدک گئے۔

عبداللہ بن ام مکتومؓ کی آمد اور دریافت پر یہ ناگواری جو بالکل نیک نیتی سے تھی یعنی اس لئے تھی کہ آپ جانتے تھے کہ عبداللہ بن ام مکتومؓ تو مسلمان ہی ہیں، اس وقت ان کی بات کا جواب نہ دینے میں چنداں ہرج نہیں، لیکن ان رئیسوں کی ناگواری پورے باشندگان مکہ پر اثر انداز ہوگی۔ اگر یہ مسلمان ہو گئے تو مکہ میں اسلام کی اشاعت کی راہ میں پھر کوئی روک باقی نہیں رہے گی۔ یہ سمجھ کر آنحضرت ﷺ عبداللہ بن ام مکتوم کی طرف سے بے التفات ہو کر ان رئیسوں کی تبلیغ و موعظت کی طرف سرتاپا متوجہ رہے۔ اس پر وحی الٰہی نے حسب ذیل الفاظ میں تنبیہ کی۔

﴿ عَبَسَ وَتَوَلّٰی ٥ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ٥ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰی ٥ اَوْيَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی ٥ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ٥ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ٥ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰی ٥ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰی ٥ وَهُوَ يَخْشٰی ٥ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ٥ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ٥ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴾ (عبس)

تیوری چڑھائی، اور منہ پھیرا کہ وہ اندھا آیا، اور تجھے کیا خبر شاید وہ سنورتا یا سوچتا تو (تمہارا) سمجھانا کام آتا، وہ جو پروا نہیں کرتا سو تو اس کی فکر میں ہے اور اس کے نہ سنورنے کا تجھ پر کوئی الزام نہیں، اور جو تیرے پاس دوڑا آیا، اور وہ (خدا) سے ڈرتا ہے تو اس سے تغافل کرتا ہے، یوں نہیں، یہ تو نصیحت ہے جو چاہے اس کو یاد کرے۔

ان آیتوں میں آنحضرت ﷺ کے اس اجتہاد پر ایک پرانے لیکن غریب مسلمان کی مزید ہدایت سے قریش کے رئیسوں کا سمجھانا زیادہ بہتر ہے، تنبیہ کی گئی اور اس نکتہ کو ذہن نشین کیا گیا کہ اسلام کی اصولی بنیادوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے نزدیک امیر و غریب، آقا اور غلام، اونچے اور نیچے کی کوئی تمیز نہیں۔ اس کی نگاہ میں بینا اور نابینا دونوں برابر ہیں۔ یہ نکتہ تو اس وقت کے فیصلہ میں آپ کے پیش نظر رہا کہ ایک مسلمان اندھے کی دلجوئی سے، ان رئیسوں کی جائز دلجوئی کر کے ان کو اسلام کی طرف مائل کرنا زیادہ بہتر ہے مگر یہ نکتہ نظر انداز ہو گیا کہ اس طرز عمل سے خود اسلام کی بنیادی تعلیم پر

کیا اثر پڑے گا اس لئے وحی الٰہی نے تنبیہ کی کہ اسلام کا یہ پیغام دنیا کے لئے صدائے عام ہے۔ جو چاہے قبول کرے، اس میں کوئی تمیز و تخصیص نہیں۔ علاوہ ازیں اس کا بھی اشارہ کیا کہ یہ روسائے قریش جن کے مسلمان ہونے کی آپ اس قدر کوشش فرما رہے ہیں وہ ایمان سے محروم ہی رہیں گے اس لئے ان کی طرف مزید توجہ بے سود ہے اور ظاہر ہے کہ آپ ان کے حق میں دانائے غیب کے اس فیصلہ سے پہلے آگاہ نہ تھے اس لئے آپ اپنے موجودہ علم کے مطابق اپنے فعل کو صحیح سمجھ رہے تھے۔

دوسرا واقعہ:

سب سے پہلی لڑائی میں مسلمانوں کے مال غنیمت کو حاصل کرنے اور بدر کے قیدیوں سے زر فدیہ قبول کرنے کا ہے۔ اس وقت تک ظاہر ہے کہ مال غنیمت اور فدیہ کا قانون نازل نہیں ہوا تھا کہ ابھی اس کا موقع ہی نہیں آیا تھا مسلمانوں کو مدینہ منورہ آ کر سب سے پہلے سریہ نخلہ میں مال غنیمت ہاتھ آیا' اس کے بعد ہی بدر کے معرکہ میں پھر مال غنیمت ملا اور ساتھ ہی قریش کے ستر قیدی بھی ہاتھ آئے جن میں اکثر مکہ کے دولت مند اور شرفاء تھے۔ ان قیدیوں کی نسبت مسلمانوں کی مختلف رائیں تھیں۔ بعض ان کو آگ میں زندہ جلا دینا چاہتے تھے، کچھ لوگ فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دینا چاہتے تھے جس سے ان کو چالیس ہزار درم ملنے والے تھے۔ نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ جو قوم مدت سے ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف اٹھاتی رہتی ہے وہ بے کسی مظلومیت' مغلوبیت اور غربت کے دور سے نکل کر جب پہلے پہل غالب اور دولت مند ہوتی ہے اور اس کو ملکی و مالی قوت پر دسترس حاصل ہوتی ہے تو وہ لمحہ اس کی زندگی میں اخلاقی حیثیت سے بڑا ہی نازک ہوتا ہے۔ غلبہ، قوت اور دولت پا کر بھی اس کے نشہ میں وہ سرشار نہ ہو اور اپنے دل و دماغ پر قابو رکھے یہ بڑا ہی مشکل کام ہے جو مظلوم تھا وہ غالب ہو جائے، اور جو ظالم تھا وہ مغلوب ہو جائے، اور اس وقت ردعمل اپنا کام کر کے مظلوم غالب میں اپنے ظالم مغلوب سے شدید انتقام لینے کا جذبہ نہ پیدا کرے یہ کوئی آسان کام نہیں۔ سیاسی و مذہبی تاریخوں سے تین صدیوں تک برابر سخت سے سخت تکلیفیں اٹھائیں لیکن قسطنطین کے زمانہ میں جب دفعتاً جو مظلوم تھے وہ غالب' اور جو ظالم تھے وہ مغلوب ہو گئے تو عیسوی قوم کا پچھلا جوہر ایک ایک کر کے رخصت ہو گیا اور ان لوگوں نے جو پہلے مظلوم تھے اس نشہ میں چور ہو کر یہودیوں اور رومی بت پرستوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جس سے اخلاق انسانی کی تاریخ آج بھی شرماتی ہے۔

غزوۂ بدر کی غیر متوقع فتح نے مظلوم و بے کس مسلمانوں کے لئے تاریخی دور کا وہی نازک موقع پیدا کر دیا۔ غریب و تنگدست مسلمانوں کو جو سالہا سال سے کسب معاش سے محروم اور غیر معمولی ضروریات کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے' ان کو غنیمت اور فدیہ کی دولت ہاتھ آئی اور وہی قریش جن کے ظلم و ستم سے ان کے بدن زخمی اور ان کے سینے داغدار تھے وہ دفعتاً مغلوب ہو گئے' ان کے بڑے بڑے سردار ان کے ہاتھوں سے لڑائی میں مارے گئے' اور ان کے ہاتھوں میں قید ہو کر ستر سردار صرف ان کے رحم و کرم پر زندہ تھے۔

اب تک مسلمان نہایت یک دلی' یکجہتی اور خلوص سے اپنی راہ طے کر رہے تھے اور یہ اخلاقی جوہر مظلوموں کی برادری میں اکثر پیدا ہو جاتے ہیں لیکن دولت آ کر ان کے بجائے ان میں اختلاف' تفریق اور حرص و طمع اور ذاتی اغراض

کے جذبات پیدا کر دیتی ہے۔ اس اتفاقی دولت اور غیر متوقع فتح و غلبہ نے صحابہ کرام کے لئے امتحان کا وہی نازک موقع پیش کر دیا اور دنیا کے سب سے بڑے رہنما کی قوت رہنمائی کے اظہار کا بھی یہی موقع تھا' چنانچہ اس وقت مال غنیمت' زر فدیہ اور قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق غالب و فاتح مسلمانوں میں اختلاف رائے رونما ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ کے سامنے اس وقت اہم ترین کام تھا۔ آپ نے امر اول کی طرف توجہ فرمائی کہ مظلوم فاتح قوت پا کر اپنا جوہر نہ کھو بیٹھیں۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے ان قیدیوں کے قتل کی جو تجویز پیش کی تھی آپ نے رد فرما دی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تجویز کہ فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے قبول فرمائی اور ان سے فرمایا کہ "اے ابوبکر تمہاری مثال ابراہیمؑ اور عیسیٰؑ کی ہے اور اے عمر تمہاری مثال نوح اور موسیٰ کی ہے۔[1] آپ نے حضرت ابراہیمؑ کی نیک دلی اور حضرت عیسیٰؑ کی رحم دلی کی مثال کی پیروی کی' اور بدر کے ان قیدیوں کی جان بخشی فرمائی، اور قتل کی بجائے زر فدیہ ادا کر دینے پر رہائی کا حکم دے دیا' اور جو ان میں نادار تھے ان کو چند مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دینے پر آزادی کا فرمان جاری کر دیا اور صحابہ کو تاکید کی کہ ان کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کریں۔ چنانچہ بعضوں کا یہ حال تھا کہ وہ خود کھجور پر قناعت کرتے تھے اور اپنے قیدیوں کو روٹی کھلاتے تھے۔

لیکن وحی الٰہی کی نگاہ میں اس سے زیادہ اہم پہلو ان غریبوں کا دفعتاً مال و دولت کی حرص و طمع میں مبتلا ہو جانا تھا چنانچہ یہی صورت پیش آئی۔ مال غنیمت کے فراہم کرنے والوں نے دعویٰ کیا کہ اس پر ہم نے لڑائی میں قبضہ کیا ہے اس لئے ہمارا ہے۔ لڑنے والے نوجوانوں نے دعویٰ کیا کہ ہماری تلواروں سے فتح حاصل ہوئی ہے اس لئے اس کے اصلی حقدار ہم ہیں۔ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کر رہے تھے وہ کہتے تھے کہ سب سے نازک اور خطرناک فرض ہمارا تھا' اس لئے ہم کو ملنا چاہئے[2] یہی اختلاف زر فدیہ کی ملکیت کی نسبت بھی ہوا ہو گا جیسا کہ سورۂ انفال کی ابتدائی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

> ﴿ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ (انفال۔۱)
>
> (اے پیغمبر!) تجھ سے (تیرے ساتھی) غنیمت کا حکم پوچھتے ہیں' تو کہہ دے کہ مال غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا ہے تو اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کرو اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کرو۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے پوچھا گیا کہ سورۂ انفال کے نزول کی کیا وجہ ہے؟ تو کہا

> ﴿ فينا اصحاب بدری نزلت حين اختلفنا فی النفل و ساء ت فيه اخلاقنا فنزعه اللّٰه من ايدينا فجعله اللّٰه الی رسول اللّٰه ﷺ فقسمه رسول اللّٰه ﷺ بين المسلمين عن سواء ﴾
>
> یہ سورۂ ہم بدر والوں کے متعلق نازل ہوئی جب مال غنیمت میں ہم نے باہم اختلاف کیا' اور اس میں ہمارے اخلاق برے ہو گئے تو خدا نے اس کو ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا اور رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں دے دیا' تو آپ نے

---

[1] مستدرک حاکم ج ۳ ص ۲۱ کتاب المغازی حیدر آباد دکن۔

[2] سیرت ابن ہشام' ذکر الفئی ببدر والاساری ج ۱ ص ۳۹۱ مطبوعہ محمد علی۔

تمام مسلمانوں کے مابین برابر تقسیم فرما دیا۔

یہی وہ تنبیہ ہے جو وحی الٰہی نے آنحضرت ﷺ کے اس فیصلہ پر کی اور آیت اتری۔ [1]

﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (انفال)

کسی پیغمبر کو زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں' تا کہ زمین میں فساد کریں' تم لوگ دنیا کا سامان چاہتے ہو' اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور دانا ہے۔ اگر خدا کی طرف سے یوں ہونا مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو تمہارے اس لینے پر تم کو بڑی سزا ملتی' تو اب جو تم نے لوٹ میں پایا' حلال و پاک کر کے کھاؤ اور اللہ کا ادب کرو' اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اسی قدر نہیں بلکہ ان قیدیوں کو جن سے زر فدیہ وصول ہو یا وصول کیا جا رہا تھا اس کے بعد ہی یہ تسلی دی گئی۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ قُلْ لِّمَنْ فِىْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (انفال)

اے پیغمبر! تمہارے ہاتھوں میں جو قیدی ہیں' ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں نیکی پائے گا' تو تم کو اس سے بہتر چیز دے گا' جو تم سے لی گئی اور تم کو معاف کرے گا اور اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ یہ تنبیہ قیدیوں کے لئے زر فدیہ لے کر رہا کرنے اور قتل نہ کئے جانے پر ہوئی [2] حالانکہ ظاہر ہے کہ جن قیدیوں سے زر فدیہ لئے جانے پر اللہ تعالیٰ نے ان سے ہمدردی فرمائی' اور اگر وہ حسن نیت سے ظاہر کریں' تو ان کی مغفرت کا وعدہ اور اس دنیاوی خزف ریزہ سے جو ان سے بطور فدیہ لیا گیا' ان کو بہتر دولت دیئے جانے کی امید دلائی' کیا ان کا قتل زر فدیہ لینے سے کم سزا ہوتی؟ اور جن سے بطور فدیہ لیا گیا ان کے قتل کئے جانے پر ان کے قاتلوں پر اس سے زیادہ سرزنش اور مقتولوں سے اس سے زیادہ ہمدردی نہ کی جاتی۔

بہر حال وہی مال غنیمت اور زر فدیہ جس کو اس وقت آنحضرت ﷺ نے صاف و صریح وحی آنے سے پیشتر قبول فرما لیا تھا اور جس پر تنبیہ ہوئی وہ آخر کار اجتہاد نبوی کے مطابق مناسب موقع پر جائز و حلال و طیب ہی ٹھہرا لیا گیا اور غلطی باقی نہیں رہی' مال غنیمت لینے کے متعلق ﴿ كُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ ﴾ کا حکم اسی وقت آ گیا' اور فدیہ لینے کی اجازت ﴿ اِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً ﴾ الفاظ میں بعد کو مناسب زمانہ میں آ گئی اور اس مال و دولت کی حرص و طمع سے اس وقت جو بداخلاقی پیدا ہونے والی تھی اس کا ازالہ ہمیشہ کے لئے اس طرح کر دیا کہ اس کی تقسیم کا ابدی قانون بنا دیا گیا اور اس میں تمام ضروری مستحقین کے حصے لگا دیئے گئے۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ج ا ص ۳۹۱۔

[2] مزید تفصیل کے لئے دیکھو سیرت النبی جلد اول میں غزوہ بدر کا بیان۔

تیسرا واقعہ:

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ غزوۂ تبوک کے لئے جا رہے تھے جس میں بکثرت مسلمانوں کی شرکت کی ضرورت تھی کہ مقابلہ رومیوں کے دل بادل فوج سے تھا اور کسی منظم سلطنت سے ٹکر کھانے کا یہ پہلا موقع مسلمانوں کو پیش آیا تھا اور موسم بھی نہایت گرم اور سخت تھا۔ تیس ہزار مسلمانوں کی جمعیت روانہ ہوگئی مگر کچھ مخلص مسلمان مجبوراً چھوٹ گئے اور اکثر منافقین نے جان بوجھ کر اس کی شرکت سے جی چرایا۔ آپ واپس آئے تو عدم شرکت کے قصوروار منافقین آ آ کر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے عذرات بیان کرنے لگے۔ آپ نے ان کا اعتبار کر کے رحم فرما کر ان کے قصور سے درگذر کیا، اس پر تنبیہ ہوئی۔

﴿ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِاسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴾

(توبہ۔ ۶۔ ۷)

وہ خدا کی قسمیں کھائیں گے اگر ہم مقدور رکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ نکلتے' وہ اپنی جانوں کو برباد کرتے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں' اللہ تجھ کو بخشے تو نے ان کو رخصت کیوں دی' جب تک تجھ پر وہ کھل نہ جاتے جو ان میں سچ بولتے اور تو جان لیتا جھوٹ بولنے والوں کو۔

ظاہر ہے کہ آپ علم غیب سے آگاہ نہ تھے اور ان کے واقعی حالات سے بے خبر تھے اس لئے بظاہر ان کے قول پر اعتبار ہی کرنا تھا اور وہی آپ نے کیا، مگر علام الغیوب نے حقیقت حال سے باخبر فرما کر ان کے جھوٹ کا پردہ چاک کیا۔ بہرحال یہاں بھی منشائے خطا' اگر خطا سمجھی جائے' تو وہی ترحم کی شان تھی۔

چوتھا واقعہ:

منافقین کی نسبت آپ ﷺ کو اطلاع دی گئی تھی کہ ان کے حق میں آپ کی دعائے مغفرت قبول نہ ہوگی اور فرما دیا گیا تھا کہ:

﴿ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ط اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ (توبہ۔ ۸۰)

تو ان کی مغفرت کی دعا مانگے' اگر ستر دفعہ بھی ان کی مغفرت کی دعا مانگے تو ہرگز ان کو خدا نہ بخشے گا' یہ اس لئے کہ انہوں نے خدا کا اور اس کے رسول کا انکار کیا۔

اس حکم کے آنے کے بعد عبداللہ بن ابی بن سلول کا انتقال ہوا۔ یہ منافقوں کا سردار تھا۔ اس کا لڑکا مخلص مسلمان تھا۔ اس نے آ کر آپ سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی' جس کو آپ نے فرطِ کرم سے رد نہ فرما سکے۔ حضرت عمرؓ نے عرض بھی کی یارسول اللہ اس کے عدم مغفرت کے متعلق تو حکم ہو چکا ہے۔ فرمایا میں ستر دفعہ سے بھی زیادہ اس کی مغفرت کی دعا مانگوں گا، بہرحال آیت بالا میں گو آپ کے مغفرت مانگنے اور نہ مانگنے دونوں کو بے کار و بے سود بتایا

گیا تھا مگر ان کے حق میں سرے سے دعائے مغفرت نہ مانگنے کی کوئی ممانعت نہ تھی اس لئے آنحضرت ﷺ نے غایت شفقت سے اس بیکار فرض کو انجام دیا تا کہ اس کے مخلص مسلمان فرزند کی دل شکنی نہ ہو اور اس لیے تغافل فرمایا کہ گو ایک مسلمان کی دلجوئی تو ہو گی مگر بیسیوں منافقین کو اپنے چھپانے میں کامیابی ہو جائے گی، اور وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر فتنوں کا باعث بنیں گے اس لئے حکم ہوا۔

﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴾ (توبہ۔۱۱)

اور نہ کبھی ان میں سے کسی کے جنازہ کی نماز پڑھ، اور نہ ان کی قبر پر کھڑا ہو، بے شک انہوں نے خدا اور اس کے رسول کا انکار کیا، اور اسی گنہگاری کی حالت میں مرے۔

پانچواں واقعہ:

اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی بعض بیویوں کی خوشنودی اور رضا مندی کے لئے کسی مباح چیز کو جو آپ ﷺ کو بہت مرغوب تھی اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، یعنی اس کے کبھی نہ استعمال کرنے کا عہد فرما لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص پر مباح چیز کا کھانا فرض نہیں، اس کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی خوشی سے یا کسی دوسرے کی رضا مندی کے لئے اس کے نہ کھانے کا عہد کر لے، اس لئے آنحضرت ﷺ نے بعض بیویوں کی خاطر جن کو وہ شے پسند نہ تھی اس کو اپنے اوپر حرام کر لیا تو ظاہر ہے کہ آپ کا اپنی بعض بیویوں کی خاطر داری کے لئے ایسا کرنا الزام کے قابل نہیں کہ آپ نے بحیثیت شوہر کے ان کی اتنی دلجوئی کو بھی عورتوں کے ساتھ عدل وانصاف کے مناسب سمجھا، مگر اس مسئلہ کی ایک دوسری حیثیت بھی تھی اور وہ یہ کہ بحیثیت ایک پیغمبر کے ایک حلال و جائز چیز کو اپنے اوپر حرام کر لیا اور اس کے نہ کھانے کا عہد کرنے سے آپ کی اقتداء میں امت کے عام افراد بھی اس کو ناجائز نہیں تو ناپسند ضرور ہی کرتے، اور یہ ایک طرح سے شریعت الٰہی میں تبدیل و تحریف کا مرادف ہو جاتا، اس لئے حکم آیا کہ ان امور میں پیغمبروں کو کسی کی دلجوئی اور خاطر داری کی پرواہ نہ چاہیے، فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾

(تحریم۔۱)

اے پیغمبر جس کو اللہ نے تیرے لئے حلال کیا ہے، اس کو حرام کیوں کرتا ہے؟ اپنی بیویوں کی مرضی چاہتا ہے، اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا آپ کو نبی کہہ کر خطاب کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ بحیثیت ایک انسان اور شوہر ہونے کے آپ ایسا کر سکتے تھے مگر پیغمبر کی حیثیت سے آپ کو یہ اختیار نہیں۔

الغرض یہی وہ پانچ واقعے ہیں جن میں آپ کی اجتہادی خطا ثابت کی گئی ہے مگر تفصیلات سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ان کو خطا کہنا درحقیقت مجاز ہے کہ پیغمبر کی بلندی اور معصومی کو پیش نظر رکھ کر اس مجازی خطا کی بھی اجازت نہیں اور اسی لئے وحی الٰہی نے ان میں سے ہر موقع پر تنبیہ کی اور اپنے صحیح فیصلہ سے رہنمائی فرمائی۔ اب کیا کسی کا شبہہ یہ بھی ہے کہ جس طرح آنحضرت ﷺ کو یہ معمولی مسامحات پیش آئے جن کی تنبیہ و اصلاح ہر وقت وحی الٰہی نے کی، ایسے ہی ممکن ہے کہ

آپ کو اور بھی ایسے مسامحات پیش آئے ہوں جن کی تنبیہ و تصحیح کی حکمت الٰہی نے پروانہ کی اور خاموشی برتی۔ اگر کسی کو یہ شبہ ہے تو درحقیقت رسالت و نبوت کی مرتبہ شناسی اور دین الٰہی و شریعت ربانی کی حقانیت اور اللہ تعالیٰ کے طرق رشد و ہدایت کی مغفرت سے کوسوں دور ہے۔ رسولوں کی بعثت اس لئے ہے کہ وہ غلط کار انسانوں کو ان کی غلطی سے نکال کر حق و صواب کی تعلیم دیں، نہ اس لئے کہ ان کے ذریعہ اُلٹے ہدایت کے بجائے مزید ضلالت کا اضافہ ہو۔ استغفر اللہ ثم استغفر اللہ! اس لئے ناممکن ہے کہ رسولوں کے ہاتھوں اور زبانوں سے کوئی ایسا کام یا حکم صادر ہو جو حکمت الٰہی کے مطابق نہ ہو اور پھر وہ اس کی تصحیح اور رہنمائی سے تغافل برتے اور انسانوں کو خود اپنے رسولوں کے ذریعہ گمراہ ہونے دے۔

پیغمبرانہ اجتہاد و رائے علم کا وہ کوثر ہے جس کی دھاریں دماغ سے نہیں بلکہ دل کے سرچشمہ سے بہتی ہیں جو انسانی رائے و تجربہ سے نہیں بلکہ الہام الٰہی، القائے ربانی، حکمت یزدانی، فہم رسالت، بلکہ نبوت سے ماخوذ ہے اور جس کی نسبت محرم اسرار شریعت، عمر فاروق برسر منبر یہ فرماتے ہیں۔

﴿ یـا ایہا الناس ان الرای انما کان من رسول اللہ ﷺ مصیبا لان اللہ کان یریہ و انما ھو منا الظن والتکلف ﴾ (ابوداؤد۔ کتاب الاقضیہ)

اے لوگو! آنحضرت ﷺ کی رائے غلطی سے پاک تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو راہ دکھاتا تھا، اور ہماری رائے ہمارا گمان اور از خود کہنا ہے۔

وہ رائے نبوی جو خدا کے بتانے اور دکھانے سے قائم ہوئی ہو، ظاہر ہے کہ بمنزلہ وحی کے ہے، اور اس کا نام بشری اجتہاد اور انسانی رائے نہیں، بلکہ نبوی اجتہاد اور پیغمبرانہ رائے ہے، جو عملاً وحی الٰہی کی ہم مرتبہ اور کلام ربانی کی ہم پایہ ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس خطبہ میں جو کچھ کہا ہے درحقیقت وہ خود کلام پاک سے مستنبط ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

﴿ اِنَّـآ اَنۡـزَلۡـنَـآ اِلَيۡكَ الۡكِتَابَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰكَ اللّٰهُ ؕ وَلَا تَـكُنۡ لِّلۡخَآئِنِيۡنَ خَصِيۡمًا ﴾ (نساء)

ہم نے تجھ پر کتاب سچائی کے ساتھ اتاری، تاکہ لوگوں کے درمیان جو اللہ تجھ کو سجھائے فیصلہ کرے، اور تو نہ ہو دغا بازوں کی طرف سے جھگڑنے والا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ آنحضرت ﷺ کو جو دکھایا، سجھایا اور رائے پیدا کرائی جاتی تھی وہ خدا کی طرف سے ہوتی تھی، یہی پیغمبرانہ رائے ہے جس کی نسبت خود آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

﴿ انا اقضی بینکم برائ فیما لم ینزل عَلَیَّ ﴾ (ابوداؤد۔ کتاب الاقضیہ)

میں تم لوگوں کے درمیان اس مسئلہ میں جس کی نسبت مجھ پر وحی نہیں ہوئی، اپنی رائے سے فیصلہ کرتا ہوں۔

یہ فیصلہ اگر غلط ہوتا تو فوراً وحی الٰہی دست گیری کرتی اور صحیح راستے پر لے آتی، جیسا کہ گذشتہ پانچوں واقعات سے ظاہر ہے

ایک غلط استدلال:

اس آیت پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقدمات کے فیصلوں میں آپ کو ''اراءتِ الٰہی'' ہوتی تھی یعنی خدا کی

طرف سے آپ کو رائے سجھائی جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ اراءتِ الٰہی (خدا کی طرف سے سمجھایا جانا) تا کہ آپ کتاب الٰہی کے مطابق فیصلہ کریں غلط نہیں ہو سکتی، لیکن ابوداؤد وغیرہ میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اہل مقدمہ سے فرمایا:

''میں ایک بشر ہوں، تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو، اور شاید تم میں سے بعض زیادہ زبان آور ہوں، جو اپنی دلیل کو خوبی سے بیان کر سکتے ہوں، تو میں جیسا سنتا ہوں ویسا فیصلہ کر دیتا ہوں، تو میں اگر کسی کو وہ حق دلا دوں جو اس کا نہیں بلکہ اس کے بھائی کا ہے، تو وہ نہ لے کہ میں اس کو آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔'' (کتاب الاقضیہ)

اس سے ایک غلط فہم یہ استدلال بھی کر سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے فیصلے ہمیشہ غلطی سے پاک نہیں ہوتے تھے، اس لئے اُمت آپ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی پر مجبور نہیں، لیکن ایسا خیال کرنا سراسر مغالطہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ مقدمات میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک واقعہ کی اصلی روداد جس کو ہر مدعی اور مدعا علیہ اپنے دعوی کے مطابق بنا کر اپنے اپنے رنگ میں بیان کرتا ہے، اس کے بعد دوسری چیز اس بیان کردہ روداد کے مطابق صحیح اور عادلانہ حکم اور فیصلہ ہے جو تمام تر مقدمہ کی اس روداد پر مبنی ہوتا ہے، جو حاکم و قاضی کے سامنے بیانات اور شہادتوں کے ساتھ پیش ہوتی ہے۔ یہ بات کہ واقعہ کی اصلی روداد کیا ہے اور ان میں سے کون صحیح کہہ رہا ہے، علم غیب سے تعلق رکھتی ہے جس کا دعویٰ کسی نبی کو نہیں اور اگر ہو بھی تو یہ دعوی بجائے خود مسلم ہے کہ قاضی کا ذاتی علم دو انسانوں کے درمیان فیصلہ کا مبنیٰ نہیں قرار پا سکتا، اس کے لئے فریقین کے بیانات، شہادتیں اور دلائل ہی بکار آمد ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امر اول کے متعلق عموماً آپ کو غیب کا علم عطا نہیں ہوا، لیکن دوسری چیز یعنی جس روداد کو آنحضرت ﷺ نے صحیح باور کیا اس کے مطابق آپ کا فیصلہ کبھی کبھی صحیح و صواب اور عادلانہ نہیں ہوتا تھا، یہ کہنا رسول و نبی کی شان کی توہین و تحقیر ہے اور اس ''اراءت الٰہی'' کے خلاف ہے جس کا شرف مقدمات کے فیصلہ میں آپ کو بخشا جاتا تھا اس لئے جو غلطی فیصلوں میں آپ سے ہو سکتی تھی وہ فریقین میں سے کسی ایک کی دلیل و شہادت کو سن کر اس کے صحیح یا غلط، مطابق واقعہ یا مخالف واقعہ سمجھنے میں لیکن جس کو آپ نے صحیح باور فرما لیا اس کے مطابق مناسب و صحیح حکم و فیصلہ کرنے میں آپ سے کبھی غلطی نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی اور امت آپ کی پیروی، آپ کے ان قضایا اور فیصلوں میں کرتی ہے نہ کہ نزاع مذکور کے گذشتہ واقعات اور گذشتہ مقدمات کے صحیح یا غلط باور کرنے میں ﴿فَشَتَّانَ بَيْنَهُمَا﴾

آنحضرت ﷺ کے اس اعلان میں نکتہ یہ ہے کہ شاید فریقین میں سے کوئی غلط بیان یا جھوٹا، برسر باطل جو اپنے مقدمہ کی روداد زیادہ خوبی سے بنا کر آپ کی عدالت سے موافق فیصلہ حاصل کر لے یہ سمجھے کہ گو حقیقت میں میرا حق نہ تھا، لیکن اب جب عدالت نبوی نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا تو میری ملکیت ثابت ہوگئی اور غصب حق کے گناہ سے بریت ہوگئی تو اس کا ایسا سمجھنا صحیح نہ ہوگا قانوناً حکم نافذ ہو جائے گا مگر عنداللہ جو برسر حق تھا وہ حق ہی رہے گا اور جو برسر باطل تھا وہ باطل ہی رہے گا اور جو اصل مالک تھا وہی مالک رہے گا اور جو غاصب ہے وہ غاصب ہی ٹھہرے گا۔ اسی اعلان کا اثر تھا کہ جب آنحضرت ﷺ نے ایک مقدمہ میں فریقین کو اس حقیقت سے مطلع فرمایا تو دونوں رو پڑے اور دونوں ایک دوسرے کے حق میں دست بردار ہونے پر آمادہ ہو گئے۔ (ابوداؤد کتاب الاقضیہ)

آنحضرت ﷺ روداد مقدمہ کو سامنے رکھ کر جو فیصلے فرماتے تھے وہ تمام تر حق، منصفانہ اور صحیح ہوتے تھے اور ان

کی اطاعت سے انحراف کفرونفاق تھا۔ اسی لئے ارشاد ہوا کہ:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (نساء۔۹)

سو قسم ہے تیرے رب کی، وہ مومن نہ ہوں گے جب تک وہ تجھ کو حکم نہ مانیں، پھر اپنے دلوں میں تیرے فیصلہ سے تنگی نہ پاویں اور مان کر قبول کریں۔

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾ (احزاب۔۵)

اور کسی ایماندار مرد یا عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے، تو بھی اس کو اپنے کام کا اختیار رہے، اور جو خدا اور اس کے بے حکم چلا، وہ صریح گمراہ ہوا۔

کیا امت کو رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلوں کے بے چوں چرا قبول کر لینے کا خدا کی طرف سے تاکیدی حکم بر سر باطل پہلو پر ہو سکتا ہے؟ چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ آپ کا کوئی فیصلہ کبھی ظالمانہ اور غلط نہیں ہو سکتا۔

﴿وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ○ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ط بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ (نور۔۴۸۔۵۰)

اور جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کر دے، تو ان میں ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے، اور اگر ان کو کوئی حق پہنچتا ہو تو قبول کر کے چلے آئیں، کیا ان کے دلوں میں روگ ہے یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ ناانصافی کرے گا، بلکہ وہی بے انصاف ہیں۔

عقل بشری:

اس میں بھی شک نہیں کہ وحی اور ملکہ نبوت کے علاوہ نبی میں نبوت و رسالت کے فرائض سے باہر کی چیزوں میں اس کی عقل وہی ہوتی ہے جو عام انسانوں کی ہوتی ہے اور جس میں اجتہادی غلطی کا ہر وقت امکان ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک اجتہاد کی یہی وہ دوسری قسم ہے۔ جس میں نبی سے بھی غلطی ہو سکتی ہے کہ اس کا مدار وحی والہام اور ملکہ نبوت پر نہیں بلکہ انسانی علم و تجربہ پر ہوتا ہے اور یہی وہ قسم ہے۔ جس کا اتباع پیروؤں پر واجب نہیں اور اس کی بہترین مثال کھجور کی کاشت کا واقعہ ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ کے بعض باغوں میں گذرے تو دیکھا کہ کچھ لوگ کھجوروں کے درختوں پر چڑھ کر کچھ کر رہے ہیں۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا کر رہے ہیں؟ ایک ہمراہی نے کہا کہ یہ مادہ کھجوروں میں نر کھجوروں کے پھول ڈالتے ہیں کہ پھل زیادہ آئیں۔ فرمایا ”میں تو نہیں سمجھتا کہ اس سے کچھ فائدہ ہوگا“ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا ”اگر ایسا نہ کرتے تو بہتر ہوتا“ اس نے جا کر باغ والوں سے آپ کا یہ فقرہ بیان کر دیا۔ صحابہ نے جو سراپا اطاعت تھے اس پر عمل کیا اور ایسا کرنا چھوڑ دیا۔ پھل اس سال کم آئے یا کم ٹھہرے۔ آپ کا پھر گذر ہوا، تو ان

لوگوں نے صورت حال عرض کی۔ آپ نے فرمایا میں نے تو یونہی ایک بات سمجھ سے کہہ دی تھی، اگر ان کو اس عمل سے فائدہ ہوتا تھا تو وہ کریں، پھر فرمایا۔

﴿ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَیْءٍ مِّنْ دِیْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهٖ وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَیْءٍ مِّنْ رَّاْیِیْ فَاِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ ﴾

میں تو ایک آدمی ہی ہوں، جب تمہیں دین کا کوئی حکم دوں تو اس کو قبول کرو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں ایک آدمی ہوں۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ [1]

﴿ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاكُمْ ﴾

تم اپنے دنیا کے کام کو زیادہ جانتے ہو۔

تیسری روایت کے الفاظ ہیں۔

﴿ فانی انما ظننت ظنا فلا تؤاخذونی بالظن ولكن اذا حدثتكم عن اللّٰه شيئا فخذوا به فانی لن اكذب علی اللّٰه عزوجل ﴾

میں نے ایک گمان سا کیا تھا، گمان پر مجھ کو نہ پکڑو، ہاں جب خدا کی طرف سے کوئی بات کہوں تو اس کو لو کہ میں خدا پر جھوٹ نہ کہوں گا۔

ان تینوں روایتوں میں آپ نے اپنے اس ارشاد کو ظن (گمان) رائے اور امر دنیا سے تعبیر فرمایا ہے اس سے یہ کلیہ سمجھ آتا ہے کہ امور دین و شریعت میں آپ کا ہر حکم واجب اور من جانب اللہ ہے، لیکن کھیتی باڑی، علاج معالجہ وغیرہ خالص دنیاوی امور ہیں۔ اگر آپ نے کچھ کہا تو اس کی حیثیت فقط مشورہ اور رائے کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ صحابہ کرام نے جن باتوں میں اپنا مشورہ آپ کو دینا چاہتے تھے، پوچھ لیتے تھے کہ یا رسول اللہ! یہ وحی سے ہے یا رائے ہے۔ آپ جب فرما دیتے تھے کہ رائے سے ہے تو وہ اپنا مشورہ پیش کرتے اور آپ پسند فرماتے تو قبول فرماتے۔ غزوۂ بدر میں آپ نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہا۔ ایک صحابی نے آ کر عرض کی یا رسول اللہ! اس مقام کا انتخاب وحی سے ہے یا رائے سے ہے۔ فرمایا، محض رائے ہے تو عرض کی کہ جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام بہتر نہیں فلاں مقام بہتر ہے۔ آپ نے ان کی رائے پسند کی اور اس پر عمل فرمایا۔ اسی طرح صلح و جنگ اور حکومت کے دوسرے معاملات میں بھی صحابہؓ سے مشورہ لیا، اور عمل فرمایا ہے اور اسی میں خود حضور ﷺ کو ﴿ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ ﴾ (توبہ) یعنی ''امور حکومت یا عام امور میں صحابہ سے مشورہ لو'' کا حکم خدا کی طرف سے ہے۔ چنانچہ غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے میں سلمان فارسیؓ کی رائے پر عمل کیا، لیکن امور جنگ و سیاست میں بھی جس بات کا حکم عقل بشری سے نہیں، بلکہ وحی الٰہی یا فہم نبوی سے ہوا تھا۔ اس میں آپ نے نہ کسی سے مشورہ لیا اور نہ کسی کے مشورے کو قبول فرمایا۔ صلح حدیبیہ کی شرائط اور دفعات جو سراسر مصلحت الٰہی اور حکمت ربانی پر مبنی

---

[1] یہ تینوں روایتیں صحیح مسلم باب وجوب امتثال ما قالہ شرعاً دون ما ذکرہ ﷺ من معائش الدنیا علی سبیل الرائی ج ۲ ص ۳۰۵ مصر میں ہیں ص ۲۶۴ طبع کراچی۔

تھے ان کے بدلنے پر حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ نے کیا کیا زور نہیں لگایا' مگر آنحضرت ﷺ نے کچھ التفات نہ فرمایا اور آخر مستقبل نے بتا دیا کہ فہمِ نبوت سراسر صحیح تھی۔ اسی طرح غزوۂ احد جیسے نازک موقع پر عبداللہ بن ابی کا تین سو آدمیوں کے ساتھ پھر جانا گوارا کیا' مگر مدینہ سے باہر جا کر صف آرا ہونے سے باز نہ آئے اور پھر مستقبل نے مصلحت الٰہی کے راز کو فاش کیا۔

ایک ادنیٰ سا تامل عقلی حیثیت سے بھی یہ راز بتا دے گا کہ دنیا میں ہر صاحب فن کی ایک نہیں دو عقلیں ہوتی ہیں۔ ایک اس فن کے متعلق جس کی استعداد اس کے اندر رکھی جاتی ہے اور پھر تعلیم و تربیت مشق اور کثرت عمل سے وہ اتنی بلند اور پختہ ہو جاتی ہے کہ وہ اس فن کے بڑے بڑے عمیق اور مشکل دقائق کو ایک نظر میں معلوم کر لیتی ہے اور اس کے لاینحل عقدوں کو اشاروں میں حل کر دیتی ہے لیکن اس دائرہ کے باہر اس کی دوسری عقل عام انسانوں ہی کی طرح معمولی ہوتی ہے۔ ایک شخص جو فن تعمیر کی مہارت اور ہندسہ اور انجینئرنگ کی صناعی میں غیر معمولی عقل و ذہانت رکھتا ہے بالکل ممکن ہے کہ کھجور کی کاشت میں اس کی عقل معمولی انسانوں سے بھی کم درجہ ہو۔ ایک فلسفی جو اپنے زور فکر سے افلاطون و ارسطو کی غلطیاں نکالتا ہے وہ تعمیر کے فن میں ایک معمولی مزدور سے بھی زیادہ کم عقل ہو۔ یہ روزمرہ کی پیش آنے والی مثالیں ہیں۔ اسی طرح وہ برگزیدہ انسان جو روحانیت کے اسرار' معرفت ربانی کے حقائق، تزکیہ نفس کے رموز، اخلاق و معاشرت کے آداب اور حقوق و شریعت کے مسائل میں دقیقہ رس فہم اور نکتہ دان عقل رکھتا ہو اس کو تعمیر و کاشتکاری کے مسائل میں محض معمولی درک ہو بلکہ بالکل نہ ہو۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام امور دین و شریعت میں وحی اور ملکہ نبوت سے جو کچھ فرماتے ہیں وہ عین مصلحت' عین حکمت' خطا اور غلطی سے سرتاپا مبرا اور پاک ہوتا ہے لیکن دوسرے امور مثلاً پہننے' اوڑھنے' کھانے پینے' رہنے سہنے' سلطنت و سیاست' نظم و نسق' صلح و جنگ' سامان و اسلحہ' جنگ و سواری' صنعت و حرفت' طب و علاج وغیرہ دنیاوی امور کی نسبت کا مصلحتیں بتا کر جزئیات کی تفصیل سے انہوں نے احتراز فرمایا اور کسی قطعی فیصلہ کا مسلمانوں کو پابند نہیں کیا۔ پہننے اوڑھنے کے متعلق صرف تین باتیں فرمائیں۔ پہلی یہ کہ وہ لباس اور طرز لباس نہ اختیار کیا جائے جس سے ستر عورت نہ ہو' دوسری یہ کہ مرد وہ لباس اختیار نہ کریں جو عورتوں کے لئے زیبا ہے' نہ عورتیں وہ لباس اختیار کریں جو مردوں کے لئے مناسب ہے' تیسری بات یہ ہے کہ وہ لباس پسندیدہ نہیں جس سے غرور و نخوت نمایاں ہو، کھانے پینے میں چند حرام چیزوں کے سوا کسی کی ممانعت نہیں' نظم و نسق اور نظامِ حکومت و سلطنت میں چند کلی اصول تعلیم فرمائے' شہنشاہانہ اور جابرانہ حکومت نہ ہو لوگوں میں مساوات ہو اور اہم امور میں اہل حل و عقد کا باہمی مشورہ ہو، وعلیٰ ہذا القیاس۔

الغرض یہی وہ امور ہیں جن میں زمانہ اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تغیر و انقلاب ہوتا ہے اس لئے ان کو ہمیشہ کے لئے محدود کر دینا مصلحتِ الٰہی کے خلاف تھا۔

ملکۂ نبوت یا عقل نبوت کا شرعی ثبوت:

گذشتہ مباحث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ نبی ﷺ میں علم و فہم کے تین ذریعے ہیں۔ وحی' ملکۂ نبوت اور عام عقل بشری۔ ان میں سے اول و آخر کے ثبوت کے لئے اب کسی استدلال کی ضرورت نہیں کہ اول تو یہ مسلمات سے ہیں'

اور دوسرے اوپر کی تشریحات میں مستقل طور سے ان پر بحثیں ہو چکی ہیں، لیکن اب تک ہم نے دوسری چیز یعنی ملکہ نبوت کے لئے کوئی شرعی دلیل پیش نہیں کی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ کہنی ہے کہ جن علماء نے اس کی حقیقت ظاہر کی ہے، انہوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کے لئے الگ الگ اصطلاحیں قائم کی ہیں مگر مفہوم و معنی کے لحاظ سے وہ دراصل ایک ہیں۔ سلف و صالحین میں سے بعض نے اس کو القاء فی الروع (دل میں ڈالنا) نبی کی حکمتِ قلبیہ، توفیق ازلی اور قوت تبیین سے تعبیر کیا ہے[1] امام غزالی و امام رازی اور دوسرے متکلمین نے اس کو ملکہ نبوت سے ادا کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب اور علمائے اصول نے اس کو "پیغمبرانہ قوت اجتہاد" کہا ہے اور صوفیہ کی عام پسند اصطلاح میں اس کو علم لدنی کہا جاتا ہے، مگر ان سب کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں یعنی نبی کے اندر وہ پیغمبرانہ عقلی قوت جو بشری عقل سے فوق ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ وحی کی تشریح، اسرار شریعت کا بیان اور دقائق حکمت کی اپنی زبان سے توضیح کرتا ہے۔

انبیائے کرام کے ان ربانی انعامات کی فہرست پڑھیے، جن کا تذکرہ قرآن نے جا بجا کیا ہے تو وحی کی مخصوص نعمت کے بعد فہرست انعامات میں جو چیز نظر آئے گی وہ "علم نبوت" ہے جس کو کہیں ذکر (یادداشت)، کہیں حکم (حق و باطل میں تمیز کا ملکہ)، کہیں حکمت (دانائی)، کہیں شرح صدر (سینہ کا کھول دینا)، کہیں تفہیم (سوجھ بوجھ دینا)، کہیں تعلیم (سکھا دینا)، کہیں اراءت (دکھا دینا سوجھا دینا) کہا گیا ہے۔ ان سب مختلف الفاظ کا مفہوم وحی سے نیچے اور عقل بشری سے اوپر عقل نبوی کے سوا اور کیا ہے؟ ان سے مراد وحی تو اس لئے نہیں کہ ان کا ذکر وحی سے الگ ہوتا ہے اور عقل بشری اس لئے نہیں کہ عقل بشری خاص نبی پر کوئی انعام نہیں کہ یہ نعمت تو ہر انسان کو کچھ نہ کچھ ملی ہے۔ اس بناء پر اس سے مراد عقل نبوی اور حکمت نبوی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

حکمت:

انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں عطا ہوتی ہیں ان میں ایک خاص نعمت کا ذکر قرآن پاک میں بار بار آتا ہے اور وہ حکمت ہے۔ آل ابراہیمؑ پر اللہ تعالیٰ نے جو احسانات کئے ان کا ذکر وہ ان الفاظ میں فرماتا ہے:

(۱) ﴿ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴾ (نساء)

تو بے شبہ ہم نے ابراہیمؑ کی اولاد کو کتاب اور حکمت دی اور ان کو بڑی سلطنت بخشی۔

حضرت لقمان کی نسبت ہے۔

(۲) ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ ﴾ (لقمان۔۲)

اور یقیناً ہم نے لقمان کو حکمت دی۔

حضرت داؤدؑ کی شان میں ہے۔

(۳) ﴿ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ﴾ (ص۔۲)

اور ہم نے داؤدؑ کی سلطنت مضبوط کی اور اس کو حکمت اور قول فیصل عطا کیا۔

---

[1] یہ تمام الفاظ امام شافعیؒ کی کتاب الرسالہ میں مذکور ہیں۔

(۴) ﴿وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ﴾ (بقرہ)

اور داؤد نے جالوت کو مارا، اور خدا نے داؤد کو سلطنت اور حکمت بخشی، اور جو چاہتا ہے اس میں سے کچھ سکھایا۔

حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں۔

(۵) ﴿قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ﴾ (زخرف)

میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں تاکہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔

خود اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ پر اپنا احسان جتاتا ہے تو فرماتا ہے۔

(۶) ﴿وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰاةَ وَالْاِنْجِيْلَ﴾ (مائدہ)

اور یاد کر جب میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل کی تعلیم دی۔

عام انبیاء کے متعلق ہے۔

(۷) ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتَابٍ وَّحِكْمَةٍ﴾ (آل عمران)

اور جب اللہ نے نبیوں سے وعدہ لیا کہ جو میں تم کو کوئی کتاب اور کوئی حکمت دوں۔

حضرت ابراہیمؑ نے آنحضرت ﷺ کے ظہور کی یہ دعا مانگی تھی۔

(۸) ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (بقرہ)

ہمارے پروردگار! اور ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج، جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو سنوارے۔ بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی۔

(۹) ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ (بقرہ)

جس طرح ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا وہ تم کو ہماری آیتیں سناتا اور تم کو سنوارتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔

اس دعائے ابراہیمی کے مطابق آنحضرت ﷺ کے ظہور کا احسان اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں ہم پر ظاہر فرمایا ہے۔

(۱۰) ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (آل عمران)

یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا، کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، اور ان کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہی احسان انہیں الفاظ میں سورۂ جمعہ میں دہرایا ہے۔

(۱۱) ﴿ هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِى الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴾ (جمعہ)

وہی اللہ جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا' جو ان کو اللہ کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے اور کتاب اور حکمت سکھاتا ہے' اور وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

خود آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے اپنا یہ احسان ان پر ظاہر فرمایا ہے۔

(۱۲) ﴿ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۗ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَىْءٍ ۗ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۗ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴾ (نساء-۱۱۳)

اور اگر خدا کا فضل و کرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک جماعت ارادہ کر چکی تھی کہ وہ تجھے گمراہ کر دے اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو' اور تجھے کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری' اور تجھ کو وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا' اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل تھا۔

آنحضرت ﷺ سے خطاب ہے۔

(۱۳) ﴿ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰۤى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ﴾ (اسرائیل)

یہ وہ ہے جو خدا نے حکمت کی باتوں میں سے تم پر وحی کی ہے۔

عام مسلمانوں سے ارشاد ہے:

(۱۴) ﴿ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ﴾ (بقرہ)

اور اللہ کا جو احسان تم پر ہے اور اس نے تم پر جو کتاب اور حکمت اتاری ہے ان کو یاد کرو، خدا تم کو اس سے سمجھاتا ہے۔

خاص طور سے ازواج مطہرات کو خطاب ہے۔

(۱۵) ﴿ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِىْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ﴾ (احزاب-۴)

اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں' ان کو یاد رکھو

یہ نعمت حسب استعداد عام مسلمانوں کو بھی ملا کرتی ہے۔

(۱۶) ﴿ يُّؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴾ (بقرہ-۳۷)

اور خدا جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے' اور جس کو حکمت بخش دی گئی اس کو بڑی دولت (بھلائی) دی گئی۔

اسی کے ذریعہ تبلیغ و دعوت کا حکم بھی ہوتا ہے۔

(۱۷) ﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ ﴾ (نحل-۱۲۵)

اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف، تو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلا، اور ان سے عمدہ طریقہ سے مناظرہ کر۔

ایک جگہ قیامت اور عبرت کے واقعات پر حکمت کا اطلاق ہوا ہے۔

(۱۸) ﴿وَلَقَدْ جَآءَهُم مِّنَ الْاَنْبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۝ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ﴾ (قمر۔۵۔۶)

اور ان کو اتنے احوال جتنے میں ڈانٹ ہوسکتی ہے، پہنچ چکے ہیں، موثر حکمت تو ان کو ڈر سنانے والے فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

اوپر کی سطروں میں وہ تمام آیتیں لکھ دی گئیں ہیں جن میں حکمت کا لفظ آتا ہے۔ ان آیتوں میں حکمت کا لفظ کہیں تنہا آیا ہے اور کہیں ''کتاب'' کے بعد آیا ہے۔ کتاب کے دو معنی قرآن میں آئے ہیں، ایک ''صحیفہ ربانی'' کے معنی میں اور یہ اکثر آیا ہے، اور دوسرے نوشتۂ الٰہی اور علم الٰہی کے معنی میں جیسے ﴿لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ﴾ ''اگر خدا کا نوشتہ یا علم پہلے نہ ہوتا'' ان سابقہ آیتوں میں کتاب سے تو بے شبہہ آسمانی کتاب اور صحیفہ ربانی، یا یوں کہو کہ وحی سے کتاب مراد ہے جیسے تورات و قرآن وغیرہ مراد ہے لیکن ''حکمت'' کا مفہوم ان آیتوں میں کیا ہے؟ حکمت کے لغوی معنی تو دانائی کی بات اور کام کے ہیں، مگر یہاں اس سے مقصود کیا ہے اس تحقیق کے لئے ضرورت ہے کہ مستند اہل لغت اور ماہرین قرآن کے اقوال نقل کر کے تبصرہ کیا جائے اور سب سے قدیم لغت نویس ابن درید المتوفی ۳۲۱ھ اپنی کتاب جمهرة اللغة میں ''حکمت'' کے حسب ذیل معنی لکھتا ہے۔

﴿فكل كلمة و عظتك اوزجرتك اودعتك الى مكرمة او نهتكَ من قبيح فهى حكمة وحكم﴾ (جلد۲ص۱۸۶ ۔حیدرآباد)

ہر وہ بات جو تجھ کو سمجھائے یا تجھ کو تنبیہ کرے یا کسی اچھی خصلت کی طرف بلائے یا کسی بری چیز سے روکے وہ حکمت اور حکم ہے۔

لغت کا امام جوہری اپنی صحاح اللغۃ میں لکھتا ہے۔

﴿الحكمة من العلم والحكيم العالم و صاحب الحكمة والحكيم المتقن للامور﴾ (جلد۲ص۱۷۶مصر)

حکمت یعنی علم اور حکیم یعنی عالم اور حکمت والا اور حکیم کاموں کو خوبی سے کرنے والا۔

عربی لغت کی مبسوط و مستند کتاب لسان العرب میں ہے۔

﴿والحكمة عبارة عن معرفة افضل الاشياء بافضل العلوم﴾ (ج۱۵ص۳مصر)

اور حکمت بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعہ سے جاننے کو کہتے ہیں۔

لغت قرآن کے مشہور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں کہتے ہیں۔

﴿والحكمة اصابة الحق بالعلم والعقل فالحكمة من الله تعالى معرفة الاشياء ايجادها على غاية الاحكام من الانسان معرفة الموجودات و فعل الخيرات﴾ (ص۱۲۶۔مصر)

اور حکمت، علم اور عقل سے سچی اور صحیح بات کو جاننا ہے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت چیزوں کا جاننا اور ان کو بکمال خوبی پیدا کرنا

ہے اور انسان کی حکمت موجودات کو جاننا اور اچھی باتوں کا کرنا ہے۔

یہ تو عربی لغت کے اماموں کی تصریحات تھیں، اب ان بزرگوں کے اقوال پر غور کرنا چاہئے جو زبان دانی کے ساتھ قرآن اور شریعت کے استدلالات اور محاوروں سے بھی کامل طور سے آگاہ تھے۔ ابن حیان اندلسی نے اپنی تفسیر بحر المحیط میں ان کے اکثر اقوال کو یکجا کر دیا ہے۔[1]

(۱) ﴿ قال مالك و ابورزين الحكمة الفقه في الدين و الفهم الذي هو سجية و نور من الله تعالى ﴾

امام مالک اور ابورزین کا قول: حکمت دین میں سمجھ اور اس فہم کو کہتے ہیں جو ایک فطری ملکہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہے۔

(۲) ﴿ وقال مجاهد الحكمة فهم القران ﴾

مجاہد کا قول: حکمت یعنی قرآن کا فہم۔

(۳) ﴿ وقال مقاتل العلم و العمل به لايكون الرجل حكيما حتى يجمعهما ﴾

مقاتل کا قول: حکمت علم اور علم کے مطابق عمل کو کہتے ہیں۔ کسی شخص کو حکیم اس وقت تک نہیں کہا جاتا جب تک وہ علم و عمل دونوں کا جامع نہ ہو۔

(۴) ﴿ وقيل الحكم و القضاء ﴾

بعضوں کا قول: حکمت فیصلہ کرنا ہے۔

(۵) ﴿ و قيل مالايعلم الامن جهة الرسول ﴾

کسی کا قول: حکمت وہ ہے جو رسول کے سوا کسی اور ذریعہ سے معلوم نہ ہو سکے۔

(۶) ﴿ وقال ابو جعفر محمد بن يعقوب: كل صواب من القول ورث فعلاً صحيحاً فهو حكمة ﴾

ابو جعفر کا قول: ہر وہ صحیح بات جو صحیح عمل پیدا کرے حکمت ہے۔

(۷) ﴿ وقيل وضع الاشياء مواضعها ﴾

کسی کا قول: چیزوں کو اپنی اپنی جگہ رکھنا حکمت ہے۔

(۸) ﴿ وقيل كل قول وجب فعله ﴾

ایک اور شخص کا قول: ہر وہ بات جس کا کرنا ضروری ہو۔

امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں حسب ذیل اقوال لکھے ہیں:۔

(۱) ﴿ قال (مالك): المعرفة بالدين و الفقه في الدين و الاتباع له ﴾

مالک کا قول: دین کی معرفت اور دین میں سمجھ اور اس کی پیروی حکمت ہے۔

(۲) ﴿ قال ابن زيد: الحكمة الدين الذي لا يعرفونه الابه ﷺ يعلمهم اياها قال

---

[1] زیر آیت وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ الآیۃ ج ۱ ص ۳۹۳ مطبوعہ سعادت مصر۔

والحکمة العقل فی الدین وقرء وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا وقال یٰعیسی وَیُعَلِّمُهُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِیْلَ و قرء ابن زید وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْ اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا قال لم ینتفع بالایات حین لم تکن معها حکمة قال والحکمة شیء یجعله اللّٰه فی قلب نورله به﴾

ابن زید کا قول: حکمت دین کا وہ حصہ ہے جو صرف رسول سے معلوم ہوتا ہے، وہی اس کو سکھاتا ہے نیز انہیں کا قول ہے کہ حکمت دینی عقل کا نام ہے اور اس پر یہ آیت پڑھی کہ ”جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی دولت دی گئی اور خدا نے حضرت عیسیٰؑ کو کہا کہ ”خدا ان کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل سکھاتا ہے“ ابن زید نے یہ آیت بھی پڑھی کہ ”ان کو اس کا حال سناؤ جس کو میں نے اپنی آیتیں دیں تو وہ ان سے الگ ہو گیا“ یعنی ان آیتوں سے نفع نہیں اٹھایا کہ ان کے پاس حکمت نہ تھی۔ حکمت وہ چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ بندہ کے قلب میں رکھتا ہے اور اس سے اس کو روشن کرتا ہے۔

(۳) ﴿عن قتادہ: والحکمة ای السنة﴾

قتادہ: حکمت یعنی سنت نبوی۔

آخر میں امام طبری اپنا فیصلہ سناتے ہیں۔

(۴) ﴿قال ابن جریر الطبری: والصواب من القول عندنا فی الحکمة انها العلم باحکام اللّٰه التی لا یدرك علمها الا ببیان الرسول ﷺ و المعرفة بها وما دل علیه ذلك من نظائره وهو عندی ماخوذ من الحکم الذی بمعنی الفصل بین الحق والباطل﴾

ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت ان احکام الٰہی کے علم کا نام ہے جو صرف رسول کے بیان (تشریح) سے معلوم ہوتے ہیں اور جو ان کی مثالیں اور نظیریں ہیں ان کی معرفت کو کہتے ہیں اور حکمت کا لفظ میرے نزدیک حکم سے ماخوذ ہے جس کے معنی حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف کتاب الرسالہ میں قتادہ کے مسلک کو پسند کیا ہے، لکھتے ہیں:

(۵) ﴿وسمعت من ارضی من اهل العلم بالقران یقول الحکمة سنة رسول اللّٰه ﷺ﴾ (ص۲۴

میں نے قرآن کے ان اہل علم سے جن کو پسند کرتا ہوں یہ سنا کہ حکمت آنحضرت ﷺ کی سنت کا نام ہے۔

امام شافعی اسی کتاب میں آگے چل کر بعضوں کا قول نقل کرتے ہیں۔

﴿وسنة الحکمة التی فی روعه عن اللّٰه عزوجل﴾ (ص۔۲۸

اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے دل میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔

آئمہ لغت اور علمائے قرآن کے ان تمام اقوال پر ایک غائر نظر ڈالو تو معلوم ہو گا کہ یہ کل کے کل ایک ہی مفہوم کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی حقیقت کی متعدد تفسیریں ہیں۔ حکمت عقل و فہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے جس سے صحیح و غلط صواب و خطا، حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان تمیز و فیصلہ بذریعہ غور و فکر، دلیل و برہان اور تجربہ و استقراء کے نہیں، بلکہ منکشفانہ طور سے ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق اس صاحب حکمت کا عمل بھی ہوتا ہے۔

ہر فن کے واقف کار دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو کسی فن کو باقاعدہ حاصل کرتے، اس کی مشق کرتے اور اس میں مہارت اور کمال بہم پہنچاتے ہیں، دوسرے وہ جو اس فن کی فطری استعداد اور قابلیت رکھتے ہیں اور تجربہ و دلیل کے بغیر خود اپنی فطری صلاحیت، صحیح وجدان اور سلیم ذوق سے اس فن کی کسی شے کو دیکھنے کے ساتھ اس کے متعلق جچی تلی رائے دیتے ہیں اور حرف حرف صحیح دیتے ہیں، اسی کا نام آپ صحتِ وجدان اور سلامت ذوق رکھتے ہیں۔ شاعری، انشاء پردازی اور دوسرے فنونِ لطیفہ میں اس کی مثالیں بکثرت دیکھی اور سنی جاتی ہیں۔ اسی طرح بعض لوگوں میں اشیاء کے حق و باطل اور افعال کے خیر و شر کی تمیز کا صحیح وجدان اور صحیح ذوق ہوتا ہے۔ وہ ان امور کے دقیق سے دقیق مسئلہ کے متعلق اپنے ربانی ذوق و وجدان سے ایسی صحیح رائے دیتے ہیں جو دوسرے لوگ وسیع مطالعہ اور غور و فکر کے بعد بھی نہیں دے سکتے۔ یہی وہ معرفت اور نور الٰہی ہے جو جد و جہد اور سعی و محنت سے نہیں بلکہ عطاو بخشش سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی کا نام ''حکمت'' ہے۔

دوسری ربانی استعدادوں اور فطری بخششوں کی طرح حکمت کا عطیہ بھی سب کو یکساں نہیں ملتا بلکہ حسب استعداد معمولی حکمت سے لے کر اعلیٰ ترین اور کامل ترین حکمت تک عطا ہوتی ہے۔ اس کے مختلف درجے اور مرتبے عام انسانوں کو مل سکتے ہیں اور ملتے ہیں لیکن اس کا اعلیٰ ترین اور کامل ترین درجہ اور مرتبہ صرف انبیاء علیہم السلام کو ملتا ہے۔

مگر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح اس ربانی عطیہ، آسمانی فہم، دینی عقل اور نورانی قوت پر ''حکمت'' کا اطلاق ہوتا ہے اسی طرح اس قوت حکمت کے آثار و نتائج اور اس کی تعلیمات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسری آیت جس میں حضرت لقمانؑ کو حکمت دیئے جانے کا بیان ہے اس کے بعد اس حکمت لقمانی کی حسب ذیل تعلیمات کا ذکر بھی کیا گیا ہے، اللہ کا شکر ادا کرنا، شرک کی ممانعت، والدین کی خدمت، اچھوں کی پیروی، خدا کا ہمہ گیر علم، نماز کا حکم، صبر، فخر و غرور کی ممانعت، میانہ روی اور آہستہ بولنا۔ اسی طرح تیرہویں آیت میں حکمت محمدیؐ کی حسب ذیل تعلیمات کی تفصیل بھی کی گئی ہے۔ شرک کی ممانعت، والدین کے ساتھ احسان، قرابت داروں اور بے کسوں سے نیک سلوک، اسراف کی برائی، نرمی کی بات کرنا، میانہ روی، اولاد کے قتل کی مذمت، کسی کی جان نہ لینا، مقتول کا بدلہ لینا، یتیم کے ساتھ اچھا برتاؤ، عہد پورا کرنا، ناپ تول ٹھیک رکھنا، بے جانی چیز کی پیروی نہ کرنا، فخر و غرور کی مذمت وغیرہ۔ ان تمام باتوں کو بیان فرما کر اللہ کہتا ہے۔

﴿ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰىٓ اِلَیْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ﴾ (اسراء)

یہ ہیں حکمت کی وہ بعض باتیں جو خدا نے تجھ پر وحی کی ہیں۔

حکمت کی ان بعض باتوں کی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکمت کے مظاہر اور نتائج کس قسم کی باتیں ہوتی ہیں یہ عموماً وہی باتیں ہوتی ہیں جن کی عالم گیر صداقت اور سچائی کو خود فطرت انسانی اور حس اخلاقی تسلیم کرتی ہے اور یہی سبب ہے کہ تیسری اور چوتھی آیت میں حکمت کا اطلاق زبور پر اور پانچویں اور چھٹی آیت میں انجیل پر ہوا ہے کہ ان میں اسی قسم کی دلآویز نصیحتوں اور عالمگیر صداقتوں کی تعلیم ہے اور خود قرآن پاک نے بھی اپنی صفت ''حکمت والا قرآن'' ظاہر کی ہے ﴿تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِیْمِ﴾ (لقمان و یونس) ﴿وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِ﴾ (یٰسین) ﴿وَالذِّكْرِ الْحَكِیْمِ﴾ (آل عمران) ان آیتوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حکمت کی بعض اہم تعلیموں اور باتوں کو وحی الٰہی خود اپنے اندر بھی شامل کر کے ان کو آپ مقطر بنا دیتی ہے۔ یہ چیز انبیاء کو کتاب الٰہی کے ساتھ عام طور پر ملتی ہے فرمایا:

﴿ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ﴾ (آل عمران۔۹)

اور یاد کرو جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ البتہ جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں۔

بہر حال یہ حکمت کی قوت انبیاء علیہم السلام کو بدرجہ اتم حاصل تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر بات دانائی اور ان کا ہر کام دانش مندی پر مبنی ہوتا تھا اور چونکہ یہ قوت ان کو حاصل تھی تو اس لئے اس کے آثار اور نتائج بھی اقوال و اعمال کی صورت میں ظاہر ہوئے اور جن کا یہ صرف اقرار و اعتراف بلکہ ان پر عمل بھی نبوت کی تصدیق میں داخل ہوا۔ پندرہویں آیت میں ہے:

﴿ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ﴾

(اور اے محمد رسول اللہ کی بیویو!) تمہارے گھروں میں خدا کی جو آیتیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کو آیات الٰہی کے علاوہ کس حکمت کے یاد رکھنے کا حکم دیا گیا، ظاہر ہے کہ وہ خود محمد رسول اللہ ﷺ کی حکمت و دانائی کی وہ باتیں تھیں۔ اب اگر وہ باتیں امور دین سے متعلق نہ ہوتیں تو ان کے لئے ان کا یاد رکھنا کیوں ضروری قرار دیا جاتا۔ اسی طرح آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارہویں آیت میں آنحضرت ﷺ کی صفت میں ہے۔

﴿ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (جمعہ۔۱)

وہ مسلمانوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کتاب کے بعد کس حکمت کی تعلیم دیتے تھے؟ ظاہر ہے کہ خود اپنی حکمت کی، تو جس حکمت کی وہ تعلیم دیتے تھے وہ خود ان کے اندر بھی تھی کہ جو چیز ان کے پاس نہ تھی وہ دوسروں کو کیا بخش سکتے تھے، تو جب یہ قوت آپ کے پاس تھی تو اس کے آثار و نتائج بھی اقوال و افعال کی صورت میں نمایاں ہوں گے۔ جن کی آپ تعلیم فرماتے تھے، اور اپنے ان امور حکمت کی تعلیم سے آپ کا مقصد بھی یہی ہو سکتا تھا کہ مسلمان ان پر عمل کریں۔

پانچویں آیت میں ہے کہ حضرت عیسٰیؑ فرماتے ہیں۔

﴿ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ﴾

میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں، تاکہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکمت کا ایک فریضہ تبیین بھی ہے یعنی کسی مجمل، ذو معنیین اور مختلف فیہ مسئلہ کی تشریح و تفصیل جس سے وہ اجمال اور اختلاف جاتا رہے، اور اصل مقصود کی تشریح ہو جائے۔ چنانچہ حضرت عیسٰیؑ نے تورات کے بعض احکام کی جن میں یہود مختلف الرائے تھے تفصیل فرمائی اور ان کی غلطی دور کی۔ بارہویں آیت میں ہے۔

﴿ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴾ (نساء)

اور اگر خدا کا فضل و کرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک گروہ نے چاہا تھا کہ تجھ کو گمراہ کر لے‘ اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو‘ اور تجھے ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت اُتاری اور تجھ کو سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور اللہ کا فضل تجھ پر بڑا ہے۔

ان آیتوں میں بیان ہے کہ منافقین کا ایک گروہ آپ کو غلط رائے دے کر بہکانا چاہتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کی یہ چال کارگر نہ ہوئی اور وہ تجھ کو بہکا نہ سکے، اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کا تجھ پر فضل و کرم ہے اور وہ فضل و کرم یہ ہے کہ اس نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری، اور تجھے وہ علم بخشا جو پہلے نہ تھا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ گمراہی سے آپ کی یہ حفاظت‘ خطاب سے یہ عصمت اور علم کی یہ بخشش آپ کو کتاب اور حکمت دونوں کے ملنے کے سبب سے حاصل ہوئی ہے۔ الغرض اس حفاظت و عصمت کے حصول میں کتاب الٰہی کے ساتھ حکمت ربانی کے انعام کو بھی دخل کامل ہے۔

یہ تو وہ نبوی حکمت تھی جس کا سر چشمہ صرف سینۂ نبوت تھا۔ لیکن یہ فیض حسب استعداد پیغمبر کی اتباع میں دوسروں کو بھی ملتا ہے‘ جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ سچی اور صحیح بات کو بہت آسانی سے سمجھ لیتے‘ قبول کر لیتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

تبلیغ اسلام کے تین ذریعوں حکمت‘ موعظت اور خوش خلقی سے مناظرہ کرنے میں سب سے اول اسی کو جگہ دی گئی۔

﴿ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ﴾ (نحل)

تو اپنے رب کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دے اور ان سے مناظرہ بطریق احسن کر۔

سچی‘ صحیح اور صاف بات دل تک پہنچ جاتی ہے اور بہت جلد اپنا اثر دکھاتی ہے، فرمایا:

﴿ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ ﴾ (قمر)

دل تک پہنچ جانے والی حکمت۔

یہ حکمت ہر نیکی کی جڑ اور بھلائی کی اصل ہے پھر اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا دولت ہو سکتی ہے، اس لئے ارشاد ہوا:

﴿ وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا ﴾ (بقرہ)

جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی نیکی (دولت) دی گئی۔

اس سلسلہ میں دو مشہور اور مستند حدیثوں کا حوالہ بھی مناسب ہے جس سے حکمت کی حقیقت واضح ہوگی اور کم از کم قرن اول میں اس لفظ کا مفہوم ظاہر ہوگا۔ آنحضرت ﷺ نے وفد کے ایک خطیب کا بیان سن کر فرمایا

﴿ اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا ﴾

بعض شعر حکمت ہیں‘ اور بعض تقریریں جادو ہوتی ہیں۔

اس حدیث میں بعض اشعار کو حکمت اور بعض تقریر و بیان کو جادو کہا گیا ہے۔ اس تقابل سے ظاہر ہے کہ اس حکمت کا عربی مفہوم اس کے اردو حکمت کے مفہوم سے بلند تر ہے‘ لیکن سحر و جادو کے مافوق انسانی تصور کی طرح حکمت

کے عربی مفہوم میں کوئی مافوق بشری تخیل ضروری ہے، اسی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ عربی میں حکمت کے معنی عقل وفہم وغیرہ کے معمولی الفاظ سے کوئی بلند اور غیر معمولی حقیقت ہے۔ اردو میں اس حقیقت کی ''حکمت'' کے ساتھ لفظ الہامی بڑھا کر ادا کیا جا سکتا ہے یعنی ''الہامی حکمت''[1]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ''رشک وحسد اگر جائز ہے تو صرف دو شخصوں پر، ایک اس پر جس کو مال کی دولت ملی تو وہ اس کو صحیح مصرف میں لٹاتا ہے، اور دوسرے ﴿رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِىْ بِهَا وَ يُعَلِّمُهَا﴾ (صحیح بخاری کتاب العلم) ''اس شخص پر جس کو حکمت ملی ہے تو وہ اس کے ذریعہ سے فیصلہ کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے اور اس میں معلم ہونے کی شان پیدا ہوتی ہے'' جب یہ عام انسانوں کا یہ درجہ ہے تو انبیاء علیہم السلام کو یہ دولت کس بہتات سے ملی ہوگی، اور وہ یقیناً آنحضرت ﷺ کے حصہ میں بھی آئی۔ اب اس حصول دولت یعنی عطائے حکمت کا نتیجہ بھی آپ سے ظاہر ہونا چاہئے اور وہ فیصلہ اور تعلیم ہے۔ آپ کے یہ ملہمانہ فیصلے اور حکیمانہ تعلیمات جو تمام تر وحی ربانی کی عملی اور زبانی شرح اور بیان ہے۔

کتاب وحکمت کی تعلیم:

اوپر کی چار آیتوں ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱ میں خفیف سے تغیر کے ساتھ حسب ذیل آیت ہے۔

﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (جمعہ)

(وہ رسول) ان (ان پڑھوں) کو خدا کی آیتیں سناتا اور ان کو سنوارتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

ان آیتوں میں آنحضرت ﷺ کے تین کاموں کا ذکر ہے۔

۱۔ خدا کی آیتوں کو پڑھنا اور دوسروں کو سنانا۔

۲۔ ان کو شرک اور بداخلاقی کی نجاستوں سے پاک وصاف کرنا اور سنوارنا۔

۳۔ ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا۔

سوال یہ ہے کہ پہلی اور تیسری آیتیں ایک ہی معنی رکھتی ہیں یا دو۔ اگر ایک معنی رکھتی ہیں تو اس بے سود تکرار کا کیا فائدہ؟ کیوں نہ دوسری جگہ بھی یتلو یعنی تلاوت ہی کا لفظ رکھ دیا گیا' اور اگر دو الگ الگ معنی رکھتی ہیں' جیسا کہ ہر صاحب نظر سمجھ سکتا ہے تو ان دونوں معنوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا۔ اگر رسول کا فرض محض وحی کی زبان سے سنی ہوئی آیتوں کو پڑھ کر دوسروں کو سنا دینا ہے اور اسی پر اس کی تبلیغ کا فریضہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کا تیسرا فرض الفاظ کی تلاوت سے آگے بڑھ کر کتاب اور حکمت کے سبق کی تعلیم کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟ بالکل ظاہر ہے کہ تعلیم کا مفہوم تلاوت سے بہت کچھ زیادہ ہے خصوصاً جبکہ لفظ تعلیم تلاوت کے بعد آتا ہے۔ وحی کے الفاظ سنا دینے سے تلاوت کا فرض ادا ہو جاتا ہے مگر تعلیم کا فرض ہنوز باقی رہ جاتا ہے۔ کتاب کی تعلیم کے معنی تلاوت کی طرح کتاب کے الفاظ کا سنا دینا یا پڑھا دینا اور دوسروں کو یاد کرا دینا نہیں بلکہ الفاظ قرآنی کی تلاوت کے بعد جو آپ کا پہلا کام تھا اس کے مشکل مطالب کو حل کرنے' مجمل معنی کو سمجھانے اور

---

[1] قرآن پاک میں حروف علت سے قبل اور آیا کرتا ہے جیسے وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ یہ حرف عطف نہیں۔

اپنی زبان اور عمل سے ان کی شرح و تفصیل کر دینے کا نام ''کتاب و حکمت کی تعلیم'' ہے اور یہ آپ کا دوسرا یا تیسرا فریضہ تھا اور یہی وہ تعلیم تھی جس کا ان آیتوں میں بار بار ذکر ہے۔ اب جب ان مطالب و معانی کی شرح و تفسیر بھی آپ کے فرائض نبوت میں داخل تھی تو اس پیغمبرانہ شرح و تفصیل کی حیثیت بھی دینی ہوگی اور اس کی تعمیل بھی امت کے لئے ضروری ہوگی۔ آپ کی اسی زبانی و عملی شرح و تفصیل کو صحابہ اور تابعین نے اپنی روایت و عمل سے محفوظ رکھا اور وہ ''احادیث و سنن'' کے نام سے موسوم ہے۔

اس تفصیل کے بعد ''حکمت'' کے ان معنوں پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیجئے جو آئمہ لغت اور علمائے قرآن نے بیان کئے ہیں تو آپ کو یقین آ جائے گا کہ وہ کل ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی معنی کی متعدد تفسیریں ہیں آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال جن کے اصطلاحی نام احادیث و سنن ہیں' کتاب الٰہی کی عملی و زبانی تشریحات ہیں۔ کتاب الٰہی وحی ربانی کا نتیجہ ہے اور احادیث و سنن سینہ نبوی کی ملہمانہ حکمت کا۔ اس مقام پر امام شافعیؒ کی یہ تحقیق پیش نظر رہے۔

﴿ وسنة الحكمة التي القى فی روعه عن اللّٰه عزوجل ﴾ (کتاب الرسالہ ص ۲۸ مصر)

اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے قلب میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔

اور اسی مفہوم کو مجاہد اس طرح ادا کرتے ہیں کہ الحكمة فهم القران حکمت فہم قرآن کا نام ہے' دوسری عبارت میں یوں کہو کہ قرآن کے معانی و مطالب کی تشریح حکمت ہے اور اس تشریح کا نام جو رسول کے قول و عمل سے ادا ہوئی' سنت ہے اور اس معنی کو امام مالک اور ابو رزین اور ابن زید وغیرہ دوسری صدی کے علمائے قرآن ان عبارتوں میں ادا کرتے ہیں کہ ''حکمت معرفت دین' فقہ دین اور اس دینی علم کو کہتے ہیں جس کو رسول نے بیان کیا اور حکمت اس نور کا نام بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کسی قلب میں پیدا کر کے اس کو منور کر دیتا ہے''

خلاصہ بحث یہ ہے کہ اصل حکمت نبوی وہ نور نبوت اور الہامی معرفت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب و سینہ میں ودیعت رکھا تھا اور چونکہ آپ کے سنن و اقوال آپ کی اسی ودیعت شدہ حکمت نبوی کی پیداوار اور آثار و نتائج ہیں اس لئے ان پر بھی حکمت کا اطلاق جائز ہے۔ اس تفصیل کے بعد ظاہر ہوگا کہ بعض اماموں اور عالموں نے حکمت کی تشریح میں اصل معنی کی طرف توجہ کی ہے اور بعض نے ثانوی معنی کو بیان کیا ہے اور دونوں حق پر ہیں۔

علم:

علم کے لغوی معنی جاننے کے ہیں مگر ہر فن کے تعلق سے جاننے کی نوعیت اور معلومات کی حیثیت مختلف ہوگی انبیاءؑ کے تعلق سے اس کا جب استعمال ہوگا تو اس سے طبعاً مراد خدا کی توحید' ذات و صفات' دین و شریعت کے احکام اور اخلاقی تعلیمات مراد ہوں گی۔ حضرت ابراہیمؑ توحید پر استدلال کر کے اپنے باپ سے فرماتے ہیں۔

﴿ يٰۤاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ ﴾ (مریم۔۳)

اے میرے باپ! میرے پاس علم کا وہ حصہ آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا۔

حضرت خضر کے متعلق ہے:

﴿ وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴾ (کہف۔۹)

اور ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا۔

خدا کے پاس سے تو ہر چیز ہے‘ پھر اپنے پاس سے علم سکھانے کا مفہوم کیا ہے؟ ہر وہ شے جو انسان کی ذاتی محنت‘ کوشش‘ جدوجہد وغیرہ معمولی ذرائع کے بغیر حاصل ہوتی ہے وہ منجانب اللہ کہی جاتی ہے، اسی طرح خدا کے پاس سے علم عطا ہونے کے معنی اس علم کے ملنے کے ہیں جو انسان کے طبعی ذرائع علم واستدلال اور تلاش وتحقیق کے بغیر خود بخود عطا ہو‘ یہی علم خداداد ہے اور اسی لئے صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو علم لدنی (پاس والا علم) کہتے ہیں۔

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی نسبت ہے۔

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ﴾ (نمل۔۲)

اور بے شک ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا۔

حضرت یوسفؑ کے آغاز نبوت کے موقع پر ہے۔

﴿ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ ﴾ (یوسف)

اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو نواز دے گا‘ اور تجھ کو باتوں کی حقیقت کی (تاویل) سکھائے گا‘ اور تجھ پر اپنا انعام پورا کرے گا۔

ان آیتوں میں اس علم کا ذکر نہیں جس کا منشاء وحی موقت ہے کیونکہ ان میں سیاق کلام سے علم کی یکبارگی دیئے جانے کا ذکر ہے جو وحی موقت کی شان نہیں‘ خصوصاً آخری آیت میں تو تاویل احادیث کا علم بیک دفعہ دیئے جانے کی تصریح ہے‘ اسی لئے حضرت یوسفؑ ایک خواب کی تعبیر بیان کر کے دوسرے موقع پر کہتے ہیں۔

﴿ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ﴾ (یوسف۔۵)

یہ وہ ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھایا ہے۔

یہ کہیں بیان نہیں کیا گیا ہے‘ کہ خواب کی تعبیر کے وقت ان پر وحی آ کر حقیقت سے ان کو مطلع کرتی تھی بلکہ خود ان کے اندر یہ علمی قوت ہمیشہ کے لئے ودیعت کر دی گئی تھی۔ اسی قسم کا وہ علم ہے جس کی نسبت سے بعض انبیاءؑ کو بچپن ہی میں علیم (جاننے والے) کا خطاب ملا۔

﴿ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴾ (زاریات۔۶)

اور فرشتوں نے اس کو ایک بڑے صاحب علم فرزند کی خوشخبری دی۔

﴿ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴾ (حجر۔۴)

ہم تجھے ایک بڑے صاحب علم فرزند کی خوشخبری دیتے ہیں۔

یہاں لفظ علیم اختیار کیا گیا ہے عالم نہیں اور یہ لفظ عالم سے زیادہ علم پر دلالت کرتا ہے۔ ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ وحی موقت جو گاہ گاہ آتی ہے اس کے علاوہ علم کا ایک دائمی عطیہ بھی نبی کی شان ہے۔

علم و حکم:

بہت سے انبیاء کے متعلق علم کے ساتھ حکم کا عطا ہونا بھی بیان ہوا ہے۔ حکم کے معنی لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں جس کا ترجمہ اردو میں سمجھ اور بوجھ کے نتیجہ یعنی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں۔

﴿ والحکم بالشئی ان تقضی بالشیء بانه کذا اولیس کذا سواء الزمت ذلك غیره اولم تلزمه ﴾ (۱۲۶۔مصر)

کسی شے پر حکم کرنا یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ ایسی شے ہے یا ایسی نہیں ہے، عام اس سے کہ اس فیصلہ کا تم دوسرے کو پابند کر سکو یا نہ کر سکو۔

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے۔

﴿ الحکم العلم والفقه والقضاء بالعدل ﴾ (ج ۱۵۔۳)

حکم کے معنی علم، سمجھ اور منصفانہ فیصلہ کرنا ہے۔

ان انبیاء علیہم السلام کو جن پر کسی کتاب کا نازل ہونا ثابت نہیں، اس علم اور حکم کا عطا ہونا ثابت ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ وحی کتاب کے علاوہ کسی اور عطیہ علم و حکم کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ کی شان میں ہے۔

﴿ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ اٰتَیْنٰهُ حُکْمًا وَّعِلْمًا ﴾ (یوسف)

اور جب یوسفؑ جوانی کی قوت کو پہنچا تو ہم نے اس کو حکم اور علم دیا۔

حضرت لوطؑ کے متعلق ہے:

﴿ وَلُوْطًا اٰتَیْنٰهُ حُکْمًا وَّعِلْمًا ﴾ (انبیاء)

اور لوط کو ہم نے حکم اور علم دیا۔

حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کے ذکر میں ہے:

﴿ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ وَكُلًّا اٰتَیْنَا حُکْمًا وَّعِلْمًا ﴾ (انبیاء)

تو ہم نے سلیمان کو وہ فیصلہ سمجھا دیا اور ہر ایک کو ہم نے حکم اور علم دیا تھا۔

حضرت یحییٰؑ کی نسبت ہے:

﴿ یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّةٍ ط وَّاٰتَیْنٰهُ الْحُکْمَ صَبِیًّا ﴾ (مریم)

اے یحییٰ کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ و اور ہم نے اس کو حکم بچپن میں عطا کر دیا۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنی نعمتیں ان الفاظ میں شمار کرتا ہے۔

﴿ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا بَنِیْۤ اِسْرَآئِیْلَ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّةَ ﴾ (جاثیہ)

اور بلاشک ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکم اور نبوت دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اور حکم اور نبوت تین چیزیں ہیں۔ یہاں کسی کو یہ شبہہ نہ ہو کہ ان آیتوں میں حکم سے

مراد دنیاوی حکومت اور سلطنت ہے کہ اس کے معنی میں یہ لفظ خالص قدیم عربی میں نہیں آیا۔ یہ اہل عجم کا محاورہ ہے۔ قرآن نے ہر جگہ اس کو فیصلہ اور قوت فیصلہ کے معنی میں استعمال کیا ہے، جیسے

﴿ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ﴾ (ص)

ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر۔

﴿ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ﴾ (ص)

تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔

﴿ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ﴾ (مائدہ)

اور اگر تو ان کے درمیان فیصلہ کرے تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کر۔

حضرت داؤدؑ اور سلیمان ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہیں۔

﴿ وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ ﴾ (انبیاء)

اور داؤدؑ اور سلیمان کو جب وہ دونوں کھیت کا فیصلہ کر رہے تھے۔

﴿ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗ اِلَى اللّٰهِ ﴾ (شوریٰ)

اور جس کسی چیز میں تم نے اختلاف کیا، تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ یہی تین باتیں سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر الگ الگ دہرائی گئی ہیں

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ﴾ (انعام)

یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت بخشی۔

جن پیغمبروں کے نام اوپر گنائے گئے ہیں اور جن کی طرف وہ لوگ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے، یہ ہیں ابراہیم، اسحاق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسماعیل، الیسع، یونس، لوط علیہم السلام۔ ان اٹھارہ ناموں میں حکم بمعنی حکومت وسلطنت (اگر ہو) تو اس کے مستحق صرف دو ہیں سلیمان اور داؤدؑ اور چاہے کسی طرح کسی تاویل سے یوسفؑ اور موسیٰؑ کو بھی شامل کر لیا جائے باقی چودہ نام ان پیغمبروں کے ہیں جن کو اس کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا اس لئے لامحالہ حکم کا لفظ قرآن میں عربیت کے اصلی اور صحیح اور صریح معنی میں مستعمل ہے اور اس لفظ سے خدا کا جو مقصود ہے، وہ کتاب کے ساتھ ساتھ ان پیغمبروں کو برابر حیثیت میں ملا تھا۔ غلط فہمی کا پورا پردہ چاک کرنے کے لئے ایک اور آیت کریمہ پر نظر ڈالئے۔

﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴾ (آل عمران)

کسی بشر کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اللہ اس کو کتاب، حکم اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بنو، بلکہ جو تم کتاب (توراۃ) سکھاتے تھے اور جو تم پڑھتے تھے اس کے ذریعہ سے تم خدا والے بنو۔

ان آیتوں میں مخاطب اہل کتاب ہیں اور جس مقدس بشر کا ان میں ذکر ہے، بظاہر اس سے مراد حضرت عیسیٰؑ ہیں،

وہ نہ ہوں تو خود محمد رسول اللہ ﷺ ہیں، اور یہ اس وقت کی بات ہے جب یہود کی پوری قوت مدینہ کے اطراف اور حجاز میں موجود تھی، اور اسلام ہنوز ان کے مقابلہ میں کمزور و ناتواں تھا۔ ایسی صورت میں جس حکم کے ملنے کا ذکر ان آیتوں میں ہے وہ کتاب اور نبوت ہی کی جنس کی کوئی چیز ہو سکتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو تو حکومت و سلطنت کا ادنیٰ سا شائبہ بھی عطاء نہیں ہوا تھا، اور آنحضرت ﷺ کو اس وقت تک جب تک بنی اسرائیل اپنی ممتاز قوت کے ساتھ مدینہ اور حجاز میں موجود تھے، یہ رتبہ نہیں ملا تھا۔ آیت ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ میں بھی حکم سے مراد وہی فیصلہ اور قضائے ربانی ہے، حکومت و سلطنت نہیں، تسکین کے لئے اس آیت کے آگے پیچھے کے الفاظ پر نظر ڈالو۔

﴿قُلْ اِنِّىْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ط مَا عِنْدِىْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ط اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِيْنَ﴾ (انعام۔۷)

کہہ دے (اے پیغمبر!) کہ میں اپنے پروردگار کی کھلی دلیل پر ہوں، اور تم اس کو جھٹلاتے ہو۔ میرے پاس وہ نہیں جس کی تم جلدی کرتے ہو، فیصلہ کسی کا نہیں لیکن اللہ کا۔ وہ حق بیان کرتا ہے اور سب فیصلہ کرنے والوں سے وہ بہتر ہے۔

ان وجوہ سے اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ انبیاء علیہم السلام کو منصب نبوت اور وحی کتاب کے ساتھ حکم کی سند بھی ملتی ہے جس کے صاف و صریح معنی کلام عرب اور لغت اور قرآن کے قرینوں سے علم و فہم فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز ہے اور اس لئے رسول کی اس قوت و طاقت کے نتائج بھی ہمارے لئے واجب العمل ہیں۔

شرح صدر:

ربانی علم و معرفت کا ایک اور مقام شرح صدر ہے۔ شرح صدر کے معنی سینہ کھولنے کے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ سینہ کی تنگی اور ضیق، جہل و نادانی کی علامت ہے، اور سینہ کی کشادگی، اور فراخی علم کی وسعت، اور معرفت کی فراوانی پر دلالت کرتی ہے۔ اسی لئے شرح صدر کے اصطلاحی اور مجازی معنی علم کی کثرت اور آگاہی کی وسعت کے ہیں اور خاص طور سے اس علم و معرفت اور اطلاع و آگاہی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کسی دقیق اور مشکل مسئلہ کے متعلق دفعۃً اور یک بیک قلب میں وارد ہو جاتی ہے اور اس حل سے اس کی تسلی و تسکین ہو جاتی ہے اور اس کے شکوک و شبہات دور ہو کر اس کو یقین کی راحت و مسرت حاصل ہو جاتی ہے۔ جمہرۃ ابن درید میں ہے۔

﴿والشرح من قولهم شرحت لك الامر اى اوضحته و كشفته و شرح الله صدره فانشرح اذا تسع لقبول الخير﴾ (۲۔۱۳۴)

شرح اہل عرب کے اس محاورہ سے ہے کہ "میں نے تیرے لئے بات کی شرح کر دی" یعنی اس کو واضح کر دیا اور کھول دیا اور اللہ نے اس کے سینہ کو کھول دیا تو وہ کھل گیا یعنی جب نیکی کے قبول کرنے کے لئے وسیع ہو گیا۔

صحاح جوہری میں ہے۔

﴿الشرح الكشف تقول شرحت الغامض اذا فسرته﴾

شرح یعنی کشف (کھولنا) تم کہتے ہو میں نے اس پوشیدہ مسئلہ کی شرح کر دی، یعنی اس کی تفسیر کر دی

لسان العرب میں ہے:

﴿الشرح الكشف يقال شرح فلان امرى اوضحه وشرح مسئلة مشكلة بينها وشرح الشيء بشرحه شرحاً وشرحه فتحه بينه و كشفه و كل ما فتح من الجواهر فقد شرح ايضا تقول شرحت الغامض اذا فسرته وشرح الله صدره بقبول الخير بشرحه شرحا فانشرح وسعه بقبول الحق فاتسع۔ قال ابن الاعرابى : الشرح الحفظ و الشرح الفتح و الشرح البيان و الشرح الفهم﴾

شرح یعنی کشف ہے، کہا جاتا ہے کہ فلاں نے اس کی بات کی شرح کر دی‘ یعنی اس کو واضح کر دیا اور مشکل مسئلہ کی شرح کر دی‘ یعنی اس کو بیان کر دیا اور کسی چیز کی شرح کر دی یعنی تفصیل کر دی اور کھول دیا اور جواہر میں سے جو کھولا جائے تو اس کی شرح کی گئی، تم بولتے ہو‘ پوشیدہ مسئلہ کی شرح کر دی‘ یعنی تفسیر کر دی اور خدا نے اس کے سینہ کو کھول دیا کسی نیک بات کے قبول کرنے کے لئے تو وہ کھل گیا یعنی اس کو قبول حق کے لئے وسیع کر دیا گیا یا وہ وسیع ہو گیا۔ ابن اعرابی نے کہا: شرح کے معنی‘ یاد رکھنا‘ کھولنا‘ بیان کرنا‘ سمجھنا۔

قرآن مجید میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے نبوت کے منصب ملتے وقت دعا مانگی۔

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ o وَیَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ o وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ o یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ﴾ (طٰہٰ)

اے میرے رب! میرے سینہ کو میرے لئے کھول دے اور میرے کام کو میرے لئے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات کو پوری طرح سمجھیں۔

دعا کے پہلے جملہ میں حضرت موسیٰؑ نے اپنے لئے شرح صدر کی استدعا کی ہے اور آخر میں فصاحت بیان کی یعنی اول میں صحیح معانی کے القاء اور آخر میں ان کے لئے صحیح الفاظ کے انتخاب کی دعا کی ہے تا کہ ان کی دعوت و تبلیغ کو مخاطب سمجھ سکیں لیکن یہ دولت محمد رسول اللہ ﷺ کو بن مانگے ملی، خدا نے فرمایا:

﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ o وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ﴾ (انشراح۔۱)

کیا ہم نے (اے محمد ﷺ!) تیرے لئے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا‘ اور تیرے بوجھ کو تجھ سے اتار لیا۔

شرح صدر اور ”سینہ کھولنے“ کی جو تشریح احادیث صحیحہ میں مذکور ہے اس کے لئے عام اصطلاح شق صدر ہے یعنی عالم رؤیا یا بیداری میں فرشتوں نے آ کر سینہ مبارک کو واشگاف کیا، اس کو آب زمزم سے دھویا اور سونے کے طشت میں ایمان اور حکمت بھر کر لائے، اور ان سے سینہ مبارک کو معمور کر کے شگاف کو برابر کر دیا [۱] اگر یہ واقعہ اپنی ظاہر حقیقت پر محمول کیا جائے تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ سینہ مبارک کو واقعاً چاک کر کے اور زمزم کے پانی سے پاک وصاف کر کے ایمان اور حکمت اس میں بھری گئی، اور اگر تمثیل کے رنگ میں لیا جائے تو یہ حقیقت ماننی پڑے گی کہ سینہ صافی ایمان وحکمت سے معمور کیا گیا، بہرحال شرح صدر کی حقیقت ایمان اور حکمت کی ربانی بخشش ہے۔

شرح صدر کے اس مذکورۂ بالا معنی کو جو شرح صدر کے واقعہ کی تفصیل سے واضح ہے اگر کوئی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو تو بحمد اللہ کہ اس کی تسکین کا سرمایہ بھی قرآن پاک میں موجود ہے۔ سورۂ زمر میں ہے:

---

[۱] صحیح بخاری ومسلم ونسائی‘ ابواب معراج واسراء وفرائض الصلوٰۃ ومسند احمد بروایت انس بن مالک وسنن ترمذی‘ تفسیر سورہ انشراح۔

﴿ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِ سْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ﴾ (زمر۔۳)
بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا، تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشنی میں ہے

اسلام کے لئے سینہ کے کھول دینے سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت موثر طریقہ سے اس پر اس طرح کھل گئی کہ اس کو اسلام کی سچائی کا پورا یقین آ گیا اور اس کو اپنے اس یقین پر کامل تسکین حاصل ہو گئی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کو اپنی منزل مقصود کے ہر قدم پر اللہ کی روشنی حاصل ہوئی۔ یہی شرح صدر کی حقیقت ہے۔ اس روشنی کی کمی بیشی درجوں اور منصبوں کے مطابق ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں حدیث کے دو ایسے موقعوں کا ذکر کرنا ہے جن سے لفظ ''شرح صدر'' کے معنی کی پوری تشریح ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ ان حدیثوں سے معنوی احتجاج یہاں مقصود نہیں بلکہ صدر اول کے کلام عرب سے شرح صدر کے محاورہ کی تشریح مقصود ہے۔

۱۔ پہلا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد عرب کے بعض قبیلے زکوۃ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں، حضرت ابوبکر صدیقؓ ان پر فوج کشی کا ارادہ کرتے ہیں، حضرت عمر فاروقؓ آ کر عرض کرتے ہیں کہ یا خلیفۂ رسول اللہ! ان سے جہاد کیونکر ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا اس نے جان و مال مجھ سے بچا لیا، حضرت صدیقؓ نے جواب دیا خدا کی قسم! میں اس سے لڑوں گا جو زکوۃ اور نماز میں فرق کرتا ہے۔ نماز خدا کا حق ہے اور زکوۃ بندوں کا حق ہے، اگر وہ بکری کا ایک بچہ بھی جس کو وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دیتے تھے اب نہ دیں گے تو میں ان سے لڑوں گا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔

﴿ فو اللّٰہ ماھو الا ان قد شرح اللّٰہ صدر ابی بکر فعرفت انه الحق ﴾ (بخاری۔ کتاب الزکوۃ)
تو خدا کی قسم، نہ تھا یہ لیکن یہ کہ کھول دیا تھا اللہ نے ابوبکر کے سینہ کو، تو میں نے جان لیا کہ وہی حق ہے۔

۲۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جنگ یمامہ میں قرآن کے بہت سے حافظ شہید ہوئے۔ اس وقت حضرت عمرؓ نے آ کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مشورہ دیا کہ قرآن پاک کو ایک ترتیب سے کاغذ پر یکجا لکھ لیا جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ میں وہ کام کیونکر کروں جس کو خود رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے مشورہ کے بہتر ہونے پر اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ کی سمجھ میں بات آ گئی۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ کہتے ہیں۔

﴿ فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح اللّٰہ صدری لذٰلك و رایت فی ذٰلك الذی رای عمر ﴾ (صحیح بخاری۔ جمع القرآن)
تو عمرؓ بار بار مجھ سے کہتے رہے، یہاں تک کہ خدا نے اس کے لئے میرے سینہ کو کھول دیا، اور میں نے بھی وہی دیکھا جو عمرؓ دیکھتے تھے۔

ان دونوں موقعوں پر لفظ شرح صدر اپنے استعمال کا محل اور اپنی حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے یہی شرح صدر ہے جس کو قرآن نے جیسا کہ اوپر سورۂ زمر کے حوالہ سے گذرا، نور ربانی یا نور بصیرت کہا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو شرح صدر کی جو وسعت عطا ہوئی تھی اس کے سمجھنے سے پہلے بلاغت کا ایک مسئلہ سمجھ لینا

چاہئے۔ جب کوئی لفظ متعلقات کے صلہ اور مفعول کے ساتھ مقید ہو کر بولا جاتا ہے تو اس سے معنی کی تخصیص و تحدید ہو جاتی ہے لیکن وہی لفظ جب متعلقات کے صلہ اور مفعول کی قید کے بغیر بولا جائے گا تو وہ عموم کے ساتھ فعل کے ثبوت کا فائدہ دے گا مثلاً علم (جاننا) مفعول کو چاہتا ہے، جس چیز کا علم ہوتا ہے اس کو عبارت میں مفعول بناتے ہیں اور اس عبارت میں اس علم سے مقصود اسی خاص شے کا علم ہوتا ہے جس کو مفعول بنایا ہے' لیکن اگر مفعول کو حذف کر دیں تو اس کا مقصد کسی خاص علم کے بجائے مطلق اور عام علم کا ثبوت ہوگا ایک جگہ قرآن میں ہے ﴿يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ (روم) ''وہ حیات دنیا کا ظاہری پہلو جانتے ہیں'' ظاہر ہے کہ اس علم کا تعلق صرف ایک چیز کے علم سے ہے یعنی دنیا کی ظاہری زندگی کے علم سے، عام علم سے نہیں' لیکن دوسری جگہ ہے ﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ کیا وہ جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے (یعنی جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے) دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ یہاں یہ ذکر نہیں کہ کس خاص بات کو جانتے ہیں' بلکہ مقصود عام علم ہے تو یہاں معنی ہوں گے کہ جو ہر طرح کے علم والے ہیں اور جو مطلق بے علم ہیں دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ بلاغت کی کتابوں میں ﴿هو يَأْمُرُ وَيُعْطِيْ وَيَمْنَعُ هُوَ اَضْحَكَ وَ اَبْكٰى﴾ کی مثالوں سے اس مفہوم کی توضیح کی گئی ہے۔

اس تمہید کے بعد شرح صدر کے گذشتہ استعمالوں اور مثالوں پر نظر ڈالئے، ہر جگہ آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ جس بات کے سمجھنے کے لئے سینہ کھولا جاتا ہے اس پر لام آتا ہے' یا قرینہ سے سمجھا جاتا ہے' مثلاً اسلام کے لئے سینہ کھول دیا' یا جمع قرآن کے لئے سینہ کھول دیا، مانعین زکوۃ کے قتال کے لئے سینہ کھول دیا' مگر حضرت موسیٰؑ اور آنحضرت ﷺ کے لئے قرآن میں جس شرح صدر کا ذکر ہے اس میں اس بات کا ذکر نہیں ہے جس کے لئے ان انبیاء علیہم السلام کے سینے کھولے گئے۔ اس سے یہ مقصود ہے کہ ان انبیاء کو امور دین میں مطلق اور عمومی شرح صدر عنایت ہوا اور یہیں سے عام امت اور انبیاء کے فرق مراتب کا اظہار ہوتا ہے کہ امت کے عام افراد کو خاص خاص امر کے سمجھنے کے لئے شرح صدر ملتی ہے اور انبیاء کو اپنے دائرہ میں کلی اور عمومی حیثیت سے یہ چیز عنایت ہوتی ہے۔

ایک اور لطیف پہلو بھی یہاں ذکر کے قابل ہے' حضرت موسیٰؑ کی دعا اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر احسان دونوں موقعوں پر لِیَ اور لَکَ ہے۔ حضرت موسیٰ کہتے ہیں ''میرے لئے میرے سینہ کو کھول دے'' اور آنحضرت ﷺ کے لئے خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''کیا میں نے تیرے لئے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا'' سوال یہ ہے کہ ''میرے لئے'' اور ''تیرے لئے'' کے اضافہ کی ضرورت ''اور اس لام'' کی حاجت کیا تھی؟ مفسرین میں امام زمخشری نے اس سوال کے جواب دینے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ صرف تاکید کے لئے ہے حالانکہ یہ لام تملیک کے بجائے لام افادہ ہے جیسا کہ ﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ میں ہے، مقصد یہ ہے کہ یہ شرح صدر کی دولت تجھ کو تیرے لئے ملی ہے یعنی تیرے کشف علم کے لئے یا تائید کے لئے یا فائدہ کے لئے اور یہ کشف علم اور شرح صدر خود تیری ذات کے لئے ہے کہ وہ کامل سے کامل تر ہو کر ظاہر ہو۔

اب آخری سوال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو دین کی جو یہ عمومی شرح صدر عنایت ہوئی اس کا کوئی اثر و نتیجہ بھی تو نمایاں ہوگا تو دراصل اسی کے یہ آثار و نتائج ہیں جو افعال و اقوال اور ''احادیث و سنن'' کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

تبیین کتاب:

آنحضرت ﷺ دنیا میں جس شریعت کو لے کر آئے وہ آخری اور ابدی تھی اور ایسی آخری اور ابدی شریعت کے لئے ضروری تھا کہ وہ زیادہ تر زور شریعت کے کلی اور ابدی اصول و مبادی پر دے۔ چنانچہ اس آخری وحی الٰہی نے اپنی کتاب الٰہی کو صرف اصول و کلیات تک محدود رکھا اور جزئیات کے لئے اپنی آیتوں میں ایسے اشارے رکھے جن کے سہارے سے وہ دل جو علم و معرفت سے پر نور اور حکم و حکمت سے معمور اور شرح صدر اور تائید ربانی سے فیض یاب ہوں۔ وہ علیٰ قدرِ مراتب جزئیات کو صحیح طور سے جان لیں۔ چنانچہ یہ رتبہ سب سے پہلے خود نبی ﷺ کو ملا اور چونکہ وہ خطا سے معصوم ہے اس لئے اس منصب کے نتائج بھی خطا سے محفوظ ہیں، پھر رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے یہ رتبہ خلفائے راشدینؓ، اکابر صحابہؓ، ائمہ تابعینؒ و تبع تابعینؒ و مجتہدینؒ عظام اور علمائے اعلامؒ کو ہمیشہ کے لئے ملتا رہا۔ اس کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے۔ جس کو ہر زمانہ کے فیض یاب علوم نبوت اور حاملین اسرارِ شریعت' خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق اس کی وحی کی روشنی میں ہمیشہ انجام دیتے رہے ہیں اور دیتے رہیں گے۔ یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی توضیح و تفسیر کی ذمہ داری بھی خود اپنے اوپر لی ہے، فرمایا:

> ﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴾ (قیامہ۔ ۱)
>
> تو قرآن کی وحی کے ساتھ اپنی زبان کو اس غرض سے حرکت نہ دے تا کہ تو اس کی تلاوت و اشاعت میں جلدی کرے ہم پر ہے۔ قرآن کو جمع کرنا اور اس کا پڑھانا۔ اور جب ہم نے اس کو پڑھا دیا' تو تو اس کی پڑھائی کی پیروی کر' پھر ہم پر ہے اس کی شرح کرنا۔

اس ''بیان اور شرح'' کی ذمہ داری کبھی بذریعہ وحی ادا ہوئی ہے جو قرآن میں مذکور ہے اور کبھی رسول کی تقریر و عمل سے پوری ہوئی ہے جو عملی تواتر سے منقول اور احادیث اور سنن کے مستند دفتر میں موجود ہے۔

یہ امر کہ اس بیان و شرح کی طاقت اور اس شرح و بیان کا اختیار رسول کو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا حسب ذیل آیت سے ثابت ہے۔

> ﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ (نحل۔ ۶)
>
> اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت (کی کتاب) اتاری تا کہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا ہے' تو اس کو کھول کر بتا دے شاید وہ سوچیں۔

''بیان'' اور ''تبیین'' کے لفظی معنی کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں اور ان کا استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے، ایک اعلان اور اظہار کے معنی میں یعنی اخفا کے مقابل، دوسرے توضیح و تفسیر کے معنی میں۔ قرآن پاک میں یہ لفظ ''تبیین'' اپنے دونوں معنوں میں آیا ہے۔ اب یہ تمیز کہ کس آیت میں کیا معنی مراد ہے سیاق و اسباق اور موقع و محل سے ہو سکتی ہے مثلاً ایک جگہ قرآن پاک میں ہے۔

> ﴿ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ

وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴾ (مائدہ)

اے کتاب والو! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا، کہ کتاب کی جو باتیں تم چھپاتے تھے، وہ ان کو تمہارے لئے ظاہر کردے اور بہت سی باتوں سے درگذرے۔

یہاں ''تبیین'' صریح طور سے اخفاء کے مقابلہ میں ہے، اس لئے یہاں ''تبیین'' کے معنی یقینی طور پر ''اظہار و اعلان'' کے ہیں لیکن یہی لفظ دوسری جگہ سورۂ نحل میں اس طرح آیا ہے۔

﴿ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾

اور ہم نے تجھ پر کتاب نہیں اتاری، لیکن اس لئے تاکہ تو واضح کردے اس کو، جس میں انہوں نے اختلاف کیا، اور ایمان والوں کے لئے رہنمائی اور رحمت بنا کر اس کو اتارا۔

اختلاف کے مقابلہ میں اظہار اور اعلان کی نہیں بلکہ توضیح و تشریح کی ضرورت ہے کہ جس امر میں اختلاف ہو، وہ توضیح و تفسیر کے بعد دور ہو جائے۔ اب پہلی آیت پر غور کرنا چاہئے جو اسی سورہ میں ایک اور مقام پر ہے۔

﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ (نحل)

اور ہم نے (اے پیغمبر) تیری طرف نصیحت کی کتاب (قرآن) کو اتارا تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا تو اس کو ان کے لئے کھول کر بتادے، شاید کہ وہ سوچیں۔

سوال یہ ہے کہ اس آیت پاک میں بیان کرنے کا مفہوم ظاہر کرنے کے ہیں یا تشریح و تفصیل کرنے کے؟ ہمارا دعویٰ ہے کہ ظاہر کرنے کے بجائے یہاں غور و فکر کی مناسبت اور قرینہ کے سبب سے تشریح و تفصیل کے معنی لینا صحیح ہے۔ امر مخفی کا اظہار سننے اور ماننے کے تو مناسب ہو سکتا ہے مگر سوچنے اور غور و فکر کے لئے یہاں تشریح و تفصیل کی ضرورت ہے نہ کہ اظہار و اعلان کی۔ اب جبکہ آنحضرت ﷺ کے لئے تفصیل و تبیین کا منصب خدا کی طرف سے ثابت ہے تو اس تفصیل و تبیین کی پیروی اور اتباع بھی خدا ہی کے احکام کی پیروی ہوگی اور آپ کی یہ تبیین و تشریح آپ کے نور حکمت کا فیضان ہوگا جس کے اشارے خود کتاب الٰہی کے اندر آپ کو موجود نظر آتے تھے۔

اراءت:

انسانی الفاظ میں یہ قدرت نہیں کہ ان کے ذریعہ سے کوئی ایسا قانون وضع کیا جا سکے۔ جو ایک طرف اختلاف فہم سے محفوظ رہے اور دوسری طرف اس میں یہ وسعت ہو کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات پر جن کے جزئیات کی کوئی حد نہیں، پوری طرح حاوی ہو سکے لیکن فہم انسانی کے اختلاف کے جو نقائص قانون میں ہوتے ہیں گو ان کو تمام تر دور نہیں کیا جا سکتا تاہم ان کو کم کیا جا سکتا ہے۔ اسلام نے اپنے قانون الٰہی سے جو بہرحال انسانی بول چال کے الفاظ میں ہے اس اختلاف فہم کے نقص کو کم کرنے کے لئے یہ کیا کہ اپنے رسول کی معرفت زبانی اور عملی طور سے اس کی تشریح و تبیین کرادی۔ گو انسانی ذرائع و حفظ و روایت کی فطری کمزوریوں کے سبب سے اس تشریح و تبیین میں بھی اختلاف فہم پیدا ہو گیا مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر یہ تشریح و تبیین نہ ہوتی تو اختلافات کی خلیج اس سے بھی زیادہ عمیق اور وسیع ہوتی۔

روزمرہ کے پیش آتے رہنے والے جزئیات کے فیصلہ کی یہ صورت رکھی گئی کہ آنحضرت ﷺ کی عدالت میں

روزانہ اس قسم کے واقعات اور مقدمات پیش ہوتے رہے اور آپ وحی کتاب کے اصول وکلیات کے تحت اپنے نور بصیرت اور فہم حکمت سے ان کے فیصلے فرماتے رہے۔ خلفائے راشدینؓ نے اپنے اپنے عہد میں ان نو بنو اور تازہ بتازہ واقعات کے فیصلوں کے لئے اولاً وحی کتابی کو اور اس کے بعد آنحضرت ﷺ کے ان قضایا اور فیصلوں کو جو فہم نبوت اور نور بصیرت اور اراءت الٰہی کے ذریعہ فیصل ہوئے تھے اپنا ماخذ قرار دیا، اور یہی اصول بعد کے فقہا اور مجتہدین نے اختیار کیا۔ ہر نئے واقعہ کو وحی کتاب اور فیصلہ نبوی کے معصوم ومسلم معیار پر جانچ کر ان میں سے کسی نہ کسی مماثل اور مشابہ پر قیاس کر کے اپنے فیصلے دیئے اور جو چیزیں ان میں نہ ملیں ان کو معمولی عدل وانصاف، رسم ورواج، عقل وفکر، استحسان وغیرہ کے اصول پر سمجھ کر ان کا فیصلہ کیا۔ یہی مجموعہ آج فقہ اسلامی کہلاتا ہے۔

وحی الٰہی قرآن پاک میں ہے اور آنحضرت ﷺ کے قضایا اور فیصلے احادیث وسنن کی صحیح روایتوں میں محفوظ ہیں۔ وحی الٰہی کی صداقت میں تو کلام نہیں ہوسکتا، اب رہ گئی آنحضرت ﷺ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی، تو اس کے متعلق بھی وحی الٰہی ناطق ہے۔

﴿ اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰکَ اللّٰہُ ﴾ (نساء)

ہم نے (اے پیغمبر) تیری طرف سچائی کے ساتھ کتاب اتاری تا کہ لوگوں کے درمیان جو تجھ کو اللہ سجھائے، اس کے ذریعہ سے فیصلہ کرے۔

اس کتاب الٰہی کے نزول کی غرض ہی یہ بتائی گئی ہے کہ تو اے پیغمبر! اس کے احکام اور قوانین کو لے کر اس فہم کے ذریعہ جو اللہ تعالیٰ تجھ کو سجھائے اور دکھائے تو لوگوں کے درمیان فیصلہ اور انصاف کر۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبر کو یہی سجھانا اور دکھانا جو کچھ تھا وہ آپ کے عمل اور قضایا فیصلوں کی صورتوں میں محفوظ ہے اور اسلام کے قانون کا وحی الٰہی کے بعد دوسرا ماخذ ہے۔

آنحضرت ﷺ کے عدل وانصاف پر خود منافقین تک کو بھروسہ تھا۔ چنانچہ ان کا قاعدہ تھا کہ جب ان کا حق کسی پر ہوتا تو وہ دوڑے ہوئے عدالت نبوی میں حاضر ہوتے، کیونکہ سمجھتے تھے کہ یہ حق آپ ہی کی عدالت سے ہم کو ملے گا لیکن جب ان پر کسی کا حق نکلتا تو وہ ٹال جاتے اور دوسرے طریقہ سے فیصلہ چاہتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی سرزنش کی۔

﴿ وَاِذَا دُعُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَہُمۡ اِذَا فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ○ وَاِنۡ یَّکُنۡ لَّہُمُ الۡحَقُّ یَاۡتُوۡۤا اِلَیۡہِ مُذۡعِنِیۡنَ ○ اَفِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ مَّرَضٌ اَمِ ارۡتَابُوۡۤا اَمۡ یَخَافُوۡنَ اَنۡ یَّحِیۡفَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ وَرَسُوۡلُہٗ ؕ بَلۡ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ○ اِنَّمَا کَانَ قَوۡلَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذَا دُعُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَہُمۡ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ؕ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ○ وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَیَخۡشَ اللّٰہَ وَیَتَّقۡہِ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ ﴾ (نور۔۵۲۔۴۸)

اور جب وہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی طرف بلائے جائیں کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کردے، تو ان میں سے کچھ لوگ منہ موڑتے ہیں، اور اگر ان کو کچھ حق پہنچتا ہو تو فرماں بردار بن کر رسول کے پاس چلے آئیں۔ کیا ان کے دل میں بیماری ہے یا وہ شک میں ہیں یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ بے انصافی کرے گا، بلکہ وہی لوگ بے انصاف ہیں۔ ایمان والوں کی بات یہ تھی کہ جب ان کو خدا اور رسول کی طرف بلایا جائے تا کہ وہ ان کے درمیان

فیصلہ کر دے تو وہ کہیں ہم نے سنا اور مان لیا۔ انہیں لوگوں کا بھلا ہے اور جو کوئی اللہ کے اور اس کے رسول کے حکم پر چلے اور اللہ سے ڈرتا رہے اور اللہ سے بچ کر نکلے وہی ہیں مراد کو پہنچے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ رسول کے تمام فیصلے منصفانہ ہوتے تھے اور رسول کے فیصلوں کی اطاعت خود خدا کے حکم کی اطاعت ہے بلکہ ایمان کی دلیل اور نشانی ہے۔

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ (نسا۔۹)

تو قسم ہے تیرے رب کی، وہ مومن نہ ہوں گے، جب تک وہ تجھے اپنے جھگڑوں کا منصف نہ بنائیں اور پھر جو تو فیصلہ کرے اس سے اپنے دل میں خفگی نہ پائیں اور پوری طرح تسلیم کریں۔

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴾ (احزاب)

اور مومن مرد یا مومن عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دے تو ان کو اپنے کام کا اختیار رہے، اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلا گمراہ ہوا۔

یہ اطاعت اور مطلقاً سرافگندگی اور تمام فیصلوں کا قطعی حق اور منصفانہ فیصلہ ہونے کی ربانی ذمہ داری ہر حاکم وقت اور سلطان زمانہ کے لئے نہیں، یہ انبیاءؑ کے لئے خاص ہے۔ دو شخصوں کے باہمی جزئی و شخصی مقدمات کا فیصلہ ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ وحی قرآنی کے ذریعہ نہیں کرتا تھا بلکہ رسول کے فہم نبوت، نور نبوت، فیض حکمت، شرح صدر، تبیین حقیقت اور اراءت (دکھانا اور سوجھانا) کے ذریعہ فرماتا تھا لیکن کلیات کی حیثیت سے وہ یقیناً وحی قرآنی کے مطابق ہوتا تھا اور ان کلیات کے مطابق ان جزئیات کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ آپ کو بجھاتا تھا۔

آپ کے ان قضایا اور فیصلوں کی رضامندانہ اطاعت ہر مسلمان پر قیامت تک ضروری ہے۔ آپ کی زندگی کے بعد ان فیصلوں کی اطاعت یہ ہے کہ اس قسم کے مقدمات اور معاملات میں ہم وہی فیصلے جاری کریں جو آپ نے اپنی زندگی میں ان کے متعلق کئے کہ آپ کے فیصلے بحکم خدا غلطی سے پاک، ظلم سے بری اور بے انصافی سے منزہ تھے اور دنیا میں رسول کے سوا کسی انسان کو اس بے گناہی اور عصمت کا درجہ اور رتبہ حاصل نہیں۔

رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے:

اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ہادی و رہنما فرمایا ہے یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات مجسم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لئے خاص ہو جاتی ہے۔ ان کی بعثت اسی لئے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی فرمائیں اور ان کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں۔ جس امت میں مبعوث ہوتے ہیں اس کے سامنے ہدایت و رہنمائی کے دو چراغ روشن ہوتے ہیں، جن دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جنہیں یہود اپنی شرارت اور سازش سے گمراہ بنانا چاہتے تھے، خطاب کر کے فرماتا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ

کٰفِرِیْنَ o وَ کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰی عَلَیْکُمْ اٰیٰتُ اللّٰہِ وَفِیْکُمْ رَسُوْلُہٗ ﴾ (آل عمران۔۱۰)

اے مومنو! اگر تم اہل کتاب کے کسی گروہ کا کہا مانو گے تو وہ ایمان لا چکنے کے بعد تمہیں مرتد کر کے کافر بنا دیں گے اور تم کو کیونکر کفر کرنا چاہئے درآں حالیکہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔

آیت کے آخری ٹکڑے سے ثابت ہوا کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں مسلمانوں کے پاس تھیں، ایک تو آیات الٰہی جو ان کو سنائی جاتی تھیں اور دوسری خود رسول کا مستقل وجود' جو اپنی تعلیم و تلقین' فیض صحبت اور اثر سے ان کو بھٹکنے نہ دیتا اور ضلالت سے مانع آتا تھا۔ اگر صرف کتاب الٰہی اس کتاب کو انجام دے سکتی تو رسول کے ذکر کی حاجت بلکہ خود بعثت کی ضرورت کیا تھی؟ اس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ کی کتاب صامت (قرآن) اس کی کتاب ناطق (رسول) سے مل کر اپنے فریضہ کو انجام دیتی ہے۔ اور غالباً اس حدیث صحیح کے بھی یہی معنی ہیں جس کا اعلان آپ ﷺ نے حجۃ الوداع سے واپسی میں اپنی وفات سے کچھ مہینوں پہلے فرمایا۔

﴿انی تارك فیکما الثقلین کتاب اللّٰہِ و سنتی﴾

مسلمانو! میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ جاتا ہوں اللہ کی کتاب اور اپنی سنت (یعنی اپنی عملی زندگی)

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپؐ کا ظاہری وجود چھپ گیا مگر آپؐ کی عملی زندگی جس کو سنت کہتے ہیں قائم و باقی ہے، اور وہ بھی قرآن کے بعد ہماری ہدایت کا دوسرا سرچشمہ ہے۔

تزکیہ:

انبیاء علیہم السلام کا عموماً اور آنحضرت ﷺ کا خصوصاً ایک امتیازی وصف تزکیہ ہے۔ تزکیہ کے معنی پاک و صاف کرنے کے ہیں۔ نبوت محمدیہ کے اس وصف کا ذکر ان آیتوں میں ہے جن میں آپ کی یہ توصیف کی گئی ہے، ایک رسول جو لوگوں پر خدا کی آیتیں تلاوت کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کا یہ تیسرا وصف پہلے دو اوصاف سے الگ ہے۔ یہ پاک و صاف کرنا' آیات الٰہی کی تلاوت اور کتاب و حکمت کی تعلیم کے بعد نبی کی عملی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی تعلیم و تربیت' فیضان صحبت' حسن اخلاق' پند و موعظت اور تبلیغ و دعوت کی تاثیر سے برے اچھے' بد نیک اور اشرار اخیار بن جاتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی ہر تاریخ اس واقعہ کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ گمراہ اور بدکار قوموں میں مبعوث ہوئے، ہر طرح کی اذیتیں اٹھائیں' تکلیفیں سہیں' مصیبتیں جھیلیں' اور آخر تاریکی کو روشنی سے' جہالت کو علم سے' اور کفر کو توحید سے بدل کر رہے اور مدت تک ان کی تاثیر کا فیض جاری رہا۔ ان کا یہ وصف تزکیہ' وحی والہام کے علاوہ ان کے جسم و جان اور زبان و دل کی کیمیا اثری کا نام ہے' خواہ ان کی زبان اس وقت وحی الٰہی سے مترنم ہو یا خاموش، ہر آن آفتاب حق کی کرنیں مطلع نبوت سے نکل نکل کر دلوں کی سرزمین کو روشن کرتی رہتی تھیں۔

نور:

اس لیے نبوت کا سینہ صدق و صفا کا آئینہ ہوتا ہے۔ نبی کا مجسم پیکر ظلمت کدہ عالم کا چراغ اور علم و ہدایت کا مطلع

النور ہوتا ہے، جس طرح اس کا صحیفۂ الہامی اور وحی ربانی نور ہوتا ہے وہ خود بھی سراپا نور ہوتا ہے، جس سے اندھے دیکھتے، گمراہ راہ پاتے اور حق کے طالب روشنی حاصل کرتے ہیں۔ خود آپ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا:

﴿ یَـآاَیُّهَـا الـنَّبِیُّ اِنَّـآ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیۡرًا o وَّدَاعِیًـا اِلَـی اللّٰهِ بِاِذۡنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیۡرًا ﴾ (احزاب)

اے نبی! ہم نے تجھ کو بتانے والا، خوشخبری سنانے والا، چوکنا کرنے والا، خدا کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن کرنے والا چراغ بنا کر بھیجا۔

یہ آس پاس کی چیزوں کو روشن کرنے والا چراغ خود رسول کی ذات ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے جسم و جان، زبان و دل، خلق و عمل، علم و فہم میں روشنی نہیں تو آپ کی ذات جو انہیں چیزوں کا مجموعہ ہے، روشن چراغ کیونکر ثابت ہوگی؟ اور جب آپ کی ذات مبارک کی یہ تمام چیزیں انوار الٰہی ہیں تو ان انوار میں سے ہر نور کی روشنی میں چلنا ہدایت ہے اور ان میں سے کسی سے قطع نظر کرنا بھی ظلمت کے ایک گوشہ میں قدم دھرنا ہے۔

آیات وملکوت کی رویت:

جس طرح انبیاء علیہم السلام اپنی قوت سامعہ سے ندائے غیب کو سنتے اور صدائے وحی کو سماعت کرتے ہیں، اسی طرح ان کی آنکھیں بہت کچھ دیکھتی ہیں جو عام انسان نہیں دیکھتے حضرت ابراہیمؑ کے ذکر میں ہے۔

﴿ وَكَذٰلِكَ نُرِیۡ اِبۡرَاهِیۡمَ مَلَكُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلِیَكُوۡنَ مِنَ الۡمُوۡقِنِیۡنَ ﴾ (انعام)

اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں کی اور زمین کی مملکت دکھاتے تھے، تا کہ وہ یقین کرنے والوں میں ہو۔

استعداد نبوت کی تربیت اور نشوونما کے لئے یہ رویت و بصیرت کی مافوق قوت ان کو عطا ہوئی۔

حضرت موسیٰؑ کو طور پر جو کچھ نظر آیا وہ جلوہ گری حسن و عشق کی مشہور کہانی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے مشاہدات روحانی کا تذکرہ معراج کے تعلق سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

﴿ لِنُرِیَهٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ﴾ (اسرائیل)

تا کہ ہم اس (رسول بندہ) کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔

دوسری جگہ ہے۔

﴿ مَا كَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی o اَفَتُمٰرُوۡنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی o وَلَقَدۡ رَاٰهُ نَزۡلَةً اُخۡرٰی ﴾ (نجم)

دل جھوٹ نہیں بولا جو اس نے دیکھا، اس پر اس سے جھگڑتے ہو، اور دوسری بار اس کو اترتے دیکھا۔

﴿ مَا زَاغَ الۡبَصَرُ وَمَا طَغٰی o لَقَدۡ رَاٰی مِنۡ اٰیٰتِ رَبِّهِ الۡكُبۡرٰی ﴾ (نجم)

نگاہ نہ بہکی، اور نہ سرکش ہوئی، اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

ایک اور مقام پر ہے۔

﴿ وَلَقَدۡ رَاٰهُ بِالۡاُفُقِ الۡمُبِیۡنِ ﴾ (تکویر)

اور اس نے یقیناً اس کو آسمان کے کھلے کناروں میں دیکھا۔

یہ مشاہدہ وحی والہام کے علاوہ نبوت کے دوسرے حاسہ بصارت کے امتیاز کو ظاہر کرتا ہے۔

سماع غیب:

جس طرح آیات وملکوت کا مشاہدہ انبیاء کے حاسہ سماعت بصارت کا امتیازی وصف ہے اسی طرح غیب کی آواز اور وحی کی صدا کو سننا بھی ان کے حاسہ سماعت کا خصوصی امتیاز ہے۔ قرآن پاک میں اس کی تصریحات موجود ہیں کہ انبیاء خدا سے ہم کلام ہوتے تھے اور وحی کو پاتے تھے ﴿وَکَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰی تَکْلِیْماً﴾ (نساء:۲۳) اور خدا نے موسیٰ سے بات کی۔

حضور کو حکم ہوا:

﴿ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰی اِلَیْكَ وَحْیُهٗ﴾ (طہ-۲)

اور اس سے پہلے کہ قرآن کی وحی تجھ پر پوری ہو قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کر۔

خدا نے پیغمبروں کو پکارا اور انہوں نے اس کی آوازیں سنیں نَادَیْنَا "ہم نے پکارا" بار بار یہ مضمون القرآن میں پیغمبروں کے متعلق آئے ہیں۔

تبلیغ ودعوت:

نبی کا سب سے پہلا اور اہم فرض تبلیغ اور دعوت ہے یعنی جو سچائی اس کو خدا سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا، خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے وہ لوگوں کو سنا دینا۔ اس نے اس کو جس صداقت سے آگاہ کیا ہے اس سے اپنے ہم جنسوں کو باخبر کرنا۔ جو مالی، جانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو بخشی گئی ہیں، ان کو اس راہ میں صرف کرنا، اور اس سمجھانے بجھانے اور راہ راست پر لانے میں صداقت کی ہر تاثیر سے کام لینا۔ اس اعلان اور دعوت میں جو تکلیف بھی پیش آئے اس کو راحت جاننا۔ جو مصیبت درپیش ہو اس کو آرام سمجھنا۔ جو کانٹے بھی اس وادی میں اس کے تلووں میں چبھیں، ان کو رگِ گل سمجھنا۔ اس حق کی آواز کو دبانے کے لئے جو قوت بھی سر اٹھائے اس کو کچل دینا، اور مال ومنال، اہل وعیال غرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگ راہ ہو کر سامنے آئے اس کو ہٹا دینا اور ان کی ان ساری کوشش وکاوش کا مقصد خدا کی رضامندی، مخلوق کی خیر خواہی اور اپنے فرضِ رسالت کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ ہے انبیاءؑ کی تبلیغ ودعوت کا مفہوم۔ دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے انہوں نے اپنے فرض کو اسی ایثار اور قربانی کے ساتھ انجام دیا اور ایک لحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی، اور آج دنیا میں جو کچھ خدا کی محبت، بھائیوں کا پیار، انسانوں کی ہمدردی، بے کسوں کی مدد، غریبوں کی اعانت اور دوسری نیکیوں کا اس سطح زمین پر وجود ہے، وہ سب بواسطہ یا بلاواسطہ، دانستہ یا نادانستہ انہیں کی دعوت وتبلیغ اور جدوجہد کا اثر اور نتیجہ ہے۔

دنیا کے بڑے سے بڑے مفکر، بڑے سے بڑے شاعر، بڑے سے بڑے حکیم اپنا فرض خود سمجھ لینا یا زیادہ سے زیادہ دوسروں کو سمجھا دینا سمجھتے ہیں، لیکن انبیاء علیہم السلام جس صداقت کو پاتے ہیں اس کو دوسروں کے سمجھانے اور ہر ممکن طریق سے اس کے پھیلانے اور اہل دنیا کو اس کے باور کرانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں اور ہر مشکل کو جھیل

کر نافہموں کو حقیقت سمجھاتے اور اندھوں کو راہ راست دکھاتے ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کی تعریف میں خدا فرماتا ہے۔

﴿ اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَیَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ط وَکَفٰی بِاللّٰهِ حَسِیْبًا ﴾ (احزاب)

جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں، اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، اور اللہ بس ہے حساب (اعمال) کے لئے۔

حضرت موسیٰ کو حکم ہوتا ہے۔

﴿ اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ﴾ (طٰہٰ۔۱۷)

فرعون کے پاس جا کہ اس نے سرکشی کی۔

آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ پیغام ربانی کی بے محابا تبلیغ کریں اور دشمنوں سے نہ ڈریں کہ تمہاری حفاظت کا خود شہنشاہ عالم ذمہ دار ہے۔

﴿ یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ط وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ﴾ (مائدہ۔۱۰)

اے پیغمبر! تیرے رب کے پاس سے جو تیری طرف اُترا ہے، اس کو پہنچا دے اور تو نے نہ کیا تو تو نے اس کے پیغام کو پہنچانے کے فرض کو ادا نہیں کیا۔ اللہ تجھ کو لوگوں سے بچائے گا۔

ان کی تبلیغ و دعوت میں تبشیر اور انذار دونوں ہوتے ہیں۔ تبشیر یعنی بشارت دینا اور خوشخبری سنانا، اور انذار یعنی خدا کے جلال سے ڈرانا، عذاب الٰہی کا خوف دلانا اور لوگوں کو ان کے انجام بد سے آگاہ کرنا۔ اور انبیاء کی آمد اس شان سے ہوتی ہے کہ خدا کی بندوں پر حجت تمام ہو جائے۔

﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ﴾ (نساء:۲۳)

یہ سب پیغمبر خوشخبری سناتے اور ہشیار و بیدار کرتے ہوئے آئے تا کہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کیلئے خدا پر کوئی حجت نہ رہے۔

ان سب نے پیغام الٰہی پہنچانے کے ساتھ اپنی خیر خواہی، دلسوزی و اخلاص مندی کا اعلان کیا۔

﴿ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِیْنٌ ﴾ (اعراف۔۹)

میں تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں، اور میں تمہارا امانت دار خیر خواہ ہوں۔

﴿ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ ﴾ (اعراف)

اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کا پیام تم کو پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کر چکا، لیکن تم خیر خواہوں کو پیار نہیں کرتے۔

﴿ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ فَكَیْفَ اٰسٰی عَلٰی قَوْمٍ كٰفِرِیْنَ ﴾ (اعراف۔۱۱)

اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کے پیام تم کو پہنچا دیئے اور تمہاری خیر خواہی کر چکا، تو پھر کیسے نہ ماننے والے لوگوں پر میں غم کھاؤں۔

یہ بھی فرمایا کہ:

﴿ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی لَّذِیْ فَطَرَنِیْ ﴾ (ھود)

میں اپنی نصیحت کی تم سے مزدوری نہیں مانگتا۔ میری مزدوری تو خدا پر ہے جس نے مجھ کو پیدا کیا۔

﴿ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مَالًا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ ﴾ (ھود)

میں اپنی تبلیغ کا بدلہ تم سے مال و دولت کا خواہاں نہیں ہوں' میری مزدوری تو خدا پر ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ:

اس سلسلہ میں ہم کو ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو بعضوں کو حضور ﷺ کی صفت تبلیغ کے سمجھنے میں پیش آئی ہے۔ قرآن مجید میں متعدد آیتیں اس معنی کی آئی ہیں کہ ''رسول کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا (ابلاغ) ہے'' اس سے آج کل کے بعض کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہوا کہ رسول کا فرض صرف ''وحی الٰہی کی تبلیغ ہے'' یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو انسانوں تک بعینہٖ پہنچا دینا اس کا کام ہے۔ اس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح کا نہ اس کو منصب ہے' اور نہ اس کا اس کو حق ہے۔ ان کے نزدیک مبلغ رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بر کی ہے' جو ایک جگہ سے دوسری جگہ خط تو پہنچا دیتا ہے۔ مگر اس خط کے مفہوم و معنی کی تشریح کا اُس کو حق نہیں ہوتا' بلکہ اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس بند لفافہ میں کیا ہے۔

شاید ان کو یہ دھوکا اس آیت کے علاوہ لفظ ''رسول'' سے بھی ہوا ہے جس کے لفظی معنی پیغمبر اور قاصد کے ہیں' لیکن وہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ جہاں اس کو رسول کہا گیا ہے' نبی (خبر پانے والا) بھی تو کہا گیا ہے' مبشر (خوشخبری سنانے والا) نذیر (ڈرانے والا) سراج منیر (روشن چراغ) صاحب حکمت' صاحب خلق عظیم' صاحب مقام محمود' مجتبٰی (مقبول) مصطفٰی (برگزیدہ) مبین (بیان اور شرح کرنے والا)، معلم (سکھانے والا) مزکی (پاک وصاف کرنے والا) داعی الی اللہ (اللہ کی طرف بلانے والا) حاکم (فیصلہ کرنے والا) مطاع (واجب الاطاعۃ) آمر (حکم دینے والا) ناہی (روکنے والا) بھی تو کہا گیا ہے۔ کیا یہ اوصاف و القاب اس کی اسی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ صرف ایک پیغام پہنچانے والا قاصد ہے؟ جس کو اصل پیغام کے مفہوم و معنی ایک معمولی قاصد اور نامہ بر کی طرح کوئی سروکار نہیں؟ اس کے پیغام کے مفہوم و معنی کی تشریح و تفسیر کا آج تو ہر عربی دان کو حق حاصل ہے' اور اس کی اصل حقیقت تک پہنچ جانے کا ہر مدعی کو دعوی ہے' مگر خود صاحب پیغام کو اپنی پیغمبری کے وقت نہ مفہوم و معنی کا علم تھا' اور نہ اس کی تشریح کا اس کو حق تھا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ہم نے پچھلے صفحات میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اس غلط خیال کی پوری تردید ہو جاتی ہے۔

ان کے اشتباہ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اسلام میں شرع اور وضع قانون کا حق صرف اللہ تعالیٰ کیلئے تسلیم کیا گیا ہے۔ وہی اصلی شارع ہے۔ اب اگر رسول کو بھی وحی کتابی سے الگ شرع بنانے کا حق تسلیم کیا جائے تو خدا کے سوا ایک اور شارع تسلیم کرنا ہوگا' لیکن اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ ہم رسول کو شارع نہیں شارح قرار دیتے ہیں۔ کیا عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جج جب حکومت کے قانون کی توضیح و تشریح کرتا ہے۔ تو وہ اپنے اس عمل سے سلطان وقت بن کر واضع قانون کا منصب حاصل کرتا ہے۔ یا صرف قانون کے مفہوم کا شارح ہوتا ہے؟ یہی حیثیت آسمانی عدالت کے اس قاضی کی ہے جس کو ہم نبی اور رسول اور معلم اور مبین کہتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر پیام اور مقصد اور مفہوم اور فیصلہ سے صرف وحی کے اسی طریقہ خاص کے ذریعہ اپنے پیغمبر کو مطلع نہیں فرماتا، جس طریقہ خاص سے قرآن مجید نازل ہوا ہے بلکہ وہ اپنی تینوں قسموں کے ذریعہ سے اپنے اغراض اس رسول پر واضح کرتا ہے، اور ان میں سے ہر طریق کی وحی کی اطاعت تمام امت پر فرض ہے، خواہ وہ وحی ہو جو الفاظ الٰہی کی قید کے ساتھ آئی ہو، جس کو قرآن کہتے ہیں، یا ربانی مفہوم و معنی رسول کے الفاظ میں ادا ہوں، جس کو حدیث و سنت کہتے ہیں۔ الغرض خواہ وہ کتاب الٰہی کے ذریعہ سے ہو یا حکمت ربانی کے فیض سے ہو۔

قرآن مجید کی وہ آیتیں جن کے معنی یہ ہیں کہ ''ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچانا ہے'' ان کا یہ منشا نہیں کہ وہ صرف پیغام پہنچانے والا ہے، خوشخبری سنانے والا نہیں، ہشیار و بیدار کرنے والا نہیں، پیغام الٰہی کے الفاظ سنانے کے بعد ان کی تعلیم دینے والا نہیں، آیات الٰہی کی تبیین و تشریح کرنے والا نہیں، رہنما اور ہادی نہیں، نجاستوں سے پاک و صاف کرنے والا نہیں، ایسا کہنا قرآن کا انکار اور عقل و فہم کا ماتم ہے۔ قرآن میں کئی جگہ ہے۔

﴿ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ ﴾ (ص، رعد، نازعات)

تو تو صرف ڈر سنانے والا ہے۔

ایک جگہ ہے:

﴿ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ﴾ (ص۔۵)

میں تو صرف ڈر سنانے والا ہوں۔

کیا ان آیتوں کا مفہوم یہی ہے کہ ڈر سنانے کے سوا رسول کا کام بشارت اور خوشخبری سنانا نہیں، اور وہ صرف منذر ہے، مبشر نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس قسم کی آیتوں۔

﴿ اِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴾ (مائدہ)

ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔

کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ صرف پیغام رساں اور قاصد ہے، مبین اور شارح نہیں، بلکہ یہ ہے کہ اس کا کام صرف خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے، زبردستی لوگوں کے دلوں میں اس کا پیغام اتار دینا نہیں، بزور لوگوں کو مسلمان بنا دینا نہیں، جبراً منوالینا نہیں، اور نہ پیغام پہنچا دینے کے بعد لوگوں کے کفر و انکار و عدم ایمان کی ذمہ داری اس پر ہے۔ قرآن پاک میں جہاں جہاں اس معنی کی آیتیں آئی ہیں، ان کا منشاء یہی اور صرف یہی ہے۔ قرآن پاک کی تیرہ مختلف آیتوں میں یہ بات کہی گئی ہے، اور ہر جگہ یہی ایک مفہوم ہے۔

﴿ وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَ اَسْلَمْتُمْ ط فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ ط وَاللّٰهُ بَصِیْرٌ م بِالْعِبَادِ ﴾ (آل عمران)

کتاب والوں اور ان پڑھوں سے کہہ دے کیا تم نے اسلام قبول کیا، اگر کیا تو ہدایت پائی، اور اگر منہ پھیرا تو تجھ پر (اے رسول) صرف پیام پہنچانا ہے، اور اللہ بندوں کو دیکھنے والا ہے۔

مفہوم بالکل ظاہر ہے کہ اسلام کی ہدایت قبول کرنے میں کوئی زبردستی نہیں۔ اگر لوگ قبول کریں تو انہوں

نے حق کی راہ پائی اور اگر انکار کریں تو رسول کا کام صرف پیغام پہنچا دینا تھا' وہ اس نے پہنچا دیا۔ اس کا فرض ادا ہو چکا' اب خدا جانے اور اس کے بندے جانیں۔

﴿ فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ وَعَلَيۡنَا الۡحِسَابُ ﴾ (رعد۔۶)

تو تیرا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے' اور ہمارا فرض ان سے حساب لینا ہے۔

اس کی مزید تفصیل سورۂ غاشیہ میں ہے۔

﴿ فَذَكِّرۡ اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِمُصَيۡطِرٍ ۝ اِلَّا مَنۡ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ۝ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الۡعَذَابَ الۡاَكۡبَرَ ۝ اِنَّ اِلَيۡنَاۤ اِيَابَهُمۡ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا حِسَابَهُمۡ ﴾ (غاشیہ۔۱)

تو (اے پیغمبر!) تو نصیحت کر' تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے' ان پر داروغہ نہیں۔ لیکن جس نے منہ پھیرا اور انکار کیا' تو خدا اس کو بڑی سزا دے گا۔ بے شک پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے' اور ہمیں پر ان کا حساب ہے۔

یہی مفہوم سورۂ شوریٰ میں ہے کہ رسول کا کام صرف سمجھانا اور تبلیغ کرنا ہے۔ وہ سلطان، کارفرما' داروغہ اور فرمانروا بنا کر نہیں بھیجا گیا کہ لوگوں سے بزور اپنی بات منوا لے۔

﴿ فَاِنۡ اَعۡرَضُوۡا فَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ عَلَيۡهِمۡ حَفِيۡظًا ؕ اِنۡ عَلَيۡكَ اِلَّا الۡبَلٰغُ ﴾ (شوریٰ)

تو اگر وہ انکار کریں تو ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا' تیرا کام صرف پہنچا دینا ہے۔

کافروں نے جب کبھی رسولوں کو جھٹلایا، انہوں نے یہی کہا کہ ہمارا کام پہنچا دینا ہے' ماننے نہ ماننے کا تمہیں اختیار ہے۔

﴿ قَالُوۡا مَاۤ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا وَمَاۤ اَنۡزَلَ الرَّحۡمٰنُ مِنۡ شَیۡءٍ اِنۡ اَنۡتُمۡ اِلَّا تَكۡذِبُوۡنَ ۝ قَالُوۡا رَبُّنَا يَعۡلَمُ اِنَّاۤ اِلَيۡكُمۡ لَمُرۡسَلُوۡنَ ۝ وَمَا عَلَيۡنَاۤ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ﴾ (یٰسین۔۱۵۔۱۷)

کافروں نے کہا تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو۔ خدا نے کچھ نہیں اتارا' تم جھوٹ کہتے ہو۔ رسولوں نے جواب دیا ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہم بھیجے ہوئے ہیں' اور ہمارا فرض صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

خود اللہ تعالیٰ نے بھی رسولوں کو تسلی دی ہے کہ ان منکروں کے انکار سے دل شکستہ نہ ہوں' اگلے پیغمبروں کے منکروں نے بھی یہی کیا تھا۔ پیغمبروں کا فرض لوگوں کو منوانا نہیں' بلکہ ان تک ہمارا پیام پہنچانا ہے۔

﴿ وَقَالَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدۡنَا مِنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ شَیۡءٍ نَّحۡنُ وَلَاۤ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمۡنَا مِنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَهَلۡ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ﴾ (نحل۔۵)

اور مشرکوں نے کہا اگر خدا چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی اور کو نہ پوجتے' نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا' اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے' (خدا کہتا ہے کہ) ایسا ہی کیا تھا ان کے پہلوں نے' تو کیا ہمارے پیغمبروں پر پہنچا دینے کے سوا کچھ ہے؟

﴿ وَاِنۡ تُكَذِّبُوۡا فَقَدۡ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنۡ قَبۡلِكُمۡ وَمَا عَلَى الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ﴾ (عنکبوت۱۸)

اگر تم جھٹلاؤ تو (کیا ہے) تم سے پہلے بھی قومیں جھٹلا چکی ہیں' اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔

رسول کا کام پہنچا دینا ہے' باقی علام الغیوب جو چاہے سو کرے۔

﴿ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ط وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴾ (مائدہ)

رسول پر نہیں ہے لیکن پہنچا دینا، اور اللہ جانتا ہے جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔

بقیہ آیتیں حسب ذیل ہیں جو ایک ہی مفہوم کو ادا کرتی ہیں۔

﴿ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْآ اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾ (مائدہ)

اور اللہ کا فرمان اور رسول کی بات مانو اور بچو، اور اگر تم نے منہ پھیرا تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

﴿ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ج فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ط وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾ (نور۔۷)

کہہ دے اے پیغمبر! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ منہ پھیریں تو رسول پر وہ ہے جس کا اس پر بوجھ ہے، اور تم پر وہ ہے جس کا بوجھ تم پر ہے، اگر اس کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے، اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔

﴿ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ o فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾ (نحل۔۱۱)

اسی طرح اللہ تم پر اپنا احسان پورا کرے گا تاکہ تم مسلمان ہو جاؤ اور اگر انہوں نے منہ پھیرا تو تجھ پر سوا اس کے کچھ نہیں کہ کھول کر پہنچا دے۔

﴿ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴾ (تغابن۔۲)

اور خدا کا کہا مانو اور رسول کی فرمانبرداری کرو۔ اگر تم نے منہ پھیرا تو ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

پیغمبر کا قول ہے۔

﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ اِلَيْكُمْ ﴾ (ہود)

تو اگر تم منہ پھیرو تو میں جو پیام دے کر تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں نے تم کو پہنچا دیا (یعنی میرا فرض ختم ہو چکا)

ان تمام آیتوں کا تعلق نبوت کے منکروں سے ہے۔ یہاں پر یہ نکتہ بھی لحاظ کے قابل ہے کہ جو لوگ ہنوز نبوت کے منکر ہوں، ان سے رسول کا تعلق صرف تبلیغ و نصیحت، پند و موعظت اور سمجھانے کا ہے، لیکن جو خوش قسمت اقرار نبوت کی سعادت کو حاصل کر لیں، تو پھر ان کا تعلق رسول سے پھر اتباع و پیروی و اطاعت کا ہو جاتا ہے، اس کے بعد رسول ان کو تبلیغ ہی نہیں بلکہ امر و نہی بھی کرتا ہے۔ کوئی حکومت دوسرے ملک کے کسی باشندے کو زبردستی اپنی رعایا نہیں بناتی، لیکن اگر کوئی شخص از خود اس حکومت کی رعایا بن جائے، تو پھر اس کو اس کے قانون کی پیروی پر بزور مجبور کیا جائے گا کہ رعایا بننے کے معنی ہی اس کے قانون کے قبول کرنے کے ہیں۔

انبیاءؑ کی تعلیم کا امتیازی نتیجہ:

دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے، وہ ایک ہی دین اور ایک ہی عقیدہ لے کر آئے۔ وہی توحید، وہی نبوت، وہی عبادت، وہی اخلاق، وہی جزا و سزا اور عمل کی پرسش۔ اس لحاظ سے انبیاءؑ کی تعلیم میں کوئی اصولی فرق نہیں، اس لئے فرمایا کہ ﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا الْاٰيه ﴾ یعنی ”خدا نے تمہارے لئے وہی دین مشروع کیا، جو نوح وغیرہ

دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا' اور اسی کا نام اسلام ہے''۔ لیکن انبیاءؑ کی تعلیم کا اہم الاصول اور سب سے ضروری جز توحید ہے اور وہی نبوت کے ساز کا اصلی اور ازلی ترانہ ہے۔

ممکن ہے کہ دنیا میں اسلام سے پہلے بہت سے اچھے لوگ گذرے ہوں' ان کی دعوت بھی مفید ہو' ان کے اخلاق وعظ بھی دل پسند ہوں' وہ یونان کے حکیم ہوں' یا ہندوستان کے اوتار' لیکن ان کی تعلیم میں اگر توحید کی دعوت شامل نہیں تو وہ نبوت کے رتبہ کے قابل نہیں' کہ پیغمبرانہ تعلیم کی پہچان ہی توحید کی دعوت ہے۔ اگر یہ نہیں تو نبوت بھی نہیں' فرمایا

﴿ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ ﴾ (انبیاء)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا لیکن ان کو یہ وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں' میری ہی پرستش کرو۔

﴿ وَلَقَدۡ بَعَثۡنَا فِیۡ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوۡلًا اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاجۡتَنِبُوا الطَّاغُوۡتَ ﴾ (نحل)

اور ہر قوم میں ہم نے ایک رسول بھیجا کہ خدا کی عبادت کرو اور بتوں سے پرہیز کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ تعلیمی حیثیت سے نبوت کی شناخت اسی سے ہو سکتی ہے۔ اسلام سے پہلے جس مدعی نبوت کی تبلیغ کا اہم ترین جزو توحید نہیں' اس کو دعوائے نبوت کا کوئی حق نہیں۔

نبوت کی غرض و غایت:

انبیاء علیہم السلام کی آمد کی غرض و غایت کو شاعرانہ زبان اور خطیبانہ جوش بیان میں بہت کچھ بتایا جا سکتا ہے' لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ ان اغراض کو گنایا جائے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی مبارک کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ اصل دعویٰ وہی ہے جس کو مدعی ظاہر کرتا ہو' نہ کہ گواہ۔

انبیاء کی بعثت کی سب سے پہلی غرض اس روز الست کے بھولے ہوئے ازلی عہد و پیمان بندگی کی یاددہانی ہے۔

﴿ وَاِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّیَّتَهُمۡ وَاَشۡهَدَهُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی شَهِدۡنَا اَنۡ تَقُوۡلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنۡ هٰذَا غٰفِلِیۡنَ ﴾ (اعراف)

اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی نسلوں سے عہد لیا' اور ان کو خود اپنے اوپر آپ گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں تو ہے' ہم نے گواہی دی' کہ قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم اس کو بھول گئے تھے۔

اس لئے ضرور ہوا کہ ان کو موقع بموقع ان کا یہ وعدہ یاد دلایا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول کی بعثت کی ایک غرض یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اس کا وجود بنی آدم پر اتمام حجت ہے۔ ممکن ہے کہ آدم کے فرزند یہ بجا عذر کریں کہ ہم کو کوئی یاد دلانے والا نہیں آیا تو فرمایا۔

﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِیۡنَ وَمُنۡذِرِیۡنَ لِئَلَّا یَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ ﴾ (نساء)

رسول خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے' تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے لئے خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔

تذکیر کے بعد نبی کا فرض اولین ہدایت اور رہنمائی ہے کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفت ہادی کے مظہر اور مورد

ہیں‘ اسی لئے ایک آیت میں نبی اور رسول کے لئے ہادی کا لفظ آیا ہے‘ فرمایا

﴿ وَلِکُلِّ قَوۡمٍ ھَادٍ ﴾ (رعد)

اور ہر قوم کے لئے ایک راہ دکھانے والا آیا۔

سورۂ شوریٰ میں فرمایا۔

﴿ وَاِنَّکَ لَتَھۡدِیۡٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴾ (شوریٰ)

اور تو اے پیغمبر سیدھی راہ دکھاتا ہے۔

سورۂ انبیاء میں بہت سے پیغمبروں کے ذکر کے بعد ہے۔

﴿ وَجَعَلۡنٰھُمۡ اَئِمَّۃً یَّھۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا ﴾ (انبیاء)

اور ہم نے ان پیغمبروں کو ایسا پیشوا بنایا‘ جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے۔

اسی طرح ان آسمانی کتابوں کو جو ان کو دی گئی تھیں‘ بار بار ھُدیً (ہدایت) کہا گیا ہے‘ اور کہیں ان کو ضیاء اور نور (روشنی) کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

اس ہدایت اور رہنمائی کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ بندگان الٰہی کو باطل کے اندھیرے سے نکال کر حق کی روشنی میں لاتے ہیں۔ انسان جب فاسد خیالات‘ بیہودہ افکار‘ بےسود اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر فطری بصیرت اور روحانی معرفت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں‘ انبیاء ان اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر ان کو ظلمات سے انوار میں لاتے ہیں‘ ان کو شک کی جگہ یقین‘ جہل کی جگہ علم‘ باطل کی جگہ حق اور ظلمت کے بجائے نور عطاء کرتے ہیں۔

﴿ ھُوَ الَّذِیۡ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبۡدِہٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ﴾ (حدید)

وہی اللہ جو اپنے بندہ پر کھلی آیتیں اتارتا ہے‘ تاکہ وہ تم کو تاریکیوں سے نور میں لائے۔

اس دنیا کی نجات صرف اعتدال میں ہے۔ جب کبھی مزاج انسانی کی طرح اس کے ان عناصر میں جن سے اس کی ترکیب ہوئی ہے افراط و تفریط پیدا ہو گی‘ روئے زمین پر فساد رونما ہو گا۔ انسانی جماعتوں اور قوموں میں بھی یہ ترازو جب اعتدال کے معیار پر پوری نہ ہو گی‘ کبھی دونوں پلے برابر نہ ہوں گے۔ آسمان سے زمین تک ایک ایک ذرہ اعتدال کی ترازو میں تلا ہوا ہے۔ کیمسٹری اور علم الافلاک کا واقف کار اس ترازو کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور حیرت کرتا ہے کہ کہیں ایک ذرہ کی کمی بیشی نہیں ہے۔ جس طرح اس مادی دنیا میں یہ حیرت انگیز توازن ہے‘ ٹھیک اسی طرح روحانی اور اخلاقی دنیا میں بھی اس توازن کی ضرورت ہے۔ عقائد ہوں کہ عبادات‘ اخلاق ہوں کہ معاملات‘ اسی توازن کا نام حق اور عدل ہے‘ فرمایا

﴿ وَالسَّمَآءَ رَفَعَھَا وَوَضَعَ الۡمِیۡزَانَ ۝ اَلَّا تَطۡغَوۡا فِی الۡمِیۡزَانِ ۝ وَاَقِیۡمُوا الۡوَزۡنَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تُخۡسِرُوا الۡمِیۡزَانَ ﴾

اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی‘ کہ اس ترازو میں کمی بیشی نہ کرو‘ اور تول کو ٹھیک رکھو‘ اور ترازو کو گھٹاؤ نہیں۔

یہ توازن اور برابر تول جو بےارادہ اور بےاختیار دنیا کے ذرہ ذرہ اور اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک کام میں خالق فطرت کے اندازہ اور تقدیر سے قائم ہے‘ یہی توازن اور برابر کی تول رسولوں کے ذریعہ آئی ہوئی میزانِ شریعت

کے مطابق ذی ارادہ اور خود اختیار انسانوں کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک جنبش میں ہونی چاہئے۔ بے ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانون فطرت ہے، اور بالا رادہ دنیا کی میزان کا نام قانون شریعت ہے۔ بے ارادہ دنیا کا نظام عدل اسی خدائی میزان فطرت سے چل رہا ہے۔ اگر اس میزان میں ایک ذرہ بھی کمی بیشی ہو جائے، تو عالم کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اسی طرح انسانی دنیا کی سکینت، طمانیت، اور امن و امان کا نظام اسی میزان شریعت کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو اس کے نظام کا درہم برہم ہونا بھی لازمی ہے، فرمایا:

﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ﴾ (حدید)

ہم نے بے شبہ اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری، تا کہ لوگ عدل کو قائم کریں۔

انبیاءؑ کی بعثت کی یہ غرض و غایت کہ لوگ شریعت کی میزان کے مطابق عدل اور توازن کو قائم رکھیں، اس موجودہ دنیا ہی کے نظام کی امن و سلامتی کے لئے ہے۔ آج یورپ کے اتحاد کی گونج نے دنیا کے گوشہ گوشہ کو پرشور بنا دیا ہے، آج رسولوں کی اہمیت اور ان کی تعلیمات کی ضرورت پر شکوک و شبہات کی ژالہ باری ہو رہی ہے، لیکن وہمی و خیالی مباحث سے قطع نظر کر کے عملی حیثیت سے دنیا کی ایک ایک اقلیم اور ایک ایک آبادی کا جائزہ لو، آج جہاں کہیں بھی سچائی کی کوئی روشنی اور حقیقت کی کوئی کرن چمکتی ہے، وہ اسی مطلع خورشید سے چھن کر نکلی ہے۔ کوئی دین دار ہو یا ملحد، خوش عقیدہ ہو یا بے عقیدہ، یونان کا حکیم ہو یا افریقہ کا جاہل، یورپ کا متمدن ہو یا صحاریٰ کا وحشی، رومی ہو یا زنگی، عیسوی ہو یا موسوی، بت پرست ہو یا موحد، مجوسی ہو یا ہندو، مسلم ہو یا غیر مسلم، شہری ہو یا دیہاتی، ہمالیہ کی چوٹی پر آباد ہو یا زمین کی گہرائی میں، کہیں بھی ہو، کوئی بھی ہو، اگر وہ اللہ کے نام کی عظمت سے واقف ہے اور نیکی اور بدی کی تمیز سے آشنا ہے، تو وہ خدائی رسولوں اور ربانی پیغمبروں کے علاوہ کس معلم کی کوششوں کا ممنون ہے؟ آج جہاں بھی عدل و میزان کا وجود ہے، وہ کسی یونانی حکیم یا یورپین فلاسفر کی تعلیم و تصنیف و تقریر و خطبہ کا اثر نہیں ہے، بلکہ طبقہ انبیاء ہی کے بے واسطہ یا بواسطہ تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں کیسے ہی بدترین مبلغ سہی مگر نیکی، عدل، احسان، ہمدردی، نیکوکاری، حسن خلق کی تعلیم، تبلیغ اور دعوت ان ہی کی زبانوں سے ہو رہی ہے۔ جو رسولوں کے پیرو اور پیغمبروں کے تابع ہیں، جو عقیدہ کے ملحد ہیں ان کو بھی نیکوکاری ان ہی پیغمبروں کے نادانستہ فیضان تعلیم کا نتیجہ ہے۔ اس بنا پر جو لوگ ذہنی طور پر پیغمبروں کے منکر ہیں، وہ بھی عملی طور سے ان کی تعلیم کے مقر اور معترف ہیں، اسی لئے انبیاءؑ کا وجود تمام دنیا کے لئے رحمت بن کر ظاہر ہوا ہے۔ قرآن نے آسمانی کتابوں کو بار بار رحمۃ و ھدیٰ، رحمت اور رہنمائی کی غرض سے بھیجنے کا جو اعلان کیا ہے، وہ تمام تر اسی غرض و غایت کی تشریح ہے، اسی لئے خاتم نبوت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات والا صفات تمام عالم کے لئے رحمت بن کر آئی، فرمایا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ (انبیاء)

اور ہم نے تجھ کو (اے محمد!) تمام دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

تائید و نصرت:

انبیاء علیہم السلام جو مقصد لے کر آتے ہیں، خواہ کسی قدر مشکلات پیش آئیں، کتنی ہی رکاوٹیں ہوں، کتنی ہی

تکلیفوں اور زحمتوں کا سامنا ہو، بالآخر وہ مقصد کامیاب ہی ہوتا ہے۔ پیغمبروں کی سیرت اور ان کی دعوت کی تاریخ خود اس دعویٰ پر گواہ صادق ہے۔ قرآن نے کہا:

﴿ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ o اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ o وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ ﴾ (الصّٰفّٰت)

اور ہماری بات اپنے رسول بندوں کے لئے پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ یقیناً انہیں کی مدد ہوتی ہے، اور ہمارا لشکر ہی غالب ہوتا ہے۔

نہ صرف اس دنیا میں بلکہ حشر کے دن بھی انہیں کو اور ان کے ذریعہ اہل ایمان کو کامیابی ہوگی۔

﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُo يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ﴾ (مومن۔ ۵۲،۵۱)

اور بے شبہ ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد اس دنیا میں کرتے ہیں، اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے، جس دن گنہگاروں کو ان کے بہانے کام نہ دیں گے۔ ان پر پھٹکار ہوگی اور ان کے لئے برا گھر ہوگا۔

پیغمبروں پر ایسے بھی سخت وقت آتے ہیں، جب ان کو اپنی قوم کے قبول ہدایت کی طرف سے پوری مایوسی ہو جاتی ہے اور امید کی روشنی کسی طرف سے دکھائی نہیں دیتی، اور عذاب میں دیر ہونے کے سبب سے ان کے منکر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کو عذاب کی دھمکی جھوٹ دی گئی، تو دفعتہً امید کا دروازہ کھلتا ہے اور خدا کی تائید و نصرت کے پرے اس طرح آتے دکھائی دیتے ہیں کہ صالح لوگوں کے دل قبول کے لئے کھول دیئے جاتے ہیں، اور معاندوں پر کسی نہ کسی طرح عذاب آ کر ان کا استیصال ہو جاتا ہے، فرمایا۔

﴿ حَتّٰىٓ اِذَا اسْتَيْئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ﴾ (یوسف)

یہاں تک کہ جب پیغمبروں کو (اپنی قوم کے ایمان سے) مایوسی ہونے لگی اور ان کے منکروں کو یہ خیال ہونے لگا کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تو ہماری مدد آ گئی۔

اللہ تعالیٰ کی اسی تائید و نصرت و حفاظت دعوت کا یہ یقین ان کو ہوتا ہے کہ وہ ہر مشکل کو اس راہ میں جھیل لیتے ہیں، اور اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لئے پھرتے ہیں۔ مخالفوں کی فوج و لشکر، تیغ و خنجر اور خوف و خطر کے باوجود اپنی دعوت و تبلیغ کے فریضہ سے باز نہیں آتے، اور کسی دام پر بھی مخالفوں سے صلح پر آمادہ نہیں ہوتے۔ منکروں کو شروع شروع میں ان کی ظاہری بے چارگی اور تنہائی کو دیکھ کر ان کی ناکامی کا گمان ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ ان کے سوءظن کی تردید کر کے فرماتا ہے:

﴿ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ﴾ (ابراہیم)

سو تو مت خیال کر کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا۔

ازل کے دن ہی یہ قانون بن چکا ہے کہ سچائی کے ان پکارنے والوں ہی کی آخر جیت ہوگی۔

﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ﴾ (مجادلہ)

اللہ لکھ چکا کہ میں ہی غالب ہوں گا، اور میرے رسول۔

خاتمہ: اس تفصیل اور تشریح سے مقصود ناظرین کو نبوت کے اصلی کمالات کا ایک جلوہ دکھانا تھا۔

فلسفی را از پیمبر و اشناس   آبگینہ راز گوہر را شناس
آبگینہ را نہ پنداری بدست   جزوے کہ گوہرے آری بدست
چوں گہر آمد بدستت شب چراغ   آبگینہ شد سیہ چون پرِ زاغ
فلسفی اندربنِ چاہ نژند   نردباں دارد بخورشید بلند
نردبانش می برد تاچند ارش   پس بخاک افتدنگوں گشتہ سرش
واں پیمبرؐ خود زبام آسماں   رشتہ افگندہ سوئے خاکیاں
رشتہ جاں رابدیں رشتہ بتاب   پس برآ تابارگاہِ آفتاب
زآسمان پیغمبر آوازت دہد   فلسفی ازخاک پروازت دہد

این ز دورت رہ نماید سوئے جاں
واں بخواند خودترا ازکوئے جاں[1]

* * *

---

[1] از دیوان فارسی مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ التوفی ۱۹ جمادی الثانیہ ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء) ص ۴۶۔ ۴۷۔ مطبوعہ مطبع شمسی حیدر آباد دکن۔

شب ظلمت

پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت

اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کی ہر شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے، بارش کی خنکی سخت امس کے بعد ہی زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی ہے، روشنی کی پوری قدر شب تارہی میں ہوتی ہے اور فضا جس قدر تاریک ہو بجلی کی چمک اتنی ہی زیادہ درخشاں نظر آتی ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ ہر اصلاحی تحریک کی وقعت اور عظمت کے جانچنے میں یہ لحاظ رکھنا چاہئے کہ دنیا اس وقت کتنی گمراہی میں مبتلا اور اصلاح کی محتاج تھی اور ایسی اصلاح کی محتاج تھی جس کے لئے پیغمبرانہ دست و بازو کی حاجت تھی اور وہ بھی ایک ایسے پیغمبر کے دست و بازو کی جس کے متعلق خود خدا یہ فرما چکے۔

﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ ﴾ (فتح)

جو تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، وہ خدا کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، اور ان کے ہاتھوں کے اوپر خدا کا ہاتھ ہے۔

اسلام یا محمد رسول اللہ ﷺ کے پیغام اور تعلیم کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کی ایک عظیم الشان روحانی و اخلاقی معاشرتی دعوت تھی، اس بناء پر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت دنیا کی کیا حالت تھی؟ اس وقت کی دنیا کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا کرۂ ارضی تھا جس پر آفتاب نہیں چمکتا تھا تو بالکل سچ ہوگا، تمام دنیا میں سچے اور صحیح عقیدہ کا کہیں وجود نہ تھا، توحید کی روشنی سے دنیا کا ذرہ ذرہ محروم تھا، مصر و یونان و روم میں سورج، چاند اور مختلف سیاروں اور ستاروں کی خدائی تھی، انہیں کے معبد تھے اور انہیں کے ناموں پر بے گناہ انسانوں اور جانوروں کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں، ہر جگہ پتھر کی مورتوں اور مٹی کی صورتوں اور سونے چاندی اور جواہرات کے بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔

اس وقت کی دنیا میں اخلاق کے تین معلم تھے، رواقی، عیسائی اور بودھ مت کے پیرو، اور یہ تینوں کے تینوں تجرد، رہبانیت اور جوگی پن میں مبتلا ہو کر اس طرح عضو معطل ہو گئے تھے کہ دنیا کا دست ترقی شل ہو کر رہ گیا تھا اور ایسی سخت سنگدلانہ ریاضتوں کو نیکی اور عبادت کا مترادف سمجھ رکھا تھا کہ آج انکی تفصیلات سننے سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ مسیح نے چھ صدی قبل تزکیہ نفس کے کچھ درس دیئے تھے لیکن مدت ہوئی دنیا اس سبق کو بھلا چکی تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ موسیٰؑ نے اس سے بھی پیشتر ہدایت و نجات کی ایک شمع جلائی تھی لیکن فتنوں اور ہنگاموں کی آندھی میں یہ چراغ طور بھی جل کر گل ہو گیا تھا اور پھر یہ بھی سچ ہے کہ مدت مدید ہوئی کہ زردشت نے روحانیت کی آگ سلگائی تھی لیکن یہ شعلہ بھی انسانی خون کی چھینٹوں سے سرد ہو چکا تھا، یہ بھی سچ ہے کہ اس سے بھی پہلے بودھ نے آریہ ورت کے پہاڑوں اور غاروں میں روح کا دارالامن ڈھونڈ نکالا تھا مگر حوادث کے طوفان نے ان پہاڑوں کو بے نام و نشان صحرا، اور ان غاروں کو درندوں کا بھٹ بنا دیا تھا، ہر قوم دوسری قوم سے برسر پیکار اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا، حرص و طمع اور کشت و خون کی گرم بازاری تھی، نفس انسانی کی ملکوتی طاقت جذبات خبیثہ کے دیوتا کے سامنے پامال ہو چکی تھی، عدل و راستی اور پاکبازی و پارسائی کے عطر معنبر کی خوشبو انسان کے جامہ خاکی سے اڑ چکی تھی، توحید اور خدا پرستی کا نور دیوتاؤں،

دیویوں، ستاروں، شہیدوں، ولیوں اور مجسموں کی پرستش کی عالم گیر تاریکی میں چھپ گیا تھا، غرض دنیا کے حالات ہر طرح سے اس ضرورت کے متقاضی تھے کہ کوئی عالم کا مصلح، اخلاق کا معلم، حق کا داعی، بنی نوع انسانی کا نجات دہندہ آخری بار وجود میں آئے اور انسانیت کے شیرازہ میں جو عرصہ دراز سے پراگندہ و منتشر ہو رہا تھا، پھر نظم و انتظام پیدا کر دے اور روحانیت و خدا پرستی کے خزاں رسیدہ باغ کو از سر نو پر بہار بلکہ سدا بہار اور دنیا کے ظلمت کدہ کو پھر مطلع انوار بنا دے۔

یہ اس عہد کی دنیا کی حالت کا ایک اجمالی خاکہ تھا، تفصیل کے لئے ہمیں مختلف قوموں اور ان کے مذہبوں میں سے ایک ایک قوم اور اس کے مذہب کی تاریخ نظر کرنی چاہئے۔

ظہور اسلام کے وقت دنیا کی تمدنی اور مذہبی حالت کیا تھی؟:

محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت مصر، یونان، کلدانیا، اسیریا اور بابل کی عظمت افسانہ پارینہ بن چکی تھی خود عرب و مضافات عرب میں جو نامور حکومتیں کبھی تھیں مثلاً نابتی، حمیری، سبائی وغیرہ مدت گزری کہ ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

اس موقع پر صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ صبح سعادت کے طلوع کے وقت کون کون سی قومیں دنیا پر حکمران تھیں اور ان کی مذہبی و اخلاقی حالت کیا تھی اور دنیا کے مذاہب اس وقت کی روحانی حالت کے سنبھالنے کی کہاں تک استطاعت رکھتے تھے اس وقت روئے زمین کی اہم طاقتیں دو ہی تھیں، فارس اور روم، فارس کا مذہب مجوسیت تھا جس کا دائرہ عراق سے لے کر ہندوستان کی سرحد تک محیط تھا اور روم کا مذہب عیسوی تھا جو یورپ، ایشیا اور افریقہ کے تینوں براعظموں کو گھیرے تھا، لیکن مذہبی حیثیت سے دو اور قومیں بھی ذکر کے قابل ہیں جن میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ قدامت کا دعویٰ ہے اور وہ یہود اور ہندو ہیں۔

مجوس فارس:

عرب کی پہلی ہمسایہ سلطنت فارس تھی، جس کے تمدن کا ستارہ ایک زمانہ میں اوج کمال پر تھا، مگر عہد بعثت سے ڈیڑھ سو برس پہلے سے ساسانی شان و شوکت اور کیانی جاہ و جلال مٹتے مٹتے سایہ سا رہ گیا تھا، مسلسل بغاوتوں، سفاکانہ خونریزیوں اور سیاسی بدامنیوں نے اس کو تہ و بالا کر دیا تھا بادشاہوں کے ظلم ستم اور امراء کی عیاشیوں اور خود غرضیوں نے صداقت، اخلاق اور ہر قسم کے اخلاقی جوہر کو جس کے خمیر سے قوم کی زندگی کی تعمیر ہوتی ہے، فنا کر دیا تھا۔

ایران میں بابل کے اثر سے ستارہ پرستی بہت عام تھی، اسی کا اثر ہے کہ فارسی لٹریچر میں افلاک اور ستاروں کی کارفرمائی آج تک نمایاں ہے، زردشت نے اس تاریکی میں اپنی آگ روشن کی، اور نور و ظلمت یا خیر و شر کے دو خالق یزداں و اہرمن اس کے دو خدا اور آگ اس کی مسجود بنی، اسلام سے کچھ صدیاں پیشتر مانی نے مسیحیت اور مجوسیت کی آمیزش سے مذہب کا ایک نیا مرقع تیار کیا تھا جس میں نور و ظلمت کے فلسفہ کا ایک ایسا گورکھ دھندا بنایا تھا جس سے اخیر اخیر تک اس قوم کو نکلنا[1] نصیب نہ ہوا۔ اس کی تعلیم یہ تھی کہ دنیا سے گوشہ گیری کر کے اس کو ویران و برباد اور ترک ازدواج سے نسل انسانی

---

[1] کتاب الفہرست ابن ندیم ذکر مانی و کتاب البدء والتاریخ مقدسی ذکر فرقہ مانویہ۔

کو منقطع کر دیا جائے تا کہ بدی کا خاتمہ ہو جائے[1] اخلاقی حیثیت سے محرمات کا وجود ہمیشہ ان کے ہاں مختلف فیہ رہا باپ کا بیٹی کو اور بھائی کا بہن کو اپنی زوجیت میں لینا، وہاں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی[2] یہ سن کر کس قدر حیرت ہوگی کہ یزدگرد ثانی جو پانچویں صدی عیسوی کے اوسط میں وہاں کا بادشاہ تھا اس نے اپنی بیٹی سے اپنا عقد کیا اور پھر اس کو قتل کر ڈالا عورتوں کو اس قوم اور اس مذہب میں جو حیثیت حاصل تھی، وہ ان افسانوں اور مقولوں سے ظاہر ہے، جو ایرانی ادبیات کا اب بھی جز ہیں، اور جو شاہنامہ کے اوراق میں اب بھی ہر شخص کو نظر آ سکتی ہے، عورتوں کی بے وفائی بداخلاقی اور ان پر عدم اعتماد پرانے ایرانی تمدن کا سب سے بڑا جزو تھا۔

سلاطین اور امراء درجہ بدرجہ رعایا کے خدا اور دیوتا تھے، جن کو سجدے کئے جاتے تھے[3] ان کی الوہیت کے گیت گائے جاتے تھے، ان کے دربار میں کوئی بیٹھ نہیں سکتا تھا، ان کے خلاف کوئی لب کشائی کی جرات نہیں کر سکتا تھا، ان کے جرائم پر ان کو سزا نہیں دی جا سکتی تھی اور رعایا ان کے مظالم کے سامنے دم نہیں مار سکتی تھی۔

ملک کا بڑا حصہ رومی عیسائیوں کی دائمی جنگ سے پریشان حال تھا، اور گرجاؤں اور آتش کدوں کی باہمی آویزش کا غیر مختتم سلسلہ قائم تھا، جب رومی فاتح ہوتے تو آتش خانے ٹوٹ کر کلیسے بن جاتے اور جب ایرانی غالب آتے تو کلیسے ٹوٹ کر آفتاب دیوتا کے معبد اور آتش خانے تعمیر ہو جاتے، یہودیوں پر جو مظالم توڑے جاتے تھے، اس کا ایک مختصر سا نقشہ توراۃ کے قصۃ البر میں نظر آتا ہے اور بعد کو مفتوح عیسائیوں پر وہ جس جس طرح ظلم کرتے تھے، اس کی تفصیل گبن کے اوراق میں منتشر طور پر ملے گی۔

بعثت سے پہلے جہانبانی کا قرعہ قباد اوّل بن فیروز کے نام پڑا، بیرونی حملوں اور اندرونی بدنظمیوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا گیا، آخر رعایا نے قباد کو قید کر دیا[4] قباد نے قید خانہ سے بھاگ کر تاریوں کے پاس پناہ لی اور ان کی اعانت سے دوبارہ تاج حاصل کیا، لیکن ملک پر اس سے بھی زیادہ مصیبت یہ نازل ہوئی کہ اس عہد میں مزدک نام ایک شخص پیدا ہوا، جو اس امر کی تعلیم دیتا تھا کہ دولت اور عورت کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں بلکہ ان کو تمام جماعت میں مشترک ہونا چاہئے، چنانچہ ایک شخص کی بیوی مزدک کے عقائد کی رو سے ہر شخص کے ساتھ ہم بستر ہو سکتی تھی، عیش پرست اور ہوس ران امراء اور عوام دونوں نے اس کو خوشی خوشی قبول کر لیا[5] اس مذہب نے بہت جلد شاہی سایہ میں ترقی حاصل کی اور خود قباد نے اس دین کی ترویج اور اشاعت میں نمایاں حصہ لیا، قوم کی اخلاقی حالت پر اس تعلیم کا جو اثر پڑ سکتا تھا، وہ ظاہر ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارا ملک عیش پرستی اور ہوس رانی کے نشہ میں سرشار ہو گیا۔

---

[1] تاریخ عزر اخبار الفرس ثعالبی مطبوعہ پیرس ص ۵۰۲

[2] ایضاً صفحہ ۲۷ ابوداؤد میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں حکم دیا کہ مجوسیوں کو اس فعل شنیع سے باز رکھا جائے (کتاب الخراج والامارۃ والفئی جلد دوم ص ۲۶)

[3] مورخوں کی تاریخ عالم ج ۸ ص ۸۴

[4] غرر اخبار الفرس ثعالبی ص ۵۰۰ پیرس

[5] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدھم جلد ۲۱ ص ۲۲۳

۵۳۱ء میں قباد کی جگہ نوشیرواں نے لی' ایرانیوں میں اس کی عدل پروری اب تک مشہور ہے مگر اس کو یہ مبارک لقب اپنے عزیزوں اور افسروں اور ہزاروں بے گناہوں کے قتل کی بدولت ملا' مزدکی فتنہ کو اس نے تلوار کے زور سے دبانا اور کیش زردشتی کو دوبارہ فروغ دینا چاہا مگر خود اس کا بیٹا نوشزاد تثلیث پرستی کی طرف مائل تھا' اس کی پاداش میں قید ہوا اور قید سے بھاگ کر ایک عیسائی فوج لے کر زردشتیوں سے صف آراء ہوا اور مارا گیا۔[1]

۵۷۹ء میں نوشیرواں نے وفات پائی اور ایران کا تخت ہرمز چہارم کے حصہ میں آیا' اغیار کی دست اندازیوں کے ساتھ اندرونی بدنظمی اور باہمی خانہ جنگی' بادشاہوں کی تغافل شعاری اور امراء کی عیش پرستی اور عوام کے اخلاقی انحطاط میں برابر ترقی ہوتی گئی' یہاں تک کہ ۶۳۶ء میں مجاہدین اسلام کی فتح مندی کے طوفانی صرصر کے سامنے ملک فارس کی یہ ٹمٹماتی ہوئی شمع ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔

اوپر کے بیانات سے معلوم ہوگا کہ ایران کی سرزمین نغمہ توحید سے کبھی گوش آشنا نہیں ہوئی' اخلاق کے متعدد ابواب ہیں جو ان کے آئین میں کبھی داخل نہیں ہوئے' یزداں واہرمن' نور وظلمت اور خیر وشر کی بھول بھلیوں نے ان کو ہمیشہ سرگرداں رکھا' حکومت اور شاہی کے متعلق ان کا تخیل خدائی کا ہم رتبہ تھا' اسلام وفارس کی جنگ میں مغیرہ بن شعبہ مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر جب سپہ سالار ایران کی بارگاہ میں گئے اور آزادی کے ساتھ جا کر اس کے ساتھ بیٹھ گئے تو ایرانی امیروں کو اس میں اپنے نائب السلطنت کی توہین نظر آئی اور ان مغیرہ کو سامنے سے ذلت کے ساتھ اٹھا دیا' انہوں نے جواب میں کہا ہم ''عربوں کا یہ دستور نہیں کہ ایک خدا بن کر بیٹھے اور دوسرے اس کے سامنے غلامی اور بندگی کریں۔''[2]

آنحضرت ﷺ کی ولادت سے تقریباً ڈیڑھ صدی پیشتر سے ایران میں جس قسم کا سیاسی انحطاط شروع ہو گیا تھا وہ روز بروز بڑھتا ہی گیا' اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ فارس کے روحانی آتش کدہ میں اب زندگی کی کوئی چنگاری باقی نہیں رہ گئی تھی' اس لئے جب اسلام کا نور طلوع ہوا تو اس کے شیوع کے لئے کوئی دوسرا پردہ بیچ میں حائل نہ ہوا' سرجان ملکم جن کا مسیحی تعصب عساکر اسلامی کو ان کی زبان سے ''قزاقانِ عرب'' کا لقب دلواتا ہے' فتح فارس کے متعلق حسب ذیل رائے دیتے ہیں۔

یزدجرد ثالث کا عہد حکومت اس لئے یادگار رہے کہ اسی زمانہ میں فارس کی قدیم شہنشاہی کا تختہ برہنہ تن ''سوسمار خواروں'' کے ایک دستہ نے الٹ دیا کہ اسی تحقیر آمیز لقب کے ساتھ عرب قبائل کے یہ مغرور ہمسائے ان کا ذکر کرتے تھے' اس انقلاب عظیم کی علت کوئی معمولی سبب نہیں ہو سکتا (مسلمان) فارسی مورخین کچھ تو اپنے حب وطن اور کچھ اپنی وہم پرستی کی بناء پر اس واقعہ کو ایک معجزہ عظیم خیال کرتے ہیں جس کے ذریعہ سے خدا نے محمد کی صداقت کو ظاہر کر دیا تھا لیکن جو لوگ دنیاوی حیثیت سے اس واقعہ پر غور کرتے ہیں انہیں فوراً نظر آ جاتا ہے کہ فارس کی ایسی سلطنت جو عیش پرستی کے ہاتھوں لاغر ونحیف ہو چکی ہو' جس میں اندرونی مناقشات کے باعث بدنظمیاں پھیلی ہوئی ہوں جو بیرونی محاربات سے یکسر خستہ و ناتواں ہو اور جو اپنی کبرسنی اور نقاہت سے قصر زوال کی جانب خمیدہ پشت ہو' اس کے لئے پرجوش ''قزاقان عرب''

---

[1] غزر اخبار الفرس ثعالبی ص ۵۹۸ پیرس۔

[2] تاریخ طبری واقعات ۱۴ھ صفحہ ۲۲۷۴ مطبع بریل۔

کی مدافعت کرنا سخت دشوار تھا [1]

مگر سوال یہ ہے کہ پاک نژاد ساسانیوں کی خستگی و ناتوانی اور نقاہت و کمزوری قزاقان عرب ہی کی ترقی کی تمہید کیوں بنی؟ کیا نہتے عربوں کے پاس اس سے زیادہ سامان جنگ اور سپاہی تھے' جو عراق و ایران کے اخیر معرکوں میں بھی ایرانی عربوں کے مقابلہ میں لاتے رہے؟ واقعہ یہ ہے کہ زرتشت کی آگ میں اب گرمی نہیں باقی رہی تھی' نور و ظلمت' خیر و شر' نیکی و بدی کے فلسفہ نے ایران کی ہر قسم کی عملی طاقت فنا کردی تھی "یزداں اور اہرمن" کی دوعملی حکومت نے روحانی امن و امان کی سلطنت برباد کردی تھی' بیسیوں چھوٹے بڑے فلسفیانہ مذہبی فرقے پیدا ہوگئے تھے جن میں سب سے اہم مانوی فرقہ تھا' جو عیسائیت اور مجوسیت کا معجون مرکب تھا' آخر میں مزدکی فرقہ کی بہیمانہ تعلیم نے ایران کی اخلاقی روح کو اور بھی موت کے قریب کردیا [2] نوشیرواں نے تلوار کی نوک سے اس فتنہ کو دبایا اور اس کے صلہ میں "بادشاہ عادل و دادگر" کا خطاب پایا تاہم ایران کی روحانی زندگی ان خون کے چھینٹوں کے بعد بھی اسی طرح تشنہ لب رہی جس طرح پہلے تھی اور منتظر تھی کہ دنیا کے خشک صحرائے عرب سے چشمہ ابل کر ادھر آئے تو وہ اپنی پیاس بجھائے۔

عیسائی رُوم:

آغاز اسلام کے وقت جس قدر ایران کی جسمانی و روحانی شہنشاہی کے اوراق منتشر و پراگندہ تھے روم کی قبائے سلطنت اس سے کچھ کم کرم خوردہ نہ تھی حالانکہ یہ وہی رومۃ الکبریٰ ہے جو یونان کے زوال کے بعد دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سمجھی جاتی تھی، اور جس کے ایک تاجدار جولیس سیزر کا نام ہمیشہ کے لئے قیصر کی صورت میں بادشاہ و شہنشاہ کا مرادف بن گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اسی سلطنت میں مبعوث ہوکر دنیا کو امن و سلامتی کا پیام سنا کر رخصت ہوئے' ان کے رفع و صعود کے بعد ہی ان کے شاگردوں میں فرقہ آرائیاں شروع ہوئیں اور بالآخر پال نے جو ایک نو عیسائی یہودی تھا' اس طرح عیسائیوں پر غلبہ پایا کہ اس کے بدعات کی خاک میں اصل عیسویت ہمیشہ کے لئے دفن ہوگئی اور باپ بیٹے روح القدس کا مشرکانہ عقیدہ اس میں داخل ہوگیا اور توراۃ جس کا کوئی نقطہ خود حضرت عیسیٰؑ بھی مٹا نہیں سکتے تھے [3] وہ ان کی روحانی شاگردی کے مدعی (پال) کے ہاتھوں ہمیشہ کے لئے لعنت [4] قرار پائی' ۲۳۵ء میں رومی سلطنت کے مشرقی و مغربی دو حصے ہوگئے' مشرقی حصہ کے تاجدار قسطنطین اعظم نے عیسائی مذہب اختیار کیا اور رفتہ رفتہ پوری رومی حکومت میں یہ مذہب پھیل گیا' مگر درحقیقت اس مشرقی تاجدار روم کے اس قبول مذہب کا جذبہ اخلاص و صداقت سے زیادہ سیاست اور سلطنت کی مصلحت پر مبنی تھا' نتیجہ یہ ہوا کہ اب باپ بیٹے اور روح القدس کی تثلیثی الوہیت میں ہر نیا ملک جو فتح ہوتا' اس کا دیوتا کسی نہ کسی نام اور رسم سے اس مذہب میں شامل ہوجاتا تھا تخت سلطنت کے غیر متوقع حصول نے مذہبی خاکساروں میں یہ حوصلہ پیدا کردیا کہ کلیساؤں نے مذہبی شہنشاہی کا خواب دیکھنا شروع کردیا اس کے لئے عقائد کی

---

[1] ملکم صاحب کی تاریخ ایران جلد اول صفحہ ۱۳۳۔

[2] تفصیل کے لئے فہرست ابن ندیم دیکھو صفحہ ۴۴۲ مصر۔

[3] انجیل متی ۵۔ ۱۷۔ ۱۸۔

[4] یہ مضامین عیسائیوں کی انجیل کے حصہ اعمال اور خطوط میں جابجا بتصریح مذکور ہیں۔

وہ لڑائیاں کھڑی کی گئیں کہ شاہانہ سایہ میں بیٹھ کر کونسلوں نے خدا کے دین کا خاکہ تیار کیا' اتحاد اور اجتماع کی ہر نئی کوشش' نئی مذہبی تفریق کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور ایک عیسوی مذہب ایک صدی کے اندر اندر بیسیوں فرقوں میں تقسیم ہو گیا۔

۳۳۷ء میں قسطنطین کی وفات پر مذہبی خانہ جنگی کے ساتھ ساتھ رومیوں کی سیاسی خانہ جنگیوں کی زیر خاکستر آگ بھی زور و شور سے شعلہ زن ہوئی' اعیان سلطنت میں مختلف گروہ بندیاں ہو گئیں' اور باہمی نفاق اور فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو گیا' بالآخر سلطنت روم مختلف صوبوں میں تقسیم ہو کر مختلف دعویدارانِ حکومت کے حصہ میں آئی [1] نا قابل فرماں راوؤں کی کمزوری دیکھ کر ایک طرف گوتھ' ونڈال وغیرہ بعض وحشی قوموں نے حملے شروع کئے اور دوسری طرف خود دور افتادہ صوبوں کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہو گئی' نتیجہ یہ ہوا کہ پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں سلطنت روم کا مغربی بازو جو برطانیہ اور فرانس وغیرہ پر مشتمل تھا' بالکل کٹ گیا اور خود روم کا دارالحکومت دشمنوں کے حملے سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس وقت یعنی پانچویں صدی کے بیچ میں لوگوں کو صاف نظر آ رہا تھا کہ ان کے مورث اعلیٰ نے بارہ کرگسوں کو خواب میں دیکھا تھا اور جس کی بناء پر اس زمانہ کے کاہنوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ سلطنت بارہ صدیوں تک قائم رہے گی' اب اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کا وقت آ گیا مورخ گبن اس زمانہ کی تصویر ان لفظوں میں کھینچتا ہے۔

> ''اس پیشین گوئی نے جس پر اس قوم نے اپنے عروج و اقبال کے زمانہ میں کبھی اعتناء بھی نہ کی تھی' اب بارہ صدیوں کے خاتمہ پر جب کہ ہر طرف سے ذلت و بدقسمتی کا سامنا تھا' اہل روم کو یاس آمیز جذبات سے پُر کر دیا لیکن ان کے زوال کی علامتیں کرگسوں کے خواب سے زیادہ واضح و نمایاں موجود تھیں' رومن حکومت مخالفین کی نظروں میں روز بروز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر میں زیادہ ظالمانہ اور نا قابل برداشت ہوتی جاتی تھی کفایت شعاری جتنی زیادہ ضروری ہوتی جاتی تھی' اسی نسبت سے اس کی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے اسی نسبت سے ٹیکس میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ [2]

امراء نے اپنے مصارف کا بار بھی عام رعایا پر ڈالنا شروع کیا جس کے باعث وہ اپنی قلیل آمدنی سے بھی محروم ہو گئی اس کی عدم ادائیگی کی صورت میں رعایا پر اس قدر جبر کیا جاتا تھا کہ اس کے دل میں حکومت کی طرف سے نفرت و عداوت پیدا ہو گئی یہاں تک کہ وہی رومن قوم جو کبھی اپنے اس لقب پر فخر کرتی تھی' اب اپنے کو اس قوم کی طرف منسوب کرتے شرمانے لگی اور رومن حکومت پر ہر وقت وحشی سے وحشی سلطنت کی محکومیت کو ترجیح دینے لگی' امراء' وزراء اور سلاطین خود اپنی ناعاقبت اندیشیوں سے رعایا کو اپنا دشمن بناتے اور جب بغاوت ہوتی تو فوج کشی کرتے اور ناکام رہتے' غرض اندرونی بدنظمیوں سے ملک کی یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ گبن کے الفاظ میں:

> ''اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین بھی فنا ہو جاتے تو ان کی مجموعی معدومیت بھی سلطنت کو مغربی بازو کی زوال و بربادی سے بچا نہیں سکتی تھی [3]

پانچویں صدی کے خاتمہ پر مغربی حصہ کے نکل جانے کے بعد مشرقی صوبوں تک یعنی ڈینوب سے لے کر جلہ و

---

[1] گبن کی تاریخ زوال و انحطاط سلطنت روم جلد اول صفحہ ۴۸۸۔۴۹۱

[2] ایضاً جلد ۲ باب ۳۶ و باب ۳۷

[3] گبن کی تاریخ زوال و انحطاط سلطنت روم جلد ۲ صفحہ ۴۶۱۔

نیل تک کی سرزمین روم کے ماتحت رہ گئی تھی لیکن اس کی حالت بھی روز بروز نازک سے نازک تر ہوتی جاتی تھی، مورخین کا بیان ہے کہ رومن فوج کی مجموعی تعداد جوایک زمانہ میں ۶۴۵۰۰۰ تھی، اب شاہ جسٹینین کے زمانہ میں (یعنی ۵۲۷ء) میں گھٹ کرایک چوتھائی سے کم یعنی ۱۵۰۰۰۰ رہ گئی تھی اور وہ بھی نہایت متفرق وابتر حالت میں۔ رعایا کی جیبیں خالی تھیں، فوج کی تنخواہیں چڑھتی جارہی تھیں اورامراء واعیان سلطنت اپنے ذاتی مصارف کے لئے ہر طرح کے جعل وفریب، رشوت ستانی اورلوٹ مار کو جائز رکھتے تھے، فوج میں یوں تو بہت سے سپاہیوں کے نام لکھے ہوئے تھے، لیکن میدان جنگ میں جانے کے وقت بہت تھوڑے سے لوگ تیار ہوتے، فوجی افسرفنِ جنگ کے بجائے اپنا وقت باہمی حسد ورقابت میں صرف کرتے اور ہرافسر کی یہ کوشش رہتی کہ دوسرے افسر کی بدنامی وذلت سے فائدہ اٹھا کر خودترقی ومنصب حاصل کرلے۔ [۱]

اندرونی بدنظمیوں پر مستزاد نہ تھا کہ بیرونی غنیم اہل روم کوایک دم کے لئے چین سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے، روم و فارس کے درمیان مدت سے لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا، پھرلومبارڈس، گوتھیس اور ونڈالس وغیرہ کے پیہم حملے روم کی رہی سہی قوت کو اور بھی پامال کررہے تھے۔

الغرض چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ پر یعنی خاتم النبیین ﷺ کی ولادت سے دو چار سال بعد روم بقول گبن کے اپنے زوال کے پست ترین نقطہ تک پہنچ گیا تھا اور گبن کی زبان میں اس کی مثال بعینہ اس عظیم الشان درخت کی ہوگئی تھی، جس کے سایہ میں ایک وقت تمام اقوام عالم آباد تھیں مگراس پرایسی خزاں آئی کہ برگ وبار کے ساتھ اس کی شاخیں اور ٹہنیاں بھی رخصت ہوگئی تھیں اوراب خالی تنا خشک ہورہا تھا خود پایہ تخت کے اندر غنیم کے گھس آنے کا ایسا خوف تمام آبادی پر چھایا ہوا تھا کہ تقریباً کل کاروبار بند ہوگئے تھے، وہ بازار اور تماشا گاہیں جہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی اب ویران اور سنسان پڑی تھیں، عیش پرستی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک عرصہ سے تاہل کے بجائے تجرد کی زندگی زیادہ پسند کرتے تھے تاکہ زیادہ آسانی اور آزادی کے ساتھ اپنے شہوانی جذبات کی تشفی کرسکیں۔ [۲]

ملک کی عام سیاسی واخلاقی حالت سے قطع نظر کرکے جب ہم مذہبی پہلو پر نظر کرتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ دلخراش تصویر نظر آتی ہے۔ بت پرست رعایا کو چھوڑ کر جو ستاروں، دیوتاؤں اور بتوں کی پوجا میں بدستور مصروف تھی، اور لوگ جنہوں نے عیسائیت قبول بھی کرلی تھی، وہ باپ بیٹا روح القدس اور مریم کی خدائی کے معتقد تھے حضرت عیسٰی اور مریم وروح القدس کی شخصیت اورمرتبہ کے تعین نے بیسوں فرقے پیدا کردیئے تھے جن میں زبانی مناظروں سے گذر کر جنگ و جدل کی نوبت آ گئی تھی یہاں تک کہ ۵۱۴ء میں خود عیسائیوں کے دوگروہوں کے درمیان ایک عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑی جس میں ۶۵۰۰۰ عیسائیوں کو خارج البلد ہونا پڑا [۳] اس جنگ عظیم کے علاوہ ہمہ وقت ہرفریق دوسرے فریق کے خون کا پیاسا رہا کرتا اور بارہا چھوٹی چھوٹی باتوں پر کشت وخون کی نوبت آجاتی، پادریوں نے اپنے منصب مذہبی کو حصول جاہ کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا اور اس بناء پر محض حب جاہ کی خاطر وہ ہرطرح کی ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے تھے،

---

[۱] گبن کی تاریخ زوال وانحطاط سلطنت روم جلد ۲ صفحہ ۴۶۱۔

[۲] گبن جلد ۳ صفحہ ۳۲۷۔

[۳] گبن جلد ۳ صفحہ ۳۴۴۔

ان پادریوں کے ایک اسقف اعظم سینٹ سرل نے جو جو سفاکیاں کی ہیں ان کی تفصیل کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہے' ایک مرتبہ اس نے اپنے مریدوں کو ہمراہ لے کر غیر مسلح یہودیوں پر دھاوا کیا اور ان سب کو جلاوطن کر دیا اور ان کا مال اسباب سرل کے مریدوں کے ہاتھ لگا اور ان کے معابد زمین کے برابر کر دیئے گئے' سرل کا حریف ارسٹس نامی پادری تھا' ایک روز جب ارسٹس راستہ سے گذر رہا تھا تو ۵۰۰ راہبوں کی جماعت اس پر ٹوٹ پڑی اور اپنی سنگ باری سے اس کو خون میں نہلا دیا[1] سرل کی ایک خاتون دوست ہلیشیا نامی تھی ایک روز وہ اپنی درسگاہ سے واپس آ رہی تھی کہ راہبوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس پر حملہ کر دیا' گاڑی سے اتار کر برہنہ کی گئی اور اس حالت میں تمام شہر کی سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے اسے کلیسا میں لائے جہاں پہنچ کر پادری پیٹر کے گرز سے اس کا خاتمہ کر دیا گیا' قتل کے بعد اس کا گوشت ہڈیوں سے جدا کیا گیا' نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اور آلائش جسم کو آگ میں ڈال دیا گیا[2] یہ ایسے واقعات ہیں جن کے ذکر سے آج قلم لرزتا ہے مگر یہ عیسائی مذہب کے علمبرداروں کا سب سے روشن کارنامہ ہے' یہی حالت ان تمام ملکوں کی تھی جہاں رومیوں کے زیر سایہ عیسوی مذہب پھیلا ہوا تھا' یعقوبی' نسطوری اور دوسرے فرقے جو سرکاری عیسوی مذہب سے الگ تھے' وہ دور دراز صوبوں اور ملکوں میں پناہ ڈھونڈتے تھے' نائیس کی کونسل کے بعد آریوس اور اس کے حریفوں میں جو معرکہ آرائیاں ہوئیں' انہوں نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ''شہزادہ امن'' کا مذہب ان جنگجوؤں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے سے بچ نہیں سکتا۔

مسٹر مارس جو پیغمبر اسلام کو نعوذ باللہ بہت بڑا مکار قرار دیتے ہیں اپنی ''تاریخ ہندوستان'' میں ضمناً ایک موقع پر تحریر کرتے ہیں۔

> ''اس نازک موقع پر (یعنی ظہور اسلام کے وقت) ان بے باکانہ بدعات کے درمیان جو چرچ کو نجس کر رہے تھے اور اختلافات کے اس غیر منقطع سلسلہ کے درمیان' جو چرچ میں ایک ہلچل ڈالے ہوئے تھے اگرچہ مشرق میں اصلی مسیحیت کی شعاع نظر آتی تھی لیکن بہت ہی مدھم' روم کے قیصروں کی قوت کچھ تو اندرونی نزاعوں اور کچھ بیرونی حملوں کے باعث اپنی بنیاد سے اکھڑ کر قصر فنا کی طرف تیز رفتاری کے ساتھ جا رہی تھی' یہود بے صبری کے ساتھ گلیلی کے اس حقیر شخص کے مذہب پر نظر کر رہے تھے جس کے دین کو اب شاہ قسطنطین کے مسیحی ہو جانے کے بعد پوری شان و شوکت اور شاہی عظمت حاصل ہو گئی تھی اور ہر اس تحریک کی مدد کے لئے تیار تھے جو ایسے قابل نفرت مذہب کا خاتمہ کرنا چاہے' اہل فارس نہایت غیظ و غضب کے ساتھ ان پر جوش اور ناروادار فتح مند عیسائیوں کو دیکھ رہے تھے' جنہوں نے ان کے معبود ''آتش شمسی'' کی بے حرمتی کی تھی اور شرک کی ساری دنیا اپنے برباد شدہ معبودوں اور ڈھے ہوئے معبودوں پر ماتم کر رہی تھی اور ان کے انتقام کے لئے آمادہ اور مستعد تھی۔''[3]

مارس صاحب خود واقعات کی نقشہ کشی میں خواہ کتنا ہی مسیحی رنگ بھریں لیکن نفس واقعات کی صحت ان کو شاید ہم سے بھی زیادہ مسلم ہے۔

---

[1] ایضاً ص ۳۲۷۔

[2] ایضاً نیز ڈریپر تاریخ معرکہ آرائی مذہب و سائنس صفحہ ۱۵۵۔

[3] مارس کی تاریخ ہندوستان جلد اول صفحہ ۱۸۳۔

بہرحال مورخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدی تک مسیحیت کی جو حالت رہی ہے وہ اس کے لئے باعث ننگ ہے مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی' اصل رومی بت پرستانہ عقیدوں نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا' حضرت مسیح کی ناسوتی اور لاہوتی دو عنصروں کی تکلیل' مصر کو قابو میں لانے کے لئے کی گئی تھی جس سے حضرت مسیح کے ''وہی ایک ہے'' کی تعلیم ہمیشہ کے لئے ان کے مذہب سے مٹ گئی' ضعیف الاعتقادی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ قبر پرستی عام ہو گئی تھی اور ہر بڑے پادری سے اس کی وفات کے بعد دعا مانگی جاتی تھی' ملک شام میں جو بڑے پادری اور بطریق تھے ان کے معتقد ان کو سجدے کرتے تھے'[1] مسیح و مریم روح القدس اور حواریین اور مسیحیت کے دیگر اساطین کے مجسمے بنا کر ان کی پرستش اس کثرت سے ہونے لگی کہ اس کی نظیر زمانہ بعد کے رومن کیتھولک فرقہ کی بت پرستی میں بھی نہیں ملتی۔[2]

سیل صاحب ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

> ''گرجا کے پادریوں (CLERGY) نے مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن' محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا' اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اس کے متعلق اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے تھے' اسی تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو رومن چرچ کے لئے باعث ننگ ہیں' مذہبی صورت میں قائم کئے گئے خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی سے ہونے لگی۔ نیس کاؤنسل کے بعد مشرقی چرچ روزانہ کے مناظرات میں مشغول ہو گیا اور ایرینس' سلیس' نسطورینس اور یوٹیکینس کے جھگڑوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا انصاف علانیہ فروخت کیا جاتا تھا اور ہر طرح کی بدعنوانیاں ہوتی تھیں مغربی چرچ میں ڈینس اور ارسلیسی نس نے بشپ کی جگہ حاصل کرنے کے لئے قتل تک نوبت پہنچا دی اور آخر ڈینس کی فتح ہوئی' اس موقعہ پر کہا جاتا ہے کہ سیسی نینس (SICININUS) کے گرجا میں ایک روز میں ۱۳۷ آدمی قتل ہوئے پائے گئے اور کوئی حیرت نہیں کہ یہ لوگ ان جگہوں کے اس قدر خواہاں ہوتے تھے' اس لئے اس ذریعہ سے ان کو گراں بہا تحفے ملتے تھے' اپنی گاڑیوں پر نہایت تزک واحتشام سے نکلتے تھے اور ان کے دسترخوان پر بادشاہوں سے زیادہ شان و شوکت ہوتی تھی۔ ان مناقشات کا سبب زیادہ تر شہنشاہ ہوا کرتے تھے۔ جسٹینین کے وقت میں حالت اور زیادہ خراب ہو گئی اس کے نزدیک اپنے عقیدہ کے مخالفوں کو مار ڈالنا کوئی جرم ہی نہ تھا۔

> بادشاہوں اور پادریوں میں عقائد اور اخلاق کی جو برائیاں پھیلی ہوئی تھیں اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عوام کی حالت بھی مبتذل ہو گئی' ان کا مقصد صرف روپیہ پیدا کرنا رہ گیا خواہ کسی ذریعہ سے ہو اور اس روپیہ کو وہ نفاست اور عیاشی پر اڑاتے تھے۔ عقائد کی خرابی کے علاوہ روم اور فارس کی سلطنتیں بھی کمزور ہو گئی تھیں شہنشاہ قسطنطین کے بعد روم کی سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی' عام طور سے اس کے جانشین بزدلی اور مظالم کے لئے مشہور تھے' آنحضرت ﷺ کے وقت تک ملک کا مغربی حصہ گاتھ (GOTHS) لوگوں نے روند ڈالا تھا، یونانیوں کی عیش پسندی اور اخلاقی خرابیوں نے ان کی قوت کو زائل کر دیا تھا۔ رومیوں نے عیسائی مذہب کو جس صورت میں قبول کیا تھا' اس کی تصویر ڈریپر کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔ ''دونوں (عیسائیت اور بت پرستی) کی باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا، جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر

---

[1] سنن ابن ماجہ باب حق الزوج علی المراۃ۔

[2] سیل صاحب کا انگریزی ترجمہ قرآن مقدمہ صفحہ ۲۵' ۲۶۔

> تھیں[1] جوں جوں زمانہ گذرتا گیا وہ مذہبی عقائد جن کی تفصیل ٹرٹلین نے بیان کی ہے متغیر ہو کر ایک عام پسند مگر پایہ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے، ان عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا .... عقیدۂ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچہ میں ڈھال لیا گیا مریم عذرا کو تو (خدا کی ماں) کا لقب دیا گیا۔[2]

اسی زمانہ میں ایک گروہ "مریمی" کے نام سے پیدا ہوا جو کہ حضرت مریم کو بھی شریک الوہیت کر کے بجائے اقانیم ثلاثہ کے، اقانیم اربعہ کا اعتقاد رکھتا تھا، جس کی تردید قرآن پاک نے سورۂ آل عمران میں فرمائی ہے، اسی کے ساتھ اور بہت سے معتقدات رومی بت پرستوں سے لے کر عیسائیت میں داخل کئے گئے اور نام بدل بدل کر رومی بت پرستوں کے دیوتاؤں کے رسوم مقدس عیسائی کلیساؤں میں جگہ پانے لگے اور ان مسائل میں بھی مختلف فرقوں کے اندر اختلاف باہمی نہایت شدومد سے پیدا ہوئے، یہاں تک کہ ان مذہبی مناقشات کے تصفیہ کے لئے حکومت کو بارہا دست اندازی کرنی پڑتی تھی، رفتہ رفتہ رشوت ستانی کا بازار گرم ہو گیا اور یہ حالت ہو گئی کہ جو شخص کسی بڑے دنیاوی عہدہ دار کے پاس جتنا رسوخ وتقرب حاصل کر سکتا اسی نسبت سے اس کو بڑی دینی خدمت مل جاتی۔[3]

یہ تو مسیحی دنیا کے مشرقی حصہ کا حال تھا، مغربی حصہ کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی، یہاں رومن امپائر کی ماتحتی میں مذہبی مناصب کے لئے کشت وخون ایک عام ومعمولی واقعہ تھا، یہاں تک کہ بعض دفعہ مقتولین کی تعداد کسی سخت خونریز جنگ کے مقتولوں کے مساوی پہنچ جاتی، چنانچہ ایک مرتبہ جب ایک اعلیٰ مذہبی عہدہ کے لئے دو پادریوں کے درمیان مقابلہ ہوا تو صرف ایک دن میں ۱۳۷ آدمی کام آئے[4] اس سفاکانہ جدوجہد کا باعث صرف یہ تھا کہ اس زمانہ کے مذہبی عہدے اکتساب زر، حصول لذائذ اور کسب جاہ کے بہت بڑے ذرائع تھے، چنانچہ جتنی نفیس غذائیں پادریوں کے دسترخوان پر رہتی تھیں، اتنی بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی تھیں۔[5]

سلاطین اور مذہب کے حاکمین کے اخلاق کا پرتو عام رعایا اور پیرووں پر لازمی طور پر پڑتا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ بداخلاقی، اسراف اور ہوس پرستی مسیحی دنیا کی آب وہوا میں سرایت کر گئی، لوگ ہر طرح کے ناجائز وسائل سے روپیہ کماتے اور کمال بے دردی کے ساتھ اپنے مسرفانہ لہوولعب اور عیاشی میں اڑا ڈالتے۔[6]

پوپوں نے اور ان کے بعد درجہ بدرجہ مذہبی عہدہ داروں نے اپنی اپنی جگہ شہنشاہانہ بلکہ خدائی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے، جو وہ زمین پر کھولتے تھے وہ آسمان پر کھولا جاتا تھا اور جو یہاں بند کرتے تھے وہ وہاں بھی بند ہو جاتا تھا، قرآن مجید نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے ﴿اِتَّخَذُوْآ اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ ا

---

[1] معرکہ مذہب وسائنس، ڈریپر ص ۶۲

[2] ایضاً صفحہ ۶۵، ۶۶

[3] سیل صاحب کا ترجمہ قرآن مقدمہ ص ۲۶

[4] ایضاً صفحہ ۲۶

[5] ایضاً صفحہ ۲۶ _ ۱۲۸

[6] تاریخ اخلاق یورپ لیکی کی دوسری جلد میں یہ واقعات مفصل لکھے ہیں۔

للّٰہ ﴾ انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو اپنا خدا بنالیا تھا۔ دینداری کا سب سے اہم جز تجرد کی زندگی اور رہبانیت تھی ہر قسم کے آرام و آسائش سے جسم کو محروم کر کے ہر قسم کے تکلیف دہ عذاب میں اپنے کو تمام عمر مبتلا رکھنا بہترین عبادت تھی، کسی نے تمام عمر غسل نہ کرنے کی قسم کھائی تھی، کسی نے اپنے کو دلدل میں ڈال دیا تھا، کوئی اپنے کو بوجھل زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھا، کسی نے سایہ میں بیٹھنے کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا اور کسی نے اپنے کو اندھیری کوٹھڑی میں بند کر لیا تھا۔ ماں باپ اور عزیز و اقارب، دینداری و تقویٰ شعاری کی راہ میں کانٹے تھے، ان سے پرہیز بلکہ ان سے نفرت کمال تقویٰ سمجھا جاتا تھا اور اسی پر فخر کیا جاتا تھا۔

ہندوستان:

دنیا کے ان متمدن ملکوں میں جہاں کوئی باا ثر مذہب قائم تھا ایک ہندوستان بھی ہے، ہندوستان کے تمدن کے پانچ مختلف دور گذرے ہیں، ایک اصلی ہندو ویدک عہد، جو دو ہزار سال ق م سے لے کر تقریباً چودہ سو سال ق م تک قائم رہا، دوسرا دور جنگ، یعنی جس میں کوروؤں اور پانڈوؤں وغیرہ کے مناقشات رہے، اور جو چودہ سو سال ق م سے لے کر تقریبا ایک ہزار سال قبل مسیح تک رہا، تیسرا دور عقلیت جس میں حکماء اور عقلیین کا دور دورہ تھا اور جو ۱۰۰۰ قبل مسیح سے لے کر تقریبا تیسری صدی قبل مسیح کے نصف تک رہا، چوتھا دور بودھ جس میں اس مذہب کا عروج تقریباً دو سو پچاس قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی عیسوی کے خاتمہ تک رہا، پانچواں دور پرانک جس میں بجائے وید یا گوتم بدھ کی تعلیمات کے، پرانوں کی تلقین پر عمل درآمد ہوتا تھا اور یہ عہد تقریباً پانچویں صدی عیسوی کے اواخر سے لے کر مسلمانوں کے داخلہ ہند تک قائم رہا۔

مورخین کا اجماع ہے کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک اور نقائص سے معمور آخری دور ہے جو تقریباً ۵۰۰ء سے شروع ہوتا ہے اس دور کے نمایاں خصوصیات حسب ذیل تھے۔

(۱) شرک جو ابتدا ہی سے ہندوستان کے خمیر میں داخل تھا اب وہ حد اعتدال سے باہر ہو گیا تھا چنانچہ وید میں جو ۳۳ دیوتاؤں کی تعداد تھی وہ اب بڑھتے بڑھتے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں تک پہنچ گئی۔ [1]

(۲) ویدک عہد میں اصنام کی پرستش کا رواج نہ تھا لیکن اس زمانہ میں مندروں کے اندر بت پرستی علی العموم رائج ہو گئی۔ [2]

(۳) مندروں کے محافظین بد اخلاقی کا سرچشمہ تھے جو لاکھوں کروڑوں ناواقف پرستش کرنے والوں کو مذہب کے نام سے خوب لوٹتے۔ [3]

(۴) ویدک عہد میں ساری ہندو قوم میں یگانگی تھی لیکن اب ذات پات کی تفریق شروع ہو گئی جو نظام معاشرت کے لئے تباہ کن تھی [4]

---

[1] آر سی دت کی ہندوستان قدیم جلد ۳ صفحہ ۲۷۲

[2] آر سی دت کی ہندوستان قدیم جلد ۳ صفحہ ۲۸۱

[3] آر سی دت کی ہندوستان قدیم جلد ۳ صفحہ ۲۸۳

[4] ایضاً صفحہ ۳۰۷

(۵) عورتوں کو محکومیت و غلامی کا درجہ دیا گیا تھا۔[1]

(۶) قوانین اس قدر غیر معقول و نامنصفانہ وضع کئے گئے جن سے علانیہ بعض ذاتوں کی پاسداری وحمایت اور بعض پر جبر وستم مقصود تھا۔ مثال کے لئے چند قوانین درج ذیل ہیں:

(الف) برہمن کو کسی حالت میں خواہ وہ کتنے ہی سنگین جرائم کا مرتکب رہ چکا ہو سزائے موت نہیں دی جاسکتی۔

(ب) کسی اونچی ذات کے مرد کا کسی نیچی ذات کی عورت کے ساتھ زنا کرنا کوئی جرم نہیں۔

(ج) کسی بودھ راہبہ کی عصمت دری کی سزا میں کچھ جرمانہ کافی تھا۔

(د) اگر کوئی اچھوت ذات کا شخص کسی اعلیٰ ذات والے کو چھولے تو اس کی سزا موت ہے۔

(ھ) اگر کوئی نیچی ذات والا اپنے سے اونچی ذات والے کو مارے تو اس کے اعضا قطع کر ڈالنا چاہئے اگر اسے گالی دے تو اس کی زبان کاٹ ڈالنی چاہئے اور اگر اسے تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو گرم تیل اس کے منہ میں ڈالنا چاہئے۔[2]

(۷) راجاؤں کے محل میں بادہ نوشی کثرت سے رائج تھی اور رانیاں اسی حالت خمار میں جامہ عصمت اتار ڈالتی تھیں۔[3]

(۸) شاہراہوں پر آوارہ گردی اور جرائم پیشہ افراد کا مجمع لگا رہتا تھا۔[4]

(۹) خدا کی تلاش آبادیوں اور بازاروں میں کرنے کے بجائے جنگلوں اور پہاڑوں میں کی جاتی تھی جسم کو سخت سے سخت ایذا اور تکلیف ان کی بہترین عبادت تھی۔

(۱۰) اوہام وخیالات فاسدہ، بھوتوں پلیتوں اور سینکڑوں قسم کے ظنون واوہام ان کا مذہب تھا اور آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز ان کا خدا تھی اور ہر ایک کے سامنے سربسجود ہونا ان کا دھرم تھا۔ بتوں، دیوتاؤں اور دیویوں کا شمار اندازہ وقیاس سے باہر تھا اور ان کے افسانوں کا گیت ان کا ترانہ حمد تھا۔ ظہور اسلام کے بعد بھی جو عرب سیاح یہاں آتے رہے انہوں نے تپسیا کرنے والے جوگیوں کے دردناک حالات لکھے ہیں جن کو پڑھ کر انکی حالت پر افسوس آتا ہے[5] اور اسی طرح وہ عرب سیاح جو سندھ اور دکن کے شہروں اور ساحلوں سے گذرے ہیں ان کے معبدوں میں پجاری عورتوں اور دیوداسیوں کی جو اخلاقی کیفیتیں لکھی ہیں[6] وہ حد درجہ شرمناک ہیں اور اس سے زیادہ شرمناک یہ ہے کہ یہ سب خدا کی خوشنودی اور مذہبی عقیدہ کے رو سے انجام دیا جاتا تھا۔

عورتیں جوؤں میں ہاری جاتی تھیں، ایک عورت کے کئی کئی شوہر[7] ہوتے تھے وہ بیوہ ہو کر زندگی کی ہر لذت

---

[1] ایضاً صفحہ ۳۳۱

[2] ایضاً ۳۴۳، ۳۴۲

[3] آرسی دت کی ہندوستان قدیم صفحہ ۴۶۹

[4] آرسی دت کی ہندوستان قدیم صفحہ ۴۶۹

[5] دیکھو ابوزید سیرانی کا سفرنامہ صفحہ ۱۱۵، ۱۱۸ پیرس و آثار البلاد قزوینی صفحہ ۸۱

[6] سفرنامہ ابوزید صفحہ ۱۳۰ اور احسن التقاسیم مقدسی صفحہ ۴۸۳۔

[7] مہابھارت کے قصہ کا آغاز پڑھو۔

سے عمر بھر کے لئے قانوناً محروم کردی جاتی تھی اور اسی لئے شوہر کے مرنے پر بعض عورتیں زندہ درآتش ہونا پسند کرتی تھیں لڑائی میں شکست کے خوف کی صورت میں ان کو خود ان کے باپ اور بھائی اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالتے تھے یہاں کے بعض فرقوں میں عورتیں مرد کو اور مرد عورتوں کو ننگا کر کے ان کی پوجا کرتے تھے[1] مذہبی تہواروں میں شراب پی پی کر ایسے بدمست ہوتے تھے کہ پھر انہیں ماں، بہن، بیٹی اور اپنی اور پرائی کی تمیز باقی نہیں رہتی تھی اور اس کو وہ نیکی کا کام سمجھتے تھے شودروں کے نام سے ایک پوری قوم کی قوم ایسی غلامی میں مبتلا تھی کہ تعلیم و تربیت، تہذیب و اخلاق اور دین و ایمان ہر چیز سے محروم رہنا اس کا فرض تھا وید کی آواز بھی اس کے کان میں پڑ جائے تو اس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینے کا حکم تھا۔

راجاؤں کی بیویوں کی کوئی تعداد قانوناً مقرر نہ تھی قانون کی بنیاد مساوات انسانی پر نہیں بلکہ ذاتوں پر تھی عورتیں فروخت کی جاتی تھیں۔

اس مختصر سے خاکہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ ابتداء اسلام سے ایک صدی پیشتر سے دیوتاؤں کی یہ جنم بھومی بھی شیطانوں کے اس جال میں گرفتار تھی جس کے شکار فارس و روم ہو رہے تھے۔

یہود:

دنیا کی آبادی اور اصلاح کی سب سے زیادہ امید اسی قوم سے ہوسکتی تھی جو سام کی اولاد میں سب سے پہلے وحی الٰہی کی امانت دار بنی اس لئے قرآن نے ان سے کہا ﴿وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ﴾ (بقرہ) اور سب سے پہلے تم ہی پیغام الٰہی کے منکر نہ بنو مگر یہ قوم سخت جانی کے ساتھ سنگ دل بھی ثابت ہوئی اس نے پتھروں کے سینوں کو پھٹتے اور ان کی چھاتیوں سے میٹھے پانی کا دودھ بہتے دیکھا اور پیا مگر پھر بھی اس کے سینہ کا دل پتھر ہی رہا قرآن نے اپنے زمانہ میں اس کو طعنہ دیا۔

﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ (بقرہ)

ان کے دل پتھروں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر سخت ہیں۔

اس نے مختلف زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا ان کو تکلیفیں دیں بلکہ ان کو قتل کر ڈالا، حضرت موسیٰؑ اور ان کے بعد کوئی پیغمبر ان میں ایسا نہیں آیا، جس نے ان کی سنگدلی کا ماتم نہ کیا ہو اور ان کی سرکشی پر ان کے حق میں بددعا نہ کی ہو چنانچہ خود قرآن مجید نے کہا۔

﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ (مائدہ-۱۱)

بنی اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا، ان پر داؤد اور مریم کے بیٹے عیسیٰؑ کی زبان سے لعنت کی گئی، یہ اس لئے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھتے تھے اور ایک دوسرے کو اس برائی سے جو وہ کرتے تھے منع نہیں کرتے، ان کا کام کتنا برا ہے۔

حضرت داؤدؑ نے زبور میں کئی دفعہ بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کا ماتم اپنے سوز و گداز کی لے میں کیا ہے

---

[1] ستیارتھ پرکاش سمولاس گیارہ ص ۳۷۸، ۳۷۹ مطبوعہ سیوک اسٹیم پریس لاہور ۱۹۱۲ء۔

زبور ۷۸ میں ہے۔

''اے میرے گروہ! میری تعلیم پر کان رکھ' میرے منہ کی باتیں کان دھر کے سنو تا کہ آنے والی پشت میں وہ فرزند جو پیدا ہوں' سیکھیں اور وہ خدا پر توکل کریں' اور خدا کے کاموں کو نہ بھلا دیں' بلکہ اس کے حکموں کا تحفظ کریں اور اپنے باپ دادوں کی طرح ایک شریر اور سرکش نسل نہ ہوں' نہ ایسی نسل کہ جس نے اپنا دل مستعد نہ کیا اور ان کے جی خدا سے نہ لگے رہے باوجود اس سبب کے پھر انہوں نے گناہ کئے اور اس کے عجائب قدرتوں کے سبب اعتقاد نہ کیا لیکن انہوں نے اپنے منہ سے اس کے (خدا کے) ساتھ ریاکاری کی' اور اپنی زبانوں سے اس سے جھوٹ بولے' اور وہ اس کے عہد میں وفادار نہ رہے' کیونکہ ان کے دل ان کے ساتھ قائم نہ رہے کتنی بار انہوں نے بیابان میں اس خدا سے بغاوت کی اور ویرانہ میں اسے بیزار کیا اس پر بھی انہوں نے خدا تعالیٰ کو آزمایا اور اسے بیزار کیا اور اس کی شہادتوں کو حفظ نہ کیا' بلکہ برگشتہ ہوئے' اور اپنے باپ دادوں کے مانند بے وفائی کی اور وہ ٹیڑھی کمان کے مانند ایک طرف پھر گئے''

زبور ۸۱ میں ہے

''اے میرے لوگو! سنو کہ میں تجھ پر گواہی دوں گا' اے بنی اسرائیل! اگر تو میری سنے گا تو تیرے درمیان کوئی دوسرا معبود نہ ہو تو کسی اجنبی معبود کو سجدہ نہ کرنا' خداوند تیرا خدا میں ہوں' جو تجھے مصر کی سرزمین سے باہر لایا' اپنا منہ کھول کہ اسے بھر دوں گا' پر میرے لوگوں نے میری آواز پر کان نہ دھرا' اور اسرائیل نے مجھے نہ چاہا تب میں نے ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا''

بہت سے بنی اسرائیل جو حضرت داؤدؑ سے باغی ہو کر لڑنے پر آمادہ تھے' حضرت داؤدؑ نے ان کے متعلق یہ بددعا کی۔

''کہ تو وہ خدا نہیں جو شرارت سے خوش ہو' شریر تیرے ساتھ نہیں رہ سکتا' وہ جو شیخی باز ہیں تیری آنکھوں کے سامنے کھڑے نہیں رہ سکتے' تو سب بدکرداروں سے عداوت رکھتا ہے' تو ان کو جو جھوٹ بولتے ہیں نابود کردے گا........

اے خداوند! اپنی صداقت میں میرا رہبر ہو' میرے دشمنوں کے سبب سے میرے سامنے اپنی راہ کو سیدھا کر' ان کے باطن میں سراسر کھوٹا پن ہے اے خدا! تو انہیں ملزم جان' ایسا ہو کہ وہ اپنی مشورتوں سے آپ ہی گر جائیں' ان کو ان کے گناہوں کی کثرت کے سبب سے نکال پھینک کہ انہوں نے تجھ سے سرکشی کی ہے''۔ (زبور۔ ۵)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی انجیل میں بنی اسرائیل کو لعنت کی اور فرمایا۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو باہر سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں پرَ بھیتر مردوں کی ہڈیوں سے اور ہر طرح کی ناپاکی سے بھری ہوئی ہیں' اسی طرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو پر باطن میں ریاکار اور شرارت سے بھرے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کیونکہ نبیوں کی قبریں بناتے' اور راست بازوں کی گوریں سنوارتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے دنوں میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے' اسی طرح تم اپنے اوپر گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو' پس اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھرو، اے سانپو! اور اے سانپو کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے۔ (متی ۲۳۔ ۲۷۔ ۳۲)

بعینہ یہی الزام قرآن نے بھی ان کو دیا ہے۔

﴿ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴾ (بقرہ)

اور وہ ناحق پیغمبروں کو مار ڈالتے ہیں، اس لئے کہ وہ نافرمان اور حد سے بڑھنے والے ہیں۔

﴿ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ (بقرہ)

کہ پھر کیوں اللہ کے نبیوں کو پہلے تم قتل کرتے رہے اگر تم مومن تھے۔

آل عمران میں اس سے بھی بڑھ کر ہر حق کے داعی اور خیر کے مبلغ کے قتل کر دینے کا ان پر بجا الزام ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ (آل عمران)

بے شک وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے، اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے اور ہر اس شخص کی زندگی کے دشمن بن جاتے ہیں جو ان کو عدل و نیکی کی بات سمجھاتا ہے، تو ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنا دے

سورۂ بقرہ اور آل عمران میں یہودیوں کے ایک ایک عیب کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دین و ملت کا قوام کتنا بگڑ گیا تھا، ان کی مذہبی سنگدلی اور تعصب کا سب سے دردناک سانحہ وہ ہے جو اسلام سے ۵۰، ۶۰ برس پہلے یمن میں پیش آیا کہ یہودیوں حمیریوں نے نجران کے عیسائیوں کو گڑھوں میں آگ جلا کر ان میں جھونک دیا، اور وہ کنارے بیٹھے اس حسرت ناک منظر کا تماشا دیکھتے رہے، چنانچہ قرآن مجید نے اس پر درد داستان کو ان لفظوں میں انہیں یاد دلایا۔

﴿ قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ ٥ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ٥ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ٥ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ٥ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ﴾ (بروج)

گڑھے والے لوگ مارے گئے، بھڑکتی آگ کے گڑھے، جب وہ ظالم ان کے کنارے بیٹھے ایمان والوں کے ساتھ جو کر رہے تھے اس کو دیکھ رہے تھے، ان کا گناہ یہی تھا کہ وہ غالب اور خوبیوں والے خدا پر ایمان رکھتے تھے۔

جزئیات کو چھوڑ کر کلی طریقہ سے ان میں حسب ذیل نقائص تھے۔

۱۔ ان کو اپنے محبوب خدا اور خاص خدا کے کنبہ ہونے پر بے انتہا غرور تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ہم کچھ کریں، ہمیں قیامت میں مواخذہ نہ ہوگا۔

﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ﴾ (مائدہ)

ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔

﴿ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ﴾ (بقرہ)

اور کہا، ہم کو دوزخ کی آگ ہرگز نہیں چھوئے گی، لیکن چند روز۔

وہ سمجھتے تھے کہ جنت کی نعمتیں صرف انہی کے لئے خاص ہیں، قرآن نے کہا:

﴿ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ (بقرہ)

کہہ دے کہ اگر آخرت کا گھر تمام لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لئے ہے تو موت کی آرزو کیوں نہیں کرتے اگر تم سچے ہو۔

وہ سمجھتے تھے کہ نبوت اور رسالت صرف ان کے گھر کی چیز ہے، کسی دوسرے کا اس میں حق نہیں۔ قرآن نے ان کے جواب میں کہا۔

﴿ ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ﴾ (جمعہ)

یہ خدا کی مہربانی ہے، وہ جس کو چاہے دے۔

جو ان میں پڑھے لکھے عالم تھے وہ خدا کے احکام کو اپنے منشاء اور دولت مندوں کی خوشنودی کے لئے اپنی باطل تاویلوں سے ادلتے بدلتے رہتے تھے اور اپنی تصنیفات اور اجتہادات کو کتاب الٰہی کا درجہ دیتے تھے۔

﴿ يُحَرِّفُوۡنَ الۡكَلِمَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَوَاضِعِهٖ ﴾ (مائدہ)

وہ لفظوں کو اپنی مناسب جگہوں سے ہٹا دیتے ہیں۔

﴿ فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ يَكۡتُبُوۡنَ الۡكِتٰبَ بِاَيۡدِيۡهِمۡ ثُمَّ يَقُوۡلُوۡنَ هٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ لِيَشۡتَرُوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ؕ فَوَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا كَتَبَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ وَوَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا يَكۡسِبُوۡنَ ﴾ (بقرہ)

تو پھٹکار ہو ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے، تاکہ وہ اس سے دنیا کا معمولی فائدہ اٹھائیں، تو پھٹکار ہے ان پر جو وہ لکھتے ہیں اور پھٹکار ہو ان پر جو وہ کماتے ہیں۔

جو ان میں ان پڑھ اور جاہل تھے وہ اپنے سنے سنائے قصوں پر ایمان رکھتے تھے۔

﴿ وَمِنۡهُمۡ اُمِّيُّوۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِىَّ وَاِنۡ هُمۡ اِلَّا يَظُنُّوۡنَ ﴾ (بقرہ)

اور ان میں بعض ان پڑھ ہیں جن کو تورات کا علم نہیں، لیکن بناوٹی باتیں معلوم ہیں، وہ صرف ان کے خیالات ہیں۔

احکام الٰہی میں سے جو آسان اور ضرورت کے مطابق حکم ہوتا اس کو قبول کرتے اور دوسرے حکموں کو پس پشت ڈالتے۔

﴿ نَبَذَ فَرِيۡقٌ مِّنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوۡرِهِمۡ كَاَنَّهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴾ (بقرہ)

جن کو خدا کی کتاب دی گئی تھی، ان میں سے ایک فریق اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈالتا ہے گویا کہ وہ جانتا ہی نہیں۔

﴿ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌۢ بِمَا لَا تَهۡوٰٓى اَنۡفُسُكُمُ اسۡتَكۡبَرۡتُمۡ فَفَرِيۡقًا كَذَّبۡتُمۡ وَفَرِيۡقًا تَقۡتُلُوۡنَ ﴾ (بقرہ)

کیا جب جب کوئی رسول تمہارے پاس وہ لے کر آیا جو تمہاری نفسانی خواہشوں کے موافق نہ ہو، تم نے غرور کیا تو کچھ کو جھٹلایا اور کچھ کو مار ڈالتے ہو۔

ایک دفعہ جب آنحضرت ﷺ مدینہ تشریف لا چکے تھے اور یہود نے بھی آپ کی ملکی سرداری کو ایک گونہ قبول کر لیا تھا تو ایک زنا کا مقدمہ آپ کی عدالت میں لائے، آپ نے پوچھا کہ تمہارے مذہب میں اس جرم کی سزا کیا ہے، بولے ہم مجرم کو کوڑے مارتے ہیں اور اس کی تشہیر کرتے ہیں، آپ نے ان سے توراۃ طلب فرمائی جب وہ لائے تو اس جرم کے متعلقہ حکموں کی آیتوں کو پڑھ کر سنانے لگے تو بیچ سے سنگ ساری کا حکم چھپا دیا، مگر ایک نومسلم یہودی عالم نے اس حکم کو پڑھ کر بتا دیا، آپ نے فرمایا خداوندا میں پہلا شخص ہوں گا جو تیرے مردہ حکم کو زندہ کروں گا (صحیح بخاری و مسلم کتاب الحدود، و ابوداؤد باب رجم الیہودیین)

آپس میں قتل و خونریزی کا بازار ان میں گرم تھا، ان میں ایک طاقتور قبیلہ دوسرے کمزور قبیلہ کو گھر سے بے گھر کر دیتا تھا اور پھر کوئی گرفتار ہو جاتا تو فدیہ دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے تھے، قرآن نے کہا۔

> ﴿ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ﴾ (بقرہ)
>
> پھر تم ہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے اور ایک گروہ کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو، اور ان کے برخلاف گناہ اور ظلم سے مدد کرتے ہو، اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی بن کر آتے تو تم فدیہ دے کر چھڑاتے ہو حالانکہ ان کا نکالنا تم پر حرام تھا، کیا تم کتاب کے کچھ حکموں کو مانتے اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔

۲۔ دوسری چیز مال و دولت کی حرص و طمع تھی اس کی وجہ سے ان میں ہر قسم کا لالچ اور اخلاقی کمزوری پیدا ہو گئی تھی، کسی بڑے کام کی خاطر وہ اپنی راحت و آرام اور جسم و جان کو قربان نہیں کر سکتے تھے

> ﴿ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ج وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ﴾ (بقرہ)
>
> ان کو سب لوگوں سے زیادہ زندگی کا لالچی پاؤ گے، مشرکوں سے بھی زیادہ، ان میں ایک ایک چاہتا ہے کہ اس کو ہزار برس کی زندگی ملے۔

عربوں کے ساتھ ان کے لین دین کے تجارتی تعلقات قائم تھے مگر وہ سخت نادہند تھے اور سمجھتے تھے کہ عربوں کے ساتھ جس طرح سختی اور بددیانتی کے ساتھ بھی برتاؤ کیا جائے وہ مذہبا منع نہیں، قرآن نے اس معاملہ میں عیسائی اہل کتاب کی تعریف کے بعد اسرائیلی اہل کتاب کی نسبت فرمایا۔

> ﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ج وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ (آل عمران)
>
> کتاب والوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کو ایک دینار بھی امانت رکھنے کے لئے دو، وہ تم کو اس وقت تک واپس نہ دیں جب تک تم ان کے سر پر کھڑے نہ رہو، اس لئے وہ کہتے ہیں کہ ان جاہل عربوں کا ہم پر حق نہیں، اور وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ بولتے ہیں۔

توراۃ میں ''اپنے بھائی'' کے علاوہ ''اجنبی'' سے سود لینے کی اجازت کا مطلب وہ یہ لیتے تھے کہ یہود یہود سے نہ لے اور اہل عرب جو یہود نہ تھے ان سے بھاری سے بھاری شرح سود وصول کرنا جائز سمجھتے تھے اور تعجب پر تعجب یہ تھا کہ ان کے علماء ان کو اس سے باز نہیں رکھتے تھے، اس حرام خوری اور ان کے علماء کی اس خاموشی پر ان کو قرآن نے بار بار ٹوکا

> ﴿ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ط لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴾ (مائدہ۔۹)

اور ان میں سے بہتوں کو تو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور ظلم کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے کرتوت کتنے برے ہیں۔ ان کے درویش اور عالم گناہ کی بات بولنے اور حرام کھانے سے کیوں باز نہیں رکھتے ان کے کام درحقیقت کتنے خراب ہیں۔

﴿ سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ﴾ (مائدہ)

جھوٹ کو سننے والے اور حرام کھانے والے ہیں۔

﴿ وَاَخْذِھِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُھُوْا عَنْهُ وَاَکْلِھِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ﴾ (نساء)

اور ان کے سود لینے کے سبب سے حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور لوگوں کا مال ناجائز طریقوں سے کھا جانے کی وجہ سے

اسی لئے تو وہ تورات کی آیتوں میں تحریف اور ان کے معنوں میں تاویل کر کے ایسے فقہی حیلے تراشتے تھے کہ وہ ہر حکم کو اپنے مطلب کے مطابق بنا لیتے تھے خدا نے فرمایا۔

﴿ اِنَّـآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِیْھَا ھُدًی وَّنُوْرٌ ج یَحْکُمُ بِھَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ کِتٰبِ اللّٰهِ ﴾ (مائدہ)

ہم نے تورات اتاری، جس میں ہدایت اور روشنی ہے، اسی کے مطابق نبی جو تابعدار تھے، یہودیوں کا فیصلہ کرتے تھے، اور ان کے درویش و عالم بھی خدا کی کتاب کے جن حصوں کو انہوں نے بچا رکھا تھا، ان میں سے فیصلہ کرتے۔

اس کے بعد اس کے احکام کے اجراء اور خاص کر قصاص کا ذکر کیا اور فرمایا۔

﴿ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ﴾ (مائدہ)

اور جو خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی لوگ کافر ہیں۔

ان میں مشرکانہ بت پرستی کے بھی بعض اثرات پیدا ہو گئے وہ جبت اور طاغوت کی پرستش میں مبتلا تھے قرآن ان کو خطاب کر کے کہتا ہے۔

﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ﴾ (نساء)

اے کتاب والو! ہم نے جو اتارا جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرتا ہے، اس پر ایمان لاؤ۔ بے شک خدا شرک کو معاف نہیں کرتا، اور اس کے سوا جس کو چاہے معاف کر دے۔

﴿ اَلَـمْ تَرَاِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَیَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا ھٰٓؤُلَآءِ اَھْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا ﴾ (نساء)

..... کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ بتوں اور شیطانوں پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ کافر مسلمانوں سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔

اوہام و خرافات پر ان کا ایمان تھا، تعویذ، گنڈا جادو اور عملیات پر فریفتہ تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ حضرت سلیمان کی تعلیم ہے (بقرہ) لبید اعصم وغیرہ مدینہ میں بہت سے عامل تھے، جو کنگھیوں اور بالوں میں منتر پڑھ کر پھونکتے تھے۔[1]

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الطب، باب السحر صفحہ ۲۵۷۔

عرب سے باہر یہودی، یونانیوں اور رومیوں کی حکومتوں میں یورپ، افریقہ اور ایشیاء کے مختلف ملکوں اور شہروں میں اس طرح پراگندہ اور منتشر تھے کہ عرب سے باہر دنیا کی قوموں میں ان کا کوئی شمار نہ تھا عرب کے اندر جو یہود زمانہ دراز سے آباد تھے ان کا بڑا شغل زراعت اور تجارت تھا سودی کاروبار کرتے تھے غریب عربوں کو اپنے گراں شرح سود اور قرضوں کے بار میں اسی طرح دباتے تھے کہ ان کی حالت ان کے سامنے غلاموں کی سی تھی اس سلسلہ میں صرف ایک واقعہ کا ذکر پوری حالت کے اندازہ کے لئے کافی ہوگا۔

محمدؓ بن مسلمہ انصاری اور ان کے رفقاء جو مدینہ کے یہودی سردار کعب بن اشرف کے قتل پر مامور ہوئے تھے وہ اس سے ملنے اور بات چیت کرنے گئے انہوں نے اس سے کہا اے کعب! اس شخص محمد (رسول اللہ ﷺ) نے تو صدقہ وصول کر کر کے ہم کو دق کر ڈالا اب میں تم سے کچھ قرض لینے آیا ہوں اس نے کہا خدا کی قسم مجھے معلوم تھا کہ تم اس سے آخر بے زار ہو جاؤ گے [1] انہوں نے کہا میں نے اس کی پیروی اختیار کی ہے لیکن اس کو چھوڑنا نہیں چاہتا انتظار ہے کہ معاملہ کی صورت کس رخ پلٹتی ہے میں تم سے کچھ غلہ قرض لینے آیا ہوں اس نے کہا مگر تم کفالت میں کیا چیز رہن رکھو گے انہوں نے کہا تم بتاؤ کیا چاہتے ہو اس نے کہا اپنی بیویاں گروی رکھو۔ انہوں نے جواب دیا ہم اپنی بیویاں گروی کیسے رکھ سکتے ہیں کہ تمام عرب میں تمہارے حسن کا جواب نہیں۔ بولا اچھا تو اپنے لڑکوں کو گروی رکھو، کہا ہم اپنے لڑکوں کو گروی کیسے رکھیں، ان کی کوئی بے عزتی نہ کرے یہ ہمارے لئے بڑی شرم کی بات ہے ہاں ہم اپنے ہتھیار گروی رکھ سکتے ہیں۔ [2]

اس سوال و جواب سے اندازہ ہوگا کہ یہود کی اخلاقی حالت کتنی پست اور ذلیل ہو چکی تھی کوئی غیر عورت اگر ان کے بازار کی طرف جا نکلتی تو اس کی عزت بچنی مشکل ہو جاتی تھی [3] کسی بچہ کو معمولی سے زیور کے لالچ میں موقع پاتے تو بیدردی سے قتل کر کے زیور اتار لیتے [4] علماء اور پیشوایان دین کی وہی کیفیت تھی جس کا ماتم اس وقت سے چھ سو برس پیشتر حضرت عیسیٰؑ نے کیا تھا لفظی موشگافیوں اور ظاہری دین داری کے سوا روح و اخلاق کا جوہر ان سے کھو گیا تھا اسلام جو ابراہیم حنیف کے ترانہ توحید اور طور کی صدائے غیبی کی آواز بازگشت تھا وہ ان کے نزدیک عرب کے بت پرستوں کے جاہلانہ مذہب سے زیادہ برا تھا وہ کہتے تھے کہ ان مسلمانوں سے یہ مشرک زیادہ راہ راست پر ہیں [5] اسلام کی اس مصالحانہ دعوت

﴿ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشۡرِكَ بِهٖ شَيۡـئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ﴾ (آل عمران)

اے کتاب والو! آؤ اس ایک بات پر ہم سب متحد ہو جائیں، جو ہم میں تم میں مشترک ہے ہم خدا کے سوا کسی کو اپنا معبود

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم قتل کعب بن اشرف صفحہ ۵۷۶۔

[2] دیکھو کتب سیر میں غزوہ بنی نضیر کے اسباب۔

[3] صحیح بخاری جلد دوم باب من اقاد بحجر صف ۱۰۱۶۔

[4] نساء۔

[5] سیرۃ ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ۔

نہ بنائیں اور نہ ہم خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنا رب بنائیں۔

میں بھی عداوت اور دشمنی ہی کی جھلک دکھائی دیتی تھی اس لئے مدینہ میں اسلام کی صلح کی ہر کوشش کو وہ ٹھکراتے رہے کیونکہ روحانی عظمت کے مقابلہ میں اس دعوت کے قبول میں ان کو اپنی قومی و مالی وتجارتی عظمت کی بربادی نظر آتی تھی عیسائیوں کی نقل میں وہ بھی عزیر (عزرا) کو خدا کا بیٹا کہتے تھے ﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ﴾ (توبہ) اپنی دولت وثروت کے غرور میں وہ کہتے تھے ﴿يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ﴾ (مائدہ) ”خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں“ قرآن کی دعوت کے جواب میں کہتے تھے کہ ہم پر اس دعوت کا اثر نہیں ہوسکتا کہ ہمارے دل نامختون ہیں ﴿وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ﴾ (بقرہ) ان فقروں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ اب دنیا میں نیابت الٰہی کے منصب کے قابل نہیں رہے تھے

عرب کے باہر یہودیوں کی پراگندہ ٹولیاں مختلف سلطنتوں کے سایہ میں پناہ گزیں تھیں ان کا مذہبی مرکز ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا سیاسی اہمیت وہ مدت ہوئی کھو چکے تھے ان کے مذہبی فرقوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی جن میں باہمی عداوت قائم تھی اور اس وقت سے چھ سو برس پہلے کی طرح بنی اسرائیل اب پھر ایک نبی اعظم کی بعثت کا بے تابانہ انتظار کر رہے تھے (بقرہ) خود عرب میں یہود اس وقت اس نبی کے جلد پیدا ہونے کی بشارت کا اپنی مجلسوں میں تذکرہ کرتے رہتے تھے جس کی پیشین گوئیوں سے تورات کے صفحے بھرے تھے اور انہیں سے سن کر یثرب کے اوس وخزرج ایک نبی کی آمد کی پیشین گوئیوں سے باخبر تھے۔

دنیا کی ان مختلف قوموں کے حالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کے بعد ضرورت ہے کہ اس قوم کے حالات پر ایک تفصیلی نظر ڈالی جائے جس کے وطن کے افق سے نبوت سے صبح سعادت طلوع ہونے والی تھی۔

* * *

ظہور اسلام کے وقت عرب کی مذہبی واخلاقی حالت

یمن میں جب وہ مشہور سیلاب آیا جس کی بلندی سطح زمین سے ایک سوبیس فٹ تھی تو اس کا پائے تخت مآرب اوراس کے اضلاع دفعتہً تباہ وبرباد ہوگئے، یہ دوسری [۱] صدی عیسوی کا واقعہ ہے۔ قرآن مجید نے اسی سیلاب کو سیل عرم کہا ہے' اس سیلاب کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ بڑے بڑے خاندان جلاوطن ہوکر ادھر ادھر نکل گئے جس سے نظامِ سلطنت میں ضعف آ گیا۔ چھٹی صدی عیسوی میں یہاں کے فرمانروا ذونواس سے جو مذہباً یہودی تھا' رعایا نے بغاوت کی اور شاہ حبش سے اعانت چاہی اس نے ۵۲۹ء میں ایک فوج بھیجی جس نے ذونواس کو معزول کردیا اوراس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ ۶۰۳ء میں قبیلہ حمیر کے ایک باحوصلہ شخص ذویزن نے فارس کی مدد سے اپنا ملک واپس لیا لیکن چندروز کے بعد وہ قتل کردیا گیا اور یمن شہنشاہی فارس کا ایک معمولی صوبہ رہ گیا۔

جو قبیلے یمن سے نکلے' ان میں سے ایک نے دوسری صدی عیسوی میں حیرہ میں جہاں اب کوفہ آباد ہے ایک سلطنت قائم کی لیکن وہ فارس کے زیر اثر اور مذہبی خیالات میں مجوس سے متاثر تھی' دوسرا قبیلہ شام میں جا کر آباد ہوا جو غسانی خاندان کہلاتا ہے [۲] چونکہ یہ خاندان رومیوں کے زیر اثر تھا اس لئے رفتہ رفتہ وہ عیسائی ہوگیا اور اسلام کے زمانہ تک عیسائی رہا۔

غرض عرب کے اصلی تمدن پر بیرونی اثر جو کچھ پڑا تھا وہ مجوسیت یا نصرانیت کا تھا یہودی معتقدات اور خیالات کا اثر بھی بہت کچھ تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب کا ایک بڑا حصہ یعنی وادی القری اور خیبر وفدک تمام تر یہودی آبادیاں تھیں اور خود مدینہ میں یہودی ہی صاحب اقتدار اور صاحب حکومت تھے باقی تمام ملکوں میں مشرکانہ رسوم جاری اور جاہلانہ مذاہب پھیلے ہوئے تھے لوگ بتوں پتھروں درختوں' ستاروں' فرشتوں اور جنوں کی پرستش کرتے تھے۔

خدا کا اعتقاد:

تاہم اس میں شبہ نہیں کہ عرب زمانہ دراز سے ایک خدائے برتر پر اعتقاد رکھتے تھے آج کل عرب کے جو قدیم کتبات دستیاب ہوئے ہیں، ان پر اللہ کا لفظ خدا کے معنی میں لکھا ہوا ہے البتہ اس کا املا اللہ نہیں بلکہ ھلہ ہے عرب شمال کے عرب جو نابتی کہلاتے ہیں ان کے ناموں کے ساتھ اللہ کا لفظ بھی شامل ہوتا تھا مثلاً زید اللہی عبداللہی [۳] خود قرآن مجید میں خدا کفار کی نسبت کہتا ہے۔

---

[۱] اس بند کے انہدام کی تاریخ کی تعیین مشکل ہے اور اسی لئے اس کی تعیین میں کئی نظریئے ہیں۔ ایک اس کو دوسری صدی عیسوی کا واقعہ بتاتا ہے تو دوسرا پانچویں صدی عیسوی کا' اصلیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس بند کے مختلف حصے مختلف زمانوں میں منہدم ہوتے رہے اور بنتے رہے آخری دفعہ پانچویں صدی عیسوی میں بالکل برباد ہوگیا۔ (سلیمان)

[۲] اکثر علمائے انساب کا بیان یہی ہے کہ یہ قبائل یمن سے آئے تھے لیکن میں نے ارض القرآن میں بدلائل اس سے اختلاف کیا ہے۔ (سلیمان)

[۳] مذاہب واخلاق کی انسائیکلوپیڈیا' جلد اول صفحہ ۶۶۴ بحوالہ پروفیسر نولدیکی۔

﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ط قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ﴾ (لقمان۔۳)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کیا ہے تو وہ بول اٹھیں گے کہ خدا نے تم کہو کہ خدا کا شکر ہے۔

یہ اصل میں حضرت ابراہیمؑ کی تعلیم تھی لیکن رفتہ رفتہ شرک کا اعتقاد پیدا ہوا یعنی یہ کہ خدائے اعظم کے سوا اور بھی چھوٹے چھوٹے خدا ہیں گو اللہ ان میں سب سے بڑا ہے۔ یہ اعتقاد اس قدر راسخ ہو گیا کہ اور معبودوں کے انکار سے ان کو اس قدر رنج ہوتا تھا جس قدر خود خدا کے انکار سے ہو سکتا تھا بلکہ چونکہ ان کے نزدیک دنیا کا کاروبار اور روزمرہ کی ضرورتیں انہی چھوٹے چھوٹے خداؤں سے انجام پاتی تھیں اور کام اکثر انہیں خداؤں سے پڑتا تھا، اس لئے اللہ کا خیال کچھ یوں ہی سا رہ گیا انہی خداؤں کی پرستش کرتے تھے، انہی پر قربانی چڑھاتے تھے، انہی سے حاجتیں مانگتے تھے، اللہ تو زمین آسمان بنا کر بیکار سا ہو چکا تھا جو کچھ کرتے تھے یہی خدایان اصغر کرتے تھے یہی سبب تھا کہ کوئی شخص اللہ کا خالی نام لیتا تھا تو لوگ بہت کبیدہ ہوتے تھے۔

﴿ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَايُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ط وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴾ (سورۂ زمر)

اور جب خالی اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو یہ لوگ، جو کہ قیامت کے معتقد نہیں ہیں، ناک بھوں چڑھاتے ہیں، لیکن جب خدا کے سوا اوروں (معبودوں) کا بھی ذکر کیا جائے تو وہ دفعۃً کھل جاتے ہیں۔

اور سمجھتے تھے کہ ان چھوٹے معبودوں کی نذر و نیاز و قربانی سے خدا خوش رہے گا اور وہ اس کے دربار میں سفارش کریں گے چنانچہ وہ کہتے تھے۔

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ (زمر)

ہم ان بتوں کو اس لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں۔

ملائکہ کی الوہیت:

شرک کے علاوہ خدائے اعظم کی نسبت یہ مانتے تھے کہ اس کے بال بچے بھی ہیں چنانچہ فرشتوں کو وہ خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ﴾ (سورۂ نجم)

جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں۔

﴿ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى o تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴾ (سورہ نجم۔۱)

تمہارے تو لڑکے ہوں اور خدا کے لڑکیاں! یہ تو کچھ اچھی تقسیم نہیں۔

اس لئے جس طرح بعض یہود عزیر کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کو خدائی کا مستحق سمجھتے تھے وہ فرشتوں کو خدا کی اولاد سمجھ کر ان کی الوہیت کے بھی قائل تھے۔

﴿ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ﴾ (آل عمران)

اور نہ تو خدا تم کو اس کا حکم دیتا ہے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہراؤ۔

﴿ وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ ۞ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰكُمْ بِالْبَنِيْنَ ۞ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ ۞ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ﴾ (زخرف)

اوران مشرکوں نے خدا کے بندوں میں سے خدا کا ایک حصہ بنایا' بے شک انسان کھلا نافرمان ہے کیا خدا جو پیدا کرتا ہے وہ اپنے لئے لڑکیاں لے اورتم کولڑکے دے کرعزت دے اوران مشرکوں نے فرشتوں کو جورحمت والے خدا کے بندے ہیں لڑکیاں قرار دیا' کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے ان کی گواہی لکھی اور باز پرس کی جائے گی اور کہتے ہیں اگر خدا نہ چاہتا تو ہم ان کی پرستش نہ کرتے۔

﴿ فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنٰتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ۞ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شَاهِدُوْنَ ۞ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ۞ وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴾ (صفت)

تو ان سے پوچھ کہ کیا تیرے رب کی لڑکیاں ہوں' اوران کے لڑکے ہوں' کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں پیدا کیا' وہ حاضر تھے' ہاں یہ ان مشرکوں کی بناوٹ ہے' وہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہوئی' اور وہ جھوٹے ہیں۔

ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ یہ فرشتے خدا کے ہاں اپنے پرستاروں کے سفارشی بنیں گے خدا نے اس کی تردید میں کہا

﴿ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا ﴾ (نجم)

اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں کہ ان کی سفارش خدا کی اجازت کے بغیر کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

قیامت میں فرشتوں سے پرسش ہوگی کہ یہ مشرک تمہاری پوجا کرتے تھے۔

﴿ ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴾ (سباء)

پھر خدا فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ انسان تمہیں کو پوجتے تھے۔

جنات کی الوہیت:

فرشتوں کی طرح وہ جنات کو بھی خدا کے عزیز وقریب سمجھتے تھے اور خدا کے ان سے رشتے لگاتے تھے۔

﴿ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ﴾ (صفت)

اور مشرکوں نے خدا اور جنوں کے درمیان رشتہ داری بنادی۔

اس لئے وہ جنات کو خدا کی خدائی کا شریک کرتے تھے۔

﴿ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾ (انعام)

اور انہوں نے جنوں کو خدا کا شریک بنایا اور وہ خدا کی مخلوق ہیں اور بن جانے خدا کے لئے بیٹے اور بیٹیاں گھڑیں۔

اور جب وہ خدا کے رشتہ دار اور خدائی کے شریک ٹھہرے تو ان کی عبادت اور پرستش بھی ضروری تھی چنانچہ جاہلیت میں اہل عرب ان جنوں کو بھی پوجا کرتے تھے[1] ﴿ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴾ (سبا) ''بلکہ یہ جن کو پوجتے تھے اور ان میں سے اکثر انہیں پر ایمان رکھتے تھے'' مسافر جب راستہ میں کہیں قیام کرتے تھے

---

[1] صحیح مسلم کتاب التفسیر۔

تو پہلے وہاں کے جنوں کی دہائی پکار لیتے تھے قرآن میں ہے ﴿وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا﴾ (جن) ''اور بات یہ تھی کہ کچھ انسان بعض جنوں کی دہائی مانگا کرتے تھے اور انہوں نے ان کو اور مغرور بنا دیا تھا'' چنانچہ بعض خوفناک مقامات میں خاص طور سے ان کے نام کی قربانی کی جاتی تھی اور ان میں سے ایک مشہور مقام دراہم تھا جہاں کے رہنے والے جنوں (مکان الدراہم) پر جانور ذبح کر کے چڑھائے جاتے تھے تا کہ قربانی کرنے والے ان کی شرارت سے محفوظ رہیں [1] قبیلہ خزاعہ کی شاخ بنو ملیح خاص طور سے جنوں کی پوجا کرتی تھی اور کلبی کا بیان ہے کہ انہیں کے متعلق یہ آیت اتری ہے۔ [2]

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ﴾ (اعراف)
خدا کو چھوڑ کر تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری ہی طرح بندے ہیں۔

بت پرستی:

جن خداؤں کو یہ لوگ مانتے تھے ان کے بت بنا لئے تھے اور جا بجا عظیم الشان بت کدے قائم ہو گئے تھے یہ رواج اس قدر عام ہو گیا تھا کہ جہاں کوئی خوبصورت پتھر مل گیا' اٹھا لیا اور اس کی پرستش شروع کر دی زیادہ خوبصورت مل گیا تو اس کو پھینک دیا اور اس کی پرستش کرنے لگے جہاں کوئی پتھر ہاتھ نہ آیا خاک کا ایک تودہ بنا لیا ایک بکری لا کر اس کا دودھ اس پر دوہا پھر اس کے گرد طواف کیا اور اب وہ ایک معبود بن جاتا تھا چنانچہ صحیح بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفہ میں یہ پوری تفصیل مذکور ہے۔

اس بت پرستی کی ابتداء یوں ہوئی کہ قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص جس کا نام عمرو بن لحیٰ تھا اور جو قبیلہ جرہم کو شکست دے کر کعبہ کا متولی بن گیا تھا ایک دفعہ بلقاء گیا اور وہاں لوگوں کو بت پرست دیکھ کر بت پرستی کی طرف مائل ہوا اور وہیں سے ایک بت لا کر کعبہ میں نصب کیا چونکہ اس کا اثر تمام عرب پر تھا اس لئے تمام عرب نے بت پرستی قبول کر لی اور گھر گھر بت خانے بن گئے ان میں ہبل سب سے بڑا تھا اس سے اتر کر منات' لات اور عزیٰ تھے۔

منات مدینہ منورہ سے سات میل پر تھا انصار کے قبیلہ یعنی اوس و خزرج اور آس پاس کے قبائل اسی کا حج کرتے تھے کعبہ کا حج بھی جب یہ لوگ کرتے تھے تو احرام یہیں آ کر اتارتے تھے حلفیہ معاہدے بھی یہیں ہوتے تھے، عبدالعزیٰ مزنی کہتا ہے۔ [3]

﴿انی حلفت یمین صدق برة بمناة عند محل آل الخزرج﴾
میں نے منات کی سچی قسم کھائی اہل خزرج کے احرام اتارنے کی جگہ کے پاس۔

لات قبیلہ ثقیف کا معبود تھا جو مقام طائف میں نصب تھا۔ اہل طائف اس کو کعبہ کے برابر تسلیم کرتے تھے

---

[1] لسان العرب لفظ سکن۔

[2] کتاب الاصنام ہشام الکلبی مطبوعہ مصر صفحہ ۳۴۔

[3] یہ پوری تفصیل معجم البلدان لفظ مناۃ میں ہے۔

عزیٰ ایک درخت تھا اس کے پاس ایک بت تھا یہ قبیلہ غطفان کا بت تھا لیکن قریش بھی اس کی نہایت عزت کرتے تھے اور اس کی زیارت کو جاتے تھے قریش جب کعبہ کا طواف کرتے تھے تو یہ پڑھتے تھے۔ [۱]

﴿ وَاللّٰتَ وَالْعُزّٰی o وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی o اِنَّھُنَّ الْغَرَانِیْقَ الْعُلٰی وَاِنْ شَفَاعَتُھُنَّ لَتُرْتَجٰی ﴾

لات، عزیٰ، اور تیسرا مناۃ یہ بڑے برگزیدہ ہیں اور ان کی سفارش کی خدا کے ہاں امید ہے۔

بت پرستی نے رفتہ رفتہ اور بہت سی برائیاں پیدا کر دی جانوروں سے گزر کر انسانی قربانیاں چڑھائی جانے لگیں آنحضرت ﷺ کے جد امجد عبدالمطلب نے جو اپنے صاحب زادہ عبداللہ کی قربانی کرنی چاہی تھی اسی رسم کی تقلید تھی۔

بحیرۃ، سائبۃ، حام کے نام سے بتوں کے نام پر سانڈ چھوڑتے تھے کعبہ کے سامنے جو قربانی کرتے تھے اس کا خون کعبہ کی دیواروں پر ملتے تھے۔ [۲] بتوں کے سامنے شگون کے تیر رہتے تھے ان میں سے ایک پر ''ہاں'' ایک پر ''ناں'' لکھا رہتا تھا جو کام کرنا چاہتے پجاری سے کہتے کہ فال نکالے، ''ہاں'' کا تیر نکلتا تو اس کام کو کرتے ورنہ باز رہتے۔

جاہلیت میں جن چیزوں کی پرستش کی جاتی تھی وہ مختلف قسموں کی تھیں۔ اصنام واوثان، انصاب اور بیوت، اصنام واوثان جن کا واحد صنم اور وثن ہے، یہ انسانی شکل وصورت کے بت تھے، اگر وہ لکڑی کے ہوتے تو بغیم کہلاتے اور اگر رنگ اور مسالے سے بنتے تو ان کو دمیہ کہتے انصاب اور نصب بن گھڑے پتھر ہوتے تھے جن کو کھڑا کر کے ان پر چڑھاوے چڑھاتے اور جانور ذبح کرتے تھے بیوت جس کا واحد بیت ہے چند گھر تھے جیسے رضا، رئام، قلیس وغیرہ جن میں بت پرستانہ رسوم ادا کئے جاتے تھے جن بتوں کے ارد گرد چکر لگاتے تھے ان کو دوار کہتے تھے اور ان پر جو قربانی کی جاتی اس کو عتیرہ کہتے تھے پتھروں کا ڈھیر لگا کر اس کے چاروں طرف چکر لگاتے تھے اس ڈھیر کو رجمہ کہتے تھے جاہلی شاعر کہتا ہے۔

﴿ کما طاف بالرجمۃ المرتجم ﴾

جیسے پتھروں کے ڈھیر کا طواف لگانے والا طواف کرے۔ [۳]

جن بتوں کی پرستش کی جاتی تھی انکی کوئی انتہا نہ تھی

ع ''قبیلہ قبیلہ کا بت اک جدا تھا''

خاص خانہ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سو ساٹھ ۳۶۰ بت تھے (صحیح بخاری باب فتح مکہ) ان میں سے قرآن پاک میں جن کے نام بتائے گئے ہیں وہ یہ ہیں (۱) لات (۲) عزیٰ (۳) منات (۴) یغوث (۵) یعوق (۶) نسر (۷) ود (۸) سواع (۹) بعل لیکن جاهلیت کے پرانے مؤرخوں اور لغت نویسوں نے جاہلیت کے شخصی ناموں اور شعراء کے اشعار سے بہت سے نام ذکر کئے ہیں ہشام کلبی کی کتاب الاصنام میں جو اس موضوع پر پہلی کتاب ہے اور جو اب مصر میں چھپ بھی گئی ہے تقریباً تیس ۳۰ بتوں کے نام ہیں علامہ ذکی پاشا جنہوں نے کلبی کی اس کتاب کو ۱۳۴۳ھ ۱۹۲۴ء میں تحشیہ اور تکملہ کے بعد شائع کیا ہے اپنے تکملہ میں چھیالیس نام اور بڑھائے ہیں یمن اور حجاز میں آثار قدیمہ کے محققوں

---

[۱] معجم البلدان لفظ لات و کتاب الاصنام للکلبی مطبوعہ دار الکتب المصریہ سنہ ۱۳۴۳ھ صفحہ ۱۹

[۲] نیل المرام فی تفسیر آیات الاحکام صفحہ ۱۱۰، ۱۱۱

[۳] ان الفاظ کے لئے دیکھو لسان العرب

نے عہد جاہلیت کے جو کتبے پڑھے ہیں ان میں المقہ، عشتار، نکرہ، قینان وغیرہ بہت سے اور ناموں کا پتہ لگایا ہے میں نے ارض القرآن کی دوسری جلد میں جو ۱۳۲۶ھ ۱۹۱۸ء میں چھپی ہے ان معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔

ذیل میں ہم ان بتوں کی فہرست درج کرتے ہیں جنکے نام اب تک معلوم ہو چکے ہیں

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جو ان کو خاص طور سے پوجتے تھے
لات	ثقیف۔
عزیٰ	قریش و بنوشیبان بن جابر۔
مناۃ	اوس وخزرج اور عام عرب۔
یغوث	بنومدحج اور اہل جرش۔
یعوق	بنوہمدان اور اہل خیوان۔
نسر	حمیر۔
ودّ	بنوکلب۔
سواع	بنولحیان۔
اساف	بت جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی۔
نائلہ	بت جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی۔
اقیصر	قضاعہ لخم وجذام وعاملہ وغطفان۔
باجر	ازدوطی وقضاعہ۔
ذوالخلصہ	بنوامامہ، خثعم، بجالہ، ازدالسراۃ۔
رضا، یارضی	بنوربیعہ کا بت خانہ۔
رُمام	حمیر کا بت خانہ۔
سبحہ	
سعد	بنی لمکان بن کنانہ۔
سعیر	عنزہ۔
ذوالشریٰ	بنوحارث۔
عائم	ازدالسراۃ۔
عم انس یا عمیانس	خولان۔
قلس	طی۔

ذوالکفین	بنو دوس۔
مناف	قریش۔
نہم	مزنیہ۔
ہبل	قریش۔
بعل	قبائل بنی عدنان۔
بعوب	حدیلہ (بنی طی)۔
اشہل	بنو عبد الاشہل۔
اوال	بکر و تغلب۔
بس	غطفان کا بت خانہ۔
بعیم	ایک لکڑی کا بت۔
بلج	ایک بت۔
جبہ	ایک بت۔
جریش یا حریش	ایک بت جس کی طرف عبد جریش کی نسبت ہے۔
جلسد	ایک بت کا نام۔
جہار	ہوازن کا معبود۔
دار	بنو عبد الدار۔
دوار	ایک بت کا نام۔
ذوالرجل	حجاز کا ایک بت۔
شارق	ایک بت کا نام جس کی طرف عبد الشارق کی نسبت ہے۔
شمس	بنو عبد شمس۔
صدا	عاد کا بت۔
صمودا	عاد کا بت۔
ضمار	عباس بن مرداس سلمی کا قبیلہ۔
ضیزن	منذر اکبر۔
عبعب	قضاعہ۔
عوض	بکر بن وائل۔

عوف	ایک بت کا نام۔
غبغب	اس پر جانور ذبح کئے جاتے تھے۔
فراض	سعد العشیرہ۔
کثری	جدیس وطسم۔
کسعہ	ایک بت کا نام۔
محرق	بکر بن وائل۔
مدان	عبد المدان۔
مرحب	حضرموت۔
منہب	ایک بت کا نام۔
ہبا	عاد۔
ذات الوداع	ایک بت کا نام۔
یالیل	عبد یالیل۔

ستارہ پرستی:

عرب میں ستارہ پرستوں کا بھی ایک گروہ تھا مختلف قبیلے مختلف ستاروں کی پوجا کرتے تھے ان میں سب سے اہم سورج اور چاند تھے۔ اسی لئے قرآن پاک نے خصوصیت کے ساتھ کہا

﴿ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ ﴾ (حم السجدۃ)

نہ سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو۔

یمن میں سبا کی قوم سورج ہی کو گودیبی مانتی تھی (نمل) یمن کے بادشاہ شمر لیرعش نے سورج دیبی کا مندر[1] بنوایا تھا، سورج اور چاند کے بعد ستاروں میں شعری کی بڑی قدر و منزلت تھی اس لئے قرآن پاک نے کہا:

﴿ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی ﴾ (نجم)

اور وہی خدا شعری کا مالک ہے۔

ابن صاعد اندلسی المتوفی ۴۶۲ھ نے اپنی کتاب طبقات الامم میں عرب کے حسب ذیل قبیلوں کو مختلف ستاروں کا پرستار بتایا ہے قبیلہ حمیر سورج کو پوجتا تھا، کنانہ چاند کو، تمیم وبران کو، لخم اور جذام مشتری کو، طی سہیل کو، قیس شعری العبور کو اور اسد عطارد کو۔[2]

---

[1] تاریخ ملوک الارض حمزہ اصفہانی صفحہ ۱۱۰ کلکتہ۔

[2] طبقات الامم قاضی ابن صاعد اندلسی صفحہ ۴۳ بیروت۔

جن اور شیاطین اور بھوت پلیت:

جن اور شیاطین کی نسبت عرب کے عجیب عجیب اعتقاد تھے وہ جن اور شیاطین بھوت پلیت سب کو ایک ہی جنس سمجھتے تھے گو اختلاف صورت اور اشغال کی وجہ سے ان کے الگ الگ نام پڑ گئے تھے جو اجنہ جنگلوں اور میدانوں میں رہتے تھے اور مسافروں کو اپنی صورتیں یا لباس بدل بدل کر دھوکا دیتے تھے ان کا نام غول تھا یہ مذکر بھی ہوتے تھے اور مونث بھی۔

عبید بن ایوب الغیر ی کہتا ہے

﴿ و غولا قفرة ذکرو انثی کان علیهما قطع البجاد ﴾

اور بیابان کے دو غول مرد اور عورت بھی گویا ان دونوں پر کمبل کے ٹکڑے پڑے ہیں۔

مونث کو سعلا ۃ کہتے تھے۔

﴿ ازل و سعلاة و غول بقفرة اذا اللیل واری الجن فیه ار نت ﴾

میں پھسلتا ہوں اور چڑیل اور غول بیابان میں جب رات پردہ پوش ہوتی تھی تو اس میں بھوت آواز دیتے تھے۔

عمرو بن یربوع ایک ممتاز شخص تھا اس نے سعلا ۃ سے نکاح بھی کیا تھا اور اس سے اولاد بھی ہوئی تھی راجز کہتا ہے۔

﴿ یاقاتل اللّٰہ بنی السعلاة ﴾

خدا سعلا ۃ کے فرزندوں کو مارے۔

بلقیس ملکہ یمن سعلا ۃ (ان کے زعم میں) ہی کے پیٹ سے تھی۔

یہ اکثر گاتے بجاتے تھے اور اہل عرب ان کے نغموں سے محظوظ ہوتے تھے

﴿ کم حببت دونك من بهماء مظلمة اتیه ا ذ ا ما مغنی جنه سمر ا ﴾

کتنی اندھیری گھپ راتوں میں' میں نے صحرا کو قطع کیا جب وہاں کے جنات کا مغنی افسانہ گوئی کر رہا تھا

صحرا نشین بدووٗں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے جاڑوں میں جب بدو آگ جلا کر بیٹھتے تھے یہ بھی آگ تاپنے کو آ جاتے تھے لیکن جب ان کو کھانے پر بلاتے تھے تو وہ عذر کرتے تھے کہ ہم آدمیوں کی غذا نہیں کھا سکتے۔

﴿ اتـوانـاری فقلت ممنون انتم فقالوا الجن قلت عمو اظلاما دعوت الی الطعام فقال منهم زعیم نحسد الانس الطعاماً ﴾

وہ لوگ رات کو میرے پاس آئے تو میں نے کہا تم کون ہو انہوں نے کہا ہم جن ہیں میں نے کہا اس تاریکی میں خوش ہو، میں نے ان کو کھانے کے لئے بلایا تو ان میں سے ایک سردار نے کہ ہم انسان کے کھانے پر حسد کرتے ہیں

یہ زیادہ تر جہاں آباد تھے ان موضعوں کے نام بدی، بقار اور عبقر تھے

ع :	جن البدی رواسیا اقدامها	بدی کے جن؛ جن کے قدم جمے تھے
ع :	تحت السنور جنة البقار	زرہوں کے نیچے بقار کے بھوت تھے
ع :	علیهن فتیان کجنة عبقر	اور ان پر شہسوار جوان عبقر کے بھوت معلوم ہوتے تھے۔

ان کے اقسام حسب ذیل تھے:

جو آدمیوں کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے ان کو عامر کہتے تھے۔

جو بچوں کو ستاتے تھے ان کا نام روح تھا۔

جو زیادہ شریر تھے ان کو شیطان کہتے تھے۔

اس درجہ سے بڑھ کر جو شریر ہوتا تھا اس کو عفریت کہتے تھے۔

یہ اکثر بچوں اور جوانوں کو اٹھا کر لے جاتے تھے حضرت علیؓ کے ایک بھائی طالب تھے ان کو اٹھا کر لے گئے اور پھر ان کا پتہ نہ چلا۔ عمرو بن عدی لخمی جو عرب کا بادشاہ تھا اس کو بھی اٹھا لے گئے تھے لیکن کئی برس کے بعد جذیمہ ابرش کو لا کر دے گئے۔

اسی طرح خرافہ کا قصہ ہے جس کو جن اٹھا کے لے گئے تھے مدت کے بعد وہ واپس آیا تو عجیب عجیب باتیں بیان کرتا تھا۔[1]

ان اجنہ یا شیاطین سے جن لوگوں کے تعلقات زیادہ بڑھ گئے تھے ان میں تابط شرا اور ابوالبلاد طہوی زیادہ مشہور تھے طہوی نے ایک دفعہ ایک بھوت گوت کو مار ڈالا۔ اس کے واقعات ایک نظم میں لکھے ہیں۔

﴿ لقیت الغول تسری فی ظلام فصدت وانتحیت لها بغضب حسام غیر موتشب
یمانی فقد سراتها والبرد منها فخرت للید ین وللجوان ﴾[2]

میں غول بیابانی سے ملا جو رات کو اندھیرے میں چلتی ہیں گو اس نے روکا اور میں یمن کی بنی ہوئی اصیل تلوار لے کر اس کی طرف بڑھا تو اس نے اس کے سر کو اور اس کی زرہوں کو کاٹ ڈالا اور وہ دونوں ہاتھوں اور سینہ کے بل زمین پر گر پڑا۔

انہیں اجنہ اور شیاطین کا زور توڑنے کے لئے قرآن نے قیامت کے اس سوال و جواب کا انداز اختیار کیا ان کے دوست انسان وہاں بھی ان کی دوستی کا دم بھرتے جائیں گے اس سے اندازہ ہوگا کہ جاہل عربوں پر ان کا کس قدر استیلاء تھا۔

﴿ یٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ قَدِ اسۡتَکۡثَرۡتُمۡ مِّنَ الۡاِنۡسِ وَقَالَ اَوۡلِیٰٓؤُهُمۡ مِّنَ الۡاِنۡسِ رَبَّنَا اسۡتَمۡتَعَ بَعۡضُنَا بِبَعۡضٍ ﴾ (انعام)

اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانوں سے بہت کچھ وصول کیا اور ان کے دوست دار انسان بولے اے ہمارے رب ہم میں سے ایک نے دوسرے کا کام نکالا۔

کہانت:

کہانت ایک سخت بلا تھی جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی ہر جگہ ایک یا کئی کاہن ہوتے تھے جو آئندہ واقعات کی

---

[1] شمائل ترمذی باب السمر۔

[2] یہ تمام تفصیل کتاب الحیوان جاحظ سے ماخوذ ہے اس نے کئی ورق میں نہایت تفصیل سے یہ واقعات لکھے ہیں دیکھو کتاب مذکور از صفحہ ۴۸ تا صفحہ ۸۰ جز ششم مطبوعہ مطبع سعادت، مصر۔

پیشین گوئیاں کرتے اور آسمانی خبریں بتاتے تھے اہل عرب کا اعتقاد اور خود کاہنوں کا دعویٰ تھا کہ ان کے ساتھ ایک ایک جن [1] رہتا ہے اور وہی ان کو القا کرتا ہے وہ اپنی شکل وصورت ایسی بناتے تھے کہ پہچان لئے جاتے تھے چنانچہ ایک بار حضرت عمرؓ کے سامنے سے ایک آدمی گذرا انہوں نے قیافہ سے اس کو پہچان لیا کہ وہ کاہن ہے اس کو بلا کر پوچھا کہ تیرے جن نے تجھ سے سب سے عجیب تر بات کیا بیان کی؟ اس نے کہا میں نے ایک روز بازار میں پھر رہا تھا کہ میرا جن گھبرایا ہوا آیا اور کہا۔

﴿ الم ترالی الجن وابلاسها و سها من بعد الکاسها ولحوقها بالقلاص واحلاسها ﴾

کیا تم جنوں کی سراسیمگی ان کی ناامیدی اور ان کے کاروبار کی ابتری نہیں دیکھتے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا سچ کہتا ہے میں ایک روز زمانہ جاہلیت میں بتوں کے پاس سویا ہوا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی نے ایک گوسالہ لا کر ذبح کیا اس کے بعد ایک شخص زور سے چلایا۔

﴿ یا جلیح امرنجیح رجل فصیح یقول لا اله الااللّٰه ﴾

اے جلیح، کامیاب امر ایک فصیح شخص لا الہ اللہ کہتا ہے۔

اس کے چند ہی دنوں بعد آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی تھی [2] صحیح بخاری (تفسیر سورۂ والضحیٰ) میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کچھ علیل ہو گئے اور دو تین دن رات کو عبادت کے لئے نہیں اٹھے اس پر ایک عورت (یہ ابولہب کی زوجہ تھی) نے آ کر آنحضرت ﷺ سے کہا۔

﴿ انی ارجوان یکون شیطانك قد ترکك ﴾

میرا خیال ہے کہ تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا۔

یہ وہی خیال تھا چونکہ کفار آپ کو کاہن خیال کرتے تھے اس لئے ان کا خیال تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی جن یا شیطان رہتا ہے۔ قرآن پاک نے اسی کی تردید اس آیت میں کی ہے۔

﴿ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰی مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ o تَنَزَّلُ عَلٰی كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ o يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ ﴾ (شعراء)

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتا ہے شیطان ہر جھوٹے گنہگار پر اترتا ہے جو سنی سنائی بات القاء کرتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔

یہ کاہن تمام مقدمات اور نزاعات کا فیصلہ بھی کرتے تھے اور اس بناء پر تمام ملک پر ان کا اثر چھایا ہوا تھا ان میں سے حازی، شق، سطیح، عزی بہت مشہور تھے جاحظ نے ان کے کاہنانہ فقرے کتاب البیان میں نقل کئے ہیں۔

﴿ والارض والسماء والعقاب والصقعاء واقعة ببقعاء لقد نفرالمجد بنی العشراء للمجد و المناء ﴾

---

[1] کتاب البیان والتبیین للجاحظ جلد اول صفحہ ۱۱۳ مطبوعہ علمیہ مصر۔

[2] صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۵۴۶

قسم ہے زمین اور آسمان کی اور عقاب اور آفتاب کی ایک واقعہ میدان میں واقع ہوا کہ بزرگی بنوعشراء پر غالب آ گئی بوجہ بڑائی اور بلندی کے۔

یہ کاہن جو خبریں بتاتے یا تلقین کرتے وہ بڑے تکلف اور مقفی اور مسجع فقرے ہوتے اس لئے جب ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کے سامنے ایک ساقط الحمل بچہ کا مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے اس کی دیت کا فیصلہ کیا تو ایک شخص نے عرب کے دستور کے مطابق اعتراضاً کہا۔

﴿ اریت من لاشرب ولا اکل ولا صاح فاستھل الیس د مہ بطل ﴾

غور فرمایئے کہ جس بچہ نے نہ کھایا نہ پیا نہ چیخا نہ رویا' کیا اس کا خون معاف نہ ہوگا۔

آپ نے فرمایا یہ کاہنوں کے بھائیوں میں سے ہے (صحیح مسلم دیۃ الجنین وصحیح بخاری باب الکہانۃ)

یہ کاہن بت خانوں میں رہتے تھے اور کسی خاص بت کے پجاری ہوتے تھے جب لوگ ان سے غیب کی بات پوچھتے یا وہ خود آئندہ کے متعلق پیشین گوئی کرنے لگتے تو ایک خاص کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے مرد بھی کاہن ہوتے تھے اور بعض عورتیں بھی ہوتیں تھیں جو کاہنہ کہلاتی تھی [1] یہ مصیبتوں اور بلاؤں کے دور کرنے کے لئے بت پرستانہ علاج اور تدبیر بتاتے تھے یہ اپنی کہانت کی اجرت میں بڑی بڑی رقم اور نذرانے وصول کرتے تھے اسلام کے بعد ان میں جو مسلمان ہوگئے وہ علانیہ اپنے خدع وفریب کا اعتراف [2] کرتے تھے ان کو نذرونیاز اور اجرت کی جو رقم یا تحفہ ملتا اس کا نام حلوان الکاہن تھا یعنی کاہن کے منہ میٹھا کرنے کے لئے تحفہ۔ اسلام نے آکر اس کو روک دیا۔ [3]

غرض ان کاہنوں نے عوام فریبی کا بڑا جال پھیلا رکھا تھا اور یہ انہی کا اثر تھا کہ ملک کا ملک سینکڑوں قسم کی وہم پرستیوں میں مبتلا ہوگیا تھا۔

شعراء کی نسبت بھی عرب کا خیال تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان رہتا ہے اور وہی اس کو اشعار القاء کرتا ہے چنانچہ مخبل شاعر کی شیطانہ عمرو کی بیٹی تھی، اور اعشیٰ جو عرب کا مشہور شاعر تھا اس کے شیطان کا نام مسحل تھا۔ اعشیٰ خود کہتا ہے:

﴿ دعوت خلیلی مسحلا و دعوالہ بجھنام یدعی للھجین المذمم حبانی اخی الجنی
نفسی فداء ہ یاقبح جیاس العشیات مرجم ﴾ [4]

میں نے اپنے دوست مسحل کو پکارا اور انہوں نے اس کے لئے جہنام کو پکارا' اور یہ کمینہ بداطوار کے لئے بلایا جاتا ہے' مجھ کو میرے جن دوست نے میری جان اس پر فدا ہو' شاموں کے وقت سب سے بڑے خوش مارنے والے اور سخت پتھراؤ کرنے والے کو دیا۔

جو اعلیٰ درجے کا شاعر ہوتا اس کا شیطان یا جن مذکر ہوتا تھا۔ ابوالنجم کہتا ہے:

﴿ انی وکل شاعر من البشر شیطانہ انثی وشیطانی ذکر ﴾

---

[1] بخاری جلد اول صفحہ ۵۴۲ کتاب الطب باب الکہانۃ۔

[2] بخاری جلد اول صفحہ ۵۴۲ کتاب الطب باب الکہانۃ۔

[3] اعشی کے دیوان مطبوعہ ویانا صفحہ ۶۵ میں صرف پہلا شعر ہے اور اس کا بھی دوسرا مصرع اس طرح ہے جہنام جدعا للھجین المذمم۔

[4] ابوداؤد مطبوعہ مجتبائی جلد ۲ صفحہ ۳۲۶۔

ہر شاعر کا شیطان تو مونث ہے مگر میرا شیطان مذکر ہے۔

شنقنان اور شیصبان روسائے شیاطین تھے جو شاعری سکھلاتے تھے ایک شاعر کو اس پر فخر تھا کہ اس کا معلم اسی شیصبان کی اولاد سے ہے۔

﴿ ولی صاحب من بنی الشیصبان فطورا اقول وطورا ھولاء ﴾
میرا ساتھی شیصبان کی اولاد ہے تو کبھی میں شعر کہتا ہوں کبھی وہ۔

اوہام پرستی:

سانپ کو قتل نہیں کرتے تھے یہ اعتقاد تھا کہ سانپ مارا جائے تو اس کا جوڑا آ کر بدلہ لیتا ہے۔[1] یہ اعتقاد تھا کہ مرنے کے بعد روح ایک پرند بن کر اڑتی رہتی ہے اس کو ہامہ کہتے تھے' یہ اعتقاد تھا کہ پیٹ میں ایک سانپ رہتا ہے جو بھوک کے وقت کاٹتا ہے، جو کام کرنا چاہتے تھے پہلے شگون لے لیتے تھے مثلاً اس وقت کوئی پرند داہنی جانب سے اڑا تو مبارک سمجھتے تھے اور بائیں جانب سے اڑا تو اس وقت اس کام سے باز رہتے تھے، بکری کا جب بچہ پیدا ہوتا تو اگر نر ہوتا تو بت پر چڑھا دیتے، اونٹنی جب دس بچے جن لیتی تو اس کو چھوڑ دیتے وہ سانڈ کی طرح چھوٹی پھرتی۔

کسی شخص کے پاس جو اونٹوں کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ جاتی تو ایک اونٹ کی آنکھ پھوڑ دیتے کہ نظر نہ لگ جائے جب کبھی قحط پڑتا تو بھیڑ یا دنبہ کی دم میں گھاس پھونس باندھ کر آگ لگا دیتے اور سمجھتے کہ اس سے پانی برسے گا سفر میں جاتے تو کسی درخت میں ڈورو غیرہ باندھ کر گرہ لگا دیتے واپس آ کر دیکھتے اگر گرہ کھل گئی ہے تو سمجھتے کہ ان کی بیوی نے بدکاری کی، سفر میں راستہ بھول جاتے تو کپڑے الٹ کر پہن لیتے، اور سمجھتے کہ اس سے راستہ مل جاتا ہے۔ یہ خیال تھا کہ جو شخص لات وعزی کو گالی دیتا ہے اس کو برص یا جذام ہو جاتا ہے[2] ہاتھوں میں پیتل کی انگوٹھی پہنتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ اس سے ضعف جاتا رہتا ہے[3] اس قسم کے سینکڑوں اوہام پھیلے ہوئے تھے جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

یہ تو ان کے مذہبی حالات وخیالات تھے ان کی اخلاقی کیفیت بھی ایسی ہی پست تھی ان کے اخلاق معائب میں سب سے نمایاں چیز ان کی جنگ جوئی تھی جس نے ان کو حد درجہ خونخوار، سنگدل اور سفاک بنا دیا تھا۔

جنگجوئی:

ذرا ذرا سی بات پر لڑنا مرنا اور ایک دوسرے کا سر کاٹ لینا ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے اور ہر خاندان دوسرے خاندان سے برسرپیکار تھا ہر بچہ اپنے باپ اور عزیزوں کے قاتل سے انتقام لینے کے جذبہ میں پرورش پاتا تھا، اور جوان ہو کر اس مقدس فرض کو انجام دیتا تھا، اور اس طرح ایک لڑائی کا سلسلہ برسوں تک قائم رہتا تھا انہیں لڑائیوں کو مؤرخین اور اہل ادب ایام العرب کہتے ہیں جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے میدانی نیشاپوری

---

[1] یہ باتیں بلوغ العرب اور اطوار العرب وغیرہ کتابوں میں مذکور ہیں۔

[2] مسند داری صفحہ ۸۹۔

[3] ابن ماجہ جلد صفحہ ۱۸۸ التیق التمائم ابواب الطب۔

المتوفی ۵۱۸ھ نے کتاب الامثال میں ان میں سے ۱۳۲ لڑائیوں کے نام بتانے کے بعد یہ لکھا ہے۔

﴿ هذ الفن لایتقصاه الاحصاء فاقتصرت علی ماذکرت ﴾ (جلد۲ص ۷۱ خیریہ مصر)

یہ فن شمار کا استقصاء نہیں کرسکتا اس لئے جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس پر میں نے قناعت کی۔

یہ تمام لڑائیاں وہ ہیں جو اسلام سے چالیس پچاس برس پیشتر سے اسلام تک ہوئیں ان میں سب سے مشہور لڑائی عبس و ذبیان کی ہے جس کا واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں قبیلوں کے دو گھوڑے داجس اور غبرا کا باہمی مقابلہ تھا ان میں سے ایک فریق نے گھوڑ دوڑ کے قواعد کی خلاف ورزی کی اور لڑائی ہو پڑی۔ یہ لڑائی ان دونوں قبیلوں میں پورے چالیس برس تک قائم رہی دوسری مشہور لڑائی حرب بسوس ہے اس کا واقعہ یہ ہے کہ بسوس نامی ایک قبیلہ کی عورت کی اونٹنی کلیب بن وائل کی چراہ گاہ میں جا پڑی کلیب نے اپنے تیر سے اس کے تھن کو زخمی کردیا اس بات نے قبیلہ میں آگ لگا دی کلیب جان سے مارا گیا اور بکر و تغلب میں خونریز جنگ ہوئی عکاظ کے میلہ میں سلیم اور غطفان کے سرداروں میں کچھ مناقشہ ہوا چند روز کے بعد موقعہ پا کر ایک کو قتل کردیا گیا اس کے انتقام کے لئے خون کی ندیاں بہیں۔ بکر و تمیم میں ایک چراہ گاہ کے معاملہ میں خونریز لڑائی ہوئی اوس و خزرج مدینہ کے دو قبیلوں میں جو ہولناک لڑائیاں ہوتی رہیں ان میں سب سے مشہور یوم بعاث ہے جس میں دونوں قبیلوں کے اکثر سردار کام آئے اس لڑائی کا خاتمہ انصار مدینہ کی بیعت پر ہوا قریش کی مشہور لڑائیوں کا نام ایام فجار ہے، ایک اور مشہور لڑائی کا نام ذی قار ہے۔

الغرض معمولی سے اشتعال سے قتل تک نوبت پہنچتی تھی، قتل سے انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا تھا اور لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جاتا تھا[1] ان میں لڑنا اور مرنا جاہلیت کا شرف اور ایک قبیلہ کی آن سمجھی جاتی تھی اور اس خون آشامی کا ذوق ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی ان لڑائیوں میں سفاکی بے رحمی اور قتل و غارت کی بدترین مثالیں پیش آتی رہتی تھیں

شراب خوری:

شراب جو ہر قسم کے فسق و فجور اور مظالم اور بدکاری کا سرچشمہ ہے عربوں میں اس کا اس قدر رواج تھا کہ ہر گھر ایک میکدہ بن گیا تھا اس کا نہ پینا اس قدر نامانوس بات تھی کہ جن چند آدمیوں نے اسلام سے پہلے اس کے پینے سے پرہیز کیا تھا ان کے نام یاد رکھے گئے تھے دوست و احباب کسی گھر میں جمع ہوتے شراب کا دور چلتا ساتھ ہی جوئے کھیلتے ان میں اونٹوں کی ہار جیت ہوتی جو جیتتا وہ جیتے ہوئے اونٹوں کو اسی وقت ذبح کرکے لوگوں کو کھلا دیتا کبھی نشہ میں سرشار ہو کر خود صاحب خانہ اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے اونٹوں کو کاٹ کاٹ کر ڈھیر کردیتا اور لوگ گوشت بھونتے' کباب لگاتے اور کھاتے اور کھلاتے اور اپنی اس بے جا فیاضی پر فخر کرتے' سامنے فاحشہ عورتیں گاتیں بجاتیں اور اسی مخموری کے عالم میں بے شرمی کی باتیں کرتے' جاہلیت کا مشہور شاعر طرفہ کہتا ہے۔

فان تبغی فی حلقه القوم تلقنی وان تقتنصنی فی الحوانیت تصطه

اگر تو مجھے لوگوں کے حلقہ میں ڈھونڈ لے تو پائے گا اور اگر شراب خانوں میں مجھے شکار کرنا چاہے تو کرسکتا ہے

---

[1] ان لڑائیوں کے مفصل حالات کے لئے دیکھو عقد الفرید ابن عبدربہ جلد ۳ امثال میدانی لفظ ''یوم''

متی تاتنی اصبحك كاساروية　　　وان كنت عنها غائبا فاغن وازود

جب بھی تو میرے پاس آئے میں تجھے شراب کا پیالہ پلاؤں گا اور اگر تو اس سے بے نیاز ہو کر آئے تو جا اور بے نیازی کر

ندا مای بیض کالنحوم وقینة　　　تروح الینابین بردو مجّد

میری محفل شراب کے ہم نشین ستاروں کی طرح گورے چٹے ہیں ایک مغنیہ ہے جو شام کو ہمارے پاس یمنی چادر اور زعفرانی کپڑوں میں آتی ہے۔

رحیب قطاب الجیب منها رفیقة　　　بجس الندامی بضة المتجرد

اس کے گریبان کا شگاف بڑا ہے شرابی رفیقوں کی دست اندازی سے مانوس اس کے بدن کے برہنہ حصے لطیف ہیں

اذا نحن قلنا اسمعینا انبرت لنا　　　علی رسلها مطروقة لم تشدد

جب ہم کہتے ہیں کہ ہمیں سناؤ تو آہستہ آہستہ نزاکت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے

ومازال تشرابی الخمور ولذتی　　　وبیعی وانفاقی طریفی و متلدی

اور میری شراب نوشی اور لذت اندوزی اور اپنی حاصل کردہ اور موروثی دولت کو خرچ کرنا میرا اشعار ہے

ولولا ثلث هن من لذة الفتی　　　وجدك لم احفل متی تام عو دی

اگر تین باتیں نہ ہوتیں جو ایک شریف کا لطف ذوق ہیں تو میری قسم، میں اپنی موت کی پرواہ نہ کرتا

فمنهن سبقی العاد لات بشربة　　　كمیت متی ما تمل بالماء تزبدی

ان میں سے ایک تو نصیحت کرنے والیوں کی بات کا خیال کئے بغیر سرخ وسیاہ رنگ شراب کا پیالہ پی لینا جس میں پانی ملانے سے جوش آئے۔

وتقصیر یوم الد جن والد جن معجب　　　ببهكتة تحت الخباء المعمد

اور دوسری بات گھنگھور گھٹا کے دن کو اور وہ کیسا پر لطف دن ہوتا ہے کسی بلند خیمہ کے نیچے حسین معشوقہ سے لطف اندوزی میں چھوٹا کرتا ہے۔

كریم یروی نفسه فی حیاته　　　ستعلم ان متناغدا اینا الصدی

میں وہ فیاض ہوں جو اپنی زندگی میں اپنے آپ کو شراب پلا کر سیراب کرتا ہے موت کے بعد معلوم ہوگا کہ ہم میں پیاسا کون ہے۔

وبرك هجور قد اثارت مخافتی　　　بوا دبها امشی بعضب مجرد

اور کتنے بیٹھے ہوئے سوئے اونٹ تھے کہ میرے خوف نے ان کے اگلوں کو ڈرایا جب میں ننگی تلوار لے کر چلا۔

فمرت كهاة ذات خیف جلالة　　　عقیلة شیخ كالو بیل یلتدد

تو ایک موٹی اونٹنی جو ایک بڈھے کی جولٹھ کی طرح جھگڑالو تھا قیمتی چیز تھی، سامنے آ گئی۔

وقال الاماذا ترون بشارب　　　شدید علینا بعینه متحمد

(اور جب میں نے تلوار سے کونچ کاٹ کر اونٹنی کو گرا دیا) تو اس بڈھے نے کہا اس بدمست کو دیکھو جو جان بوجھ کر ظلم کر رہا ہے۔

فظل الاماء یمتللن خوارها　　　ویسعی علینا بالسدیف المسراهد

تو لونڈیاں اس کے بچہ کو جو اس کے پیٹ سے نکلا تھا بھوننے لگیں اور چربی دار کوہان کا گوشت لے کر ہمارے پاس دوڑا جانے لگا۔

لبید بن ربیعہ جو عرب کا مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کی محفل کا چوتھا ممبر ہے کہتا ہے۔

بل انت لا تدرین کم من لیلة   طلق لذ یذ لهوها و ند امها

بلکہ تو نہیں جانتی کہ کتنی کھلی ہوئی راتیں جن کی دلچسپی اور ہم نوشی پر لطف تھی۔

قد بث سامرها وغایه تاجر   وافیت اذ رفعت وعزا مدامها

میں ان کا قصہ گو تھا اور شراب نوش کی منزل میں آتا جاتا رہا جب جھنڈا بلند ہوا اور شراب کی قیمت گراں ہو گئی۔

اغلی السباء بکل اد کن عاتق   ارجونة قد حت وفض ختامها

میں اس کی قیمت کو اور گراں کر رہا تھا پرانی خاکی رنگ کی مشک یا خم خرید کر جو پیالوں میں بھری جاتی اور اس کی مہر توڑی جاتی۔

وصبوح صافیة وجذب کرینة   بمو ترتاتاله ابهامها

اور کتنی صبح کی صاف شراب اور مغنیہ کا عود کو کھینچ کر اپنے انگوٹھے سے دباتا۔

باد رت حاجتها الدجاج بسحرة   لا عل منها حین هب نیامها

میں نے شراب کی ضرورت مرغ سحر سے پہلے پوری کی تاکہ میں اس کے سونے والوں کے جاگنے سے پہلے دہرالوں۔

تغلب ان قبیلوں میں تھا جنہوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا لیکن اس مذہب نے بھی عربوں کو اس بری عادت سے باز نہیں رکھا تھا بلکہ شراب کی درآمد زیادہ تر انہیں عیسائیوں کے ملک شام سے ہوتی تھی تغلب کا سب سے بڑا شاعر اپنے فخریہ میں کہتا ہے۔

الاهبی بصحنك فاصبحینا   ولاتبقی خمور الا ند رینا

ہاں اپنا پیالہ لے کر اٹھ جا اور مجھے صبح کی شراب پلا اور اندریں (شامی گاؤں) کی کوئی شراب چھوٹنے نہ پائے۔

مشعشة کان الحض فیها   اذ اما الماء خالطها سخینا

پانی میں ملی ہوئی گویا اس میں کسم کے پھول پڑے ہیں جب گرم پانی اس میں ملاؤ۔

تجور بذی اللبانة عن هو اه   اذ ا ما ذاقها حتی یلینا

غرض مند کو اس کی غرض بھلا دے اگر اس کو چکھ لے یہاں تک کہ اس کو نرم کر دے۔

تری اللحر الشحیح اذا مرّت   علیه لماله فیها مهینا

تنگ دل بخیل پر بھی اگر اس کا ایک دور گذار دیا جائے تو وہ اپنی دولت کو لٹا دے۔

ضبنت الکاس عنا ام عمرو   و کان الکاس مجراها الیمینا

اے عمر کی ماں! تو نے ہم سے پیالہ ہٹا لیا حالانکہ پیالہ کا دور داہنی طرف تھا۔

وما شر الثلثه ام عمر و   بصاحبك الذی لاتصبحینا

حالانکہ تیرا وہ ہم نشین جس کو تو نہیں پلاتی تین میں سب سے بد تر نہیں۔

كاس قد شربت ببعلبك   واخرى فى د مشق وقاصرينا

اور ایک وہ پیالہ جس کو بعلبک میں پیا اور دوسرا وہ جو دمشق اور قاصرین میں پیا۔

ان اشعار سے اندازہ ہوگا کہ جاہلیت میں شراب نوشی کا کیا عالم تھا شراب فروشوں کی دوکانیں کسی ممتاز مقام پر ہمیشہ کھلی رہتی تھیں اور نشان کے لئے وہاں جھنڈا اڑا کرتا تھا جس کو غایہ کہتے تھے (دیکھو اوپر لبید کا دوسرا شعر) انتہا یہ ہے کہ تجارت کا لفظ ''شراب فروشی'' کا مترادف بن گیا تھا۔ ایک جاہلی شاعر عمرو بن قمئہ کہتا ہے

اذا سحب الريط والمروط الى   ادنى تحارى وانفض اللمم (حماسہ)

یاد ہے وہ دن جب میں اپنی چادر گھسیٹتا ہوا قریب ترین شراب خانے میں جاتا تھا اور اپنے گیسوؤں کو جھاڑتا تھا

بدر میں قریش کے جو دولت مند رؤساء مارے گئے تھے ان کے مرثیہ میں قریش کا ایک شاعر خاص طور سے ان کی بزم شراب اور مجلس رقص وسرود کی بربادی کا ماتم کرتا ہے۔

وماذا بالقليب قليب بدر   من القينات والشراب الكرام [1]

بدر کے گڑھے میں (جس میں مقتولین کی لاشیں ڈالی گئی تھیں) ناچنے والیوں اور فیاض شرابیوں کا ماتم ہے۔

شراب کے رواج عام کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ عربی زبان میں شراب کے ڈھائی سو نام ہیں اور علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے خاص ان ناموں پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے تمام گھروں میں شراب کی مجلسیں قائم ہوتیں گھر کی عورتیں اور چھوٹے بچے ساقی بنتے تھے یہ شعر اوپر گذر چکا ہے جس میں شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے۔

﴿صبيت الكاس عنا ام عمرو   كان الكاس مجراها اليمينا﴾

اے ام عمرو! تو نے شراب کا پیالہ ہم سے ہٹا لیا حالانکہ پیالہ کی گردش داہنی طرف سے تھی۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اسلام لانے سے پہلے میں اپنے باپ (عباس) کی زبان سے کم سنی میں یہ سنا کرتا تھا ﴿اسقنا كاسا دهاقا﴾ شراب کا ایک لبریز پیالہ ہم کو پلا۔ [2]

صحیح بخاری کتاب الاشربہ میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب شراب حرام ہوئی تو اس وقت ایک مجلس تھی جس میں حضرت ابو دجانہؓ، ابو طلحہؓ، سہیل بن بیضاء شریک تھے اور میں جو کہ سب سے کمسن تھا ساقی گری کی خدمت انجام دے رہا تھا۔

شراب کس بے تکلفی سے پی جاتی تھی، کس درجہ کے لوگ پیتے تھے، کس قسم کے افعال اس حالت میں سرزد ہوتے تھے، اس کا اندازہ صحیح بخاری کی ایک روایت سے ہوگا [3] جو حرمت شراب سے قبل کا واقعہ ہے۔

غزوۂ بدر میں حضرت علیؓ کو مال غنیمت میں سے ایک اونٹنی ملی تھی، خمس میں سے ایک اور اونٹنی آنحضرت ﷺ نے عطا فرمائی، حضرت علیؓ کا نکاح حضرت فاطمہؓ سے ہو چکا تھا اور وہ دعوت ولیمہ کی تیاری کر رہے تھے ارادہ تھا کہ جنگل میں جا کر اذخر (ایک گھاس کا نام) لائیں اور زرگروں کے ہاتھ فروخت کریں اس ارادہ سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ان

---

[1] صحیح بخاری، باب الہجرۃ جلد اول صفحہ ۵۵۸۔

[2] صحیح بخاری باب ایام الجاہلیۃ جلد اول صفحہ ۵۴۱۔

[3] ایضاً کتاب الغزوات غزوۂ بدر صفحہ ۵۷۱۔

کہ اونٹنیوں کے کوہان کسی نے کاٹ لئے ہیں اور پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکال لیا ہے لوگوں سے پوچھا یہ کام کس کا ہے؟ معلوم ہوا کہ پاس ہی ایک گھر میں حضرت حمزہؓ چند انصار کے ساتھ شراب پی رہے تھے ایک مغنیہ نے گاتے گاتے یہ مصرع گایا۔

﴿الا یا حمز للشرف النواء﴾

اے حمزہ! موٹی اونٹنیوں کے لئے۔

حضرت حمزہ تلوار لے کر اٹھے اور اونٹنیوں کے پیٹ چاک کر کے ان کے کلیجے نکال لئے، حضرت علیؓ نے جا کر آنحضرت ﷺ کو خبر کی اور یہ ماجرا بیان کیا آنحضرت ﷺ نے چادر اوڑھی اور حضرت علیؓ اور زیدؓ کو لے کر حضرت حمزہؓ کے پاس گئے حضرت حمزہؓ مخمور تھے آنحضرت ﷺ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور کہا "تم سب میرے غلام ہو"۔ آنحضرت ﷺ یہ حالت دیکھ کر چلے آئے۔

حضرت حمزہؓ نے ۳ھ میں شہادت پائی اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔

شراب کی حرمت جس تدریج سے نازل ہوئی ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ تمام ملک کس طرح اس میں مبتلا تھا کس طرح وہ مقبول عام ہو چکی تھی کہ اس کی حرمت کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا اور کنایہ اشاروں سے گذر کر جب تک صاف ممانعت نہیں کر دی گئی لوگ سمجھ نہیں سکے۔

ابوداؤد کتاب الاشربہ میں روایت ہے کہ جب شراب کی ممانعت نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ نے کہا "اے خدا! شراب کے بارہ میں ہم کو صاف صاف بتا دے" ان کے اصلی الفاظ یہ ہیں۔

﴿اللهم بين لنافي الخمر بيانا شفاء﴾

اے خدا! شراب کے بارے میں ہمارے لئے شافی بیان کر دے۔

اس پر سورۂ بقرہ کی یہ آیت اتری۔

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ط قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ (بقرہ)

لوگ تم سے شراب اور قمار بازی کی نسبت سوال کرتے ہیں تو کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں، لیکن فائدہ سے گناہ بڑھ کر ہے۔

اس آیت کے اترنے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے پلاتے رہے یہاں تک کہ ایک دفعہ ایک انصاری نے حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ وغیرہ کی دعوت کی، شراب کا دور چل رہا تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت آ گیا ایک صاحب[1] نے امامت کی، مگر نشہ کے خمار میں ﴿قُلْ يَآ اَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ﴾ کے سورہ کو کچھ کا کچھ پڑھ گئے اس پر یہ آیت اتری

---

[1] شراب کی حرمت کی یہ تاریخی صورت حضرت عمرؓ (ترمذی تفسیر مائدہ ابوداؤد کتاب الاشربہ) حضرت ابوہریرہؓ (مسند احمد ج ۲ ص ۲۵۱) اور حضرت علیؓ (ابوداؤد کتاب الاشربہ) سے مروی ہے یہ بات کہ وہ کون صحابی تھے جنہوں نے نشہ کی حالت میں غلط ملط سورہ پڑھ دی تھی، ~~روایات سے صاف طور پر ظاہر نہیں ہوتی، ایک روایت میں~~ حضرت علیؓ کا نام ہے اور دوسری میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا نام اور تیسری میں کوئی مہاجر مذکور ہے حضرت الاستاذ نے سیرۃ جلد دوم (تاریخ احکام ذکر حرمت شراب) میں ابوداؤد کتاب الاشربہ کے حوالہ سے حضرت علیؓ کا نام لکھ دیا تھا مگر مزید تحقیق سے یہ نسبت مشکوک معلوم ہوتی ہے اس خاص روایت کا مرکزی راوی عطا بن السائب عن ابی عبدالرحمٰن ہے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

﴿ لَاتَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ (نساء)

نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو یہاں تک کہ تم جو کہو اس کو سمجھ بھی سکو۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

ابوعبدالرحمٰن سلمی حضرت علیؓ سے روایت کرتا ہے اس سے یہ روایت مختلف طریقوں سے آئی ہے اور ہر ایک میں شراب پینے والوں اور حالتِ نشہ میں نماز پڑھانے والے کے نام کا اختلاف ہے، چنانچہ روایت کے اصلی الفاظ میں وہ روایتیں جن میں حضرت علیؓ کا نام ہے۔

۱۔ عن ابی جعفر الرازی عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن السلمی عن علی بن ابی طالب قال صنع لنا عبدالرحمن بن عوف طعا ما فدعانا و سقانا من الخمر فاخذت الخمر مناو حضرت الصّلوٰۃ فقد مونی فقرات قل يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ونحن نعبد ما تعبدون فانزل اللّٰه يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى

(ترمذی تفسیر نساء)

ابوجعفر رازی نے عطاء بن سائب سے، عطا نے ابوعبدالرحمٰن سلمی سے، ابوعبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علیؓ بن ابی طالب سے روایت کی کہ انہوں نے فرمایا کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ہمارے لئے کھانا تیار کرایا اور ہم کو مدعو کیا اور شراب پلائی جب ہم شراب کے نشہ میں چور ہو گئے اور نماز کا وقت آیا تو لوگوں نے مجھ کو امام بنایا اور میں نے قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ونحن نعبد ماتعبدون پڑھی اس پر خدا نے یہ آیت اتاری يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى (یعنی مسلمانو! نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو)

۲۔ عن سفیان حدثنا عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن السلمی عن علی رضی اللّٰہ عنہ ان رجلا من الانصار دعاہ عبدالرحمن بن عوف فسقا ھما قبل ان محرّم الخمر فامھو علی فی المغرب۔

سفیان نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابوعبدالرحمٰن سلمی سے ابوعبدالرحمٰن سلمی، حضرت علی علیہ السلام سے یہ روایت کی ہے کہ انصار کے ایک شخص نے ان کو اور عبدالرحمٰن بن عوف کو مدعو کیا اور تحریم شراب سے پہلے ان دونوں کو شراب پلائی پھر علیؓ نے نماز مغرب پڑھائی۔

۳۔ خالد بن عبداللہ عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن ان عبدالرحمن صنع طعا ما فدعا فقرأ قُل يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ فخلط فیھا فنزلت لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ (ابوداؤد کتاب الاشربہ)

خالد بن عبداللہ عطا بن سائب سے، عطا ابی عبدالرحمٰن سے روایت کرتے ہیں کہ عبدالرحمٰن نے کھانا تیار کرایا اور صحابہ میں سے ایک نے امامت کی اور قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھی لیکن اس میں گڈمڈ کر دیا، اس پر آیت اتری لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ نشے کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ جو کچھ کہتے ہو اس کو جان لو۔

وہ روایتیں جن میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا نام ہے۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

اس کے بعد جب نماز کا وقت آتا تو منادی اعلان کرتا تھا کہ کوئی مخمور نماز میں شامل نہ ہونے پائے۔ لیکن چونکہ اب بھی ممانعت کا کوئی عام حکم نہ تھا اس لئے نماز کے علاوہ اور اوقات میں لوگ پیتے پلاتے رہتے

(پچھلے صفحے کا بقیہ حاشیہ)

۴۔ عن سفیان عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمٰن السلمی عن علی رضی الله عنه قال دعانا رَجل من الانصار قبل ان تحرم الخمر فتقدم عبدالرحمٰن ابن عوف وصلی بهم المغرب فقرأ قل یایها الکافرون فالتس علیه فنزل لا تقربوا الصلوة وانتم سکارٰی (مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

سفیان نے عطا سائب سے عطاء نے ابوعبدالرحمٰن سلمی سے' ابوعبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ تحریم شراب سے پہلے انصار کے ایک شخص نے ہم کو مدعو کیا تو عبدالرحمٰن بن عوف نے امامت کی اور ان کو مغرب کی نماز پڑھائی اور قل یا ایها الگافرون پڑھی' لیکن اس میں خلط ہو گیا اس پر یہ آیت اتری لا تقربوا الصلوة وانتم سکارٰی نشے کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔

۵۔ سفیان بن عطا بن السائب عن بن عبدالرحمٰن ورجل آخریشر بون الخمر فصلی بهم عبدالرحمٰن بن عوف فقرا قل یا ایها الکفرون فخلط فیها فنزلت لا تقربوا الصلوٰة (مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

سفیان نے عطا بن السائب سے، عطا نے ابن عبدالرحمٰن سے، ابن عبدالرحمٰن نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ وہ اور عبدالرحمٰن بن عوف اور ایک دوسرے آدمی شراب پی رہے تھے اور ان کو عبدالرحمٰن بن عوف نے نماز پڑھائی اور قل یا ایها الکافرون پڑھی جس خلط ملط کر دیا اس پر یہ آیت اتری۔

۶۔ ناسا من اصحاب النبی فلم علی بن ابی طالب رضی اللّٰه عنه فقرا قل یا ایها الکفرون لا اعبد ما تعبدون ونحن عابدون ما عبد تم فنزلت لا تقربوا الصلوة الایة (مستدرک حاکم کتاب الاشربہ)

چند لوگوں نے کہ جن میں علی بن ابی طالبؓ بھی تھے بلایا پھر انہوں نے قل یا ایها الکفرون لا اعبد ما تعبدون ونحن عابدون ما عبد تم پڑھی اس پر یہ آیت اتری۔

وہ روایت جس میں نام کی تعیین نہیں۔

۷۔ سفیان عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمٰن بن علی رضی اللّٰه عنه قال دعانا رجل من الانصار قبل تحریم الخمر فحضر صلوٰة المغرب فتقدم رجل فقراء قل یا یها الکفرون فالتبس علیه فنزلت لا تقربوا الصّلوٰة ۔ الایة (مستدرک حاکم تفسیر نساء)

سفیان عطا بن سائب سے' عطا ابوعبدالرحمٰن سے، وہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا' تحریم شراب سے پہلے ہم کو انصار کے ایک شخص نے مدعو کیا' نماز مغرب کا وقت آیا تو ایک آدمی نے امامت کی اور قل یا ایها الکافرون پڑھی لیکن اس میں خلط ملط کر دیا اس پر یہ آیت اتری لا تقربوا الصلوة (الایۃ)

ان چھ روایتوں میں مختلف قسم کے اختلافات ہیں۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

تھے حضرت عمرؓ نے پھر دعا کی' اتفاق سے اسی زمانہ میں بعض انصار نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاصؓ کی دعوت کی اس میں

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

(۱) پہلی اور پانچویں روایت میں ہے کہ داعی عبدالرحمٰن بن عوفؓ تھے' دوسری اور چھٹی میں ہے کہ داعی کوئی انصاری تھے چوتھی میں دعوت کے بغیر مجلس شراب کا ذکر ہے۔

(۲) پہلی اور دوسری میں ہے کہ امام حضرت علیؓ تھے' جنہوں نے نشہ میں کچھ کا کچھ پڑھ دیا' تیسری' چوتھی' پانچویں میں ہے کہ وہ امام عبدالرحمٰن بن عوفؓ تھے اور چھٹی میں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ کوئی آدمی امام تھا۔

(۳) اور روایتوں میں ہے کہ اس دعوت کی مجلس میں شراب تھی' چھٹی میں شراب کا مطلق ذکر نہیں ہے' بلکہ وہ شخص جو امام بنا تھا وہی شاید کہیں سے پی کر آیا ہو گو کہ حرمت شراب سے پہلے پینا کوئی شرعی جرم نہیں' تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پینا جو بچپن سے آنحضرت ﷺ کی صحبت و تربیت میں پل کر جوان ہوئے قیاس کے خلاف ہے' خصوصاً اس آیت کے بعد کہ شراب اور جوئے میں بڑا گناہ ہے، حضرت علیؓ کا پینا اور بھی زیادہ واقعہ کی صورت میں شک پیدا کرتا ہے' پھر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس روایت میں مختلف قسم کے ایسے اختلافات ہیں جو ناقابل تطبیق ہیں۔ ان اختلافات کا راز اس وقت کھل جاتا ہے جب ان کے راویوں پر نظر ڈالی جاتی ہے' سب سے پہلا راوی ابوعبدالرحمٰن سلمی جن کا نام عبداللہ بن حبیب ہے وہ پہلے حضرت علیؓ کا طرفدار حامی (شیعہ) تھا' بعد کو عثمانی (بنوامیہ کا طرف دار) اور حضرت علیؓ کا مخالف ہو گیا' پھر اس کا یہ دعویٰ کہ اس نے حضرت علیؓ سے سنا ہے' محدثین میں مسلم نہیں' بخاری نے اسکو مانا ہے لیکن ابن ابی حاتم نے اس سے انکار کیا ہے' روایت کے دوسرے راوی عطا بن سائب کا حافظہ خراب ہو گیا تھا' اس لئے لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا تھا' گو سفیان کی اس سے روایتیں حافظہ کی خرابی سے پہلے کی سمجھی جاتی تھیں' مگر اوپر کی روایتوں میں دیکھو کہ خود سفیان کی روایتوں میں بھی وہی ناقابل تطبیق اختلاف موجود ہے' ان وجوہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف فیہ جزئیات غیر مسلم ہیں اور واقعہ کی اصل صورت وہی ہے جو چھٹی روایت میں ہے کہ وہ مجلس محض دعوت کی تھی جس میں حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ موجود تھے کہ نماز کا وقت آ گیا اور ایک صاحب جو مخمور تھے نماز پڑھانے کھڑے ہو گئے اور آیتیں غلط ملط پڑھ دیں چونکہ اس واقعہ کے راوی حضرت علیؓ تھے اور وہ دعوت میں شریک تھے اس لئے یا تو ابوعبدالرحمٰن سلمی عثمانی نے فرقہ داری کے جذبہ میں یا عطاء نے ذرا سی بھول میں واقعہ کی نسبت ادھر سے اُدھر کر دی۔

اس آخری چھٹی روایت کی تائید حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے ہوتی ہے' جس کی سند پورے سلسلہ سے الگ اور مستقل ہے:

۷۔ عن ابی هریره قال حرمت الخمر ثلاث مرات قدم رسول اللّٰه ﷺ المدینة وهم یشربون الخمر ویاکلون المیسر فسالوا رسول اللّٰه ﷺ عنهما فانزل الله علی نبیه ﷺ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا الاية فقال الناس ماحرم علینا انما قال فیهما اثم کبیر و کانوا یشربون الخمر حتی اذا کان یوم من الایام صلی رجل من المهاجرین ام صحابه فی المغرب خلط فی قرأته فانزل الله فیهما اية غلظ منها يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَاتَقُوْلُوْنَ۔ و کان الناس یشربون حتی یاتی احد هم الصلوٰة وهم مغلق ثم انزلت اية اغلظ من ذٰلِكَ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ فقالوا انتهینا دیناه (مسند احمد جلد ۲)

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

شراب کا دور بھی چلا یہ پی کر بدمستی میں کہنے لگے کہ مہاجر انصار سے بہتر ہیں اس پر بات بڑھی اور مار پیٹ تک نوبت پہنچی اس پر حکم آیا۔ (صحیح مسلم فضائل سعد بن ابی وقاص)

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ (مائدہ)

اے ایمان والو! بے شک شراب، جوا، بت اور پانسے ناپاک اور شیطان کے کام ہیں تو ان سے بچو تاکہ فلاح پاؤ۔

اس کے بعد شراب قطعاً حرام ہوگئی حرمت شراب کی یہ آخری آیت جس وقت اتری، حضرت ابوعبیدہؓ امین اور ابی بن کعبؓ جو سید القراء تھے ابوطلحہؓ کے گھر میں مہمان تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا۔ ساقی گری کی خدمت حضرت انس سے متعلق تھی۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب الاشربہ میں خود حضرت انسؓ کی زبانی روایت ہے۔

﴿ کنت اسقی اباعبیدة واباطلحة و ابی بن کعب فجاء هم ات فقال ان الخمر حرمت ﴾

میں، ابوعبیدہ ابی بن کعب اور ابوطلحہ کو شراب پلا رہا تھا کہ ایک شخص نے آ کر کہا کہ شراب حرام ہوگئی۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ شراب تین بار حرام کی گئی رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو لوگ شراب پیتے تھے اور جوئے کا مال کھاتے تھے لوگوں نے آپ سے ان دونوں کے متعلق سوال کیا خدا نے آپ پر یہ آیت نازل فرمائی یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا الایہ لیکن لوگوں نے کہا کہ خدا نے ہم پر حرام نہیں کی صرف یہ کہا کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اب بھی لوگ شراب پیتے رہے یہاں تک کہ ایک دن ایک مہاجر نے نماز مغرب پڑھائی اور اپنی قرأت میں خلط کر دیا، اس لئے خدا نے شراب کے متعلق اس سے زیادہ سخت آیت اتاری یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ اب بھی لوگ شراب پیتے رہے البتہ جب کوئی نماز پڑھنے جاتا تھا تو ہوش کی حالت میں جاتا تھا، پھر اس سے زیادہ سخت آیت نازل ہوئی یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اب لوگوں نے کہا کہ خداوند ہم باز آئے۔

اس میں حضرت علیؓ کا کہیں ذکر نہیں، حضرت علیؓ جیسے قرآن کے صاحب فہم کی نسبت یہ خیال کرنا کہ پہلی آیت کے اشارہ سے وہ شراب کی حرمت کو نہ سمجھ سکے تھے، قبول کے قابل نہیں، محدثین میں حاکم نے مستدرک میں چھٹی روایت کو لکھ کر بیان کیا ہے کہ اس واقعہ میں حضرت علیؓ کا نام شامل کرنا خوارج کی کارستانی ہے جس کی تردید اس روایت سے ہوجاتی ہے جس کو خود علیؓ روایت فرماتے ہیں، حاکم کہتے ہیں

وفی هذا الحدیث فائدة کثیرة وهی ان الخوارج تنسب هذا السکر وهذا القراءة الی امیر المؤمنین علی بن ابی طالب دون غیره وقد براه الله منها فانه راوی هذا الحدیث (مستدرک تفسیر نساء ج۲ ص۳۰۷)

اور اس حدیث میں بہت بڑا نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ خوارج نے نشہ اور اس خلط قرأت کو امیر المومنین علیؓ بن ابی طالب ہی کی طرف منسوب کیا تھا تو خدا نے ان کو اس الزام سے بری کر دیا کہ وہی اس حدیث کے راوی ہیں۔

درحقیقت واقعہ کے صرف راوی تھے لیکن عثمانی اور خارجی راوی نے خود حضرت علیؓ کو صاحب واقعہ بنایا۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس جلسہ میں گیارہ بزرگ شریک تھے جن میں حضرت معاذ بن جبل بھی شریک تھے اس موقع پر لحاظ کے قابل یہ بات ہے کہ اگرچہ یہ مدتوں کی عادت تھی اور اس وقت بھی سب خمار میں جھوم رہے تھے۔ [1] تاہم جوں ہی یہ آواز آئی کہ رسول اللہ ﷺ نے شراب کی ممانعت کر دی کسی نے پوچھ گچھ تک نہ کی اور دفعتہً جام و سبو توڑ ڈالے یہ صرف ابوطلحہؓ کے گھر کا حال نہیں تھا بلکہ تمام مدینہ کے گلی کوچوں میں شراب کی ندیاں بہہ گئیں۔

بخاری باب النظام میں ہے۔

﴿فجرت فی سکک المدینة﴾

مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی پھرتی تھی۔

ان ندیوں کی روانی سے اندازہ ہوگا کہ عرب میں شراب نوشی کی کثرت کا کیا عالم تھا۔

قمار بازی:

شراب خوری کے ساتھ ساتھ ان میں قمار بازی کا بھی عام رواج ہو گیا تھا، عرب کے مال و دولت کا تمام تر سرمایہ اونٹوں کے چند گلوں تک محدود تھا اس لئے جوا بھی انہیں کے ذریعہ سے کھیلا جاتا تھا چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنے حریف سے کہتا ہے۔

اعیّرتنا البانھا ولحومھا وذلک عاریا بن ریطة ظاھر

کیا تو ہم پر عیب لگاتا ہے کہ ہم اونٹ کا دودھ اور گوشت کھاتے ہیں اے ابن ریطہ ہم پر یہ عیب نہیں لگ سکتا۔

نحابی بھا اکفاءنا ونھینھا ونشرب فی اثمانھا ونقامر

ہم ان کو اپنے ہمسروں کو بطور عطیہ کے دیتے ہیں اور ان کو مہمانی میں صرف کرتے ہیں ان کی قیمت سے شراب پیتے اور جوا کھیلتے ہیں۔

اس غرض سے اونٹوں کو ذبح کر کے ان کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور ان ہی ٹکڑوں پر پانسے ڈالتے تھے ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر کر لئے تھے جن کے نام یہ ہیں قد، توام، رقیب، حلس، مبل، معلیٰ، منافس، منیح، سفیح، وغد، ان میں ہر تیر کے مختلف حصے معین کر لئے تھے اور جب جوا کھیلتے تھے تو ان کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصف شخص کے ہاتھ میں دے دیتے تھے وہ ان کو گڈمڈ کر کے ایک ایک تیر کو ایک ایک شخص کے نام پر نکالتا جاتا تھا جن کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے جن جن کے حصے مقرر تھے وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تین تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا وہ جس کے نام پر نکلتے ان کو ناکامی ہوتی تھی اس طرح گوشت کے جو ٹکڑے جمع ہوتے تھے ان کو فقیروں محتاجوں اور دوستوں پر تقسیم کر دیتے تھے چونکہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا اس لئے قمار بازی کی مجلسوں میں شریک نہ ہونا ایک قومی عار تھا اور اس قسم کے لوگوں کو نہایت بخیل خیال کرتے تھے اور ان کو برم کا خطاب دے رکھا تھا [1] جو لوگ یہ خطاب حاصل کر لیتے

---

[1] فتح الباری جلد ۱۰ مطبوعہ مصر طبع اول صفحہ ۳۱ بحوالہ روایت ابی عاصم۔

تھے ان سے شادی بیاہ کرنا ننگ و عار خیال کیا جاتا تھا چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنی بیوی کو وصیت کرتا ہے۔

و اذا هلکت فلا تریدی عاجز غسا و لا برما و لا معزالا

اور اگر میں ہلاک ہو جاؤں تو عاجز، کمزور اور جوئے میں نہ شریک ہونے والے اور سفر میں قوم سے علیحدہ رہنے والے سے
نکاح نہ کرنا۔

جوئے کی ایک صورت جس کو ''رہان'' کہتے تھے یہ تھی کہ کسی شرط پر بازی لگاتے تھے اور جب وہ شرط پوری نہیں ہوتی تھی تو جس چیز پر بازی لگائی جاتی تھی، اس کو لے لیتے تھے، چنانچہ جب رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ ہوئی اور باوجود رومیوں کی شکست کے قرآن مجید نے پیشین گوئی کی کہ ان کو چند سال میں ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہو جائے گا تو کفار نے حضرت ابوبکرؓ سے اسی قسم کی شرط لگائی اور اس فتح کے لئے چھ برس کی مدت مقرر کی چنانچہ جب یہ مدت گزر چکی اور رومیوں کو فتح و ظفر نصیب نہ ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بازی ہارنا پڑی [2] اور رفتہ رفتہ اس قمار بازی کا مذاق ان میں اس قدر عام ہو گیا تھا کہ لوگ مال و دولت کھو چکنے کے بعد بیوی اور بال بچوں پر بازی لگا دیتے تھے [3] یہ قمار بازی اور وہ بھی شراب کی بدمستی کے عالم میں اکثر مار پیٹ اور لڑائی پر ختم ہوتی تھی عبس و ذبیان کی چہل سالہ جنگ گھوڑ دوڑ ہی کی قمار بازی کا نتیجہ تھی حصول دولت اور کسب شہرت کے اس غلط طریقہ سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے تھے۔

سود خوری:

عرب میں سود خوری کا عام رواج تھا تمام دولت مند سود پر لین دین کرتے تھے حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب نے جو قریش کے سردار اور آنحضرت ﷺ کے چچا تھے تجارت کا کاروبار نہایت وسیع پیمانے پر پھیلا رکھا تھا اور اس تعلق سے سود خوری میں نہایت شہرت رکھتے تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے جب حجۃ الوداع میں سود کی حرمت کا اعلان کیا تو سب سے پہلے ان ہی کے سود کو باطل قرار دیا، حضرت عثمانؓ اور خالد بن ولیدؓ سود پر قرض دیتے تھے مسعود ثقفی طائف کا مشہور رئیس تھا اور اس کے بھائی عبد یالیل، حبیب بن ربیعہ نہایت دولت مند تھے۔ مغیرہ ان ہی لوگوں میں سود پر داد و ستد کرتے تھے چنانچہ جب طائف فتح ہوا اور چاروں بھائی اسلام لائے تو انہوں نے مغیرہ سے سود کا تقاضا کیا، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ (بقرہ)

مسلمانو! خدا سے ڈرو اور بقیہ سود کو اگر تم مسلمان ہو تو چھوڑ دو۔

ان کے علاوہ طائف ایک سرسبز اور دولت مند شہر تھا اس لئے وہاں کے لوگ عموماً سود پر بیوپار کرتے تھے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان سے جن شرائط پر مصالحت کی ان میں ایک ضروری شرط یہ بھی تھی کہ وہ لوگ سود خوری نہ کریں

---

[1] یہ پوری تفصیل تفسیر کبیر ج ۲ ص ۳۳۱ میں ہے۔

[2] ترمذی ص ۱۶، جوئے کی صورت کو رہان کہتے تھے اور اب تک وہ حرام نہیں ہوئی تھی۔

[3] تفسیر کبیر ج ۲ ص ۵۴۱۔

گے۔ [۱] اسی طرح یمن کے نجرانی سوداگر بھی سودی کاروبار کرتے تھے ان سے بھی یہی شرط کی گئی۔ [۲]

سود کا عام اور متداول طریقہ تو یہ تھا کہ ایک معین شرح پر قرض دیتے تھے اور راس المال کے ادا کرنے کے لئے میعاد مقرر کر دیتے تھے، جب میعاد گذر جاتی تھی تو اس کا تقاضا کرتے تھے اگر مدیون اس کو ادا نہیں کر سکتا تھا تو میعاد میں اور اضافہ کر دیتے اور اس کے عوض میں شرح سود بڑھا لیتے تھے لیکن اس نے ترقی کر کے ایک نہایت ظالمانہ صورت اختیار کر لی تھی جو سود در سود سے بھی زیادہ خطرناک تھی یعنی ایک میعاد متعینہ کے لئے کسی کو مثلاً سو روپیہ دیتے تھے لیکن مدت گذر چکتی اور تقاضا کرنے پر مدیون اس رقم کو ادا نہیں کر سکتا تو میعاد اور بڑھا دیتے تھے لیکن اس کے معاوضہ میں راس المال میں بھی اضافہ کروا لیتے تھے یہاں تک کہ کبھی کبھی یہ اضافہ دوگنی چوگنی مقدار تک پہنچ جاتا تھا اس طرح اضافہ ہوتے ہوتے مدیون کی کل جائداد مستغرق ہو جاتی تھی' یہ معاملہ زیادہ تر غریبوں اور کاشتکاروں کے ساتھ پیش آتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غریبوں اور کاشتکاروں کا تمام طبقہ چند دولت مندوں اور خصوصاً یہودیوں کے ہاتھ میں گرو تھا۔ قرآن مجید کی یہ آیت اسی طریقہ سود کو مٹانے کے لئے نازل ہوئی۔

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ (آل عمران)

مسلمانو! دونا چار گنا سود نہ کھاؤ اور خدا سے ڈرو یقین ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

سود کے علاوہ قرض کے متعلق اور بھی مختلف قسم کی ناجائز سختیاں پیدا ہو گئی تھی مثلاً اگر راہن میعاد متعینہ پر مال مرہونہ کو چھڑا نہ سکتا تھا تو مرتہن اس کا مالک ہو جاتا تھا [۳] مال و دولت سے گذر کر عورتوں اور بال بچوں تک کو رہن رکھواتے۔ [۴]

لوٹ مار:

عرب میں روز کی لوٹ مار نے اگرچہ ہر قبیلہ کو قتل و غارت گر اور راہزن بنا دیا تھا تاہم بعض قبائل میں اس قسم کے خاص خاص جتھے تھے جنہوں نے راہزنی کو اپنا ذریعہ معاش اور عام مشغلہ بنا لیا تھا اس قسم کے لوگوں کو ''لصوص'' کہتے تھے اور قبیلہ طے کو عرب میں عام طور پر جو شہرت حاصل تھی وہ اسی گروہ کی بدولت تھی۔

یہ گروہ شہر سے باہر میدانوں میں جنگلوں میں' پہاڑ کے کھوؤں میں رہتا تھا اور ادھر سے جو مسافر یا قافلے گذرتے تھے ان کو لوٹ لیتا تھا ان کا استیصال صرف ایک پرزور نظام حکومت ہی سے ہو سکتا تھا جو عرب میں مفقود تھا چنانچہ قبیلہ طے کے عیسائی سردار عدی بن حاتم مسلمان ہو کر جب آپ سے ملنے آئے اور آپؐ نے ان سے یہ پیشین گوئی کی کہ ''وہ دن آئے گا کہ جب حیرہ سے ایک پردہ نشین عورت بے خوف و خطر حضر موت کا سفر کرے گی'' چونکہ وہ قبیلہ طے کے رئیس تھے اور ان کو اس قبیلہ کے ڈاکوؤں کا حال معلوم تھا اس لئے ان کو تعجب ہوا کہ طے کے لصوص کیا ہو جائیں گے؟

---

[۱] فتوح البلدان بلاذری فتح طائف۔

[۲] ابوداؤد کتاب الامارت۔

[۳] موطا امام مالک ص ۳۰۴۔

[۴] بخاری قتل کعب بن اشرف۔

ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال و دولت، مویشی بلکہ اہل و عیال تک پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے تیار رہتا تھا تاجروں اور سوداگروں کے قافلے بغیر کسی بھاری انعام کے کسی میدان میں سے بسلامت نہیں گذر سکتے تھے ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کی عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا اور مویشیوں کو ہانک کر لے جاتا تھا چنانچہ صبح کا وقت جبکہ رات بھر چلنے کے بعد مسافر آرام کرتے تھے، اس کام کے لئے مخصوص ہو گیا تھا، چنانچہ صبح کا لفظ عربی میں لوٹنے کے معنی میں جاہلیت میں عام طور پر بولا جاتا تھا کامیاب ڈاکو اپنے کارناموں کو نظم کرتے تھے اور فخریہ پڑھتے تھے، ایک قبیلہ کا شاعر حارث نامی ڈاکو کے سلامت نکل جانے پر کہتا ہے۔

یا لھف زیابة للحارث　　　الصابح فالغانم فا لائب

اے زیابہ کا افسوس حارث کے لئے جو صبح کو ڈاکہ ڈالنے والا پھر لوٹنے والا پھر بسلامت واپس جانے والا ہے۔

حج کے تین مہینوں میں البتہ وہ اس پیشہ سے باز رہتے تھے لیکن اس سے زیادہ مدت پر وہ صبر نہیں کرتے تھے، اور چونکہ ہر قبیلہ کے مال و دولت اور مویشی پر موقع پا کر اسی طرح تصرف کرتا تھا اس لئے وہ اس کو عیب نہیں بلکہ بہادری کا کام سمجھتے تھے اور اس طرح ملک میں مسلسل قتل و غارت اور لوٹ مار کا طریقہ جاری تھا۔

چوری:

ڈاکہ کے علاوہ اقتصادی حالات کی مجبوری سے بدوؤں میں چوری کا رواج عام تھا مختلف قبیلوں کے ایسے بہادر جو قبیلہ میں کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتے تھے وہ خصوصیت کے ساتھ اس پیشہ کو اختیار کرتے تھے وہ تنہا بڑے بڑے خطرناک موقعوں پر جا کر اس کام کو انجام دیتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے ان میں سے سلیک بن السلکہ اور تابط شرًا شہرت عام رکھتے تھے تابط شرًا کا ایک قطعہ حماسہ میں ہے جس میں اپنی چوری اور حیلہ گری کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے۔

قریش میں تجارت کے سبب سے دولت بھی تھی اور خود خانہ کعبہ میں تحفوں اور نذرانوں کا خزانہ جمع رہتا تھا اس لئے ان میں چوری کے مواقع بھی زیادہ تھے، چنانچہ کلبی نے متعدد ممتاز قریشیوں کے نام بتائے ہیں، جنہوں نے اس خزانہ سے سونے کا ہرن چرا لیا تھا[1] بلکہ اس کے لئے خاص طور سے ابولہب کا نام لیا جاتا ہے۔[2]

عام بدو عربوں میں یہ برائی جتنی عام ہو گئی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو گا کہ آنحضرت ﷺ ان مردوں اور عورتوں سے جو اسلام قبول کرنے آتے تھے دوسری باتوں کے ساتھ ان سے یہ معاہدہ بھی لیتے تھے کہ "وہ آئندہ چوری نہ کریں گے"[3] بلکہ خود قرآن پاک نے آپ کو اس کے معاہدہ لینے کا حکم دیا تھا۔[4]

چوری کرنے کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کر لئے تھے ایک شخص نے اپنی چھڑی کے کنارے ایک ٹیڑھا لوہا

---

[1] فتح الباری جلد ۱۲ ص ۷۷۔

[2] کتاب المعارف لابن قتیبہ۔

[3] صحیح بخاری کتاب الحدود ص ۱۰۳، ۱۰۴۔

[4] سورہ ممتحنہ رکوع ۲۔

(مجن) لگا رکھا تھا حج کے زمانہ میں آتا اور جب حاجیوں کو غافل پاتا تو اس لوہے کے سہارے سے ان کے اسباب کو کھینچ لیتا۔ ۱؎

جس طرح عرب میں طے کے ڈاکو لوٹ مار میں مشہور تھے اسی طرح بعض قبائل چوری میں شہرت عام رکھتے تھے چنانچہ اسلم، غفار، مزینہ اور جہینہ کے قبیلے تمام عرب میں اس بنا پر بدنام تھے کہ وہ خاص طور پر حاجیوں کے مال و اسباب کی چوری کیا کرتے تھے۔ ۲؎

چونکہ یہ چوری عربوں کی اقتصادی کمزوری کا نتیجہ تھی، اس لئے اس کے لئے غیر و بیگانہ کی تخصیص نہ تھی بلکہ اس کا اثر اعزہ و اقارب، ہمسایہ، دوست و آشنا خاندان غرض سب پر پڑتا تھا، چنانچہ مدینہ میں بشر، بشیر، مبشر تین آدمی تھے جن کو بنو ابیرق کہا جاتا تھا، ان میں بشیر منافق تھا اور آنحضرت ﷺ کی ہجو میں شعر کہہ کر دوسروں کی طرف منسوب کر دیتا تھا یہ لوگ نہایت تنگدست اور فاقہ مست تھے، انہوں نے رفاعہ نامی ایک شخص کے بالاخانہ سے جس میں ہتھیار و تلوار اور زرہ وغیرہ بھی رکھی ہوئی تھی نقب لگا کر چوری کی آپ ﷺ نے رفاعہ کے ہتھیار واپس دلائے، لیکن رفاعہ نے ان کو خدا کی راہ میں وقف کر دیا اور بشیر بھاگ کر مشرکین سے جاملا۔ ۳؎

مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اس مرض میں گرفتار تھیں اسی لیے قرآن پاک نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت یہ عہد لینے کی بھی تاکید کی کہ ﴿ وَلَا يَسْرِقْنَ ﴾ (ممتحنہ) یعنی وہ چوری نہ کریں گی شرفا اگر اس الزام میں پکڑے جاتے تو وہ چھوڑ دیئے جاتے تھے اس لیے یہ برائی رکنے نہیں پاتی تھی۔ چنانچہ اسلام کے بعد بھی جب قبیلہ مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو اس پر قریش کو سخت تردد ہوا اور لوگوں نے کہا اس کے متعلق آنحضرت ﷺ کی خدمت میں کون سفارش کرے گا؟ لوگوں نے اسامہ بن زید کو منتخب کیا جن کو آپ بہت پیار کرتے تھے انہوں نے سفارش کی تو آپ نے فرمایا ''تم حدود اللہ کے متعلق سفارش کرتے ہو''؟ پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ ''گزشتہ قومیں صرف اس لیے ہلاک ہو گئیں کہ جب شریف آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور ضعیف چوری کرتا تھا تو اس کو سزا دیتے تھے خدا کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا'' ۴؎

خود شہر کے اندر اس قسم کی وارداتوں کی یہ حالت تھی کہ صفوان بن امیہ ایک روز ایک بیش قیمت چادر اوڑھ کر سو رہے تھے ایک شخص نے موقع پا کر اس کو اڑا لیا وہ گرفتار کر کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لایا گیا، تو آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا صفوان کو اس پر رحم آیا اور آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ ایک چادر کے لیے ایک عرب کا ہاتھ کاٹا جائے گا، آپ نے فرمایا میرے پاس لانے سے پہلے ہی اس کا خیال رکھنا تھا، حاکم تک معاملہ پہنچنے کے بعد کسی کو سفارش کا حق حاصل نہیں۔ ۵؎

۱؎ مسلم باب فی صلوٰۃ الکسوف۔

۲؎ مسلم و بخاری کتاب المناقب باب اسلم وغفار۔

۳؎ ترمذی ص ۴۹۴ کتاب التفسیر سورۂ نون۔

۴؎ بخاری ج ۲ ص ۱۰۰۳ کتاب الحدود۔

۵؎ دار قطنی ص ۳۷۴ کتاب الحدود۔

سفاکی و بے رحمی و وحشت:

رات دن کی لوٹ مار اور کشت وخون سے درندوں کے تمام اوصاف پیدا ہو گئے تھے زندہ اونٹ اور دنبہ کے کوہان اور چکیاں کاٹ کر کباب لگاتے اور یہ ان کی بڑی مرغوب غذا تھی۔

زندہ جانوروں کو درخت سے باندھ دیتے، اور ان پر تیر اندازی کی مشق کرتے، لڑائیوں میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر ڈالتے، مقتولوں کے ناک کان کاٹ لیتے اور عورتیں ان کے ہار بنا کر پہنتیں، منت مانتے کہ دشمن کو قتل کریں گے تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔

سزا دینے کا ایک یہ طریقہ تھا کہ مجرم کو دو درختوں کی ٹہنیاں جھکا کر اس کے اعضا ان میں باندھ دیتے اور پھر ٹہنیوں کو چھوڑ دیتے مجرم کا بدن چر کر ٹہنیوں کے ساتھ رہ جاتا۔

کبھی کبھی عورتوں کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیتے، اس کے بدن کے ٹکڑے اڑ جاتے، اس قسم کی سزائیں اکثر عرب کے سلاطین اور رؤسا دیا کرتے تھے۔

کبھی کبھی آدمی کو کسی کوٹھڑی میں قید کر کے اس کا کھانا پینا بند کر دیتے تھے یہاں تک کہ وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا اس طریقہ سزا کا نام ان کے ہاں ''صبر'' تھا، مردوں کی قبر پر اونٹ باندھ دیتے تھے اور اسکو کھانے کو نہیں دیتے تھے وہ چند روز میں مر جاتا تھا، سمجھتے تھے کہ یہ مردہ کی سواری بنے گا اس اونٹ کو ''بلیہ'' کہتے تھے۔

زنا اور فواحش:

زنا اور فسق و فجور عام تھا اور یہ واقعات فخریہ اشعار میں بیان کیے جاتے تھے امراؤ القیس عرب کا سب سے بڑا شاعر تھا اس کے ساتھ شہزادہ اور والی ملک تھا، اس نے اپنی پھوپھی زاد بہن عنیزہ اور اور عورتوں کے ساتھ جو افعال شنیعہ اور بے حیائیاں کیں قصیدہ لامیہ میں فخر کے ساتھ تفصیل کے ساتھ لکھی ہیں باوجود اس کے اس قصیدہ کے اشعار عرب میں بچہ بچہ کی زبان پر تھے۔

ابن عباس سے روایت ہے کہ اہل جاہلیت گو بالاعلان زنا کو جائز نہیں سمجھتے تھے لیکن چھپے چوری کرنے کو جائز سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ کھلم کھلا کرنا تو کمینہ پن ہے لیکن چھپ کر کرنے میں مضائقہ نہیں [1] فاحشہ عورتیں گھروں کے سامنے جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں [2] اور صاحب الرایات کہلاتی تھیں انکی اولاد اصلی اور حلالی اولاد کے برابر سمجھی جاتی تھی اسلام سے پہلے ایسی عورتیں خود مکہ معظمہ میں تھیں ان میں سے ایک کا نام عناق تھا۔ مرثد غنوی نے آنحضرت ﷺ سے اجازت مانگی کہ میں عناق سے نکاح کرلوں اس پر یہ آیت اتری۔

﴿ وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ﴾ (نور)

اور زانیہ عورت سے زانی یا مشرک ہی نکاح کرتے ہیں۔

---

[1] تفسیر طبری آیت محصنت غیر مسافحت ج ۵ ص ۱۳، مصر۔

[2] صحیح بخاری کتاب النکاح جلد ۲ ص ۲۶۹۔

بڑے بڑے رؤسا گھر کی لونڈیوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ بدکاری کے ذریعہ سے جا کر کچھ کما لائیں اور ان کی نذر کریں، عبداللہ بن ابی مدینہ کا رئیس تھا اور اس درجہ کا شخص تھا کہ ہجرت سے پہلے تمام انصار نے تاج بنوالیا تھا کہ اس کو بادشاہ بنا کر پہنائیں گے، چنانچہ صحیح بخاری میں یہ واقعہ منقول ہے عبداللہ بن ابی کی دو لونڈیاں تھیں ایک کا نام مسیکہ تھا اور دوسری کا نام امیمہ تھا وہ ان دونوں کو زنا کاری کرانے پر مجبور کرتا تھا۔ اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری۔ [۳]

﴿وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ﴾ (سورہ نور)

اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو۔

موجودہ طریقہ کے علاوہ نکاح کی اور چند قسمیں جاری تھیں جو حقیقت میں بدکاری ہی کی قسمیں تھیں ایک یہ کہ کوئی شجاع اور بہادر شخص ہوتا تو اپنی عورت کو بھیج دیتے کہ اس سے ہم بستر ہو، بچہ پیدا ہوتا تو سمجھتے تھے کہ اس میں بھی وہی اوصاف آجائیں گے جس کا یہ نطفہ ہے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ چند آدمی جن کی تعداد ایک وقت میں دس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی کسی عورت کے پاس جاتے اور سب اس سے ہم صحبت ہوتے جب وہ حاملہ ہو جاتی اور بچہ جنتی تو سب کو بلوا بھیجتی اور کسی ایک سے کہتی تھی کہ یہ بچہ تمہارا ہے اس کو قبول کرنا پڑتا اور پھر وہ اس کا بیٹا سمجھا جاتا۔

تیسرا یہ طریقہ تھا کہ فاحشہ عورتیں جو سر بازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں ان کے لڑکا پیدا ہوتا تو قیافہ شناس کو بلوا بھیجتیں وہ صورت شکل دیکھ کر بتاتا کہ فلاں شخص کا نطفہ ہے عورت اس کو بلا کر کہتی کہ یہ تمہارا بچہ ہے۔ صحیح بخاری کتاب النکاح میں یہ تینوں طریقے تفصیل سے مذکور ہیں۔

ایک اور قسم عارضی نکاح کی جاری تھی اور وہ یہ تھی کہ کسی عورت سے مدت متعینہ کے لیے نکاح کر لیتے تھے اس مدت کے گزرنے کے بعد اسکی اجرت دے کر اس کو الگ کر دیتے تھے اس کو متعہ کہتے تھے اسلام نے شروع میں اس کو ضرورۃً چندے باقی رکھا پھر ہمیشہ کے لئے اس کو حرام کر دیا۔

بے شرمی و بے حیائی:

شرم و حیا کا وجود نہ تھا حج کعبہ میں ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہوتے لیکن (قریش کے سوا) باقی سب مادرزاد ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے عورتیں جب ننگی ہو کر کعبہ کا طواف کرتیں تو لوگوں سے کہتیں کہ کوئی ہم کو اتنا کپڑا دیتا کہ ستر عورت ہو جاتا پھر یہ شعر پڑھتیں۔

الیوم یبدو بعضه او کلهٗ	آج بدن کا کچھ حصہ کھلے گا یا سارا اور جو کھلا ہے اس سے
فما بد امنه فلا احلّه	لطف اٹھانے کی میں اجازت نہیں دیتی

صحیح مسلم باب التفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے۔

---

[۳] ابوداؤد کتاب النکاح، صحیح مسلم باب التفسیر۔

نہاتے وقت اوٹ نہیں کرتے تھے کھلے میدان میں بے ستر ہو کر نہاتے تھے [1] پاخانہ پیشاب کے وقت پردہ نہیں کرتے تھے [2] جلسوں میں بیٹھتے تو بیویوں سے ہم صحبتی کے تمام واقعات بیان کرتے [3] سوتیلی ماؤں پر وراثۃً قبضہ کر کے ان کو بیوی بناتے۔

عورتوں پر ظلم

عورتوں کی حالت نہایت خراب تھی مورث کے متروکہ میں سے ان کو کچھ نہیں ملتا تھا، عرب کا قول تھا کہ میراث اس کا حق ہے جو تلوار پکڑ سکتا ہے' اسی بنا پر چھوٹے بچے بھی وراثت سے محروم رہتے تھے۔

لڑائیوں میں مفتوحہ قبیلہ کی عورتیں عین میدان جنگ میں فاتحین کے تصرف میں آ جاتیں، اگر صلح ہو جاتی اور عورتیں واپس دے دی جاتیں تو باوجود اس کے کہ سب ناموس برباد ہو چکے ہوتے بدستور گھروں میں لے لی جاتیں اور یہ کوئی عیب نہیں خیال کیا جاتا تھا' فاتحین اس تصرف پر فخر کرتے' اور اس کو اشعار میں ادا کرتے، بنوضبہ نے جب بنوعامر پر فتح پائی تو ان کی عورتوں کو عین میدان جنگ میں رسوا کیا فرزدق نے اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

فظلت و ظلت یر کبون ھبیرھا	تو لوگ عورتوں پر متصرف ہو گئے۔
ولیس لھم الا عوالیھا ستر	اور اگر کوئی پردہ بیچ میں تھا تو صرف نیزے تھے'

قبیلہ قیس اور بنودارم میں جو معرکہ ہوا وہ رحرحان کے نام سے مشہور ہے اس کی نسبت جریر کہتا ہے۔

نکحت نساء ھم بغیر مھور	ان کی عورتوں سے بغیر مہر کے نکاح کیا۔

عمرو بن معدیکرب' عرب کے مشہور بہادر اور شاعر تھے ان کی بہن ریحانہ کی عصمت اسی طرح جب برباد ہوئی تو عمرو نے کہا

امن ریحانۃ الداعی السمیع	کیا ریحانہ کی طرف سے کوئی پکارنے والا سننے والا ہے'
یوئر قنی واصحابی ھجوع	جس نے گو مجھے بے خواب رکھا ہے لیکن میرے احباب سوتے ہیں
اذالم تستطع امرا فدعه	اگر تم کسی کام کو نہ کر سکو تو اس کو چھوڑ کر۔
وجاوزہ الی ماتسطیع	وہ کرو جو کر سکتے ہو۔

طلاق کے لئے کوئی مدت اور عدت نہ تھی یعنی جب تک شوہر چاہے، عورت نہ شوہر کے پاس رہ سکتی تھی نہ کسی اور سے شادی کر سکتی تھی۔

نکاح کی کوئی حد نہ تھی غیلان بن سلمہ ثقفی جب اسلام لائے تو انکی دس بیویاں تھیں۔ وہب اسدی نے اسلام قبول کیا تو ان کے عقد نکاح میں آٹھ بیویاں تھیں۔ [4]

---

[1] نسائی باب الاستتار عند الغسل۔

[2] ابوداؤد کتاب الطہارۃ۔

[3] ابوداؤد کتاب النکاح باب ما یکرہ وعن ذکر الرجل ما یکون من اصابۃ ہے۔

[4] ابوداؤد کتاب النکاح۔

دوحقیقی بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرتے باپ مرجاتا تو اس کی کل بیویاں (بجز حقیقی ماں) بیٹے کے تصرف میں آتیں اوراسکی جائز بیویاں سمجھی جاتیں۔

ایام کے زمانہ میں عورتوں کو الگ کردیتے اوران کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے۔

عورت جب بیوہ ہوجاتی تو گھر سے باہر ایک نہایت تنگ کوٹھڑی رہنے کو، اور خراب سے خراب کپڑے پہننے کو دیئے جاتے، خوشبو وغیرہ کی قسم کی کوئی چیز استعمال نہ کرسکتی، اس حالت کے ساتھ جب پورا سال گزر جاتا تو ایک بکری یا گدھا لاتے اس سے وہ اپنے جسم کو مس کرتی پھر کوٹھڑی سے باہر نکلتی اور اسکے ہاتھ میں مینگنی دی جاتی، وہ مینگنی کو پھینک دیتی اس وقت سوگ سے نکل آتی اور قدیمی حالت قائم ہوتی[1] عورت کا جومہر مقرر ہوتا وہ باپ کو ملتا عورت کو اس سے سروکار نہ ہوتا۔

غرض مجموعی حیثیت سے عورت بدترین مخلوق اور ہر قسم کی جبر وتعدی کا تختہ گاہ مشق تھی رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ جس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی اس کو سخت رنج ہوتا اور شرم کے مارے لوگوں سے چھپتا پھرتا۔

﴿ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ط اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ﴾ (نحل۔۷)

اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اسکا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے اس خوشخبری کے رنج سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے) کہ ذلت کے ساتھ اس کو قبول کرلے یا زندہ زمین میں دفن کردے۔

ابوحمزہ ایک رئیس تھا اس کے لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے گھر میں رہنا چھوڑ دیا اس پر اس کی بیوی یہ اشعار پڑھ پڑھ کر بچی کو لوریاں دیتی تھی۔

مالا بی حمزة لا یاتینا	ابوحمزہ کو کیا ہوگیا ہے کہ ہمارے پاس نہیں آتا۔
یبیت فی بیت التی تلینا	اور ہمسایہ کے گھر میں رات بسر کرتا ہے۔
غضبان الا نلد البنینا	اس پر ناراض ہے کہ ہم بیٹے نہیں جنتے۔
تاللّٰہ ماذاك بایدینا	خدا کی قسم یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں۔
ونحن کالزرع لزارعینا	ہم بطور کھیت کے ہیں۔
تنبت ما قد زرعوہ فینا	ہم میں جو بویا جائے گا وہی اگے گا۔

رفتہ رفتہ دختر کشی کی رسم جاری ہوگئی۔ لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو میدان میں لے جاکر زمین کھودتے اور زندہ گاڑ دیتے اس کو عربی میں داوَ کہتے ہیں۔

ایک صاحب نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آکر ظاہر کیا تھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح باب اعداد المتوفی عنہا زوجہا۔

[2] تفسیر ابن جریر وابن کثیر سورۃ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ۔

زندہ دفن کیں۔ [۲]

عورت کو وراثت کا کوئی حصہ نہیں ملتا تھا ان کا قانون تھا کہ وراثت کا حق اسی کو ہے جو تلوار چلائے [۱] عورت بیوہ ہونے کے بعد اپنے شوہر کے وارثوں کی ملک سمجھی جاتی تھی وہ اگر بیوہ پر چادر ڈال دیتا تو وہ اس کی جائز مدخولہ بن جاتی۔ [۲]

وحشت و جہالت:

حرام حلال کی کوئی تمیز نہ تھی ہر چیز اور ہر جانور جو کھا سکتے تھے کھاتے تھے حشرات الارض عام غذا تھی، چھپکلی تک کھا جاتے تھے، خون کو جما لیتے تھے اور قاشیں تراش تراش کر کھاتے، مردہ جانور کھانا عام بات تھی [۳] چمڑے کو آگ میں بھون کر کھاتے زندہ جانور کا گوشت کاٹ کر کھا لیتے تھے، گردن مروڑ کر، ڈنڈے سے مار کر، درندوں کا مارا ہوا سب [۴] کھاتے تھے، گدھے کا گوشت بھی کھاتے تھے۔ [۵]

عرب کا مشہور جاہلی شاعر اعشیٰ میمون جس نے آغاز اسلام کا زمانہ پایا اور اہل عرب نے آنحضرت ﷺ کی مدح میں اس کا قصیدہ نقل کیا ہے اس میں وہ اسلام کی تائید میں اہل عرب کو جن باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے وہ، یہ ہیں:

وایاك والمیتات لا تا کلنها   ولا تاخذن سهما حدید التفصد ا
مرداروں سے پرہیز کر اور ان کو نہ کھا   اور نہ تیز تیر سے جانور کو قصد دے کر مار کر کھا
وذا النصب المصوب لا تنسکنه   ولا تعبد الاوثان واللّٰه فاعبد ا
اور نہ کھڑے کئے ہوئے بتوں پر قربانی کر   اور نہ بتوں کی پوجا کر بلکہ اللہ کی عبادت کر
ولا السائل المحروم لا تترکنه   لعاقبة ولا الا سیر المقیّد
اور محروم بھیک مانگنے والے کو کسی اور انجام کے لئے مت چھوڑ   اور نہ زنجیر میں بندھے ہوئے قیدی کو
ولا تسخون من بائس ذی ضرارة   ولا تحسبن المرء یوما مخلد ا
اور نہ کسی مصیبت زدہ مفلس سے ٹھٹھا کر   اور نہ کبھی یہ سمجھ کہ آدمی ہمیشہ رہنے والا ہے
ولا تقربن جارة ان سرها   علیك حرام فانکحن او تابّدا [۶]
اور نہ اپنی ہمسایہ خاتون سے بدکاری کر   وہ تجھ پر حرام ہے تو یا نکاح کر لے اور یا کنوارا رہ جا

---

[۱] تفسیر یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ۔

[۲] تفسیر وَلَا تَعْضُلُوْھُنَّ۔

[۳] اسباب النزول سیوطی آیت حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةُ۔

[۴] تفسیر طبری سورہ مائدہ بیان ماکولات۔

[۵] صحیح نسائی کتاب الصید والذبائح۔

[۶] دیوان اعشیٰ مطبوعہ ویانا ۱۹۲۷ء ص ۱۰۳۔

عربوں کی خصوصیات

خیر الامم بننے کی اہلیت

لیکن ان تمام مفاسد اور برائیوں کے باوجود اہل عرب میں کچھ ایسی خصوصیتیں بھی تھیں جو دنیا میں صرف انہیں کے ساتھ مخصوص تھیں اور ان کی انہی فطری اور طبعی خصوصیات و امتیازات کا اثر تھا کہ خالق فطرت نے ان کو اپنی نبوت و رسالت اور تعلیم و شریعت کا اہل سمجھا اور ان کو اپنے اس خلعت خاص سے سرفراز کیا۔

صحت نسب:

ان خصوصیات میں سب سے پہلی چیز ان کی صحیح النسبی ہے شمالی عرب کے تمام قبیلے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد اور ان کی نسل سے تھے اور یہ بات ایسی مشہور و متواتر روایتوں سے ثابت تھی کہ کسی نے اس کی تردید کی ہمت نہیں کی، توراۃ نے حضرت ابراہیمؑ کی جن اولادوں کے نام بتائے ہیں ان میں سے ایک ایک نام کا سراغ عرب کی پرانی آبادیوں میں ملتا ہے چنانچہ ریورنڈ رفاسٹر نے ۱۸۴۴ء میں عرب کا جو تاریخی جغرافیہ لکھا ہے اس میں پوری دلیل اور تفصیل اور شہادتوں کے ساتھ ان آبادیوں کا پتہ لگایا ہے اور ان کی جگہیں متعین کی ہیں، قدیم یہودی مورخ یوسیفوس نے بھی یہی لکھا ہے [1] اور آج کل ایک یہودی فاضل ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون نے تاریخ الیہود فی بلاد العرب ایک کتاب لکھی ہے اس میں بھی اس نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے اور اس کی صحت پر دلیلیں پیش کی ہیں [2] اور بعض حال کے مناظر عیسائیوں کے علاوہ اس واقعہ کے تواتر میں کسی نے شک نہیں کیا ہے اور غالباً اسی لئے سینٹ پال نے اپنے خطوط میں عرب کی ہاجرہ کی تمثیل استعمال کی ہے [3] اور قرآن پاک نے اہل عرب اور قریش کو خطاب کر کے صاف کہا۔

﴿ مِلَّةَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرَاهِیۡمَ ﴾ (حج)

تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب۔

حضرت ابراہیمؑ تک نام بنام سلسلہ نسب کے پہنچنے میں پشتوں کی کمی بیشی یا ناموں کا گھٹنا بڑھنا ممکن ہے مگر مجموعی حیثیت سے یہ دعوی کہ یہ حضرت ابراہیم کی اولاد تھے کسی حیثیت سے مشکوک نہیں ہے خصوصاً جب اس کے ساتھ خارجی قرائن پر بھی نظر کر لی جائے کہ وہی تمدن اور طرز معاشرت جو توراۃ میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کے اہل و عیال کی نظر آتی ہے اسلام کے عہد تک بلکہ آج تک وہ اسی طرح عربوں میں قائم و باقی ہے، وہی خیمے ہیں، وہی صحرا ہیں، وہی مویشی ہیں، وہی بدویانہ زندگی ہے، وہی رسوم و رواج ہیں، جن کو اسلام نے آ کر اور زیادہ نکھار دیا، وہی بیت اللہ حج اور قربانی کی عبادتیں ہیں اور یہ ایسا کھلا قرینہ ہے جو آج بھی یورپ کے محققوں کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ مشہور جرمن محقق نولڈیک کہتا ہے:

---

[1] ترجمہ انگریزی ۱۸۲۲ء جلد اول ص ۲۵

[2] تاریخ الیہود فی بلاد العرب لاسرائیل ولفنسون مطبوعہ مطبعۃ الاعتماد مصر صفحہ ۷۵ـ۷۶

[3] سینٹ پال گلتیوں کے نام باب ۴ـ ۲۵

''اور نیز عربوں میں قدیم سامی کریکٹر اپنے خالص رنگ میں باقی سمجھا جاتا ہے اور ان کی زبان اصل زبان کے بہت قریب ہے''۔[1]

اہل عرب کو اپنے حسب و نسب کی حفاظت کا جو خیال و لحاظ تھا اس کے ذکر سے عرب کی تاریخیں معمور ہیں چنانچہ نسب پر فخر کرنا ان کی شاعری کا اور نسبی مفاخرت ان کی تقریر کا سب سے بڑا موضوع تھا اپنے باپ دادوں کے مسلسل ناموں کو یاد رکھنا ان کا خاندانی فرض سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ انسانوں سے ہٹ کر جانوروں (گھوڑوں) تک کے نسب نامے محفوظ رکھتے تھے، قبائل کے نسبی تعلقات کو یاد رکھنے والے، خاص خاص لوگ ہر قبیلہ میں موجود رہتے تھے اور یہی سبب ہے کہ آج بھی ان کے اکابر اور مشاہیر کا سلسلہ نسب آپ کو معلوم ہو سکتا ہے اور اس پر بہت سی اہم کتابیں لکھی گئی ہیں، اور یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا میں صرف اہل عرب کے ساتھ مخصوص ہے، یہود اور بنی اسرائیل بھی گو حضرت ابراہیمؑ ہی کی نسل سے تھے مگر وہ بھی اس خصوصیت میں ان کی برابری نہیں کر سکتے کہ دوسری قوموں کے اختلاط اور میل جول اور کسی خاص وطن کے نہ ہونے کے سبب سے ان کی اکثر خاندانی خصوصیتیں مٹ گئیں۔

نسب بجائے خود کوئی فخر کی چیز نہیں اسی لئے محمد رسول اللہ ﷺ نے عمل کے مقابلہ میں نسبی فخر کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا لیکن حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد کی ہدایت کے لئے جو دعا کی تھی اور ان کو جس بیت اللہ کی پاسبانی سپرد کی تھی اور ان میں ایک نبی کی بعثت کی جو دعا مانگی تھی اور خدا نے ان کی نسل میں دینی اور دنیاوی برکات کے عطا کرنے کا ان سے جو عہد کیا تھا ان سب کے پورا ہونے اور ان کے حقیقی مصداق بننے کے لئے نسل ابراہیم کی صحیح النسبی کی ضرورت تھی اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس شرف کے ساتھ مخصوص کیا۔

کسی پہلے مذہب میں داخل نہ تھے:

اسی طرح ان کو ان تمام اثرات سے محفوظ رکھا جو قوموں کے عادات و اخلاق اور استعدادات کو بدل دیتے ہیں مثلاً وہ باوجود اس کے کہ ہر چہار طرف سے مختلف بڑے بڑے مذہبوں سے ٹکرا رہے تھے مگر کوئی مذہب ان کو فتح نہیں کر سکا تھا مجوسیت خلیج فارس سے لے کر یمن تک حکمران تھی، یہودیت یمن اور حجاز کی تجارت گاہوں پر قابض تھی، عیسائیت اپنی فوج و لشکر اور راہبوں اور قسیسوں کے دل بادل کے ساتھ یمن سے لے کر شام کی حدود تک پھیلی ہوئی تھی اور بعض افراد اور بعض قبیلوں کو وہ برائے نام عیسائی بنا بھی چکی تھی، مگر پورا عرب بدستور اپنی خالص حالت پر باقی تھا۔ عرب میں جو نیک طبع اور دیندار لوگ ہوتے تھے وہ مجوسی یا یہودی یا عیسائی ہونے کے بجائے اپنے کو دین ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے اور اسی لئے اپنے مذہب کا نام دین حنیفی رکھتے تھے اور یہ سب اس لئے ہو رہا تھا کہ خاتم الانبیاء ﷺ کے ذریعہ دین ابراہیمی کی دعوت و تجدید کا رستہ کھلا رہے۔

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون ''السنہ سامیہ'' میں نے ارض القرآن جلد اول ص ۱۰۷ سے ص ۱۱۶ تک اس پر مدلل بحث کی ہے اور علمائے یورپ کے حوالے یکجا کر دیئے ہیں۔

محکوم نہ تھے:

عرب کا ملک تخلیقِ عالم کے آغاز سے اسلام تک ہر غیر قوم کی حکومت سے ہمیشہ آزاد رہا' شمالی عرب نے کبھی کسی قوم کی غلامی نہیں کی، بابل کے بخت نصر نے بنی اسرائیل کو زیروزبر کر دیا، مگر عرب کی طرف آنکھ نہ اٹھا سکا' یونانیوں اور رومیوں نے مصر سے لے کر عراق کی سرحد تک صدیوں تک حکومت کی، مگر خاص عرب کے اندر قدم نہ رکھ سکے، سکندر نے اور اس کے بعد رومی سپہ سالاروں نے جب ادھر نظر اٹھائی تو فطرت نے ہمیشہ ان کو شکست دی' عرب کا ملک دنیا کی دو عظیم الشان حکومتوں یعنی ایران اور روم کی سرحد پر واقع تھا مگر وہ دونوں اپنے حرص و آز کا ہاتھ اس کی طرف بڑھانے سے قاصر رہیں' گستاخ عیسائی حبشیوں نے یمن فتح کرنے کے بعد ہاتھیوں کے جھرمٹ کے ساتھ مکہ معظمہ پر چڑھائی کی، مگر قدرت الٰہی نے ان کو تباہ کر دیا، یہ تمام اہتمام و انتظام اس لئے تھا کہ کوئی دوسری جابرانہ قوت ان کے دل و دماغ کی استعداد برباد نہ کر سکے، ان کی آزادی کی روح برقرار اور ان کی فاتحانہ طاقت بدستور قائم رہے تا کہ یہ مخفی خزانہ خدا کے آخری مذہب کی حکومت کے قیام و بقاء میں کار آمد ہو۔

کتابی فاسد تعلیم سے نا آشنا تھے:

جس طرح وہ خارجی اثرات سے پاک تھے اسی طرح صحیفۂ فطرت کے سوا ہر قسم کے کتابی علم سے وہ نا آشنا تھے یعنی اس ذریعہ سے بھی وہ دوسری قوموں کے دماغی اثرات سے محفوظ تھے اور علم کی جاہلانہ اور کج بحثانہ ذہنیت سے پاک تھے وہ اُمیّ تھے تا کہ ایک اُمی معلم کی ربانی تعلیم کے قبول کرنے کے لئے ہر طرح تیار رہیں۔

وہ زمین کے وسط میں آباد تھے:

عرب کا ملک پرانی دنیا کے وسط میں واقع ہے ایک طرف ایشیا دوسری طرف افریقہ اور تیسری طرف یورپ کا راستہ اس سے قریب ہے پھر بحری جائے وقوع نے اس کو جزائر اور دور دراز ملکوں سے قریب کر دیا تھا اس لئے عرب سے نکل کر وہ ایک طرف عراق ہو کر ایران' ترکستان' خراسان' سیستان' کابل' ہندوستان تک پہنچ گئے اور دوسری طرف شام ہو کر مصر' افریقہ' الجزائر' تیونس' مراکش اور اسپین تک جا پہنچے اور بحری راستوں سے ایک طرف سے تمام جزائر افریقہ' حبشہ زنجبار پھر ادھر جزائر ہند' جاوا' سماٹرا اور چین تک ان کا گزر ہوا اور دوسری طرف سائپرس' کریٹ اور سسلی تک ان کا پرچم لہرایا۔ یہ تمام مواقع اس لئے میسر آئے کہ عرب کی جائے وقوع اس دعوت کے لئے مناسب مرکز تھا، فرض کرو کہ اگر اس دعوت کی جگہ ہندوستان یا چین ہوتی تو اسپین اور سسلی تک پہنچنے کے لئے کتنا عرصہ درکار ہوتا پھر یہ کہ اس وقت تک دنیا جن دو مشرقی اور مغربی طاقتوں کے زیر فرمان تھی ان دونوں کے زور کو برابر طور سے اور ایک ساتھ توڑنے کے لئے عرب کے سوا دنیا میں کوئی جگہ موزوں نہ تھی جہاں سے دونوں پر ایک ساتھ حملہ کرنا اور دنیا کو ان کے خون آشام پنجوں سے نجات دینا آسانی ممکن ہوا۔

بعض اخلاقی خوبیاں:

ان کے علاوہ اہل عرب کو خیر الامم بننے اور عالم کے لئے شاہد' نمونہ اور مصلح بننے کے لئے کچھ اور اخلاقی خوبیوں

کی بھی ضرورت تھی اور وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں ان خوبیوں کے بغیر وہ اسلام کی عظیم الشان تحریک کے علم بردار نہیں ہو سکتے تھے اور نہ وہ دنیا کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتے تھے۔

شجاع و بہادر تھے:

وہ حد سے زیادہ شجاع و بہادر تھے، وہ خطرات سے بے خوف تھے اور لڑائی کو کھیل سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے یہی سبب ہے کہ وہ تمام دنیا کی قوموں اور سلطنتوں کے مقابلہ میں تنہا کھڑے ہوئے اور کسریٰ و قیصر کو انہوں نے ایک ساتھ چیلنج دیا اور اس تحریک کے پھیلانے میں تھوڑی تھوڑی غیر مسلح جمعیتوں سے ہزاروں اور لاکھوں کی فوج کا بے خطر مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔

پر جوش تھے:

ساتھ ہی وہ پر جوش بھی تھے اس لئے جس دعوت اور تحریک کو لے کر اٹھے اس کو پوری کوشش، عزم اور جوش کے ساتھ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا، ان کے عزم اور جوش کو نہ پہاڑ روک سکا، اور نہ سمندر اس سے ٹکرا سکا، ہر جگہ وہ توحید کا علم لئے بحر و بر، دشت و جبل میں پھیل گئے اور اپنے عزم راسخ سے ارکان عالم کو متزلزل کر دیا۔

حق گو تھے:

ان کی جسمانی شجاعت و بہادری نے ان کو دل کا شجاع اور بہادر بھی بنا دیا تھا جو بات ان کے دل میں ہوتی تھی وہی ان کی زبان پر تھی، اہل مدینہ میں جو نفاق کا عنصر پیدا ہو گیا تھا وہ یہود کے اثر کا نتیجہ تھا، ورنہ قریش اور عام اہل عرب میں یہ بات نہ تھی۔ یا تو وہ کھلے دشمن تھے یا کھلے دوست۔ اپنے نزدیک وہ جس کو حق سمجھتے تھے اس کے ظاہر کرنے میں ان کو کسی کا باک نہیں ہوتا تھا۔

عقل و دانش والے تھے:

باوجود اس کے کہ وہ عموماً ظاہری نوشت و خواند سے عاری تھے مگر فطرت کے عطیہ عقل و دانش سے وہ کافی طور بہرہ مند تھے حضرت ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، خالدؓ، ابوعبیدہؓ بن جراح وغیرہ سینکڑوں ہزاروں صحابہؓ نے علم، مذہب، اخلاق اور سیاست میں نکتہ سنجیاں کیں وہ خود ان کی عقل و دانش کی گواہ ہیں، روم و ایران کی متمدن قوموں سے جس طرح انہوں نے معاملہ، مراسلہ اور نامہ و پیام کیا اور علم و سیاست کے الجھے سے الجھے ہوئے مسئلہ کو جس طرح سلجھایا، وہ خود اسی نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے ان کے شعراء کے کلام، ان کے مقرروں کی تقریریں ان کے فصحاء کے مقولے سنئے تو ان کی اس فطری صلاحیت کا اندازہ ہوگا کہ ظاہری تعلیم کے بغیر کیونکر یہ لعل و گہر وہ اپنے منہ سے اگل سکے۔

ذہن اور حافظہ کے تیز تھے:

فطرت کا قاعدہ ہے کہ اگر اس کے بعض قوی بیکار رہیں تو ان کی قوت دوسرے زیر عمل قوی کو وہ منتقل کر دیتی ہے اور جس عضو سے زیادہ کام لیا جاتا ہے اس کی قوت کو وہ ترقی دیتی رہتی ہے اسی اصول کے موافق ظاہری تعلیم اور نوشت

وخواند سے محروم ہونے کے سبب سے جہاں ان کے بعض قوی بیکار ہو رہے تھے وہاں ان کو اپنی یادداشت کے لئے تحریری اوراق اور سفینوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود اپنے دل و دماغ پر بھروسہ کرنے کی عادت تھی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا ذہن اور حافظہ بہت قوی تھا، یہی سبب ہے کہ ان کے شعراء اپنے بڑے بڑے قصیدوں کو زبانی پڑھتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے اس کو برزبان یاد رکھتے تھے اور ان کی اسی قوت کا یہ فیض تھا کہ ان میں کا بڑا طبقہ تحریر کے بغیر قرآن پاک کی بڑی بڑی سورتوں کو یاد رکھتا تھا اور بہتیرے ایسے تھے جو پورے قرآن کو یاد رکھتے تھے اور یہ انہیں کی تقلید ہے کہ دنیا کے ہر حصہ میں ایسے ہزاروں مسلمان پائے جاتے ہیں جو پورے قرآن کے حافظ ہوتے ہیں اور اہل عرب کی اسی خصوصیت کا مظہر یہ بھی تھا کہ احادیث وسیر اور واقعات کا بڑا سرمایہ تحریر کے علاوہ زبانی ایک دوسرے کو پوری ذمہ داری اور حفاظت کے ساتھ منتقل ہوتا رہا اور سینکڑوں اصحاب ایسے تھے جو ہزاروں لاکھوں احادیث کو حرف حرف اور لفظ لفظ کی پابندی کے ساتھ یاد رکھتے تھے اہل عرب کی اس خصوصیت نے اسلام کی حفاظت اور اشاعت کا نہایت اہم فرض انجام دیا۔

فیاض تھے:

اہل عرب کی ایک خاص امتیازی صفت ان کی فیاضی تھی مہمان نوازی ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی ہمسایوں اور پناہ گزینوں کی امداد میں وہ اپنی جان تک لڑا دیتے تھے اپنی شہرت اور ناموری کے لئے اونٹوں کو ذبح کر کے کھلا دینا یا جوئے میں جیتی ہوئی دولت کو احباب کے جلسہ دعوت میں اڑا دینا، اور اس پر فخر کرنا ان کی قومی رسم تھی اور یہی اوصاف ان کی شاعرانہ مدح میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں اسلام نے ان کی اسی صفت کو تھوڑی سی اصلاح کے بعد خدا کی راہ میں خیرات وصدقات وزکوۃ سے بدل دیا اور اسلام کی مشکل کشائی میں اس نے سب سے زیادہ مدد دی۔

مساوات پسند تھے:

چونکہ وہ کبھی کسی دوسری قوم کے محکوم نہ ہوئے تھے، اور نہ وہ کسی ایک مطلق العنان بادشاہ کے تابع فرمان بنے تھے اس لئے ان کی خودداری کا جذبہ بیدار تھا وہ غلام بننا نہیں جانتے تھے وہ اپنے کو ذلیل کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور وہ بڑے سے بڑے شخص کے سامنے برابری کے ساتھ بےباکانہ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔

عرب میں بیسیوں لڑائیاں صرف اسی خودداری کی حفاظت میں پیش آئی تھیں جس کا ایک منظر سبعہ معلقہ کے آخری قصیدہ میں نظر آتا ہے اہل عرب کے اس جذبہ نے حق گوئی مساوات اور جمہوریت پسندی وغیرہ اسلامی تعلیمات کے پھیلانے میں بڑی مدد دی۔

عملی تھے:

اہل عرب کے فطری اخلاق وکردار کی آخری دفعہ یہ ہے کہ وہ طبعاً عملی اور عملیت پسند تھے وہ اہل ایمان اور اہل ہند کی طرح محض تخیل پسند، خیال آراء اور نظریہ باز نہ تھے وہ مجسم عمل تھے اور عملیت کو پسند کرتے تھے، وہ چون و چرا اور کیسے اور کیونکر کی فلسفیانہ الجھنوں سے پاک تھے، وہ دنیا کے کاروباری آدمیوں اور سپاہیوں کی طرح چند اچھی باتوں کو قبول کر کے ان پر فوراً عامل بن جاتے تھے یہی سبب ہے کہ عجمیانہ نکتہ آفرینی اور بال کی کھال نکال کر اس کی الجھنوں کے سلجھانے میں وہ

کبھی گرفتار نہیں ہوئے وہ ہمہ تن عمل اور صرف عمل تھے اسی بناء پر شارعؑ نے ان کے سامنے ایک عملی مذہب کو پیش کر کے ان کو سرتاپا عملی بنا دیا اور جو کچھ وہ تعلیم لائے تھے اس کا مجسم پیکر بن کر چند سال میں دنیا کے سامنے ان کو پیش کر دیا دور دور سے بدوی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آتے اور شک و حجت اور مناظرہ و قیل و قال کے فرائض و اخلاق کی عملی تعلیم حاصل کر کے اپنے قبیلہ میں واپس چلے جاتے تھے اور بالآخر اپنی عملی دعوت سے اپنے پورے قبیلے کو مسلمان بنا لیتے تھے وہ اگر مگر اور ممکن و ناممکن کی بحث میں نہیں پڑتے تھے وہ تعلیم کو دیکھتے تھے اور سنتے تھے وہ اچھی طرح معلوم ہوتی تو اس کو قبول کرتے اور اس پر عمل کر کے دینی اور دنیاوی فوائد اور نتائج کے حصول کا یقین کرتے تھے اور اسی غیر متزلزل یقین اور ایمان کے بھروسہ پر وہ مشکل سے مشکل اور خطرناک سے خطرناک کام کر گذرتے تھے اہل عرب کی اسی خصوصیت نے اسلام کی سادگی کو برقرار اور عجمی فلسفیت و نظریت سے پاک و مبرا رکھا اور ساتھ ہی چند سال کے اندر اندر مغرب و مشرق اور شمال و جنوب میں اسلام کا پھریرا آسمان پر اڑنے لگا۔

ان اوصاف کی مصلحت:

اہل عرب کے ان تمام فطری و طبعی اوصاف و اخلاق کو دیکھ کر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری دین کی اشاعت اور حفاظت کے لئے جس قوم کا انتخاب کیا تھا وہ ازل سے اس کے لئے منتخب ہو چکی تھی باوجود ان کی ہر قسم کی گمراہیوں کے ان کے یہ چند اچھے اوصاف اس لئے ان میں ودیعت کئے گئے تھے تاکہ جب خدا کی بادشاہی کا دن آ پہنچے تو ان کی فطری استعداد کا یہ سرمایہ اس کی امداد و اعانت کے لئے خزانہ غیب کا کام دے، یہی وہ سرمایہ تھا جو اس وقت نہ ہند و عجم میں تھا نہ روم و فرنگ میں اور نہ ترک و زنگ میں تھا وہ عرب اور صرف عرب میں تھا اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری نبوت کے لئے اسی قوم کو برگزیدہ کر کے یہ امانت اس کے ہاتھ میں سپرد کی' آنحضرت ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کی اولاد میں اسمٰعیل کو پسند کیا اور اسمٰعیل کی اولاد میں بنی کنانہ کو اور بنی کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنو ہاشم اور بنو ہاشم میں سے مجھ کو'' ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''میں عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ کا بیٹا ہوں اللہ نے ان تمام لوگوں کو پیدا کیا تو مجھے اس نے ان سب میں سے بہتر نسل میں رکھا ان کو دو حصوں میں (عرب و عجم) میں تقسیم کیا تو مجھے اس حصے میں یعنی عرب میں بنایا جو سب سے بہتر تھا اس حصے کو بھی قبیلوں میں تقسیم کیا تو مجھے اس قبیلہ میں پیدا کیا جو سب سے بہتر تھا پھر اس قبیلہ کو گھرانوں میں تقسیم کیا تو مجھے سب سے بہتر گھرانے میں پیدا کیا پھر اس گھرانے کو افراد پر تقسیم کیا تو مجھے اس گھرانے کا سب سے بہتر فرد بنایا''۔ [1]

* * *

---

[1] یہ دونوں حدیثیں ترمذی باب المناقب میں ہیں۔

صبح سعادت

دنیا اور عرب کی سرزمین اس ظلمت میں تھی کہ صبح سعادت نمودار ہوئی اور خورشید نبوت کے طلوع کا غلغلہ برپا ہوا، ظلمتِ شب کافور ہوئی اور تھوڑی دیر میں ذرہ ذرہ سورج کی کرنوں سے پرنور ہوگیا، یہ ظاہر ہے کہ یہ سورج گو دنیا کو روشن کرنے نکلا تھا لیکن وہ نکلا عرب ہی کے اُفق سے تھا، اس لئے ضروری تھا کہ اس کے نور سے پہلے اسی ملک کی سرزمین روشن ہو۔

ایک قوم کا انتخاب:

سرور کائنات ﷺ کو گو خدا نے تمام عالم کی اصلاح کے لئے بھیجا تھا اور اس بناء پر ایک ایسی شریعت کامل عطا تھی جو نہ صرف عربوں بلکہ تمام عالم کے لئے ابد تک کافی ہے، لیکن کوئی شریعت کوئی قانون، کوئی دستورالعمل اس وقت تک مفید اور کارآمد نہیں ہوسکتا جب تک اس کے ساتھ ایسا گروہ موجود نہ ہو، جو اس شریعت کی عملی تصویر ہو، وہ جس کی ہر بات ہر ادا ہر جنبش عملی خطیب بن کر گردوپیش کو اپنا ہم زبان اور ہم عمل بنالے۔

اس بناء پر خاتم انبیاءؐ کا سب سے اہم مقصد ایک خاص قوم کو تربیت دے کر اصلاح عالم کے لئے تیار کرنا تھا دنیا کی اور قومیں باری باری اس منصب پر ممتاز ہوچکی تھیں ایک زمانہ تھا کہ جب بنی اسرائیل جیسی قوم جو آج تمام دنیا میں خوار اور ذلیل ہے ﴿اَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ﴾ (ہم نے تم کو دنیا کی قوموں پر فضیلت دی)[1] کا تاج پہن چکی تھی لیکن اوپر بہ تفصیل گذر چکا کہ اب تمام قوموں میں صلاحیت کا مادہ مفقود ہوچکا تھا ایران تین ہزار برس تک ناز ونعمت میں پل کر ترقی کی روح فنا کرچکا تھا رومیوں کے تمام قوائے عمل بوسیدہ ہوچکے تھے، ہندوؤں کا دل ودماغ صرف وہم پرستی کا کام دینے کے قابل رہ گیا تھا صرف ایک عرب تھا جو بن جتی زمین کی طرح مادہ ہائے نشوونما سے لبریز تھا اور ایک لوح سادہ کی طرح ہر قسم کی نقش آرائیوں کے قابل تھا مشیت ایزدی نے اسی کو تاکا اور چند روز میں وہی عرب جو سرتاپا جہل سرتاپا وحشت اور سرتاپا درندہ بن چکا تھا ﴿کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ کا مظہر بن گیا۔[2]

ان لوگوں کا حلیہ وجمال اور خط وخال یہ تھا۔

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ جو پیغمبر تمام عالم کے لئے معبوث ہوتا ہے وہ علاوہ ان اصول کے جو اور مذاہب میں ہیں چند اور نئے اصول اختیار کرتا ہے جن میں سے ایک یہ ہے۔

یدعوا قوما الی السنة الراشدة ویزکیھم ویصلح شانھم ثم یتخذ ھم بمنزلة جوارحه فیجا ھدھم اھل الارض ویغرقھم فی البلاد وھو قوله تعالیٰ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔

وہ ایک قوم کو سنت راشدہ کی طرف دعوت دیتا ہے ان کو پاک اور درست کرتا ہے پھر ان کو اپنا دست وبازو بناتا ہے اور ان کو دنیا میں پھیلا دیتا ہے اور انکے ذریعہ سے مجاہدہ کرتا ہے جیسا کہ خدا نے کہا کہ تم بہترین امت ہو جو دنیا کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔

[2] تم بہترین قوم ہو جو انسان کے لئے (پردہ عدم سے) باہر لائی گئی ہو جو نیکیوں کا حکم دیتی اور برائیوں سے روکتی ہے۔

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ (حج۔۴۱)

وہ لوگ کہ ہم جب ان کو دنیا میں اقتدار دیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوۃ دیں گے، اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور بری باتوں سے روکیں گے۔

اصلاح وہدایت کی مشکلات:

ہر قوم کی اصلاح وہدایت میں اوّل سخت اور متعدد مشکلات پیش آتی ہیں لیکن ان کی نوعیت ایک دو سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن عرب کی اصلاح میں ہر نوع، ہر حیثیت ہر جہت کی گوناگوں اور لاعلاج مشکلات تھیں اور ایسی تھیں جن میں سے ایک کا حل کرنا بھی قدرت انسانی سے بالاتر تھا، بنواسرائیل ایک مدت سے مصر میں قبطیوں کی غلامی کر رہے تھے اور قبطیوں کے جور وظلم کا طوفان ان کے سر سے گذر چکا تھا، حضرت موسیٰؑ نے ان پر یہ احسان عظیم کیا کہ فرعون کے پنجہ ستم سے ان کو چھڑا کر نکال لائے لیکن غلامی میں رہتے رہتے ان کی طبیعت میں اس قدر رذلت پسندی آ گئی تھی کہ جب ان سے یہ کہا گیا کہ آگے کنعان کی زمین ہے اس کو لڑ کر لو اور اسی پر تخت سلطنت بچھاؤ تو انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے صاف کہہ دیا کہ تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو ہم تو یہاں سے آگے قدم نہیں بڑھاتے۔ یہ ایک امتداد معاشرت کا اثر تھا جو مرتے مرتے ان لوگوں کی طبیعت سے نہیں گیا اور جب تک یہ نسل پوری اپنی موت سے مر کر منقرض نہیں ہوگئی، بنواسرائیل کو کنعان کی زمین میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔

یہ صرف ایک مشکل کی مثال تھی اب عرب کی مشکلات کا اندازہ کرو۔

جہالت:

عرب کی قوم اُمی محض تھی، الوہیت، رسالت، کتاب معاد، عبادت ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی، جس سے ان کے کان آشنا ہوں، اسلام کا ہر لفظ جو ان کے کان میں پڑتا تھا، ان کو تعجب انگیز اور بالکل بیگانہ آواز معلوم ہوتی تھی قرآن مجید نے ان کے اس جاہلانہ حیرت واستعجاب کو متعدد آیتوں میں ذکر کیا ہے۔

﴿یٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ۝ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ ۝ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُھُمْ فَھُمْ غٰفِلُوْنَ﴾ (یٰسین۔۱)

قرآن حکیم کی قسم، تو بےشبہ پیغمبروں میں سے ہے، راہ راست پر ہے، یہ قرآن رحمت والے غالب خدا کے پاس سے اترا ہے تا کہ تو اس قوم کو آگاہ کرے، جن کے اسلاف کو آگاہ نہیں کیا گیا اور اس لئے وہ غفلت میں پڑے ہیں۔

یہ نبوت کے شرف سے محروم قوم ایک آسمانی مذہب کے تمام خصائص سے محض بیگانہ تھی۔

﴿وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَھُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْھُمْ وَقَالَ الْکٰفِرُوْنَ ھٰذَا سٰحِرٌ کَذَّابٌ ۝ اَجَعَلَ الْاٰلِھَۃَ اِلٰـھًا وَّاحِدًا اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْھُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِھَتِکُمْ اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۝ مَا سَمِعْنَا بِھٰذَا فِی الْمِلَّۃِ الْاٰخِرَۃِ اِنْ ھٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ﴾ (ص۔۴،۷)

اورانہوں نے تعجب کیا کہ ان میں ایک پیغمبر ہو کر ان کے پاس آیا' کافروں نے کہا یہ دروغ گو جادوگر ہے اس نے اتنے خداؤں کو ایک خدا بنا دیا' یہ عجیب بات ہے' ان کے پنچ اٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو' اس میں اس کی پیغمبر کی کوئی غرض ہے' ہم نے سنا تو سابق مذہب میں یہ نہیں سنا یہ سب گھڑی ہوئی بات ہے۔

﴿ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ ﴾ (ق۔۲)

بلکہ ان کو تعجب ہوا کہ ان ہی میں سے ایک ان کے پاس پیغمبر بن کر آیا' کافروں نے کہا یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔

صفات الٰہی' آثار نبوت' احوال معاد، ان میں سے ہر بات کو سن کر وہ اسی طرح سرتاپا حیرت بن جاتے تھے نبوت کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ انسان تو اس کے سزاوار نہیں، اس منصب پر تو فرشتوں کو ممتاز ہونا چاہئے تھا۔

﴿ وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ ﴾ (فرقان۔۲۱)

اور جو ایک دن ہمارے سامنے آنے کے منکر ہیں' وہ کہتے ہیں کہ فرشتے پیغمبر بنا کر ہم پر کیوں نہ اتارے گئے۔

﴿ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴾ (فصلت۔۱۳)

پیغمبر جب ان کے سامنے سے' اور پیچھے سے آتے ہیں کہ ایک خدا کے سوا اور کسی کو نہ پوجو' تو وہ کہتے ہیں کہ خدا اگر کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو اتارتا' ہم تو تمہاری باتوں کا انکار ہی کریں گے۔

﴿ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓی اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴾ (بنی اسرائیل)

ہدایت آنے کے بعد صرف اس شبہ نے لوگوں کو ایمان لانے سے باز رکھا ہے کہ کیا خدا نے آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے جواب میں کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے بستے ہوتے تو البتہ ہم آسمان سے کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے۔

نبی کا تخیل اگر ان کے ذہن میں کبھی آتا تھا تو بشریت سے ماوراء صورت میں یعنی یہ کہ وہ انسانی ضروریات سے منزہ ہو اس کے پیچھے خدا کا اور فرشتوں کا پرا ہو' آسمان اور زمین کے خزانے اس کے دست قدرت میں ہوں۔

﴿ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْۢبُوْعًا ۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِیْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَیْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِیَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِیْلًا ۝ اَوْ یَكُوْنَ لَكَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰی فِی السَّمَآءِ ﴾ (بنی اسرائیل۔۹۰۔۹۳)

انہوں نے کہا اے پیغمبر ہم تجھ پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک زمین سے ہمارے لئے تو چشمہ نہ بہا دے' یا تیری ملکیت میں کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ نہ ہو' جن میں نہریں جاری کر دی ہوں' یا جیسا کہ تو نے کہا ہم پر بادل کا کوئی ٹکڑا گرا دے' یا خدا اور فرشتوں کو پرا بنا کر نہ لے آئے یا تیرے پاس کوئی سونے کا گھر نہ ہو یا تو آسمان پر نہ چڑھ جائے۔

﴿ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْكُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَلَكٌ فَیَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِیْرًا ۝ اَوْ یُلْقٰٓی اِلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ یَّاْكُلُ مِنْهَا ﴾ (فرقان۔۷۔۸)

انہوں نے کہا یہ عجیب پیغمبر ہے، یہ تو کھاتا پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ اترا جو اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا یا اس کے پاس کوئی خزانہ کیوں نہیں ڈال دیا گیا یا اس کے لئے خاص کوئی باغ ہوتا جس سے یہ کھاتا۔

پیغمبر کے لئے ان کے خیال میں یہ بھی ضروری بات تھی کہ وہ بڑا دولت مند ہو اس کے قبضہ میں کوئی بڑی جائیداد ہو میووں کے ہرے بھرے باغ اور سونے چاندی کے خزانے اس کے پاس ہوں چنانچہ گذشتہ آیت میں کفار کے اس خیال کی طرف بھی اشارہ ہے اسی لیے مکہ اور طائف کے جو رؤساء دولت مند تھے وہ اس منصب کے سب سے زیادہ مستحق سمجھے جاتے تھے۔

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴾ (زخرف۔۳)

وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا۔

کسی کتاب کے نازل ہونے کے معنی ان کے خیال میں یہ تھے کہ آسمان سے کاغذوں میں ایک لکھی لکھائی ترشی ترشائی جلد بندھی ہوئی ایک کتاب سب کے سامنے مجمع میں اتر آئے۔

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ﴾ (فرقان۔۲)

کافروں نے کہا، اس پر قرآن یکبارگی کیوں نہیں اترا۔

﴿ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ﴾ (بنی اسرائیل۔۱۰)

اور کافروں نے کہا ہم تیرے آسمان پر چڑھ جانے کے بھی اس وقت تک قائل نہیں ہونگے، جب تک ہم پر کوئی ایسی کتاب نہ اتار لائے جس کو ہم لے کر پڑھنے لگیں۔

﴿ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ (انعام۔۱)

اور اگر کاغذوں میں لکھا ہوا کوئی قرآن آسمان سے تم پر اترے جس کو تم اپنے ہاتھ سے ٹٹول بھی سکتے تو کافر یہی کہتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

غرض ایک آسمانی مذہب کی کیفیت سے بالکل بے خبر تھے الوہیت اور صفات الٰہی کے اسرار، نبوت کے خصائص، نزول کتاب کی حقیقت ہر چیز ان کے لئے حیرت اور استعجاب کا سرمایہ تھی۔

﴿ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴾ (مومنون۔۴)

کیا انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا، یا ان کے پاس یہ تعلیم آئی ہے جو ان کے اسلاف کے پاس نہیں آئی، یا انہوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا، تو اس کے منکر ہیں۔

اس بناء پر عرب کے مشرکین اور کفار کو ایک مدت تک صدائے نبوت سے گوش آشنا ہونے کی حاجت تھی اور اس میں کئی برس صرف ہو گئے لیکن وہ لوگ جو اس صدا سے نامانوس نہ تھے ان تک آواز پہنچنے کی دیر تھی کہ وہ سرتاپا لبیک تھے، حصہ اول میں گذر چکا ہے کہ سابقین اسلام عموماً وہی لوگ تھے جو اہل کتاب یا حنفاء کے آغوش پروردہ تھے، اشخاص کے علاوہ

قبائل کا بھی یہی حال تھا مشرکین کلام الٰہی کا جواب خندۂ تحقیر سے دیتے تھے اور رموزِ نبوت کے دانا چشم پرنم اور دل پرکیف تھے

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِہٖٓ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْھِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۝ وَّیَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ کَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝ وَیَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْکُوْنَ وَیَزِیْدُھُمْ خُشُوْعًا ﴾ (بنی اسرائیل)

جن کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے (یہود و نصاریٰ) جب ان کو قرآن کی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو منہ کے بل وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، ہم سے ایک پیغمبر آخر الزمان کے بھیجنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ ضرور پورا ہوا، رو کر وہ منہ کے بل گرتے ہیں اور یہ ان کے خشوع کو اور بڑھاتا ہے۔

﴿ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَھُمْ مَّوَدَّۃً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰی ذٰلِکَ بِاَنَّ مِنْھُمْ قِسِّیْسِیْنَ وَرُھْبَانًا وَّاَنَّھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ ۝ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَی الرَّسُوْلِ تَرٰٓی اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاکْتُبْنَا مَعَ الشّٰھِدِیْنَ ﴾ (مائدہ)

ان میں سب سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ محبت رکھنے والے وہ ہیں جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں سبب یہی ہے کہ ان میں قسیس اور راہب ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے، اور جب وہ کلام سنتے ہیں جو پیغمبر پر اترا ہے تو ان کی آنکھوں کو تو دیکھے گا کہ حق کو پہچان کر آنسو بہاتی ہیں، اور کہتے ہیں کہ خدایا ہم ایمان لائے ہم کو بھی حق کی شہادت دینے والوں میں لکھ لے۔

مدینہ کے یہود جو اسلام سے سیاسی اور دینی کینہ اور تعصب رکھتے تھے اور اس بناء پر اسلام کے مقابلہ میں اپنی زبان سے اپنی کور باطنی کا اظہار وہ اپنا فرض سمجھتے تھے تاہم چشم دل کو بینش حق سے باز نہیں رکھ سکتے تھے۔

﴿ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ ۚ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْھُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۱۷)

جن کو ہم کتاب دے چکے ہیں وہ اس پیغمبر کو اسی طرح پہچانتے ہیں، جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، ان میں سے کچھ لوگ جان کر حق پوشی کرتے ہیں۔

﴿ وَلَمَّا جَآءَھُمْ کِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ وَکَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَی الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَھُمْ مَّا عَرَفُوْا کَفَرُوْا بِہٖ ﴾ (بقرہ۔۱۱)

اور جب خدا کے پاس سے پیغمبر وہ کتاب لے کر آیا جو خود ان کی آسمانی کتابوں کو سچ کر رہی ہے، تو باوجود اس کے کہ وہ کافروں کو اس سے پہلے اسی کے نام سے دباتے تھے، اب حق پہچان کر اس کا انکار کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی شہادتوں سے قطع نظر کر کے اگر واقعات پر غور کیا جائے تب بھی یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی، مجرد دعوت حق سننے کے ساتھ جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو لبیک کہا ان کے حالات پیش نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لئے صرف اثر پذیر دل اور ذوق آشنا نگاہوں کا جویاں تھا، حضرت سعید بن زیدؓ، عثمان بن مظعونؓ صہیب رومیؓ، ابوذر غفاریؓ، سلمان فارسیؓ وغیرہ جو سابقین اسلام ہیں اسی قسم کے لوگ تھے ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ قریش کے مشرکین و کفار خدا کا کلام تیرہ برس تک متصل سنتے رہے لیکن ان کے دل کی سنگینی میں کوئی فرق نہ آیا، ورقہ مکہ کا قریشی عیسائی صرف ایک بار قرآن سنتا ہے اور ناموس اکبر کی آواز پہچان لیتا ہے، مکہ کے مشرک

ترپن برس تک آپ کے چہرہ پرنور کو دیکھتے رہے لیکن نور الٰہی کو نہ پہچان سکے اور عبداللہ بن سلام یہودی عالم نے صرف ایک دفعہ جمال پرانوار کو دیکھا اور پکار اٹھے کہ یہ حق کی تجلی ہے۔ روسائے قریش ہر روز اپنی آنکھوں سے نزول وحی کا تماشا دیکھتے ہیں اور جنبش نہیں کرتے' نجاشی حکومت کی مسند پر اور ہرقل شہنشاہی کے تخت پر بیٹھ کر غائبانہ کلام اللہ کی چند آیتیں سنتے ہیں اور تڑپ جاتے ہیں' قریش کے گھر یہ دولت خود اترتی ہے اور وہ اس کو ٹھکرا دیتے ہیں لیکن مدینہ سے بنی اسرائیل کے پڑوسی جوان کی زبان سے آخری نبوت کی بشارت سن چکے تھے اتفاقاً مکہ آتے ہیں اور اسی دولت ابدی کو اپنے گھر اٹھا لے جاتے ہیں طائف کے سنگدل جاہل نبی پر پتھر برساتے ہیں اور اس کی ہنسی اڑاتے ہیں اور نجران کے عیسائی عالم مناظرہ کی غرض سے مدینہ آتے ہیں لیکن چہرہ پر پیغمبری کی معصومیت دیکھ کر دہل جاتے ہیں اور صلح کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔

قریش اور حجاز کے راز نبوت کے نامحرم دعوت حق کا جواب اکیس برس تک تیغ و سنان سے دیتے ہیں' لیکن یثرب' ہجر' یمن' عمان' بحرین کے بڑے بڑے عیسائی اور عظیم الشان قبائل جو یہود و نصاری اور مجوسیوں کے اثر سے ان رموز سے کس قدر آگاہ ہو چکے تھے وہ آواز حق پہنچنے کے ساتھ دفعتہً مسلمان تھے۔

آبائی دین ورسوم کی پابندی:

ہر نئی تحریک کو غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس کے قبول کرنے میں جو چیز سب سے پہلے عائق ہوتی ہے وہ قومی رسم ورواج اور آبائی دین و مذہب کی پابندی ہے' انسانیت کے پاؤں میں اس سے بھاری کوئی زنجیر نہیں دوست وآشنا کا چھوٹنا' ماں باپ سے علیحدگی' آل واولاد سے کنارہ کشی' مال و جائداد سے دست برداری' جماعت کی مخالفت، قوم سے انقطاع اور وطن سے دوری ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو ہر انسان آسانی سے برداشت کر سکے۔ ملکی رسم ورواج کی دیرینہ محبت اور آبائی کیش وآئین کی موروثی الفت' حق و باطل کی تمیز اور نیک و بد کی پہچان کی حس مٹا دیتی ہے عام دنیا کی فطری حالت کے علاوہ عرب کی قوم قدامت پسندی اور قدیم حالت پر بقا اور استحکام میں خاص شہرت رکھتی ہے' دنیا کہاں سے کہاں بدلتی چلی گئی، پرانی نسل کی بدویانہ خصوصیتیں جو توراۃ میں پڑھتے ہیں وہ تمام سامی قوموں سے مٹ گئیں مگر عرب میں اس وقت بھی نمایاں تھیں اور آج بھی نظر کے سامنے ہیں۔ دین ابراہیمؑ کے چند اصول حج' ختنہ اور قربانی وغیرہ ہزاروں برس کے بعد بھی عرب میں مٹ مٹا کر باقی رہ گئے تھے اور ان سے نہیں چھوٹے تھے ان کے شعر وشاعری اور فخر و مباہات کا سب سے پُر جوش مضمون آباواجداد اور نام ونسب پر فخر وغرور تھا جس کو چھوڑنا ان کے نزدیک اپنی پرانی عزت و عظمت کی دیوار کو خود گرا دینا تھا۔

آنحضرت ﷺ نے جب مکہ میں دین حق کی منادی شروع کی تو اس کی شدید مخالفت جس بناء پر سب سے زیادہ کی گئی وہ یہی آبائی دین کے ترک کا مسئلہ تھا اور یہی دین جدید کے بطلان کی سب سے مستحکم دلیل ان کے پاس تھی' چنانچہ قرآن مجید نے بار بار ان کے اس قول کو دہرایا ہے اور اس کی لغویت کو ظاہر کیا ہے۔

﴿ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا بَلۡ نَـتَّبِعُ مَآ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡـئًا وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ ﴾ (بقرہ۔)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کی پیروی کرو، کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم اس کی پیروی کریں

گے جس پر اپنے باپ دادوں کو ہم نے پایا کیا اگر چہ ان کے باپ دادا کچھ نہ سمجھتے ہوں اور نہ راہ راست پر ہوں (تب بھی)

﴿ بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۝ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰی مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴾ (زخرف۔۲۲۔۲۴)

بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم پر چل کر رہنمائی پائیں گے اور اسی طرح ہم نے اے پیغمبر تم سے پہلے کسی آبادی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، لیکن اس کے دولت مندوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم انہیں کے نقش قدم کے پیرو ہیں، کہوا ے پیغمبر کیا اگر چہ میں اس روش سے جس پر تم نے اپنے بزرگوں کو پایا زیادہ سیدھا راستہ لے کر تمہارے پاس کیوں نہ آؤں (تب بھی تم انہیں کی پیروی کرو گے) انہوں نے کہا کہ ہم تو (جو تم دے کر بھیجے گئے ہو) اس کا انکار ہی کرتے رہیں گے۔

﴿ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا ط وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (اعراف۔۲۸)

اور جب وہ کوئی بے شرمی کی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو اسی پر پایا اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے، کہہ دو اے پیغمبر کہ اللہ تو بے شرمی کی بات کا کبھی حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ پر وہ تہمت باندھتے ہو جو تم نہیں جانتے۔

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴾ (مائدہ)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کے پاس اور اس کے رسول کے پاس آؤ تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادوں کو جس پر پایا ہے وہی ہم کو کافی ہے، کیا ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ سیدھے راستے پر ہوں (تب بھی وہ انہیں کی پیروی کریں گے)

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًی وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ط اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴾ (لقمان۔۲۱)

کچھ لوگ ایسے ہیں جو علم، ہدایت اور روشن کتاب کے بغیر اللہ کے بارہ میں جھگڑا کرتے ہیں، اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں، بلکہ ہم اسی کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا اگر چہ ان کو شیطان دوزخ کے عذاب ہی کی طرف کیوں نہ پکارے (تو وہ اسی کی پیروی کریں گے)

کفار کے یہ سوال و جواب خود ظاہر کرتے ہیں کہ ان کو اپنے آبائی رسوم کو چھوڑنا کس درجہ محال نظر آتا تھا، آپ نے بعثت کے تین برس بعد جب بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع کی تو قریش کی عدالت میں آپ پر سب سے بڑا جرم یہی قائم کیا گیا کہ یہ خاندانی دیوتاؤں کی تحقیر، بزرگوں کی توہین اور آبائی رسم ورواج کی مذمت کرتے ہیں، مکہ میں جب آپ نے علی الاعلان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور بہت سے نیک لوگوں نے اس دعوت پر لبیک کہا تو قریش کے بڑے بڑے

رئیسوں نے ابوطالب کے پاس جا کر آپ کے خلاف جو الزامات قائم کئے وہ یہ تھے ''اے ابوطالب! تمہارا بھتیجا ہمارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے، ہمارے مذہب کی توہین کرتا ہے، ہم کو بے وقوف اور نادان کہتا ہے اور ہمارے باپ دادوں کو گمراہ بتاتا ہے تو یا تو تم ان کو روکو، یا ہم کو اور اس کو چھوڑ دو کہ باہم سمجھ لیں''۔

یہ ان کی عدالت کا پہلا مطالبہ تھا ابوطالب نے ان کو سمجھا بجھا کر واپس کیا تو کچھ دنوں کے بعد انہوں نے پھر اپنا مطالبہ ان الفاظ میں پیش کیا ''اے ابوطالب! تم نے اپنے بھتیجے کو اب تک منع نہیں کیا اب خدا کی قسم ہم اپنے بزرگوں کی برائی، اپنی نادانی اور اپنے دیوتاؤں کی ہجو نہیں سن سکتے، تو یا تو اس کو باز رکھو اور یا ہم سے لڑنے پر آمادہ ہو جاؤ'' اس اعلان جنگ سے کام نہ چلا تو وہ تیسری دفعہ ابوطالب کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں ''اے ابوطالب! ولید کا بیٹا عمارہ کیسا خوشرو جوان ہے تم اس کو متبنیٰ بنا لو اور اپنے بھتیجے کو قتل کے لئے ہمارے حوالہ کر دو کہ اس نے تمہارے اور تمہارے بزرگوں کے دین و مذہب کی مخالفت کی ہے، تمہاری قوم کی جماعت کو پراگندہ کیا ہے اور ان کو بے وقوف اور نادان کہتا ہے'' سب سے آخری دفعہ قریش کے رئیسوں نے خود آنحضرت ﷺ سے مل کر گفتگو کی اور کہا ''اے محمد! تمہارے سوا کسی قوم میں کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جو اپنی قوم پر وہ مصیبت لاتا ہو جو تم لائے ہو تم نے باپ دادوں کو برا کہا، ہمارے مذہب کی تحقیر کی، دیوتاؤں کو گالی دی ہم کو بے وقوف اور نادان بنایا اور جماعت میں تفرقہ ڈالا، غرض کوئی ایسی برائی نہ تھی جو تم نے ہمارے ساتھ نہیں کی'' [۱]

ان الزامات کی فہرست کی ایک ایک دفعہ پڑھو، معلوم ہوگا کہ آبائی دین، موروثی رسم و رواج اور خاندانی دیوتاؤں کی غلامی سے آزاد ہونا ان پر کتنا بار تھا اور وہ اس جرم کو کتنا سنگین سمجھتے تھے موسم حج میں آنحضرت ﷺ جب لوگوں کے پاس جا جا کر توحید کا پیغام سناتے تھے تو ابولہب آپ کے اثر کو باطل کرنے کے لئے آپ کی تقریر کے بعد آپ کے پیچھے پیچھے صرف یہ کہتا جاتا تھا کہ ''لوگو! یہ وہی ہے جو تم کو تمہارے باپ دادوں کے مذہب سے برگشتہ کرتا پھرتا ہے۔'' [۲]

ابوطالب جنہوں نے ہر موقع پر آنحضرت ﷺ کی حمایت کی اور وہ آپ کو اپنے دل و جان سے عزیز رکھتے تھے وہ بھی آپ کی دعوت حق کو اپنے آبائی دین کے مقابلہ پر پذیرائی کے قابل نہ سمجھتے تھے، بھتیجے نے بار بار کہا ''چچا جان! کلمہ شہادت ایک دفعہ پڑھ لیجئے کہ قیامت میں آپ کی شفاعت کی ایک سند مجھے ہاتھ آ جائے''۔ ابوطالب نے جواب دیا ''جان پدر! سب کچھ تم پر نثار لیکن بزرگوں کے مذہب کو نہیں چھوڑ سکتا'' عین اس وقت جب ابوطالب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے اور نزع کی حالت تھی آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ ''چچا جان لا الہ الا اللہ کہہ دیجئے کہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں'' ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ جو ان کے پاس بیٹھے تھے کہا ''ابوطالب کیا تم (اپنے باپ) عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے'' آپ بار بار لا الہ الا اللہ پڑھنے کی درخواست کرتے تھے اور یہ دونوں ان کو وہی عبدالمطلب کے دین سے علیحدگی پر شرم دلاتے تھے بالآخر ابوطالب نے یہی کہا کہ ''میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں'' اور لا الہ الا اللہ نہیں کہا۔ یہ صحیح بخاری کی روایت ہے' [۳] صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے کہ ابوطالب نے کہا کہ ''اے

---

[۱] یہ تمام واقعات ابن اسحاق اور سیرت کی تمام کتابوں میں بتفصیل مذکور ہیں۔

[۲] مستدرک حاکم ج ۱ ص ۱۵ کتاب الایمان

[۳] کتاب الجنائز باب قال المشرک عند الموت لا الہ الا اللہ۔

بھتیجے! جو فقرہ تم کہتے ہو میں کہہ کر تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا ہو لیکن قریش کہیں گے کہ ابو طالب موت سے ڈر گیا''[1] ابن اسحاق میں ہے کہ انہوں نے آہستہ سے وہ فقرہ کہہ دیا[2] بہر حال اس واقعہ سے جو دکھانا ہے وہ یہ ہے کہ اس حالت میں بھی مخالفین کے پاس باز رکھنے کے لئے اس سے زیادہ پر زور اور پر اثر دلیل نہ تھی کہ ''ابو طالب کیا آبائی مذہب چھوڑ دو گے؟'' اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام کی اشاعت کے راستہ میں یہ تخیل کتنا بڑا پتھر تھا۔

توہم پرستی:

عرب کی اصلاح و ہدایت کی راہ میں ایک اور عائق عرب کی توہم پرستی تھی، ہر قوم میں جاہلوں کا جس طرح یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ فلاں دیوتا یا فلاں پیر کے خلاف اگر زبان سے کچھ نکلا تو فوراً بلائیں آ کر ہم کو لپٹ جائیں گی، عرب میں گھر گھر سینکڑوں بت اور صنم خانے تھے، دنیا کے تمام کام انہیں اصنام اور بتوں سے متعلق سمجھے جاتے تھے مدتوں سے یہ خیال راسخ چلا آتا تھا کہ فلاں بت کی پرستش یا خدمت گذاری میں اگر کوتاہی کی گئی تو آسمان سے پانی برسنا بند ہو جائے گا فرزند نرینہ پیدا نہ ہوگا، باغوں میں پھل نہ آئیں گے، اسی بناء پر اسلام کے نام سے ان کو لرزہ آتا تھا اور یہ تخیل صرف اسی وقت پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ ایک مدت سے عرب میں چلا آتا تھا حضرت ہودؑ کی دعوت کے جواب میں ثمود نے کہا:

﴿اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ﴾ (ہود)

ہم تو اس کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے کہ ہمارے کسی دیوتا نے تم کو آ کے ستایا ہے۔

ابتداء میں جب آنحضرت ﷺ نے بتوں کے خلاف وعظ کہنا شروع کیا تو اکثر لوگوں نے (نعوذ باللہ) پاگل سمجھ لیا[3] جاہلیت کے زمانہ کے بعض کافر احباب ہمدردی کی راہ سے جھاڑ پھونک کرنے آئے[4] ضمام بن ثعلبہؓ ایک صحابی تھے وہ مسلمان ہو کر اپنے قبیلہ میں جب واپس گئے اور لات و عزیٰ کی مذمت شروع کی تو تمام قبیلہ خوف سے کانپ گیا کہ ''ضمام! ان کو برا نہ کہو، دیکھو کہیں تم کو برص، جنون یا جذام نہ ہو جائے''[5] حضرت زنیرہؓ مسلمان ہونے کے بعد بصارت سے محروم ہو گئی تھیں، کفار نے کہنا شروع کیا لات و عزیٰ نے ان کو اندھا کر دیا ہے[6] حضرت طفیل بن عمرو دوسی مسلمان ہو کر جب اپنے وطن تشریف لے گئے اور اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا ''دیکھو ذو الشری (بت) کہیں برباد نہ کر دے''۔[7]

فتح مکہ کے بعد جبکہ دیوتاؤں کے زور و قوت کا راز افشاء ہو چکا تھا اور اکثر قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا تاہم

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان باب ۹۔

[2] ابن ہشام وفات ابی طالب۔

[3] ابن کثیر زمخشری، ابن حبان، بغوی وغیرہ تمام مفسرین نے لکھا ہے۔

[4] دیکھو تفسیر آیت مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ و نیز مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ صحیح مسلم باب تحفیف الصلوٰة والخبطة

[5] مسند دارمی کتاب الصلوٰۃ۔

[6] اسد الغابہ ترجمہ حضرت زبیرہؓ و سیرۃ ابن ہشام ذکر مستضعفین مسلمین۔

[7] اسد الغابہ ذکر طفیل بن عمروؓ دوسی۔

لات، عزیٰ، منات ذی الکفین، سواع کے بت خانوں کو وہ اپنے ہاتھ سے نہ توڑ سکے خاص مدینہ سے راسخ الایمان مسلمان بھیجے گئے، جنہوں نے اس فرض کو انجام دیا، پجاریوں نے کوئی مزاحمت نہ کی، وہ سمجھتے تھے کہ ان دیوتاؤں کو کون توڑ سکتا ہے جو اس گستاخی کا ارادہ کرے گا وہ خود تباہ و برباد ہو جائے گا [1]

توہم پرستوں میں کسی مذہب کی صحت و بطلان کی دلیل شواہد عقلی نہیں ہیں بلکہ دنیا کے ظاہری مادی فوائد اور جانی و مالی خیر و برکت ہوئی ہے، لیکن قوانین گاہ عالم میں ایک مذہب پرست بھی اسی طرح آلام و مصائب میں گرفتار ہو سکتا ہے جس طرح ایک غیر مسلم، عرب کے بدو اور اعراب ابتداءً مسلمان ہونے کی ہمت بھی کرتے تھے تو معاً یہ توقع بھی کر لیتے تھے کہ اب وہ ہر قسم کے آفات ارضی و سماوی سے محفوظ ہیں اس بناء پر اگر کبھی ان کی اس توقع کو صدمہ پہنچتا تو دفعتہً وہ متزلزل ہو جاتے تھے صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے۔ [2]

﴿كان الرجل قدم المدينة فان ولدت امراته غلاما و نتجت خيله قال هذا دين صالح و ان لم تلد امراتهٗ ولم تنتج خيله قال هذا دين سوء﴾

باہر کا جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ آتا تھا اس کی یہ حالت تھی کہ اگر اس کی بیوی لڑکا جنتی اور اس کی گھوڑی بچہ دیتی تو وہ کہتا کہ یہ نہایت عمدہ مذہب ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو کہتا یہ نہایت برا مذہب ہے۔

قرآن مجید کی یہ آیت اسی قسم کے لوگوں کی شان میں نازل ہوئی [3]

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ﴾ (حج۔۲۰) [4]

اور بعض لوگ وہ ہیں جو خدا کی بندگی کنارہ کھڑے ہو کر کرتے ہیں (یعنی دل سے نہیں کرتے) اگر ان کو فائدہ پہنچا تو ان کو اطمینان ہو جاتا ہے، لیکن اگر مبتلائے مصیبت ہوئے تو فوراً روبرگشتہ ہو جاتے ہیں۔

ہجرت کے بعد جب مسلمان مدینہ آئے تو اتفاق سے ایک عرصہ تک کسی مسلمان گھرانے میں کوئی لڑکا پیدا نہ ہوا تو دشمن اس واقعہ کو اپنی بددعاؤں کا نتیجہ سمجھتے تھے اور خوش ہوتے تھے، آخر چھ مہینے کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ پیدا ہوئے تو مسلمان بے انتہا مسرور ہوئے [5] سوء اتفاق یہ کہ اول اول جو لوگ مدینہ میں آتے تھے ان کو وہاں کی آب و ہوا راس نہیں آتی تھی، ابتدائے ہجرت میں حضرت ابوبکرؓ و حضرت بلالؓ آئے تو سخت بیمار ہو گئے [6] حضرت طفیل بن عمروؓ نے جب مدینہ کو ہجرت کی تو ان کو بھی مدینہ کی آب و ہوا ناموافق ہوئی [7] اگرچہ مخلصین ارباب فہم پر اس قسم کی عارضی ناگواریوں کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا تاہم عام لوگ جن کی وہم پرستی فطرت ثانیہ ہو گئی تھی وہ اس قسم کے اتفاقی واقعات سے بے حد متاثر

---

[1] ابن سعد و طبری ذکر اصنام۔

[2] تفسیر سورہ حج جلد ثانی ص ۶۹۴۔

[3] صحیح بخاری تفسیر سورہ حج۔

[4] مستدرک حاکم ج ۳ و اصابہ ذکر عبداللہ بن زبیر۔

[5] مستدرک حاکم ج ۳ و اصابہ عبداللہ بن زبیر۔

[6] صحیح بخاری کتاب المرضیٰ و باب مقدم النبی ﷺ المدینہ۔

[7] صحیح مسلم کتاب الایمان۔

ہوتے تھے‘ چنانچہ جب عکل وعرینہ کے چند لوگوں نے مدینہ میں آ کر اسلام قبول کیا اور آب وہوا کی ناموافقت کے سبب سے بیمار ہوگئے اور آنحضرت ﷺ نے تبدیلی آب وہوا کی غرض سے ان کو اونٹوں کی چراگاہ میں بھیج دیا تو گو وہ صحیح ہوگئے تاہم مرتد ہوگئے [۱] اسی طرح ایک بدو نے آ کر آپ کے دست مبارک پر بیعت کی، لیکن سوء اتفاق سے دوسرے دن بخار میں مبتلا ہوا تو اپنی بیعت توڑنی چاہی آپ نے تین بار منع فرمایا لیکن اس نے اصرار سے آخر بیعت فسخ کر دی اور فرمایا: [۲]

﴿المدینة کالکیر تنفی خبثها و تنصع طیبها﴾

مدینہ آگ کی بھٹی ہے جو میل کو الگ کر دیتا ہے اور حقیقی جوہر کو خالص کر دیتا ہے۔

انہی اسباب کی بناء پر آنحضرت ﷺ نے مدینہ کے متعلق یہ دعا فرمائی۔

﴿اللّٰهم حبب الینا المدینة کحبها مکة او اشد، اللّٰهُمَّ و صححها و بارك لنا فی مدها وصاعها و انقل حماها فاجعلها بالجحفة﴾ [۳]

خداوند! مکہ کی طرح یا اس سے زیادہ ہمارے لئے مدینہ کو محبوب بنا دے‘ اس کو امراض سے صحیح کر دے اس کے پیمانے میں برکت دے اور اس کے بخار کو جحفہ میں منتقل کر دے۔

قبائل کی خانہ جنگیاں:

اسلام کی اشاعت کا ایک بڑا مانع عرب کی باہمی خانہ جنگیاں تھیں جو عرب کے خصائص قومی کا عنصر اعظم بن گئی تھیں‘ یہ خانہ جنگیاں ہزاروں برس سے چلی آتی تھیں اور ان کی وجہ سے قبائل میں ایسے مستمر اور ثابت الاساس انتقامی جذبات پیدا ہوگئے تھے جن کا مٹنا قریباً محال تھا انہی لڑائیوں نے ثار (انتقامِ خون) کی رسم پیدا کر دی تھی جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے اور یہ رسم ایسی سخت اور شدید الاثر تھی کہ ایک شخص کے خون کے لئے قبیلہ کا قبیلہ مٹ جاتا تھا ہزاروں برس کے خون قومی فرض کی طرح باقی چلے آتے تھے جو درج رجسٹر ہوتے رہتے تھے اور بچہ بچہ کی زبان پر ہوتے تھے جو بچہ پیدا ہوتا تھا وہ ہوش سنبھالنے کے وقت سب سے پہلے ثار کا لفظ سنتا تھا یعنی خاندان میں فلاں شخص قتل کیا گیا ہے اور اس کے خون کا انتقام اب تک باقی ہے اس لئے بچہ بچہ کا نصب العین ابتدائے زندگی سے یہی ثار ہوتا تھا۔

اس بناء پر ایک شخص یا ایک خاندان جس خلوص اور عقیدت مندی کے ساتھ اسلام کی طرف جھکتا تھا معاً اسی زور اور قوت کے ساتھ دوسرا فریق اسلام کی مخالفت اور اس سے سرکشی پر آمادہ ہو جاتا تھا مکہ میں اسلام کی مخالفت کا صرف یہی راز تھا کہ خدا نے نبوت کے لئے ہاشم کا گھرانا چن لیا تھا بنوامیہ کی مخالفت اس کے لیے لامحالہ ہونی تھی۔

مدینہ میں اوس وخزرج دو قبیلے تھے‘ اسلام سے پہلے دونوں لڑ لڑ کر تھک گئے تھے‘ اسلام کی آواز آئی تو گو دونوں نے ایک ساتھ لبیک کہا، تاہم قبیلہ اوس کا ایک ایک فرد اگر ہمہ تن اخلاص و جوش تھا تو خزرج میں بیسیوں منافق تھے انتہا یہ

---

[۱] صحیح بخاری کتاب المحاربین۔

[۲] بخاری ج ا ص ۲۵۳ کتاب الحج فضائل مدینہ و باب اعتصام السنة۔

[۳] صحیح بخاری مقدم النبی ﷺ المدینہ۔

ہے کہ ابتدائے اسلام میں ہجرت سے پہلے دونوں قبیلوں کی نماز کی امامت کے لئے باہر سے ایک تیسرے قبیلہ کا آدمی بلوایا گیا تھا کہ خدا کے سامنے بھی ایک کو دوسرے کے پیچھے کھڑے ہونے سے عار تھا۔ [1]

خزاعہ اور بنو بکر باہم شدید دشمن تھے اور ان میں باہم پرانی عداوت چلی آتی تھی مدینہ آنے کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کو صلح کا پیام اور اسلام کی دعوت دی خزاعہ نے اسلام کی دعوت قبول کی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے۔

خوب غور کرو کہ انصار اسلام لا کر ہمہ تن نیکوکاری اور پاکیزہ نفسی کے پیکر بن گئے لیکن ثار کے جذبات کس طرح آسانی سے دفعتہً مشتعل ہو جاتے تھے، ایک موقع پر ایک یہودی نے جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑ دیا تو انصار کے دونوں قبیلوں (اوس اور خزرج) کی تلواریں میان سے نکل آئیں [2] اور بڑی مشکل سے آنحضرت ﷺ نے ان کے جوش کو فرو کیا۔

حضرت عائشہؓ کے واقعہ افک میں جب آنحضرت ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر اس کی شکایت کی اور حضرت سعد بن معاذؓ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! اگر وہ تہمت لگانے والا ہمارے قبیلہ کا ہے تو میں اس کی گردن اڑا دیتا ہوں، اگر ہمارے بھائی خزرج کے قبیلہ سے ہے تو آپ حکم دیں میں بجا لاؤں گا، اس پر سعد بن عبادہ جو قبیلہ خزرج کے رئیس تھے دفعتہً کھڑے ہو گئے اور کہا۔

> ﴿ كذبت لعمر الله لا تقتله ولا تقدر على قتله ولو كان من رهطك ما احببت ان يقتل ﴾ [3]
>
> خدا کی قسم تو جھوٹ کہتا ہے، تو اس کو قتل نہ کرے گا، نہ کر سکتا ہے اور وہ شخص اگر تیرے قبیلہ کا ہوتا تو اس کا قتل کیا جانا پسند نہ کرتا۔

اس پر اوس اور خزرج دونوں قبیلہ کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، یہاں تک کہ قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے چنانچہ صحیح بخاری حدیث افک میں ہے۔

> ﴿ فثار الحيان الاوس و الخزرج حتى ان يقتتلوا و رسول الله قائم على المنبر ﴾
>
> پس دونوں قبیلے اوس اور خزرج مشتعل ہو گئے یہاں تک کہ دونوں کشت و خون پر آمادہ ہو گئے اور آنحضرت ﷺ اس وقت منبر پر کھڑے تھے۔

ایک بار محلم بن جثامہ لیثی نے عہد اسلام میں قبیلہ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر ڈالا، آنحضرت ﷺ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا، قبائل کے تعلقات کی بناء پر عیینہ نے مقتول اور اقرع بن حابس نے قاتل کی طرف سے وکالت کی اور بات بڑھی اور سخت شور و شغب ہوا تو آپ نے عیینہ سے فرمایا "دیت کیوں نہیں قبول کر لیتے" اس نے کہا "خدا کی قسم اس وقت تک دیت نہ قبول کروں گا جب تک اس کی بیویوں کو اس قدر نہ ستا لوں جس قدر اس نے ہماری بیویوں کو ستایا ہے" اس پر شور و غل ہوا۔ آپ نے پھر یہی الفاظ دہرائے اور عیینہ نے وہی پہلا جواب دیا چونکہ یہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا اور قتل

---

[1] ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ۔

[2] اصابہ ج ۱ مطبوعہ مصر ص ۸۸ معجم صغیر طبرانی میں بھی ایک اور اسی قسم کا واقعہ مذکور ہے۔

[3] صحیح بخاری کتاب المغازی باب حدیث الافک۔

کا یہ پہلا مقدمہ تھا جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تھا اس لئے قبیلہ بنولیث کے ایک شخص نے جو مسلح کھڑا تھا کہا کہ ابتدائے اسلام میں اس واقعہ کی مثال بکری کے اس ریوڑ کی سی ہے کہ اس کے پہلے حصہ کو تیر مارا گیا تو دوسرا بدک کے بھاگ گیا، یعنی اگر قاتل کے موافق فیصلہ کیا گیا تو لوگ سمجھیں گے کہ اسلام قصاص کو دیت سے بدل دینا چاہتا ہے اور چونکہ دلوں میں اب تک انتقام کے جذبات تازہ ہیں اور لوگ دیت لینا پسند نہیں کرتے، اس لئے ان کو اسلام کے قبول کرنے میں تامل ہوگا' لیکن آنحضرت ﷺ چونکہ سفر میں تھے اس لئے دیت میں ۵۰ اونٹ اسی وقت دیئے اور مدینہ پہنچ کر ۵۰ اونٹ کا وعدہ فرمایا۔ [1]

اہل عرب میں یہ جذبہ اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ گو آپ نے فتح مکہ میں امن عام کی منادی کر دی اور تلوار کو میان میں کر لینے کا حکم دیا تاہم انتقام کا جوش اب تک تازہ تھا۔

قبیلہ ہذیل کا ایک شخص اسلام لانے کی غرض سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جا رہا تھا اس نے زمانہ جاہلیت میں قبیلہ خزاعہ کا کوئی جرم کیا تھا وہ لوگ انتقام کے لئے اس کو ڈھونڈ رہے تھے سوء اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا اور ان لوگوں نے اس کو فوراً قتل کر دیا کہ اگر بارگاہ نبوت میں وہ پہنچ گیا تو پھر اس کا موقع ہاتھ نہ آئے گا آپ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو سخت برہم ہوئے ان لوگوں نے حضرت عمرؓ حضرت ابوبکر، حضرت علی رضی اللہ عنہم سے سفارش کی درخواست کی' آنحضرت ﷺ نے نماز کے بعد ایک خطبہ دیا جس کے الفاظ یہ تھے:

> ''خدا نے مکہ کو دار الحرام بنایا ہے' آدمیوں نے نہیں بنایا ہے' خدا نے کل چند گھنٹوں کے لئے اس کو میرے لئے حلال کر دیا تھا لیکن آج اس کی قدیم حرمت دوبارہ لوٹ آئی ہے اور خدا کے سب سے نافرمان بندے تین آدمی ہیں ایک وہ جس نے حدود حرم میں کسی کو قتل کیا' دوسرا وہ جس نے اپنے قاتل کے سوا کسی دوسرے شخص کو مار ڈالا' تیسرا وہ جس نے زمانہ جاہلیت کا انتقام لیا' تم نے جس شخص کو قتل کر ڈالا ہے میں اس کی دیت دوں گا''

چنانچہ آپ نے اس کی دیت [2] ادا فرمائی۔

بنوثعلبہ کے ایک آدمی نے جاہلیت میں اوس وخزرج کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا' بنوثعلبہ اسلام لا کر جب مدینہ آئے تو آنحضرت ﷺ خطبہ دے رہے تھے' ایک انصاری بے اختیار چلا اٹھے کہ یارسول اللہ ﷺ یہ ہمارے مجرم ہیں ان سے قصاص دلوایئے' آنحضرت ﷺ نے ہاتھ اٹھا کر فرمایا ﴿الا لا یجنی والد علی ولدہ﴾ [3] یعنی لڑکے کے جرم کا بدلہ باپ سے نہیں لیا جائے گا۔

ان واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ثار کا جذبہ کس طرح رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا اور اس جذبہ کا مشتعل ہو جانا کس قدر آسان ہوتا تھا۔

خانہ جنگیوں پر ختم نہیں' یوں بھی تمام قبائل رقیب اور حریف مقابل تھے دو مختلف قبیلوں کے آدمیوں میں کسی ذاتی

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ ص ۱۵۵ کتاب الدیات۔

[2] مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۳۱۔

[3] دار قطنی ج ۲ ص ۲۰۸۔

معاملہ پر بھی نزاع ہو جاتی تھی اور ان میں کوئی اپنے قبیلہ کا نام پکارتا تھا تو قومی جنگ کا سامان ہو جاتا تھا‘ ایک دفعہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپڑ مار دیا انصاری نے یا للانصار (انصار کی دہائی) پکارا‘ مہاجر نے بھی یا للمہاجرین (مہاجرین کی دہائی) کا نعرہ مارا‘ آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی آپ نے نکل کر فرمایا کہ ”یہ کیا جہالت کی پکار ہے؟“

﴿ مابال دعوی الجاھلیة ﴾

یہ کیا جہالت کا دعویٰ ہے۔

لوگوں کو معلوم تھا کہ اسلام اس فعل شنیع کا سخت دشمن ہے اس لئے جب تک وہ اپنا انتقام نہ لے لیتے ان کو اسلام لانے میں تامل ہوتا تھا۔ عمرو بن اقیش ایک صاحب تھے وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام سے متاثر اور اس کے قبول کرنے کے لئے ہر طرح آمادہ تھے لیکن ایک عائق تھا جو اس راہ میں حائل تھا یعنی ”ثار“ وہ جانتے تھے کہ اسلام لا کر اس خاندانی فرض کے ادا کرنے کی ان کو اجازت نہیں مل سکتی، ابن مندہ نے ان کے حال میں لکھا ہے:

﴿ و کان لہ ثار فی الجاھلیة و کرہ ان یسلم حتی یاخذہ ﴾

ان کا انتقام زمانہ جاہلیت میں باقی رہ گیا تھا جب تک وہ نہ لے لیں، انہوں نے مسلمان ہونا پسند نہ کیا۔

اسی طرح عمرو بن مالکؓ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور اسلام کی دعوت دی تو قبیلہ والوں نے کہا، بنو عقیل پر ہمارا ثار (انتقام) باقی ہے‘ وہ لے لیں تو اسلام لائیں‘ چنانچہ انہوں نے اسی وقت بنو عقیل پر جو مسلمان ہو چکے تھے حملہ کیا اور اس فرض سے سبکدوش ہوئے [۱]

سیاسی مشکلات:

جہالت‘ وحشت‘ پابندی رسوم‘ آبائی اثر وغیرہ وغیرہ ان میں سے ایک چیز بھی مانع اصلاح نہ ہوتی تاہم صرف سیاسی اسباب ایسے جمع تھے کہ قریش یا دیگر قبائل عرب کبھی اسلام کے آگے سر نہیں جھکا سکتے تھے مکہ میں دو خاندان برابر کے رقیب تھے امیہ اور ہاشم اور آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے امیہ کا پلہ ترجیح علانیہ گراں ہو چکا تھا‘ آنحضرت ﷺ نے جب نبوت کا اظہار کیا تو سب سے پہلے امیہ کے خاندان نے سرکشی کی اور فتح مکہ تک یہی خاندان تھا جو تمام لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا علم بردار تھا، بنو امیہ کے بعد اور دوسرے جو خاندان بھی تھے وہ بھی جو حرم کے مناصب دہ گانہ (رفادہ وغیرہ) کے ممتاز حصہ دار تھے ان میں سے ہر ایک دیکھ رہا تھا کہ اس جدید انقلاب میں ان فوائد اور اقتدار کا بالکل خاتمہ ہے ابوجہل سے جب ایک شخص نے کہا کہ ”محمد کی دعوت اسلام کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے“ تو اس نے صاف کہا کہ ”میں کیا کہوں محمد کے خاندان نے عزت و شرف میں برتری کا دعویٰ کیا اور ثبوت میں دعوتیں کھلائیں‘ اس کے جواب میں ہم نے اسی شان سے دعوتیں دیں‘ انہوں نے خون بہا دیئے ہم نے بھی خون بہا دیئے‘ انہوں نے زر پاشیاں کیں ہم نے بھی کیں‘ ہم دونوں دوش بدوش ہو چکے تھے کہ دفعتہً ان کی طرف سے یہ دعویٰ پیش ہوا کہ ہمارے خاندان میں نبوت اور آسمان سے وحی بھی آ گئی‘ اب ہم کہاں تک برداشت کریں‘ خدا کی قسم ہم کبھی محمد پر ایمان نہیں لا سکتے“ یہی ابوجہل جب انصار کے ہاتھ

---

[۱] اصابہ فی تمییز الصحابہ ذکر عمرو بن مالکؓ۔

سے قتل ہوا تو اس نے مرتے وقت حسرت سے کہا کہ کاش مجھ کو کاشتکاروں کے سوا کسی اور قوم نے قتل کیا ہوتا۔ [1]

خوب غور سے دیکھو بدر، احد، حمراء الاسد، احزاب وغیرہ تمام لڑائیوں میں یہی اموی عنصر تھا جو کام کرتا تھا، قریش کے قبیلہ سے باہر جو بڑے بڑے قبیلے تھے، مثلاً غطفان اور اسد وغیرہ وہ یا اہل مکہ ہی کے خاندان کی کوئی شاخ تھی یا قریش کے حلیف وہم عہد تھے خیبر میں یہود تھے جو قوم کے لحاظ سے قریش سے الگ تھے لیکن عرب تجارتی حیثیت سے تمام تر انہی یہودیوں کے زیر بار تھے انہی سے قرض دام لیتے تھے، انہی کے ہاں مال و متاع رہن رکھتے تھے [2] خیبر اور غطفان ایک مدت دراز سے باہم حلیف تھے اس طرح مکہ سے لے کر خیبر اور نجد تک تمام عرب ایک سلسلہ اتحاد میں مربوط تھا۔

کعبہ تمام عرب میں قبلہ گاہ اعظم تھا، ہر سال تمام ملک حج کرنے کے لئے آتا تھا اور آستانہ کعبہ پر سر جھکاتا تھا، کعبہ کے مجاور معمولی پنڈوے نہ تھے بلکہ خیمہ و خرگاہ، تیغ و سپر، جاہ چشم غرض ریاست و امارت کے تمام تر سروسامان رکھتے تھے اس لئے تمام عرب میں ان کی شہنشاہی قائم تھی یہی بات ہے کہ جب تک مکہ فتح نہ ہوا اسلام چین سے نہیں بیٹھ سکا لیکن اسلام کی مخالفت صرف قریش کی متابعت پر محدود نہ تھی بلکہ بڑا سبب یہ تھا کہ اسلام سے خاص قریش کو جو نقصان پہنچ سکتا تھا براہ راست وہی تمام روسائے قبائل کو پہنچتا تھا، عرب کا ملکی نظام یہ تھا کہ تمام ملک میں قبائل پھیلے ہوئے تھے اور ہر قبیلہ کا ایک رئیس اعظم ہوتا تھا جو تمام قبیلہ پر حکمران ہوتا تھا اور مال غنیمت سے چوتھ وصول کرتا تھا جس کو مرباع کہتے تھے اس کے علاوہ غنائم میں سے جو عورت یا اور کوئی عمدہ چیز اس کو پسند آجاتی تھی اس کو چھانٹ لیتا تھا اس کا نام صفی تھا، یہ گویا چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں، جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں یہ ریاست خاندانی اصول پر چلتی تھی باپ کے مرنے کے بعد بیٹا رئیس منتخب ہوتا تھا قبیلہ کے تمام معاملات ذاتی نزاعیں قصاص یا خون بہا کے فیصلے سب رئیس کے ہاتھ میں فیصل ہوتے تھے یہ روٴساء عام قوم سے بہت سے حقوق میں ممتاز ہوتے تھے۔

قبائل میں یہی امتیاز مراتب تھا کہ جو قبائل زیادہ شریف مانے جاتے تھے ان میں سے ایک آدمی کو اگر کوئی دوسرا قبیلہ قتل کر دیتا تھا تو اس کا خون دوسرے قبیلہ کے دو خون کے برابر سمجھا جاتا تھا اور اس لئے ایک کے بدلہ میں دو کو قتل کرتے تھے۔ یہ امتیاز اور فرق مراتب اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ جب غزوہٴ بدر میں قریش کی فوج سے عتبہ و شیبہ میدان میں آئے اور مبارز طلب ہوئے اور انصار ان کے مقابلہ کو نکلے تو عتبہ نے اس بناء پر اس کے مقابلہ سے انکار کر دیا کہ قریش اور انصار کا جوڑ نہیں۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جبلہ بن الایہم خاندان غسان کا اخیر فرمانروا اسلام لایا اور مکہ میں آیا ایک دن طواف میں اس کی چادر کسی شخص کے پاؤں کے نیچے آ گئی، جبلہ نے اس کی گال پر تھپڑ کھینچ مارا اس نے بھی برابر کا جواب دیا، جبلہ نے حضرت عمرؓ کے پاس جا کر شکایت کی حضرت عمرؓ نے واقعہ سن کر کہا، اس کا کیا قصور تم نے جو کیا اس کی جزا پائی، جبلہ نے کہا یہ میرا رتبہ ہے کہ کوئی مجھ پر ہاتھ اٹھاتا تو قتل کر دیا جاتا، حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہاں زمانہ جاہلیت میں یہی قاعدہ تھا لیکن اسلام نے اس کا خاتمہ کر دیا، جبلہ نے کہا جو مذہب شرفاء کو ذلیل کر دیتا ہے، میں اس سے باز آتا ہوں۔ یہ کہہ کر چوری سے

---

[1] ابن ہشام حصہ اول ص ۱۰۸ مطبوعہ مصر طبع اوّل۔

[2] طبری واقعہ خیبر۔

روم چلا گیا اور عیسائی ہو گیا۔

عرب کا ہر رئیس قبیلہ درحقیقت جبلہ تھا اور اسلام قبول کرنے کے وقت اس کو یہی منظر نظر آتا تھا، اسلام ان تمام واقعات اور خصوصیات کو مٹاتا تھا اس کے دربار میں شاہ و گدا، رئیس و عامی، شریف و حقیر کا ایک ہی درجہ تھا اس لئے عرب میں تمام روسائے قبائل کو صاف نظر آتا تھا کہ اسلام کا پھیلنا ان کے ہر قسم کے فخر و امتیاز کا مٹ جانا ہے۔

عرب میں ایک دوسری حریف طاقت یہودیوں کی تھی جو حجاز سے لے کر شام کے دروازوں تک پھیلے تھے ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے مضبوط قلعے تھے فن جنگ سے واقف تھے سامان و اسلحہ وافر رکھتے تھے دولت کی بہتات تھی باغوں اور زمینوں پر ان کا قبضہ تھا، عرب کے تمام مادی ذرائع معاش کے وہ تنہا اجارہ دار تھے پھر اسلام آیا تو اس طرح کہ اس نے یہودیوں کی ایک ایک برائی کو طشت از بام کیا اور ان کے مذہبی وقار کے کھوکھلے پن کو علی الاعلان ظاہر کیا اس لئے انہیں صاف نظر آتا تھا کہ یہ نئی طاقت ملک میں جڑ پکڑ کر ان کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دے گی، چنانچہ بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع اور یثرب، خیبر، فدک، تیماء، وادی القری وغیرہ کے یہودی زمیندار، سوداگر، مہاجن اور قلعہ نشین دل سے چاہتے تھے کہ اس قوت کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں اور آخر لڑائیاں پیش آئیں اور دین توحید کے مقابلہ میں اہل شرک کا ساتھ دے کر خندق و احزاب و غطفان کے معرکے پیش کئے، عرب کے مختلف قبیلوں اور سرحدی صوبوں پر ایران و روم کی سلطنتیں فرمانروائی کرتی تھیں عراق، یمن اور بحرین پر ایران کی حکومت تھی اور حجاز کے شامی حدود پر قیصر کا قبضہ تھا عرب کے مختلف ہمسایہ قبیلے انہیں دو میں سے کسی ایک سلطنت کی حفاظت کا دم بھرتے تھے اور یہ دونوں سلطنتیں اس بیچ کے سرحدی ملک کی ایک ایک حرکت اور جنبش پر نظر رکھتی تھیں، اس لئے اس ملک میں اتنی بڑی عظیم الشان تحریک کا قوت پکڑنا ان کو کسی طرح پسند نہ آ سکتا تھا اس لئے عرب میں اسلام کی قوت کا ان کو جب احساس ہوا تو انہوں نے اس کی دار و گیر کرنی چاہی کسریٰ ایران نے اپنے ایرانی گورنر کو لکھا کہ اس نئے مدعی کو پکڑ کر ہمارے سامنے حاضر کرو اور قیصر نے تو کھلم کھلا حملہ کی تیاری ہی کر دی تھی جس کے باعث تبوک کی فوج کشی ہوئی اور آخر آنحضرت ﷺ کے بعد اسلام کو ان دونوں ہمسایہ طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

ذریعہ معاش:

اسلام لانے کا ایک بڑا مانع یہ تھا کہ عرب کا ذریعہ معاش عموماً قافلوں پر حملہ آوری اور سلب اموال اور رہزنی تھا اوپر ہم امالی قالی سے نقل کر آئے ہیں کہ عرب کا ذریعہ معاش غارت گری تھا اور چونکہ حج کے چار مہینے تک جنگ و غارت سے باز رہنے میں ان کے ذرائع معاش مسدود ہو جاتے تھے اس ضرورت سے وہ حج کے مہینوں کو ادل بدل کر لیا کرتے تھے۔

اندرونی عرب تمام تر دشت و صحرا اور بالکل ویرانہ ہے، زراعت یا تجارت کی کوئی صورت نہیں باوجود اس کے لاکھوں نفوس آباد ہیں، اس لئے ان کو غارت گری کرنی پڑتی اور امتداد زمانہ سے یہ عادت ان میں راسخ ہو گئی تھی، رفتہ رفتہ ٹھگی، رہزنی اور سرقہ تمام ملک میں پھیل گیا تھا، یہاں تک کہ بڑے بڑے نامور شعراء چور اور راہزن ہوتے تھے۔

اکثر بڑے بڑے جتھے اس لئے قائم ہوتے تھے کہ بنجارے جو ملک میں پھر کر غلہ کی تجارت کرتے تھے ان کو لوٹ لیا کریں آنحضرت ﷺ نے دومۃ الجندل پر جو سریہ بھیجا تھا، اسی کے انسداد کی غرض سے بھیجا تھا دومۃ الجندل مدینہ

منورہ سے پندرہ منزل کے فاصلہ پر ہے تاہم یہ لوگ اس قدر فاصلہ سے خود مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تدبیر کر رہے تھے کہ آپ کو خبر ہوگئی اور حفظ ماتقدم کے لئے خود وہاں تک گئے اور چند روز قیام کر کے ان اطراف کا بندوبست کیا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اسلام لانے سے پہلے چند شخصوں کو قتل کر کے ان کا مال چھین لیا تھا' چنانچہ جب اسلام لائے اور اس واقعہ کا اظہار کر کے لوٹ کا مال بھی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے فرمایا۔

﴿ اما الاسلام فاقبل و اما المال فلست منه فی شئی ﴾

اسلام تو میں نے قبول کیا لیکن مال سے مجھ کو کسی قسم کا واسطہ نہیں۔

ایک نکتہ یہاں خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے حدیثوں میں جو یہ وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ اکثر بیعت اسلام کے وقت جن باتوں کا اقرار لیتے تھے' ان میں ایک یہ بھی ہوتا تھا کہ ''چوری نہ کریں گے'' اس کی یہی وجہ تھی کہ ان جرائم کا رواج تھا ورنہ آج اگر شرفاء سے بیعت کے وقت یہ اقرار لیا جائے تو لوگوں کو تعجب ہوگا کہ یہ بیعت لینے کی کیا چیز ہے

اسلام قبول کرنے کے ساتھ ان تمام جرائم سے توبہ کرنا ہوتا تھا اس لئے عرب کو اسلام قبول کرتے وقت یہ نظر آتا تھا کہ وہ تمام ذرائع معاش سے مجبور ہو جاتے ہیں' وہ قافلوں پر حملہ نہیں کر سکتے' کہیں ڈاکہ نہیں ڈال سکتے' کسی کا مال نہیں چھین سکتے تو اب ان کے لئے کیا باقی رہ جاتا ہے۔

قریش خود رہزن اور غارت گر نہ تھے وہ شہر کی متمدن زندگی بسر کرتے تھے۔ تاہم دیگر اسباب کے ساتھ ان کے اسلام نہ قبول کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ قبول اسلام کا اثر ان کے وسائل معاش پر بھی پڑ سکتا تھا' قریش کا ذریعہ معاش صرف ان تجارتی تعلقات تک محدود تھا جو انہوں نے باضابطہ طور پر دوسرے قبائل اور ممالک سے قائم کر لئے تھے اور یہ تمام قبائل اور ممالک مذہبی حیثیت سے اسلام کے دشمن اور حریف اور مقابل تھے اس بناء پر قریش کو خوف تھا کہ اگر وہ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو جائیں گے تو یہ دفعۃً یہ تمام تجارتی تعلقات منقطع ہو جائیں گے چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح (صفحہ ۱۳۸ جلد ۴) میں امام شافعیؒ کی روایت سے لکھتے ہیں۔

﴿ قال الشافعی کانت قریش تنتاب الشام انتیاباً کثیرا و کان کثیر من معائشها منه وتاتی العراق فیقال لما دخلت فی الاسلام ذکرت للنبی ﷺ خوفها من انقطاع معائشها بالتجارة من الشام والعراق اذا فارقت الکفر و دخلت فی الاسلام و خلاف ملك الشام والعراق لاهل الاسلام فقال النبی صلی الله علیه وسلم اذا هلك کسری بعده فلم یبق بارض العراق کسری یثبت له امر بعده وقال اذا هلك قیصر فلا قیصر فاجابهم علی ماقالوا ﴾

امام شافعیؒ کا بیان ہے کہ قریش شام میں اکثر تجارتی حیثیت سے آمد و رفت رکھتے تھے اور ان کی معاش کا تعلق زیادہ تر اسی سے تھا اور اس غرض سے وہ عراق میں بھی آتے جاتے تھے تو کہا جاتا ہے کہ جب قریش کے لوگ اسلام لائے تو آنحضرت ﷺ سے ان ذرائع معاش کے منقطع ہو جانے کا خوف ظاہر کیا اور شام و عراق کے بادشاہوں کی اس مخالفت کا ذکر کیا جو ان کو اہل اسلام کے ساتھ تھی اس پر آپ نے فرمایا کہ جب کسریٰ ہلاک ہو جائے تو پھر اس کے

بعد دوسرا کسریٰ نہ ہوگا چنانچہ عراق سے کسریٰ کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور آپ نے فرمایا جب قیصر ہلاک ہوجائے گا تو پھر دوسرے قیصر کا وجود نہ ہوگا چنانچہ ارض شام میں پھر کوئی قیصر نہ ہوا، جس کی وہاں حکومت ہو اس لحاظ سے آنحضرت ﷺ نے یہ جواب ان کے بیان کے موافق دیا ہے۔

رفع شک:

اس موقع پر ایک غلطی کا ذکر کرنا ضرور ہے جو عام طور پر یورپ میں پھیلی ہوئی ہے، اہل مغرب کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی کہ اس میں عرب کی ہر قسم کے خواہش ہائے نفسانی کے پورے کرنے کا سامان موجود تھا عرب جنگ و جدل اور لوٹ مار کے شائق تھے اسلام نے انہی چیزوں کو جہاد و غنیمت کی صورت میں بدل دیا، عرب سخت نفس پرست تھے اسلام نے چار بیویوں اور غیر محدود لونڈیوں کی اجازت دے دی، اہل عرب زاہدانہ زندگی سے بالکل آشنا نہ تھے اسلام نے بھی رہبانیت کی تحقیر کی، اب کیا چیز تھی جو اہل عرب کو اسلام سے روک سکتی تھی۔

لیکن یہ خیال تمام تر غلط ہے جہاد اور تعدد ازواج اور سراری کی بحث کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گی یہاں اس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ جہاد یا تعدد ازواج جو کچھ بھی تھا قدیم آزادی سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا جہاد صرف کافروں سے جائز تھا، فرض کرو ایک قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا تو اس پر کوئی شخص ہتھیار نہیں اٹھا سکتا تھا اور اس کے مال و متاع سے تعرض نہیں کر سکتا تھا لیکن قدیم رسم کے لحاظ سے اتحاد مذہب کوئی روک نہ تھی، تمام قبائل بت پرستی میں متحد تھے، لیکن ہمیشہ ایک دوسرے کو لوٹتے رہتے تھے جہاد کے لئے اور بہت سی پابندیاں تھیں، جو پہلے بالکل نہ تھیں جہاد میں صرف پاس پاس کے قبائل شریک ہوتے تھے، دور دور کے قبائل اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے جہاد میں جو لونڈیاں گرفتار ہوتی تھی ان سے اس وقت تمتع جائز ہوتا تھا جب ایک مہینہ کی مدت گزر جائے یا اگر حاملہ ہے تو بچہ پیدا ہو چکے لیکن اسلام سے پہلے فتح کے ساتھ ہی عورتوں کو تصرف میں لے آتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے پہلے نکاح کے لئے تعداد کی کوئی قید نہ تھی ایک ساتھ آٹھ آٹھ، دس دس شادیاں کرتے تھے اب چار کی قید ہوگئی اور وہ بھی اس سخت شرط کے ساتھ کہ سب میں عدل و مساوات رہے اس لئے یہ کہنا کہ اسلام عرب کے مرغوبات کو قائم رکھتا تھا تمام تر غلط ہے برخلاف اس کے عرب کی ایک ایک چیز روایات قدیمہ، جہالت، عادات رسوم، نفس پرستی، ہر چیز اسلام کے قبول کرنے کی مانع تھی۔

ہر قوم پر جو چیز سب سے زیادہ سختی کے ساتھ حکمران ہوتی ہے، وہ قدیم عادات اور رسوم اور خیالات ہیں، آج یورپ علوم وفنون اور آزادی خیال میں اس حد تک ترقی کر گیا ہے، لیکن جو بے ہودہ تعجب انگیز رسمیں پہلے قائم تھیں، اب بھی قائم ہیں، یا تو تعود کی وجہ سے ان کی برائیاں سرے سے نظر ہی نہیں آتیں یا آتی ہیں تو عادت کی حکومت کے مقابلہ میں آزادی خیال اور علوم وفنون سب عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں۔

عرب میں جس قدر رسمیں قومی عادتیں تھیں جو ان کی ہستی کی عناصر بن گئی تھیں، اسلام ایک ایک کا دشمن تھا، ثار یعنی انتقام خون عرب کے جذبات کا سب سے بڑا مظہر تھا، اسلام نے اس کو بالکل مٹا دیا، خاندانی فخر ومباہات ان کی قومی زندگی کی روح تھی، فنا کر دی گئی، ابوسفیان رئیس العرب کو بلال ؓ (جو حبشی غلام تھے) کے ساتھ بیٹھنا پڑا، یا تو قریش کو انصار کے مقابلہ میں تلوار اٹھانے سے بھی عار تھا یا اب قریش کی لڑکیاں غلاموں کے (زید و سالم وغیرہ) گھر میں آ گئیں، عکاظ

وغیرہ کے میلے جہاں عرب سال کے سال جمع ہو کر اپنے مفاخر کی داستانیں سناتے تھے، سرد پڑ گئے۔

اسلام ایک طرف تو عرب کے تمام تر مفاخر کو خاک میں ملاتا تھا دوسری طرف خود اس میں ہوائے نفس اور تفریح طبع کا کوئی سامان نہ تھا اسلام قبول کرنے کے ساتھ پانچ وقت کی وقت نماز گلے کا ہار بن جاتی تھی جو آزاد مزاجوں پر سخت گراں تھی۔

﴿ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ ﴾ (بقرہ)

اور وہ (نماز) خاشعین کے سوا اوروں پر یقیناً گراں ہے

روزہ یعنی تیس دن تک متصل کھانا پینا چھوڑ دینا کوئی آسان کام نہ تھا، زکوۃ ایسا ٹیکس تھا کہ محض اس کے ادا کرنے پر حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں عام بغاوت ہوگئی، صرف حج ایک ایسا فرض تھا جو بظاہر زندہ دلی کا سامان رکھتا تھا، لیکن اب وہ حج جاہلیت کا حج نہیں رہا، طواف عریاں کی اجازت نہیں رہی تھی، بڑی دلچسپی کی چیز بت تھے وہ ایک ایک کر کے حرم سے نکال دیئے گئے مقام منیٰ میں خاندانی واقعات کی رجز خوانی کا جو طریقہ چلا آتا تھا بند کر دیا گیا یہ فرائض اور اوامر کا حال تھا اسی کے ساتھ محرکات اور نواہی کی وہ عالم گیری تھی کہ ان کے جاہلانہ خیال کے مطابق زندگی نہیں بلکہ زنداں بن گئی تھی، زنا حرام، شراب حرام، قمار حرام، سونا چاندی حرام، اطلس وحریر حرام، چنگ وعود حرام، تصویر حرام، پھر زندہ دلی اور لطف زندگی کے لئے باقی کیا رہ جاتا ہے۔

خوب غور سے دیکھو تمام مذاہب نے عبادتوں میں بھی دلچسپی کا سامان رکھا ہے عیسائیوں کی نماز گا کر ادا کی جاتی ہے، پارسیوں میں زمزمہ ہوتا ہے، ہندو بھی عبادت کے وقت بھجن گاتے ہیں اور سامنے دلفریب بت ہوتے تھے لیکن اسلام میں بظاہر دلآویزی اور دلفریبی کی ایک چیز بھی نہیں۔

مذکورہ بالا واقعات کی بناء پر یورپ کا یہ اعتراض کس قدر غلط اور تمام تر بے سروپا ہے کہ اسلام اس لئے پھیلا کہ وہ نفس پرستی کی ترغیب دلاتا اور اس کے سامان مہیا کرتا تھا

پھر کیا تھا؟ اس کا جواب آگے آتا ہے؟

* * *

تبلیغ نبوی

اور اس کے اصول اور اس کی کامیابی کے اسباب

تمام گذشتہ موانع، عوائق، مشکلات اور دشواریوں کی دیواریں آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے ٹوٹتی گئیں، اسلام پھیلا اور اس طرح پھیلا کہ آنحضرت ﷺ نے جب دنیا کو چھوڑا تو تمام عرب میں ایک بھی بت پرست نہ تھا اس لئے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ مخالفین کے نزدیک تو اس کا جواب صرف تلوار ہے لیکن کارلائل[1] کے بقول نہتے اور یکہ وتنہا اسلام کے ہاتھ میں یہ تلوار کس کے زور سے آئی؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تلوار صرف اسلام کی تبلیغی دعوت تھی اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں اسلام کی اس طاقت کی تشریح کر دینا مناسب ہے۔

فریضۂ تبلیغ:

’’تبلیغ‘‘ کے لفظی معنی پیغام پہنچانے کے ہیں اور اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اس کی اچھائی اور خوبی کو دوسرے لوگوں اور دوسری قوموں اور ملکوں تک پہنچائیں اور ان کو اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں قرآن پاک میں تبلیغ کے ہم معنی چند اور الفاظ بھی ہیں جن میں سے ایک لفظ (انذار) ہے جس کے معنی ہشیار اور آگاہ کرنے کے ہیں، دوسرا لفظ دعوۃ ہے جس کے معنی بلانے اور پکارنے کے ہیں اور تیسرا لفظ تزکیہ جس کے معنی یاد دلانے اور نصیحت کرنے کے ہیں بعثت نبوی کے وقت دنیا میں دو قسم کے مذہب تھے، دو ایسے جو تبلیغی تھے یعنی عیسائیت اور بودھ مت۔ باقی زیادہ تر ایسے ہی تھے جو تبلیغی نہیں تھے جیسے یہودیت، مجوسیت، ہندویت۔ جو دو تبلیغی سمجھے جاتے تھے ان کی نسبت یہ فیصلہ مشکوک ہے کہ آیا یہ تبلیغ ان کے اصل مذہب کا حکم تھا یا بعد کے پیرووں کا عمل کیونکہ ان کے مذہبی صحیفوں میں اس تعلیم کی دعوت کی کھلی ہوئی ہدایتیں اور ان کے بانیوں کی زندگی میں اس کی عملی مثالیں نہیں ملتیں، تمام مذاہب میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے تبلیغ کی اہمیت کو سمجھا اور اس کے متعلق اپنے صحیفہ میں کھلے احکام دیئے اور اس کے داعی وحامل علیہ السلام نے اپنی زندگی میں اس کی عملی مثالیں پیش کیں۔

جن مذہبوں نے تبلیغ کو اپنا اصول نہیں ٹھہرایا ان کے ایسا کرنے کی اصلی وجہیں دو ہیں ایک یہ کہ ان کے نزدیک اس حق کے قبول کرنے کی عزت کا استحقاق پیدائش سے حاصل ہوتا ہے کوشش سے نہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ جو حق ان کے پاس ہے وہ ان کے نزدیک اتنا پاک ومقدس ہے کہ ان کی خاص پاک و بزرگ ومحترم نسل وقوم کے علاوہ دوسری تمام قومیں جو ناپاک ونجس وکم تر ہیں ان تک اپنے پاک مذہب کو لے جانا خود اس مذہب کی پاکی کو صدمہ پہنچانا ہے، یہی سبب ہے کہ حضرت مسیحؑ سے ایک دفعہ جب ایک کنعانی (متی ۱۵) یا یونانی (مرقس) عورت نے برکت چاہی تو فرمایا ’’میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا‘‘ (متی ۱۵۔۲۵) پھر فرمایا ’’مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی (بنی اسرائیل کا مذہب) کتوں (غیر اسرائیلی قوموں) کو پھینک دیں‘‘ (۲۷) پھر فرمایا ’’غیر قوموں

---

[1] ہیروز اینڈ ہیرو دورشپ (محمد ﷺ)

کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ پہلے اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ اور چلتے ہوئے منادی کرو"۔ (متی۔۱۰۔۶) پھر ارشاد فرمایا "وہ چیز جو پاک ہے کتوں کو مت دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ پھینکو" (متی ۷۔۶)

ہندوؤں نے اپنے مذہب کو تمام قوموں سے جو چھپا کر رکھا اس کا بھی یہی سبب تھا کہ وہ اپنا پاک دھرم ملیچھوں اور اچھوتوں کو سکھا کر اس کو ناپاک نہیں کرنا چاہتے تھے یہودیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ نامختون اس نعمت کے اہل نہیں۔

تبلیغ کی اہمیت:

آنحضرت ﷺ نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا اور خدا کے پیغام کی منادی کا سب کو یکساں مستحق قرار دیا' اس لئے اپنی تبلیغ کے لئے قریش وغیر قریش، حجاز و یمن' عرب و عجم' ہند و روم کی تخصیص نہیں فرمائی بلکہ دنیا کی ہر قوم' ہر زبان اور ہر گوشہ میں صدائے الٰہی کا پہنچانا فرض قرار دیا ابتدائی وحی میں انجانوں کو ہشیار اور بےخبروں کو آگاہ کرنا سب سے پہلے حکم تھا ﴿یَآاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُo قُمْ فَاَنْذِرْ ﴾ (مدثر۔۱) اے چادر پوش! اٹھ کھڑا ہو اور ہشیار وآگاہ کر، پھر بار بار حکم ہوتا رہا کہ ﴿بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ﴾ جو تیری طرف اتارا گیا اس کو اوروں تک پہنچا ﴿فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ﴾ (شوریٰ) لوگوں کو دعوت دے اور مضبوط قائم رہ جس طرح تجھے حکم دیا گیا ﴿فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰی ﴾ (اعلیٰ) لوگوں کو نصیحت کر اگر نصیحت فائدہ مند ہو ﴿ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ ﴾ (ق) قرآن سے سمجھاؤ اس کو جو میری دھمکی سے ڈرتا ہو۔ اور ان کے علاوہ بیسیوں آیتوں میں اس فرض کی اہمیت ظاہر کی گئی' حضرت علیؓ سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے علی! تمہاری کوشش سے ایک آدمی کا بھی دین حق قبول کر لینا دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بڑھ کر ہے۔[1]

اس سے زیادہ یہ کہ اسلام نے اپنے ہر پیرو پر خیر کی دعوت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور تواصی بالحق یعنی باہم ایک دوسرے کو سچائی کی نصیحت کرنا ضروری قرار دیا ہے اور مسلمانوں کا یہ فرض بتایا ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تاریکی سے نکالنے کی جدوجہد کریں آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے خطرات سے بےپرواہ ہو کر پیام الٰہی لوگوں تک پہنچایئے اور اگر ایسا نہ کیا تو رسالت کا فرض انجام نہ دیا۔

> ﴿ یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ط وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ﴾ (مائدہ)
>
> اے خدا کے پیغام پہنچانے والے تیرے پروردگار کے پاس سے جو کچھ تیری طرف اترا ہے اس کو پہنچا دے اگر تو نے ایسا نہیں کیا تو تو نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا اور تجھ کو خدا لوگوں سے بچا لے گا۔

اس کی وسعت:

اس کے بعد اس فریضہ تبلیغ کی وسعت کی بحث ہے' پیغام الٰہی' سچائی کا ایک بہتا چشمہ ہے' جو آہستہ آہستہ

---

[1] صحیح مسلم باب خیبر۔

قدرتی رفتار سے پہلے اپنی قریب کی زمین کو پھر آگے کو پھر اس سے آگے کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ زمین کے کناروں تک پہنچ جاتا ہے آنحضرت ﷺ کو اس تبلیغ کا حکم اسی تدریج کے ساتھ ہوا سب سے پہلے خاص اپنے گھر اور خاندان کے لوگوں کو سمجھانے کا حکم ہوا۔

﴿ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴾ (شعراء۔۱۱)

اور اپنے سب سے نزدیک کے اہل خاندان کو آگاہ وہشیار کر۔

اس کے بعد یہ دائرہ بڑھ کر شہر مکہ اور اس کے اطراف کی آبادیوں تک پہنچتا ہے

﴿ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾ (شوریٰ۔۱)

تاکہ تو مکہ اور جو اس کے آس پاس کے بدوی ہیں ان کو آگاہ وہشیار کرے۔

اب تبلیغ کا دائرہ اس سے بھی آگے بڑھتا ہے اور ہر زندہ روح یعنی سمجھ بوجھ، احساس وعقل وغیرہ حقیقی زندگی کی علامتیں جس میں موجود ہوں اس کی مخاطب ہوتی ہیں۔

﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا ﴾ (یٰسین۔۵)

یہ قرآن تو صرف ایک نصیحت اور صاف صاف خدا کا کلام ہے تاکہ وہ اس کو ہشیار کرے جو زندہ ہے۔

پھر جس تک بھی وہ آواز پہنچ جائے سب سے اس کا خطاب ہے۔

﴿ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ﴾ (انعام۔۲)

تاکہ میں تمہیں آگاہ وہوشیار کروں اور ان کو جن تک میری یہ آگاہ وہوشیار کرنے والی آواز پہنچے۔

پھر تمام انسانوں تک اس کی وسعت ہے۔

﴿ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ ﴾ (ابراہیم۔۷)

یہ قرآن تمام انسانوں کے لئے پیغام ہے۔

آنحضرت ﷺ کو خطاب ہوا۔

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ﴾ (سبا۔۳)

اور ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ہوشیار کرنے والے بنا کر بھیجا۔

آپ کو حکم ہوا کہ تمام انسانوں کو خطاب کر کے یہ اعلان فرما دیں۔

﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ (اعراف۔۲۰)

اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں۔

اس سے زیادہ یہ ہے کہ تمام کائنات آپ کی دعوت وتبلیغ کے دائرہ میں داخل ہے فرمایا۔

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (فرقان۔۱)

برکت والا ہے وہ خدا جس نے حق اور باطل میں امتیاز بتانے والی کتاب اپنے بندہ محمد پر نازل کی تاکہ وہ دنیا جہان

کے لئے ہوشیار و آگاہ کرنے والا ہو، وہ خدا جس کی ملکیت میں آسمانوں کی اور زمین کی سلطنت ہے۔

اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات ہے کہ اس تبلیغ و دعوت کی وسعت اور اس میں کامیابی کی خوشخبری بھی اس وقت دے دی گئی تھی جب مسلمانوں کے دلوں میں ایک قسم کی مایوسی چھائی ہوئی تھی چنانچہ آیت ذیل نازل ہوئی۔

﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَo وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ﴾ (ص-۵)

یہ قرآن تو دنیا کے لئے نصیحت ہے اور تم ایک زمانہ کے بعد اس کی خبر جانو گے۔

انبیاء اور بانیان مذاہب کے عملی نمونوں اور مثالوں کی تلاش اور جستجو کرو تو یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جائے گی کہ اسلام کے سوا اور جو مذہب تبلیغی سمجھے جاتے ہیں، وہ حقیقت میں تبلیغی نہیں خود بودھ نے ہندوؤں کے علاوہ کسی کو اپنی نجات کا راستہ نہیں بتایا اور نہ اس کا حکم دیا، حضرت عیسیٰؑ نے اسرائیل کے علاوہ کسی دوسری قوم کو نہ اپنا وعظ سنایا اور نہ ان کو اپنا مخاطب بنایا اور نہ ان میں سے کسی کو اپنا شاگرد کیا نہ کسی دوسری قوم میں اپنی زندگی میں اپنا واعظ اور مبلغ بھیجا حالانکہ فلسطین میں رومیوں اور یونانیوں کی بڑی جماعت موجود تھی۔

آنحضرت ﷺ نے مکہ میں رہ کر مکہ اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو بیدار و ہشیار کیا، حج کے موسم میں عرب کے ایک ایک قبیلہ کو جا کر حق کا پیغام پہنچایا اور اسی زمانہ میں یمن اور حبشہ تک آپ کی آواز پہنچ گئی اور لوگ تلاش حق کے لئے آپ کے پاس مدینہ منورہ آئے تو قریش گو برسوں تک دوسرے قبیلوں تک اسلام کے پہنچنے میں سدراہ بنے رہے پھر بھی مبلغ اور داعی بھیج بھیج کر قبیلوں تک آواز پہنچائی اور بالآخر قریش کے خلاف اس لئے تلوار اٹھائی گئی کہ اسلام کو تبلیغ کی پرامن آزادی ملے، چھ برس کے جنگ و جدل کے بعد حدیبیہ میں قریش نے اسلام کے اس مطالبہ کو تسلیم کیا اور تبلیغ کی آزادی عطا کی، قرآن نے اسلام کی اس روحانی فتح کو "فتح مبین" قرار دیا اور ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴾[1] نازل ہوئی، اس کے بعد ہی عرب اور بیرون عرب میں اسلام کے واعظ قاصد اور مبلغ بھیجے گئے اور دنیا کے امراء اور سلاطین کو دعوت اسلام کے خطوط لکھے گئے اور عربوں کے علاوہ دیلم، ایران اور حبش اور روم کے طالبین اسلام آئے اور فیضان حق سے سیراب ہوئے مشرکین عرب، یہود اور عیسائی اور پارسی سب نے آپ کے زمانہ ہی میں آپ کے نور سے روشنی حاصل کی۔

لیکن نفس تبلیغ کی فرضیت و اہمیت سے بھی زیادہ اہم چیز تبلیغ کے اصول ہیں۔

تبلیغ کے اصول:

یہ نکتہ کہ کس طرح لوگوں کو کسی سچائی کے قبول کی دعوت دینی چاہئے، دنیا میں پہلی دفعہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا۔ وہ مذہب بھی جو تبلیغی ہونے کے دعوے رکھتے ہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لئے تبلیغ کے اہم اصول کی تشریح کی ہے لیکن صحیفۂ محمدی نے نہایت اختصار لیکن پوری تشریح کے ساتھ اپنے پیروؤں کو یہ بتایا ہے کہ پیغام الٰہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کو قبول حق کی دعوت کس طرح دی جائے۔

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ (نحل-۱۶)

اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو دانائی اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور ان سے مناظرہ خوش آئند طریق

---

[1] صحیح مسلم باب صلح الحدیبیہ۔

سے کر۔

تبلیغ و دعوت کے یہ تین اصول مسلمانوں کو سکھائے گئے عقل و حکمت، موعظہ حسنہ اور مناظرہ بطریق احسن۔ مسلمان متکلموں نے بیان کیا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے یہ تینوں اصول وہی ہیں جو منطقی استدلال میں عموماً کام میں لائے جاتے ہیں یعنی ایک تو برہانیات جن میں یقینی مقدمات کے ذریعہ سے دعویٰ کے ثبوت پر دلیلیں لائی جاتی ہیں، دوسرے خطابیات ہیں جن میں موثر اور دلپذیر اقوال سے مقصود کو ثابت کیا جاتا ہے اور تیسرے جدلیات جن میں مقبول عام اقوال اور فریقین میں مسلم مقدمات سے استدلال کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک نے پہلے طریقہ کو ''حکمت'' اور دوسرے کو ''موعظت حسنہ'' اور تیسرے کو ''جدال'' سے تعبیر کیا ہے اور استدال کے یہی وہ تین طریقے ہیں جن سے ایک شخص دوسرے کے سامنے اپنے مدعا کو ثابت کرتا ہے۔

خیر یہ تو فلسفیانہ نکتہ آفرینی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی کے سامنے کوئی نئی بات پیش کرتے ہیں اور اس کو قبول کی دعوت دیتے ہیں تو عموماً تین طریقے برتتے ہیں۔ یا تو اس بات کے ثبوت اور تائید میں کچھ دلنشین دلیلیں پیش کرتے ہیں یا اس کو مخلصانہ نصیحت کرتے ہیں اور موثر انداز سے اس کو نیک و بد اور نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہیں یا یہ کرتے ہیں کہ اس کی دلیلوں کو مناسب طریقہ سے رد کر کے اس کی غلطی کو اس پر واضح کرتے ہیں، پہلے طریقہ کا نام حکمت اور دوسرے کا نام موعظہ حسنہ اور تیسرے کا نام جدال بطریق احسن ہے تبلیغ و دعوت کے یہی تین طریقے اسلام نے بتائے ہیں۔

قولِ لین:

حکیمانہ استدلال ہو یا وعظ و نصیحت ہو یا جدال و مناظرہ ہو، ضرورت یہ ہے کہ داعی نرمی اور خیر خواہی سے باتیں کرے کہ سختی اور شدت کا طریق دوسرے کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا کرتا ہے کیسی ہی اچھی اور سچی بات ہو لیکن اس قسم کے جذبات اس کے قبول کی استعداد اس سے سلب کر لیتے اور سننے والے میں اپنی غلطی پر ضد اور ہٹ پیدا کر دیتے ہیں جس سے دعوت کا فائدہ اور نصیحت کا اثر باطل ہو جاتا ہے، اسی لئے قرآن پاک نے اپنے پیغمبروں کو اپنے مخالف سے مخالف دشمن کو بھی نرمی ہی سے باتیں کرنے کی تاکید کی ہے، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو فرعون جیسے سرکش کے سامنے پیغام ربانی لے کر جانے کی ہدایت ہوتی ہے تو ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے۔

﴿ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ، فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴾ (طہٰ)

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی کی ہے تم اس سے نرم گفتگو کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے یا خدا سے ڈرے۔

دعوت و تبلیغ میں رفق و نرمی اور لطف و تحمل کی تعلیم کی اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی کہ نہ کوئی داعی اور واعظ پیغمبروں سے بہتر ہو سکتا ہے اور نہ فرعون سے بڑھ کر کوئی مجرم ہو سکتا ہے پھر ایسے مجرم کے سامنے اس لطف و نرمی سے وعظ و نصیحت کی تعلیم جب پیغمبروں کو ہوتی ہے تو عام داعی و مبلغوں اور واعظوں کو عام مخالفوں مجرموں اور سرکشوں کے ساتھ بدرجہا زیادہ رفق و ملاطفت سے اپنا فرض ادا کرنا چاہئے۔

اعراض اور قول بلیغ:

آنحضرت ﷺ کو ان منافقوں کے بارہ میں جو آپ کی نافرمانی کے جرم کے مرتکب ہوئے تھے یہ حکم ہوتا ہے

﴿ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِیْ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا ۢ بَلِیْغًا ﴾ (نساء)

تو ان سے درگذر کر اور ان کو نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کہہ جو ان کے دلوں میں اثر کرے۔

اس تعلیم میں تین ہدایتیں ہیں: اول یہ کہ دعوت و تبلیغ میں مخالفت کی بدسلیقگی، بدتہذیبی اور درشتی سے ان کو درگذر اور ان کو برداشت کرنا چاہئے دوسرے یہ کہ ان کو نصیحت کرنا اور سمجھانا چاہئے اور تیسرے یہ کہ گفتگو کا وہ موثر طرز و انداز اختیار کرنا چاہئے جو دل میں گھر کرے۔

تیسیر و تبشیر:

انہیں ربانی ہدایتوں کی تعلیم میں جب آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ کو یمن میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لئے متعین فرمایا تو رخصت کرتے وقت یہ نصیحت فرمائی ﴿ یسروا و لا تعسروا و بشروا و لا تنفروا ﴾[1] دین الٰہی کو آسان کر کے پیش کرنا سخت بنا کر نہیں، لوگوں کو خوشخبری سنانا نفرت نہ دلانا، یہ وہ تبلیغی اصول ہیں جو ایک داعی و مبلغ کی کامیابی کی جان ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کے سامنے اور صحابہ نے عام مسلمانوں کے سامنے اسی اصول کے مطابق دین الٰہی پیش کیا اور کامیابی حاصل کی۔ دین کی جائز آسانی اور سہولت کو پیش کرنا اور اس کو سخت، درشت اور مشکل نہ بنانا ہی اس کے قبول عام کی راہ ہے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے لطف و شفقت رحم و کرم اور مہر و محبت کی دلنواز صداؤں سے دلوں کو پرامید اور مسرور بنانا اس سے بہتر ہے کہ بات بات پر خدا کی قہاری و جباری اور ہیبت و جلال کا ذکر کر کے دلوں کو خوف زدہ اور مایوس بنایا جائے۔

تدریج:

تبلیغ کا ایک اور اصول آنحضرت ﷺ نے یہ تعلیم فرمایا کہ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ ایک دفعہ اس کی گردن پر نہ ڈالا جائے بلکہ رفتہ رفتہ وہ اس کے سامنے پیش کئے جائیں پہلے توحید اور رسالت کو پیش کرنا چاہئے اس کے بعد عبادات کو، عبادات میں بھی اہم پھر اہم کے اصول کو پیش نظر رکھنا چاہئے، عبادات میں سب سے اہم نماز ہے، پھر زکوٰۃ ہے، پھر دوسرے فرائض ہیں، حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجتے وقت آپ نے فرمایا ''تم یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک قوم کے پاس جاؤ گے تو ان کو پہلے اس کی دعوت دینا کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمد اس کا رسول ہے جب وہ یہ مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں اور جب وہ یہ بھی مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے، یہ صدقہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دیا جائے، جب وہ اس کو تسلیم کر لیں تو دیکھو صدقہ میں چن چن کر ان کے بہترین مال کو نہ لینا اور ہاں مظلوم کی

---

[1] صحیح بخاری بعث معاذ الی الیمن جلد دوم صفحہ ۶۲۲۔

بددعا سے ڈرتے رہنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔[۱]

تالیف قلب:

تبلیغ ودعوت کے سلسلہ میں اسلام نے ایک اور طریقہ بھی پیش کیا ہے جس کو تالیف قلب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ﴿وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ﴾ (توبہ۔۱۸) اس کے لفظی معنی ہیں ”دلوں کو ملانا“ اور اس سے مقصود اس شخص کے ساتھ جس کو اسلام کی طرف مائل کرنا ہو لطف ومحبت اور امداد واعانت اور غم خواری وہمدردی کرنا ہے کیونکہ انسان طبعاً شریفانہ جذبات کا ممنون ہوتا ہے یہ ممنونیت عناد اور ضد کے خیالات کو دور کر کے قبول حق کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بہت سے لوگوں کو اپنے اس اعجاز سے اسلام کا حلقہ بگوش بنالیا تھا، چنانچہ مکہ کے بعض رئیس اسی جذبہ سے متاثر ہو کر اسلام لائے تھے‘ آنحضرت ﷺ نے حنین کی غنیمت کا سارا مال انہیں کو تقسیم کر دیا تھا نتیجہ یہ نکلا کر پھر حق کے خلاف ان کی گردنیں نہ اٹھ سکیں۔ صفوانؓ جو اسلام کے سخت مخالف اور آنحضرت ﷺ سے نہایت بغض رکھتے تھے وہ کہتے ہیں کہ ”مجھ کو آنحضرت ﷺ نے دیا‘ جتنا دیا‘ اور مجھے ان سے سخت بغض تھا لیکن آپ کے ان احسانات نے مجھے ایسا متاثر کیا کہ اب میری نگاہ میں ان سے زیادہ کوئی پیارا نہیں“ [۲] ایک دفعہ ایک بدو نے آکر کہا کہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان بکریوں کے جتنے ریوڑ ہیں وہ مجھ کو عنایت کیجئے آپ نے وہ سب اس کو دے دیئے یہ فیاضی دیکھ کر اس پر اتنا اثر پڑا کہ اس نے اپنے پورے قبیلہ کو آکر کہا ”بھائیو! اسلام قبول کرو کہ محمد اتنا دیتے ہیں کہ ان کو اپنے فقر وافلاس کا ڈر ہی نہیں رہتا۔“ [۳]

ایک یہودی لڑکا آنحضرت ﷺ کی خدمت کرتا تھا وہ بیمار پڑا تو آنحضرت ﷺ اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے اور جا کر اس کے سرہانے بیٹھے‘ پھر فرمایا کہ لڑکے اسلام قبول کر لے۔ اس نے مستفسرانہ نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا اس نے کہا ابوالقاسم (آپؐ کی کنیت) کی بات مان لے، چنانچہ وہ مسلمان ہوگیا اور جب آنحضرت ﷺ وہاں سے اٹھے تو زبان مبارک پر یہ فقرہ تھا کہ اس خدا کی حمد جس نے اس کو دوزخ سے بچالیا۔ [۴]

دعوت عقل:

اسلام نے تبلیغ ودعوت کے جو اصول بتائے ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ ایک استدلالی اور عقلی مذہب ہو کہ بغیر اس کے حکمت ودانشمندی‘ وعظ ونصیحت اور جدال ومناظرہ کی بنیاد قائم نہیں رہ سکتی‘ اس بناء پر مذاہب عالم کی تاریخ میں نبوت محمدیہ سب سے پہلی ربانی آواز ہے جس نے حاکمانہ قانون (توراۃ) یا صرف لفظوں کے الٹ پھیر (انجیل) یا راجاؤں کے احکام (وید) کے بجائے عقل انسانی کو مخاطب کیا غور وفکر کی دعوت دی فہم وتدبر کا مطالبہ کیا اس نے اپنی ہر تعلیم کی خوبی مصلحت اور حکمت خود ظاہر کی اور بار بار مخالفوں کو آیات الٰہی میں غور وفکر کی ہدایت کی۔ فرمایا

---

[۱] صحیح بخاری باب مذکور جلد دوم صفحہ ۱۶۳۔

[۲] صحیح مسلم جلد دوم صفحہ ۲۹۰ مصر۔

[۳] ایضاً۔

[۴] صحیح بخاری کتاب الجنائز۔

﴿ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ط اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ o قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ﴾ (انعام۔۸)

کہہ اے پیغمبر کہ تمہارے پاس کوئی (یقینی) علم ہے کہ اس کو تم ہمارے لئے ظاہر کرو، تم گمان ہی کے پیچھے چلتے ہو اور تم تو اٹکل ہی کرتے ہو کہہ کہ اللہ ہی کی ہے پہنچتی ہوئی دلیل۔

نیز ارشاد ہوا

﴿ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ط وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ (انفال۔۵)

تا کہ جو ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جو جیتا رہے وہ دلیل سے جئے اور اللہ ہی سننے والا جاننے والا

غفلت شعار کافروں کی نسبت فرمایا۔

﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴾ (یوسف۔۱۲)

اور آسمانوں میں اور زمین میں خدا کی توحید کی کتنی نشانیاں (دلیلیں) ہیں جن پر وہ گذر جاتے ہیں اور ان پر غور نہیں کرتے۔

غور و فکر کرنے والے اہل ایمان کی تعریف میں فرمایا

﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ o الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ﴾ (آل عمران۔۲۰)

بے شبہ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں، جو اللہ کو کھڑے بیٹھے اپنی کروٹوں پر یاد کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں غور کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار تو نے یہ عالم بیکار نہیں بنایا۔

اس سے زیادہ عقلی اور علمی استدلال کی دعوت اور کیا ہوگی مگر بہر حال یہ خارجی استدلال تھا اندرونی استدلال کی بھی اس نے دعوت دی، فرمایا

﴿ وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ (ذاریات)

اور خود تمہارے اندر نشانیاں ہیں تم دیکھتے نہیں۔

صحیفہ محمدی کی نسبت ہر جگہ یہ الفاظ فرمائے

﴿ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ﴾ (ق۔۱)

یہ بصیرت اور نصیحت ہے ہر رجوع ہونے والے بندہ کے لئے۔

﴿ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ﴾ (اعراف۔۲۴)

یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے بصیرتیں ہیں۔

﴿ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ ﴾ (جاثیہ۔۲)

یہ لوگوں کے لئے بصیرتیں ہیں۔

﴿ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ﴾ (نساء۔۱۱)

کیا یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔

﴿ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴾ (محمد۔۳)

کیا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر ان کے تالے ہیں۔

﴿ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ﴾ (یٰسین۔۱)

حکمت والے قرآن کی قسم۔

﴿ تِلْكَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْحَکِیْمِ ﴾ (یونس ولقمان)

یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔

نہ صرف اسی قدر بلکہ خدا کا وجود، توحید، رسالت، قیامت، جزا، سزا، عبادت، نماز، روزہ، زکوۃ، حج، اخلاق وغیرہ ہر تعلیم کی تلقین کرتے وقت اس نے اس کی صداقت کی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں اور ہر مسئلہ کی مصلحتیں اور حکمتیں علی الاعلان ظاہر کی ہیں آئندہ صفحوں میں ہر قدم پر اس کی دلیلیں آپ کو ملیں گی۔

مذہب میں زبردستی نہیں:

یہ وہ حقیقت ہے جس کی صدا آج ہر در و دیوار سے آتی ہے لیکن شاید لوگوں کو معلوم نہیں کہ دنیا میں اس حقیقت کا اعلان سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی زبان مبارک سے ہوا، اور ظاہر ہے کہ جو مذہب اپنی اشاعت کے لئے صرف دعوت و تبلیغ کا راستہ رکھتا ہو جس نے اس کے اصول بتائے ہوں جس نے عقل و بصیرت اور فہم و تدبر کے ہر معاملہ میں لوگوں سے مطالبہ کیا ہو ہر قدم پر عقلی استدلال اور مصلحت و حکمت کا اظہار کیا ہو وہ کیونکر جبر و اکراہ اور زور و زبردستی کے طریقہ کو اختیار کر سکتا تھا، اسلام نے نہ صرف یہ کہ مذہب کی جبری اشاعت کو ناپسند کیا بلکہ اس کا فلسفہ بتایا کہ مذہب زبردستی کی چیز کہ اسلام میں مذہب کا اولین جز ایمان ہے ایمان یقین کا نام ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ایک ذرہ بھی بزور پیدا نہیں کر سکتی بلکہ تیز سے تیز تلوار کی نوک بھی کسی لوح دل پر یقین کا کوئی حرف نقش نہیں کر سکتی۔

﴿ لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ﴾ (بقرہ۔۳۴)

دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی۔

یہ وہ عظیم الشان حقیقت ہے جس کی تلقین انسانوں کو صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے ہوئی دوسری جگہ فرمایا،

﴿ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ ﴾ (کہف)

اور کہہ دے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے، تو جو چاہے قبول کرے اور جو چاہے انکار کرے۔

ایمان اور کفران دو میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر کوئی زبردستی نہیں ہے عقل و بصیرت والے اسے خود قبول کریں گے اور نافہم اس سے محروم رہیں گے اس لئے بار بار یہ واضح کیا گیا کہ رسول کا کام لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچا دینا

ہے زبردستی منوانا نہیں۔

﴿ اِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴾ (مائدہ)

ہمارے رسول پر تو یہی فرض ہے کہ وہ صاف صاف ہمارا پیغام پہنچا دے۔

آنحضرت ﷺ کو جو قریش کے اعراض و مخالفت سے حد درجہ غمگین تھے تسکین دی گئی۔

﴿ اِنْ عَلَیْكَ اِلَّا الْبَلَاغُ ﴾ (شوریٰ)

اے پیغمبر تیرا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔

﴿ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ o لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ ﴾ (غاشیہ)

اے پیغمبر تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے، تو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔

﴿ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا ط اِنْ عَلَیْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ﴾ (شوریٰ)

ہم نے تجھ کو ان پر گماشتہ بنا کر نہیں بھیجا، تیرے ذمہ صرف پیغام کا پہنچا دینا ہے۔

کسی دین کو زبردستی پھیلانا اسلام کی نگاہ میں ایک ایسا فعل ہے جس سے رسول کی شان کو اس نے بہت بلند سمجھا ہے فرمایا

﴿ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ط اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴾ (یونس)

اور اگر تیرا پروردگار چاہتا کہ لوگوں کو زبردستی مومن بنا دے تو زمین کے سب لوگ ایمان لے آتے، تو کیا اے پیغمبر تو لوگوں پر زبردستی کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں۔

اسلام میں حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لئے لڑنا جائز ہے، اور آنحضرت ﷺ کو بھی مجبور لڑنا پڑا اس سے مخالفوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ لڑائی صرف اس لئے تھی کہ اسلام کو تلوار کے زور سے لوگوں میں پھیلایا جائے، حالانکہ قرآن میں ایک بھی آیت ایسی نہیں جس میں کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم ہو، اور نہ آنحضرت ﷺ کی سیرت میں کوئی واقعہ ایسا ہے جس میں کسی کافر کو زبردستی تلوار کے زور سے مسلمان بنایا گیا ہو بلکہ اگر ہے تو یہ ہے۔

﴿ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰی یَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْلَمُوْنَ ﴾ (توبہ)

اور اگر لڑائی میں کوئی مشرک تجھ سے پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اس کو وہاں پہنچا دے جہاں وہ بے خوف ہو کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔

یہ نہیں کہا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے اس کو پناہ نہ دو بلکہ یہ فرمایا کہ اس کو پناہ دے کر اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے، اور اسکو کلامِ الٰہی سنایا جائے، تا کہ اس کو غور و فکر کرنے کا موقع ملے، ظاہر ہے کہ جو مشرک اس طرح مسلمان ہو گا اس کے تبدیل مذہب کا محرک تلوار کے بجائے کوئی اور چیز (پیامِ حق) ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی مشروعیت مظلوموں کی حمایت، جلاوطنوں کے حق دلانے، حج کا راستہ کھولنے اور عقیدہ

کی آزادی حاصل کرنے کے لئے تھی جیسا کہ اس کا مفصل بیان کتاب میں کہیں آئے گا قرآن کی اس آیت میں۔

﴿ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (انفال)

اور ان کافروں سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین پورا اللہ کے لئے ہو جائے۔

’’فتنہ‘‘ سے مراد عقیدہ اور مذہب کی آزادی نہ ہونا ہے‘ حضرت ابن عمرؓ صحابہ کی خانہ جنگیوں میں شریک نہ تھے ایک شخص نے آ کر ان سے کہا کہ خدا نے فتنہ کے مٹانے کے لئے لڑنے کا حکم نہیں دیا؟ اور اوپر کی آیت پیش کی انہوں نے جواب دیا کہ ہم یہ فرض آنحضرت کے زمانہ میں ادا کر چکے ہیں جب مسلمان کم تھے تو انسان اپنے دین کے سبب سے فتنہ میں مبتلا کیا جاتا تھا‘ یا اس کو لوگ مار ڈالتے تھے یا قید کر لیتے تھے یہاں تک کہ مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو پھر فتنہ باقی نہ رہا۔ [1]

میدان جنگ میں تبلیغ:

ناواقفوں نے ایک اور مسئلہ کی غلط تعبیر کی ہے اسلام کی امن پسندی نے یہ قانون بنایا ہے کہ اگر کسی مخالف قوم سے لڑائی آ پڑے تو میدان جنگ میں پہنچ کر بھی صلح و آشتی کا خیال دور نہ کیا جائے بلکہ تلوار کے فیصلہ سے پہلے دو باتیں ان کے سامنے پیش کرنی چاہئیں‘ اوّل یہ کہ تم بھی کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاؤ اور لڑائی سے ہاتھ اٹھا کر ہمارے بھائی بن جاؤ اگر ایسا کرو تو تم دین‘ حکومت اور عزت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو جاؤ گے‘ اگر یہ منظور نہ ہو تو اپنے مذہب پر قائم رہ کر ہماری سیاسی حکومت کو قبول کر لو، اس حالت میں تمہاری حفاظت کی ہر قسم کی ذمہ داری ہمارے سر ہوگی اگر وہ ان دو میں سے کسی بات کو قبول کر لیں تو ان سے لڑنا جائز نہیں‘ اسلام کی تاریخ میں ایسے کتنے منظر ہیں کہ کسی دشمن سے دشمن قوم نے اسلام یا محض اطاعت قبول کر لی ہے اور خونریزی رک گئی اور لڑائی کا میدان محبت و آشتی کی بزم بن گئی ہے۔

یہ قانون جو سرتا پا امن پسندی، سلامت طلبی اور خونریزی سے بچنے کی آخری کوشش پر مبنی ہے اس کو مخالفوں نے اس صورت میں پیش کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی تعلیم دی‘ آنحضرت ﷺ کا دستور تھا کہ جب آپ کسی فوج کو متعین کرتے تو اس کے سردار کو یہ ہدایت فرماتے۔

> ’’جب تو مشرکوں میں سے کسی دشمن قوم سے مقابل ہو تو اس کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دے ان میں سے جو بات بھی وہ مان لے اس کو قبول کر لے اور اس پر حملہ کرنے سے رک جا اس کو اسلام کی دعوت دے اگر وہ قبول کر لے تو پھر اس سے رک جا اس کے بعد اس سے خواہش کر کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں آ جائے تو اس کا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کا ہے اگر وہ نہ مانے تو اس کی حالت بدو مسلمانوں کی سی ہوگی قانون اس پر مسلمانوں کا جاری ہوگا لیکن غنیمت اور فئی میں اس کا حصہ نہ ہوگا جب تک وہ جہاد میں شرکت نہ کرے‘ اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو اس کو جزیہ دے کر ذمی بننے کو کہہ‘ اگر وہ اس کو مان لے تو اس سے بھی رک جاؤ، اگر وہ اس کو بھی نہ مانے تو پھر خدا کی مدد مانگ اور لڑائی شروع کر دے۔‘‘ [2]

---

[1] صحیح بخاری تفسیر انفال جلد دوم صفحہ ۶۷۰۔

[2] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر۔

یہ وہ اصول جنگ تھے جس سے خونریزی کی روک تھام مقصود تھی نہ یہ کہ کسی مجبور کو بزور شمشیر مسلمان بنا لینا صحابہ کرامؓ کے زمانہ میں ایرانیوں سے جب لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے تین روز تک میدان جنگ میں تلوار نہیں اٹھائی' حضرت سلمان فارسیؓ تین روز تک ان کو سمجھاتے رہے اور کہتے رہے کہ "میں تمہاری قوم سے ہوں لیکن دیکھتے ہو کہ عرب میرے زیر فرمان ہیں اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو تم کو بھی وہی حقوق ملیں گے جو ہمارے ہیں اور اگر تم اپنے مذہب ہی پر رہنا چاہو تو جزیہ دے کر رہ سکتے ہو لیکن محکوم ہو کر رہو گے"[1] اس سے معلوم ہوا کہ جنگ میں دشمن کو بھی تبدیل مذہب پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ اس کے سامنے دوسری راہیں بھی کھلی تھیں۔

ثمامہؓ بن اثال قبیلہ بنی حنیفہ میں سے تھے اور یمامہ کے رئیس تھے یہ وہ قبیلہ ہے جو آخر تک سرکش رہا اور اسی میں آنحضرت ﷺ کے آخر زمانہ میں مسیلمہ پیدا ہوا تھا ثمامہ اتفاق سے مسلمانوں کے ایک لشکر کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے اور مدینہ لا کر مسجد نبوی کے کھمبے میں باندھ دیئے گئے آنحضرت ﷺ نماز کے لئے تشریف لائے تو پوچھا کہ ثمامہ تمہاری کیا رائے ہے؟ جواب دیا محمد میری رائے اچھی ہے اگر مجھے قتل کرو گے تو ایک خون والے کو قتل کرو گے اور اگر احسان کرو گے تو ایک شکر گذار پر احسان ہوگا اور اگر زر فدیہ چاہتے ہو تو مانگو جو مانگو گے دیا جائے گا" آنحضرت ﷺ نے کچھ نہیں فرمایا پھر اسی طرح دوسرے دن سوال و جواب ہوا پھر تیسرے دن، تیسرے دن آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "ثمامہ کو چھوڑ دو" لوگوں نے کھول دیا وہ رسی سے کھل کر آزاد ہو گئے مگر سچائی کی زنجیر ان کے پاؤں میں پڑ گئی' مسجد نبوی کے قریب ایک نخلستان میں جا کر خود بخود غسل کیا اور پھر مسجد میں آ کر کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گئے'[2] کیا کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کے لئے اس سے بہتر موقع ہو سکتا تھا بدر کے قیدی گرفتار ہو کر آئے لیکن انہیں یہ نہیں کہا گیا کہ تلوار یا اسلام۔ اسی طرح جنگ کے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ رہا قرآن پاک نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق کہا ﴿فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً﴾ (محمد) لڑائی ختم ہونے کے بعد ان قیدیوں کو احسان دھر کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو یہ ارشاد نہ ہوا کہ اسلام یا تلوار۔

غزوۂ خیبر میں مسلمان روزانہ بعض قلعوں پر حملہ کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں بالآخر شیر خدا علی مرتضیٰ کو حکم ہوتا ہے کہ فوج لے کر جاؤ وہ پوچھتے ہیں یا رسول اللہ کیا میں ان سے لڑوں یہاں تک کہ وہ ہماری طرح ہو جائیں فرمایا؟ آہستگی سے روانہ ہو یہاں تک کہ ان کے میدان میں پہنچ جاؤ پھر ان کو اسلام کی طرف بلاؤ اور اس میں ان کا جو حق ہوگا وہ ان کو بتاؤ خدا کی قسم اگر ایک شخص کو بھی خدا تمہارے ذریعہ سے ہدایت دے دے تو اس سے بہتر ہے کہ تمہاری ملکیت میں سرخ اونٹ ہوں۔ [3] چنانچہ خیبر کے یہود نے اسلام کا مذہب قبول نہیں کیا لیکن اسلام کی حکومت قبول کر لی اور مصالحت ہو کر تلوار نیام میں کر لی گئی۔

اسی طرح کسی مسلمان کے لئے کسی دوسرے مسلمان پر ہتھیار اٹھانا جائز نہیں بلکہ کفر کا موجب ہے کفار کو مسلمانوں کا یہ طرز عمل معلوم تھا۔ اکثر لڑائیوں میں جب مشرک حملہ آور اپنی کمزوری محسوس کرتا تھا تو اپنی جان بچانے کے

---

[1] صحیح بخاری و سنن ترمذی ربط الاسیر۔

[2] صحیح بخاری غزوۂ خیبر۔

[3] صحیح مسلم کتاب الایمان۔

لئے کلمہ توحید پڑھ دیتا تھا اور ایک بپھرے ہوئے مسلمان کو مجبوراً اپنے غصہ کو ضبط کر کے ہاتھ روک لینا پڑتا تھا۔

ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ اگر لڑائی میں میرا حریف اپنی تلوار سے میرا ہاتھ اڑا دے اور جب میرے حملہ کی باری آئے تو درخت کی آڑ پکڑ کر کہے ’’میں مسلمان ہوتا ہوں‘‘ تو اے خدا کے رسول میں کیا کروں، اس کو قتل کر دوں؟ فرمایا نہیں اس کا قتل جائز نہیں، عرض کی یا رسول اللہ میرا ہاتھ اس نے کاٹ دیا پھر بھی اس کا قتل جائز نہیں کہ اگر تم نے اب اس کو قتل کیا تو وہ ہو گیا جو تم اس کے قتل سے پہلے تھے اور تم وہ ہو جاؤ گے جو وہ اس اقرار توحید سے پہلے تھا[1]

حضرت اسامہ بن زیدؓ آپ کے بڑے چہیتے خادم تھے وہ ایک فوجی دستہ کے سپہ سالار بنا کر ایک لڑائی میں بھیجے گئے جب گھمسان کا رن پڑا تو ایک کافر ان کی زد میں آیا، انہوں نے حملہ کا قصد کیا تو وہ لا الہ اِلاَّ اللہ پکار اٹھا‘ ایک انصاری جو پہلے اس پر جھپٹے تھے وہ تو رک گئے مگر اسامہؓ نے اس کافر کے اس کلمہ پڑھنے کو اس کی جان بچانے کے فریب پر محمول کر کے اس کا کچھ خیال نہ کیا اور نیزہ سے اس کا کام تمام کر دیا‘ آنحضرت ﷺ کو یہ خبر ہوئی تو اسامہ سے سخت آزردہ ہوئے، اسامہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ اس نے صرف تلوار کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا فرمایا اور کتنا بلیغ فقرہ فرمایا ’’اے اسامہ تم نے کیا اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا‘‘ پھر برابر یہ فرماتے رہے اے اسامہ تم قیامت میں اس کے لا الہ اِلاَّ اللہ کا کیا جواب دو گے‘ اسامہ کہتے ہیں کہ مجھ کو اتنی ندامت ہوئی کہ میں نے دل میں آرزو کی کہ کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا۔

دیکھو کہ واقعہ کی تصویر کتنی الٹ دی گئی ہے واقعہ تو یہ تھا کہ اپنی حملہ آورانہ لڑائی کے گھمسان میں بعض کفار و مشرکین جن کو یہ معلوم تھا کہ کسی کلمہ گو کو مسلمان اپنے مذہب کے حکم کے بموجب قتل نہیں کرتے وہ جب مسلمانوں کی زد میں پڑتے تھے تو اپنی جان بچانے کے لئے فوراً کلمہ شہادت پڑھ دیتے تھے۔ اور بیان اس صورت میں کیا جاتا ہے کہ اسلام نے کفار کو تلوار کی نوک سے کلمہ پڑھنے پر مجبور کیا۔ کیا یہ صداقت ہے؟

اسی طرح آنحضرت ﷺ کا ایک اور اعلان ہے جس کو اکثر غلط معنی میں پیش کیا گیا ہے آپ نے فرمایا ﴿ امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللّٰہ ﴾ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑائی کروں جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کریں جب وہ اقرار کر لیں تو انہوں نے اپنے جان و مال کو مجھ سے بچا لیا اور ان کی نیت کی پرسش خدا کا کام ہے‘ اس حدیث کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ مسلمان سے لڑنا جائز نہیں لیکن کسی غیر مسلم قوم سے بھی لڑنا اسی وقت جائز ہے جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کرے اور جب اس نے یہ کر لیا تو پھر اس سے بھی لڑنا روا نہیں خواہ وہ حملہ کے ڈر سے لا الہ الا اللہ پڑھے یا سچے دل سے اس نے یہ اقرار کیا ہو اس کی تحقیق کہ کس نیت سے اس نے کلمہ پڑھا انسان کا فرض نہیں، خدا کا ہے، یہ بالکل ایک مصالحانہ اعلان ہے لیکن لوگ اس کو اس معنی میں پیش کرتے ہیں کہ گویا اسلام کا حکم یہ تھا کہ مسلمان دیوانہ وار تلوار لئے پھرتے اور جس کو پاتے اس کو ڈرا دھمکا کر کہتے کہ کلمہ پڑھو ورنہ سر قلم کر دیں گے‘ غور کرو اگر یہ حکم ہوتا تو قیدی اقرار توحید کئے بغیر اس آسانی سے چھوڑے جاتے اور ہاری ہوئی قوموں سے اسلام نہیں‘ صرف چند درہم کا جزیہ لے کر ان کو آزاد کر دیا جاتا؟ اور کیا مسلمانوں کو یہ اجازت ملتی کہ

﴿ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا ﴾ (انفال)

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان صفحہ ۵۲۔ مصر۔

اگر کفار کا محارب فریق صلح کے لئے جھکے تو تو بھی جھک جا۔

بلکہ اس کے بجائے یہ حکم ہوتا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں ان سے صلح نہ کرنا اور نیز کیا مسلمانوں کو یہ حکم ہو سکتا تھا کہ

﴿ وَاِنۡ اَحَدٌ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ اسۡتَجَارَكَ فَاَجِرۡهُ حَتّٰى يَسۡمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبۡلِغۡهُ مَاۡمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ ﴾ (توبہ)

اور اگر لڑائی کے میدان میں مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دے یہ اس لئے کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔

بلکہ یہ ہوتا کہ پناہ ملنے اور کلام الٰہی سننے کے بعد وہ مسلمان نہ ہو تو اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچانے کے بجائے اس کو قتل کر کے جہنم میں پہنچا دو مگر ایسا نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی امن پسندی اور رواداری کے مفہوم کو کس طرح الٹ کر بیان کیا جاتا ہے حالانکہ اسلام نے ان مشرکوں سے بھی جو ہمارے کسی دوست مشرک قبیلہ کے دوست ہوں اور ہم سے صلح و آشتی سے رہنا چاہتے ہوں لڑنے کو منع کیا ہے۔

﴿ فَاِنِ اعۡتَزَلُوۡكُمۡ فَلَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ وَاَلۡقَوۡا اِلَيۡكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمۡ عَلَيۡهِمۡ سَبِيۡلًا ﴾ (نساء)

تو اگر وہ تم سے کنارہ پکڑیں پھر نہ لڑیں اور تمہارے سامنے صلح کی طرح ڈالیں تو اللہ نے تم کو ان پر حملہ کرنے کی راہ نہیں دی۔

یعنی پھر ان پر تلوار اٹھانا درست نہیں، حالانکہ اگر اسلام کی مذہبی جنگجوئی کے وہی معنی ہوتے کہ ”یا تلوار یا اسلام“ تو کیا اس امن پسندی اس صلح جوئی اور اس ترک جنگ کی صورت ممکن ہو سکتی تھی؟

مسلح تبلیغی جماعتیں:

غلط فہمی پھیلانے کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کے لئے جو جماعتیں ملک میں بھیجی جاتی تھیں وہ مسلح ہوتی تھیں لیکن یہ حقیقت بھلا دی جاتی ہے کہ یہ عرب کا واقعہ ہے جہاں کوئی منظم اور باضابطہ حکومت نہ تھی جس پر تمام رعایا کی حفاظت کی ذمہ داری ہو، ایک ایک وادی میں ایک ایک قبیلہ اپنی اپنی الگ ریاست قائم کئے ہوئے تھا اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے برسر پیکار تھا راستوں پر رہزنوں اور ڈاکوؤں کا قبضہ تھا جن سے اکا دکا آدمی کا صحیح و سالم بچنا ناممکن تھا اس لئے جب کہیں کوئی تبلیغی مہم بھیجی جاتی تھی، تو بدامنی کے ملک میں رہنے والوں کے عام دستور کے مطابق وہ اپنی ممکن حفاظت کے لئے مسلح جاتی تھی اور اس بات کی دلیل کہ اس مسلح جماعت کی تبلیغ و دعوت کے سوا کوئی مقصد نہ تھا اس سے ظاہر ہے کہ ان کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی جو فوجی حملہ کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھی۔

غزوۂ بدر کے بعد جب قریش کا زور ٹوٹ گیا اور ملک میں اسلام بھی ایک قوت شمار ہونے لگا تو آنحضرت ﷺ نے بعض بعض قبیلوں کی درخواست پر مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو تبلیغ و تعلیم کے لئے ادھر ادھر بھیجا تب وہ بھی اکثر راستہ میں جان سے ماری گئیں واقعہ رجیع میں ستر داعیوں کا مارا جانا، واقعہ بئر معونہ میں چھ یا دس داعی مسلمانوں کا قتل ہونا، سریہ ابن ابی العوجاء میں پچاس مسلمانوں کی شہادت، واقعہ ذات اطلاح میں چودہ داعی مسلمانوں کا تیروں سے مارا جانا، عروہ

بن مسعود ثقفی کا تیروں سے چھد جانا اس دعویٰ کی شہادت ہے۔

تبلیغ و دعوت کی تنظیم:

آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں تشریف فرما رہے تھے، بنفس نفیس اس فرض کو انجام دیتے رہے ایک ایک کے پاس جاتے اور حق کا پیغام سناتے شہر سے نکل کر مکہ کے آس پاس آ جاتے تھے اور آنے جانے والوں کو بشارت سناتے مکہ سے نکل کر طائف گئے اور وہاں بھی اپنا فرض ادا کیا۔ یہ بھی خدا کی مصلحت تھی کہ اس نے اپنے آخری دین کا مرکز مکہ معظمہ کو قرار دیا جو عرب کا مرکزی شہر تھا اور حج کے موسم میں تمام قبیلے یہاں آ جاتے تھے، آپ سالہا سال حج کے موسم میں ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور خدا کی دعوت پیش کرتے، اسی سالانہ تبلیغ سے اسلام کو وہ جماعت ہاتھ آئی جس کا نام انصار ہے۔

الغرض ان تبلیغی سرگرمیوں سے مکہ میں سینکڑوں آدمی مسلمان ہو چکے تھے، مگر قریش کے ظلم سے وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور آنحضرت ﷺ کے مشورہ سے وہ حبشہ کی طرف روانہ ہوئے، اس سفر کی مصلحت عجیب و غریب تھی ان مظلوم مسلمانوں کی ہجرت نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ وہ اس مسافرت میں جہاں جہاں سے گذرے، اسلام کی آواز پہنچاتے گئے اور اس طرح یمن اور حبشہ دونوں ملکوں میں اسلام کی تحریک روشناس ہو گئی۔

مکہ میں آنحضرت ﷺ کے بعد عام مسلمانوں میں سب سے پہلے مبلغ اور داعی حق حضرت ابوبکرؓ تھے مکہ کے بہت سے معزز گھرانوں کے پرجوش نوجوان انہیں کی تبلیغ سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ حضرت ابوبکرؓ ہی کی کوششوں سے دائرہ اسلام میں آئے حضرت ابوبکرؓ کے بعد اسلام کے دوسرے مبلغ حضرت مصعب بن عمیرؓ تھے جن کے موثر وعظوں کو سن کر آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے ہی مدینہ کے گھرانے توحید کے پرستار ہو گئے تھے۔

مدینہ منورہ آ کر اسلام نے امن و اطمینان کی سانس لی تو آنحضرت ﷺ نے ان نومسلموں کو تعلیم کے لئے جو اطراف ملک سے دارالسلام میں آتے تھے نیز ملک کے مختلف گوشوں میں اسلام کی تبلیغ کے لئے ایک جماعت قائم کی جس کا نام عام طور سے اصحابِ صفہؓ (چبوترہ والے) مشہور ہے اس میں وقتاً فوقتاً سو سے زیادہ آدمی داخل رہے ہیں یہ لوگ ملک میں اسلام کی دعوت کے لئے بھیجے جاتے تھے اور خود نومسلموں کو تعلیم دیتے بیر معونہ میں ستر کے قریب جو داعی اور مبلغ راہ میں بیدردانہ قتل ہوئے وہ اسی جماعت کے ارکان تھے۔

ان کے علاوہ اکابر صحابہ جو وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں، بادشاہوں، قوموں اور قبیلوں میں اسلام کی دعوت لے کر پھیلے، احادیث و سیر کی کتابوں میں ان کے نام متفرق طور سے ملتے ہیں۔ میں نے تھوڑی سی کوشش سے اس قسم کے پینتیس صحابیوں کے نام جمع کئے ہیں جنہوں نے از خود آنحضرت ﷺ کے مشورہ سے اس فرض کو انجام دیا ان کے نام یہ ہیں ابوذر غفاری، طفیل بن عمرو دوسی، جعفر طیار، عمرو بن عبسہ سلمی، ضماد بن ثعلبہ، خالد بن ولید، علی بن ابی طالب، مہاجر بن ابی امیہ، زیاد بن لبید، خالد بن سعید، عدی بن حاتم، علاء بن حضرمی، ابوموسیٰ اشعری، معاذ بن جبل، جریر بن عبداللہ بجلی، دحیہ کلبی، عمرو بن امیہ ضمری، مغیرہ بن شعبہ، عمرو بن العاص، دبر بن نخیس، عروہ بن مسعود ثقفی، عامر بن شہر، منقذ بن حبان، ثمامہ بن آثال، محیصہ

بن مسعودؓ احنف ابوزید انصاری، عمرو بن مرہ، عیاش بن ربیع مخزومی، واثلہ بن اسقع، عبداللہ بن حذافہ سہمی، حاطب بن ابی بلتعہ، سلیط بن عمرو بن عبد شمس، شجاع بن وہب اسدی، انہیں مبلغوں اور داعیوں اور قاصدوں کی پکار تھی جس نے یمن، یمامہ، بحرین، حجاز، نجد غرض پورے عرب کو بیدار کر دیا اور عرب سے باہر ایران، شام، مصر، حبش ہر جگہ اسلام کا پیغام پہنچ گیا۔

مبلغوں کی تعلیم وتربیت:

سیرۃ کی دوسری جلد کے آغاز میں اشاعت اسلام کی تاریخ اور دعاۃ معلمین کی تعلیم وتربیت کا حال لکھا جا چکا ہے سلسلہ بیان کے لئے یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ ان کو سب سے پہلے قرآن پاک کی سورتیں یاد کرائی جاتی تھیں لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا آنحضرت ﷺ کے شب وروز کے ارشادات سننے کا موقع بھی ان کو ملتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تبلیغ کا درس اولین قرآن اور صرف قرآن تھا۔

دعوت بالقرآن:

قرآن پاک اسلام کے دعویٰ اور دلیل دونوں کا مجموعہ ہے اور وہی اس کے مذہب کا صحیفہ ہے خود آنحضرت ﷺ اور دوسرے مبلغ صحابہ بھی تبلیغ ودعوت میں صرف قرآن کی سورتیں پڑھ کر سناتے تھے، اور جہاں ان کو اس کا موقع مل جاتا وہاں اس کی تاثیر اپنا کام کر جاتی تھی، اور یہ فرض خود قرآن نے اپنا آپ قرار دیا تھا اس کی تبلیغ کے لئے جہاد کی ضرورت تھی مگر اس جہاد کا ہتھیار لوہے کی تلوار نہیں بلکہ قرآن کی تلوار تھی جس کی ضرب ڈھال اور سپر سے بھی ممکن نہ تھی اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اسی تلوار سے جہاد کا حکم دیا فرمایا۔

﴿ فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴾ (فرقان)

تو اے پیغمبر منکروں کا کہنا نہ مان اور اس قرآن سے ان کے ساتھ بڑے زور وشور سے جہاد کر۔

اس پیغام الٰہی کے زمین میں اترنے کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ خدا کے بھولے ہوئے بندوں کو ان کا عہد یاد دلائے۔ فرمایا:

﴿ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴾ (ق)

تو اے پیغمبر ان کو جو میری دھمکی سے ڈرتے ہوں قرآن کے ذریعہ سے یاد دلا۔

قرآن رحمت عالم پیام عمومی ہے اور یہی اس کے نزول کی غرض وغایت ہے، فرمایا

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ﴾ (فرقان۔۱)

برکت والا ہے وہ جس نے حق وباطل میں امتیاز بتانے والی کتاب اپنے بندہ پر اس لئے اتاری تا کہ تمام دنیا کو بیدار اور ہشیار کر دے۔

یہی قرآن اسلام کی طاقت اور محمد رسول اللہ ﷺ کا اصلی ہتھیار تھا جس کی کاٹ نے کبھی خطا نہ کی

اشاعتِ اسلام کی قدرتی ترتیب:

عرب میں صرف تین قومیں تھیں جن کا اسلام لانا گویا تمام جزیرہ نمائے عرب کا اسلام لانا تھا یعنی مشرکین، یہود

اور نصاریٰ، مشرکین عرب کا مرکز خانہ کعبہ تھا اور ان کے مذہبی پیشوا قریش تھے' یہود کا صدر مقام مدینہ اور خیبر تھا اور مجوس شام اور یمن کے اطراف میں پھیلے تھے۔

اس بناء پر الاقرب فالاقرب کے لحاظ سے اشاعت اسلام کی قدرتی ترتیب یہ تھی کہ قریش اور کفار مکہ کو پہلے دعوت توحید دی جاتی پھر یہود کو حلقہ بگوش اسلام بنایا جاتا' اور اس کے بعد نصاریٰ اور مجوس کو دعوت دی جاتی چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اسی ترتیب کے ساتھ اسلام کی اشاعت کی اور اسی بناء پر قرآن مجید کا طریق دعوت مختلف نظر آتا ہے تمام مکی سورتوں کے مخاطب کفار مکہ تھے اس لئے ان میں بت پرستی کی مذمت' توحید کی ترغیب' عجائب قدرت کا بیان عذاب الٰہی سے تخویف اور صنادید قریش کی مخالفت کے جواب کے سوا کچھ نہیں لیکن جب آنحضرت ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو یہود سے سابقہ پڑا اور اب قرآن کا طرز خطاب بدل گیا چنانچہ ابتدائی مدنی سورتیں زیادہ تر یہود کی مذہبی تاریخ ان کی تحریفات اور ان کی اخلاقی کمزوریوں اور قصص بنی اسرائیل پر مشتمل ہیں سب سے اخیر میں نصاریٰ کی باری آئی اور فتح مکہ کے بعد قبائل عرب کے وفود کے سلسلہ میں نجران کے عیسائیوں کا وفد آیا اسی زمانہ میں سورۂ آل عمران نازل ہوئی جس میں نصاریٰ کا ذکر ہے۔

مجوس عرب میں بہت کم تھے بحرین اور یمن میں خال خال وہ پائے جاتے تھے وہ بھی ایرانی النسل تھے خالص عرب نہ تھے اس لئے قرآن مجید نے خاص طور پر کسی سورہ میں ان کے ساتھ خطاب نہیں کیا ہے البتہ جابجا مناسب موقعوں پر ان کا نام لیا ہے اور ان کے عقائد کی تردید اور ان کو ثنویت یعنی دو خداؤں کی پرستش کے بجائے توحید کی دعوت دی ہے۔

قبول اسلام کے لئے کیا چیز درکار تھی؟

اگرچہ یورپ کا یہ عام دعویٰ ہے کہ عرب میں اسلام صرف تلوار کے زور سے پھیلا، لیکن ابتداء میں جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو قبول کیا ان کے اوصاف پیش نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لئے صرف اثر پذیر دل کا جویاں تھا اور جب یہ آشیانہ مل جاتا تھا تو اس کے سامنے یہ طائر قدس اپنے پر ڈال دیتا تھا، چنانچہ ابتدائے بعثت میں جن اشخاص نے اسلام کو قبول کیا، وہ وہی تھے جو نیک طبع' ایماندار' راستی پسند اور حق جو تھے اور جو نبوت کے اوصاف و خصائص سے واقف تھے، گزشتہ آسمانی مذاہب سے کچھ نہ کچھ آگاہ تھے اور معاشرت اور تمدن سے بہرہ ور تھے اشخاص کے علاوہ جن قبائل اور آبادیوں نے اسلام کے قبول کرنے میں پیش دستی کی وہ بھی وہی تھے جن میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی تھیں۔ عرب کے دو مختلف حصوں جنوبی و شمالی میں سب سے زیادہ اسلام کو کامیابی عرب کے جنوبی حصہ یعنی یمن' عمان' بحرین' یمامہ میں ہوئی اور شمالی حصہ میں سے مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں ہوئی کیونکہ وہ تمدنی حیثیت سے دنیا کی دو ممتاز متمدن قوموں ایرانیوں اور رومیوں سے متاثر تھے اور مذہبی حیثیت سے یہودیوں اور عیسائیوں سے ان کا میل جول اور خلا ملا تھا اہل مدینہ بھی یہودیوں کے تمدن و معاشرت، روایات اور رسم و رواج سے بہت کچھ متاثر تھے۔ [1]

اسلام کو عربوں سے جس قدر لڑائیاں پیش آئیں وہ سب نجد اور حجاز میں پیش آئیں لیکن مسلمانوں کی کوئی جزار

---

[1] مستدرک حاکم ج ۲ ص ۱۹۵ (صحیح علی شرط مسلم)

فوج مدینہ یمن، عمان، یمامہ اور بحرین کو فتح کرنے کے لئے نہیں بھیجی گئی، انصار مدینہ نے خود آ کر اسلام کو لبیک کہا، اطراف مدینہ کے قبائل میں غفار نے خود مکہ آ کر قریش کی تلوار کی آگ میں کھڑے ہو کر لا الہ الا اللہ پڑھا، یمن سے دوس کے قبیلہ کے آدمیوں نے خود مکہ معظمہ پہنچ کر ایمان کی دولت حاصل کی اور اس کے سردار نے اپنا قلعہ اسلام کی پناہ کے لئے پیش کیا، اشعر کا قبیلہ بھی اسی زمانہ میں غائبانہ مشرف بہ اسلام ہوا، ہمدان کا قبیلہ حضرت علیؓ کی دعوت پر ایک دن میں مسلمان ہو گیا۔

عمان کا بھی یہی حال ہوا۔ وہاں بھی اسلام نے صرف اپنی تبلیغی کوششوں کے ذریعہ سے اقتدار حاصل کیا، ایک بار آپ نے عرب کے کسی قبیلہ کے پاس ایک آدمی کو بھیجا وہ لوگ اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے اور اس کو زدوکوب کیا، اس نے آ کر آپ سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر اہلِ عمان ہوتے تو تم کو نہ گالیاں دیتے نہ مارتے (مسلم فضائل اہل عمان)

یمامہ کے رئیس ثمامہؓ قید ہو کر مدینہ آئے، یہاں آزاد کر دیئے گئے مگر مدینہ کی مسجد میں جو جلوہ انہوں نے دیکھا اپنی ظاہری مادی آزادی کے بعد بھی اس کی نورانی زنجیر سے انہوں نے رہائی نہ پائی خود بخود مسلمان ہو گئے اور اپنے قبیلہ میں جا کر اسلام کے داعی بن گئے اور آخر خون کا ایک قطرہ گرے بغیر اسلام نے وہاں اکثریت حاصل کر لی۔

دیہاتوں میں سب سے پہلے قریۂ جواثی نے صدائے توحید پر لبیک کہا جو مضافاتِ بحرین میں تھا، اسی قریہ جواثی کے باشندے فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، چنانچہ مسجد نبوی کے بعد عرب کے دیہاتوں میں سب سے پہلا جمعہ اسی گاؤں میں پڑھا گیا[1] بارگاہ نبوت میں عرب کے وفود اگرچہ فتح مکہ کے بعد حاضر ہوئے، لیکن بحرین کے لوگوں نے اس میں تمام قبائل عرب پر پیش دستی کی، چنانچہ ۵ھ میں سب سے پہلا وفد جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا وہ قبیلہ عبدالقیس کا تھا جو بحرین میں سکونت گزیں تھا۔

اہل یمن کا شمار اگرچہ مہاجرین اولین میں نہیں کیا جاتا لیکن جب آنحضرت ﷺ کی ہجرت کا حال معلوم ہوا تو اسی وقت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بھی یمن سے ۵۲ آدمیوں کو لے کر مدینہ کی طرف ہجرت کی غرض سے روانہ ہو گئے بحری سفر تھا وہ لوگ کشتی میں سوار ہوئے تو باد مخالف کے جھونکوں نے ان کو حبشہ میں پہنچا دیا جو مسلمانوں کا سب سے پہلا دارالہجرۃ تھا وہاں حضرت جعفر بن ابی طالبؓ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو یہیں اقامت کا حکم دیا ہے تم لوگوں کو بھی یہیں ٹھہر جانا چاہئے، چنانچہ وہ لوگ وہیں مقیم ہو گئے اور فتح خیبر کے زمانے میں مہاجرین حبشہ کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔[2]

یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جہالت اور وحشت تھی اور اس کی اشاعت کی سب سے بڑی محرک چیز تمدن، معاشرت اور اخلاق کی بلندی اور کتب آسمانی اور دیگر مذاہب سے واقفیت تھی، خود قرآن مجید نے اس کو ظاہر کیا ہے۔

﴿ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ

---

[1] بخاری باب الجمعۃ فی القریٰ والمدن۔

[2] صحیح مسلم فضائل جعفرؓ بن ابی طالب واسماءؓ بنت عمیس۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾ (توبہ)

دیہاتی بدوی کفر اور نفاق میں سب سے زیادہ سخت ہیں' اور زیادہ اس کے اہل ہیں کہ وہ ان احکام کو نہ جانیں جو خدا نے اپنے رسول پر اتارا ہے' اور اللہ جانتا اور حکمت والا ہے۔

اور بھی اس قسم کی آیتیں ہیں' جو لوگ بادیہ سے آ کر اسلام لائے تھے اور کچھ مسائل سیکھ کر واپس چلے جاتے تھے ان سے جو بیعت لی جاتی تھی اس کا نام بیعت اعرابی تھا جو کم درجہ سمجھی جاتی تھی اس بناء پر بادیہ میں الگ تھلگ رہنا صحابہ کے زمانہ میں معیوب سمجھا جاتا تھا بلکہ بعض لوگ اس کو ارتداد کی علامت سمجھتے تھے۔ [۱]

اشاعتِ اسلام کے اسباب و ذرائع:

گذشتہ مباحث پر ایک غائر نظر ڈالنے کے بعد خود بخود یہ عقدہ کھل جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دین حق کو عربوں میں کس طرح پھیلایا اور آپ کو کیونکر کامیابی حاصل ہوئی تاہم اگر واقعات کی روشنی میں ایک ایک صحابی کے قبول اسلام کے اسباب کی تلاش کی جائے تو حسب ذیل اسباب سامنے آئیں گے۔

۱۔ اسلام کے نشر و اشاعت کا سب سے مقدم اور اصلی سبب معجزہ قرآنی تھا' قرآن مجید جس مؤثر اور دل کپکپا دینے والے طریقہ سے عقائد و معارف و اخلاق کی تلقین کرتا تھا' اس کے سامنے وہ تمام عوائق اور موانع جن کا اوپر ذکر ہو چکا فنا ہو جاتے تھے۔ جو لوگ سرے سے خدا کے وجود کے منکر تھے قرآن مجید ان کے سامنے عالم کی بوقلمونی' مظاہر قدرت کی بو العجبی' کائنات کی نیرنگی' اجرام فلکی کی جلوہ گری اور عناصر کی نگار آرائی سے اس طرح استدلال کرتا تھا۔

﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ (بقرہ)

تم خدا کا انکار کس طرح کرتے ہو حالانکہ تم کبھی بے جان تھے تو اس نے تم کو زندگی بخشی' پھر ایک دن تم کو مردہ بنا دے گا پھر زندہ کرے گا اور پھر اس کے پاس واپس کئے جاؤ گے۔

﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ (بقرہ)

آسمان و زمین کی پیدائش میں' شب و روز کے اختلاف میں' ان کشتیوں میں جو سمندر میں انسانوں کے لئے سود مند چیزوں کو لے کر چلتی ہیں' بادلوں سے پانی برسانے میں، اس پانی سے مردہ زمین کو زندہ کرنے میں اور اس زمین میں ہر قسم کے جانداروں کو پھیلانے میں' ہواؤں کے چلانے میں' ان بادلوں میں جو فضائے آسمانی میں مسخر ہیں دانشمندوں کے لئے یقیناً بڑی نشانیاں ہیں۔

﴿ وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴾ (آل عمران)

آسمان و زمین میں جو بھی ہے برضا یا مجبوراً اسی کا اطاعت گذار ہے' اور اسی کی طرف ایک دن سب لوٹائے جائیں گے۔

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الامارۃ اور سنن نسائی کتاب البیعہ۔

﴿ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ الَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ هٰذَا بَاطِلًا ﴾ (آل عمران)

آسمان وزمین کی خلقت اورشب وروز کے الٹ پھیر میں ان ارباب عقل کے لئے بے شبہ بڑی نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھے لیٹتے (ہر حال میں) خدا کو یاد کرتے ہیں' اور آسمان وزمین کی خلقت پر غور کرتے ہیں' کہ خدایا تو نے یہ بیکار پیدا نہیں کیا۔

﴿ هُوَ الَّذِیۡ یُسَیِّرُکُمۡ فِی الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ حَتّٰۤی اِذَا کُنۡتُمۡ فِی الۡفُلۡكِ وَجَرَیۡنَ بِهِمۡ بِرِیۡحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوۡا بِهَا جَآءَتۡهَا رِیۡحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الۡمَوۡجُ مِنۡ کُلِّ مَکَانٍ وَّظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ اُحِیۡطَ بِهِمۡ دَعَوُا اللّٰهَ مُخۡلِصِیۡنَ لَهُ الدِّیۡنَ ﴾ (یونس)

وہ وہ ہے جو تم کو خشکی اور دریا میں سفر کراتا ہے' یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور موافق ہوا کشتی والوں کے لئے جاری ہے اور لوگ خوش ہو رہے ہیں کہ (دفعتہً) زور کا جھکڑ آیا اور ہر طرف سے موجیں آ گئیں اور لوگوں کو یقین ہو چلا کہ اب وہ گھر گئے اس وقت وہ مخلص ہو کر خدا کو پکارنے لگتے ہیں۔

﴿ وَمِنۡ اٰیٰتِهٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡکُنُوۡۤا اِلَیۡهَا وَجَعَلَ بَیۡنَکُمۡ مَّوَدَّةً وَّرَحۡمَةً ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ۝ وَمِنۡ اٰیٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِکُمۡ وَاَلۡوَانِکُمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡعٰلِمِیۡنَ وَمِنۡ اٰیٰتِهٖ مَنَامُکُمۡ بِالَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَابۡتِغَآؤُکُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ ﴾ (روم)

اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے لئے تم ہی میں سے جوڑے بنائے کہ تم کو ان سے تسلی ہو اور تم دونوں میں باہمی محبت اور ہمدردی پیدا کی' اس بات میں سوچنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں' اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا پیدا کرنا ہے' اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا ہے' اس بات میں جاننے والوں کے لئے نشانیاں ہیں' اور خدا کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا اور خدا کے فضل (روزی) کو ڈھونڈنا ہے اس میں سننے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

خدایا ایک قوت اعظم کا اعتراف خود انسان کی فطرت ہے، لیکن غفلت شعاری اور آبائی اثر اور دیگر اسباب سے یہ فطرت کبھی کبھی مردہ اور بے حس ہو جاتی ہے، قرآن مجید اسی خفتہ حس کو بیدار کرتا ہے۔

﴿ اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ﴾ (ابراہیم)

کیا خدا میں شک ہے' جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

﴿ کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰهِ وَکُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا فَاَحۡیَاکُمۡ ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ ثُمَّ اِلَیۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴾ (بقرہ)

اور کیسے تم خدا کا انکار کرتے ہو' حالانکہ تم بے جان تھے' اور اس نے تم کو زندگی دی اور پھر وہ تم کو موت دے گا' پھر وہ تم کو زندہ کرے گا' پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

عرب میں ملحد کم تھے، زیادہ تر بلکہ قریباً تمام تر مشرکین تھے جو خدا کو اگرچہ مانتے تھے' لیکن یہ بھی مانتے تھے کہ

اس کے سوا اور بھی خدا ہیں جو خدا کے شریک ہیں اور نظام عالم ان ہی کے ہاتھ سے انجام پاتا ہے، انسان کی فطرت ہے کہ جس سے براہ راست اس کو کام پڑتا ہے اس کو زیادہ مانتا ہے‘ اسی سے زیادہ محبت کرتا ہے اسی کی زیادہ پرستش کرتا ہے‘ چونکہ مشرکین کا اعتقاد تھا کہ بادلوں کی بارش‘ غلہ کی پیداوار‘ نباتات کی روئیدگی‘ سب اجرام فلکی یا اصنام کا کام ہے اس لئے ان کو عبدیت کا جو کچھ تعلق تھا ان ہی معبودوں سے تھا وہ انہی کی عبادت کرتے تھے انہیں سے محبت رکھتے تھے انہیں پر نذر چڑھاتے تھے، انہی کے سامنے قربانیاں کرتے تھے‘ معرکوں میں انہیں کے نام کی جے پکارتے تھے، اس بناء پر آنحضرت ﷺ کا اصلی کام اسی شرک اور اصنام پرستی کو مٹانا تھا‘ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اصل وجود باری کے متعلق بہت کم استدلال ہے زیادہ تر شرک کا ابطال اور اس کی تحقیر اور تہجین ہے۔

قرآن مجید طرح طرح سے نہایت موثر پیرایوں میں شرک کی لغویت کا اظہار کرتا ہے۔

﴿ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِیَ وَجَعَلَ بَیْنَ الْبَحْرَیْنِ حَاجِزًا ط ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ o اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ط ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ o اَمَّنْ یَّهْدِیْكُمْ فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ یُّرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًا ۢ بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ط ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ o اَمَّنْ یَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ ط وَمَنْ یَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ط ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴾ (نمل۔۶۴۔۶۱)

کیا وہ جس نے زمین کو قرارگاہ بنایا‘ اور اس کے بیچ میں نہریں بہائیں‘ اور اس کے لئے پہاڑوں کی میخیں گاڑیں‘ اور دونوں دریاؤں میں اوٹ رکھا‘ کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے‘ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ جانتے نہیں‘ کیا وہ جو پریشان خاطروں کی سنتا ہے‘ جب وہ اس کو پکارتے ہیں اور بلا کو ہٹا دیتا ہے اور تم کو دنیا کا حکمران بناتا ہے‘ کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے تم بہت کم سوچتے ہو‘ کیا وہ جو تم کو خشکی اور تری کی اندھیریوں میں راستہ دکھاتا ہے اور وہ جو کہ اپنی رحمت (بارش) کے آگے ہواؤں کو بھیجتا ہے‘ کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے مشرکین جن کو خدا کا شریک کہتے ہیں خدا ان سے برتر ہے۔ آیا کون ہے جو آفرینش کا آغاز کرتا ہے‘ پھر اس کو لوٹا لاتا ہے‘ اور وہ کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے۔ تو کہہ دے کہ اگر سچے ہو تو دلیل لاؤ۔

کفار اور مشرک عموماً قیامت کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ ﴿ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ ﴾ یعنی ہڈیاں گل سڑ چکیں تو اب کون ان کو جلائے گا‘ قرآن مجید ان سے خطاب کرتا تھا۔

﴿ اَلَمْ یَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰى o ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى o فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى o اَلَیْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ یُّحْیِۦَ الْمَوْتٰى ﴾ (قیامۃ)

کیا انسان پہلے منی نہیں تھا‘ پھر گوشت کا لوتھڑا بنا‘ پھر خدا نے اس کو ٹھیک کیا اور اس سے دو جوڑ مرد اور عورت بنائے‘ کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردے کو زندہ کر دے۔

غرض عقائد‘ عبادات‘ اخلاق‘ اعمال ہر چیز کو قرآن اس موثر اور دلنشین طریقہ سے ادا کرتا تھا کہ دل میں گھر کر جاتا تھا اور رسم و عادات کا بند اس سیلاب کو کسی طرح روک نہیں سکتا تھا اس پر بھی جو کفر پر ثابت قدم رہے وہ ذاتی

اغراض کا اثر تھا حقیقی جحود اور انکار نہ تھا۔

تمام بڑے بڑے صحابہ بڑے بڑے روساء، قبائل، بڑے بڑے شعراء اور خطباء قرآن ہی سن کر ایمان لائے، حضرت عمرؓ کس ارادہ سے چلے تھے، لیکن جب قرآن مجید کی آیتیں سنیں تو کانپ اٹھے اور اسلام قبول کر لیا، عتبہ جو رئیس قریش اور علوم عرب کا ماہر تھا جب اس نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر کہا کہ تم نبوت کی دعوت سے باز آؤ ہم تمہارے لئے سب کچھ مہیا کر دیتے ہیں، آپ نے حٰمٓ کی ابتدائی آیتیں پڑھیں، جب یہ آیت آئی:

﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ﴾ (حٰم فصلت)

تو اگر وہ منہ پھیرے تو کہہ دے کہ میں تم کو اس کڑک سے ڈراتا ہوں جو عاد و ثمود کی کڑک کی طرح ہے۔

تو عتبہ نے بیتاب ہو کر آنحضرت ﷺ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ خدا کے لئے بس، تم کو قرابت کی قسم دلاتا ہوں، پھر واپس جا کر قریش سے کہہ دیا محمد جو کلام پیش کرتے ہیں نہ تو وہ شعر ہے نہ جادو نہ کہانت ہے[1] (بلکہ کوئی اور چیز ہے) حضرت ابوذرؓ نے اسلام لانے سے پہلے اپنے بھائی انیس کو جو شعرائے عرب میں تھے، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں تحقیق حال کے لئے بھیجا تھا، وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور قرآن مجید سنا تو جا کر حضرت ابوذرؓ سے کہا کہ لوگ ان کو کاہن اور شاعر کہتے ہیں، لیکن میں کاہنوں اور شعراء دونوں کے کلام سے واقف ہوں اور ان کا کلام دونوں سے الگ ہے، انیس کے بعد حضرت ابوذرؓ خود گئے اور واپس آئے تو ان کا آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہو گیا۔[2]

ولید بن مغیرہ (حضرت خالدؓ کا باپ) جو اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ نے یہ آیتیں پڑھیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ (نحل۔۹۰)

خدا عدل کا، احسان کا، اور رشتہ داروں کو عطا کرنے کا حکم دیتا ہے اور فحش سے بری بات سے اور ظلم سے منع کرتا ہے، وہ تم کو سمجھاتا ہے کہ شاید تم سمجھ جاؤ۔

ولید نے کہا پھر پڑھنا، آپ نے دوبارہ پڑھا، وہ واپس گیا اور قریش سے جا کر کہا کہ یہ انسان کا کلام نہیں۔[3]

عثمان بن مظعونؓ بڑے پایہ کے صحابی اور سابقین اسلام میں ہیں یہی آیتیں ہیں جن کو سن کر ان کے دل نے سب سے پہلے اسلام کا جلوہ دیکھا۔ وہ خانہ کعبہ کو جا رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے راستہ میں اپنے پاس بٹھا لیا، پھر فرمایا کہ ابھی مجھ پر یہ کلام اترا ہے یہ کہہ کر آپ نے اوپر والی آیتیں پڑھیں۔ عثمانؓ کہتے ہیں کہ پہلا موقع تھا کہ اسلام نے میرے دل میں گھر کیا۔[4]

---

[1] علامہ ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح جلد ۴ صفحہ ۴۴ میں مسند ابویعلی وغیرہ سے یہ روایت نقل کی ہے نیز یہ روایت مستدرک حاکم میں بھی ہے۔

[2] صحیح مسلم فضائل حضرت ابوذرؓ۔

[3] الجواب الصحیح جلد ۴ صفحہ ۴۶ بحوالہ عبدالرزاق۔

[4] مسند ابن حنبل جلد اول صفحہ ۳۱۸ و ادب المفرد امام بخاری باب البغی۔

جبیر بن مطعم نے کفر کے زمانہ میں آنحضرت ﷺ کو سورۂ طور پڑھتے سنا جب اس آیت پر پہنچے:

﴿ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ ○ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ○ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ﴾ (طور۔۲۷۔۲۵)

کیا یہ لوگ از خود پیدا ہو گئے یا خود خالق ہیں، کیا آسمان اور زمین کو انہیں لوگوں نے پیدا کیا بلکہ (واقعہ یہ ہے کہ) ان میں ایمان نہیں، کیا ان کے پاس خدا کے خزانے ہیں کیا یہی لوگ سربراہ کار ہیں۔

تو خود جبیرؓ کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل اڑنے لگا۔ [۱]

طفیل بن عمرؓ والدوسی مشہور شاعر اور شرفائے عرب میں تھے، ہجرت سے پہلے وہ مکہ گئے لوگوں کو ان کے آنے کی خبر ہوئی تو ان کے پاس گئے اور آنحضرت ﷺ کی نسبت کہا کہ ان کے پاس نہ جانا، وہ لوگوں پر جادو کر دیتے ہیں لیکن جب حرم میں اتفاقیہ آنحضرت ﷺ کی زبان سے قرآن سنا تو ضبط نہ کر سکے اور مسلمان ہو گئے۔ [۲]

ہجرت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے جب طائف کا سفر کیا اور مشرکین کو اسلام کی دعوت دی تو اگر چہ ادھر سے جواب ڈھیلا اور پتھر تھا تاہم خالد العدوانی نے جو طائف کے رہنے والے تھے آپ کو

﴿ وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴾ (طارق)

قسم ہے آسمان کی اور رات کے چلنے والے ستارہ کی۔

پڑھتے سنا تو اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسی حالت کفر میں پوری سورہ یاد کر لی [۳] اور آخر اسلام لائے

حضرت ابوبکرؓ کو قیام مکہ کے زمانہ میں بعض مشرکین نے اپنی پناہ میں لے لیا تھا اس زمانہ میں حضرت موصوف نے ایک مسجد بنوالی تھی اور اس میں نماز پڑھا کرتے تھے، لیکن نماز بآواز بلند پڑھتے تھے آواز سن کر محلّہ کے نوجوان اور عورتیں جمع ہو جاتیں اور قرآن سنتیں تو ان کا دل خود بخود اسلام کی طرف کھنچتا، چنانچہ اسی بناء پر کفار نے حضرت ابوبکرؓ سے شکایت کی کہ قرآن پکار کر نہ پڑھا کرو، اس سے ہمارے بچے اور عورتیں مفتون ہوتی جاتی ہیں [۴] انصار اول اول جب مقام عقبہ میں اسلام لائے تو قرآن ہی سن کر لائے تھے، جو لوگ داعی بنا کر بھیجے جاتے ان کو قرآن یاد کرایا جاتا اور وہ جہاں جاتے یہی کارگر آلہ تسخیر لے کر جاتے، نجاشی کے دربار میں کفار قریش جب سفیر بن کر گئے اور ان کی شکایت پر نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر باز پرس کی تو حضرت جعفر طیارؓ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں نجاشی بے اختیار رو پڑا اور کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل ایک ہی چشمہ سے نکلے ہیں۔ [۵]

حبش میں جب آپ کی بعثت کا چرچا ہوا تو بیس شخص جو مذہباً عیسائی تھے، تحقیق حال کے لئے مکہ میں آئے اور

---

[۱] صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۂ طور۔

[۲] ان کے اسلام کا حال ابن القیم (زادالمعاد) نے بہ تفصیل لکھا ہے اور ابن اسحاق کے حوالہ سے لکھا ہے۔

[۳] مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۳۳۵۔

[۴] بخاری شریف ذکر ہجرت۔

[۵] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۲۹۱۔

آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے ان کے سامنے قرآن مجید کی آیتیں پڑھیں' ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور اسی وقت اسلام لائے' آنحضرت ﷺ کے پاس سے یہ لوگ اٹھے تو ابو جہل نے ان سے مل کر کہا کہ تم سخت احمق ہو اتنے دور سے سفر کر کے آئے اور دم بھر میں اپنا مذہب بدل لیا انہوں نے کہا ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتے۔[۱]

قرآن کی پیشین گوئیوں کی صداقت نے بھی لوگوں کے دلوں کو کھینچا' چنانچہ اہل ایران کے مقابلہ میں رومیوں کی فتح کی جو پیشین گوئی کی تھی جس دن یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی صدہا کافر مسلمان تھے۔[۲]

ایک ضروری نکتہ:

عام خیال یہ ہے کہ اہل عرب جو قرآن مجید سن کر اسلام قبول کر لیتے تھے' وہ صرف فصاحت و بلاغت کی بناء پر' یعنی چونکہ عرب میں شعر و خطابت کا بہت چرچا تھا اور تمام ملک میں شاعری کا مذاق سرایت کر گیا تھا اس لئے جب وہ دیکھتے تھے کہ کسی اور شاعر یا خطیب کا کلام ایسا فصیح و بلیغ نہیں ہے تو وہ اسلام قبول کر لیتے تھے۔

بے شبہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے لیکن اس کا اعجاز جس قدر عبارت و انشاء میں ہے اس سے کہیں زیادہ معنی و مطالب میں ہے۔

فرض کرو کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایسا ہی معجزہ ہوتا جیسا اب ہے لیکن اس میں صرف تاریخی واقعات یا اسی قسم کی اور کوئی بات ہوتی تو کیا یہی اثر پیدا ہو سکتا تھا قرآن مجید ایک طرف تو فصاحت و بلاغت کے بناء پر اعجاز کا کام دیتا تھا دوسری طرف جو مطالب اور مقاصد ادا کرتا تھا وہ اسلام ہی کے مقاصد اور مطالب تھے وہ خدا کی عظمت و جلالت، اصنام کی تحقیر و تذلیل، انسان کا عجز و تعبد، سزا و جزاء، بعث و نشر، جور و ظلم کی تقبیح، اخلاق حسنہ کی تحسین ان مطالب کو اس طرح ادا کرتا تھا کہ خود بخود وہ دل میں گھر کرتے جاتے تھے ان کو یہ نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ان باتوں کو اس لئے مان رہے ہیں کہ مسلمان ہو چکے ہیں بلکہ یہ باتیں براہ راست ان کے دل میں اتر جاتی تھیں اور وہ مسلمان ہو جاتے تھے۔

موانع کا ازالہ:

عرب کو جو چیزیں اسلام سے روکتی تھیں ان میں سب سے اہم (جیسا کہ اوپر لکھ آئے ہیں) ان کے اوہام و اعتقادات باطلہ تھے جو سینکڑوں ہزاروں برس سے چلے آتے تھے یا سیاسی و معاشی ضرورتیں تھیں مقدم الذکر باتوں کا قرآن مجید اور اعجاز نبوی نے استیصال کر دیا' عرب میں جو لوگ صاحب فہم اور ذی اثر تھے اور سیاسی اسباب سے مجبور نہ تھے یہ ناممکن تھا کہ وہ قرآن سنتے اور ان کے تمام عقائد اور اوہام دفعتہً فنا نہ ہو جاتے یہ ارباب اثر جب خود متاثر ہو جاتے تھے تو ان میں سے ایک ایک شخص کے اثر سے ہزاروں اشخاص مسلمان ہو جاتے تھے کیونکہ قبائل پرستی کی بناء پر قبیلہ کا ایک معزز اور رئیس اپنے پورے قبیلہ کے دل و دماغ کا مالک ہوتا تھا۔

البتہ جو لوگ سیاسی اسباب سے مطلقاً دعوتِ اسلام کی طرف متوجہ ہی ہونا نہیں چاہتے تھے' انہوں نے بار بار

---

[۱] ابن ہشام جلد اول صفحہ ۱۳۶ مطبوعہ مصر ذکر ہجرت حبش۔

[۲] صحیح ترمذی تفسیر سورۂ روم۔

دارالنبوۃ (مدینہ منورہ) پر چڑھائیاں کیں، لیکن نصرت ایزدی نے ان کو اس قدر شکستیں دیں کہ بالآخر مجبور ہو کر بیٹھ گئے ان میں سے کچھ فنا ہو گئے کچھ چار و ناچار اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئے جن میں سے اکثر رفتہ رفتہ بالآخر دل سے مسلمان بن گئے۔

قبائل کی ریاست سیاسی حیثیت سے گو اسلام کے مخالف تھی لیکن بعض وجوہ سے اسلام کو تائید بھی پہنچاتی تھی، اسلام کی جمہوریت جس قدر ریاست کی مخالف تھی، اسی قدر عام جماعت کی حامی تھی، اسلام سے اگر ایک رئیس کی شان، ریاست و خودسری کو نقصان پہنچتا تھا تو ہزاروں آدمیوں کو نظر آتا تھا کہ اسلام قبول کر لینے سے ہر شخص رئیس کا ہمسر ہو جاتا ہے، غرض اسلام اگر ایک رئیس کو مٹاتا تھا تو سینکڑوں کو رئیس بنا دیتا تھا۔

اس کے ساتھ رؤسا کی ریاست بالکل زائل نہیں ہو جاتی تھی بلکہ اسلام قبول کرنے پر وہ اپنے قبیلہ کے رئیس باقی رہتے تھے صرف اتنا ہوتا تھا کہ ان کی بے قید مطلق العنانی قائم نہیں رہتی تھی اور اسلامی احکام کا پابند رہنا پڑتا تھا، اس لئے اگر کوئی خودغرضی کرنا بھی چاہتا تھا تو اس کو بھی یہ سودا گراں نہیں پڑتا تھا۔ مولفۃ القلوب کا گروہ اس کی ایک صریح نظیر تھا۔

اب صرف معاشی کی ضرورت سدراہ ہو سکتی تھی لیکن لوگوں کو نظر آتا تھا کہ جن حدود میں اسلام کی حکومت قائم ہو جاتی ہے وہاں امن و امان قائم ہونے کی وجہ سے تجارت اور دیگر ذرائع معاش کثرت سے ترقی کر جاتے ہیں۔

۲۔ نبوت کے متعلق ان کو جو شکوک تھے مشاہدہ اور تجربہ نے ان کا پردہ چاک کر دیا، بڑی سے بڑی انسانیت اور پاک سے پاک زندگی کا جو تخیل ایک انسان کے ذہن میں آ سکتا تھا، محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس سے بھی بدرجہا بالاتر اور ارفع تھی ان کو نظر آتا تھا کہ گو مدعی نبوت بظاہر جامہ بشریت میں تھے لیکن اپنی معنوی زندگی اپنے معجزانہ اخلاق اور اپنے مافوق الفطرت علم و معرفت اور اپنے ربانی کرشموں کی بناء پر بشریت سے کوئی بالاتر مخلوق ہے ﴿مَا هٰذَا بَشَرًا ط اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ﴾ قرآن مجید نے آنحضرت ﷺ کے صدق نبوت پر اسی مقدس و معصوم زندگی سے استدلال کیا ہے۔

﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (یونس)

اے قریش! نبوت سے پہلے بھی میں نے تم میں ایک مدت دراز تک زندگی بسر کی ہے، کیا تم نہیں سمجھتے۔

زندگی کا یہی اعجاز تھا جس سے ظہور نبوت سے پہلے ہی امین کا خطاب آپ نے حاصل کر لیا تھا، بیوی کے برابر انسان کے اصلی حالات و اخلاق کا واقف کار کوئی اور نہیں، نبوت محمدی کا معتقد اولین دنیا میں کون تھا، ام المومنین خدیجہؓ بنت خویلد، لیکن ان کی اس زود اعتقادی کا راز کیا تھا، ۴۰ برس کے معجزانہ اخلاق اور مافوق الفطرۃ اوصاف و حالات کا تجربہ وہ خود پیغمبر کو خطاب کر کے نبوت کی تسکین ان الفاظ میں دیتی ہیں "خدا کبھی آپ کو رسوا نہ کرے گا آپ رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرتے ہیں، ناداروں کی طرف سے قرض ادا کرتے ہیں، محتاجوں کی خبر لیتے ہیں، مہمانوں کے ساتھ بہ مدارات پیش آتے ہیں جو لوگ حقیقت میں مبتلائے آلام ہیں، ان کی اعانت کرتے ہیں۔[1]

سن چکے ہو کہ عرب میں آپ کی نبوت کا جب چرچا پھیلا تو ابوذر غفاریؓ نے انیس اپنے بھائی کو تحقیق حال کے لئے بھیجا انہوں نے واپس آ کر پیکر نبوت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا، میں ایک ایسے شخص کو دیکھ کر آیا ہوں جو بھلائیوں کا

---

[1] صحیح بخاری بدء الوحی۔

حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔ [۱]

نبوت کے بعد قریش نے ذات نبوی کے ساتھ گو عداوت اور کینہ پروری کا کوئی پہلو اٹھا نہیں رکھا تاہم کوئی ادنیٰ اخلاقی جرم بھی اس کے ساتھ منسوب نہ کر سکے اسلام کے سب سے اول اعلان دعوت کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر قریش کے مجمع کو طلب کیا اور پوچھا کہ اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک فوج گراں تم پر حملہ آور ہونے کو تیار ہے تو کیا سچ مانو گے' سب نے بیک آواز کہا'' محمد! تیری بات آج تک ہم نے کبھی جھوٹ نہ پائی [۲] ابوسفیان جو ہجرت کے آٹھویں سال تک اسلام کے سخت ترین دشمن تھے ۶ھ میں ہرقل قیصر روم کے دربار میں کفار قریش کی ایک جماعت کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کے اخلاق واوصاف کے متعلق شہادتیں پیش کر رہے تھے تاہم وہ ایک حرف بھی صداقت کے خلاف نہ کہہ سکے انہوں نے شہادت دی کہ'' محمد کبھی جھوٹ نہیں بولتے، انہوں نے کبھی بدعہدی نہ کی، شرک سے روکتے ہیں، توحید کی تعلیم دیتے ہیں، عبادت' صدق' عفت، صلہ رحمی کی تاکید کرتے ہیں'' ہرقل ہر فقرہ پر کہتا جاتا تھا کہ نبوت کے یہی آثار ودلائل ہیں یہ سب سے پہلا دن تھا کہ ابوسفیان کے دل نے آنحضرت ﷺ کی کامیابی کا یقین کیا۔ [۳]

کتاب کی دوسری جلد میں آپ کے تمام محاسن اخلاق یعنی رفق' ملاطفت' حسن معاملت' جود وسخا' عدم تشدد' عفو ودرگذر وغیرہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس پر مجموعی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ درحقیقت آنحضرت ﷺ کا ایک معجزہ تھا اور یہ معجزہ تسخیر قلوب ہی کے لئے عطا ہوا تھا قرآن مجید اس نکتہ کو خود بتاتا ہے۔

﴿ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ﴾ (آل عمران۔۱۵۹)

محمد اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے چل دیتے۔

آپ کی یہی معجزانہ کشش تھی جو لوگوں کو کھینچ کھینچ کر دائرہ اسلام میں داخل کرتی تھی اور کفار کے جاہلانہ شکوک و اوہام کو دم کے دم میں مٹا دیتی تھی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے بہت سی بکریاں مانگیں آپ نے دے دیں اس پر آپ کی فیاضی کا اس قدر اثر پڑا کہ اپنے قبیلہ میں آ کر اس نے کہا'' لوگو مسلمان ہو جاؤ کیونکہ محمد اس قدر دیتے ہیں کہ خود ان کو اپنے تنگ دست ہونے کا مطلق خوف نہیں ہوتا۔'' [۴]

فتح مکہ میں جب صفوانؓ بن اُمیہ مجبوراً اسلام لایا تو آنحضرت ﷺ نے اس کو تین سو اونٹ دے دیئے خود صفوان کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو اس قدر دے دیا کہ آپ پہلے میرے نزدیک مبغوض ترین خلق تھے لیکن اس فیاضی سے محبوب ترین شخص بن گئے [۵] ہند خاندان نبوت کی قدیم ترین دشمن تھی' جنگ اُحد میں قوت بازوئے اسلام حضرت حمزہؓ کا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسی نے آپ کے دل کو چاک کیا تھا' اسی نے ان کا جگر نکال کر چبایا تھا لیکن اس کو نگل نہ سکی اور پھر اگل دیا تھا اور اسی نے ان کے ناک کان کاٹ کر گلے کا ہار بنایا تھا فتح مکہ میں بھیس بدل کر آپ کی خدمت

---

[۱] صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۴۹۹ قصہ اسلام ابی ذر۔

[۲] صحیح بخاری تفسیر سورہ تبت صحیح مسلم کتاب الایمان باب عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ''۔

[۳] صحیح بخاری بدء الوحی۔

[۴] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۲۹۰ باب ماسئل رسول اللہ شیاً قط فقال لا وصحیح بخاری باب حسن الخلق والسخاء۔

[۵] صحیح مسلم باب مذکور۔

میں اسلام لانے کے لئے حاضر ہوئی تب بھی گستاخی سے باز نہیں آئی، لیکن دربار رسالت میں پہنچ کر آپ کے حسن خلق سے اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار بول پڑی یارسول اللہ! سطح زمین پر آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانا مجھے مبغوض نہ تھا لیکن آج آپ کے گھرانے سے کوئی گھرانا محبوب نہیں ہے، آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ خدا کی قسم ہمارا بھی یہی حال ہے۔ [1]

آپ پر ایک یہودی عالم کا قرض آتا تھا اس نے تقاضا کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس وقت میرے پاس کچھ نہیں'' اس نے کہا کہ ''میں تو لے ہی کے ٹلوں گا'' آپ نے کہا ''تو اب میں تمہارے ساتھ بیٹھتا ہوں'' چنانچہ آپ فجر سے لے کر ظہر کی نماز تک اس کے ساتھ بیٹھ رہے صحابہ نے اس کی اس گستاخی پر ناراضگی ظاہر کی اور خدمتِ اقدس میں عرض کی کہ ''یارسول اللہ! آپ کو ایک یہودی نے روک رکھا ہے'' آپ نے فرمایا ''ہاں لیکن مجھے خدا نے اس سے منع کیا ہے کہ میں کسی ذمی یا اور کسی شخص پر ظلم کروں'' دن چڑھا تو یہودی نے کلمہ پڑھا اور کہا کہ ''میرا نصف مال خدا کی راہ میں صدقہ ہے میں نے یہ گستاخی صرف اس لئے کی کہ توراۃ میں پیغمبر کے جو اوصاف مذکور ہیں ان کا تجربہ کروں۔'' [2]

ثمامہ بن آثال یمامہ کا ایک رئیس تھا جو اسلام کا مجرم تھا صحابہ کا ایک دستہ نجد کے اطراف میں بھیجا گیا حسن اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا گرفتار ہو کر مدینہ آیا اور مسجد نبوی کے ایک ستون میں باندھ دیا گیا آنحضرت ﷺ نماز کے لئے تشریف لائے تو اس پر نظر پڑی آپ نے دریافت کیا کہ ثمامہ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے اس نے کہا کہ ''اگر مجھے قتل کرنا چاہیں تو ایک خونی مجرم کو آپ قتل کریں گے اور اگر عفو فرمائیں گے تو یہ احسان ایک احسان شناس کی گردن پر ہوگا اگر مال کی خواہش ہے تو فرمایئے جو ارشاد ہوگا حاضر کیا جائے گا'' یہ سن کر آپ اسی حالت میں اس کو چھوڑ کر چلے گئے دوسرے دن پھر اسی قسم کا سوال و جواب ہوا تیسرے دن پھر یہی گفتگو کی، آنحضرت ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اس کے بند گرہ کھول دیئے اور رہا کر دیا۔ اس پر اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ مسجد سے نکل کر ایک کھجور کے درخت کی آڑ میں گیا اور وہاں غسل کیا اور غسل کر کے مسجد میں آیا اور کلمہ توحید پڑھ کر آنحضرت ﷺ کو مخاطب ہوا ''محمد! زمین پر آپ کے چہرے سے زیادہ کوئی چیز مجھ کو مبغوض نہ تھی لیکن آج وہ مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے مجھ کو آپ کے دین سے زیادہ کسی دین سے عداوت نہ تھی لیکن آج وہ میرے لئے تمام مذاہب سے عزیز تر ہو گیا ہے مجھے آپ کے شہر سے زیادہ کسی شہر سے دشمنی نہ تھی لیکن وہ آج مجھ کو تمام شہروں سے زیادہ خوش نما نظر آتا ہے'' [3]

ایک بار آپ کسی سفر میں تھے اور ساتھ میں مطلق پانی نہ تھا صحابہ نے پیاس کی شکایت کی آپ نے ایک صحابی کے ساتھ حضرت علیؓ کو پانی کی جستجو میں روانہ فرمایا، راہ میں ایک عورت اونٹ پر پانی کی دو مشکیں بھرے ہوئے لئے جا رہی تھی دونوں صاحب اس کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے آئے۔ آپ نے برتن منگوائے اور مشکوں کے منہ کھول دیئے صحابہؓ نے باری باری سے پینا شروع کر دیا، وہ کھڑی تماشا دیکھتی رہی، فراغت کے بعد اس کے صلہ میں آنحضرت

---

[1] مسلم جلد ۲ صفحہ ۵۵ باب قضیۂ ہند۔

[2] مشکوٰۃ ص ۵۲۱ کتاب الفتن فی اخلاقہ ﷺ۔

[3] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۶۷ کتاب الجہاد والسیر۔

ﷺ نے کھجور، آٹا اور ستو تھوڑا تھوڑا لوگوں سے جمع کر کے ایک کپڑے میں باندھ کر اس کے اونٹ پر رکھوا دیا وہ گھر پہنچی تو لوگوں نے تاخیر کا سبب پوچھا اس نے کہا راہ میں مجھ کو دو آدمی ملے اور وہ مجھ کو اس شخص کے پاس لے گئے جس کو لوگ بددین کہا کرتے ہیں، خدا کی قسم وہ یا تو اس آسمان و زمین کے درمیان سب سے بڑا جادوگر ہے یا وہ واقعی خدا کا رسول ہے۔ لیکن اسلام کا یہ اثر صرف اسی کی ذات تک محدود نہ رہا بلکہ تربیت یافتگان نبوت کے فیض اثر سے اس کے تمام قبیلے تک وسیع ہوگیا۔ [۱]

نبوت کے امتیاز و شناخت کا ذریعہ صرف اخلاق ہی کا اعجاز نہیں' اس کی زبان کا ایک ایک حرف، اس کی معصوم شکل و صورت کی ایک ایک ادا' اعجاز اور سرتاپا اعجاز ہوتی ہے

روئے و آوازِ پیمبر معجزہ است (رومی)

آپ کی صداقت سے لبریز تقریر کا ایک ایک حرف دل میں اتر جاتا تھا اور نبوت کا اصلی معیار اس کے سامنے روشن ہو جاتا تھا۔

جب آپ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو تمام مدینہ میں غل پڑ گیا' حضرت عبداللہ ؓ بن سلام جو مدینہ کے مشہور یہودی عالم تھے' اپنے نخلستان میں کھجور توڑ رہے تھے، آمد آمد کی خبر ان کے کان میں پہنچی تو فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ فرما رہے تھے ﴿ افشو السلام، واطعموا الطعام، وصلوا الارحام، وصلوا والناس نیام تدخلوا الجنة بسلام ﴾ [۲] واپس گئے تو اس قدر متاثر تھے کہ آنحضرت ﷺ اٹھ کر ابوایوب انصاری کے مکان میں جونہی پہنچے حضرت عبداللہ بن سلام ؓ بھی آئے اور کہا کہ میں آپ کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں اور نیز یہ شہادت دیتا ہوں کہ آپ ایک حق مذہب لے کر آئے ہیں۔ [۳]

ضماد ایک شخص تھے جن کے ساتھ زمانہ جاہلیت میں آپ کے دوستانہ تعلقات رہ چکے تھے' وہ جنون کا علاج کرتے تھے اتفاق سے وہ مکہ میں آئے تو کفار سے سنا کہ آپ (نعوذ باللہ) مجنوں ہوگئے وہ آپ کے پاس گئے اور کہا ''محمد! میں جنون کا علاج کرتا ہوں'' اس کے جواب میں آپ نے ایک تقریر کی اور اس کو ان الفاظ سے شروع کیا۔

﴿ الحمد للہ نحمدہ و نستعینه من یهده اللہ فلا مضل له و من یضلله فلا هادی له واشهد ان لا اله الا اللہ وحده لا شریك له واشهد ان محمّدا عبده و رسوله ﴾

تمام تعریفیں خدا کے لئے ہیں میں اس کی حمد کرتا ہوں اس سے مدد چاہتا ہوں' خدا جس کو ہدایت دیتا ہے اس کو کوئی شخص گمراہ نہیں کرسکتا' جس کو گمراہ کرتا ہے اس کو کوئی ہدایت نہیں کرسکتا' میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں' وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اس کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔

ان پر ان فقروں کا یہ اثر پڑا کہ وہ مکرر سننے کے مشتاق ہوئے آپ نے تین بار یہ کلمات اعادہ فرمائے تو انہوں نے کہا کہ میں نے کاہنوں جادوگروں اور شاعروں کا کلام سنا ہے' لیکن آپ کے اس کلام کی طرح مؤثر کبھی نہیں سنا' وہ

---

[۱] بخاری جلد ۱ صفحہ ۴۹ کتاب التیمم۔

[۲] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۴۵۔

[۳] بخاری جلد ۱ صفحہ ۵۵۶ باب ہجرۃ النبی ﷺ واصحابہ الی المدینہ۔

سمندر تک پہنچ جائے گا، ہاتھ لائیے میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں۔ [1]

حضرت حلیمہؓ کے شوہر حارثؓ یعنی آپ کے رضاعی باپ جب مکہ میں تشریف لائے تو قریش نے کہا کچھ سنا ہے کہ تمہارا بیٹا کہتا ہے کہ لوگ مر کر پھر زندہ ہوں گے، انہوں نے آپ سے کہا کہ بیٹا یہ کیا کہتے ہو؟ آپ نے نہایت زور دار لہجہ میں فرمایا ہاں اگر وہ دن آیا تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر بتادوں گا کہ جو کچھ میں کہتا تھا سچ تھا۔ ان پر اس کا یہ اثر پڑا کہ فوراً مسلمان ہو گئے اور یہ اثر اس قدر دیرپا ہوا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر میرا بیٹا ہاتھ پکڑے گا تو جنت میں پہنچا کر ہی چھوڑے گا۔ [2]

انسان کا چہرہ حقیقت کا آئینہ ہے، آپ کی ایک ایک ادا صداقت اور معصومیت کا پیکر تھی، آپؐ کی شکل نہایت پرجلال تھی، چہرہ پرنور تھا، آواز موقر اور پررعب تھی اور ان تمام چیزوں کا مجموعی اثر پیغمبرانہ اعجاز کے ساتھ دلوں کو اپنی طرف جذب کر لیتا تھا اسی اثر سے متاثر ہو کر حضرت عبداللہؓ بن سلام نو مسلم یہودی عالم آپ کے چہرۂ مبارک کو دیکھ کر بے اختیار بول اٹھے تھے۔

﴿ وجهه ليس بوجه كذاب ﴾ (ترمذی ص۴۰۹)

جھوٹے آدمی کا یہ چہرہ نہیں ہوسکتا۔

اور یہی کشش تھی جس کا اظہار حجۃ الوداع میں اعراب بادیہ کی زبان سے ان الفاظ میں ہوتا تھا

﴿ هذا وجه مبارك ﴾

یہ مبارک چہرہ ہے۔

بارگاہ نبوت میں پہنچنے کے ساتھ ہی یہ اثر آنکھوں کی راہ سے دل میں پہنچ جاتا تھا ابو رافع نام ایک شخص قریش کی طرف سے قاصد بن کر آپ ﷺ کی خدمت میں آئے تھے جوں ہی چہرۂ اقدس پر نظر پڑی وہ بہزار جان شیدا تھے، اسلام قبول کیا [3] اور آپ کی غلامی کو فخر سمجھا۔ [4]

* * *

---

[1] مسلم باب تخفیف الصلوۃ والخطبہ۔

[2] اصابہ جلد ۱ صفحہ ۲۹۶ تذکرہ حارث۔

[3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب یستجن بالامام فی العہود۔

[4] اصابہ واستیعاب۔

اسلام

یا

محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ کام

آنحضرت ﷺ جس عظیم الشان پیغام کو لے کر آئے تھے اور جس مہتم بالشان کام کو انجام دینے کے لئے دنیا میں بھیجے گئے تھے، نیک دل اور حقیقت شناس لوگ تو سننے اور دیکھنے کے ساتھ اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے وہ بھی جن کے دل کے آئینے زنگ آلود تھے، پیغام کی سچائی، وحی کی تاثیر، پیغمبر کی پُر اثر دعوت، اعجاز معصومیت اور اخلاق کے پرتو سے صاف و شفاف ہوتے گئے اور عوائق، موانع، شبہات اور شکوک کی تو بر تو ظلمتیں اور تاریکیاں رفتہ رفتہ چھٹتی چلی گئیں اور اسلام کا نور روز بروز زیادہ صفائی اور چمک کے ساتھ عرب کے افق پر درخشاں و تاباں ہوتا گیا یہاں تک کہ ۲۳ برس کی مدت میں ایک متحدہ قومیت، ایک متحدہ سلطنت، ایک متحدہ اخلاقی نظام، ایک کامل قانون اور ایک کامل شریعت، ایک ابدی مذہب اور عملی جماعت خدا پرستی، اخلاص، ایثار، دین، تقویٰ، ایمانداری، اخلاق اور سچائی کا ایک مجسم عہد یعنی ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان پیدا ہو گیا اور گویا یہی حقیقت تھی جس کی طرف آپ نے اپنی امت کے سب سے بڑے مجمع میں (حجۃ الوداع) اپنی وفات سے تقریباً دو ماہ پیشتر یہ ارشاد فرمایا۔

﴿الا ان الزمان قد استدار کھیئۃ یوم خلق اللّٰہ السمٰوٰت والارض﴾ (بخاری)

ہاں اب زمانہ کا دور اپنی اسی حالت پر آ گیا جس حالت پر اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان وزمین کو پیدا کیا۔

اور یہی حقیقت تھی جس کی نسبت آپ نے اپنی وفات سے کچھ دنوں پیشتر ایک نہایت پُر درد الوداعی تقریر کے آخر میں یہ الفاظ فرمائے۔ [1]

﴿قد ترکتم علی البیضاء لیلھا کنھارھا﴾

میں تم کو ایک روشن راستہ پر چھوڑ جاتا ہوں جس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ اس کی رات بھی دن کے مانند ہے

اور آخر حجۃ الوداع کے مجمع عام میں تکمیل کی بشارت آئی کہ

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ﴾ (مائدہ۔۳)

آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر ختم کر دی۔

پروفیسر مارگولیتھ جن کی تائیدی شہادت بہت کم مل سکتی ہے، لکھتے ہیں:

”محمد کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا، آپ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر کیا گیا تھا بنیاد ڈال چکے تھے آپ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا، آپ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔ [2]

---

[1] سنن ابن ماجہ ابواب سنن وبدعت ومستدرک حاکم جلد اول صفحہ ۹۶ مسند ابن حنبل جلد ۴ صفحہ ۱۲۶۔

[2] لائف آف محمد مارگولیوتھ صفحہ ۴۷۱۔

ایک دور (یورپ) کے بیگانہ مستشرق کی نسبت جس کا علم، عرب اور اسلام کے متعلق صرف چند کتابوں سے مستعار ہے، خود ایک عرب عیسائی اہل قلم کو فیصلہ کا زیادہ حق ہے، بیروت کے مسیحی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے، اس کے جواب میں ایک عیسائی عالم (دارو مجاعص) نے لکھا۔

"دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے دس برس[1] کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفہ، ایک نئی شریعت اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی، جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود وہ اُمّی اور ناخواندہ تھا وہ کون؟ محمد بن عبداللہ قریشی عرب اور اسلام کا پیغمبر۔ اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا اور اپنی قوم اور اپنے پیرووٴں کے لئے اور اس سلطنت کے لئے جس کو اس نے قائم کیا ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کر دیئے اس طرح کہ قرآن اور احادیث کے اندر وہ تمام ہدایات موجود ہیں جن کی ضرورت ایک مسلمان کو اس کے دینی یا دنیاوی معاملات میں پیش آ سکتی ہیں حج کا ایک سالانہ اجتماع فرض قرار دیا تا کہ اقوام اسلامی میں اہل استطاعت ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنے دینی و قومی معاملات میں باہم مشورے کر سکیں، اپنی امت پر زکوۃ فرض کر کے قوم کے غریب طبقہ کی حاجت پوری کی قرآن کی زبان کو دنیا کی دائمی اور عالم گیر زبان بنا دیا کہ وہ مسلمان اقوام کے باہمی تعارف کا ذریعہ بن جائے قوم کے ہر فرد کو ترقی کا موقع اس طرح عنایت کیا کہ یہ کہہ دیا کہ ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر صرف تقوی کی بناء پر بزرگی حاصل ہے اس بناء پر اسلام ایک حقیقی جمہوریت بن گیا جس کا رئیس قوم کی پسند سے منتخب ہوتا ہے مسلمانوں نے ایک مدت تک اس اصول پر عمل کیا۔ یہ کہہ کر کہ عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں، اسلام میں داخل ہونا ہر شخص کے لئے آسان کر دیا۔ نامسلموں کے لئے اسلامی ملکوں میں عیش و آرام اور امن و اطمینان سے سکونت کی ذمہ داری یہ کہہ کر اپنے اوپر لے لی کہ تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے تو خدا کا سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی اولاد کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے، خاندانی ازدواجی اصلاحات بھی اس کی نظر سے پوشیدہ نہ رہیں، اس نے نکاح و وراثت کے احکام مقرر کئے، عورت کا مرتبہ بلند کیا، نزاعات اور مقدمات کے فیصلہ کے قوانین بنائے، بیت المال کا نظام قائم کر کے قومی دولت کو بیکار نہ ہونے دیا علم کی اشاعت اور تعلیم اس کی کوششوں کا بڑا حصہ رہی اس نے حکمت کو ایک مومن کا گم شدہ مال قرار دیا، اسی سبب سے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے زمانہ میں ہر دروازہ سے علم حاصل کیا، کیا ان کارناموں کا انسان دنیا کی سب سے بڑی ہستی قرار نہ پائے گا"

انگلستان کا مشہور انشاء پرداز کارلائل نے اپنے "ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ" میں لاکھوں پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں میں صرف محمد عربی ﷺ ہی کے وجود گرامی کو اس قابل سمجھا کہ وہ آپ کو نبوت کا ہیرو قرار دے، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار آپ ﷺ کی نسبت کہتا ہے

"قرآن سے اس شخص کے روحانی ارتقا کا پتہ چلتا ہے جو تمام نبیوں اور مذہبی لوگوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہا"[2]

---

[1] مدینہ منورہ میں آپ دس برس زندہ رہے تھے۔

[2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدھم مضمون قرآن ج ۱۵ صفحہ ۵۹۸۔

الغرض دوست و دشمن سب کو اس کا اعتراف ہے کہ انبیاء میں یہی برگزیدہ ہستی ہے۔ جس نے کم سے کم مدت میں اپنی بعثت اور رسالت کے زیادہ سے زیادہ فرائض ادا کیئے اور اصطلاحات انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا، جس کی تکمیل اس کی تعلیم اور عمل سے نہ ہو گئی ہو اور یہ اس لئے کہ تمام انبیاءؑ میں خاتم نبوت، مکمل دین اور آخری معلم کی حیثیت آپ ﷺ ہی کو عطا ہوئی تھی اگر انسان کی عملی و اخلاقی و دینی ضرورتوں کا کوئی گوشہ آپ کے فیض سے محروم رہ کر تکمیل کا محتاج ہوتا تو آپ کے بعد بھی کسی آنے والے کی حاجت باقی رہ جاتی حالانکہ آپ نے فرما دیا کہ ''میرے بعد کوئی نبی نہیں میں نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ ہوں۔''[1]

آپ کی تعلیمات کی یہی ہمہ گیری ہے جس پر کوتاہ بینوں کو آج نہیں بلکہ خود صحابہؓ کے عہد میں بھی تعجب آتا تھا، بعض مشرکوں نے حضرت سلمان فارسیؓ سے مذاقاً کہا کہ تمہارے پیغمبر تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں یہاں تک کہ اس کی بھی کہ تم کو قضائے حاجت کیونکر کرنی چاہیے حضرت سلمانؓ نے کہا ہاں یہ سچ ہے آپ نے ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم ایسی حالت میں قبلہ رخ نہ بیٹھیں اور اپنے داہنے ہاتھ سے طہارت نہ کریں اور نہ تین ڈھیلوں سے کم استعمال کریں، جن میں کوئی ہڈی اور گوبر نہ ہو[2] نبوت محمدی کی تعلیمات کی یہ ہمہ گیری ہی اس کی تکمیل کی دلیل ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پست سے پست اور غیر متمدن اقوام سے لے کر بلند سے بلند اور متمدن سے متمدن قوموں تک کے لئے یکساں تعلیمات اور ہدایات رکھتی ہے، عرب کے بدوؤں اور قریش کے رئیسوں دونوں کے لئے آپ کی بعثت تھی، اس لئے آپ کی تعلیمات میں پست کو بلند اور بلند کو بلند تر بنانے کی برابر ہدایات ہیں، آج یہی چیز ہے کہ افریقہ کے وحشیوں میں اسلام اپنی تعلیمات کے ساتھ تنہا جاتا ہے اور ان کو متمدن اور مہذب بنانے کے لئے باہر سے کسی مذہب کی تعلیم کی اس کو ضرورت پیش نہیں آتی لیکن عیسوی مذہب کو چند اخلاقیات چھوڑ کر کہ جن کا ماخذ انجیل ہے، عقائد پادریوں کی کونسلوں سے دعائیں اور عبادات کلیساؤں کے حکمرانوں سے اور تہذیب و تمدن کی تعلیمات یورپ کے بے دینوں اور ملحدوں سے حاصل کرنی پڑتی ہیں لیکن اسلام میں محمد رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کچھ نہیں، عقائد ہوں کہ عبادات اور دعائیں، اخلاق ہوں کہ آداب تمدن، خانگی معاملات ہوں یا لین دین کا کاروبار، انسانوں کے ساتھ معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ، سب کا ماخذ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی ہمہ گیر تعلیمات ہیں۔

آپ کی ان ہمہ گیر تعلیمات کی کتاب جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے چار ابواب پر منقسم ہے اور انہیں کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

آپ نے بتایا کہ ہر انسان کا ایک تعلق تو اپنے خالق کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے خالق کی دوسری مخلوقات کے ساتھ۔ اسی مفہوم کو دوسری عبارت میں یوں کہو کہ اس کا ایک تعلق اپنے آقا اور مالک کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے آقا اور مالک کے غلاموں کے ساتھ یا یوں کہو کہ اس کا ایک رخ تو آسمان کی طرف ہے اور دوسرا زمین کی سمت، اس کو ایک لگاؤ تو عالم غیب سے ہے اور دوسرا عالم شہود سے، پہلے کے ساتھ اس کا تعلق ایک مہربان آقا اور فرمانبردار غلام کا ہے اور دوسروں

---

[1] صحیح بخاری جلد اول باب خاتم النبیین و جامع ترمذی کتاب الامثال۔

[2] جامع ترمذی و سنن ابن ماجہ کتاب الطہارت۔

کے ساتھ اس کا تعلق برادری اور بھائی چارے کا ہے' خالق اور مخلوق یا خدا اور بندہ کے درمیان جو علاقہ اور رابطہ ہے اس کا تعلق اگر صرف ہمارے ذہنی قویٰ اور قلبی حالات سے ہے، تو اس کا نام عقیدہ ہے، اور اگر ان قلبی حالات کے ساتھ ہمارے جسم و جان اور مال و جائداد سے بھی ہے تو اس کا نام عبادت ہے' باہم انسانوں اور انسانوں میں یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ و رابطہ ہے اس کی حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہیں اگر ان کی حیثیت محض قانون کی ہے، تو اس کا نام معاملہ ہے اور اگر ان کی حیثیت قانون کی نہیں بلکہ روحانی نصیحتوں اور برادرانہ ہدایتوں کی ہے تو اس کا نام اخلاق ہے۔

قرآن پاک کی اصطلاح میں پہلے تعلقات کی مضبوطی اور استحکام کا نام ایمان ہے اور دوسرے تیسرے اور چوتھے کی بجا آوری کا نام عمل صالح ہے اور انہیں دونوں کے مجموعہ پر کامل نجات کا انحصار ہے عمل صالح کی تین قسمیں ہیں خدا کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار اور اس کے احکام کی تعمیل' بندوں کے ساتھ کاروبار اور معاملہ میں قانون الٰہی کی پابندی اور ان کے ساتھ محبت الفت اور نیکی اور بھلائی کا برتاؤ اور گو اس لحاظ سے کہ ان میں سے ہر ایک عمل کو جس میں خدا کی خوشنودی اور رضامندی مقصود ہو اسلام عبادت کہتا ہے' لیکن اصطلاح میں پہلے کا نام عبادات، اور دوسرے کا نام معاملات، اور تیسرے کا نام اخلاق ہے۔ الغرض محمد رسول اللہ ﷺ جو عالمگیر شریعت اور دائمی ہدایت لے کر آئے وہ انہیں چاروں عنوانوں کا مجموعہ ہے' یعنی عقائد' عبادات' معاملات اور اخلاق۔ ان ہی کی اصلاح، تعلیم اور تکمیل کے لئے آپ کی بعثت ہوئی اور یہی آپ کے پیغمبرانہ فرائض کے اصلی کارنامے ہیں۔

* * *

عقائد

عقائد کی حقیقت اور اہمیت: انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں، یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں، یہ عام خیالات اور حقیقت اس کے چند پختہ غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں، ان ہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں، یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرہ حیات کا ہر خط اسی پر جا کر ختم ہوتا ہے ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادہ کے تابع ہیں، ہمارے ارادہ کا محرک ہمارے خیالات اور جذبات ہیں اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں، عام بول چال میں انہیں چیزوں کی تعبیر ہم "دل" کے لفظ سے کرتے ہیں، اسلام کے معلم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے، فرمایا

﴿الا وان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وھی القلب﴾ (صحیح بخاری کتاب الایمان)

انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا، خبردار کہ وہ ٹکڑا دل ہے۔

قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں، سب سے پہلے ﴿قَلْبٌ سَلِيْمٌ﴾ (سلامت دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے، دوسرا اس کے مقابل ﴿قَلْبٌ اٰثِمٌ﴾ (گنہگار دل) یہ وہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے اور تیسرا ﴿قَلْبٌ مُّنِيْبٌ﴾ (رجوع ہونے والا دل) یہ وہ ہے جو اگر کبھی بھٹکتا ہے اور بے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہوتا ہے غرض یہ سب نیرنگیاں اسی ایک بیرنگ ہستی کی ہیں جس کا نام دل ہے ہمارے اعمال کا ہر محرک ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے، اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿انما الاعمال بالنیات﴾ (صحیح بخاری آغاز کتاب)

تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے

اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں آپ نے یوں ادا فرمایا

﴿انما لامرئ مانوی فمن کانت ھجرته الی دنیا یصیبھا او الی امرأة ینکحھا فھجرته الی ماھاجر الیه﴾ (صحیح بخاری آغاز کتاب)

ہر شخص کے کام کا ثمرہ وہی ہے جس کی وہ نیت کرے تو جس کی ہجرت کی غرض دنیا کا حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنا ہے تو اس کی ہجرت اسی کے لئے ہے جس کے لئے اس نے ہجرت کی یعنی اس سے اس کو ثواب حاصل نہ ہوگا۔

آج کل علم نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بداہۃً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لئے اس کی قلبی اور دماغی صلاح مقدم ہے اور انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے اب صحیح اور صالح عمل کے لئے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل

عقیدہ بن جائے اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت ہیں ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔

جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کے مانے بغیر نہ بن سکتی ہے نہ ثابت ہو سکتی ہے اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح و درست نہیں ہو سکتا ہے جب تک اس کے لئے بھی چند مبادی اور چند اصول موضوعہ ہم پہلے تسلیم نہ کر لیں۔

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لئے ہم کو رہنما نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس لئے پابہ زنجیر عقل کے ذریعہ ہم کو اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے اگر پا سکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعہ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ عمل صالح کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کرنے کے قابل نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادہ اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے جس پر حسن عمل کا دارومدار ہے۔ عبداللہ بن جدعان ایک قریشی تھا جس نے جاہلیت میں بہت سے نیکی کے کام کئے تھے مگر بایں ہمہ مشرک تھا اس کی نسبت آنحضرت ﷺ سے حضرت عائشہؓ نے ایک دفعہ دریافت کیا کہ ”یارسول اللہ ﷺ عبداللہ بن جدعان نے جاہلیت میں جو نیکی کے کام کئے ان کا ثواب اس کو ملے گا“ فرمایا ”نہیں اے عائشہؓ! کیونکہ کسی دن اس نے یہ نہیں کہا کہ بار الہا! میرے گناہوں کو قیامت میں بخش دے“ [1]

بدر کی لڑائی کے موقع پر ایک مشرک نے جس کی بہادری کی دھوم تھی حاضر ہو کر کہا کہ ”اے محمد میں بھی تمہاری طرف سے لڑنے کے لئے چلنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے“ فرمایا ”کیا تم اللہ عزوجل اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہو“ اس نے جواب دیا ”نہیں“ فرمایا ”واپس جاؤ کہ میں اہل شرک سے مدد کا خواستگار نہیں“ دوسری دفعہ وہ پھر آیا اور وہی پہلی درخواست پیش کی مسلمانوں کو اس کی شجاعت و بہادری کی وجہ سے اس کی اس درخواست سے بڑی خوشی ہوئی اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ وہ ان کی فوج میں شریک ہو جائے لیکن آنحضرت ﷺ نے اس سے پھر وہی سوال کیا کہ ”کیا تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر ایمان ہے“ اس نے پھر نفی میں جواب دیا آنحضرت ﷺ نے پھر وہی فرمایا کہ میں کسی مشرک سے مدد نہ لوں گا غالباً مسلمانوں کی تعداد کی کمی اور اس کی بہادری کے باوجود اس سے آپ کی بے نیازی کی کیفیت نے اس کے دل پر اثر کیا تیسری دفعہ جب اس نے اپنی درخواست پیش کی اور آپ نے دریافت فرمایا کہ تم کو خدا اور رسول پر ایمان ہے تو اس نے اثبات میں جواب دیا اور نور اسلام سے منور ہو کر لڑائی کی صف میں داخل ہوا [2]

قرآن پاک نے ان لوگوں کے کارناموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں اس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا۔ اسی طرح اس شخص کے کام بھی جو ایمان سے محروم ہے بے بنیاد اور بے اصل ہیں۔

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴾ (ابراہیم۔ ۱۸)

---

[1] یہ مصنف ابن ابی شیبہ، غزوات، نسخہ قلمی دار المصنفین، و ابن حنبل جلد ۶ صفحہ نمبر ۱۴۹، مصر۔

[2] صحیح مسلم باب غزوات، جلد دوم، ص ۱۰۶، مصر۔

جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا، ان کے کاموں کی مثال اس راکھ کی ہے جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے، یہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔

سورۂ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے کہ اس کے وجود کی حقیقت فریب نظر سے زیادہ نہیں۔

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءًؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا ﴾ (نور ۳۹)

جنہوں نے خدا کا انکار کیا ان کے کام اس سراب کی طرح ہیں جو میدان میں ہو، جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہاں کسی چیز کا وجود اس کو نظر نہ آئے۔

اس کی ایک اور مثال ایسی سخت تاریکی کی دی گئی ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا اور جس میں ہوش و حواس اور اعضاء کی سلامتی کے باوجود ان سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہے۔

﴿ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِىْ بَحْرٍ لُّجِّىٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍؕ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰهَاؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾ (نور)

یا ان کے کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گہرے سمندر میں سخت اندھیرا ہو، اس کے اوپر موج اور موج پر پھر موج ہے اور اس کے اوپر بادل گھرا ہو۔ اندھیرے میں ایک کے اوپر ایک کہ اس میں ہاتھ نکالے تو وہ بھی سوجھائی نہ دے، جس کو خدا نے نور نہ دیا اس کے لئے نور نہیں۔

الغرض ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند اور صحیح تخیل پر قائم نہیں ہو سکتی، اس لئے ریا، نمائش اور خود غرضی کے کاموں کو کوئی عزت نہیں دی جا سکتی، وہ کام گو بظاہر نیک ہوں لیکن نیکی کرنے والے کا ان سے اصلی مقصد نام و نمود پیدا کرنا ہوتا ہے، اخلاقی نقطہ نظر سے تمام دنیا ان کو بے وقعت اور ہیچ سمجھتی ہے اس بناء پر آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا اور فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِىْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًاؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَىْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْاؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ (بقرہ۔۲۶۴)

اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو احسان رکھ کر اور دکھ دے کر اس طرح نہ برباد کرو جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھانے کے لئے اپنے مال خرچ کرتا ہے اور خدا پر (جو نیکیوں کی جزا دیتا ہے) اور قیامت پر (جس میں نیکیوں کی جزا ملے گی) یقین نہیں کرتا پس اس کی خیرات کی مثال اس چٹان جیسی ہے جس پر کچھ مٹی پڑی ہو اور اس پر پانی برسا تو مٹی ڈھل گئی اور پتھر رہ گیا جس پر جو کچھ بویا جائے گا وہ اگے گا نہیں۔ اور خدا کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

غرض ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے وہ ہماری سیرابی کا اصل سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی کیونکہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں

مگر روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ' خدا کے وجود کا اقرار اور اس کی رضا مندی کا حصول ہمارے اعمال کی غرض و غایت ہے' یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں' وہ ہمارے دل کا نور ہے' وہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک نظر آئے' اور ہمارے تمام کاموں کی بنیاد ریا' نمائش' جاہ پسندی خود غرضی اور شہرت طلبی وغیرہ کے دلی جذبات اور پست محرکات کے سوا کچھ اور نہ رہ جائے۔

توراۃ میں بعض عقیدوں کا ذکر ہے' مگر ایمان کی حقیقت اور اسکی اہمیت کی تعلیم سے وہ خالی ہے انجیل میں ایمان کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے' مگر اخلاق کی سچائی' اعمال کی راستی اور دل کے اخلاص کے لئے نہیں' بلکہ معجزوں اور کرامتوں کے ظاہر کرنے کیلئے اور خوارق عادت پر قدرت اور اختیار پانے کیلئے [۱] اس کے برخلاف فلسفہ یونان کے بہت سے پیرووں اور ہندوستان کے بہت سے مذہبوں نے محض ذہنی جولانی' مراقبہ' تصور' دھیان اور علم کو انسان کی نجات کا ذریعہ قرار دیا اور اخلاق و عمل سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ عیسائیوں زردشتیوں اور برہموں نے عقائد کو یہ وسعت دی اور انکی ایسی تفصیل کی کہ وہ سرتاپا خیالی فلسفہ بن گئے' جن سے انسانوں کے قوائے عملی سرد ہو گئے اور انکی تصوریت ان کی عملیت پر غالب آ گئی اور انسانوں کے قوائے عمل سرد ہو گئے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے علم و عمل' تصور اور فعل، عقلیت اور عملیت میں لزوم ثابت کیا' مگر اصلی زور انسان کی عملیت پر صرف کیا اور عقائد کے اتنے ہی حصہ کا یقین و اقرار ضروری قرار دیا' جو دل کی اصلاح کرے اور عمل کی بنیاد اور اخلاق و عبادات کی اساس قرار پا سکے' عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ اور تصورات اور نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا' چند سیدھے سادے اصول جو تمام ذہنی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں' ان کا نام عقیدہ اور ان پر یقین کرنے کا نام ایمان رکھا' آپ نے صریح الفاظ میں عقائد کے صرف پانچ اصول تلقین کئے' اللہ پر ایمان، اللہ کے فرشتوں پر ایمان' اللہ کے رسولوں پر ایمان، اللہ کی کتابوں پر ایمان اور اعمال جزا و سزا کے دن پر ایمان۔

یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا ضروری ہے' ان کے بغیر خالص عمل کا وجود نہیں ہو سکتا' اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ وہ اس دنیا کا تنہا خالق اور مالک ہے' اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے' تاکہ وہی ہمارے تمام کاموں کا قبلہ مقصود قرار پا سکے اور اسی کی رضا جوئی اور اس کی مرضی کی تکمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض و غایت ہو اور ہم جلوت کے سوا خلوت میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں' اور نیکی کو اس لئے کریں اور ہر برائی سے اس لئے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اسکی مرضی ہے اس طرح ہمارے اعمال ناپاک اغراض اور ناجائز خواہشوں سے مبرا ہو کر خالص ہو سکیں اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضا گناہوں سے پاک ہوں ہمارا دل بھی ناپاک خیالات اور ہوا و ہوس کی آمیزش سے پاک ہو اور اس کے احکام اور اس کے پیغمبر کی سچائی پر ایسا دل سے یقین ہو کہ ہمارے جذبات ہمارے غلط استدلال ہماری گمراہ خواہشیں بھی اس یقین میں شک اور تذبذب پیدا نہ کر سکیں۔

خدا کے رسولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے ان احکام اور ہدایات اور اسکی مرضی کا علم انہیں کے واسطہ سے انسانوں کو پہنچا ہے اگر ان کی صداقت سچائی اور راستبازی کو کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغام ربانی اور احکام الٰہی کی

---

[۱] متی ۱۷۔۲۰۔

صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جائے اور انسانوں کے سامنے نیکی نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے‘ جو انسانوں کے قوائے عملی کی تحریک کا باعث بن سکے‘ پھر اچھے اور برے صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری رہنمائی کیلئے نہیں ہوگی۔

خدا کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں اور جو مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں اور مخلوقات کو قانون الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں اور ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لحظہ محفوظ کرتے جاتے ہیں تاکہ ہم کو ان کا اچھا یا بُرا معاوضہ مل سکے۔

خدا کے احکام و ہدایات جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے گئے ان کو دور دراز ملکوں اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لئے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکل اور کتابوں اور صحیفوں کی صورت میں یا لفظ و آواز سے مرکب ہو کر ہمارے سینوں میں محفوظ رہیں اس لئے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہو اس کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ورنہ رسولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے کا ذریعہ مسدود ہو جائے اور ہمارے لئے نیکی و بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے‘ جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ‘ جاہل و عالم‘ بادشاہ اور رعایا سب متفق ہو سکیں۔

اعمال کی باز پرس اور جوابدہی کا خطرہ نہ ہو اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیائے انسانیت سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے‘ یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت و خلوت میں ان کی ذمہ داری کو محسوس کراتا ہے اس لئے روز جزا اور یوم آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے اور اسی لئے محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس پر بے حد زور دیا ہے بلکہ مکی وحی کی تلقین کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے۔

یہی پانچ باتیں اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہیں‘ یعنی اللہ تعالیٰ پر، اس کے تمام رسولوں پر، اسکی کتابوں اور اس کے فرشتوں پر اور روز جزا پر ایمان لانا‘ یہ عقائد خمسہ یکجا طور پر سورۂ بقرہ میں متعدد دفعہ کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان ہوئے ہیں۔

﴿ اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ...... وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ﴾ (بقرہ)

جو لوگ غیب (خدا) خدا کی صفات اور ملائکہ پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم پر اے محمد اترا اور تم سے پہلے پیغمبروں پر اترا اس پر یقین رکھتے ہیں یعنی انبیاءؑ اور ان کی کتابوں پر۔

﴿ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴾ (بقرہ)

اور آخرت (روز جزا) پر یقین رکھتے ہیں۔

یہ تو سورہ کے آغاز کی آیتیں ہیں سورہ کے بیچ میں پھر ارشاد ہوا

﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ﴾ (بقرہ۔۱۷۷)

لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص خدا پر آخری دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لائے۔

سورہ کے آخر میں ہے۔

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ

وَرُسُلِہٖ﴾ (بقرہ۔۲۸۵)

پیغمبر پر جو کچھ اتارا گیا اس پر وہ خود اور تمام مومن ایمان لائے، سب اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔

سورۂ نساء میں انہیں عقائد کی تعلیم ہے۔

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا ۢ بَعِیْدًا﴾ (نساء۔)

اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو! ایمان لاؤ اللہ پر! اور اس کے رسول پر! اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری اور جو شخص اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے پیغمبروں کا اور روز آخرت کا انکار کرے گا وہ سخت گمراہ ہوا۔

* * *

اللہ تعالیٰ پر ایمان

اٰمَنَ بِاللّٰہِ

ایک قادر مطلق اور بہمہ صفت موصوف ہستی پر یقین‘ اور اس کو ایک جاننا تعلیم محمدی کی پہلی ابجد ہے‘ اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے باوجود اس کے کہ اللہ کی توحید اور صفات پر ایمان رکھنا ان کے اصول میں بھی داخل تھا مگر ان کی تعلیمات میں ترتیب مفقود تھی اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی نگاہ میں توحید کا مسئلہ اہمیت کے کس درجہ پر ہے آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے اس مسئلہ کی اصلی اہمیت محسوس کی اور اس کو اپنے نصاب درس کا پہلا سبق اور معارف و حقائق اور جسمانی اعمال و اخلاق کا سربنیاد قرار دیا۔ اللہ اگر چاہے تو انسان کے تمام گناہوں سے درگذر کر سکتا ہے‘ مگر اسی ایک حقیقت سے انکار وہ جرم ہے جس کو وہ کبھی معاف نہ فرمائے گا۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ (نساء)

یقیناً خدا شرک کو معاف نہ کرے گا اور اس کے سوا جس کے جو گناہ چاہے معاف کر دے

پھر اس کے ساتھ خالص توحید کا بیان‘ اسماء و صفات کی تشریح‘ شرک کے ہر پہلو کی نفی اور توحید کے ہر پہلو کی تکمیل، تعلیم محمدی کی امتیازی شان ہے معلوم ہو چکا ہے کہ نبوت محمدیہ کی غرض و غایت صرف تخیل، نظریہ آرائی اور الٰہیاتی فلسفہ نہ تھا‘ بلکہ ایک زندہ قوم‘ جہد وجہد اور عمل والی قوم‘ اخلاص و ایثار اور نیکی و تقویٰ والی قوم پیدا کرنا تھا اس کو تمام دنیا کی پیشوائی کے لئے نمونہ عمل بنانا تھا اس لئے سب سے پہلے اہل عرب کو جو اس کے مخاطب اول تھے رموز و اسرار توحید کا اس طرح حامل بنانا تھا کہ ان کے رگ و ریشہ میں ولولہ اور جوش کا ایک نشہ پیدا ہو جائے اس کے لئے ضرورت تھی کہ سب سے پہلے زمین کو ہموار کیا جائے شرک کے وہ تمام عقائد جو عربوں میں پھیلے ہوئے تھے ان کو مٹا دیا جائے اور جن وجوہ اور اسباب سے شرک کے یہ عقائد پیدا ہوتے ہیں ان کی بیخ کنی کی جائے۔

اصلاح عقائد:

معلوم ہو چکا ہے کہ عرب میں جہالت اور وحشت کی وجہ سے سینکڑوں غلط عقائد اور توہمات پھیل گئے تھے اور دنیا کے دوسرے مذاہب کے عقائد میں بھی بہت سی غلطیاں داخل ہو گئی تھیں، ان میں سب سے زیادہ بدتر اور تمام برائیوں کا اصلی محور شرک تھا‘ اس لئے سب سے پہلے آنحضرت ﷺ نے اس کی اصلاح سے آغاز کیا۔

شرک اور بت پرستی کا اصلی زینہ اسباب و موثرات کا وجود ہے‘ خدا نے عالم میں ایک سلسلہ اسباب قائم کر دیا ہے اور عالم کے تمام واقعات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں‘ لیکن یہ تمام سلسلہ ایک قادر مطلق کے دست قدرت میں ہے اور اس سلسلہ کی ایک کڑی بھی اس کے اشارہ کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی‘ شرک اس طرح شروع ہوتا ہے کہ پہلے انسان ان اسباب و علل میں سے بعض نمایاں اور قوی الاثر اسباب سے متاثر ہوتا ہے‘ اجرام فلکی کی عظمت، آفتاب و ماہتاب کی نور افشانی، سمندر کا پرزور تلاطم‘ عناصر کی نیرنگ آرائیاں‘ انسان کو مبہوت کر دیتی ہیں‘ وہ ان کی عظمت و تاثیر سے متاثر‘ پھر منفعل اور بالآخر ان کا غلام بن جاتا ہے‘ اعتقاد کے پہلے مرحلہ میں انسان غور رسی کے دعویٰ سے اس قدر امتیاز اور تفریق کرتا ہے کہ یہ

چیزیں خود خدا یا معبود نہیں ہیں، لیکن یہ تمیز آخر تک قائم نہیں رہتی بلکہ رفتہ رفتہ خوش اعتقادی کا اثر غالب آتا جاتا ہے، اور یہ چیزیں خدا کی شریک بنتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ اصلی مسبب الاسباب نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتا ہے۔

شرک کی جو گوناگوں صورتیں دنیا میں موجود تھیں اور جس طرح آنحضرت ﷺ نے ان کا استیصال کیا ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ دنیا کی مشہور قوموں میں سے عیسائی اور مجوسی علانیہ مشرک تھے یعنی تین اور دو خدا مانتے تھے، ہندو بھی اسی کے قریب تھے، ان مذہبوں کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ خدا کے جو مختلف نمایاں اور اہم اوصاف ہیں، ان کا مستقل اور مجسم وجود قائم ہو گیا، مثلاً صفتِ خلق اور احیاء و امانت برہما بشن مہیش کے نام سے موسوم ہیں، مجوسیوں نے دیکھا کہ دنیا میں جس قدر اشیاء اور افعال و حرکات ہیں سب باہم متضاد ہیں نور و ظلمت، پستی و بلندی، یمین و شمال، نرم و سخت، رات دن، خیر و شر، حلم و غضب، غرور و خاکساری، فسق و صلاح کوئی چیز مقابلہ اور تضادات سے خالی نہیں، اس لئے ایسے دو متضاد عالم کا خالق ایک نہیں ہو سکتا، اس بنا پر انہوں نے دو خدا تسلیم کئے اور ان کا نام یزداں اور اہرمن یا نور و ظلمت رکھا۔

قرآن مجید میں تمام احکام نہایت تدریج کے ساتھ نازل ہوئے ہیں، یہاں تک کہ ۱۳ برس کی وسیع مدت تک روزہ، زکوۃ اور حج کچھ فرض نہیں ہوا تھا لیکن شرک کا استیصال کلی نبوت کا پہلا سبق تھا۔

سورۂ زمر مکہ میں نازل ہوئی اور اسی سورہ میں شرک کی تمام صورتیں مٹا دی گئیں، تمام دیگر سورتوں میں نہایت کثرت سے اس قسم کے شرک کا ابطال اور رد کیا ہے، اس لئے ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

مجوسیوں کے شرک کی بنیاد اس پر تھی کہ افعالِ خیر و شر کا ایک خالق نہیں ہو سکتا ورنہ لازم آئے گا کہ خدا شر کو پیدا کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص برائی کے پیدا ہونے کو جائز رکھتا ہے وہ خود اچھا نہیں ہو سکتا، اس لئے قرآن مجید میں نہایت کثرت سے تصریحات آئیں کہ جن کو ہم خیر و شر کہتے ہیں سب کا فاعل خدا ہے، آنحضرت ﷺ نے نہایت تصریح و تاکید کے ساتھ تعلیم کی کہ جو کچھ ہوتا ہے، سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے، باقی یہ مسئلہ کہ بری چیز کا خالق اچھا نہیں ہو سکتا، اولاً تو یہ مغالطہ آمیز غلطی ہے، ایک صناع مصور اگر ایک نہایت مکروہ جانور کی تصویر نہایت اچھی کھینچے تو اس کے کمال مصوری میں اس سے کچھ داغ نہیں آئے گا کہ جانور خود برا ہے، دوسرے یہ کہ اسلام نے اس مسئلہ کی جس اصلی گرہ کو کھولا ہے وہ یہ ہے کہ اشیاء بذاتہٖ خیر و شر نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے صحیح یا غلط طریقہ استعمال سے خیر یا شر ہو جاتی ہیں، آگ بجائے خود نہ خیر ہے نہ شر، اگر اس سے اچھا کام لیا جائے تو خیر ہے، اور برا لیا جائے تو شر ہے، زہر نہ اچھا ہے نہ برا، اگر اس کو بیماریوں کے استیصال میں استعمال کیا جائے تو خیر ہے اور کسی بے گناہ کے قتل میں استعمال کرو تو شر ہے، اسی طرح دوسری اشیاء کے بھی خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں، نہ کوئی شے دنیا میں خیرِ مطلق ہے نہ کوئی شرِ محض، اسی لئے قرآن نے شر کی نسبت خدا کی طرف نہیں کی ہے، بلکہ خود انسان کی طرف کی ہے۔

﴿ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ﴾ (جن)

آیا اہل زمین کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے پروردگار نے ان کو راہ پر لانا چاہا ہے۔

﴿ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ﴾ (نساء)

تجھ کو جو نیکی پہنچی تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو مصیبت پہنچی وہ خود تیری طرف سے ہے۔

﴿ اَوَ لَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ط قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ (آل عمران)

کیا جب تم کو کوئی مصیبت پہنچی جس کی دوگنی تم ان کو پہنچا چکے ہو تو تم نے کہا یہ کہاں سے آئی کہہ دے کہ خود تمہاری طرف سے ہے خدا ہر بات پر قدرت رکھتا ہے۔

الغرض کسی شے کا ایسا پیدا کرنا جس میں خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں، شر نہیں ہے ان میں اس کے شر کے پہلو کو استعمال کرنا اور کام میں لانا شر ہے، ڈاکٹر بہت سی بیماریوں کے لئے زہریلی دوائیں بناتے ہیں مگر یہ شر نہیں البتہ جو کوئی شریر ان دواؤں سے ان امراض کے ازالہ کے بجائے کسی کی جان لے لیتا ہے تو وہ شر ہے۔ حاصل یہ کہ اس دنیا میں جب خیر و شر اشیاء میں بذاتہ نہیں ہے تو اچھی چیزوں کے لیے الگ اور بُری چیزوں کے لئے الگ خالق تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خالق ایک ہی ہے دو نہیں۔

﴿ وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْآ اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ج اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ج فَاِيَّاىَ فَارْهَبُوْنَ ۞ وَلَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (نحل۔۵۲۔۵۱)

اور خدا نے کہا کہ دو خدا نہ بناؤ، وہ ایک ہی خدا ہے، تو مجھی سے ڈرو اور اس کے لئے ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔

بزرگوں کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا:

(۲) شرک کا بہت بڑا ذریعہ کسی خاص شخص یا کسی شے کی تعظیم مفرط ہے جس کو شخص پرستی یا یادگار پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں حضرت عیسیٰؑ، رام چندر کرشن کو اسی خوش اعتقادی نے آدمی سے خدا بنا دیا اس بناء پر قرآن مجید میں نہایت پر زور اور پر رعب الفاظ میں شخص پرستی کی تحقیر کی گئی۔

﴿ يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ط اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﴾ (نساء۔۱۷۲)

اے اہل کتاب اپنے دین میں حد سے زیادہ نہ بڑھ جاؤ، اور خدا کی نسبت وہی کہو جو حق ہے، مسیح یعنی عیسیٰ بن مریم صرف خدا کے پیغمبر ہیں۔

﴿ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۞ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴾ (نساء)

مسیح کو خدا کا بندہ ہونے سے ہرگز عار نہیں اور نہ مقرب فرشتوں کو (عار ہے) اور جس شخص کو خدا کی بندگی سے عار ہوگا اور بڑائی کی لے گا تو خدا سب کو عنقریب اپنے حضور میں بلائے گا۔

﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ط قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ط وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ط يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ (مائدہ)

وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ عیسٰی بن مریم خدا ہے کہہ دو کہ اگر خدا یہ چاہے کہ مسیح بن مریم کو اس کی ماں کو اور دنیا میں جو کچھ ہے سب کو برباد کر دے تو کون ہے جو خدا کو روک لے خدا ہی کے لئے آسمان و زمین اور جو چیزیں ان دونوں میں ہیں ان کی حکومت ہے اور خدا تمام چیزوں پر قادر ہے۔

﴿ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِىْ وَاُمِّىَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِىْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِىْ بِحَقٍّ ط اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِىْ نَفْسِىْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِىْ نَفْسِكَ ط اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِىْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبَّكُمْ ﴾ (مائدہ۔۱۱۷۔۱۱۶)

اور جب خدا کہے گا کہ کیوں عیسٰیؑ! تم نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا کہو عیسٰی عرض کریں گے کہ سبحان اللہ میری یہ مجال ہے کہ میں کوئی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھ کو حق نہیں اگر میں نے کہا ہوگا کہ تو' تو جانتا ہوگا تو میرے دل کی بات جانتا ہے اور میں تیرے دل کی بات نہیں جانتا' تو بڑا غیب دان ہے میں نے لوگوں سے صرف وہی کہا تھا جس کا حکم تو نے مجھ کو دیا تھا یعنی یہ کہ خدا کی عبادت کرو جو میرا بھی خدا ہے اور تمہارا بھی۔

آنحضرت ﷺ باوجود اس کے کہ حاصل کون و مکاں تھے لیکن بار بار قرآن مجید میں تاکید آتی تھی۔

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَىَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ (کہف)

کہہ دے اے پیغمبر کہ میں تو تمہاری ہی طرح آدمی ہوں' لیکن یہ کہ میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے۔

ایک خاص نکتہ غور کے قابل ہے جس قدر جلیل القدر انبیاء علیہم السلام گذرے ہیں ان کے خاص خاص لقب ہیں مثلاً حضرت موسٰیؑ کلیم اللہ تھے' حضرت ابراہیمؑ کا لقب خلیل اللہ تھا' حضرت عیسٰی روح اللہ تھے، لیکن آنحضرت ﷺ باوجود اس کے کہ اشرف انبیاء تھے، آپ نے کیا لقب پسند کیا؟ اور کلمہ توحید میں، نماز میں، درود میں آنحضرت ﷺ کے اسم گرامی کے ساتھ کیا امتیازی وصف شامل کیا گیا؟ صرف رسالت اور عبدیت!

﴿ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ﴾

میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد خدا کے بندے اور رسول ہیں۔

اس میں بھی عبدیت کا وصف رسالت پر مقدم ہے آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ بعض کفار کے حق میں دعائے بد کی۔ اس پر یہ آیت اتری۔ [۱]

﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَىْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾ (آل عمران۔۱۳)

تم کو کچھ اختیار نہیں ہے خدا چاہے گا تو ان پر توجہ کرے گا یا ان کو عذاب دے گا کہ وہ ظالم ہیں۔

آنحضرت ﷺ بعض کفار کی ہدایت پانے اور اسلام کے قبول کرنے کے نہایت خواہش مند تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ ﴾ (قصص)

---

[۱] صحیح بخاری غزوہ احد' یہ حدیث صحیح بخاری کے مختلف ابواب میں مذکور ہے۔

تم جس کو چاہتے ہو اس کو ہدایت نہیں دے سکتے۔

آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن ابی کے لئے دعائے مغفرت کی اس پر قرآن مجید میں آیا۔ [1]

﴿ اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ؕ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ﴾ (توبہ)

تم ان کے لئے مغفرت چاہو یا نہ چاہو اگر تم ان کے لئے ستر دفعہ بھی مغفرت چاہو گے تو خدا ان کی مغفرت نہ کرے گا

آنحضرت ﷺ ہمیشہ ہر موقع پر اس امر کی تاکید اور اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ لوگ آپ کی زائد از اعتدال مدح نہ کریں جو منجر ہو کر شرک تک پہنچ جائے۔ بار بار فرماتے تھے۔

﴿ لا تطرونی کما اطری الیهود والنصاری ﴾ [2]

میری شان میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جس طرح یہود و نصاری نے اپنے پیغمبروں کی شان میں کیا۔

ایک دفعہ آپ ﷺ راستہ میں جا رہے تھے ایک شخص نے دفعتہ آپ کو دیکھا اور اس پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا آپ نے فرمایا ڈرو نہیں میں ایک قریشی خاتون کا بیٹا ہوں جو گوشت کو خشک کر کے کھایا کرتی تھی۔ [3]

بنو عامر کا وفد جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ آپ ہمارے سید (آقا) ہیں آپ نے فرمایا سید خدا ہے' لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہم سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں آپ نے فرمایا اچھا یہ کہو' لیکن دیکھو تم کو شیطان اپنا وکیل نہ بنا لے [4] اصلی الفاظ یہ ہیں۔

﴿ قولو بقولکم ولا یستحرینکم الشیطان ﴾

ایک دفعہ ایک شخص نے ان الفاظ میں آپ کو مخاطب کیا اے ہمارے آقا! اور ہمارے آقا کے فرزند! اور اے ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے فرزند! آپ نے فرمایا لوگو! پرہیز گاری اختیار کرو شیطان تمہیں گرا نہ دے، میں عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں' خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا ہے مجھے پسند نہیں کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ۔ [5]

غور کرو کہ رسول کی شان میں یہ الفاظ ناجائز نہیں مگر توحید کو شرک کے ہر شائبہ سے بچانے کا خیال ہر خیال پر غالب تھا۔

درمیانی واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد:

(۳) شرک کا اصلی ضرر یہ ہے کہ خدا سے انسان کو جس درجہ کا تعلق، جس قسم کا عجز و نیاز، جس مرتبہ کی محبت، جس درجہ کی التجا درکار ہے، اس کا رخ دوسری طرف بدل جاتا ہے، ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوتا

---

[1] بخاری کتاب التفسیر' سورۂ توبہ۔

[2] بخاری جلد اول کتاب الانبیاء باب واذکر فی الکتاب مریم۔

[3] شمائل ترمذی و مستدرک جلد ۳ ص ۴۸ علی شرط الشیخین واقعہ فتح مکہ۔

[4] ادب المفرد امام بخاری باب ہل یقول سیدی و ابوداؤد کتاب الادب باب کراہتہ التمادح۔

[5] مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۱۵۳۔

کائنات اور زمین و آسمان کے خالق نہیں ہیں تاہم وہ ہر قسم کی حاجتیں اور مرادیں انہیں دیوتاؤں اور معبودوں سے مانگتے ہیں انہیں کو حاجت روا جانتے ہیں اٹھتے بیٹھتے انہیں کا نام لیتے ہیں انہی پر نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، غرض براہ راست ان کو جو تعلق ہوتا ہے انہیں معبودوں سے ہوتا ہے خود مسلمانوں میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا طرز عمل انبیاء و صلحاء بلکہ مزارات کی نسبت اس کے قریب قریب ہے اس بنا پر مقدم ترین امر یہ ہے کہ معبودین کی نسبت اس قسم کا خیال نہ پیدا ہونے پائے اور صاف بتا دیا جائے کہ خدا کے آگے کسی کی کچھ نہیں چل سکتی اس کی مرضی میں کوئی دست اندازی نہیں کرسکتا حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے طلب مغفرت کا وعدہ کیا تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا۔

﴿ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ﴾ (ممتحنہ)

میں آپ کے لئے مغفرت کی درخواست ضرور کروں گا لیکن مجھ کو خدا کے سامنے آپ کی نسبت کوئی اختیار نہیں

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنی والدہ کے لیے استغفار کی درخواست کی تھی وہ نہیں قبول ہوئی، البتہ یہ درخواست ضرور قبول ہوئی کہ میں ان کی قبر کی زیارت کرلوں۔[1]

قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری کہ ﴿ وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ ﴾ تو آپ نے خاندان کے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا "اے قریشیو! اے اولاد عبدالمطلب! اے عباس! اے صفیہ! اے فاطمہؓ! میرے مال میں سے جو مانگو میں دے سکتا ہوں لیکن خدا کے ہاں میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔"[2]

قرآن مجید میں نہایت کثرت اور نہایت تشدد کے ساتھ اس مضمون کو ادا کیا گیا کہ تم لوگ جس کو حاجت روا سمجھتے ہو اور ان سے حاجتیں مانگتے ہو ان کو کارخانہ ہستی میں کسی قسم کا اختیار نہیں۔

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا یَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِیْلًا ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ط اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴾ (بنی اسرائیل)

کہہ دو کہ خدا کے علاوہ تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری مصیبت کے ہٹانے یا بدلنے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے جن کو تم پکارتے ہو ان میں جو خدا کے مقرب ترین ہیں وہ خود خدا کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں بے شبہ تیرے خدا کا عذاب ڈرنے ہی کے قابل ہے۔

خوارق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں:

(۴) شرک کا ایک بڑا ذریعہ خوارق عادات کی نسبت غلط فہمی ہے، جن اشخاص سے خوارق عادات سرزد ہوتے ہیں ان کی نسبت لوگوں کو پہلے یہ خیال آتا ہے کہ یہ خود خدا نہیں ہیں، لیکن ان میں خدائی کا شائبہ ضرور ہے ورنہ ایسے افعال کیونکر سرزد ہوتے ہیں جو قدرت انسانی سے بالاتر ہیں یہی خیال رفتہ رفتہ دیوتاؤں اور اوتار تک ترقی کرتا ہے اور بالآخر خدائی تک پہنچا دیتا ہے حضرت عیسیٰؑ اسی بنا پر آج چالیس کروڑ آدمیوں کے خدا یا خدا کے بیٹے ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجنائز۔

[2] یہ روایت اس آیت کی تفسیر میں تمام تفسیروں اور حدیث کی کتابوں میں منقول ہے۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ انبیاء علیہم السلام سے معجزات صادر ہوتے ہیں اور یہ امر خصائص نبوت میں ہے تاہم یہ مسئلہ اسلام کے زمانہ تک مشتبہ اور مجمل رہا قرآن مجید میں خرق عادات کے متعلق حسب ذیل امور بیان کئے گئے۔

(۱) معجزات صادر ہو سکتے ہیں اور خدا اپنے مقبول بندوں کو معجزات عطا کرتا ہے۔

﴿وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ط قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (انعام)

اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرت ﷺ) پر کوئی معجزہ خدا کے یہاں سے کیوں نہیں اترا کہہ دو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ معجزہ نازل کرے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

(۲) باوجود اس کے کفار کو معجزہ طلبی سے روکا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ نبوت اور رسالت معجزہ پر موقوف نہیں۔

﴿وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ (رعد۔۱)

اور کفار کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ پر کوئی معجزہ خدا کے ہاں سے کیوں نہیں اترا بے شک آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لئے راہ دکھانے والے ہیں۔

﴿وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا ۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِى السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّىْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾ (بنی اسرائیل۹۰۔۹۳)

اور کفار کہتے ہیں کہ ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم زمین سے چشمہ نہ نکال دو یا تمہارے پاس کھجوروں یا انگوروں کا باغ نہ ہو کہ جس کے بیچ میں تم نہریں جاری کردو یا آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرادو جیسا کہ تمہارا گمان تھا یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نہ لے آؤ یا تمہارا گھر سونے کا نہ بن جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہم تو اس چڑھنے پر بھی یقین نہ لائیں گے جب تک ہم پر کوئی کتاب نہ اتارو جس کو ہم خود پڑھیں، کہہ دو کہ سبحان اللہ میں تو صرف بشر ہوں اور سول ہوں۔

(۳) جو معجزے اس آیت میں کفار نے طلب کئے وہ ناممکن باتیں نہ تھیں، تاہم خدا نے آنحضرت ﷺ کو جو جواب تلقین کیا وہ یہ تھا کہ میں تو بشر ہوں، دوسری جگہ اس کا جواب یہ دیا کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں یعنی معجزے صادر ہوں گے تو یہ میرا فعل نہ ہوگا بلکہ خدا کا ہوگا۔

﴿وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ط قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ (عنکبوت)

اور کفار کہتے ہیں کہ ان پر خدا کے یہاں سے معجزے کیوں نہیں اترے کہہ دو کہ معجزے تو خدا کے ہاں ہیں، اور میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں، کیا ان (کفار) کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تمہارے اوپر کتاب (قرآن) اتاری جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے، اس میں رحمت ہے اور ایمان لانے والوں کے لئے یاد رکھنے کی چیز ہے۔

اسی لئے معجزات کے ذکر میں ہمیشہ باذن اللہ (خدا کی اجازت سے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

حرام وحلال کرنا خدا کا کام ہے:

(۵) شرک کی ایک قسم یہ تھی کہ انبیاءؑ یا پیشوایانِ مذہبی کو تحریم وتحلیل کا مجاز سمجھتے تھے یعنی وہ جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس چیز کو چاہیں حلال ٹھہرا دیں‘ قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری۔

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا ﴾ (توبہ)

ان لوگوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو رب بنالیا ہے۔

تو حضرت عدیؓ نے جو حاتم طائی کے فرزند اور اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے‘ آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ ہم لوگ اپنے پیشوایان مذہبی کو اپنا رب تو نہیں سمجھتے تھے‘ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ’’کیا تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حلال اور جس کو چاہیں حرام کر دیں‘‘ عرض کی کہ ’’ہاں‘‘ آپ نے فرمایا ’’یہی رب بنانا ہے‘‘[1] عموماً اہل مذاہب پیغمبروں کو شارع مستقل سمجھتے تھے لیکن یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے‘ شریعت کی تاسیس‘ حلال وحرام کی تعیین‘ جائز وناجائز کی تفریق‘ امر ونہی کے احکام یہ سب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں‘ پیغمبر صرف مبلغ اور پیغام رساں اور تعلیم الٰہی سے ان احکام کے شارح اور بیان کرنے والے ہیں‘ اسی بناء پر قرآن مجید میں ذات نبوی کی صفت رسالت کو بار بار تاکید اور اصرار کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ﴾ (آل عمران)

محمد تو صرف ایک رسول ہے اس سے پہلے اور رسول گذر چکے۔

﴿ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﴾ (نساء)

مریم کا بیٹا عیسیٰ‘ اللہ کا صرف رسول تھا۔

اس حصر سے یہ مقصود تھا کہ انبیاء میں خدائی کی کوئی صفت نہیں ہوتی، بلکہ جو کچھ ان میں ہے وہ رسالت ونبوت کے اوصاف ہیں۔

غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم:

(۷) شرک کا ایک بڑا ذریعہ یہ تھا کہ جو اعمال اور آداب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں وہ اوروں کے ساتھ بھی برتے جاتے تھے‘ یہ اگرچہ شرک فی العبادۃ یا شرک فی الصفات تھا لیکن رفتہ رفتہ شرک فی الذات تک منجر ہوتا ہے سجدۂ عبادت خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن کفار اور دیگر اہل مذاہب بتوں اور مقتدایان دینی کو بھی سجدہ کرتے تھے اور سلاطین و امراء کو سجدہ کرنا عام طور سے رائج تھا آنحضرت ﷺ نے نہایت سختی سے اس کو روکا، بنو اسرائیل میں سجدۂ تعظیمی یا سجدۂ محبت جائز تھا چنانچہ حضرت یوسفؑ کو ان کے والدین نے سجدہ کیا تھا لیکن چونکہ اسلام میں توحید کو انتہائے کمال تک پہنچانا تھا سجدہ تعظیمی بھی منع کر دیا گیا۔ ایک دفعہ ایک صحابی خدمت اقدس میں آئے اور عرض کی کہ میں نے اہل عجم کو دیکھا ہے وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں آپ اجازت دیں تو ہم آپ کو سجدہ کریں، آپ ﷺ نے فرمایا، تو کیا میری قبر پر گذرو

---

[1] جامع ترمذی وابن کثیر تفسیر آیت مذکور۔

گے تو اس کو سجدہ کرو گے؟ عرض کی کہ نہیں۔ فرمایا تو اب بھی نہ کرو، اگر میں کسی کو دوسرے کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دے سکتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے [۱] اسی طرح ایک اور صحابی ملک شام سے آئے تو آپ کو سجدہ کیا آپ نے پوچھا کہ یہ تم نے کیا کیا؟ عرض کی کہ میں نے شام میں رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے مذہبی افسروں کو سجدہ کرتے ہیں تو میرا جی چاہا کہ میں بھی آپ کو سجدہ کروں، فرمایا ایسا نہ کرو اگر میں کسی کو خدا کے سوا سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔ [۲]

صفات الٰہی کی توحید:

(۸) شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ جو اوصاف مخصوص ہیں وہ اوروں میں تسلیم کئے جائیں جس کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ شرکت وصف کی بناء پر خدا کے شریک اور ہمسر بن جائیں ان میں سے ایک وصف علم غیب ہے اکثر اہل مذاہب اعتقاد رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں کہ انبیاء اور اولیاء کو علم غیب ہوتا ہے، بنی اسرائیل کے زمانہ میں کاہنوں کا یہی کام تھا کہ وہ آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے عرب میں بھی کاہن یہی پیشہ کرتے تھے اور مختلف طریقوں سے پیشین گوئی کرتے تھے کبھی فال سے، کبھی پانسے پھینک کر اور کبھی یہ ظاہر کر کے کہ ان کو جنات غیب کا حال بتاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے نہایت تاکید اور استقصاء کے ساتھ اس اعتقاد کو مٹایا اور علم غیب کی تمام صورتیں باطل کیں خود قرآن میں نہایت کثرت سے اس کے متعلق آیتیں نازل ہوئیں۔

﴿ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ﴾ (انعام)

اور خدا کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

آنحضرت ﷺ نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی اور فرمایا کہ مفاتح غیب پانچ ہیں، جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ [۳]

۱۔ حمل یعنی لڑکا ہوگا یا لڑکی۔
۲۔ کل کیا ہوگا۔
۳۔ بارش کب ہوگی۔
۴۔ کس جگہ موت آئے گی۔
۵۔ قیامت کب آئے گی۔

اگر چہ علم غیب کی اور بھی صورتیں ہیں، لیکن زیادہ تر انہیں امور کی نسبت لوگ علم غیب کے مدعی تھے اور ان ہی باتوں کو لوگ پہلے سے جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے بھی علم غیب کی نفی کی، ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر آنحضرت ﷺ تشریف

---

[۱] ابوداؤد کتاب النکاح حق الزوج علی المراۃ۔

[۲] ابن ماجہ حق الزوج علی المراۃ۔

[۳] صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیہ میں یہ تفصیل مذکور ہے۔

فرماتھے انصار کی چند لڑکیاں گا رہی تھیں گاتے گاتے انہوں نے یہ گانا شروع کیا۔

﴿ وفینا رسول یعلم ما فی غد﴾ [1]

اور ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا کہ یہ نہ کہو وہی کہو جو پہلے گا رہی تھیں [2] اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو خاص حکم دیا کہ آپ اس حقیقت کو واضح کردیں۔

﴿ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ ﴾ (انعام)

کہہ دو کہ اے پیغمبر کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔

اور غیب کا علم صرف خدا کی صفت ہے۔

﴿ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهَ ﴾ (نمل)

کہہ دو اے پیغمبر کہ خدا کے سوا آسمانوں میں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا۔

غیب دانی کے مدعی کاہن جو عرب کی گلی گلی میں خدع وفریب کا جال پھیلائے بیٹھے رہتے تھے اور بت خانوں میں خدائی کرتے تھے‘ ان کی سطوت خاک میں مل گئی‘ بت خانے ویران ہو گئے تو ان کے یہ پجاری بھی فنا ہو گئے، صحابہ نے آکر پوچھا کہ یارسول اللہ ہم جاہلیت میں کاہنوں کے پاس جایا کرتے تھے، فرمایا اب نہ جایا کرو، عرض کی ہم پرندوں سے فال لیا کرتے تھے فرمایا ”یہ تمہارا وہم تھا، اس کے سبب سے اپنے ارادہ سے باز نہ رہا کرو“ بعض لوگوں کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ کاہن کچھ نہیں، انہوں نے کہا یارسول اللہ! ان کی بعض باتیں سچی بھی نکل آتی ہیں فرمایا شیطان ایک آدھ بات سن لیتا ہے اور مرغی کی طرح قرقر قرقر کرکے اپنے دوست کے کانوں میں ڈالتا ہے اور وہ اس میں سو جھوٹ ملا دیتا ہے کبھی فرمایا کہ ”فرشتوں کی زبان سے شیاطین فضائے آسمانی میں چوری چھپے کچھ سن لیتے ہیں اور کاہن اس میں سینکڑوں جھوٹ اپنی طرف سے ملا کر بیان کرتے ہیں“ جاہلوں میں کچھ ایسے مکار ہوتے ہیں جو چوری کا غائبانہ پتہ بتانے کا دعوی کرتے ہیں عرب ان کو عرّاف کہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی کسی مال کا پتہ پوچھنے کے لئے کسی اعراف کے پاس جائے گا اس کی چالیس دن کی نماز قبول نہ ہوگی۔ علم نجوم جس کے زور سے لوگ غیب کا حال دریافت کر لینے کے مدعی بنتے تھے اس کا سیکھنا بھی جادو کی طرح گناہ قرار دیا اور فرمایا کہ جو کسی کاہن کے پاس جا کر اس کی باتوں کو سچ سمجھے وہ محمد پر جو کچھ اترا ہے اس کا انکار کرتا ہے۔ [3]

ان تعلیمات نے خدا کے علاوہ دوسروں کی غیب دانی کے عقیدہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا کہانت کی گرم بازاری سرد ہو گئی فال‘ شگون بد‘ نجوم اور غیب دانی کے دوسرے خداعانہ طریق مٹ گئے پرندوں اور پانسوں کے ذریعہ سے غیب کا حال دریافت کرنا وہم و وسوسہ قرار پایا اور غیب کی مملکت پر خدا کے سوا کسی اور کی حکومت قائم نہ رہی۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الرد علی الجہمیہ۔

[2] صحیح بخاری کتاب النکاح۔

[3] مشکوۃ باب الکہانۃ میں صحیحین سے یہ حدیثیں نقل کی ہیں‘ علم نجوم کی حرمت والی حدیث ابوداؤد‘ ابن ماجہ اور احمد سے لی ہے۔

مخفی قوتوں کا ابطال:

(۹) کائنات میں خدا کے سوا جن غیبی اسباب وعلل یعنی سحر وطلسم جنات وشیاطین اور ارواح خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت وتصرف کا اعتقاد تھا اور ان سے بچنے کے لئے ان کی دہائی پکاری جاتی تھی نذر چڑھائی جاتی تھی قربانی کی جاتی تھی آنحضرت ﷺ کی تعلیم اور وحی نے ان تمام خرافات کا قلع قمع کر دیا اور خدا کے سوا تمام دوسری مخفی وپوشیدہ قوتوں کا ڈر انسان کے سینوں سے ہمیشہ کے لئے نکال کر پھینک دیا اور دعا وکلمات الٰہی کے سوا ہر نوع کے جھاڑ پھونک، منتر، تعویذ، گنڈے ٹوٹکے، جن میں کسی غیر خدا سے غیبی استعداد یا شرک کا کلمہ ہو کفر قرار پائے اسی قسم کے فاسد خیالات کے استیصال کے لئے ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ضمن میں اس آیت کے پڑھنے کا حکم دیا گیا۔

﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ (فاتحہ)

(اے عالم کے پروردگار) ہم تیرے ہی آگے سر جھکاتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔

سحر وطلسم وجادو اور ٹوٹکے کے متعلق ارشاد خداوندی ہوا۔

﴿ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ط وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ط وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَالَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴾ (بقرہ)

یہ جادو اور ٹوٹکے کرنے والے کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن خدا کے حکم سے، اور یہ بیہودہ (جادو اور ٹوٹکے) سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان رساں ہیں نفع بخش نہیں اور یقیناً ان کو علم ہے کہ جو ان کو حاصل کرتا ہے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ سحر وجادو کی حقیت وہم وتخیل سے زیادہ نہیں، فرمایا:

﴿ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴾ (طہٰ)

مصری جادوگروں کے جادو سے اس کو یہ خیال ہوتا تھا کہ وہ دوڑ رہے ہیں۔

بلکہ بعض صحابہ نے ان مکار جادوگروں کے قلع قمع کے لئے ان کے قتل تک کا حکم دے دیا [1] تا کہ انسانوں کے دلوں میں ان کا جو خوف وہراس بیٹھا ہوا ہے وہ دور ہو اور ان کے اس عاجزانہ قتل ہونے سے یہ ثابت ہو کہ ان میں کوئی غیر معمولی طاقت نہیں بالکل وہ بے بس ہیں۔

ابوداؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ ''یا رسول اللہ! ہم جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے اب آپ کیا فرماتے ہیں؟'' ارشاد فرمایا ''کہ تم اپنے جھاڑ منتر ہمارے سامنے پیش کرو اگر ان میں شرک کی کوئی بات نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں'' ایک اور صحابی نے ایک بیمار یا پاگل کو سورۂ فاتحہ پڑھ کر چند روز پھونکا وہ اچھا ہو گیا اس نے ان کو انعام دیا، انہوں نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے واقعہ عرض کیا تو فرمایا ''میری عمر کی قسم! ہر جھاڑ پھونک باطل ہے لیکن تم نے سچے جھاڑ کی روزی کھائی'' ایک اور صحابی روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

﴿ ان الرقى التمائم والتوله شرك ﴾ (ابوداؤد وابن ماجہ)

---

[1] جامع ترمذی باب ماجاء فی حد الساحر وابوداؤد باب اخذ الجزیہ من المجوس۔

بے شک جھاڑ پھونک گنڈے اور میاں بیوی کے چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں۔

انہیں صحابی کے گھر میں ایک بڑھیا آیا کرتی تھی گھر والوں نے اس سے کسی بیماری کا کوئی ٹوٹکا کرایا‘ ایک دھاگا پڑھ کر اس نے باندھ دیا تھا وہ گھر آئے تو اس دھاگے پر ان کی نظر پڑی انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کو توڑ کر پھینک دیا اور فرمایا کہ عبداللہ کا خاندان شرک کی باتوں سے مستغنی ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ جھاڑ پھونک گنڈے اور میاں بیوی کو چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں‘ ان کی بیوی نے کہا کیا وجہ ہے کہ ایک دفعہ میری آنکھ میں کچھ پڑ گیا جب میں جھاڑتی تھی تو پانی رُک جاتا تھا اور جب چھوڑ دیتی تھی تو پانی بھر آتا تھا انہوں نے جواب دیا یہ شیطانی بات ہے تم نے کیوں نہ وہ کیا جو رسول اللہ ﷺ کرتے تھے آنکھوں میں پانی ڈالتیں اور یہ دعا پڑھتیں ”اے لوگوں کے پروردگار! اس بیماری کو دور کر، تو ہی شفا دینے والا ہے، تیری شفا بخشی کے سوا کوئی شفا نہیں ایسی شفا دے کہ پھر کوئی بیماری نہ رہے۔

اوہام وخرافات کا ابطال:

(۱۰) وہ تمام اوہام وخرافات جن سے شرک پرست اہل عرب لرزہ براندام رہتے تھے اور جن کو وہ بالذات موثر اور متصرف سمجھتے تھے آنحضرت ﷺ نے ان کا طلسم توڑ دیا‘ اور اعلان فرما دیا کہ ان کی کوئی اصل نہیں فرمایا۔[۱]

﴿ لا عدوی ولا طیرة ولا صفر ولا هامة ﴾ (ابوداؤد وابن ماجہ)

نہ چھوت ہے‘ نہ بدفالی ہے‘ نہ پیٹ میں بھوک کا سانپ ہے نہ مردہ کی کھوپڑی سے پرندہ نکلتا ہے۔

ایک اور صحابی کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا۔

﴿ العیافة والطیرة والطرق من الجبت ﴾ (ابوداؤد وابن ماجہ)

پرندوں کی بولی سے فال لینا، ان کے اڑنے سے فال لینا، اور کنکری پھینک کر یا خط کھینچ کر حال بتانا شیطانی کام ہے۔

ایک اور صحابی آپ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ فال نکالنا شرک ہے پھر ان صحابی نے کہا کہ ہم صحابہ میں کوئی نہیں جو اس کو برا نہ سمجھتا ہو بلکہ خدا پر بھروسہ [۲] رکھنا چاہئے، یہ بھی آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”نچھتر“ (نو) کچھ نہیں [۳] یعنی پانی کی بارش میں اس کو بالذات کوئی دخل نہیں اسی طرح غول بیابانی کے متعلق عربوں کے جو معتقدات تھے ان کو آپ نے ایک لفظ سے باطل کر دیا فرمایا۔

﴿ لا غول ﴾ (ابوداؤد باب فی الطیرة)

غول بیابانی کچھ نہیں۔

اسی طرح بحیرہ اور سائبہ وغیرہ جانوروں کے متعلق ان کے خیالات فاسدہ کا قرآن نے ابطال کیا‘ سورۂ انعام میں ان کے ان مشرکانہ عقائد اور اعمال کی بتصریح تردید کی گئی اور سورۂ مائدہ میں فرمایا گیا۔

﴿ مَاجَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ﴾ (مائدہ)

---

[۱] یہ تمام روایتیں ابوداؤد جلد دوم باب التمائم و باب ماجاء فی الرقی اور ابن ماجہ باب تعلیق التمائم میں ہیں۔

[۲] ابوداؤد وابن ماجہ ذکر فال۔

[۳] ابوداؤد باب الطیرة۔

خدا نے بحیرہ اور سائبہ اور وصیلہ اور حام نہیں ٹھہرایا۔

بحیرہ، اس بچہ کو کہتے تھے جس کا کان پھاڑ کر بتوں کی نذر کرتے تھے۔

سائبہ، اس جانور کو کہتے تھے جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیئے جاتے تھے۔

وصیلہ، بعض لوگ نذر مانتے تھے کہ اگر بچہ نر ہوا تو اس کو بت پر چڑھائیں گے اور اگر مادہ ہو تو ہم رکھیں گے پھر اگر نر و مادہ ملے ہوتے تو مادہ کے ساتھ نر بھی رکھ لیتے تھے، یہ وصیلہ تھا۔

حام، وہ اونٹ جس کے دس بچے بوجھ اٹھانے اور سواری کے لائق ہو چکتے تو دیوتا کے نام پر آزاد کر دیا جاتا۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اوہام جو عرب میں پھیلے ہوئے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کا استیصال فرمایا یہ اوہام پرستی حقیقت میں قوموں کی تباہی کا ایک بڑا سبب ہوتی ہے یہ اوہام حقیقت کے خلاف ہونے کے علاوہ بہت سے کاموں میں خلل انداز ہوتے ہیں اور غور سے دیکھو تو ان کا سلسلہ بالآخر کسی نہ کسی شرک پر منجر ہوتا ہے اور انسان کو صحیح طریق عمل سے روک دیتے ہیں مثلاً بیماری میں طب کے قاعدہ کے موافق علاج کیا جائے تو مفید ہوگا لیکن بہت سے لوگ وہم پرستی کے بناء پر ٹونے ٹوٹکے کو دافع مرض سمجھتے ہیں اس قسم کے اوہام عرب میں نہایت کثرت سے پھیلے ہوئے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان تمام اوہام کو تصریح اور تعین کے ساتھ باطل قرار دیا مثلاً

۱۔ عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے تو چاند یا سورج میں گرہن لگتا ہے، حضرت ابراہیم آپ کے صاحب زادہ نے جب انتقال کیا تو سورج میں گرہن لگا ہوا تھا لوگوں نے خیال کیا کہ انہی کے مرنے کا اثر ہے، آنحضرت ﷺ نے جب سنا تو مسجد میں جا کر خطبہ دیا کہ چاند اور سورج خدا کی قدرت کے مظاہر ہیں کسی کے مرنے سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔ [1]

۲۔ یہ خیال تھا کہ سانپ اگر مارا جائے تو اس کا جوڑا آتا ہے اور انسان کو ہلاک کرتا ہے

۳۔ ایک دفعہ آپ مسجد میں تشریف رکھتے تھے ایک ستارہ ٹوٹا آپ نے دریافت فرمایا کہ جاہلیت میں تم لوگ اس کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے تھے، لوگوں نے عرض کی کہ ہمارا یہ اعتقاد تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے یا کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا ہے تو ستارے ٹوٹتے ہیں آپ نے فرمایا کہ کسی کے مرنے یا پیدا ہونے سے ستارے نہیں ٹوٹتے۔ [2]

۴۔ شیر خوار بچوں کے سرہانے استرا رکھ دیا کرتے تھے کہ جنات ان کو نہ ستانے پائیں ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے دیکھا تو اٹھا کر پھینک دیا اور کہا کہ آنحضرت ﷺ ان باتوں کو ناپسند کرتے تھے۔ [3]

۵۔ نظر بد سے بچنے کے لئے اونٹوں کے گلے میں قلاوہ لٹکاتے تھے آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ کسی اونٹ کے گلے میں قلاوہ نہ رہنے پائے۔ [4]

---

[1] صحیح بخاری باب صلوٰۃ الکسوف۔

[2] مسند احمد بن حنبل جلد اول ص ۲۱۸ مصر۔

[3] ادب المفرد باب الطیرۃ من الجن صفحہ ۱۸۔

[4] امام مالک باب ما جاء فی نزع التعلیق والجرس من العین ص ۳۷۳۔

الغرض توحید کامل کی تعلیم نے عربوں کے تمام مشرکانہ اوہام وخرافات کو ہمیشہ کے لئے مٹا دیا اسلام کی اس اصلاح اہمیت کا اندازہ عیسائیت کی ان مقدس روایات وحکایات سے کرو' جنہوں نے صدیوں تک دنیا کو دیوؤں' بھوتوں چڑیلوں کے تسلط اور عذاب کے شکنجہ میں مبتلا رکھا اور ان کو نکالنا اور بھگانا عیسائیت کا کمال اور اعجاز سمجھا جاتا رہا۔

کفارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید:

(۱۱) شرک کے اسباب میں ایک بڑا سبب کفارہ اور شفاعت کے وہ غلط معنی تھے' جو عربوں اور عیسائیوں وغیرہ میں رائج تھے عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنی سمجھ لئے تھے اس کا اصلی سبب ان کا وہ تخیل تھا جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت ان کے ذہن میں قائم تھا وہ خدا اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے جو ایک قاہر وجابر بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہے اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی وہ اس کے دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے اسی لئے وہ ان درمیانی ہستیوں کے بھی خوش رکھنے کی ضرورت کے معتقد تھے چنانچہ وہ اپنے بتوں دیوتاؤں اور فرشتوں کو اس نیت سے پوجتے تھے اور کہتے تھے۔

﴿ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ (یونس)

یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے جب ان کی اس بت پرستی پر ان کو ملامت کی تو انہوں نے صاف کہا۔

﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ (زمر)

ہم ان کو اسی لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے تقرب میں نزدیک کردیں۔

یہودیوں میں بھی اسی قسم کی دوسری غلط فہمی تھی اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گھرانا خدا کا خاص کنبہ اور خاندان ہے اور ان کے خاندان کے پیغمبر اور نبی چونکہ خدا کے پیارے اور محبوب ہیں اس لئے ان کی اولاد اور نسل بھی دنیا اور آخرت میں یہی درجہ رکھتی ہے اگر ان پر کوئی مصیبت بھی پڑے گی تو ان کے خاندان کے بزرگ جو خدا کے مقرب اور برگزیدہ ہیں وہ ہر طرح ان کو اس سے بچالیں گے ان کا دعویٰ تھا کہ

﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ﴾ (مائدہ)

ہم خدا کی اولاد اور اس کے پیارے ہیں۔

قرآن نے کہا:

﴿ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ (مائدہ)

بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہو' یہ اسی کو اختیار ہے کہ جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے سزا دے

اور اسی بناء پر ان کا دعویٰ تھا:

﴿ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ﴾ (آل عمران)

ہم کو دوزخ صرف چند گنتی کے دن چھو کر چھوڑ دے گی۔

قرآن نے کہا:

﴿ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴾ (آل عمران)

اور یہ اپنے دل سے بنا کر جو جھوٹا عقیدہ گھڑ چکے ہیں، وہ ان کے مذہب میں ان کو دھوکا دے رہا ہے۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا اور ہے کہ باپ (خدا) نے تمام انسانوں کی طرف سے جو موروثی وطبعی طور سے گنہگار ہیں اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰؑ) کو قربانی دے کر ان کے گناہوں کا کفارہ دے دیا اور وہ گناہوں سے پاک وصاف ہو گئے اور حضرت عیسیٰؑ اور ان کے بعد ان کے جانشین پوپوں کو گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جو زمین پر کھولیں گے وہ آسمان پر کھولا جائے گا، اسی لئے پوپوں کے سامنے اعتراف گناہ کا عقیدہ عیسائیوں میں پیدا ہوا اور ان کو بندوں کے گناہوں کے معاف کرنے کا دنیا میں حق ملا۔

پیغام محمدی نے ان کو ملزم قرار دیا اور کہا

﴿ اِتَّخَذُوْآ اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ (توبہ)

انہوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو، خدا کو چھوڑ کر اپنا خدا بنا رکھا ہے۔

اور اصولی طور پر اس نے یہ بتا دیا کہ

﴿ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ (آل عمران)

خدا کے سوا کون گناہوں کو معاف کر سکتا ہے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ بیٹا قیامت کے دن باپ کے داہنے بازو پر برابر بیٹھ کر خلق کا عدل وانصاف کرے گا قرآن پاک نے ایک بڑے مؤثر طرز میں اس کی تردید کی ہے قیامت کے دن خدا حضرت عیسیٰؑ سے پوچھے گا۔

﴿ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ (مائدہ)

اے عیسیٰؑ! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا بناؤ

وہ کہیں گے بارالٰہا! میں نے تو ان سے وہی کہا جو تو نے کہا تھا، میں نے تو ان کو یہ تعلیم نہیں دی تھی، میں نے تو ان سے یہی کہا تھا کہ صرف ایک خدا کو پوجو، اب

﴿ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ (مائدہ)

اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو بخش دے تو تو سب کچھ کر سکتا ہے کہ تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ گناہوں کی مغفرت اور معافی یا گناہوں پر سزا اور عذاب دینا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

بت پرست عربوں کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ یہ دیوتا اور ان کے یہ بت خدا کی طرف سے دونوں عالم میں مختار کل ہیں وہ یہاں دینے نہ دینے کا اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں، اور اس عقیدہ کا نام ان کے یہاں شفاعت تھا، اور یہ دیوتا ان کے شفیع تھے قرآن مجید نے کفارہ، غیر خدا کے اختیار مغفرت اور بت پرستانہ طریقہ اشاعت کے عقائد باطلہ کی ہر طرح تردید کی اور بتایا کہ یہ اختیار، خدا کے سوا کسی اور کو نہیں سب اس کی عظمت اور جلال کے سامنے عاجز اور درماندہ ہیں۔

﴿ وَلَا یَمْلِكُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴾ (زخرف)

یہ کافر خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، لیکن وہ جس نے حق کی شہادت دی اور وہ جانتے بھی ہوں۔

﴿ لَا یَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴾ (مریم)

یہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن جس نے رحم والے خدا سے اقرار لے لیا۔

﴿ ءَ اَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً اِنْ یُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْئًا وَّلَا یُنْقِذُوْنِ ﴾ (یٰسین)

کیا خدائے برحق کو چھوڑ کر جھوٹے معبودوں کو خدا بناؤں، اگر رحمٰن مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی شفاعت مجھے ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکتے ہیں۔

کفار فرشتوں کو بھی اسی غرض سے پوجتے تھے، حکم ہوا۔

﴿ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَرْضٰی ﴾ (نجم)

اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت کچھ فائدہ نہیں پہنچاتی، لیکن اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لئے چاہے اور پسند کرے۔

﴿ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا یَمْلِكُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَعْقِلُوْنَ ﴾ (زمر۔۵)

کیا ان کافروں نے خدا کے سوا کسی کو شفیع بنایا ہے، کہہ دے کہ اگرچہ یہ کچھ اختیار اور سمجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں تو بھی شفیع بننے کے قابل ہیں۔

خدا قیامت میں ان سے کہے گا۔

﴿ وَمَا نَرٰی مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِیْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ﴾ (انعام)

اور ہم دیکھتے نہیں کہ تمہارے ساتھ ان شفیعوں کو جن کو تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہاری ملکیت میں خدا کے ساتھ شریک ہیں

﴿ وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ وَلَمْ یَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا ﴾ (روم ۱۳۔۱۲)

اور جب قیامت کھڑی ہوگی، تو مشرکین ناامید ہوں گے، جن کو وہ خدا کا شریک کار بتاتے تھے ان میں سے کوئی ان کا شفیع نہ ہوا۔

خاص یہود کو مخاطب کر کے ان کے عقیدہ کی تردید میں کہا گیا۔

﴿ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآئِیْلَ .... وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا یُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴾ (بقرہ)

اے فرزندان اسرائیل!......... اور ڈرو اس دن سے، جس میں کوئی ایک دوسرے کے ذرا کام نہ آئے گا، اور نہ اس کی طرف سے کوئی شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ کچھ اس کے بدلہ میں لیا جائے گا اور نہ کوئی ان کو مدد پہنچائی جائے گی۔

پھر اسی معنی کی آیت اسی سورہ میں دوسری جگہ ہے۔

﴿ يٰبَنِىٓ اِسْرَآئِيْلَ .... وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ ﴾ (بقرہ)

اے فرزندان اسرائیل!.......... اور ڈرو اس دن سے جس میں کوئی کسی کے ذرہ بھی کام نہ آئے گا' اور نہ اس کی طرف سے کوئی بدلہ قبول ہوگا' اور نہ شفاعت فائدہ دے گی۔

اور اسی معنی میں مسلمانوں سے بھی کہا گیا کہ وہ عمل پیش کریں شفاعت کے بھروسے میں نہ رہیں۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِىَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ﴾ (بقرہ۔۳۴)

اے مسلمانو! جو کچھ ہم نے تم کو روزی دی رکھی ہے اس میں سے کچھ خرچ کر دیا کرو' اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ لین دین ہے نہ دوستی ہے نہ شفاعت ہے۔

غرض آپ کے پیغام نے ان معنوں میں شفاعت کے عقیدہ باطل کی ہر جگہ تردید کی ہے' اور اعلان کیا ہے کہ اس شفاعت کا اختیار صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔

﴿ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ○ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ط لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾ (زمر)

کیا انہوں نے خدا کے سوا اوروں کو شفیع بنا رکھا ہے کہہ دے کہ اگرچہ ان کو کسی چیز کا اختیار نہیں اور نہ ان کو سمجھ ہے تو بھی کہہ دے کہ شفاعت کا کل اختیار خدا ہی کو ہے اسی کا راج آسمانوں اور زمین میں ہے پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے

اس آیت پاک نے کفار و مشرکین کے عقیدہ شفاعت کی قطعی طور سے تردید کی' دوسری آیت میں یہود و نصاری کے عقیدہ شفاعت کا اتنا حصہ صرف تسلیم کیا کہ خدا کے نیک بندے اپنے دوسرے بھائیوں کے حق میں شفاعت کریں گے

﴿ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾ (زخرف)

اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں' وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے' لیکن وہ جنھوں نے حق کی گواہی دی اور وہ دانش رکھتے ہیں۔

دوسری جگہ اسی شہادت کو اقرار لینا کہا گیا ہے۔

﴿ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴾ (مریم)

یہ لوگ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جو خدا کے نزدیک (دنیا میں اپنے عمل کے ذریعے سے) اقرار لے چکا ہے۔

لیکن اس شہادت حق اور عہد الٰہی کے باوجود اس اختیار کے استعمال کے لیے اللہ تعالیٰ کی اجازت اور رضامندی شرط ہے۔

﴿ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ﴾ (یونس)

(خدا کی بارگاہ میں) کوئی شفیع نہیں لیکن اس کی اجازت کے بعد۔

﴿ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ﴾ (بقرہ)

وہ کون ہے جو خدا کے سامنے کسی کی شفاعت کر سکے لیکن اس کی اجازت سے۔

﴿ وَکَمْ مِّنْ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُھُمْ شَیْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰہُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَرْضٰی ﴾ (نجم)

اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت ذرا بھی کام نہیں آ سکتی البتہ اس کے بعد کہ خدا اجازت دے جس کو چاہے اور پسند کرے۔

﴿ لَا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴾ (نباء)

یہ فرشتے اور روح کوئی خدا سے اس دن بات نہ کر سکے گا لیکن جس کو وہ رحم والا اجازت دے اور ٹھیک کہے۔

پھر یہ شفاعت بھی ان ہی لوگوں کے حق میں ہو سکے گی، جس کے حق میں اللہ تعالیٰ انبیاء اور صالحین کو شفاعت کی اجازت دے گا، فرمایا۔

﴿ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَۃُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَہٗ ﴾ (سباء۔۳)

اور شفاعت خدا کے نزدیک نفع نہ دے گی، لیکن اس کے لئے جس کے لیے وہ شفاعت کی اجازت دے۔

بلکہ خود انبیاء علیہم السلام بھی سفارش انہیں کی کریں گے جن کی سفارش خود خدا چاہے گا، فرمایا

﴿ وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَھُمْ مِّنْ خَشْیَتِہٖ مُشْفِقُوْنَ ﴾ (انبیاء)

اور وہ شفاعت نہیں کریں گے، لیکن اس کی جس کے لئے خدا اپنی خوشنودی ظاہر کرے اور وہ ان کے خوف سے ترساں ہونگے۔

پھر ایک جماعت ایسی بھی ہے جس کے افراد کے لئے ازل ہی سے یہ اعلان عام ہو چکا ہے کہ ان کے لئے مغفرت اور شفاعت کا دروازہ بند ہے اور یہ وہ مجرم ہیں جن کے دل حق کی شہادت سے محروم رہ گئے۔

﴿ فَمَا تَنْفَعُھُمْ شَفَاعَۃُ الشّٰفِعِیْنَ ﴾ (مدثر)

تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہ دے گی۔

﴿ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ ﴾ (مومن)

اور ظالموں اور مشرکوں کا [1] نہ کوئی دوست اس دن ہوگا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔

اور وہ بدنصیب گروہ جس کے حق میں رحمت کا یہ دروازہ بند رہے گا مشرکین ہیں جیسا کہ ذیل کی آیت سے ظاہر ہے

﴿ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ﴾ (نساء)

اللہ اس گناہ کو کہ اس کے ساتھ کوئی شریک ٹھہرایا جائے نہیں بخشتا، اور اس سے نیچے کے گناہ جس کو چاہے بخش دے۔

لیکن ایسی حالت میں جب کہ وہی شفاعت کریں گے جن کو اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دے گا اور وہ بھی انہیں کی شفاعت کریں گے جن کی شفاعت کرانا خود خدا کو منظور ہوگا تو حقیقت میں خود اللہ ہی اپنے دربار میں اپنا آپ شفیع ہوگا،

---

[1] ان الشرک لظلم عظیم (لقمان۔۲) "بے شک شرک بڑا ظلم ہے" (صحیح بخاری ذکر لقمان جلد نمبر ۱ صفحہ ۴۸۷)

صوفیانہ اصطلاح میں یوں کہو کہ جلال الٰہی کی بارگاہ میں اس کی صفت کریمی اور رحیمی خود شفیع بن کر کھڑی ہوگی اس لئے ارشاد ہوا۔

﴿ وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴾ (انعام)

اور اس قرآن کے ذریعہ (اے پیغمبر) ان لوگوں کو ہشیار کر دے کہ اس سے ڈرتے رہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جمع کئے جائیں گے ان کے لئے ان کے رب کے سوا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں شاید وہ بچتے رہیں۔

﴿ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ (سجدہ)

خدا کے سوا تمہارا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں پھر کیا تم سوچتے نہیں۔

خدا کی اس صفت کریمی و رحیمی کے مظہر اس دنیا میں بھی وہی ہونگے جو اس دنیا میں اس کے مظہر بن کر آئے تھے اور وہ انبیائے کرام ہیں کہ خدا کے رحم و کرم ہی کے سبب سے جو اس کو اس دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ ہے ان کی بعثت ہوئی اور وہ اپنی اپنی امت پر شاہد قرار پائے اسی طرح خدا کی اجازت کے بعد اس دنیا میں بھی وہی خدا کے اس رحم و کرم اور فضل عمیم کے مظہر قرار پائیں گے، نیز رحمت کے فرشتے اور امت کے نیکوکار اور صالح افراد بھی جن کو رحمت الٰہی نے چنا ہو، اس منصب پر ممتاز ہو سکیں گے، خصوصاً وہ سراپا رحمت نبی جو دنیا میں رحمۃ للعالمین کا مظہر بن کر آیا۔

اجرام سماوی کی قدرت کا انکار:

۱۲۔ بظاہر اس دنیا میں بہت سی باتیں آفتاب و ماہتاب کی گردش اور ان کے سبب سے اختلاف موسم کے اثرات سے ہوتی ہیں اس لئے ستارہ پرست قوموں میں یہ اعتقاد پیدا ہوگیا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ستاروں کی گردش کے اثر سے ہوتا ہے، یہی اعتقاد عرب کے مشرکوں میں بھی پھیلا تھا وہ سورج اور چاند کو سجدے کرتے تھے اسلام نے ان کو اس شرک سے روکا اور کہا:

﴿ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ ﴾ (فصلت)

سورج اور چاند کو سجدے نہ کیا کرو۔

اسی طرح وہ زمانہ کو دنیا کے کاروبار میں حقیقی موثر جانتے تھے اور یہ کہتے تھے۔

﴿ وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ﴾ (جاثیہ)

ہم کو تو زمانہ مارتا ہے۔

اسی کا اثر ہے کہ ہماری شاعری کی زبان میں ''فلک کج رفتار'' اور ''دہر ناہنجار'' کی شکایت اب تک چلی آتی ہے، عرب کے مشرکین بھی اسی طرح بولا کرتے تھے، ان کو جب کوئی خلاف توقع تکلیف پہنچتی تھی تو زمانہ کی شکایت کیا کرتے تھے اور اس کو برا کہتے تھے[1] آنحضرت ﷺ نے اس سے منع کیا اور فرمایا کہ ''زمانہ کو گالی نہ دیا کرو کہ زمانہ خود خدا ہے''[2]

---

[1] فتح الباری شرح بخاری جلد ۸ صفحہ ۴۴۱ و کتاب الاسماء والصفات بیہقی صفحہ ۱۱۵، الہ آباد۔

[2] صحیح مسلم الفاظ الادب۔

اور فرمایا کہ خدا ارشاد فرماتا ہے کہ ”آدم کا بیٹا مجھے تکلیف پہنچاتا ہے وہ زمانہ کو برا کہتا ہے، زمانہ میں ہوں میرے ہاتھ میں تمام کام ہیں، میں شب و روز کا انقلاب کرتا ہوں [۱] یعنی جن تکلیفوں اور مصیبتوں کا خالق زمانہ کو سمجھ کر لوگ اس کو برا کہتے ہیں حقیقت میں ان کا پیدا کرنے والا خدا ہی ہے اس لئے یہ گالی حقیقت میں خدا کو دی جاتی ہے۔

اس خیال کا یہ بھی اثر تھا کہ اہل عرب بارش کو پچھتر کی طرف منسوب کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ فلاں پچھتر کے سبب سے ہم پر پانی برسایا گیا حدیبیہ کے موقع پر اتفاق سے رات کو بارش ہوئی اور صبح کو نماز کے بعد حضور صحابہ کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا تم جانتے ہو تمہارے رب نے کیا کہا، صحابہؓ نے عرض کی خدا اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے ارشاد ہوا اس نے فرمایا ”آج صبح کو میرے بندوں میں سے کچھ مومن ہو کر اٹھے کچھ کافر ہو کر۔ جنہوں نے یہ کہا کہ خدا کے فضل و رحمت سے ہم پر پانی برسا وہ تو خدا پر ایمان لانے والے اور ستارہ کے انکار کرنے والے ہیں اور جنہوں نے یہ کہا کہ فلاں پچھتر سے پانی ہم پر برسا تو وہ خدا کے انکار کرنے والے اور ستارہ پر ایمان لانے والے ہیں۔“ [۲]

سورج گرہن اور چاند گرہن کو بھی لوگ عظیم الشان واقعات اور انقلابات کی علامت سمجھتے تھے کم و بیش دنیا کی تمام قوموں میں وہ آسمانی دیوتاؤں کے غیظ و غضب کے مظہر یقین کئے جاتے تھے ۹ھ میں اتفاق سے ایک دن سورج میں گرہن لگا اسی دن آپ کے صاحب زادے ابراہیم نے وفات پائی، صحابہؓ نے خیال کیا کہ یہ سورج میں گرہن لگنے کا سبب حضرت ابراہیم کی موت ہے، آنحضرت ﷺ نے یہ سنا تو تمام مسلمانوں کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا اور ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اس خیال کی تردید کی فرمایا کسوف و خسوف اور گرہن کو کسی کے جینے مرنے سے کوئی تعلق نہیں یہ بھی خدا کے نشانوں میں سے ایک نشان ہے۔ [۳]

غیر خدا کی قسم سے روکنا:

(۱۳) شرک کی ایک نہایت ہی باریک صورت یہ تھی کہ لوگ غیر خدا کی قسمیں کھاتے تھے۔ قسم کھانے کے معنی حقیقت میں شہادت کے ہیں جس کی قسم کھائی جاتی تھی اس کو دراصل واقعہ پر گواہ بنایا جاتا تھا عربوں میں بت پرستی کے رواج کے باعث بتوں اور دیوتاؤں کی قسمیں کھائی جاتی تھیں جو صریح کفر تھیں قریش اپنے دیوتا لات اور عزیٰ کی قسمیں کھایا کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا [۴] لیکن رواج اور عادت کے باعث مسلمان ہونے کے بعد بھی بے اختیار ان کی زبان سے ان کی قسمیں نکل جاتی تھیں، آپؐ نے فرمایا کہ جس شخص کی زبان سے لات اور عزیٰ کی قسم نکل جائے تو وہ فوراً لا الہ الا اللہ کہہ دے۔ یہ گویا اس کفر کے کلمہ سے توبہ ہے، قریش میں باپ کی قسم کھانے کا بھی رواج تھا اس سے بھی آپ نے منع فرمایا، ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو آپ نے باپ کی قسم کھاتے ہوئے سنا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے منع کیا ہے کہ اپنے باپ کی قسم کھایا کرو، جس کو قسم کھانی ہو یا تو خدا کی قسم کھائے ورنہ چپ رہے، حضرت عمرؓ

---

[۱] صحیح بخاری تفسیر سورۂ جاثیہ و کتاب الرد علی الجہمیہ جلد ۲ صفحہ ۱۱۶۔

[۲] صحیح بخاری باب الاستسقاء و باب الذکر بعد الصلوۃ و صحیح مسلم کتاب الایمان۔

[۳] صحیح بخاری صلوۃ الکسوف۔

[۴] سنن نسائی کتاب الایمان والنذور۔

کہتے ہیں کہ حضور کے ارشاد کا یہ اثر ہوا کہ اس وقت سے آج تک میں نے نہ تو اپنی بات میں اور نہ کسی اور کی بات دہرانے میں کبھی باپ کی قسم کھائی [۱] ماں کی قسم بھی لوگ کھایا کرتے تھے اس سے بھی آپ نے منع فرمایا، اسی طرح کعبہ کی بھی قسم لوگ کھایا کرتے تھے اس پر ایک یہودی نے آ کر مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تم بھی شرک کرتے ہو کعبہ کی قسم کھاتے ہو، آپ نے مسلمانوں کو فرمایا کہ کعبہ کی نہیں بلکہ کعبہ والے (خدا) کی قسم کھایا کرو [۲] ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمر نے کسی کو کعبہ کی قسم کھاتے سنا تو اس کو منع کیا اور کہا کہ غیر خدا کی قسم نہ کھائی جائے، میں نے رسول خدا ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ جس نے غیر خدا کی قسم کھائی اس نے کفر کیا یا شرک کیا [۳] دوسری روایت میں ہے کہ ہر وہ قسم جو غیر خدا کی کھائی جائے شرک ہے۔[۴]

خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں:

(۱۴) اکثر نیک لوگوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیت عین خدا کی مشیت ہے، اس میں نہ صرف بد عقیدہ لوگ بلکہ اہل توحید بھی غلطی سے مبتلا ہو جاتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے انسانوں کو اس دقیق غلطی سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ دنیا میں مشیت صرف خدا کی ہے اسی کی خواہش کے مطابق دنیا چل رہی ہے تمام مشیتیں اور خواہشیں اسی کی مشیت اور خواہش کے ماتحت ہیں خدا کے ساتھ اور کسی مخلوق کی مشیت عالم کے کاروبار میں شریک نہیں، لیکن لوگوں نے خدا کی مشیت کے ساتھ اوروں کی مشیت کو بھی شریک کر لیا تھا، توحید کامل کے معلم نے اس خیال کی سختی سے تردید کی اور قرآن مجید نے جا بجا اس حقیقت کو واضح کیا کہ مشیت الٰہی کے علاوہ کوئی اور حقیقی مشیت نہیں' تمام دیگر مشیتیں اسکی تابع اور ماتحت ہیں، عقیدہ کی یہ غلطی اس قدر عام تھی کہ جو لوگ یہ عقیدہ نہیں رکھتے تھے وہ بھی سلاطین حکام اور بزرگوں کے ساتھ گفتگو میں یہ کہنا حسن ادب سمجھتے تھے کہ جو خدا چاہے اور جو حضور چاہیں، آنحضرت ﷺ نے اس طرز کلام سے منع فرمایا' یہاں تک کہ خدا کی مشیت کے ساتھ برابری سے خود اپنی مشیت کے ذکر سے بھی صحابہ کو روکا۔ اس قسم کا طرز کلام لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گیا تھا اس میں یہ تصحیح فرمائی کہ خدا اور غیر کی مشیت کے درمیان عطف کا واؤ (اور) نہ لایا جائے کہ اس سے برابری کا شائبہ نکلے بلکہ پھر کا لفظ بولا جائے تا کہ معلوم ہو کہ خدا کی مشیت کے بعد اوروں کی مشیت کا درجہ ہے۔

نسائی میں ہے کہ ایک یہودی نے خدمت نبوی میں آ کر مسلمانوں سے کہا کہ ''تم لوگ شرک کرتے ہو کہ جو خدا چاہے اور جو محمد چاہیں'' آپ نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یوں کہو کہ ''وہ ایک ہے جو چاہے پھر جو آپ چاہیں''[۵] یہی واقعہ ابن ماجہ میں اس طرح ہے کہ ایک صحابی نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک یہودی یا عیسائی ان سے کہہ رہا ہے کہ تم مسلمان بڑے اچھے لوگ ہوتے اگر شرک نہ کیا کرتے، تم کہا کرتے ہو کہ خدا جو چاہے اور محمد چاہیں، ان صحابی نے خدمت اقدس میں آ کر اپنا یہ خواب بیان کیا آپ نے فرمایا میں اس فقرہ کی برائی جانتا تھا یوں کہو کہ ''جو خدا چاہے پھر جو محمد[۶]

---

[۱] یہ تمام واقعات صحیح بخاری' صحیح مسلم' نسائی کتاب الایمان میں مذکور ہیں۔

[۲] نسائی' کتاب الایمان والنذور۔

[۳] جامع ترمذی ابواب النذور الایمان' مستدرک حاکم صفحہ ۱۸ جلد ۱' کتاب الایمان۔

[۴] مستدرک حاکم بحوالہ مذکور۔

[۵] نسائی کتاب الایمان والنذور۔ [۶] ابن ماجہ کتاب النذور۔

چاہیں'' ابوداؤد میں یہی تعلیم اس واقعہ کی تقریب کے بغیر اس طرح مذکور ہے کہ آپؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ ''یہ نہ کہا کرو کہ جو خدا چاہے اور جو فلاں چاہے بلکہ یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو فلاں چاہے'' لیکن امام بخاری نے ادب المفرد میں اور بیہقی نے کتاب الاسماء میں جو روایت کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی اور کی مشیت کا نام بھی نہ لینا چاہئے ایک شخص نے خدمت والا میں حاضر ہو کر سلسلہ کلام میں کہا کہ ''جو خدا چاہے اور جو آپ چاہیں'' ارشاد ہوا کہ ''تم نے خدا کا ہمسر اور مقابل ٹھہرایا جو خدا تنہا چاہے''[۱]

اس سلسلہ میں یہاں تک اہتمام مدنظر تھا کہ اس سے بھی منع فرمایا کہ خدا اور رسول کی طرف ایک ضمیر پھیر کر ایک فعل لایا جائے تاکہ یہ سمجھا جائے کہ خدا اور رسول کا درجہ برابر برابر ہے' ایک دفعہ آپ کے سامنے کسی شخص نے خطبہ کے اثنا میں یہ فقرہ کہا جس نے خدا اور رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پائی اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی....... یہاں تک اس نے کہا تھا کہ آپ نے اس کو روک دیا اور فرمایا ''اٹھ جاؤ تم بُرے خطیب ہو''[۲] آپ ﷺ نے آزردگی کا اظہار اس لیے فرمایا کہ ''ان دونوں'' کو ساتھ کہنے سے سامعین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ خدا کی اور رسول کی نافرمانی کا حکم برابر ہے اور اس میں شرک کا شائبہ ہے، اس لیے خطیب کو یوں کہنا چاہئے تھا کہ اور جو خدا اور رسول کی نافرمانی کرے گا وہ.......... جیسا کہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے اور ماثورہ خطبوں میں منقول ہے۔

مشتبہات شرک کی ممانعت:

(۱۵) جن باتوں میں شرک کا ذرا بھی شائبہ پایا جاتا تھا، ان سے بالکل منع کر دیا۔ لوگ اولاد کا نام آفتاب ماہتاب وغیرہ کی عبدیت کے ساتھ رکھتے تھے مثلاً عبدالشمس، عبدمناف۔ ان ناموں سے سخت منع فرمایا اور فرمایا کہ بہترین نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں[۳] اہل عجم اپنے سلاطین کو شاہنشاہ یعنی تمام بادشاہوں کا بادشاہ کہتے تھے چونکہ اس میں شرک کا احتمال تھا آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ نام خدا کو سب سے زیادہ ناپسند ہے[۴] دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا اس شخص پر اللہ کا بیحد غضب ہوا جس نے اپنے کو شہنشاہ کہا خدا کے سوا کوئی بادشاہ نہیں۔[۵]

غلاموں کو لوگ عبد یعنی بندہ کہتے تھے' حالانکہ انسان خدا کا بندہ ہے آدمیوں کا نہیں' اسی طرح غلام اپنے مالک کو رب کہتے تھے حالانکہ رب خدا ہے اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے قطعاً منع فرمایا کہ کوئی شخص غلاموں کو عبد یعنی بندہ نہ کہنے پائے بلکہ یوں کہے کہ میرا ''بچہ یا بچی'' اور اسی طرح غلام اور باندیاں اپنے آقا کو رب نہ کہیں مالک کہیں کہ تم سب غلام ہو اور رب اللہ ہے[۶] ہانیؓ ایک صحابی تھے جن کی کنیت ابوالحکم تھی وہ جب خدمت اقدس میں اپنی قوم کے ساتھ آئے تو آپ نے فرمایا کہ حکم خدا ہے اور خدا ہی حکم دینے والا ہے تم کو لوگ ابوالحکم کیوں کہتے ہیں؟ عرض کی کہ میرے قبیلہ میں جب کوئی

---

[۱] ابوداؤد کتاب الادب باب لاتقولوا خبثت نفسی۔

[۲] ادب المفرد امام بخاری صفحہ ۱۵۷ مصر و کتاب الاسماء والصفات امام بیہقی صفحہ ۱۱ مطبوعہ الہ آباد۔

[۳] ابوداؤد کتاب الادب باب تغیر الاسماء۔

[۴] ابوداؤد کتاب الادب۔

[۵] حاکم فی المستدرک ص ۲۷۵ ج ۴۔

[۶] ابوداؤد کتاب الادب باب الکرم وحفظ المنطق۔

نزاع ہوتی ہے تو لوگ مجھ کو حکم یعنی ثالث بناتے ہیں اور میں جو فیصلہ کرتا ہوں اس کو سب تسلیم کر لیتے ہیں، آپؐ نے فرمایا تمھارے بچوں کے کیا نام ہیں بولے شریح، مسلم، عبداللہ۔ آپ نے پوچھا سب میں بڑا کون ہے؟ عرض کی شریح۔ فرمایا تو تمھاری کنیت ابوشریح ہے۔[1]

اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی برا کام کرتے ہیں تو شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں گویا اس نے برائی کرائی ایک دفعہ ایک صاحب آنحضرت ﷺ کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی انہوں نے کہا شیطان کا برا ہو آپ نے فرمایا یوں نہ کہو ورنہ شیطان غرور سے پھول جائے گا اور کہے گا میری قوت سے یہ ہوا، خدا کا نام لو تو شیطان دب کر مکھی کے برابر ہو جائے گا۔[2]

تصویر بنانے سے سخت منع کیا اسکی وجہ تھی کہ اوّل اوّل لوگ کسی بزرگ اور مقتداء کی تصویر گھر میں رکھتے تھے تو محبت یا یادگار کے طور پر رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ انہی تصویروں کی پرستش ہونے لگی تھی چنانچہ ہندوؤں اور رومن کیتھولک عیسائیوں میں اسی طرح تصویر پرستی اور اس سے بڑھ کر بت پرستی کا رواج ہوا اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے سرے سے تصویر کھینچنے سے منع فرمایا۔

قبر پرستی اور یادگار پرستی سے روکنا:

(۱۶) شرک کا بڑا ذریعہ قبر پرستی اور یادگار پرستی ہے قبروں اور یادگاروں کو لوگ عبادت گاہ بنا لیتے ہیں سالانہ مجمع کرتے ہیں' دور دور سے سفر کر کے آتے ہیں، قبروں پر مسجدیں بناتے ہیں، منتیں مانتے ہیں، نذریں چڑھاتے ہیں، آنحضرت ﷺ نے ان تمام افعال سے منع کیا۔ وفات سے پانچ دن پہلے آپؐ نے فرمایا کہ تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجد بنا لیتے تھے، دیکھو میں تم کو منع کرتا ہوں کہ قبروں کو مسجد نہ بنانا[3] عین وفات کے وقت چہرہ سے چادر الٹ دی اور فرمایا کہ خدا یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے ان لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنا لیا۔

ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہے:

(۱۷) یہ توحید کے متعلق وہ اصلاحات تھیں جن کا تعلق زیادہ تر اعمال اور روزمرہ کی بول چال سے تھا، لیکن حقیقی اصلاح جس سے توحید کی تکمیل ہوتی ہے وہ قلب و روح کی توحید ہے، انسان کے تمام کاموں کا کوئی نہ کوئی نفسیاتی محرک ہوتا ہے کوئی طلب شہرت کے لیے کام کرتا ہے کوئی دنیاوی معاوضہ کے لیے کرتا ہے کوئی نمائش اور دکھاوے کے لیے کرتا ہے کوئی غیر کی محبت یا عداوت میں کرتا ہے ان تمام کاموں کا محرک درحقیقت غیر خدا ہے جس نے خدا کی جگہ لے لی ہے اسی لیے قرآن مجید نے کہا۔

﴿ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ ﴾ (فرقان)

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب' باب تغیر الاسم القبیح۔

[2] ابوداؤد کتاب الادب لا یقول خبثت نفسی۔

[3] صحیح مسلم کتاب المساجد۔

تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنا خدا خود اپنی نفسانی خواہش کو بنالیا ہے۔

اسی لیے بڑا بت وہی ہے جس کو انسان نے خود اپنے دل کے بت خانے میں چھپا رکھا ہے اس بت کو توڑنا توحید کی اصلی تکمیل ہے آپ نے بتایا کہ انسان کے تمام کاموں کا دارومدار خود اس کے دل کے عمل پر ہے۔

﴿اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ﴾

اس لئے ایک مسلمان کے ہر قسم کے کاموں کا اصلی محرک صرف خدا کا حکم‘ خدا کا خوف‘ خدا کی اطاعت‘ خدا کی خوشنودی‘ خدا کی محبت‘ غرض صرف خدا ہونا چاہیے‘ جس درجہ تک ایک مومن کی اس قلبی کیفیت میں ترقی ہوگی اس کے ایمان وتوحید کی تکمیل بھی پایہ کمال کو پہنچتی جائیگی‘ اسی بنا پر وحی محمدی نے ہر جگہ اور ہر موقع پر انسان کو اس کے عمل کی غرض وغایت ﴿مَرْضَاۃِ اللّٰہِ﴾ اللہ کی خوشنودی ﴿مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْن﴾ خالص خدا کے لیے اور ﴿وَجْہِ رَبِّہِ الْاَعْلٰی﴾ ذاتِ خدا قرار دینے کی تعلیم دی ہے اس بنا پر انسان جو کام خدا کے علاوہ کسی اور غرض ونیت سے کرے درحقیقت اس کام کے لیے اس نے ایک مؤقت خدا الگ بنالیا اور وہ گو اس وقت لفظی اور قانونی شرک کا مجرم نہیں‘ لیکن معنوی ونفسی شرک کے ارتکاب کا یقیناً مجرم ہے‘ آپ نے فرمایا، جس نے خدا کے لیے دیا اور خدا ہی کے لیے رد کیا‘ خدا کے لیے چاہا اور خدا ہی کے لیے عداوت کی‘ اور خدا ہی کے لیے بیاہ کیا اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا[۱]

متعدد صحابیوں[۲] سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ریا چھپا ہوا شرک ہے‘ حضرت ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ چھپا ہوا شرک یہ ہے کہ انسان کوئی کام دوسرے کی موجودگی کے سبب سے کرے[۳] حضرت شدادؓ بن اوس روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کی خیرات کی اس نے شرک کیا[۴] یہی صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں آپ فرمارہے تھے کہ مجھے اپنی امت کے لوگوں پر سب سے زیادہ جس کا خوف ہے وہ شرک کا ہے ہاں میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ چاند یا سورج کو سجدہ کریں گے یا بتوں کو پوجیں گے بلکہ یہ ہے کہ وہ غیر خدا کے لیے عمل نہ کرنے لگیں، اور چھپی نفسانی خواہش[۵] میں نہ مبتلا ہوں‘ حضرت محمود بن لبید انصاریؓ آپ کا قول نقل کرتے ہیں کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ ”مجھ کو سب سے زیادہ جس کا تم پر خوف ہے وہ شرک اصغر ہے“ صحابہ نے عرض کی ”یارسول اللہ ﷺ

---

[۱] مستدرک حاکم ترمذی آخر کتاب الزہد، ترمذی کے دو نسخوں میں اس حدیث کے متعلق دو تنقیدیں درج ہیں‘ ایک میں منکر لکھا ہے اور دوسرے میں حسن اور اس کے ایک راوی اجلح کی نسبت لوگوں نے کلام کیا ہے مگر حدیث کا نفس مضمون تمام اسلامی روایات اور احکام کے عین مطابق ہے۔

[۲] حضرت ابوسعید خدری، معاذ بن جبل‘ ابوہریرہؓ‘ شداد بن اوسؓ محمود بن لبید، ابوسعیدؓ بن ابی فضالہ‘ ان صحابیوں کی روایتیں‘ ابن حنبل‘ ابن ماجہ، مستدرک وغیرہ میں ہیں۔

[۳] مستدرک حاکم کتاب الرقاق صفحہ ۳۲۹ جلد ۴ (صحیح)۔

[۴] بحوالہ سابق مستدرک، ابن حنبل مسند شداد بن اوس صفحہ ۱۲۶ جلد ۴۔

[۵] سنن ابن ماجہ باب الریاء والسمعہ۔

! شرک اصغر کیا ہے؟" فرمایا "ریا" قیامت کے دن جب لوگوں کو اپنے اپنے عمل کا بدلہ مل رہا ہوگا خدا ریا کار لوگوں سے کہے گا کہ تمہارے لئے ہمارے ہاں کچھ نہیں تم انہیں کے پاس جاؤ جن کے دکھانے کو دنیا میں یہ کام کیا کرتے تھے [1] حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ "ایک موقعہ پر ہم لوگ دجال کے متعلق آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اسی اثناء میں آنحضرت ﷺ تشریف لے آئے اور فرمایا کہ دجال سے بڑھ کر جو خوفناک چیز میرے نزدیک ہے کیا میں تم کو اس سے آگاہ نہ کروں؟ ہم سب نے عرض کی "ہاں یارسول اللہ ﷺ" فرمایا وہ شرک خفی ہے یعنی یہ کہ مثلاً کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے تو وہ نماز کو محض اس لئے درست کر کے پڑھے کہ کوئی دوسرا شخص اس کو دیکھ رہا ہے [2] ابوسعید بن ابی فضالہ انصاری بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "قیامت میں جب خدا اگلوں اور پچھلوں کو یکجا کرے گا" تو ایک منادی آکر پکارے گا کہ جس کسی نے اپنے عمل میں خدا کے ساتھ کسی غیر کو بھی شریک بنا لیا ہو تو وہ اپنا ثواب اس غیر سے مانگے' کہ خدا ساجھے سے بے نیاز ہے [3] ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے ارشاد کیا کہ خدا فرماتا ہے کہ میں تمام شریکوں میں سب سے زیادہ شرکت سے بے نیاز ہوں تو جس نے اپنے کسی کام میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کر لیا تو میں اس سے الگ ہوں اور وہ اسی کا ہے جس کو اس نے میرا شریک بنایا۔ [4]

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ صحابہ اپنے ہر عمل میں اس شرک خفی سے ڈرتے تھے، شداد بن اوسؓ کہتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے زمانہ حیات میں ریا کو شرک اصغر گنا کرتے تھے [5] ایک دفعہ حضرت عمر فاروقؓ جا رہے تھے دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبلؓ صحابی آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں، حضرت عمرؓ نے رونے کا سبب دریافت کیا، تو انہوں نے قبر مبارک کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس قبر میں مدفون ہستی نے کہا تھا کہ "ریا کا ادنی شائبہ بھی شرک ہے" [6] اسی طرح ایک دفعہ عبادہ تابعیؒ نے دیکھا کہ حضرت شداد بن اوسؓ صحابی اپنی جانماز پر بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں، رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن میں نے رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ اقدس پر غم وملال کے آثار دیکھے' عرض کی میرے ماں باپ حضور پر فدا ہوں اس حزن وملال کا سبب کیا ہے ارشاد ہوا کہ میں اپنے بعد اپنی امت پر ایک چیز سے ڈرتا ہوں" عرض کیا یارسول اللہ وہ کیا ہے؟" فرمایا شرک اور چھپی نفسانی خواہش۔ میں نے دوبارہ گذارش کی یارسول اللہ! کیا آپ کی اُمت آپ کے بعد شرک میں مبتلا ہوگی؟ فرمایا اے شداد! میری امت یقیناً سورج یا چاند یا بت اور پتھر کی پرستش نہیں کرے گی لیکن وہ اپنے عمل کی نمائش اور ریا کرے گی عرض کیا "یارسول اللہ کیا ریا

---

[1] ابن حنبل مسند محمود بن لبید انصاریؓ صفحہ ۴۲۸ جلد ۵ ابوداؤد و مسند ابن حنبل۔

[2] سنن ابن ماجہ باب الریاء والسمعہ۔

[3] سنن ابن ماجہ باب الریاء و ترمذی و مسند ابن حنبل۔

[4] ابن ماجہ باب الریاء۔

[5] مستدرک حاکم کتاب الرقاق جلد ۴ صفحہ ۳۲۹ (صحیح)۔

[6] مستدرک حاکم کتاب حوالہ مذکور صفحہ ۳۲۸ (صحیح)۔

شرک ہے؟ فرمایا ''ہاں''۔[1]

ان واقعات اور تعلیمات کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کس طرح ہر پہلو سے شرک کی تردید اور توحید کی تکمیل فرمائی ہے وہی عرب جو پہلے خدا کے سوا ہر چیز کی پرستش کرتے تھے انہوں نے آپ کی تعلیم کے اثر سے خدا پرستی اور توحید کی انتہائی معراج حاصل کر لی۔

* * *

---

[1] مستدرک بحوالہ مذکور سابق، حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد لکھا ہے، مگر ذہبی نے تصریح کی ہے کہ ''اس کا ایک راوی عبدالواحد بن زید متروک ہے'' تاہم چونکہ حدیث کا نفس مضمون مسند ابن حنبل (جلد ۴ صفحہ ۱۲۶) اور سنن ابن ماجہ (باب الریاء) میں ایسے سلسلوں سے مذکور ہے، جن میں یہ عبدالواحد نہیں پڑتا، اس لئے ہم نے اس حدیث کو یہاں درج کیا ہے۔

توحید

اور

اس کے ایجابی اصول وارکان

یہ تو توحید کے سلبی اجزا تھے یعنی توحید کے مخالف عقائد اور خیالات کی نفی اور تردید' لیکن نبوت محمدی کا کارنامہ اس سے بالاتر ہے اور وہ توحید کی اصل بنیاد کی استواری، اس کے اصول کی تعیین' امور ایمان کی تفصیل اور اس کے اجزا کی تکمیل ہے۔ عرب میں شرک و بت پرستی بھی تھی اور کہیں کہیں آسمانی مذاہب کی محرف صورتیں بھی موجود تھیں مگر ایک صحیح مذہب کا تخیل ان کے سامنے مطلق نہ تھا اس بنا پر عقائد اور ایمان کی کوئی صحیح اور مرتب صورت بھی ان کے ذہن میں نہیں ہوسکتی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے تمام پچھلے خرافات اور اوہام کو' جن کو دین کا درجہ دیا گیا تھا' یک قلم محو کردیا بت پرستی' فرشتہ پرستی' ستارہ پرستی' فطرت پرستی' انسان پرستی غرض شرک کی تمام صورتیں قطعاً مٹا دیں اور ان کی جگہ مرتب، متعین' سنجیدہ عقائد اور سچائیوں سے معمور چند حقائق کی تعلیم دی جو انسان کے تمام اعمال اور اخلاق کے لیے بنیادی پتھر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل:

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز خدا کی ہستی کا یقین اور پھر اس کی توحید پر ایمان ہے۔ دنیا میں جتنے پیغمبر آئے ان میں سے ہر ایک نے اس قادر مطلق کی طرف لوگوں کو دعوت دی مگر یہ دعوت ان کے ایک مسلم دعویٰ کی حیثیت سے تھی' انہوں نے اس دعویٰ کو دلائل کا محتاج نہ سمجھا اور حقیقت میں جن محدود زمانوں میں قوموں کے لیے ان کی بعثت ہوئی ان کے لیے دلیل اور برہان کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ ان کے زمانوں میں بت پرستی، ستارہ پرستی اور فطرت پرستی کا رواج تھا' الحاد کا وجود نہ تھا لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت عمومی تھی، جو آخری زمانہ تک کے لئے اور تمام قوموں کے لئے تھی اور علم الٰہی میں یہ تھا کہ بعثت محمدی کے بعد عقل انسانی تحقیق و تلاش کے آخری مراحل طے کرنا چاہے گی، اور قدرت کے سربمہر خزانے وقف عام ہونگے اور عقلیت کا دور دورہ ہوگا اور ہر شے دلیل و ثبوت کی محتاج قرار پائے گی' اس لیے محمد رسول اللہ ﷺ کو دلائل و براہین، ثبوت اور شواہد کی بھی تلقین کی گئی۔

ایک اور سبب یہ ہے کہ انبیائے سابقین صرف اپنی قوموں کی دعوت پر مامور ہوئے تھے جن میں مشرکین کا وجود تھا' ملحدین کا نہ تھا' لیکن خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت تمام قوموں اور طبقوں کے لیے ہوئی اس لیے آپ کی دعوت میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ آپ انسانی عقل کی ہر صنف کو مخاطب کررہے ہیں اور اس کے معیار اور سطح کے مطابق اس قادر مطلق کی ہستی اور وجود پر دلیلیں بھی پیش کررہے ہیں اس لیے آپ نے دوسرے پیغمبروں کی طرح صرف مشرکوں کو مخاطب نہیں فرمایا بلکہ مشرکوں' کافروں' ملحدوں' مشککوں' دہریوں' ہر ایک کو مخاطب فرمایا اور ان میں سے ہر ایک کی تسکین و تشفی کا سامان بہم پہنچایا۔

ایک قادر مطلق، خالق عالم اور صانع کائنات کی ہستی کے ثبوت اور انکار پر جب سے فلسفہ کا وجود ہے' ہمیشہ

بحثیں پیدا ہوتی رہی ہیں اور دلیلیں پیش کی جاتی رہی ہیں۔ مصر، یونان، ہندوستان، اسلامی ممالک اور آج یورپ میں بھی اس مسئلہ پر عقلائے زمانہ نے اپنی جودت ذہن، نکتہ رسی اور دقیقہ فہمی کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے مگر غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ دلائل کی زبان اور طرز تعبیر میں گو تبدیلی ہوتی رہی ہے، مگر اصل مغز سخن صرف ایک ہے اس بنا پر وحی محمدی نے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود پر جو دلیل قائم کی اس میں اسی ایک مغز سخن کو لے لیا ہے اور نہایت مؤثر طرز ادا میں اس کو بار بار دہرایا ہے اور انسانوں کو متنبہ کیا ہے۔

وحی محمدی کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادر مطلق خالق عالم اور صانع کائنات ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے[1] متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے آثار قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مردہ اور گمنام قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا، جن میں سامان تمدن، اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس ہوتی ہے مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی ان میں نظر نہیں آتی ان کی عمارتوں کے منہدم کھنڈروں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہے، آج بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیل سے بہرہ ور ہیں، غرض جماعت انسانی کا کوئی حصہ، زمین کا کوئی گوشہ، زمانہ کا کوئی عہد اس تخیل سے خالی نہیں ملتا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف بھی انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے اسی لیے وحی محمدی نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے۔

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (روم)

اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کر، یہ خدا کی وہ فطرت ہے، جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا، خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں، یہی سیدھا اور ٹھیک دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔

﴿كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ﴾

ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

اسی لئے خدا کا اعتراف روز ازل کا وہ عہد و پیمان ہے جو خالق و مخلوق میں ہوا تھا اور یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں وہ اعتراف نمایاں ہو جاتا ہے، قرآن پاک نے اس واقعہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا﴾ (اعراف)

اور جبکہ تیرے خدا نے بنی آدم کی پیٹھ سے ان کی نسل کو لیا، اور خود ان کو ان ہی پر گواہ کیا، کہ کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں، انہوں نے کہا ہاں ہم گواہ ہیں۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان۔

انسان کا یہ جذبہ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے وحی محمدی نے بار بار انسان کے اسی دبے ہوئے جذبہ کو ابھارا ہے اور اسی زیر خاکستر آگ کو ہوا دی ہے اور انسان کو اس کا بھولا ہوا وعدہ یاد دلایا ہے وہ انسانوں سے پوچھتی ہے۔

﴿ اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (ابراھیم)

کیا آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے؟

ایک اور مقام پر اس نے کہا

﴿ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ ھُمُ الْخَالِقُوْنَ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ ﴾ (طور)

کیا وہ آپ ہی آپ بن گئے یا وہی اپنے آپ خالق ہیں یا انہیں نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا یہ کوئی بات نہیں بلکہ ان کو یقین نہیں۔

دنیا اور کائنات جس میں انسان بھی شامل ہے اور جو اپنی عقل اور فہم کی بنا پر سب میں بالاتر ہے، بہر حال موجود ہے اور اس کے اس وجود میں کوئی شک نہیں ہے اب سوال یہ ہے کہ کسی کے بن بنائے وہ آپ سے آپ بن گئی یا خود اس نے اپنے آپ کو بنالیا ہے ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ نہ آپ سے آپ کوئی چیز بن سکتی ہے اور نہ کوئی مفعول اپنا فاعل آپ ہوسکتا ہے اگر کوئی بے وقوف یہ کہے کہ نر و مادہ مل کر اپنا بچہ پیدا کرتے ہیں تو اس سے پوچھا جائے گا کہ سلسلہ توالد و تناسل کا آغاز کیونکر ہوا اور اولین نر و مادہ کا اور مادہ تخلیق و روح کا خالق کون ہے۔

یہ گوناگوں علم، یہ رنگارنگ کائنات، یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلموں زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ لاکھوں جاندار اور بے جان اشیاء، یہ علل او اسباب کا تسلسل، یہ تغیر و انقلاب کا نظام، یہ کائنات کا نظام اور اس کے ذرہ ذرہ کا قاعدہ و قانون، انسان کے اندرونی قویٰ اور ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار، خواص و قویٰ کے رموز انسان کی خیالی، بلند پروازی اور عملی عجز و درماندگی یہ تمام باتیں ایک خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں یہ نیلگوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالق کل کا پتہ دیتا ہے۔

﴿ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴾ (آل عمران۔ ۱۹۰)

آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

یہ شب و روز کا نور و ظلمت، یہ سورج اور چاند کی روشنی، ان کی مقررہ رفتار اور باقاعدہ طلوع و غروب اسکی دلیل ہے کہ اس ابلق ایام پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میں اس کا سیاہ و سپید ہے۔

﴿ وَمِنْ اٰیٰتِہِ الَّیْلُ وَالنَّھَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴾ (فصلت)

اور اس کی نشانیوں میں سے رات دن اور سورج اور چاند ہیں۔

آسمان اور زمین کی پیدائش، دن اور رات کا الٹ پھیر تو ہے، دیکھو کہ خطرناک سمندروں میں کس طرح ایک ملک سے دوسرے ملک کو تجارت کا سامان لے کر دوڑے پھرتے ہیں اگر پانی میں مٹی اور لوہے کا ایک ذرہ بھی ڈالو تو فوراً ڈوب جائے گا مگر لاکھوں من کے لدے ہوئے جہاز کیسے پھول کی طرح پانی پر تیر رہے ہیں جس فطری قاعدہ کے بموجب یہ عمل

ظہور میں آ رہا ہے وہ جس کے حکم سے بنا ہے اس کا کتنا بڑا احسان ہے پھر ان سمندروں سے بخارات اٹھتے ہیں وہ اوپر جا کر بادل بنتے ہیں اور وہ وہیں پہنچ کر برستے ہیں، جہاں پیداوار اور زمین کی نشو و نما کی حاجت ہو اور پھر وہ بادل ہواؤں کے تخت پر بیٹھ کر کیسے ادھر ادھر ضرورت کے مطابق اڑتے پھرتے ہیں۔

﴿ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴾ (بقرہ)

بے شبہ آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش، اور دن رات کے الٹ پھیر میں، اور ان جہازوں میں جو انسانوں کے لئے فائدہ رساں سامان لے کر سمندر میں چلتے ہیں اور آسمان سے اس کے پانی برسانے میں، اور پھر اس پانی کے ذریعہ مرے پیچھے زمین کو زندگی بخشنے میں اور زمین میں ہر طرح کے جو چلنے والوں کے پھیلانے میں، اس میں اور ہواؤں کے کبھی اِدھر اُدھر اڑنے میں اور آسمان اور زمین کے بیچ میں جو بادل کام میں لگے ہیں، ان سب میں سمجھ بوجھ والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔

آسمان اور زمین کی عجیب و غریب خلقت کے ساتھ خود انسان کی اپنی پیدائش کی حکایت کتنی عجیب ہے۔

﴿ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَفِیْ خَلْقِكُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ﴾ (جاثیہ۔۳۔۴)

بیشک آسمانوں میں اور زمین میں ایمان والوں کیلئے نشانیاں ہیں اور خود تمھاری پیدائش میں اور جو چلنے والے پھیلائے ان میں یقین کرنے والوں کے لیے دلیلیں ہیں۔

سورہ انعام میں نباتات اور اس کی نیرنگیوں کو اپنی ہستی کی دلیل میں پیش کیا، یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک ہی زمین ہے جس میں سے وہ اُگتے ہیں، ایک پانی ہے جس سے وہ سینچے جاتے ہیں، ایک ہی ہوا ہے جس سے وہ سانس لیتے ہیں مگر کتنے رنگ برنگ کے پھل پھول میوے اور درخت لگتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا رنگ، ہر ایک کا مزہ، ہر ایک کی پتی، ہر ایک کا قد و قامت، ہر ایک کے خواص اور فائدے، دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔

﴿ وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴾ (انعام)

اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس سے اُگنے والی ہر چیز نکالی، پھر اس سے سبز خوشے نکالے جن سے ہم جڑے ہوئے دانے نکالتے ہیں، اور کھجور کے گابھے میں سے لٹکتے گچھے اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار ہم شکل، اور جدی جدی شکل کے، جب وہ پھلیں تو ان کے پھل اور پکنے کو دیکھو، ان میں ایمان والے لوگوں کے لیے دلیلیں ہیں۔

سورہ روم میں پہلے مٹی سے انسان کی پیدائش کو، پھر اس میں عورت مرد کے جوڑے ہونے کو، اور ان کے درمیان

مہر و محبت کے جذبات کے ظہور کو اپنی ہستی کی دلیل بتایا ہے۔ پھر اپنی قدرت کے دوسرے عجائبات کو جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں ایک ایک کر کے پیش کیا ہے۔ اول تو خود انسان کی پیدائش، پھر ان میں عورت مرد ہونا اور ان کے درمیان جذبات کی لہر پھر مختلف قوموں کی بولیوں' شکلوں اور رنگوں کو دیکھو کہ ایک ایک سے الگ ہے، پھر خود انسانوں کے اندر کے اعمال دیکھو' ایک نیند ہی کی حقیقت پر غور کرو' یہی تمہاری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ﴾ (روم ۲۰۔۲۶)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے بنایا' پھر تم آدمی بن کر چلتے پھرتے ہو' اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے جنس سے تمہارے جوڑے بنائے کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم سب کے درمیان پیار اور مہر رکھا' اس میں ان لوگوں کے لئے جو سوچتے ہیں' دلیلیں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں کی اور زمین کی بناوٹ اور تمہاری بولیوں اور رنگوں کی بوقلمونی ہے' اس میں جاننے والوں کے لئے یقیناً دلیلیں ہیں' اور اس کی عجیب قدرتوں میں سے تمہاری رات اور دن میں نیند ہے' اور تمہارا اس کی مہربانیوں کو تلاش کرنا ہے، اس میں ان کے لئے جو سنتے ہیں دلیلیں ہیں' اور اس کے عجائب قدرت میں سے یہ ہے کہ تمہیں وہ بجلی کی چمک دکھاتا ہے جس سے تم ڈرتے ہو' اور کبھی (رحمت کی بارش کی) امید رکھتے ہو' اور وہ آسمان سے پانی برساتا ہے' پھر اس سے زمین کو اس کے مرے پیچھے زندہ کرتا ہے' اس میں ان کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں' دلیلیں ہیں اور اس کی دلیلوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔

اس اخیر آیت میں آسمان و زمین کے اس کے حکم سے قائم رہنے کا ذکر ہے۔ تم کہتے ہو کہ یہ باہمی جذب و کشش سے قائم ہیں لیکن خود یہ جذب و کشش کس کی کشش کا نتیجہ ہے؟ یہ خود حیرت انگیز ہے' سورہ لقمان میں آسمانوں کے کسی نظر نہ آنے والے کے سہارے کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر ٹھہرے ہونے کا ذکر ہے۔ یہ نظر نہ آنے والا سہارا قوت کشش ہی سہی وہ بھی تو اسی کے اسرار میں سے ہے۔ اس کے بعد ایک جان دار اور بے حیات مردہ زمین کے اندر سے پانی برسنے کے ساتھ انواع واقسام کی زندگی کے نمونوں کا ابھرآنا کتنا حیرت انگیز ہے' یہ بھی اسی کا کرشمہ ہے۔

﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ﴾ (لقمان۔۱۰)

اس نے آسمانوں کی چھت کو کسی ایسے ستونوں کے بغیر کھڑا کیا ہے جو تم کو نظر آتے ہوں' اور زمین میں ایسے کھونٹے ڈال دیئے کہ وہ تم کو لے کر ہل نہ جائے اور اس نے اس زمین پر ہر قسم کے چلنے پھرنے والے پھیلائے اور آسمان

سے پانی برسایا پھر ہم نے اسی زمین سے ہر اچھے جوڑے پیدا کئے۔

سورۂ سجدہ میں انسان کی پیدائش کا مٹی سے آغاز، پھر قطرہ آب (نطفہ) کے ذریعہ توالد و تناسل، پھر اس کے سڈول جسم کا بن جانا، پھر اس مٹی کے مردہ قالب میں دفعتہً کہیں سے زندگی آ جانا اور اس میں روح پھک جانا اور اس میں علم و حواس کے حیرت انگیز آلات کا پیدا ہو جانا ان سب کو اپنی صفت میں پیش کیا ہے۔

﴿ اَلَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۝ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴾ (سجدہ۔۷۔۱۰)

وہ جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی، اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی، پھر اس کی نسل ذلیل سے نچڑے پانی سے بنائی، پھر اس کو سڈول کیا، اور اُس میں اپنی جان سے کچھ پھونک دیا، اور تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنا دیئے تم ان احسانوں کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔

مردہ زمین کے اندر کیا کیا قوتیں ودیعت ہیں اور خود انسانوں کے جسم و جان میں عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے لیکن کوئی صاحب نظر ادھر نہیں دیکھتا انسان کی زندگی، اس کے اندرونی جذبات، حواس، ذہنی قویٰ اور دماغی حرکات ان میں سے ہر شے معمہ ہے۔

﴿ وَ فِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۝ وَ فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ (ذاریات)

اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں، اور خود تمہاری جانوں کے اندر، کیا تم نظر نہیں کرتے۔

جانوروں کے جسموں کے اندر جو عجیب و غریب نظام ہے وہ بھی غور کے قابل ہے ایک ہی گھاس پھوس کی غذا ان کے پیٹ میں جاتی ہے۔ پھر اس کا کچھ حصہ لید اور گوبر، کچھ خون اور کچھ دودھ بن جاتا ہے اور اسی لید اور گوبر کے باہر آنے کے راستوں اور سرخ خون کی رگوں کے درمیان سے خالص، سپید، شیریں دودھ کی دھاروں کا نکلنا کتنا عجیب ہے؟

﴿ وَ اِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِیْكُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ ﴾ (نحل)

اور تمہارے لئے جانوروں میں عبرت ہے، ہم تمہیں ان کے پیٹوں کے اندر سے لید اور خون کے بیچ سے خالص اور پینے والوں کے لئے خوشگوار دودھ پلاتے ہیں۔

ایک ہی قسم کے پھل ہیں اگر ان کو ایک طرح سے کھاؤ تو تمہاری عقل اور قوت کو بڑھاتے ہیں اور دوسری طرح کھاؤ تو وہ ان کو ضائع کر دیں۔

﴿ وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ وَ الْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴾ (نحل)

اور کھجوروں اور انگوروں کے پھلوں کو دیکھو کہ ان میں سے کچھ سے تو تم نشہ اور اچھی روزی حاصل کرتے ہو، اس میں سمجھ والوں کے لئے دلیل ہے۔

زمین اور زمین پر کی مخلوقات کو چھوڑ کر اوپر آسمان کی طرف نظر اٹھاؤ، سورج کا روشن چراغ اور چاند کی خوشنما

قندیل کتنی عجیب ہے۔ پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینوں میں آسمان کے بارہ برجوں کو طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسموں اور زمانوں کو نمایاں کرتا ہے۔

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ﴾ (فرقان)

بابرکت ہے وہ ہستی جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور ان میں ایک چراغ اور چمکانے والا چاند بنایا

انہیں چند چیزوں میں اس کی قدرت کے عجائبات محدود نہیں بلکہ ہر شے اپنی خلقت، اپنی محکم روش اور اپنے قانون فطرت سے اس کی گواہی دیتی ہے۔

﴿ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْۤ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ ﴾ (نمل)

اس ہستی کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو مضبوط نظام پر بنایا۔

اس کی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے اس میں مستحکم نظم و نسق کی بندش نظر آتی ہے۔

﴿ مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ ﴾ (ملک)

تجھے مہر والے خدا کی بناوٹ میں کوئی بے برابری نظر آتی ہے؟ پھر نگاہ کر کیا کوئی فطور دکھائی پڑتا ہے، پھر دہرا کر دوبارہ نظر کر، تیری نگاہ ردھو کر تھک کر تجھ تک پلٹ آئے گی (مگر کوئی نقص نہ پائے گی)

اس قسم کی اور سینکڑوں آیتیں ہیں جن کا استقصا بھی مشکل ہے ان آیتوں میں تین قسم کے دلائل ہیں۔

۱۔ قدرت کے عجائبات اور نیرنگیاں، اور پھر ان کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔

۲۔ عالم کا نظم و نسق اور اس کا مرتب سلسلہ۔

۳۔ کائنات اور سلسلہ عالم کی ہر کڑی میں بے انتہا مصلحتوں، حکمتوں اور فائدوں کا ہونا۔

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منظم علل و اسباب، خود بخود بخت و اتفاق سے نہیں بن گئے بلکہ کسی حکیم و دانا اور قادر مطلق صانع نے اپنی قدرت اور ارادہ سے ان کو بنایا ہے۔

اہل فلسفہ اور متکلمین عالم کے وجود پر عموماً یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ ہم بداہۃً دیکھتے ہیں کہ عالم میں ہر چیز کے لئے علل و اسباب ہے، یہ سلسلہ یا تو کہیں جا کر ختم ہوگا یا یوں ہی مسلسل چلا جائے گا۔ اگر یہ یوں ہی مسلسل چلا جائے گا تو لازم آتا ہے کہ ہر چیز کے پیدا ہونے پر غیر متناہی علل گذر جائیں اور غیر متناہی علل کا خاتمہ نہیں ہوسکتا اور نہ کہیں اس کا آغاز ہوسکتا ہے اس لئے کوئی چیز پیدا بھی نہیں ہوسکتی۔ تسلسل عقلاً بھی محال ہے، بلکہ انسان اس کے تخیل سے بھی عاجز ہے اس بنا پر لامحالہ سلسلہ علل کا کہیں خاتمہ ہونا ضروری ہے جس علت کل پر تمام علتیں ختم ہو جاتی ہیں وہی خلق و پیدائش اور وجود و کون کی اصلی علت العلل ہے۔

یہ دلیل گو بہت کچھ پیچیدہ اور اصطلاحات سے لبریز اور بہت سے محذوف مقدمات پر مبنی ہے تاہم وہ انسانی عقل میں آتی ہے اور بہتوں کے لئے تسکین کا باعث ہے۔ قرآن پاک کی ایک دو آیتوں میں بھی اس دلیل کا ماخذ مذکور ہے۔ سورہ ہود کے آخر میں ہے۔

﴿ وَ لِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَیْهِ ﴾ (ہود)

اور خدا ہی کے پاس ہے آسمانوں اور زمین کی چھپی بات اور اسی کی طرف ہر بات لوٹائی جاتی ہے تو اس کو پوجو اور اس پر بھروسہ رکھو۔

﴿ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴾ (نجم۔۴۲)

اور یہ کہ تیرے رب کی طرف ہے سب کی انتہا

آنحضرت ﷺ انسانی کمزوریوں سے واقف تھے۔ چند صحابیوں نے آ کر عرض کیا' یارسول اللہ ﷺ کبھی کبھی ہمارے دلوں میں ایسے خیالات اور وسوسے آتے ہیں جن کو ہم زبان سے ادا نہیں کر سکتے۔ فرمایا کیا تم کو یہ کیفیت حاصل ہو گئی؟ گذارش کی ہاں یارسول اللہ! فرمایا یہ تو خالص ایمان ہے مقصود یہ ہے دل میں وسوسوں کا آنا اور پھر ان وسوسوں کو اتنا بدتر جاننا کہ ان کا زبان پر لانا بھی وہ گناہ سمجھے یہ کیفیت ایمانی کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح آپ نے فرمایا لوگ علم و دانش کا سوال کرتے ہیں کہتے ہیں کہ خیر اس کو تو خدا نے پیدا کیا اور پھر اس خدا کو کس نے پیدا کیا۔ آسمان کو خدا نے بنایا زمین کو خدا نے بنایا یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے پھر پوچھتے ہیں اچھا تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا؟ فرمایا یہ شیطانی وسوسہ ہے جب یہ حالت کسی کو پیش آئے تو کہہ دے ﴿ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ﴾ میں اللہ پر ایمان لایا۔ [۱]

یہ تعلیم درحقیت اسی مسئلہ کی ہے کہ خدا پر تمام علتوں کی انتہا ہے اور اس کے بعد کوئی علت نہیں اس لئے یہ وسوسہ لائق جواب نہیں یہ جہالت اور نادانی کا سوال ہے۔

توحید پر عقلی دلیلیں:

اگر کوئی عالم کا خالق و صانع ہے تو وہ یقیناً ایک ہے دو نہیں' تاہم دنیا میں ایسے عقلمند بھی ہیں جو دو تین اور متعدد خداؤں کے قائل ہیں اور عالم کی ایک مملکت کو سینکڑوں حصوں میں تقسیم کر کے ان کو مختلف خداؤں کی حکومتیں قرار دیتے ہیں وحی محمدی نے اس شرک کے ابطال پر سب سے زیادہ جس دلیل کو پیش کیا ہے وہ نظام عالم کی یکسانی اور وحدت اور کائنات کے علل و اسباب کا باہم توافق' تعاون' اشتراک اور اتحاد ہے۔ دنیا میں ایک ذرہ بھی اس وقت تک پیدا ہو نہیں سکتا جب تک آسمان سے لے کر زمین تک کی تمام کارکن قوتیں اور اسباب ایک دوسرے سے موافق و مناسب نہ ہوں اور باہم ان میں اشتراک عمل پیدا نہ ہو' ایک دانہ زمین سے اس وقت تک اگ نہیں سکتا جب تک دانہ اگنے کے لائق نہ ہو، زمین میں اگانے کی صلاحیت نہ ہو، موسم اس کے مناسب نہ ہو' بارش موافق نہ ہو' آفتاب سے اس کو گرمی اور روشنی اس کے مزاج کے مطابق بہم نہ پہنچے، پھر اس کے اگنے کے موانع اور عوائق ایک ایک کر کے دفع نہ ہوں' ان سب مراحل کے بعد وہ دانہ اگے گا اور پھل لائے گا' قرآن پاک نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

﴿ لَوْ كَانَ فِیْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ﴾ (انبیا)

اگر زمین و آسمان میں اس ایک خدائے برحق کے سوا چند اور خدا بھی ہوتے' تو زمین و آسمان برباد ہو جاتے' تو پاک ہے عرش والا خدا ان باتوں سے جو یہ مشرک کہتے ہیں۔

---

[۱] یہ دونوں حدیثیں صحیح مسلم کتاب الایمان میں متعدد روایتوں سے مذکور ہیں۔

آسمان و زمین کا یہ تمام کاروبار یہ تمام قوانین قدرت اگر ایک کے بجائے دو طاقتوں کے ہاتھوں میں ہوتے تو یہ باہمی تصادم میں ایک لمحہ کے لئے بھی قائم نہ رہتے۔ فلسفیانہ اصطلاحات میں اس مطلب کو ادا کرو تو یوں ہوگا کہ عالم کائنات معلول ہے اس کی کوئی علت تامہ ہوگی۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک معلول کی دو علت تامہ نہیں ہو سکتیں کیونکہ علت تامہ اس کو کہتے ہیں جس کے وجود کے بعد معلول کے وجود میں کسی اور چیز کا انتظار نہ ہو۔ اب عالم کی علت تامہ اگر ایک نہ ہو بلکہ دو ہوں تو سوال یہ ہے کہ ایک علت تامہ کے وجود کے بعد عالم کے وجود میں دوسری علت تامہ کا انتظار رہے گا یا نہیں، اگر رہے گا تو پہلی شے علت تامہ نہیں رہے گی اور اگر انتظار نہ رہے گا تو دوسری شے علت تامہ نہ ہوگی۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ عالم کی علت تامہ ایک ہی ہو سکتی ہے۔

توحید کے ثبوت اور شرک کے ابطال کی دوسری دلیل نظام عالم کی وحدت ہے، سورج چاند اور تاروں سے لے کر انسان، حیوان، ہوا، پانی، درخت، گھاس پات تک دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ سب ایک مقررہ نظام اور بندھے اصول کے ماتحت ہیں جن میں کبھی سر موفوق نہیں ہوتا۔ ہر شے اپنے ایک اصول کی پابند اور ایک عادت جاریہ کے مطابق چل رہی ہے، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں یکسانی اور مساوات کی ایک خاص وحدت قائم ہے اور وہ سب کسی ایک ہستی کے اشارے پر چل رہے ہیں۔

﴿ وَمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ (مومنون)

اور نہ اس خدائے برحق کے ساتھ کوئی اور خدا ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو الگ لے جاتا، اور ایک دوسرے پر چڑھ جاتا

﴿ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۝ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ﴾ (بنی اسرائیل۔۴۴۔۴۲)

کہہ اگر خدائے برحق کے ساتھ اور خدا ہوتے جیسا کہ یہ مشرکین کہتے ہیں، تو ایسی حالت میں وہ تخت والے (حکمران خدا) سے حکومت چھیننے کا راستہ ڈھونڈتے، پاک اور بلند ہے خدا اس بات سے جس کو یہ مشرک کہتے ہیں، اس خدائے برحق کی پاکی ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان کے اندر ہے بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی پاکی کی گواہی نہ دیتی ہو۔

اسی وحدت نظام کے استدلال کو ایک اور آیت میں خدا نے بیان فرمایا ہے۔

﴿ مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ﴾ (ملک۔۴۔۳)

تو خدا کے بنائے میں کوئی فرق نہیں دیکھتا، پھر نگاہ کر، کیا کوئی فطور تجھ کو دکھائی دیتا ہے؟ پھر دوبارہ نظر دوڑا، تیری نظر تھک کر واپس آ جائے گی۔

اس واقعاتی استدلال سے بڑھ کر جو بالکل نظم فطرت پر مبنی ہے کوئی دوسری دلیل نہیں ہو سکتی اس لئے قرآن پاک نے اس کو اختیار کیا ہے۔ یہ دنیا وحدت نظام ہی کے ماتحت چل رہی ہے ورنہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی چل نہ سکے۔ اسی

سے اس دنیا کے حاکم و فرمانروائے مطلق کی وحدت بخوبی ثابت ہے۔

توحید کی تکمیل:

توحید خواہ کسی قدر محرف، شرک آمیز اور ناقص شکل میں ہو، دنیا کے تمام مذاہب اور ادیان کی مشترک اور اولین تعلیم ہے۔ لیکن ان مذاہب میں وہ کسی خاص اصل پر مبنی نہ تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس عمارت کو چند بنیادی اصول کے پتھروں پر قائم کیا، یہ پتھر کیا ہیں؟ یہ پتھر خدا کی حقیقی عظمت کی شناخت اور اس عالم کائنات میں انسان کی اصلی حیثیت اور مرتبہ کی تعیین ہیں۔

خدا کی حقیقی عظمت:

اہل عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق بھی مانتے تھے مگر اس کو قدرت کے کارخانہ کا تنہا مالک نہیں سمجھتے تھے۔ یہودیوں کا خدا ایک خاندانی خدا تھا جس نے ساری دنیا صرف بنی اسرائیل کے لئے پیدا کی تھی اور اس کو بنا کر ساتویں دن وہ تھک کر بیٹھ گیا وہ انسانوں سے کشتی لڑتا تھا، اس کی اولادیں تھیں۔ عیسائیوں کا خدا سب کچھ مسیح بن مریم کو دے کر خود معطل ہو گیا تھا۔ ایرانیوں کے خدا کی خدائی نیکی و بدی کی دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ہندوؤں کا خدا اوتاروں کا بھیس بدل کر لاکھوں خدا بن گیا تھا اور برہما مہیش اور بشن تین نے مل کر خدائی کے کاروبار کی باہم تقسیم کر لی تھی۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے اس خدا کا جلوہ نمایاں کیا جو آسمان کے اوپر سے لے کر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے۔ اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں، اس کی شاہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں، اس کے کارخانہ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں، کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں، دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں۔ شجر، حجر، جنگل، دریا، پہاڑ، صحرا، سورج، چاند، زمین و آسمان، انسان، حیوان، زبان والے اور بے زبان، سب اس کے آگے سربسجود اور اس کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں، سب کمزور ہیں وہی ایک قوت والا ہے، سب جاہل ہیں اسی ایک کو علم ہے، سب فانی ہیں اسی ایک کو بقا ہے، سب محتاج ہیں وہی ایک بے نیاز ہے، سب اس کے بندے ہیں وہی ایک شہنشاہ ہے، غرض عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے اور اس پر صرف اسی کی حکمرانی ہے وہ ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے، وہ ہر قسم کے صفات عالیہ، اوصاف کمالیہ اور محامد جمیلہ سے متصف ہے، اس کے مانند کوئی نہیں کوئی اس کی شبیہ و مثال نہیں وہ تشبیہ و تمثیل سے بالاتر اور انسانی رشتہ ناتے سے پاک ہے۔

﴿ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ (زمر)

وہ ہے اللہ تمہارا رب، اسی کی بادشاہی ہے، اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔

﴿ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (زمر)

آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔

﴿ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (انعام)

آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا۔

﴿ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ﴾ (انعام)

چھپی اور کھلی کا جاننے والا۔

﴿ كُلُّ شَىْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ ﴾ (قصص)

اس کی ذات کے سوا ہر چیز فانی ہے اسی کے ہاتھ میں فیصلہ کی طاقت ہے۔

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَىْءٌ وَّهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ (شوریٰ)

اس کے مانند کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

﴿ هُوَ الْحَىُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ (مومن)

وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔

﴿ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَايَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ط وَيَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ ﴾ (انعام)

غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا، خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ اس کو جانتا ہے۔ درخت کا کوئی پتہ نہیں گرتا اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہے لیکن وہ اس کے علم میں ہے۔

﴿ اَللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِى الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ (آل عمران)

اے اللہ اے بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے، جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت نصیب کرے، تیرے ہاتھ میں بھلائی ہے بیشک تو ہر بات پر قادر ہے۔

﴿ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ ط وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ط يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ (یونس)

اگر اللہ تجھے مصیبت پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کا دور کرنیوالا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کرنا چاہے تو اس کے فضل وکرم کا کوئی روکنے والا نہیں، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اپنے فضل سے ممتاز کرے اور وہی گناہوں کو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج اَلْحَىُّ الْقَيُّوْمُ ط لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ط لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ج مَنْ ذَا الَّذِىْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ط يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَىْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ج وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ج وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِىُّ الْعَظِيْمُ ﴾ (بقرہ۔۳۴)

اللہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہیں، وہی جیتا ہے اور سب اس کے سہارے جیتے ہیں، اس کو نہ اونگھ ہے نہ نیند، آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے، اسی کا ہے کون ایسا ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے، جو خلق کے روبرو ہے اور جو ان کے پیچھے ہے سب کو جانتا ہے، اور وہ اس کے علم کے کسی حصہ کا احاطہ نہیں کر سکتے، مگر وہ جو چاہے اس

کا تخت آسمانوں کو اور زمین کو سمائے ہے، ان آسمانوں کی اور زمین کی نگرانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اوپر اور بڑا ہے۔

﴿ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴾ (حدید۔۴)

جو زمین میں گھستا ہے، اور جو اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے وہ سب جانتا ہے اور تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور تم جو کچھ کرو، اللہ اس کو دیکھتا ہے آسمان اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور تمام کاموں کا مرجع وہی ہے۔

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (فاتحہ۔۱)

سب تعریف اسی کے لئے ہے جو تمام عالم کا پالنے والا ہے۔

﴿ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ﴾ (آل عمران)

اور آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کے زیر فرمان ہے۔

﴿ وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ ۝ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ۝ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ ﴾ (بروج)

وہی گناہوں کا بخشنے والا ہے، بندوں سے محبت کرنے والا ہے، تخت کا مالک ہے، بڑی شان والا ہے، جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔

﴿ يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ﴾ (جمعہ۔۱)

آسمانوں میں اور زمین میں جو ہے سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں۔

﴿ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ ﴾ (اسرائیل)

اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔

ان معنوں کی ہزاروں آیتیں قرآن پاک میں ہیں، ان تعلیمات نے خدا کی عظمت، جلالت اور کبریائی کا وہ جلوہ پیش کیا جس کے سامنے معبودان باطل کی عزت خاک میں مل گئی، بتوں کی بڑائی کا طلسم ٹوٹ گیا، سورج چاند تاروں کی خدائی کا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ جن وانس، شجر و حجر، بحر و بر، سب اس کے جلال و جبروت کے سامنے سربسجود نظر آئے، پھر اس کے سوا کون تھا جو نیرنگ وجود کے ساز سے ﴿ أَنَا اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ﴾ (میں ہوں خدا جس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں) کی صدا بلند کر سکتا۔

انسان کا مرتبہ:

توحید محمدی کا دوسرا بنیادی اصول اس عالم خلق میں انسان کی حیثیت اور درجہ ہے جو لوگ بتوں کو سجدہ کرتے ہیں پتھروں کو پوجتے ہیں، درختوں کے آگے جھکتے ہیں، جانوروں کو دیوتا جانتے ہیں جنات اور ارواح خبیثہ کے نام کی دہائی پکارتے ہیں، انسانی مخلوقات کو ارباب جانتے ہیں انسانوں کو خدا سمجھتے ہیں، وہ حقیقت میں انسان کے مرتبہ سے ناواقف ہیں وہ دراصل اس طرح انسان کو پتھروں سے، درختوں سے، جانوروں سے، دریاؤں سے، پہاڑوں سے اور چاند تاروں سے کم تر جانتے ہیں۔ انہوں نے درحقیقت انسان کے اصلی رتبہ اور حیثیت کو نہیں پہچانا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی وحی کی

زبان سے جاہل عربوں کو یہ نکتہ سوجھایا کہ انسان اس عالم خلق میں تمام مخلوقات سے اشرف ہے۔ وہ اس دنیا میں خدا کی نیابت کا فرض انجام دینے آیا ہے۔ قرآن کی ابتدائی سورۃ میں آدمؑ کی خلافت کا قصہ محض داستان نہیں، بلکہ انسان کی اصلی حیثیت کو عیاں اور نمایاں کرنے والی تعلیم کا اولین دیباچہ ہے۔ اس کو فرشتوں کا مسجود بنانا گویا تمام کائنات کا مسجود بنانا تھا۔ اس کو تمام اسماء کا علم عطا کرنا گویا تمام اشیاء کو اس کے تصرف میں دینا تھا۔ وہ ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ کے فرمان کے رو سے اس عالم میں خدا کا نائب ہے اور اس کا سر خلافت الٰہی کے تاج سے ممتاز ہے، کروڑوں مخلوقات الٰہی میں خدا کی امانت کا حامل وہی منتخب ہوا یہ منصب اعلیٰ نہ فرشتوں کو ملا، نہ آسمان کو، نہ زمین کو، نہ پہاڑ کو، صرف انسان ہی کا سینہ اس امانت کا خزانہ قرار پایا اور اسی کی گردن اس بوجھ کے قابل نظر آئی، فرمایا:

﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ﴾ (احزاب)

ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر، اور زمین پر، اور پہاڑوں پر پیش کی۔ سب نے اس بار (امانت) کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔

وحی محمدی نے انسان کا رتبہ یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بزرگیوں سے سرفراز فرمایا عالم مخلوقات میں برتر بنایا اور انعام و اکرام سے معزز کیا ہے۔

﴿ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ﴾ (بنی اسرائیل)

ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی، اور ہم نے خشکی اور تری میں ان کو سواری دی، اور ستھری چیزوں کی ان کو روزی بخشی، اور اپنی بہت سی پیدا کی ہوئی چیزوں پر ان کو فضیلت عطا کی

انسان ہی وہ ہستی ہے جو سب سے معتدل قویٰ اور بہترین اندازہ کے ساتھ دنیا میں مخلوق ہوئی۔

﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴾ (التین)

البتہ ہم نے انسان کو بہتر اندازہ پر پیدا کیا۔

یہاں تک کہ انسان خدا کی صورت کا عکس قرار پایا متعدد حدیثوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت [1] پر پیدا کیا۔ اسی بنا پر آپ نے تعلیم دی کہ غلام کو سزا دو تو اس کے چہرہ پر نہ مارو کہ وہ صورت الٰہی کا عکس ہے۔ عین میدان جنگ میں اگر تلواریں برس رہی ہوں تو حریف کے چہرہ پر وار نہ کرنا چاہئے [2] کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت [3] پر بنایا ہے۔ غصہ میں بھی نہ کہنا چاہئے کہ خدا تیرے چہرہ کو اور تیرے جیسے چہرہ کو بگاڑ دے کہ خدا نے آدم

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاستیذان، ابن ابی عاصم فی السنۃ والطبرانی من حدیث ابن عمر باسناد رجالہ ثقات وادب المفرد بخاری واحمد عن ابی ہریرہ وصحیح مسلم کتاب البر، نیز تورات میں بھی یہ فقرہ ان الفاظ میں ہے: ”جس دن خدا نے آدم کو پیدا کیا خدا کی صورت پر اسے بنایا“ (پیدائش ۵۔۲)۔

[2] صحیح بخاری کتاب العتق وصحیح مسلم کتب البر والصلۃ۔

[3] صحیح مسلم کتب البر یہ آخری ٹکڑا صرف مسلم میں ہے۔

کو اپنی صورت پر خلق کیا[1] ان حدیثوں کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کی طرح خدا کی کوئی خاص جسمانی شکل ہے اور آدم کی شکل اس کی نقل ہے لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ بلکہ یہ مطلب ہے کہ انسان میں خدا کی صفات کاملہ کی ایک دھندلی سی جھلک موجود ہے علم، قدرت، حیات، سمع، بصر، ارادہ، غضب، رحم، سخا وغیرہ تمام صفات رحمانی کی ناقص مثالیں اس کے اندر اللہ نے ودیعت کر رکھی ہیں اور چونکہ انسان کے تمام اعضا میں اس کا چہرہ ہی اس کی شخصیت کا آئینہ دار اور اس کے اکثر حواس کا مصدر ہے جن سے اس کے تمام اوصاف کا ظہور ہوتا ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے انسان کے اعضا میں اسی کو فیض رحمانی کا مورد ظاہر[2] کیا۔ اب غور کرو کہ وہ چہرہ جس کو خدا سے ایسی نسبت ہو اس لائق ہے کہ وہ غیر خدا کے آگے زمین پر رکھا جائے اور اس کی زبان سے غیر خدا کی حمد کا ترانہ نکلے۔

انسان وہ تو کائنات میں خلیفۃ اللہ بن کر آیا ہے۔

﴿ وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ ﴾ (انعام)

اور اسی نے تم کو زمین کا نائب بنایا۔

تو اب وہ کائنات میں خدا کے سوا کس کو سجدہ کرے۔

روئے زمین کی تمام چیزیں اس کی خاطر بنیں وہ روئے زمین کی خاطر نہیں بنا۔

﴿ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ﴾ (بقرہ)

جو کچھ زمین میں ہے خدا نے (اے انسانو!) تمہارے لئے بنایا۔

﴿ اِنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ ﴾ (حج)

زمین میں جو کچھ ہے، خدا نے اس کو تمہارے بس میں دے دیا ہے۔

تو وہ زمین کی کس ہستی کے سامنے سر جھکائے۔

مشرک، بت پرست، ستارہ پرست، فطرت پرست، حقیقت میں غیروں کے آگے جھک کر یہ ثبوت دیتے ہیں کہ یہ ان کے لئے نہیں بلکہ وہ ان کے لئے بنے ہیں۔ جو چاند اور سورج کو پوجتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چاند اور سورج ان کے لئے نہیں بلکہ وہ چاند اور سورج کے لئے بنے ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی وحی اور تعلیم کے ذریعہ سے یہ بتایا کہ کائنات کی ہر چیز انسان کے لئے بنی ہے اور انسان خدا کے لئے، اس لئے کائنات کا ہر ذرہ انسان کی خدمت گذاری میں مصروف ہے تو انسان کو بھی خدا ہی کی خدمت گذاری میں مصروف رہنا چاہئے۔

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری

انسانوں نے آسمانی مخلوقات کو اپنا معبود بنایا تو وحی محمدی نے انسانوں سے کہا

﴿ وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرَاتٌ بِاَمْرِہٖ ﴾ (نحل)

اور خدا نے رات دن اور چاند اور سورج کو تمہارے لئے کام میں لگایا، اور ستارے اس کے حکم میں کام میں لگے ہیں

---

[1] الادب المفرد امام بخاری باب لاتقل قبح اللہ وجہہ۔

[2] اس حدیث کی شرح میں فتح الباری شرح بخاری میں یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

انسانوں نے جانوروں کو پوجا تو پیغام محمدی نے ان انجانوں کو بتایا کہ یہ تمہارے ہیں، تم ان کے نہیں ہو

﴿ وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ ﴾ (نحل)

اور جانوروں کو اس نے پیدا کیا، تمہارے لئے جن میں اون کی گرمی اور دوسرے فائدے ہیں۔

انسانوں نے دریا اور سمندر کو دیوی اور دیوتا بنایا، حالانکہ وہ بھی انہی کی خاطر عدم سے وجود میں آئے ہیں

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ (نحل)

اور وہی خدا ہے جس نے دریا کو کام میں لگایا تا کہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ، اور تا کہ تم اس میں سے آرائش کے موتی پہننے کو نکالو اور دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر کو پھاڑتے پھرتے ہیں، تا کہ تم خدا کے فضل و کرم (روزی) کی تلاش کرو

آگ بھی انسانوں کی مسجود بنی حالانکہ وہ خود ان ہی کی محبت میں جل رہی ہے۔

﴿ اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ﴾ (یٰسین۔۸۰)

جس نے تمہارے واسطے ہرے درخت سے آگ پیدا کی، پس اس وقت تم اس سے اور آگ روشن کرتے ہو۔

الغرض زمین سے لے کر آسمان تک جو بھی مخلوق ہے انسان اس سے اشرف اور بلند تر ہے اور سب اسی کے لئے ہے پھر اس انسان سے بڑھ کر اور کون نادان ہے جو مخلوقات میں سے کسی کو اپنا معبود اور مسجود بنائے، اس حقیقت کے آشکارا ہونے کے بعد شرک کا کوئی پہلو بھی ایسا ہے جس میں کوئی سچا مسلمان گرفتار ہو سکے اور ایک آستانہ کو چھوڑ کر وہ کسی اور چوکھٹ پر اپنا سر جھکا سکے۔

الغرض محمد رسول اللہ ﷺ نے جس توحید کی تلقین کی وہ انہیں دو اصولوں پر قائم ہے ایک یہ کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف ہے اس لئے کسی مخلوق کے سامنے اس کا سر نہ جھکنا چاہئے اور دوسرا یہ کہ ہر قسم کی قوت، ہر قسم کی قدرت اور تمام اوصاف کمالیہ صرف ایک بزرگ و برتر ہستی کے لئے ہیں جو ماوراء عرش سے زیر فرش تک ہر ذرہ پر حکمران ہے اس کی اطاعت کے دائرہ سے کوئی نقطہ باہر نہیں انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اٹھ کر صرف اسی کے آستانہ پر جھکنا چاہئے۔ ہماری تمام عقیدت، ہماری تمام محبت، ہمارا تمام خوف، ہماری تمام امیدیں، ہماری تمام دعائیں، ہماری تمام التجائیں اور ہماری تمام عاجزیاں صرف اسی ایک درگاہ پر نثار ہوں اور اسی کے رحم و کرم کے سہارے ہماری زندگی کا ہر لحہ بسر ہو۔

وہ بزرگ و برتر ہستی کیا ہے؟ اور اس کی نسبت ہمارا کیا تخیل ہو؟ تعلیم محمدی نے اس کا بھی جواب دیا ہے۔

خدا کا جامع اور مانع تخیل:

قرآن پاک کی آیات، جاہلیت کے اشعار، اسلام سے پہلے عربوں کے واقعات بلکہ عرب کے آثار قدیمہ کے کتبات سے یہ واضح طور پر ثابت ہے کہ عربوں کے ذہن میں ایک بالاتر ہستی کا تخیل ضرور موجود تھا جس کا نام ان کے ہاں اللہ تھا مگر وہ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ اس کے صفات کیا ہیں؟ اس کی طرف کیا کیا باتیں منسوب کی جا سکتی ہیں؟ کن کن باتوں سے پاک ہے؟ اس کا تعلق اپنے بندوں کے ساتھ کیسا ہے؟ ہم کو اس کے آگے کیسے جھکنا چاہئے اور اس سے کیا کیا مانگنا چاہئے اور کیونکر مانگنا چاہئے؟ اس کے حضور میں دعائیں کیونکر کی جائیں؟ ہم اس سے کیوں ڈریں اور کیونکر ڈریں؟ اور

اس سے ڈرنے کی کیا حقیقت ہے؟ اور اس سے محبت بھی کی جا سکتی ہے یا نہیں اور اگر کی جا سکتی ہے تو کیونکر؟ اس سے محبت کی حقیقت کیا ہے اس کی قدرت کہاں تک ہے؟ اس کے علم کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ ہم سے دور ہے یا بالکل قریب؟ اس کے تقدس، بڑائی اور عظمت کی کوئی حد ہے؟ اس پر ہم توکل اور بھروسہ کیونکر کریں؟ کیا وہ انسانوں کی کسی صنف سے کلام بھی کرتا ہے؟ کیا اس کے کچھ احکام بھی ہیں؟ کیا اس کے احکام واجب الاطاعہ بھی ہیں؟ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے اور کن سے ناخوش؟ کیا وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے رازوں سے بھی آگاہ ہے؟ کیا اسکی اجازت کے بغیر زمین کا ایک ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا ہے؟ اسکی مشیت اور اسکا ارادہ کیونکر آسمان سے زمین تک ہر چیز کو محیط ہے؟ کیا اس کے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون بھی ہیں؟ کیا وہ انسانوں کی تعلیم اور اصلاح کے لیے پیغمبروں کو بھی مبعوث کرتا ہے؟ کیا ہم اس کے نزدیک اپنے اعمال کے جواب دہ بھی ہیں؟ ہم سے وہ کیوں اور کیونکر ہمارے اعمال کا مواخذہ کریگا؟ یہ وہ باتیں ہیں، جن سے عرب جاہلیت کا دل و دماغ بالکل عاری اور خالی تھا اور ان چیزوں کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی تخیل نہ تھا جاہلیت کا ایک ایک شعر پڑھ جاؤ، ان کے مذاہب و اعتقادات کا ایک ایک حرف تلاش کر لو اس سے زیادہ کچھ نہ پاؤ گے کہ وہ ایک طاقتور اعلیٰ ہستی ہے، جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور مصیبتوں اور بلاؤں میں اسکو پکارنا چاہئے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی ربانی تعلیمات سے ان کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا، اسکی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا اسکی مشیت و ارادہ اور قدرت و وسعت سے آگاہ کیا، ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی ان کو تعلیم دی جس کی قدرت بے انتہا، جس کی وسعت غیر محدود، جس کی مشیت کائنات کے ہر ذرہ میں نافذ، جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل، دلوں کے اسرار، زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو، اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جواب دہ اور ذمہ دار ہے، اس کے مواخذہ کا خوف اور اسکی رحمت کی امید ہے، وہ محبوب ازل ہے اور اسکی محبت کا نشہ ہمارے دلوں کی ہشیاری ہے، اس کے فضل و کرم اور محبت کی نیرنگیاں اوپر سے نیچے تک پھیلی ہیں، اس کی قوت ہر قوت پر غالب، اس کا ارادہ ہر ارادہ پر نافذ، اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے، اسکی عبادت ہر مخلوق پر فرض اور اسکی اطاعت ہر مکلف پر واجب ہے، وہ ہر عیب سے منزہ و پاک اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور ان کے تزکیہ اور اصلاح کے لیے رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجتا رہا اور ان سے ہم کلام ہوتا رہا، اس کے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین ہیں جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے وہ اندھیرے کی روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسوں کی امید، زخمیوں کا مرہم، بے قراروں کا قرار اور بے کسوں کا سہارا ہے، وہ ہم سے ہماری گردن کی رگ سے بھی قریب تر ہے، ہم اس کو جب پکاریں وہ سنتا ہے، وہ نیکیوں کو پسند اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے، وہ جب چاہے آسمان و زمین کو فنا کر دے اور جب چاہے ان کو پھر رچا دے، اسکی محبت دنیا کا حاصل ہے، اسکی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے۔

﴿ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴾ (رعد)
ہاں خدا کی یاد سے دلوں کو اطمینان کی دولت ملتی ہے۔

ان تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ وہ لوگ جن کو بھولے سے بھی خدا کا نام یاد نہ آتا تھا وہ اس کے سوا سب کچھ بھول

گئے اور اسکی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو گئے‘ وہ چلتے پھرتے‘ اٹھتے بیٹھتے‘ سوتے جاگتے ہر حال میں اسکی یاد میں سرمست و سرشار ہو گئے۔

﴿ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ ﴾ (آل عمران)

وہ خدا کو اٹھتے‘ بیٹھتے اور لیٹے یاد کرتے ہیں۔

اس سرمستی و سرشاری میں بھی انہوں نے جنگلوں میں راہبانہ زندگی بسر نہیں کی‘ دولتمندوں کی بھیک کو اپنا سہارا نہیں بنایا‘ دنیا کی کشمکشوں سے بزدلانہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دے کر اختیار نہیں کیا‘ بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جدوجہد اور سعی و کوشش کو اپنا مذہب سمجھا‘ اور خدا کا حکم جان کر اسکو پوری مستعدی کے ساتھ بجالائے‘ اور ان تمام ہنگاموں کے ساتھ دل کا معاملہ دلدار ازل کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا‘ خدا نے ان کی مدح کی کہ

﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ ﴾ (نور)

وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت‘ خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

ان کی محبت الٰہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آ گیا، خدا نے انکی توصیف کی کہ

﴿ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ﴾ (بقرہ)

ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔

ان کا توکل‘ ان کا صبر‘ ان کا استقلال‘ ان کی استقامت‘ ان کی بہادری‘ ان کی بے خوفی، ان کی صداقت‘ ان کی راستبازی‘ ان کی اطاعت غرض ان کی ہر چیز ان کے اسی جذبہ ایمانی کا پرتو تھی اور ہر وقت ان کے پیش نظر یہ تعلیم رہتی تھی کہ

﴿ وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ ﴾ (طلاق)

جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے‘ تو خدا اس کو بس کرتا ہے۔

﴿ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ﴾ (زمر)

کیا خدا اپنے بندوں کے لئے کافی نہیں

﴿ وَتَخْشَی النَّاسَ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ ﴾ (احزاب)

اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے‘ حالانکہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرنا چاہئے۔

ان میں یہ تمام روحانی و اخلاقی جوہر ایمان باللہ کے بدولت پیدا ہوئے۔

اسماء و صفات:

دنیا کے آغاز میں خدا نے کہا تھا کہ ہم نے آدم کو سب نام سکھائے۔ دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی اور علم کی وسعت کہاں سے کہاں پہنچ گئی‘ مگر غور کیجئے تو ناموں کے ہیر پھیر سے ہم اب تک آگے نہیں بڑھے یہی ہماری حقیقت رسی ہے اور یہی ہمارا فلسفہ ہے‘ ہم اپنے مفروضہ اصول منطق کی بنا پر ذاتیات اور حقائق کے ذریعہ سے اشیاء کی تعریف کے مدعی بن گئے لیکن ہزاروں صدیاں گزرنے پر بھی ذاتی اور حقیقی تعریف (حد منطقی) کی ایک بھی مثال پیش نہ کر سکے‘ جو کچھ کر سکے وہ یہ کہ صفات‘ عوارض اور خواص کے مختلف رنگوں سے نئی نئی طفلانہ شکلیں بناتے اور بگاڑتے ہیں جب مادیت کا یہ علم ہے تو

وراء الوراء ہستی میں ہماری بشری طاقت اس سے زیادہ کا تحمل کیونکر کر سکتی، تجلی گاہ طور اسی رمز کی آتشیں تصویر ہے۔

ہم خدا کو بھی اس کے ناموں، اس کے کاموں اور اس کی صفتوں ہی سے جان سکتے ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ نے عرب کے جاہلوں کو اسی نصاب انسانی کے مطابق تعلیم دی عرب کا جاہل اللہ نام ایک اعلیٰ ہستی سے واقف تھا لیکن اسکے ناموں اور کاموں کے تخیل سے بڑی حد تک نا آشنا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے بھی وہ قطعی بیگانہ تھا دیوان عرب یعنی ان کی شاعری کے دفتر میں کہیں کہیں اللہ کا نام آتا ہے، مگر کہیں اسکی صفت کا ذکر نہیں آتا، قرآن پاک میں ان کے خیالات کا پورا عکس اتارا گیا ہے لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے بھی آگاہ تھے بعض عیسائی عربوں میں اللہ کے ساتھ ساتھ ''الرحمان'' کا لفظ بھی مستعمل ہوتا تھا جس کے معنی رحم کرنے والے کے ہیں اصحاب الفیل کے رئیس عیسائی ابرہہ کے نام سے سد عرم (یمن) پر جو کتبہ لگا ہے اور جس کو جرمن فاضل گلازر نے شائع کیا ہے، اس میں بھی دو جگہ رحمان کا لفظ آیا ہے عرب عیسائی شعراء کے کلام میں بھی یہ لفظ ملتا ہے عیسائیوں میں اس کے استعمال کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب مشرکین کو اس لفظ سے چڑ ہو گئی تھی اسی لئے جب اسلام نے اس لفظ کو اختیار کیا تو مشرکین نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آنحضرت ﷺ نے معاہدہ کے کاغذ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھوائی تو قریش کے نمائندہ نے کہا کہ قسم ہے اللہ کی مجھے نہیں معلوم [1] کہ رحمان کیا ہے؟

محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے اور قرآن مجید میں بار بار خدا کے لیے رحمان کے لفظ کے استعمال سے مشرکوں کو برہمی ہوتی تھی اور کہتے تھے کہ ہم کبھی رحمان کے آگے سرنگوں نہیں ہو سکتے، قرآن نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے:

﴿ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ ط قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ج اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴾
(فرقان)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمان کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمان کیا ہے، کیا تم جس کو کہو اس کو ہم سجدہ کریں، رحمان کا نام ان کی نفرت اور بڑھا دیتا ہے۔

مشرکین کو یہ برا لگتا تھا کہ محمد ایک طرف تو ان کے بتوں اور دیوتاؤں کی مذمت کرتے ہیں اور دوسری طرف عیسائیوں کے رحمان کی مدح و ستائش کرتے ہیں

﴿ اَهٰذَا الَّذِیْ یَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴾ (انبیاء)

(مشرک آپ کو دیکھتے ہیں تو مذاق سے کہتے ہیں کہ) یہی وہ ہے جو تمہارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے، اور وہی مشرک رحمان کے ذکر سے انکار کرتے ہیں۔

تعلیم محمدی نے عرب کے نا آشنایان حقیقت کو بالآخر آگاہ کیا کہ خدا کے اسماء وصفات کی کوئی حد نہیں اس کو سب ہی اچھے ناموں سے پکارا جا سکتا ہے۔

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط اَیًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴾ (اسرائیل)

---

[1] صحیح بخاری جلد اول کتاب الشروط ص ۳۷۹۔

کہہ دو (اے پیغمبر کہ) خدا کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر پکارو، جس نام سے بھی پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا مسئلہ اسلام کی ان اہم مذہبی اصلاحات میں سے ہے جن سے نہ صرف عرب کے جاہل ناآشنا تھے، بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے پیرو بھی ان کے متعلق غلطیوں میں مبتلا تھے۔ یہودیوں کے اسفار اور صحیفوں میں خدائے برحق کا اصلی نام "یہووا" تھا مگر کبھی عام یہودیوں کو اس مقدس نام کو زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی دوسرا عام نام "اہیم" ہے جو ہر موقع پر استعمال ہوتا ہے ان کے علاوہ اس کے بیسیوں نام اور اسماء جو درحقیقت اس کے اوصاف ذاتی اور اعمال ربانی کے ترجمان ہیں تورات کا دفتر ان سے خالی ہے۔ صفات الٰہی میں سے جو صفت یہودی صحیفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ فوجوں والا خداوند یعنی "رب الافواج" کا لفظ ہے جو اس کی صفات جلالی کا مظہر ہے۔

عیسائیوں کی انجیل اور مذہبی کتابوں میں باپ کا لفظ خدا کے لئے استعمال ہوا ہے اس لفظ کی حقیقت اور خدا پر اس لفظ کے اطلاق سے مقصود کیا ہے، اور گوشت پوست اور مادیت سے بھرے ہوئے لفظ کا خدا پر مجازی استعمال بھی کہاں تک جائز ہے؟ اور اس سے اس مذہب میں کہاں تک غلطیاں پھیلیں ان باتوں کو چھوڑ کر بھی دیکھئے تو یہ خدا کی صرف جمالی صفات کی ناقص اور مادی تعبیر ہے۔ عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث کے اختراعی عقیدہ کو اسی مسئلہ صفات کے پردہ میں چھپا لیا اور یہ تاویل کی گئی کی تثلیث کے اقانیم ثلثہ باپ (خدا) بیٹا (حضرت عیسیٰ) اور روح القدس، حیات، خلق اور علم تین صفتوں سے عبارت ہیں۔ باپ حیات، بیٹا خلق اور روح القدس علم ہے اور یہ تینوں ایک ہیں اور یہ تینوں اپنے وجود میں الگ الگ ہیں، اس تشریح سے صفات الٰہی کے تجسیم کے مسئلہ نے جنم لیا اور ایک خدا کئی خداؤں کا مجموعہ بن گیا۔

ہندوؤں میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی نیرنگی نظر آتی ہے، لیکن ہر صفت نے ان کے ہاں ایک مستقل وجود حاصل کر لیا ہے، اور خود خدا ہر قسم کی صفات سے خالی اور مجرد رہ گیا ہے۔ اسی لئے ہندوستان کے تمام مذاہب اسی تجسم صفات کے جلوہ گاہ ہو کر رہ گئے ہیں، برہما، مہیش، وشنو، تین صفات خالق، ممیت (مارنے والا) اور قیوم کے مجسمے ہیں، غلط تعبیر نے وحدت کی جگہ یہاں بھی تثلیث پیدا کر دی، شنکر آچاریہ نے خدا کے صرف تین اصلی صفات تسلیم کئے، حیات، علم اور سرور یا آنند، جین مذہب اور بعض ہندو فرقوں میں ایک خالقیت کی صفت کے تجسم نے اعضائے تناسل کی پرستش کی گمراہی پیدا کی، عام ہندوؤں میں ۳۳ کروڑ عجیب الخلقت دیوتاؤں کی عظیم الشان بھیڑ بھی صفات واسمائے الٰہی کی تجسیم اور مستقل وجود کے غلط فلسفہ نے پیدا کیا، اور اسی نے بت پرستیوں کی نت نئی صورتیں نمایاں کیں، مجوسیوں میں یزدان اور اہرمن کی ثنویت اور دوئی بھی خدا کی دو صفتوں، ہادی اور مضل کو دو مستقل ہستیوں میں منقسم کر دینے کا نتیجہ ہے، اس تفصیل سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اس مسئلہ کی غلط تعبیر نے دنیا میں کتنی گمراہیاں پیدا کی ہیں

محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کے ان تمام فاسد تخیلات کو باطل ٹھہرایا، ان کے غلط عقیدوں کی تصحیح کی، اور ربانی ہدایت کے نور سے سراج منیر بن کر جس طرح اس حقیقت کو روشن کیا وہ نبوت محمدی کے عظیم الشان کارناموں میں سے ہے

آپ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں، اور اس کی باتوں کی کوئی انتہا نہیں، آپ نے یہ دعا سکھائی "اے خداوند! تیرے ہر اس نام کے وسیلہ سے جو تو نے اپنا رکھا، یا اپنی کتاب میں اتارا، یا کسی مخلوق کو سکھایا، یا اپنے لئے اپنے علم غیب میں اس کو چھپا رکھا، میں تجھ سے مانگتا ہوں"۔ حضرت عائشہ کو یہ الہامی دعا تعلیم ہوئی،

خداوندا! میں تیرے سب اچھے ناموں کے وسیلہ سے جن میں سے کچھ کو ہم نے جانا اور جن کو نہیں جانا تجھ سے درخواست کرتا ہوں"۔[1] قرآن پاک کے ذریعہ بتایا گیا۔

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ (الکهف)

کہہ دے (اے پیغمبر) کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لئے سیاہی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے لیکن میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہونگی اگر چہ ہم ایسا ایک اور سمندر بھی کیوں نہ لے آئیں۔

دوسری جگہ کہا گیا

﴿وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ﴾ (لقمان)

اگر زمین میں جتنے درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر اور اس کے بعد سات سمندروں کا پانی سیاہی ہو جائے تو بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہونگی۔

الغرض تمام اچھے اور کمالی نام اسی کے لئے ہیں اور اسی کو زیبا ہیں۔

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ (طٰہٰ)

نہیں ہے کوئی معبود لیکن وہی اللہ، اسی کے لیے ہیں سب اچھے نام۔

بڑائی کا ہر نام اور خوبی کا ہر وصف اسی ذات بے ہمتا کے لیے ہے خواہ اسکو خدا کہو، یا اللہ کہو لغت اور زبان کا کوئی فرق اس میں خلل انداز نہیں۔

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ (اسرائیل)

کہہ دے (اے پیغمبر) اس کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جو چاہے کہہ کر پکارو، سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

لیکن مشرکوں کی طرح اس کو ایسے ناموں سے نہ پکارو جو اس کے کمال اور بڑائی کے منافی ہیں اور بتوں اور دیوتاؤں کے ناموں سے بھی اسکو یاد نہ کرو۔

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْ اَسْمَآئِهٖ﴾ (اعراف)

اور اللہ ہی کے لیے ہیں سب اچھے نام، اس کو ان ناموں سے پکارو، اور ان لوگوں سے علیحدہ رہو، جو اس کے ناموں میں کجی کرتے ہیں۔

تعلیم محمدی کا صحیفہ وحی اللہ تعالیٰ کے تمام اوصاف حمیدہ اور اسمائے حسنیٰ سے بھرا ہوا ہے بلکہ اسکا صفحہ صفحہ اس کے اسماء وصفات کی جلوہ گریوں سے معمور ہے۔ قرآن پاک کا کم کوئی ایسا رکوع ہوگا جس کا خاتمہ خدا کی توصیف اور حمد پر نہ ہو اور یہ تمام اوصاف اور نام اس عشق ومحبت کو نمایاں کرتے ہیں جو اس محبوب ازل اور نور عالم کے ساتھ قرآن کے ہر پیرو کے دل میں ہونا چاہئے۔

---

[1] یہ تینوں دعائیں امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں بسند نقل کی ہیں اور پہلی روایت مسند ابن حنبل میں بھی (بسند عبداللہ بن مسعود) ہے۔

﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ط اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ ط اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَیْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِیَّةٍ وَّلَا غَرْبِیَّةٍ یَّكَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَلَوْلَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ط یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ وَیَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴾ (نور)

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے‘ اس کے نور کی مثال یہ ہے کہ ایک طاق ہو جس میں چراغ ہو‘ چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو‘ شیشہ اتنا صاف ہو کہ گویا ایک چمکتا ستارہ ہے‘ وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے جلایا گیا ہو‘ نہ وہ پورب ہے نہ پچھم ہے اس کا تیل اتنا صاف ہے کہ آگ کے چھوئے بغیر وہ آپ سے آپ جلنے کو ہو‘ روشنی پر روشنی‘ خدا اپنی روشنی تک جس کو چاہے پہنچا دے اور خدا لوگوں کے سمجھانے کے لئے یہ مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ط لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ط لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ط یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ط وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ج وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴾ (بقرۃ)

اللہ، نہیں ہے اس کے سوا کوئی اور معبود‘ وہ ہمیشہ زندہ، تمام دنیا کو سنبھالے ہے‘ اس کو اونگھ اور نیند نہیں آتی آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے، کون ہے جو اسکی مرضی کے بغیر اس کے سامنے سفارش کرنے کو کھڑا ہو انسانوں کے سامنے اور پیچھے جو کچھ ہے اس کو جانتا ہے اور وہ اسکے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے لیکن جتنے کا وہ چاہے اسکا تخت آسمانوں اور زمین کو سمائے ہوئے ہے اس آسمان اور زمین کی نگہبانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اونچا اور بڑا ہے۔

﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ○ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ط اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ط سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ○ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ط یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴾ (حشر۔۲۴۔۲۲)

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں‘ چھپے اور کھلے کا علم رکھنے والا‘ وہی رحم کرنے والا اور مہربانی والا ہے‘ وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں‘ سب کا بادشاہ‘ پاک‘ پوری سلامتی، امن والا‘ ہر شے پر گواہ‘ غالب‘ سب پر قابو والا‘ بڑائی والا‘ ہر چیز اس سے پاک ہے جس کو یہ مشرک خدا کا شریک بتاتے ہیں‘ وہی اللہ پیدا کرنے والا‘ بنانے والا‘ ہر چیز کی صورت کھینچنے والا‘ اسی کے لئے سب اچھے نام ہیں‘ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے‘ سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں وہی سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔

﴿ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ○ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ط یَعْلَمُ

مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْھَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْھَا وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ٥ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ٥ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَیُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ وَھُوَ عَلِیْمٌ ۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ (حدید٦۔۱)

آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ سب خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں، وہی غالب اور دانا ہے، آسمانوں اور زمینوں کی حکومت اسی کی ہے، وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے، اور وہ ہر بات پر قادر ہے، وہی پہلا اور وہی پچھلا ہے، وہی کھلا ہے اور چھپا ہے، اور ہر بات کو جانتا ہے، وہی ہے جس نے آسمان کو اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر تخت پر برابر ہوا وہ جانتا ہے جو زمین میں گھستا ہے، اور جو زمین میں سے نکلتا ہے، اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو آسمان میں چڑھتا ہے اور جہاں بھی تم ہو وہ تمھارے ساتھ ہے، اور اللہ تمھارے کاموں کو دیکھتا ہے، آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور اللہ ہی تمام چیزوں کا مرجع ہے وہ رات کو دن میں داخل کر دیتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے وہ سینوں کے سب بھیدوں سے واقف ہے۔

خدا کے متعلق اہل عرب کا جو پست تخیل تھا اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اسکو مٹا کر ان کے سامنے جو بلند تخیل پیش کیا اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے آپ نے جب توحید کا آوازہ بلند کیا تو مشرکین جو اپنے دیوتاؤں کے آل و اولاد اور بیویوں اور گوپیوں کی حمد کے ترانے گاتے تھے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمائش کی کہ ذرا اپنے خدا کا نسب تو ہمارے سامنے بیان کرو یعنی گویا وہ اپنے دیوتاؤں سے اسلام کے خدا کا مقابلہ کر کے بتانا چاہتے تھے کہ اس حیثیت سے اسلام کا خدا ہمارے دیوتاؤں کی ہمسری نہیں کر سکتا، اس کے جواب میں وحی محمدی نے اپنے خدا کی حقیقت قرآن پاک کی اس سب سے مختصر سورہ میں پیش کی۔[۱]

﴿قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ٥ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ٥ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ ٥ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ﴾ (اخلاص)

کہہ دے (اے پیغمبر) وہ اللہ ایک ہے، وہ تنہا اور بزرگ اور بے نیاز اور عالم کا مرجع اور جا پناہ ہے، نہ اس کے کوئی اولاد ہے اور نہ اسکے کوئی ماں باپ ہے (جس نے اس کو جنا ہو)، اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے (جو اس کی بیوی ہو)

یہ روایت حضرت ابی بن کعبؓ سے مروی ہے۔ حضرت ابی صحابہ میں سب سے زیادہ قرآن کے ماہر سمجھے جاتے تھے، وہ اس کے بعد اس سورۃ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ ’’صمد‘‘ وہ ہے جو نہ جنتا ہے اور نہ کسی نے اسکو جنا ہو کیونکہ جو جنا جاتا ہے وہ مرتا بھی ہے اور جو مرتا ہے وہ اپنے وارث و جانشین بھی ضرور چھوڑتا ہے اور خدا نہ مرتا ہے نہ اسکا کوئی جانشین ہے اور کوئی اسکا ہمسر نہیں ہے یعنی کوئی اس کے برابر نہیں اور نہ کوئی اس کا مثل ہے‘‘ غور کرو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے پہلے اہل عرب میں خدا کا کتنا پست و ذلیل تخیل تھا جس کا اندازہ تم ان کے سوال سے کر سکتے ہو اور آپ کی تعلیم کے بعد وہ تخیل کتنا پاک اعلیٰ اور بلند ہو گیا جس کا اندازہ حضرت ابی کی تفسیر سے ہو سکتا ہے جو اسی عرب نژاد قبیلہ کے ایک فرد ہیں لیکن ان کا دل اب محمد رسول اللہ ﷺ کے فیض سے منور ہو چکا تھا حضرت ابو ہریرہؓ آپ سے سن کر کہتے ہیں کہ ’’خدا فرماتا ہے کہ آدم کے بیٹے نے مجھ کو جھٹلایا اور آدم کے بیٹے نے مجھ کو گالی دی۔ اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا دوبارہ پیدا نہیں کرے گا حالانکہ پہلی بار کے پیدا کرنے سے دوسری بار کا پیدا کرنا زیادہ آسان ہے اور اسکا گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا

---

[۱] مستدرک حاکم تفسیر سورۃ اخلاص (صحیح) و جامع ترمذی تفسیر سورہ مذکور و کتاب الاسماء بیہقی صفحہ ۲۳ (الہ آباد)۔

کہ خدا کی اولاد ہے حالانکہ میں ایک اور صمد ہوں جس نے نہ کسی کو جنا ہے اور نہ اس کو کسی نے جنا ہے اور نہ اسکا کوئی ہمسر ہے [1] یہ حضرت ابو ہریرہؓ یمنی عرب ہیں، یعنی اس عرب کے ایک فرد ہیں جو تعلیم محمدی سے پہلے ان حقائق سے بے بہرہ تھا اور اب وہ اس تنزیہ و تقدیس کے موتی اپنے منہ سے اگل رہے ہیں۔

اس مختصر سورہ میں سب سے چھوٹا لفظ ''صمد'' کا ہے لیکن درحقیقت قرآن کی بلاغت نے اس ایک لفظ میں صفات الٰہی کا بے پایاں دفتر چھپا رکھا ہے صمد کے معنی لغت میں اونچی پتھریلی زمین یا چٹان کے ہیں جو کسی ایسی وادی میں ہو جہاں سیلاب آتا ہو تو اس پر چڑھتا نہ ہو اور لوگ اس وقت دوڑ دوڑ کر اسی پر چڑھ کر اپنے کو بچائیں پھر صمد کے اس لغوی معنی سے اس سردار کے معنی پیدا ہوئے جو بزرگی اور شرافت میں انتہائی معراج کمال پر ہو' اور اس سردار کو بھی کہنے لگے جس کی موجودگی کے بغیر مجلس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا ہو' اور اس سردار کو بھی کہتے ہیں جس کے اوپر کوئی سردار نہ ہو اور اس جائے پناہ کے معنی میں بھی مستعمل ہوا جو سب کو مصیبت کے وقت اپنے دامن میں پناہ دے سکے' اس مرجع و مرکز کے معنی میں بھی آیا ہے جس کی طرف ہر شخص دوڑ دوڑ کر جاتا ہے' صمد ٹھوس کو بھی کہتے ہیں جس کے اندر خول نہ ہو' اس اسی لئے اس کو بھی کہتے ہیں جو کھاتا پیتا نہ ہو اور جس کے آل و اولاد نہ ہو، اس کو بھی کہتے ہیں جس سے کوئی بے نیاز نہ ہو، اس بہادر کو بھی کہتے ہیں جس کو لڑائی میں بھوک اور پیاس نہ لگتی ہو ﴿صَمَدَۃٌ﴾ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے حمل نہ رہا ہو، حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ صمد وہ سردار ہے جو اپنی بزرگی اور سرداری میں کمال درجہ پر ہو، وہ شریف جس کی شرافت کامل ہو، وہ بڑا جس کی بڑائی میں کوئی نقص نہ ہو، وہ بردبار جس کی بردباری بدرجہ اتم ہو، وہ بے پرواہ و بے نیاز جس کی بے پروائی و بے نیازی کی کوئی حد نہ ہو وہ زبردست جس کے جبروت کی انتہا نہ ہو، وہ علم والا جس کا علم بدرجہ اتم ہو، وہ حکیم جس کی دانائی بمرتبۂ کمال ہو یعنی وہ جو بڑائی اور بزرگی کی ہر صنف میں کامل ہو [2]

ان معنوں کے علاوہ صحابہ اور تابعین نے اس کی تفسیر میں حسب ذیل معانی بھی لکھے ہیں۔

ابن عباسؓ: وہ جس کی طرف مصیبت کے وقت لوگ رجوع کریں۔
حسن بصری: وہ حیّ و قیوم جس کو زوال نہ ہو اور جو باقی ہو۔
ربیع بن انس: جن کے نہ اولاد ہو نہ ماں باپ۔
عبداللہ بن مسعودؓ: جس کے اندر معدہ وغیرہ جسمانی اعضا نہ ہوں۔
بریدہؓ: جس میں خوف نہ ہو۔
عکرمہ و شعبی: جو کھاتا نہ ہو۔
عکرمہ: جس میں سے کوئی دوسری چیز نہ نکلے۔
قتادہ: باقی' غیر فانی۔

---

[1] صحیح بخاری سورہ اخلاص۔

[2] کتاب الاسماء والصفات' امام بیہقی بسند صفحہ ۴۳۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معانی[1] اس ایک لفظ کے اندر پوشیدہ ہیں اور یہ سب صرف ایک حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں تاہم اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس کے اصلی معنی چٹان کے ہیں جو لڑائی اور مصیبتوں کے وقت جائے پناہ کا کام دے، اسرائیلی الٰہیات میں بھی یہ لفظ یہی اہمیت رکھتا ہے اور بنی اسرائیل کے صحیفوں میں جائے پناہ کے لیے چٹان کا لفظ آیا ہے استثناء (۳۲۔۳۳) میں ہے۔

''اگر ان کی چٹان انکو بیچ نہ ڈالتی اور خداوند ان کو اسیر نہ کرواتا کیونکہ ان کی چٹان ایسی نہیں جیسی ہماری چٹان''۔

یہ چٹان اس موقع پر حقیقت میں خدا کی مدد و نصرت سے کنایہ ہے سموال کے پہلے صحیفہ میں یہ کنایہ تصریح سے بدل جاتا ہے

''خداوند کے مانند کوئی قدوس نہیں، تیرے سوا کوئی نہیں' کوئی چٹان ہمارے خدا کے مانند نہیں'' (۲۔۲)

اس سورہ میں خدا کی صفت میں دو لفظ ہیں احد (ایک) اور صمد (جائے پناہ) یہ دونوں خدا کے دو متضاد کمالی اوصاف کو حاوی ہیں' اسکی یکتائی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں نہ اس کو کسی کی حاجت نہ اس کو کسی سے غرض۔ وہ یکتا و تنہا اکیلا بے ہمتا' بے نیاز' بے پرواہ' سب سے مستغنی اور سب سے الگ ہے لیکن اسی کمال یکتائی کے ساتھ وہ سب کے ساتھ' سب کا دستگیر' سب کی جائے پناہ' سب کا محتاج الیہ' سب کا مرکز' سب کا مرجع' سب کا ماویٰ' سب کا ملجا یعنی سب کی چٹان' مصیبتوں میں سہارا' بلاؤں میں تسلی اور اضطرابوں میں تشفی ہے۔

﴿ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ﴾

ہر جگہ سے بھاگ کر اللہ کے ہاں پناہ لو

یہ سورۂ پاک توحید اسلامی کے ہر شعبہ کو حاوی ہے اور اسی لیے اسکو ثلث القرآن (تہائی قرآن) کا درجہ دیا گیا ہے' ایک صحابی تھے جو نماز کی ہر دو رکعت میں قرأت کے آخر میں اس سورہ کو پڑھا کرتے تھے لوگوں نے یہ واقعہ آنحضرت ﷺ سے بیان کیا آپ نے ان سے اسکی وجہ دریافت کرائی انہوں نے کہا ''اس میں میرے رب کی صفتیں بیان کی گئی ہیں جو مجھ کو بہت محبوب ہیں'' آپ نے فرمایا ''بشارت ہو کہ خدا بھی تم سے محبت کرتا ہے''[2] ایک اور انصاری تھے جو قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے ان کا یہ حال تھا کہ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد اس سورۃ کو پڑھ لیتے تھے' تب کوئی دوسری سورۃ پڑھتے تھے ان کے مقتدی صحابہ نے اس پر اعتراض کیا تو انہوں نے کہا مجھے امامت چھوڑنی منظور ہے مگر اپنی روش چھوڑنی منظور نہیں۔ لوگوں نے اس واقعہ کا تذکرہ آنحضرت ﷺ سے کیا۔ آپ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو گذارش کی کہ یارسول اللہ ﷺ مجھے یہ سورۃ بہت محبوب ہے۔ ارشاد ہوا ''یہ محبت تم کو جنت میں لے جائے گی۔''[3] قتادہ بن نعمانؓ صحابی تھے جو رات بھر اسی ایک سورہ کو دہراتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ لوگوں نے آپ ﷺ سے اس کا

---

[1] ان معانی کے لئے دیکھو کتاب الاسماء بیہقی صفحہ ۴۳' مفردات القرآن راغب اصفہانی' ابن جریر طبری' ابن کثیر اور تفسیر سورۃ الاخلاص لابن تیمیہ۔

[2] صحیح بخاری کتاب التوحید۔

[3] صحیح بخاری کتاب الصلوۃ۔

تذکرہ کیا تو فرمایا کہ یہ سورہ قرآن کا تہائی حصہ ہے۔[1]

اس گمراہی اور تاریکی کا اندازہ جو آنحضرت ﷺ سے پہلے عرب پر چھائی ہوئی تھی اس روحانی لطف اور نورانی فیض سے کرو جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس کے حصہ میں آیا۔

قرآن مجید اور حدیث میں اللہ تعالیٰ کے سو سے زیادہ نام اور اوصاف آئے ہیں۔ صحیح حدیثوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو ان کو محفوظ رکھے یا نگاہ میں رکھے وہ جنت میں داخل[2] ہوگا۔ خدا طاق ہے وہ طاق عدد کو پسند کرتا ہے''۔ آخری فقرہ اس علت کو ظاہر کرتا ہے کہ ۹۹ نام کیوں رکھے گئے پورے سو کیوں نہ مقرر کئے۔ یہ اس لئے کہ اگر پورے سو ہوتے تو عدد طاق نہ رہتا اور اس سے توحید کا رمز آشکارانہ ہوتا۔ صحیح احادیث میں اسی قدر ہے یعنی ان ۹۹ ناموں کی تصریح نہیں ہے۔ مگر ترمذی میں اور بعض کم درجہ حدیثوں میں ان ناموں کو گنایا بھی ہے۔ لیکن محدثین نے عموماً یہاں تک کہ حافظ ابن حجر نے بھی لکھا ہے کہ ''یہ روایتیں ضعیف اور کمزور ہیں''۔ پھر ان روایتوں میں بعض ناموں کا ادل بدل اور الٹ پھیر بھی ہے اور بعض ایسے نام بھی ان میں ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں ہیں اور بعض ایسے نام جو قرآن میں ہیں ان میں نہیں ہیں، اسی لئے علماء کا فیصلہ یہ ہے کہ ان روایتوں میں ان ناموں کا انتخاب راویوں نے خود اپنی تلاش و تفحص سے کیا ہے اس لئے ان روایتوں سے یہ شبہ نہ ہو کہ اسمائے الٰہی ان ننانونے میں محدود ہیں بلکہ بڑے بڑے آئمہ اور محدثین مثلاً عبدالعزیز بن یحییٰ، ابوبکر بن عربیؒ، امام نوویؒ، حافظ ابن حجرؒ، امام خطابیؒ، ابن تیمیہؒ اور قرطبی وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ اسمائے الٰہی ان ننانوے میں محصور نہیں اور یہ بھی تصریحات ملتی ہیں کہ اسماء اور صفات الٰہی کی کوئی حد و پایاں نہیں ہے[3] اور اس پر محدثین نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایتوں سے جو آغاز مضمون میں اوپر گذر چکی ہیں استدلال کیا ہے۔

بہر حال قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کے تتبع سے علماء نے ننانوے ناموں کا پتہ چلایا ہے اور ان کو الگ الگ ایک ایک کر کے گنایا ہے۔ یہ تمام نام وہ ہیں جو بطور علم اور بطور صفت کے قرآن پاک میں آئے ہیں یا وہ افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوئے ہیں یا آنحضرت ﷺ نے دعاؤں میں ان کی تعلیم کی ہے ہم ذیل میں بہ ترتیب ایک ایک نام لکھتے ہیں اور اس کی مختصر لغوی تشریح کرتے ہیں تا کہ معلوم ہو سکے کہ آنحضرت ﷺ نے خدا کا جو تخیل اور عقیدہ اپنے پیرووں کو سکھایا، وہ کتنا وسیع، کتنا بلند، کتنا منزہ اور پاکیزہ ہے۔ علماء نے ان ناموں کو یا ان صفات کو مختلف معنوی مناسبتوں سے ترتیب دیا ہے لیکن ہم نے ان کے صرف تین مرتبے قرار دیئے ہیں۔ ایک وہ جن سے اس کے رحم و کرم، عفو و درگذر یعنی صفات جمالی ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جن سے اس کی شاہنشاہی، جلال و جبروت اور حکومت و استیلا کا اظہار ہوتا ہے ہم ان کو صفات جلالی کہتے ہیں۔ تیسرے وہ اسماء اور صفات جن سے اس کی تنزیہہ، بلندی کمالات کی جامعیت اور ہر قسم

---

[1] مسند احمد بسند ابی سعید خدریؓ۔

[2] صحیح بخاری کتاب التوحید و صحیح مسلم۔ کتاب الذکر و مسند احمد بسند ابی ہریرہؓ و جامع ترمذی و نسائی و ابن ماجہ و ابن خزیمہ و ابوعوانہ و ابن جریر و طبرانی و بیہقی وغیرہ۔

[3] تمہید ابوشکور سالمی القول الثالث فی عدد الاسماء یہ ماتریدیہ کی مشہور مستند کتاب ہے۔

کے اوصاف حسنہ اور محامد عالیہ کا ثبوت ہوتا ہے ان کو ہم صفات کمالی سے تعبیر کرتے ہیں۔

الغرض خدا کے تمام اسماء وصفات انہیں تین عنوانوں کی تشریح ہیں یعنی یا تو ان سے خدا کی رحیمی و کریمی ظاہر ہوتی ہے یا اس کے جاہ وجلال کا اظہار ہوتا ہے یا اس کی تنزیہہ و کمال کا اثبات ہوتا ہے۔

صفاتِ جمالی:

یعنی وہ اسماء وصفات جن سے خدا کے رحم و کرم اور شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

اللہ: یہ خدا کا نام ہے جو قرآنِ پاک میں بطور خاص علم کے ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ اسلام سے پہلے بھی یہ عرب میں ''خدائے برحق'' کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ اس لفظ کی لغوی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی اس ہستی کے ہیں جس کی پرستش کی جائے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ وہ جس کی حقیقت و معرفت میں عقل انسانی حیران و سرگرداں ہو۔ دوسروں کی تحقیق ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت اور محبت رکھے جو ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس اخیر تعبیر کی بنا پر اللہ کے معنی پیار کرنے والے یا پیارے کے ہیں۔

اَلـرَّحْمٰنُ: اللہ کے بعد یہ دوسرا لفظ ہے جس کو علم کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے معنی رحم والے کے ہیں یہ گذر چکا ہے کہ رحمان کا لفظ اسلام سے پہلے صرف عیسائی عربوں میں مستعمل تھا۔ عام اہل عرب میں اللہ کا لفظ مستعمل تھا۔ قرآن مجید نے ہر سورہ کے شروع میں اور نیز اور مقامات میں اللہ کو الرحمان کہہ کر سینکڑوں جگہ استعمال کیا ہے۔ بظاہر تو یہ وصف موصوف کی معمولی ترکیب ہے مگر در حقیقت یہ بدل و مبدل منہ ہیں اور اس سے اس رمز کی طرف اشارہ ہے کہ عام عربوں کا اللہ اور عرب عیسائیوں کا رحمان دو اجنبی صفتیں اور دو بیگانہ ہستیاں نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں اور ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں اور اس طرح ان دو مختلف قوموں کو وحدت الٰہی کی دعوت دی گئی جو ناموں کے تعدد کو حقیقت کے تعدد کا مرادف سمجھتی تھیں اور کہا گیا۔

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط اَيًّامَا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴾ (اسرائیل)

اللہ کہو یا رحمان کہو جو چاہے کہو اسی کے لئے سب اچھے نام ہیں۔

اَلـرَّحِيْـمُ: رحم کرنے والا۔ رحم کا لفظ اس رحم سے نکلا ہے جس سے بچہ کی پیدائش ہوتی ہے۔ اس لئے اصل لغت کے لحاظ سے اس لفظ میں بھی مربیانہ محبت کا جذبہ نمایاں ہے۔

الرحمان اور الرحیم خدا کی وہ دو صفتیں ہیں جن سے قرآن کا صفحہ صفحہ منور ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہوا جو کچھ ہے، جو کچھ ہوگا، وہ اس کی رحمانی اور رحیمی، انہیں دو صفتوں کا ظہور ہے۔ اس عالم اور اُس عالم دونوں میں اس کی انہیں دونوں شانوں کا ظہور ہے اور ہوگا۔

اَلرَّبُّ: پرورش کرنے والا' یعنی ہستی کے اول نقطہ سے لے کر آخر منزل تک ہر لمحہ اور ہر لحظہ مخلوقات کی نشو ونما اور ظہور و ترقی کا ذمہ دار۔

اَللَّطِيْفُ: لطف والا مہربان۔

اَلْعَفُوُّ: معاف کرنے والا' درگذر کرنے والا۔

اَلْوَدُوْدُ : محبوب، محبت کرنے والا، پیار کرنے والا۔

اَلسَّلَامُ : امن وسلامتی، صلح وآشتی، ہر عیب سے پاک وصاف۔

اَلْمُحِبُّ: محبت والا، پیار والا، چاہنے والا۔

اَلْمُؤْمِنُ : امان دینے والا، امن بخشنے والا، ہر خوف سے بچانے والا اور ہر مصیبت سے نجات دینے والا۔

اَلشَّکُوْرُ: اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول اور پسند کرنے والا۔

اَلْغَفُوْرُ وَالْغَفَّارُ: معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، درگذر کرنے والا۔

اَلْحَفِیْظُ وَالْحَافِظُ: حفاظت کرنے والا، نگہبان، نگہبانی کرنے والا، بچانے والا۔

اَلْوَهَّابُ: دینے والا، عطا کرنے والا، بخشنے والا۔

اَلرَّازِقُ وَالرَّزَّاقُ: روزی دینے والا، نشوونما کا سامان بہم پہنچانے والا۔

اَلْوَلِیُّ: دوست، حمایتی، طرفدار۔

اَلرَّءُوْفُ: مہربان، نرمی اور شفقت کرنے والا۔

اَلْمُقْسِطُ: انصاف والا، عادل۔

اَلْهَادِیْ: راہ دکھانے والا، رہنما۔

اَلْکَافِیْ: اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لئے کافی۔

اَلْمُجِیْبُ: قبول کرنے والا، دعاؤں کا سننے والا۔

اَلْحَلِیْمُ: بردبار، بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرنے والا۔

اَلتَّوَّابُ وَقَابِلُ التَّوْبِ: توبہ قبول کرنے والا، گنہگار کے گناہوں سے درگذر کر کے دوبارہ اس کی طرف رجوع ہونے والا۔

اَلْحَنَّانُ: ماں کی طرح بچوں پر شفقت کرنے والا۔

اَلْمَنَّانُ : احسان کرنے والا۔

اَلنَّصِیْرُ: مدد کرنے والا۔

ذُو الطَّوْلِ: کرم والا۔

ذُو الْفَضْلِ: فضل والا۔

اَلْکَفِیْلُ: بندوں کی کفالت کرنے والا۔

اَلْوَکِیْلُ: بندوں کی ضرورتوں کا ذمہ لینے والا، سامان کرنے والا۔

اَلْمُقِیْتُ: روزی پہنچانے والا۔

اَلْمُغِیْثُ : فریاد کو پہنچنے والا، فریاد سننے والا۔

اَلْمُجِیْرُ: پناہ دینے والا۔

اَلْمُغْنِی: جو بندوں کو اپنے سوا ہر چیز سے بے نیاز کئے ہوئے ہے۔

صفات جلالی:

یعنی وہ اسماء وصفات جن سے خدا کی بڑائی، کبریائی، شہنشاہی اور قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔

اَلْمَلِکُ وَالْمَلِیْکُ بادشاہ، فرمانروا۔

اَلْعَزِیْزُ: غالب، جس پر کوئی دسترس نہ پائے۔

اَلْقَاهِرُ وَالْقَهَّارُ: جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جا سکتا۔ سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا۔

اَلْمُنْتَقِمُ: سزا دینے والا، برائیوں کی جزا دینے والا۔

اَلْجَبَّارُ: جبروت والا جس کے سامنے کوئی دوسرا دم نہ مار سکے۔ جس سے کوئی سرتابی نہ کر سکے۔

اَلْمُهَیْمِنُ: سب پر شاہد اور گواہ اور دلیل۔

اَلْمُتَکَبِّرُ: اپنی بڑائی دکھانے والا، کبریائی والا، سخت سزا دینے والا۔

شَدِیْدُ الْعِقَابِ: سخت سزا والا۔

شَدِیْدُ الْبَطْشِ: بڑی گرفت والا جس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔

نکتہ:

خدا کے صفات جلالی کا ذکر زیادہ تر تورات میں ہے۔ لیکن صحیفہ محمدی میں جہاں کہیں خدا کی ان جلالی صفتوں کا ذکر آتا ہے ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ خدا کے عادل حکیم اور علیم ہونے کا بھی ذکر ہوتا ہے جس سے انسان کی اس غلط فہمی کا مٹانا مقصود ہے کہ خدا کی ان جلالی صفتوں کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ نعوذ باللہ ایک لاابالی کی طرح دم کے دم میں جو چاہے کر گذرتا ہے بلکہ اس کا قہر اس کا غلبہ اس کا انتقام اور اس کی گرفت، عدل وانصاف اور حکمت ومصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور اس طرح ان جلالی ناموں سے بے رحمی اور ظالمانہ سخت گیری کا جو شبہ پیدا ہو سکتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ﴾ (آل عمران۔ ۱۹)

بے شک خدا بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

اس لئے اللہ تعالیٰ کے وصف میں عزیز (غالب) کے ساتھ حکیم (حکمت والا) ہمیشہ قرآن میں آیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا کے عذاب کے ذکر کے ساتھ اس کی رحمت کا تذکرہ بھی ہمیشہ قرآن میں کیا جاتا ہے اور دوزخ کے بیان کے ساتھ جنت کا سماں بھی لازمی طور پر دکھایا جاتا ہے۔

جہاں یہ کہا گیا کہ ﴿وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ وہیں یہ بھی کہا گیا ﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ﴾ قوموں کی تباہی وبربادی کا ذکر کیا گیا تو فرمادیا گیا۔

﴿وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ﴾ (مومن۔۴)

اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔

اس کی صفت ﴿ذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ﴾ "دردناک عذاب دینے والا" جہاں بیان کی گئی تو اس سے معاً پہلے ﴿لَذُوْ مَغْفِرَةٍ﴾ یقینی بخشش والا (حم السجدہ۔۵) بھی فرما دیا گیا۔ غرض صفات جلالی کے بیان میں یہ رعایت پیش نظر رکھی گئی ہے کہ اس کے ساتھ یا آگے پیچھے اس کی صفات جمالی کا بھی ذکر ہوتا کہ خوف و خشیت کے ساتھ اس کی محبت اور لطف و کرم کے جذبات بھی نمایاں ہوں۔

صفاتِ کمالی:

یعنی وہ اسماء و صفات جن سے اس کی خوبی' بڑائی' بزرگی اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح کے اسماء و صفات پانچ قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو اس کی وحدانیت سے متعلق ہیں، دوسرے وہ جو اس کے وجود سے تعلق رکھتے ہیں، تیسرے اس کے علم سے، چوتھے اس کی قدرت سے اور پانچویں اس کی تنزیہہ اور پاکی سے۔

صفاتِ وحدانیت:

یعنی وہ صفتیں جو اس کی یکتائی اور بے مثالی کو ظاہر کرتی ہیں اور وہ یہ ہیں۔

اَلْوَاحِدُ:	ایک۔
اَلْاَحَدُ:	ایک۔
اَلْوِتْرُ:	طاق جس کا کوئی جوڑا نہیں۔

صفاتِ وجودی:

یعنی وہ صفتیں جن سے اس کا وجود' بقا' دوام' ازلیت اور بے زوالی ظاہر ہوتی ہے۔

اَلْمَوْجُوْدُ:	وجود والا' ہست۔
اَلْحَیُّ:	ہمیشہ زندہ' غیر فانی۔
اَلْقَدِیْمُ:	وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہ ہو' جو ہمیشہ سے ہے۔
اَلْقَیُّوْمُ:	جو اپنے سہارے تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔
اَلْبَاقِیْ:	باقی جس کو ہمیشہ بقا ہے۔
اَلدَّآئِمُ:	ہمیشہ رہنے والا۔
اَلْاَوَّلُ:	وہ پہلا جس کے پہلے کوئی نہیں۔
اَلْاٰخِرُ:	وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔
اَلْمُقَدِّمُ:	جو سب سے آگے سے ہے۔

اَلْمُؤَخِّرُ: جو سب سے پیچھے رہ جائے گا۔

اَلظَّاهِرُ: جس کا وجود کھلا اور نمایاں ہے (یعنی جو اپنے کاموں اور قدرتوں کے لحاظ سے ظاہر ہے)

اَلْبَاطِنُ: وہ چھپا اور مخفی ہو (یعنی جو اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ ہے)

علم:

یعنی وہ صفتیں جو اس کے ہر چیز سے باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔

اَلْخَبِیْرُ: خبر رکھنے والا۔

اَلْعَلِیْمُ: جاننے والا۔

عَلَّامُ الْغُیُوْبِ: جو باتیں سب سے پوشیدہ ہیں ان کو جاننے والا۔

عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: دلوں کے چھپے ہوئے بھید کو جاننے والا۔

اَلسَّمِیْعُ: سننے والا۔

اَلْبَصِیْرُ: دیکھنے والا۔

اَلْمُتَکَلِّمُ: بولنے والا، اپنے علم اور ارادہ کو ظاہر کرنے والا۔

اَلْوَاجِدُ: پانے والا، جس کے علم کے سامنے کوئی چیز گم نہ ہو۔

اَلشَّهِیْدُ: حاضر، جس کے سامنے سے کوئی چیز غائب نہ ہو۔

اَلْحَسِیْبُ: حساب کرنے والا، یعنی جن چیزوں کا علم حساب کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یعنی وزن اور مقدار ان کا بھی جاننے والا۔

اَلْمُحْصِیْ: گننے والا یعنی جن چیزوں کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے یعنی اعداد ان کا بھی جاننے والا۔

اَلْمُدَبِّرُ: تدبیر کرنے والا، انتظام کرنے والا۔

اَلْحَکِیْمُ: حکمت والا، عقل والا، سب کاموں کو مصلحت سے کرنے والا۔

اَلْمُرِیْدُ: ارادہ کرنے والا، مشیت والا۔

اَلْقَرِیْبُ: نزدیک، جو اپنے علم کے لحاظ سے گویا سب کے پاس ہے۔

قدرت:

یعنی وہ صفتیں جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔

اَلْفَاتِحُ وَالْفَتَّاحُ: ہر مشکل کو کھولنے والا۔

اَلْقَدِیْرُ وَالْقَادِرُ: قادر، قدرت والا۔

اَلْمُقْتَدِرُ: اقتدار والا، جس کے سامنے کوئی چون و چرا نہیں کرسکتا۔

اَلْقَوِیُّ: قوی زبردست، جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکا۔

اَلْمَتِیْنُ : مضبوط، جس میں کوئی کمزوری نہیں۔

اَلْجَامِعُ: جمع کرنے والا متفرق اور پراگندہ چیزوں کو اکٹھا کرنے والا۔

اَلْبَاعِثُ : اٹھانے والا، مردوں کو قبروں سے اٹھانے والا یا دنیا میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ کا محرک اول۔

مَالِکُ الْمُلْکِ سلطنت کا مالک، جس کے سامنے کسی کی کوئی ملکیت نہیں۔

اَلْبَدِ یْعُ: نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے والا۔

اَلْوَاسِعُ : سمانے والا، جو ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔

اَلْمُحِیْطُ: جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، کوئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں۔

اَلْمُحْیِ وَالْمُمِیْتُ: جلانے والا اور مارنے والا۔

اَلْقَابِضُ وَالْبَاسِطُ: سمیٹنے والا اور پھیلانے والا۔

اَلْمُعِزُّ وَالْمُذِلُّ: عزت دینے والا اور ذلت دینے والا۔

اَلْخَافِضُ وَالرَّافِعُ : نیچا کرنے والا اور اونچا کرنے والا۔

اَلْمُعْطِیُ وَالْمَانِعُ : دینے والا اور روک لینے والا۔

اَلنَّافِعُ وَالضَّارُّ : نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا یعنی نفع وضرر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

اَلْمُبْدِیُٔ وَالْمُعِیْدُ : جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کو وجود میں لانے والا اور جو ہو کر فنا کر دی گئی ہو اس کو پھر دوبارہ وجود میں لانے والا۔

نکتہ:

اس قسم کی صفتیں جن میں بظاہر قبح نظر آتا ہے جیسے اَلضَّارُ (نقصان پہنچانے والا) اَلْمُذِلُّ (ذلت دینے والا) اَلْخَافِضُ (پست کرنے والا) اَلْمَانِعُ (روکنے والا) وغیرہ ان کا تنہا استعمال چونکہ غلط فہمی پیدا کرنیوالا ہے اس لئے جب تک ان کے ساتھ ان کے مقابل کی صفت نہ بولی جائے ان کا استعمال جائز نہیں رکھا گیا۔ یعنی خدا کو صرف اَلضَّارُ، اَلْخَافِضُ، اَلْمَانِعُ اور اَلْمُذِلُّ کہنا درست نہیں جب تک اس کے ساتھ اس کے دوسرے پہلو کو بھی نہ ملا لیا جائے۔ یعنی اَلضَّارُ کے ساتھ اَلنَّافِعُ، اَلْخَافِضُ کے ساتھ اَلرَّافِعُ، اَلْمَانِعُ کے ساتھ اَلْمُعْطِیُ اور اَلْمُذِلُّ کے ساتھ اَلْمُعِزُّ۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے قرآن پاک اور احادیث دونوں میں ان صفات کے استعمال میں یہ رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے کہ تنہا نقصان پہنچانے والا ذلت دینے والا اور روکنے والا، کوئی خوبی نہیں بلکہ ایک طرح کی برائی ہے۔ ہاں نقصان ونفع پہنچانے والا عزت وذلت دینے والا اور دینے والا اور روکنے والا دونوں کو ملا کر کہا جائے تو جائز ہوگا اس سے مقصود اس کی قدرت کی وسعت ہے اگر کوئی ایسا نفع پہنچانے والا ہے جس میں نقصان پہنچانے کی قدرت ہی نہیں یا ایسا عزت دینے والا ہے جس میں ذلیل کرنے کی استطاعت ہی نہیں تو اس کے اس عزت دینے اور نفع پہنچانے پر اس کا مجبور ومضطر ہونا لازم آتا ہے اور اس کی قدرت کا یہ کمال نمایاں نہیں ہوتا کہ وہ نقصان پہنچانے کی طاقت رکھنے کے باوجود نفع پہنچاتا اور ذلت دے

سکنے کے باوصف وہ عزت دیتا ہے اس کا کمال ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

تنزیہہ:

وہ صفات جو اس کی بڑائی، کبریائی، پاکی اور نیکی اور ہر عیب اور نقصان سے اس کی برأت کو ظاہر کرتی ہیں۔

اَلْعَلِیُّ:	مرتبہ والا۔	اَلْمَاجِدُ :	عزت والا۔
اَلْعَظِیْمُ:	عظمت والا۔	اَلْحَمِیْدُ :	تعریف والا۔
اَلْکَبِیْرُ:	بڑا۔	اَلْقُدُّوْسُ :	پاک۔
اَلرَّفِیْعُ :	بلند۔	اَلْحَقُّ :	سچا اور اصل یعنی یہ کہ اس کے سوا سب باطل ہیں
اَلْجَلِیْلُ :	بزرگ۔	اَلْجَمِیْلُ:	اچھا۔
اَلْکَرِیْمُ:	شریف۔	اَلْبِرُّ :	نیک۔
اَلْغَنِیُّ :	بے نیاز۔	اَلْعَدْلُ:	عادل۔
اَلصَّادِقُ:	سچا، راست باز۔	سُبُّوْحٌ :	ہر عیب سے پاک۔
اَلصَّمَدُ:	بزرگی کی ہر صفت میں کامل	اَلرَّشِیْدُ :	سیدھی راہ چلنے والا، نہ بھٹکنے والا

ان تعلیمات کا اثر اخلاق انسانی پر:

اللہ تعالیٰ کے ان اسماء وصفات کا عقیدہ دین محمدی میں محض نظری نہیں بلکہ عملی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہ محامد واوصاف اخلاق انسانی کا معیار ہیں۔ ان اوصاف کو چھوڑ کر جو اس ذوالجلال کے لئے خاص ہیں اور جو بندہ کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ ہیں بقیہ اوصاف ومحامد انسان کے لئے قابل نقل ہیں کہ وہ خدا کے محامد واوصاف سے دور کی نسبت رکھتے ہیں، اس لئے انسان پر فرض ہے کہ اگر وہ خدا سے نسبت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اپنے اندر اس کے محامدِ اوصاف سے نسبت پیدا کرے اور خدا کے ان اسماء وصفات کو محامد ومحاسن اور خوبیوں کا انتہائی معیار جان کر ان کی نقل اور پیروی کی کوشش کرے۔ محامد الٰہی گویا استاد اعلیٰ کی وصلی ہے جس کو دیکھ کر شاگرد کو اپنے خط کی خوبی میں ترقی کرنی چاہئے اس لیے انسان کو بھی اپنے ہر حرف کے لکھنے (محامد الٰہی کی اتارنے) میں ایک نظر اس استادِ ازل کی وصلی پر بھی ڈال لینی چاہئے تا کہ معلوم ہو کہ اس کی ذاتی مشق کہاں تک اصلی وصلی کے مطابق ہے۔

گذر چکا کہ قرآن کا پہلا سبق یہ ہے کہ بحکم

﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ (بقرہ)

آدم کا بیٹا زمین میں خدا کا خلیفہ اور نائب بنایا گیا ہے۔

خلیفہ اور نائب میں اصل کے اوصاف ومحامد کا پرتو جتنا زیادہ نمایاں ہوگا اتنا ہی وہ اپنے اندر اس منصب کا استحقاق زیادہ ثابت کرے گا اور اتنا ہی وہ اصل سے زیادہ قریب ہوگا اور نیابت کے فرائض زیادہ بہتر ادا کرے گا۔ یہاں تک کہ اس میں وہ جلوہ بھی نمایاں ہوگا جب وہ سرتاپا خدائی رنگ میں رنگ کر نکھر جائے گا۔

﴿ صِبۡغَةَ اللّٰهِ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰه صِبۡغَةً ﴾ (بقرہ)

خدا کا رنگ اور خدا کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے۔

تمام اہل تفسیر متفق ہیں کہ اس ''خدائی رنگ'' سے مقصود خدا کا ''دین فطرت'' ہے۔

یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوۡرَتِهٖ﴾ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا اور ساتھ ہی اس کی تشریح بھی گذری کہ اس صورت سے مقصود جسمانی نہیں معنوی شکل و صورت ہے۔ یعنی یہ کہ خدا نے انسان میں اپنے صفات کاملہ کا عکس جلوہ گر کیا ہے اور ان کے قبول کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے اور ان میں حد بشری تک ترقی کی استعداد بخشی ہے اور اخلاق و صفات میں ملاء اعلیٰ سے تشبہ اور ہم شکلی کا جوہر مرحمت فرمایا ہے اور یہی صوفیہ اور خاصان خدا کے اس مقولہ

﴿ تخلقوا باخلاق اللّٰه ﴾

خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو۔

کیا مطلب ہے حدیث میں یہی مفہوم بروایت طبرانی ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ

﴿ حسن الخلق خلق اللّٰه الاعظم ﴾

حسن خلق خدا تعالیٰ کا خلق عظیم ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کی چار قسمیں اوپر بیان ہوئی ہیں۔ جلالی، تنزیہی، کمالی اور جمالی، صفات جلالی جن میں کبریائی، عظمت، شہنشاہی اور بڑائی کے اوصاف ہیں، اللہ تعالیٰ کے سوا مخلوقات ان کی مستحق نہیں اور نہ یہ اوصاف بندگی اور عبودیت کے رتبہ کے سزاوار ہیں۔ ان کا انعکاس یہ ہے کہ بندوں میں ان کے مقابل کے صفات پیدا ہوں یعنی عاجزی، تواضع، فروتنی اور خاکساری، اسی لئے ترفع، تکبر اور بڑائی کا اظہار منع ہے اور اسی لئے آدم جس نے فروتنی اختیار کی اور عجز و قصور کا اعتراف کیا، مغفرت کی خلعت سے سرفراز ہوا اور شیطان جس نے ترفع اور غرور کیا، دائمی لعنت کا مستحق ٹھہرا۔

﴿ اَبٰی وَاسۡتَكۡبَرَ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴾ (بقرہ)

اس نے آدم کے سجدہ سے انکار کیا اور غرور کیا، اور کافروں میں سے ہو گیا۔

قرآن پاک میں ہے کہ بڑائی اور کبریائی صرف خدا کے لئے ہے اسکے سوا کوئی اور اس کا مستحق نہیں

﴿ وَلَهُ الۡكِبۡرِيَآءُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ﴾ (جاثیہ)

اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے بڑائی ہے۔

صحیح مسلم [2] میں ابو سعید خدریؓ اور ابو ہریرہؓ دو صحابیوں سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''عزت اسکا لباس اور کبریائی اسکی چادر ہے (خدا فرماتا ہے) تو جو کوئی عزت اور کبریائی میں میرا حریف بنے گا میں اسے سزا دوں گا'۔ دوسری جگہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''خدا کے نزدیک سب سے براوہ ہے جو اپنا نام بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہ رکھتا ہے خدا کے سوا کوئی بادشاہ اور مالک نہیں [3] ﴿اَلۡعَزِيۡزُ الۡجَبَّارُ الۡمُتَكَبِّرُ﴾ (حشر۔۳) اسی کی شان ہے، البتہ اللہ تعالیٰ اپنی

---

[1] کنز العمال ج ۱۲ ص ۲ بروایت حضرت عمار بن یاسر۔

[2] کتاب الادب باب الکبر جلد دوم صفحہ ۴۰۰ مصر۔

[3] صحیح بخاری و مسلم کتاب الادب۔

عزت جلال اور قوت و جبروت کا فیضان بعض بندوں اور امتوں پر نازل کرتا ہے اور ان کو طاقت اور قوت اور بادشاہی عطا کرتا ہے مگر اس نوازش پر بھی نیک بندوں اور صالح امتوں کا فرض یہی ہے کہ عین اس وقت جب ان کے دست و بازو سے قوتِ حق اور ربانی جاہ وجلال کا اظہار ہو رہا ہو، ان کی پیشانیاں فرط عبودیت سے اس کے آگے جھکی ہوں اور سر نیاز اظہار بندگی کے لیے اس کے سامنے خم ہوں کہ عزت وجلال خاص خدا کی شان تھی جس کا فیضان رسول اللہؐ پر ہوا اور رسول کی وساطت سے مومنوں پر ہوا۔ یہ ترتیب خود قرآن میں ملحوظ رکھی گئی ہے۔

﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (منافقون)

اور عزت خدا کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لئے اور مومنوں کے لئے ہے۔

حاکم میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تین کپڑے ہیں، وہ اپنی عزت وجلال کا ازار باندھتا ہے اور اپنی رحمت کا جامہ پہنتا ہے اور اپنی کبریائی کی چادر اوڑھتا ہے، تو جو شخص اس عزت کے سوا جو خدا کی طرف سے اس کو عنائت ہوئی ہو معزز بننا چاہتا ہے تو وہی وہ شخص ہے جس کو قیامت میں یہ کہا جائے گا ''اس کا مزہ چکھ تو معزز اور شریف بنتا تھا'' (قرآن) اور جو انسانوں پر رحم کرتا ہے خدا اس پر رحم کرتا ہے کیونکہ اس نے وہ جامہ پہنا جس کا پہننا اسکو روا تھا اور جو کبریائی کرتا ہے تو اس نے خدا کی اس چادر کو اتارنا چاہا جو خدا ہی کے لیے تھی۔[1]

خدا کے صفات کمال میں سے وحدانیت اور بقائے ازلی و ابدی کے سوا کہ ان سے تمام مخلوقات اور ممکنات طبعاً محروم ہیں بقیہ اوصاف کے فیضان سے انسان مشرف ہوتا ہے صفاتِ تنزیہی مثلاً قدرت، علم، سمع، بصر، کلام وغیرہ سے بھی مخلوقات تمام تر محروم ہیں ان کی تنزیہہ یہی ہے کہ وہ خدا کے عصیان، نافرمانی اور گنہگاری کے عیب سے بری اور پاک ہوں۔

صفات جمالی وہ اصلی اوصاف ہیں جن کے فیضان کا دروازہ ہر صاحب توفیق کے لیے حسب استعداد کھلا ہوا ہے ان صفات جمالی کا سب سے بڑا مظہر عفو و درگزر ہے عیسائیوں کی عام دعا میں ایک فقرہ ہے کہ ''خداوند! تو ہمارے گناہوں کو معاف کر، جس طرح ہم اپنے قرضداروں کو معاف کرتے ہیں'' اسلام نے اس الٹی تشبیہ کو جائز نہیں رکھا ہے۔ اس کے ہاں یہ ہے کہ ''اے انسان تو اپنے مجرموں کو معاف کر کہ خدا تیرے گناہوں کو معاف کرے'' آپ نے فرمایا ''جو کوئی اپنے بھائی کے گناہ پر پردہ ڈال دے گا' خدا اس کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا۔''[2] قرآن کہتا ہے کہ ''تم دوسروں کو معاف کرو کہ خدا تم کو معاف کرتا ہے۔''

﴿ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴾ (نساء)

اگر تم کوئی نیکی دکھا کر یا چھپا کر کرو یا کسی کی برائی کو معاف کرو تو اللہ (بھی) معاف کرنے والا قدرت والا ہے۔

ایک دفعہ عہد نبوت میں بارگاہ عدالت قائم تھی۔ ایک مجرم کو سزا دی جارہی تھی۔ سزا کا منظر دیکھ کر حضور کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا ادا شناسوں نے سبب دریافت کیا۔ فرمایا کہ امام تک معاملہ پہنچنے سے پہلے اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا

---

[1] کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۱۷۹، مستدرک حاکم۔

[2] صحیح مسلم کتاب البر والصلہ۔

کرو۔ خدا معاف کرنے والا ہے اور عفو و درگذر پسند کرتا ہے، تو تم بھی معاف اور درگذر کیا کرو، کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ خدا تمہیں بھی معاف کرے۔ وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔[۱]

آنحضرت ﷺ ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں فرما رہے تھے کہ ''جس کے دل میں غرور کا ایک ذرہ بھی ہوگا وہ بہشت میں داخل نہ ہوگا۔'' ایک صحابی نے عرض کی یا رسول اللہ! انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اس کا جوتا اچھا ہو کیا یہ بھی غرور ہے، فرمایا

﴿ان اللہ عزوجل جمیل یحب الجمال﴾[۲]

اللہ تعالیٰ اچھا ہے اور جمال والا ہے اچھائی اور جمال کو پسند کرتا ہے۔

یہ غرور نہیں، غرور حق کو پامال کرنا اور انسانوں کو دبانا ہے۔ یہی روایت حدیث کی دوسری کتابوں میں ان الفاظ کے ساتھ ہے۔ خدا جمال والا ہے وہ جمال کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے بندہ پر اس کی نعمت کا اثر ظاہر ہو۔[۳]

یہ روایت بھی ہے ''خدا جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے وہ سخی ہے سخاوت کو پسند کرتا ہے وہ صاف ستھرا ہے صفائی اور ستھرا پن کو پسند کرتا ہے''[۴] روایت کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں ''وہ جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے اخلاق عالیہ سے محبت اور بداخلاقیوں سے نفرت رکھتا ہے''۔[۵] ایک موقع پر آنحضرت ﷺ حضرت عائشہؓ کو نصیحت فرماتے ہیں اے عائشہ! خدا نرمی والا ہے وہ ہر بات میں نرمی کو پسند کرتا ہے[۶] ایک مرتبہ آپ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا ''لوگو! خدا پاک ہے اور پاک ہی کو قبول کرتا ہے۔[۷] عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا ''اے قرآن کے ماننے والو وتر نماز پڑھا کرو کہ خدا یکتا (وتر) ہے وہ یکتا (وتر) کو پسند کرتا ہے''۔[۸]

رحمت و شفقت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے مگر خدا کی رحمت و شفقت کے وہی مستحق ہیں جو دوسروں پر رحمت و شفقت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا رحم کرنے والوں پر وہ رحم کرنے والا بھی رحم کرتا ہے۔ لوگو! تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا (ابوداؤد، باب فی الرحمۃ) – رشتہ داری اور قرابت کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے تمام رشتہ داریاں اور قرابتیں رحم کے تعلق پر قائم ہیں، آپ نے فرمایا کہ رحم کی جڑ رحمان سے ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ اے رحم جو تجھ کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا۔ جو تجھ کو ملائے گا اس کو میں بھی ملاؤں گا''۔[۹] ترمذی میں یہی تعلیم ان الفاظ

---

[۱] مستدرک للحاکم جلد۴ ص۳۸۲، کتاب الحدود۔

[۲] صحیح مسلم کتاب الایمان و ترمذی باب الکبر۔

[۳] کنز العمال کتاب الزینۃ بحوالہ شعب الایمان بیہقی۔

[۴] کنز العمال کتاب الزینۃ بحوالہ کامل لابن عدی۔

[۵] ایضاً بحوالہ معجم اوسط طبرانی۔

[۶] صحیح مسلم، ابوداؤد، حاکم، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی فی الآداب۔

[۷] صحیح مسلم کتاب الصدقات و ترمذی تفسیر سورہ بقرہ۔

[۸] ابوداؤد باب استحباب الوتر۔

[۹] صحیح بخاری باب صلۃ الرحم۔

میں ہے ''میں خدا ہوں میں رحمان ہوں، میں نے رحم کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام (رحمان) سے اس کا نام (رحم) مشتق کیا ہے تو جو اس کو ملائے گا میں اس کو ملاؤں گا۔ جو اس کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا۔''[۱] پھر فرمایا جو انسان پر رحم نہیں کرتا خدا اس پر رحم نہیں کرتا۔[۲] بخاری میں اس روایت کے یہ الفاظ ہیں۔ جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔[۳] آپ نے فرمایا خدا نے رحم کے سو حصے کئے، ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ زمین والوں کو عنایت کیا۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ باہم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رحم و شفقت سے پیش آتے ہیں۔ یہاں تک کہ گھوڑی بھی اپنے بچہ کے لئے اس خوف سے پاؤں اٹھا لیتی ہے کہ اس کو صدمہ نہ پہنچے۔[۴]

بخل خدا کی صفت نہیں مگر آپ نے فرمایا ''تم اپنی تھیلی کے منہ نہ بند کرو ورنہ تم پر بھی تھیلی کا منہ بند کیا جائے گا۔''[۵] یہ نصیحت بھی فرمائی کہ ''جو بندہ دوسرے بندے کی پردہ پوشی کرے گا' قیامت میں اس کی پردہ پوشی خدا کرے گا[۶] یہ نصیحت بھی فرمائی کہ جب تک تم اپنے بھائی کی مدد میں ہو[۷] خدا تمہاری مدد میں ہے۔

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا کہ خدا سے بڑھ کر کوئی غیرت مند نہیں اسی لئے اس نے فحش باتوں کو حرام کیا ہے۔[۸] اسی کی تفسیر دوسری حدیث میں ہے، آپ نے فرمایا کہ ''خدا بھی غیرت کرتا ہے اور مومن بھی غیرت کرتا ہے اور خدا کی غیرت یہ ہے کہ اس نے اپنے مومن پر جس بات کو حرام کیا ہے اگر کوئی اس کا ارتکاب کرے تو وہ اس پر خفا ہو''۔[۹]

اللہ تعالیٰ ظلم سے پاک ہے۔

﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ ﴾ (آل عمران۔ ۱۹)

اور خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اس لئے اس کے بندوں کا فرض ہے کہ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے اللہ تعالیٰ کی اس عملی تعلیم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا۔

﴿ یا عبادی انی حرمت الظلم علی نفسی و جعلته بینکم محرما فلا تظالموا ﴾[۱۰]

---

[۱] ابواب البر والصلۃ۔

[۲] ترمذی باب مذکور۔

[۳] جامع بخاری باب رحمۃ الولد۔

[۴] ایضاً۔

[۵] صحیح ترمذی ابواب البر والصلۃ۔

[۶] مسلم کتاب البر والصلۃ باب بشارۃ من ستر اللہ تعالیٰ علیہ فی الدنیا بان یستر علیہ فی الاخرۃ۔

[۷] ابوداؤد کتاب الادب باب فی المعونۃ للمسلم۔

[۸] صحیح بخاری کتاب التوحید جلد دوم ص ۱۱۰۔

[۹] جامع ترمذی باب ماجاء فی الغیرۃ من ابواب النکاح۔

[۱۰] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ و مسند ابن حنبل جلد ۸ ص ۱۶۰ مصر' وادب المفرد امام بخاری باب الظلم' ص ۹۵۔

اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے، ہاں تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا

پاکیزگی اور لطافت خدا کی صفتیں ہیں۔ اس لئے خدا کے ہر بندہ کو بھی پاک وصاف رہنا چاہئے۔ آپ نے فرمایا۔

﴿ان الله طيب يحب الطيب و نظيف يحب النظافة فتنظفوا و لا تشبهوا اليهود﴾ [1]

خدا پاکیزہ ہے، پاکیزگی کو پسند کرتا ہے اور پاک وصاف ہے پاکی اور صفائی کو پسند کرتا ہے، تم پاک وصاف رہا کرو اور یہودیوں کی طرح گندے نہ بنو۔

یہ توحید کا ایک رخ تھا۔ اب اس کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کے قابل ہے۔

وہ قومیں جو توحید سے آشنا نہ تھیں انہوں نے انسانیت کا مرتبہ بھی نہیں پہچانا تھا، وہ انسان کو فطرت کے ہر مظہر کا غلام سمجھتی تھیں۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم توحید ہی تھی جس نے خدا کے سوا ہر شے کا خوف انسانوں کے دلوں سے نکال دیا۔ سورج سے لے کر زمین کے دریا اور تالاب تک ہر چیز آقا ہونے کے بجائے انسانوں کی غلام بن کر ان کے سامنے آئی۔ بادشاہوں کے جلال و جبروت کا طلسم ٹوٹ گیا اور وہ بابل (ومصر) ہندوایران کے خدا اور ﴿رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ ہونے کے بجائے انسانوں کے خادم، راعی اور چوکیدار کی صورت میں نظر آئے۔ جن کا عزل ونصب دیوتاؤں اور فرشتوں کے ہاتھ میں نہ تھا بلکہ انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔

تمام انسانی برادری جس کو دیوتاؤں کی حکومتوں نے اونچ نیچ، بلند وپست، شریف وذلیل، مختلف طبقوں اور ذاتوں میں منقسم کر دیا تھا اور جن میں سے کچھ کی پیدائش پرمیشور کے منہ، کچھ کی اس کے ہاتھ اور کچھ کی اس کے پاؤں سے تسلیم کی جاتی تھی اس عقیدے کی وجہ سے ایسی مختلف جنسوں میں بٹ گئی تھی، جن کو کسی طرح متفق نہیں کر سکتے تھے اور اس طرح مساوات انسانی کی دولت دنیا سے گم تھی اور زمین قوموں اور ذاتوں کے ظلم وجبر اور غرور وفخر کا دنگل بن گئی تھی۔ توحید نے آ کر اس بلند وپست اور نشیب وفراز کو برابر کیا۔ سب انسان خدا کے بندے سب اس کے سامنے برابر سب باہم بھائی بھائی اور سب حقوق کے لحاظ سے یکساں قرار پائے۔ ان تعلیمات نے دنیا کی معاشرتی اخلاقی اور سیاسی اصلاحات میں جو کام کیا اس کے نتائج تاریخ کے صفحوں میں ثبت ہیں۔

بہر حال اس اصول کی صداقت کو انہوں نے بھی تسلیم کر لیا جو حقیقی توحید سے ناآشنا ہیں اور اسی لئے وہ مساوات انسانی کے حقیقی جوہر سے بھی اب تک آشنا ہیں اور انتہا یہ ہے کہ خدا کے گھر میں جا کر بھی تفاوت درجہ کا خیال ان کے دل میں دور نہیں ہوتا۔ دولت وفقر اور رنگ وقومیت کے امتیازات خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر بھی نہیں بھولتے۔ مسلمانوں کو تیرہ سو برس سے اس مساوات کی دولت اسی توحید کامل کی بدولت حاصل ہے اور وہ ہر قسم کے ان مصنوعی امتیازات سے پاک ہیں، اسلام کی نظر میں سب ایک خدا کے بندے ہیں اور سب یکساں اس کے سامنے سرافگندہ ہیں۔ دولت وفقر، رنگ وروپ اور نسل وقومیت کا کوئی امتیاز ان کو منقسم نہیں کرتا۔ اگر کوئی امتیاز ہے تو صرف تقویٰ اور خدا کی فرمانبرداری کا ہے۔

---

[1] ترمذی باب فی النظافۃ ص ۴۵۶۔

﴿ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ﴾ (حجرات۔۲)

تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے تقویٰ کرتا ہو۔

خدا کا ڈر اور پیار:

اس سلسلہ میں ایک اور اہم مسئلہ خدا سے ڈرنے اور اس سے محبت کرنے کا ہے۔ عام طور سے مخالفوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے جس خدا کی تعلیم دی ہے وہ فقط قہار، جبار اور مہیب شہنشاہ مطلق ہے۔ جس کی ہیبت وجلال سے تمام بندوں کو صرف ڈرتے اور کانپتے رہنا چاہئے۔ اس کے گوشہ چشم میں لطف وعنایت کا گذر نہیں۔ محبت اور پیار کا نذرانہ اس کے دربار میں قبول نہیں۔ نہ وہ اپنے کمزور بندوں پر خود محبت کی نظر رکھتا ہے اور نہ وہ اپنے بندوں سے اپنے لئے محبت کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تعلیم محمدی کی بالکل غلط تصویر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جو اسماء اور صفات اوپر گذر چکے ہیں ان پر ایک ایک کر کے نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس کے چند پُر جلال ناموں کو چھوڑ کر جو اس کی قدرت تامہ اور مالکیت عامہ کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں بقیہ تمام تر نام صرف محبت پیار اور لطف وکرم، رحمت اور مہر کی تجلی گاہ ہیں۔ مخالفوں کو اس حقیقت کے سمجھنے میں دو وجوہات کے سبب مغالطہ ہوا۔

۱۔ آنحضرت ﷺ نے اللہ سے خوف اور خشیت کی بھی انسانوں کو دعوت دی۔

۲۔ دوسرے مذہبوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کے اظہار کی جو اصطلاحیں مقرر کی تھیں آپ نے شدت کے ساتھ ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا۔

محبت کے ساتھ خوف وخشیت کی تعلیم:

یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیم میں محبت اور پیار کے ساتھ خدا کے خوف وخشیت کو بھی جگہ دی ہے۔ غور کرو کہ انسانوں میں تمام کاموں کے محرک دو ہی جذبے ہیں۔ خوف اور محبت۔ یہ دونوں جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ یا آگے پیچھے بھی اور ان دونوں جذبات کے لوازم بھی الگ الگ ہیں۔ ادعائے محبت کا نتیجہ ناز تبختر اور کبھی گستاخی اور کبھی اپنے مہربان ومحبوب پر غایت اعتماد کی بنا پر نافرمانی بھی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جذبہ محبت کے ان لوازم اور اثرات کا انسداد خوف ہی کے جذبہ سے ہوسکتا ہے۔ اس لئے خالق ومخلوق کے درمیانی رابطہ کی تکمیل کا تعلق نہ تنہا خوف سے ہوسکتا ہے اور نہ تنہا محبت سے انجام پاسکتا ہے بلکہ ان دونوں کے اشتراک، امتزاج اور اعتدال سے اور یہی نبوت محمدی کی تعلیم ہے۔

اسلام سے پہلے جو آسمانی مذاہب قائم تھے ان میں اس مسئلہ میں بھی افراط وتفریط پیدا ہوگئی تھی اور صراط مستقیم سے وہ تمام ترہٹ گئے تھے۔ یہودی مذہب کی بنا سراسر خوف وخشیت اور سخت گیری پر تھی۔ اس کا خدا فوجوں کا سپہ سالار ہے[1] اور باپ کا بدلہ پشت تا پشت تک بیٹوں سے لینے والا تھا۔[2] حالانکہ یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم وکرم اور محبت و

---

[1] یرمیاہ ۳۲، ۱۴، ۱۵ وغیرہ۔

[2] خروج ۲۰، ۵، ۳۴، ۷ واستثناء ۴، ۳۴، ۲، ۱۵ وغیرہ۔

شفقت کا ذکر کہیں کہیں موجود ہے۔[1] اس کے برعکس عیسائیت زیادہ تر خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کے تذکروں سے معمور تھی گو ایسا نہیں ہے کہ اس میں خدا کے خوف و خشیت کی مطلق تعلیم نہیں بلکہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی تاکید ہے۔[2] مگر ان دونوں مذہبوں کے پیروؤں نے ان دو متقابل تعلیموں کے درمیان اعتدال ملحوظ نہیں رکھا تھا۔ اسلام نے اسی نقطہ اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے وہ نہ تو خدا کو محض جبار، قہار، رب الافواج اور صرف بنی اسرائیل یا بنی اسمٰعیل کا خدا مانتا ہے نہ اس کو مجسم انسان، انسانوں کا باپ، یا محمد ﷺ کا باپ سمجھتا ہے اور نہ تنہا رحم و کرم اور محبت و شفقت کے صفات سے اس کو متصف کرتا ہے بلکہ وہ خدا کی نسبت یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے اور رحمان و کریم بھی، وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور و رحیم بھی، وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے، خفا بھی ہوتا ہے اور نوازتا بھی ہے، اس سے ڈرنا بھی چاہئے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہئے۔

﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَلَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ط وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ط اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (اعراف)

(لوگو!) اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر چپکے چپکے پکارا کرو۔ وہ حد سے بڑھ جانے والوں کو پیار نہیں کرتا، اور زمین کی درستی کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ اور اس کو اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اور اس کے فضل و کرم کی لو لگاتے ہوئے پکارا کرو، بے شک خدا کی رحمت اچھے کام کرنے والوں کے قریب رہتی ہے۔

چند نیک بندوں کی مدح میں فرمایا۔

﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ﴾ (انبیا-۶)

وہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے تھے، اور ہم کو امید اور ڈر کے ساتھ پکارتے تھے۔

اس سے زیادہ پر لطف بات یہ ہے کہ اسلام خدا سے لوگوں کو ڈراتا ہے مگر اس کو جبار اور قہار کہہ کر نہیں بلکہ مہربان اور رحیم کہہ کر۔ چنانچہ خدا کے سعید بندوں کی صفت یہ ہے کہ

﴿ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ﴾ (یٰسین)

اور رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔

﴿ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ﴾ (ق)

اور جو رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔

نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کی زبانیں اس مہربان کے جلال کے سامنے گنگ ہیں۔

﴿ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ ﴾ (طٰہٰ)

اور رحم والے کے ادب سے تمام آوازیں پست ہو گئیں۔

دنیا میں جو پیغمبر آئے دو قسم کے تھے، ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ

---

[1] خروج ۲۰‘ ۷‘ ۳۴‘ ۷ و زبور ۸۶‘ ۱۵ و ۱۰۳‘ ۸ وغیرہ میں خدا کے پیار اور رحم و کرم کا ذکر ہے۔

[2] لوقا کی انجیل ۱۲‘ ۵ اوّل پطرس ۲‘ ۷ دوم قرنتیون ۷۔ ۱‘ افسیون ۵۔ ۲۱ الغرض خدا سے ڈرنے کی تعلیم عیسائیت میں بھی دی گئی ہے۔

تھا۔ اس لئے وہ صرف خدا کے خوف و خشیت کی تعلیم دیتے تھے مثلاً حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ۔ دوسرے وہ جو محبت الٰہی میں سرشار تھے اور وہ لوگوں کو اسی غم خانہ عشق کی طرف بلاتے تھے مثلاً حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ۔

لیکن پیغمبروں میں ایک ایسی ہستی بھی آئی جو ان دونوں صفتوں کی برزخ کبریٰ، جلال و جمال دونوں کا مظہر اور پیار اور ادب و لحاظ دونوں کی جامع تھی یعنی محمد رسول اللہ ﷺ۔ ایک طرف آپ کی آنکھیں خوف الٰہی سے اشک بار رہتی تھیں، دوسری طرف آپ کا دل خدا کی محبت اور رحم و کرم کے سرور سے سرشار رہتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں یہ دونوں منظر آپ کے چہرہ انور پر لوگوں کو نظر آ جاتے تھے۔ چنانچہ جب راتوں کو آپ شوق و ولولہ کے عالم میں نماز کے لئے کھڑے ہوتے، قرآن مجید کی لمبی لمبی سورتیں زبان مبارک پر ہوتیں اور ہر معنی کی آیتیں گذرتی جاتیں جب کوئی خوف و خشیت کی آیت آتی، پناہ مانگتے اور جب کوئی مہر و محبت اور رحم و بشارت کی آیت آتی تو اس کے حصول کی دعا کرتے تھے۔ [1]

الغرض اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ خوف اور محبت کے کناروں سے ہٹا کر جہاں سے ہر وقت نیچے گرنے کا خطرہ ہے خوف و خشیت اور رحم محبت کے بیچ کی شاہراہ میں وہ انسانوں کو کھڑا کرے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ

﴿ الایمان بین الخوف والرجاء﴾

ایمان کامل خوف اور امید کے درمیان ہے۔

کہ تنہا خوف لوگوں کو خدا کے رحم و کرم سے ناامید اور محض رحم و کرم پر بھروسہ لوگوں کو خودسر اور گستاخ بنا دیتا ہے جیسا کہ اس عملی دنیا کے روزانہ کے کاروبار میں نظر آتا ہے اور مذہبی حیثیت سے اس کے نتائج کا مشاہدہ عملاً یہودیوں اور عیسائیوں میں کیا جا سکتا ہے اسی لئے محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی تعلیم میں ان دونوں متضاد کیفیتوں کو ایمان اور عقیدہ کی رو سے برابر کا درجہ دیا۔ لیکن ساتھ ہی عاجز و درماندہ انسانوں کو یہ بھی بشارت سنائی کہ خدا کی رحمت کا دائرہ اس کے غضب کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہے، فرمایا

﴿ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ﴾ (اعراف)

میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔

اور اس کی تفسیر صاحب قرآنؐ نے ان الفاظ میں کی۔

﴿ رحمتی سبقت غضبی ﴾ (بخاری)

میرے غضب سے میری رحمت آگے بڑھ گئی۔

عیسائیوں نے خدا سے اپنا رشتہ جوڑا اور اپنے کو فرزند الٰہی کا لقب دیا، بعض یہودی فرقوں نے بنی اسرائیل کو خدا کا خانوادہ اور محبوب ٹھہرایا اور حضرت عیسیٰؑ کے جوڑ پر حضرت عزیرؑ کو فرزند الٰہی کا رتبہ دیا، لیکن اسلام یہ شرف کسی مخصوص خاندان یا خاص قوم کو عطا نہیں کرتا، بلکہ وہ تمام انسانوں کو بندگی اور اطاعت کی ایک سطح پر لا کر کھڑا کرتا ہے، مسلمانوں کے مقابلہ میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو دعویٰ تھا۔

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۹، صفحہ ۹۳۔

﴿ نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبّٰٓؤُهٗ ﴾ (مائدہ)

ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔

قرآن مجید نے اس کے جواب میں کہا:

﴿ قُلۡ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمۡ بِذُنُوۡبِكُمۡ بَلۡ اَنۡتُمۡ بَشَرٌ مِّمَّنۡ خَلَقَ ﴾ (مائدہ)

اگر ایسا ہے تو خدا تمہارے گناہوں کے بدلہ تم کو عذاب کیوں دیتا ہے (اس لئے تمہارا دعویٰ صحیح نہیں) بلکہ تم بھی انہیں انسانوں میں سے ہو جس کو اس نے پیدا کیا۔

دوسری جگہ قرآن نے تنہا یہودیوں کے جواب میں کہا۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ هَادُوۡۤا اِنۡ زَعَمۡتُمۡ اَنَّكُمۡ اَوۡلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنۡ دُوۡنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴾ (جمعہ۔۶)

اے وہ جو یہودی ہو! اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ تمام انسانوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے خاص چہیتے ہو تو موت (یعنی خدا کی ملاقات) کی تمنا کیوں نہیں کرتے۔

اسلام رحمت الٰہی کے دائرہ کو کسی خاندان اور قوم تک محدود نہیں رکھتا' بلکہ وہ اس کی وسعت میں انسانوں کی ہر برادری کو داخل کرتا ہے۔ ایک شخص نے مسجد نبوی میں آ کر دعا کی کہ ''خدایا مجھ کو اور محمد کو مغفرت عطا کر'' آپ نے فرمایا خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا [۱] ایک اور اعرابی نے مسجد میں دعا مانگی کہ خدایا مجھ پر اور محمد پر رحمت بھیج اور ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ کر' آپ نے صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرمایا ''یہ زیادہ گمراہ ہے یا اس کا اونٹ''۔ [۲]

محبت کی جسمانی اصطلاحات کی ممانعت:

اس سلسلہ میں تعلیم محمدی کے متعلق غلط فہمی کا دوسرا سبب جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے یہ ہے کہ بعض مذاہب نے خدا کی محبت و کرم کی تعبیر کے لئے جو مادی اور جسمانی اصطلاحیں قائم کی تھیں اسلام نے ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اسلام کا خدا رحم و کرم اور محبت اور پیار کے اوصاف سے معرا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان دوسرے غیر مادی خیالات کی طرح خدا اور بندہ کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو بھی اپنی ہی انسانی بول چال میں ادا کر سکتا ہے۔ محبت اور پیار کے یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی مادی اور جسمانی رشتوں کے ذریعہ سے نمایاں ہوتے ہیں' اس بنا پر بعض مذاہب نے اس طریقہ ادا کو خالق و مخلوق کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے بھی بہترین اسلوب سمجھا' چنانچہ کسی نے خالق اور مخلوق کے درمیان باپ اور بیٹے کا تعلق پیدا کیا' جیسا کہ عیسائیوں میں ہے دوسرے نے ماں کی محبت کا بڑا درجہ سمجھا۔ اس لئے اس تعلق کو ماں اور بیٹے کی اصطلاح سے واضح کیا اور دیویاں انسانوں کی ماتائیں بنیں جیسا کہ ہندوؤں کا عام مذہبی تخیل ہے۔ خاص ہندوستان کی خاک میں زن و شو کی باہمی محبت کا امتیازی خاصہ ہے جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی ہے اس کی نگاہ میں محبت کا اس سے زیادہ پر اثر منظر اور ناقابل

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الادب۔

[۲] ابوداؤد کتاب الادب۔

شکست پیمان کوئی دوسرا نہیں۔ اس لئے یہاں کے بعض فرقوں میں خالق ومخلوق کی باہمی محبت کے تعلق کو زن وشو کی اصطلاح سے ادا کیا گیا' سدا سہاگ فقراء اس تخلیل کی مضحکہ انگیز تصویر ہیں۔

یہ تمام فرقے جنہوں نے خدا اور بندہ کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتوں کے ذریعہ ادا کرنا چاہا وہ راہ سے بے راہ ہو گئے اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام کو بلکہ خواص تک کو گمراہ کر دیا اور لفظ کی اصلی روح کو چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری مغالطوں میں گرفتار ہو گئے۔ عیسائیوں نے واقعی حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا سمجھ لیا۔ ہندوستان کے بیٹوں نے ماتاؤں کی پوجا شروع کر دی۔ سدا سہاگ فقیروں نے چوڑیاں اور ساڑھیاں پہن لیں اور خدائے قادر سے شوخیاں کرنے لگے۔ اسی لئے اسلام نے جو توحید خالص کا مبلغ تھا ان جسمانی اصطلاحات کی سخت مخالفت کی، اور خدا کے لئے ان الفاظ کا استعمال اس نے ضلالت اور گمراہی قرار دیا۔ لیکن وہ ان الفاظ کے اصلی معنی اور منشا کا اور اس مجاز کے پردہ میں جو حقیقت مستور ہے اس کا انکار نہیں کرتا۔ بلکہ وہ ان جسمانی معنوں کو خالق ومخلوق اور عبد ومعبود کے ربط وتعلق کے اظہار کے لئے ناکافی اور غیر مکمل سمجھتا ہے اور وہ ان سے بھی زیادہ وسیع وکامل معنی کا طالب ہے۔

﴿ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ﴾ (بقرہ)

تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو' بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو

دیکھو کہ باپ کی طرح کی محبت کو وہ اپنے پروردگار کی محبت کے لئے ناکافی قرار دیتا ہے اور عبد ومعبود کے درمیان محبت کے رشتہ کو اس سے اور زیادہ مضبوط کرنا چاہتا ہے۔

الغرض رحمت ومحبت کے اس جسمانی طریقہ تعبیر کی مخالفت سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسلام سرے سے خالق و مخلوق اور عبد ومعبود کے درمیان محبت اور پیار کے جذبات سے خالی ہے، اتنا کون نہیں سمجھتا کہ مذہب کی تعلیمات انسانوں کی بولی میں اتری ہیں۔ انسانوں کے تمام خیالات وتصورات اسی مادی اور جسمانی ماحول کا عکس ہیں اس لئے ان کے ذہن میں کوئی غیر مادی اور غیر جسمانی تصور کسی مادی اور جسمانی تصور کی وساطت کے بغیر براہ راست پیدا نہیں ہو سکتا، اور نہ اس کے لئے ان کے لغت کا ایسا لفظ مل سکتا ہے جو غیر کسی مادی اور غیر جسمانی مفہوم کو اس قدر منزہ اور بلند طریقہ سے بیان کرے جس میں مادیت اور جسمانیت کا مطلق شائبہ نہ ہو' انسان ان دیکھی چیزوں کا تصور صرف دیکھی ہوئی چیزوں کی تشبیہ سے پیدا کرتا ہے' اور اس طرح ان دیکھی چیزوں کا ایک دھندلا سا عکس ذہن کے آئینہ میں اتر جاتا ہے۔

اس ''ان دیکھی ہستی'' کی ذات وصفات کے متعلق جس کو تم خدا کہتے ہو، ہر مذہب میں ایک تخیل ہے۔ غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ تخیل بھی اس مذہب کے پیروؤں کے گرد وپیش کی اشیاء سے ماخوذ ہے لیکن ایک بلند تر اور کامل تر مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس تخیل کو مادیت' جسمانیت اور انسانیت کی آلائشوں سے اس حد تک پاک ومنزہ کر دے جہاں تک بنی نوع انسان کے لئے ممکن ہے، خدا کے متعلق باپ' ماں اور شوہر کا تخیل اس درجہ مادی' جسمانی اور انسانی ہے کہ اس تخیل کے معتقد کے لئے ناممکن ہے کہ وہ خالص توحید کے صراط مستقیم پر قائم رہ سکے اسی لئے نبوت محمدی نے ان مادی تعلقات اور جسمانی رشتوں کے ظاہر کرنے والے الفاظ کو خالق ومخلوق کے اظہار ربط وتعلق کے باب میں یک قلم ترک کر دیا بلکہ ان کا استعمال بھی شرک قرار دیا، تاہم چونکہ روحانی حقائق کا اظہار بھی انسانوں ہی کی مادی بولی میں کرنا ہے

اس لئے اس نے جسمانی و مادی رشتہ کے بجائے جس کو دوسرے مذاہب نے منتخب کیا تھا اس رشتہ کے محض جذبات، احساسات اور عواطف کو خالق و مخلوق کے تعلقاتِ باہمی کے اظہار کے لئے اسلام نے مستعار لے لیا، اس طرح خالق و مخلوق کے درمیان کوئی جسمانی رشتہ قائم کئے بغیر اس نے ربط و تعلق کا اظہار کیا اور انسانوں کو استعمالات کی لفظی غلطی سے جو گمراہیاں پہلے پیش آ چکی تھیں ان سے ان کو محفوظ رکھا۔

ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لئے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں جن کو کسی خاص تخیل اور نصب العین کی بناء پر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے۔ اور گو ان کی حیثیت اب علم اور نام کی ہے تاہم وہ درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھ کر استعمال کئے گئے ہیں ہر قوم نے اس علم اور نام کے لئے اسی وصف کو پسند کیا ہے جو اس کے نزدیک اس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہو سکتی ہے۔

اسلام نے خالق کے لئے جو نام اور علم اختیار کیا ہے وہ لفظ اللہ ہے۔ اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے اس میں اہل لغت کا یقیناً اختلاف ہے مگر ایک گروہ کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہ وَلَاہُ سے نکلا ہے اور وَلَہٗ کے اصل معنی عربی میں اس غم، محبت اور تعلق خاطر کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے اسی سے بعد میں مطلق "عشق و محبت" کے معنی پیدا ہو گئے، اور اسی سے ہماری زبان میں لفظ وَالِہٗ (شیدا) مستعمل ہے۔ اس لئے اللہ کے معنی محبوب اور پیارے کے ہیں جس کے عشق و محبت میں نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات کے دل سرگرداں متحیر اور پریشان ہیں۔ حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن "گنج مراد آبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے، اللہ کا ترجمہ ہندی میں وہ "من موہن" یعنی دلوں کا محبوب کیا کرتے تھے۔

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن صفتوں پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے وہ رحمٰن اور رحیم ہیں۔ ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں یعنی رحم والا، مہربان، لطف و کرم والا، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (یعنی مہربان محبوب رحم والا) کے ضمن میں قرآن مجید کے ہر سورہ کے آغاز میں انہیں صفات ربانی کے بار بار دہرانے کی تاکید کی گئی ہے ہر نماز میں کئی کئی دفعہ ان کی تکرار ہوتی ہے کیا اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کے تخیل کو واضح کرنے کے لئے کوئی دلیل مطلوب ہے۔ لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں دوسرا علم یہی لفظ رحمان ہے جو رحم و کرم اور لطف و مہر کے معنی میں صفت مبالغہ کا صیغہ ہے۔

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴾ (بنی اسرائیل)

اس کو محبوب (اللہ) کہو یا مہربان (رحمان) کہو جو کہہ کر اس کو پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔

قرآن مجید نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی صدہا بار کی تکرار کو چھوڑ کر ۵۳ موقعوں پر خدا کو اس رحمان کے نام سے یاد کیا ہے۔

ابھی اس سے پہلے باب میں اسمائے الٰہی کا ایک ایک حرف ہماری نظر کے سامنے سے گزر چکا ہے۔ ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے ہر قسم کے جلالی و جمالی اوصاف آ گئے ہیں، استقصا کرو تو معلوم ہوگا کہ ان میں بڑی تعداد انہی ناموں کی ہے جن سے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مہر و محبت کا اظہار ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام یا ایک وصف الودود سورہ ذات البروج میں آیا ہے جس کے معنی "محبوب" اور "پیارے" کے ہیں کہ وہ سرتاپا مہر و محبت اور عشق اور پیار ہے۔

اس کے سوا خدا کا ایک اور نام الـولـی ہے جس کے لفظی معنی ''یار'' اور ''دوست'' کے ہیں خدا کا ایک اور نام جو قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے ''الرء وف'' ہے ''رؤف'' کا لفظ ''رافت'' سے نکلا ہے ''رافت'' کے معنی اس محبت اور تعلق خاطر ہیں جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے، اسی طرح خدا کا ایک اور نام ''حنان'' ہے جو حَنّ سے مشتق ہے ''حن'' اور ''حنین'' اس سوز دل اور محبت کو کہتے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے یہ الفاظ ان مجازی اور ان مستعار معانی کو ظاہر کرتے ہیں جو اسلام نے خالق ومخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لئے اختیار کئے ہیں دیکھو کہ وہ ان رشتوں کا نام نہیں لیتا لیکن ان رشتوں کے درمیان محبت اور پیار کے جو خاص جذبات ہیں ان کو خدا کے لئے بے تکلف استعمال کرتا ہے۔ اس طرح مادیت اور جسمانیات کا تخیل آئے بغیر وہ ان روحانی معنوں کی تلقین کر رہا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ وہ غـفـار (بخشش کرنے والا) اور غـفـور (بخشنے والا) ہے۔ یعنی بندوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا، وہ سَلَامٌ (امن وسلامتی) ہے کہ وہ سرتاپا اپنے بے پناہ بندوں کے لئے امن وسلامتی ہے وہ مُؤْمِنٌ (امن دینے والا) ہے۔ وہ اَلْعَدْلُ یعنی سرتاپا انصاف ہے، اَلْعَفُوُّ (معاف کرنیوالا) ہے۔ اَلْوَھَّابُ (عطا کرنیوالا) اَلْحَلِیْمُ (بردبار) اَلصَّبُوْرُ (بندوں کی گستاخیوں پر صبر کرنیوالا) اَلتَّوَّابُ (بندوں کے حال پر رجوع کرنیوالا) اَلْبِرُّ (نیک اور مجسم خیر) اور اَلْمُقْسِطُ (منصف اور عادل) ہے ان میں ہر لفظ پر ٹھہر کر ذرا غور کرو کہ اسلام کا تخیل کس قدر بلند اور برتر ہے۔

تورات کے اسفار، انجیل کے صحیفوں اور ہندوؤں کے ویدوں کے حصص کا ایک ایک ورق پڑھ جاؤ، کیا اللہ تعالیٰ کے لئے ایسے پُرمحبت اور سراپا مہر وکرم اسماء وصفات کی یہ کثرت تم کو وہاں ملے گی؟ یہ سچ ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کے لئے ماں اور باپ کا لفظ یہود ونصاریٰ اور ہنود کی طرح استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا، مگر اس سے یہ قیاس کرنا غلطی ہے کہ وہ اس لطف احساس اور مہر وکرم کے جذبات وعواطف سے خالی ہے جن کو یہ فرقے اپنا مخصوص سرمایہ سمجھتے ہیں مگر بات یہ ہے کہ ان روحانی جذبات اور معنوی احساسات کے ساتھ وہ شرک وکفر کی اس ضلالت اور گمراہی سے بھی انسانوں کو بچانا چاہتا ہے جو ذرا سی لفظی غلط فہمی سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو اصلیت سمجھ کر پاک اور سرتاپا روحانی معنوں کو مادی اور مجسم یقین کر لیتے ہیں، اور اس لئے وہ اس بلند تر توحید کی سطح سے بہت نیچے گر کر سررشتہ حقیقت کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ متکلم ازل کا آخری پیغام لے کر آئے تھے، اس لئے ضرورت تھی کہ آپ کی تعلیم اس قسم کی لغزشوں سے پاک ومبرا ہو، روحانی حقائق کی تعبیر کے لئے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا یقیناً مادی اور جسمانی استعارات اور مجازات سے چارہ نہیں، تاہم ایک دائمی تعلیم کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنی تعلیم کو استعمالات کی غلطیوں اور مجازات کی غلط فہمیوں سے محفوظ رکھے، چنانچہ اسلام نے اسی بناء پر ان استعارات اور مجازات کے استعمال میں بڑی احتیاط برتی ہے، اور خدا کے مہر وکرم اور عشق ومحبت کے تذکروں کے ساتھ ادب ولحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کیا ہے، قرآن مجید اور احادیث، روحانی عشق ومحبت کے ان دلآویز اور ولولہ انگیز حکایات سے معمور ہیں، بایں ہمہ اسلام انسان کو بیٹا اور خدا کو باپ نہیں کہتا کہ عبد ومعبود کے تعلقات کے اظہار کے لئے اس کے نزدیک یہ کوئی بلند تر تعبیر نہیں، وہ خدا کو اَبُ (باپ) کی بجائے ''رب'' کہہ کر پکارتا ہے وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے۔

"اَبُ اور رَبُ" ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل اسلام کے مطمع نظر سے کس درجہ پست ہے، اَبُ یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی بناء پر ایک خاص لحظہ میں قائم ہوتا ہے، اور پھر اس کی حیثیت بدل کر پرورش اور حفاظت کی صورت میں وہ بچپن کے ایک محدود عرصے تک قائم رہتا ہے، اس طرح گو باپ کو بیٹے کے وجود میں یک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے، مگر یہ تعلق حد درجہ ناقص، محدود اور فانی ہوتا ہے، بیٹے کے وجود، قیام وبقاء، ضروریات زندگی، سامان حیات، نشوونماء اور ارتقاء کسی چیز میں باپ کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ اپنے باپ سے الگ، مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے، مگر ذرا غور کرو، کیا عبد ومعبود اور خالق ومخلوق کے درمیان جو ربط و تعلق ہے اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے، کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لمحہ کے لئے بھی بے نیاز اور مستغنی ہوسکتا ہے، کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہے۔

ربوبیت (پرورش) عبد ومعبود اور خالق ومخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک اور پیدائش سے وفات تک، بلکہ وفات کے بعد سے ابد تک قائم رہتا ہے جو ایک لمحہ کے لئے منقطع نہیں ہوسکتا، جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے، وہ گہوارہ عدم سے لے کر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے۔ انسان ذرہ ہو یا بصورت غذا، قطرہ آب ہو یا قطرہ خون، مضغہ گوشت ہو یا مشت استخوان، شکم مادر میں ہو یا اس سے باہر، بچہ ہو یا جوان، ادھیڑ عمر ہو یا بوڑھا، کوئی آن، کوئی لمحہ، رب کے مہر وکرم اور لطف ومحبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت، جسمانیت، ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے، اس سے رب یک قلم پاک ہے، اور اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں جن میں نصرانیت اور ہندویت نے ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے۔

ان آیتوں اور حدیثوں کو دیکھو جن سے یہ روشن ہوتا ہے کہ اسلام کا سینہ اس ازلی وابدی عشق ومحبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے، اور وہ خمخانہ الست کی سرشاری کی یاد بھٹکے ہوئے انسانوں کو کس طرح دلا رہا ہے، اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے، ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت "حب الٰہی" ہے اور یہ وہ دولت ہے جو اہل ایمان کی پہلی جماعت کو عملاً نصیب ہو چکی تھی، زبان الٰہی نے شہادت دی۔

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ﴾ (بقرہ)

جو ایمان لائے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں۔

اس نشہ محبت کے سامنے باپ، ماں، اولاد، بھائی، بیوی، جان ومال، خاندان سب قربان اور نثار ہو جانا چاہیے، ارشاد ہوتا ہے۔

﴿ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ ﴾ (توبہ۔۲۴)

اگر تمھارے باپ، تمھارے بیٹے، تمھارے بھائی، تمھاری بیویاں اور تمھارا کنبہ اور وہ دولت جو تم نے کمائی ہے، اور وہ سوداگری جس کے منداپڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے، اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو خدا اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ محبوب اور پیارے ہیں تو اس وقت تک انتظار کرو کہ خدا اپنا فیصلہ لے آئے۔

ایمان کے بعد بھی اگر نشہ محبت کی سرشاری نہیں ملی تو وہ بھی جادۂ حق سے دوری ہے۔ چنانچہ جو لوگ کہ راہ حق سے بھٹکنا چاہتے تھے ان کو پکار کر سنا دیا گیا۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَنۡ يَّرۡتَدَّ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِهٖ فَسَوۡفَ يَاۡتِى اللّٰهُ بِقَوۡمٍ يُّحِبُّهُمۡ وَيُحِبُّوۡنَهٗۤ ﴾ (مائدہ)

مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین اسلام سے پھر جائے گا تو خدا کو اس کی کچھ پرواہ نہیں، وہ ایسے لوگوں کو لا کھڑا کرے گا جن کو وہ پیار کرے گا اور وہ اس کو پیار کریں گے۔

حضرت مسیحؑ نے کہا "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" ہر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری آثار اور جسمانی علامات سے پہچانی جاتی ہے۔ تم کو زید کی محبت کا دعویٰ ہے مگر نہ تمہارے دل میں اس کے دیدار کی تڑپ ہے، نہ تمہارے سینہ میں صدمہ فراق کی جلن ہے، اور نہ آنکھوں میں ہجر و جدائی کے آنسو ہیں، تو کون تمہارے دعویٰ کی تصدیق کرے گا، اسی طرح خدا کی محبت اور پیار کے دعویدار تو بہتیرے ہو سکتے ہیں مگر اس غیر محسوس کیفیت کی مادی نشانیاں اور ظاہری علامتیں، اس کے احکام کی پیروی اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ خدا کے رسول کو اس اعلان کا حکم ہے۔

﴿ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ ﴾ (آل عمران)

اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو کہ خدا بھی تم کو پیار کرے گا۔

محبت کیونکر حاصل ہو، وحی محمدی نے اس رتبہ بلند کے حصول کی تدبیر بھی بتا دی فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجۡعَلُ لَهُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا ﴾ (مریم)

جو لوگ ایمان لائے، اور انہوں نے نیک کام کئے رحمت والا خدا ان کے لئے محبت پیدا کرے گا

اس آیت میں محبت کے حصول کے ذریعے دو بتائے گئے۔ ایمان اور عمل صالح یعنی نیک کام چنانچہ طبقات انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں جن کو ان ذریعوں سے خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴾ (مائدہ)

خدا نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيۡنَ ﴾ (بقرہ)

خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِيۡنَ ﴾ (آل عمران)

خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ ﴾ (مائدہ و حجرات)

خدا منصف مزاجوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (توبہ)

خدا پرہیز گاروں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِيْلِهٖ ﴾ (صف)

خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کے راستہ میں لڑتے ہیں

﴿ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ (آل عمران)

اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

﴿ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴾ (توبہ)

اور خدا پاک صاف لوگوں کو پیار کرتا ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ تین قسم کے آدمیوں سے محبت کرتا ہے اور تین قسم کے آدمیوں کو پیار نہیں کرتا' محبت ان سے کرتا ہے جو خدا کی راہ میں خلوص نیت کے ساتھ اپنی جان فدا کرتے ہیں اور ان سے جو اپنے پڑوسی کے ظلم پر صبر کرتے ہیں اور ان سے جو وضو کر کے خدا کی یاد کے لئے اس وقت اٹھتے ہیں جب قافلہ رات کے سفر سے تھک کر آرام کے لئے بستر لگاتا ہے تو وہ وضو کر کے خدا کی یاد کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں' اور خدا کی محبت سے محروم یہ تین ہیں اترانے والا مغرور' احسان دھرنے والا بخیل، جھوٹی قسمیں کھا کھا کر مال بیچنے والا سوداگر۔[1]

دنیا کے عیش و مسرت میں اگر کوئی خیال کا کانٹا سا چبھتا ہے اور ہمیشہ انسان کے عیش و سرور کو مکدر اور مبغض بنا کر بے فکری کی بہشت کو فکر و غم کی جہنم بنا دیتا ہے تو وہ ماضی اور حال کی ناکامیوں کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی ہے۔ پہلے کا نام حزن و غم ہے اور دوسرے کا نام خوف و دہشت ہے۔ غرض غم اور خوف یہی دو کانٹے ہیں جو عاجز و درماندہ انسانیت کے پہلو میں ہمیشہ چبھتے رہے ہیں، لیکن جو محبوب حقیقی کے طلب گار اور اس کے والہ و شیدا ہیں ان کو بشارت ہے کہ ان کے عیش کا چمن اس خارزار سے پاک ہوگا۔

﴿ اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ (یونس)

ہاں خدا کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہے' اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

محبت کا جو جذبہ بڑے کو چھوٹے کے ساتھ احسان' نیکی' درگذر اور عفو و بخشش پر آمادہ کرتا ہے اس کا نام ''رحم'' اور ''رحمت'' ہے اسلام کا خدا تمام تر رحم ہے۔ اس کی رحمت کے فیض سے عرصہ کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہے۔ اس کا نام رحمان و رحیم ہے۔ جو کچھ یہاں ہے سب اس کی رحمت کا ظہور ہے وہ نہ ہو تو کچھ نہ ہو۔ اسی لئے اس کی رحمت سے ناامیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے۔ مجرم سے مجرم اور گنہگار سے گنہگار کو وہ نوازنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ و تیار ہے۔ گنہگاروں اور مجرموں کو وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے میرے بندو! کہہ کر تسلی کا یہ پیام بھیجتا ہے۔

﴿ قُلْ يٰعِبَادِیَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ (زمر)

---

[1] احمد ابن حنبل مسند ابوذرؓ جلد ۵ صفحہ ۱۷۶۔

اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو پیام پہنچا دے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، اللہ یقیناً تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے بے شک وہی بخشش کرنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔

فرشتے حضرت ابراہیمؑ کو بشارت سناتے ہیں تو کہتے ہیں۔

﴿ فَلَا تَكُنۡ مِّنَ الۡقَانِطِيۡنَ ﴾ (حجر)

تم ناامید ہونے والوں میں سے نہ ہو۔

خلیل اللہ اس رمز سے ناآشنا نہ تھے کہ مرتبہ خلعت محبت سے مافوق ہے۔ اس لئے جواب دیا:

﴿ وَمَنۡ يَّقۡنَطُ مِنۡ رَّحۡمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوۡنَ ﴾ (حجر)

''اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے سوا اور کون ناامید ہوتا ہے۔''

بندوں کی جانب سے خدا پر کوئی پابندی عائد نہیں مگر اس نے خود اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر کچھ چیزیں فرض کرلی ہیں، من جملہ ان کے ایک رحمت بھی ہے۔ خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے وہ گنہگاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے، وہ سیہ کاروں کو ان کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے۔ وہ غالب ہے، قاہر ہے، جبار ہے، منتقم ہے، لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار وغفور ہے، رحمان ورحیم ہے، رؤف وعفو ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود بخود عائد کرلی ہے اور اپنے اوپر اس کو فرض گردان لیا ہے۔

﴿ كَتَبَ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ ﴾ (انعام)

اللہ نے از خود اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے۔

قاصد خاص کو حکم ہوتا ہے کہ ہمارے گنہگار بندوں کو ہمارے طرف سے سلام پہنچاؤ اور تسلی کا یہ پیام دو کہ اس کا باب رحمت ہر وقت کھلا ہے۔

﴿ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلۡ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ كَتَبَ رَبُّكُمۡ عَلٰى نَفۡسِهِ الرَّحۡمَةَ اَنَّهٗ مَنۡ عَمِلَ مِنۡكُمۡ سُوۡٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ وَاَصۡلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴾ (انعام)

اے پیغمبر جب تیرے پاس وہ آئیں جو میری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں تو ان کو کہہ کہ تم پر سلامتی ہو، تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر از خود اپنے بندوں پر مہربان ہونا لازم کرلیا ہے، کہ جو کوئی تم میں سے براہ نادانی برائی کر بیٹھے، پھر اس کے بعد بارگاہ الٰہی کی طرف رجوع کرے اور نیک بنے، تو بے شک وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصہ کائنات کا کوئی ذرہ اس سایۂ رحمت سے محروم نہیں۔

﴿ وَرَحۡمَتِىۡ وَسِعَتۡ كُلَّ شَىۡءٍ ﴾ (اعراف)

اور میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہے۔

بخاری وترمذی وغیرہ کی صحیح حدیثوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا تو اس نے اپنے دست خاص سے اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کرلی، جامع ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ اگر مومن کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے تو وہ جنت کی طمع نہ کرتا اور اگر کافر کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کی رحمت کس قدر بے حساب ہے، تو

وہ جنت سے مایوس نہ ہوتا یہ اسلام کے تخیل کی صحیح تعبیر ہے۔ بارگاہ احدیت کا آخری قاصد اپنے دربار کی جانب سے گنہگاروں کو بشارت سناتا ہے کہ اے آدم کے بیٹو! جب تک تم مجھے پکارتے رہو گے اور مجھ سے آس لگائے رہو گے میں تمہیں بخشتا رہوں گا خواہ تم میں کتنے ہی عیب ہوں' مجھے پرواہ نہیں' اے آدم کے بیٹو! اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں اور پھر تم مجھ سے معافی مانگو تو میں معاف کر دوں خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں مجھے پرواہ نہیں۔ اے آدم کے بیٹو! اگر پوری سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھری ہو' پھر تم ہمارے پاس آؤ اس حال میں کہ کسی کو شریک نہ بناتے ہو' تو میں بھی تمہارے پاس پوری زمین بھر مغفرت لے کر آؤں گا [1] کیا انسانوں کے کانوں نے اس رحمت اس محبت اس عفو عام کی بشارت کسی اور قاصد کی زبان سے بھی سنی ہے۔

حضرت ابوایوب ؓ صحابی کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر تم گناہ نہ کرتے تو خدا اور مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی کہ وہ اس کو بخشتا۔'' [2] یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے رحم و کرم کے اظہار کے لئے گنہگاروں ہی کی تلاش ہے کہ نیکوکاروں کو تو سب ڈھونڈتے ہیں' مگر گنہگاروں کو صرف وہی ڈھونڈتا ہے۔

دنیا میں انسانوں کے درمیان جو رحم و کرم اور مہر و محبت کے عناصر پائے جاتے ہیں' جن کی بنا پر دوستوں' عزیزوں' قرابت داروں اور اولادوں میں میل ملاپ اور رسم و محبت ہے اور جس کی بنا پر دنیا میں عشق و محبت کے یہ شان دار مناظر نظر آتے ہیں' تم کو معلوم ہے کہ یہ اس شاہد حقیقی کے سرمایہ محبت کا کون سا حصہ ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کئے ان میں سے ایک حصہ اپنی مخلوقات کو عطا کیا' جس کے اثر سے وہ ایک دوسرے پر باہم رحم کیا کرتے ہیں باقی ننانوے حصے خدا کے پاس ہیں'' [3] اس لطف و کرم اور مہر و محبت کی بشارتیں کس مذہب نے انسانوں کو سنائی ہیں اور کس نے گنہگار انسانوں کے مضطرب قلوب کو اس طرح تسلی دی ہے؟ صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک شخص شراب خوری کے جرم میں بار بار گرفتار ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا' صحابہ نے تنگ آ کر کہا ''خداوند! تو اپنی لعنت اس پر نازل کر کہ یہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے۔'' رحمۃ للعالمین کو لوگوں کی یہ بات ناپسند آئی۔ فرمایا ''اس پر لعنت نہ کرو کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت [4] ہے'' تم نے دیکھا کہ اسلام نے گنہگاروں کے لئے بھی خدا کی محبت کا دروازہ کھول رکھا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے ان عربوں کو جو خدا کی محبت کیا' خدا کی معرفت سے بھی ناآشنا تھے کس طرح آشنائے حقیقت کر دیا اور اس ذات الٰہی کے ساتھ اپنی وابستگی، محبت اور سرشاری کے لطف سے ان کو کس درجہ بہرہ انداز کر دیا۔ بلال ؓ کو دیکھو ٹھیک دوپہر کے وقت عرب کی جلتی ہوئی ریت میں ان کو لٹایا جاتا ہے۔ ایک گرم پتھر ان کے سینہ پر رکھا جاتا ہے اور خدائے واحد سے انحراف کے لئے ان کو مجبور کیا جاتا ہے اور وہ یہ سب تکلیفیں اٹھا رہے ہیں مگر زبان پر صرف

---

[1] جامع ترمذی (ابواب الدعوات) و دیگر کتب احادیث صحیح۔

[2] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۴۱۴۔

[3] بخاری کتاب الادب صفحہ ۸۸۷۔

[4] بخاری کتاب الحدود باب ما یکرہ من لعن شارب الخمر صفحہ ۱۰۰۲۔

احد احد" وہی ایک وہی ایک" کا ترانہ نکلتا ہے[۱] مکہ کا ذرہ ذرہ صدائے حق کا دشمن ہے۔ ابوذر غفاریؓ یہ جان کر بھی صحن مکہ میں جوش وحدت سے سرشار ہو کر کلمۂ توحید کا باآواز بلند اعلان کرتے ہیں، ہر طرف سے پتھر اور ہڈی کی بارش ہوتی ہے۔ بعض لوگ چھڑا دیتے ہیں لیکن جب دوسری صبح نمودار ہوتی ہے تو پھر محبت الٰہی کے کیف و مستی کا وہی عالم نظر آتا ہے اور مشرکین کی طرف سے وہی سزا ملتی ہے۔[۲]

ایک صحابی جورات کو میدان جنگ میں ایک پہاڑ پر پہرہ دینے پر متعین تھے۔ وہ اپنی نیند ٹالنے کے لئے خدا کی یاد کے لئے کھڑے ہوتے ہیں، دشمن پے بہ پے تین دفعہ تیر مارتا ہے جو بدن میں پیوست ہو جاتا ہے، اور وہ بدستور محو نماز ہیں۔ ان کے ساتھی پوچھتے ہیں کہ تم نے نماز کیوں نہیں توڑی، کہتے ہیں کہ "جو سورہ شروع کی تھی جی نہ چاہا کہ اس کو تمام کئے بغیر چھوڑ دوں۔"[۳]

محمد رسول اللہ ﷺ کے دو جانشین عین نماز میں زخم کھا کر گرتے ہیں، مگر مقتدیوں کی صف اس باقی اور حی کے سامنے کھڑی ہو کر ہر فانی و میت ہستی کی محبت سے بے نیاز رہتی ہے۔ اسی لئے خدا نے بشارت دی کہ خدا ان کا محبوب ہے وہ خدا کے محبوب تھے۔ یعنی رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

مدینہ میں ایک اللہ والے مسلمان نے وفات پائی، اس کا جنازہ اٹھا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اس کے ساتھ نرمی کرو کہ اللہ نے بھی اس کے ساتھ نرمی کی ہے" کیونکہ اس کو اللہ اور اس کے رسول سے محبت تھی" قبر کھودی جانے لگی تو فرمایا اس کی قبر کشادہ رکھو کہ خدا نے اس کے ساتھ کشادگی فرمائی ہے۔ اس بار بار کے اہتمام کو دیکھ کر صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! آپ کو اس مرنے والے کی موت کا غم ہے۔ فرمایا کہ ہاں، اس کو خدا اور رسول سے پیار تھا[۴] ایک دفعہ آپ نے ایک صاحب کو کسی جماعت کا افسر بنا کر بھیجا وہ جب نماز پڑھاتے تو ہر نماز میں ہر سورہ کے آخر میں قل ھو اللہ ضرور پڑھتے جب یہ جماعت سفر سے لوٹ کر آئی تو خدمت اقدس میں یہ واقعہ عرض کیا۔ فرمایا "ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں"۔ لوگوں نے پوچھا تو جواب دیا کہ یہ میں اس لئے کرتا ہوں کہ اس سورہ میں رحم والے خدا کی صفت بیان ہے تو مجھ کو اس کے پڑھنے سے محبت ہے۔ فرمایا ان کو بشارت دو کہ وہ رحم والا خدا بھی ان سے محبت کرتا ہے۔[۵] یہ بشارت محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک کے سوا کسی اور نے بھی سنائی ہے؟

صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمت والا میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ یارسول اللہ! قیامت کب آئے گی؟ فرمایا تم نے اس کے لئے کیا سامان کر رکھا

---

[۱] سیرۃ ابن ہشام ذکر عدوان المشرکین واسد الغابہ جلد اصفحہ ۲۰۶، مصر۔

[۲] طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت ابوذر غفاریؓ۔

[۳] صحیح بخاری وسنن ابی داؤد، کتاب الطہارت باب الوضوء من الدم۔

[۴] ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ماجاء فی حفر القبر۔

[۵] مسلم کتاب صلوۃ المسافرین وقصرہا باب فضل قراۃ قل ھو اللہ احد، یہ واقعہ بخاری کتاب الصلوۃ باب الجمع بین السورتین میں دوسری طرح مروی ہے اور اس میں رسول اللہؐ کے الفاظ بھی مروی ہیں۔

ہے۔ نادم ہو کر شکستہ دلی سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! میرے پاس نہ تو نمازوں کا بڑا ذخیرہ ہے نہ روزوں کا اور نہ صدقات و خیرات کا، جو کچھ سرمایہ ہے وہ خدا اور رسول کی محبت کا ہے اور بس۔ فرمایا تو انسان جس سے محبت کرے گا اسی کے ساتھ رہے گا۔ صحابہ نے اس بشارت کو سن کر اس دن بڑی خوشی منائی۔[1]

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا جب خدا کسی بندہ کو چاہتا ہے تو فرشتہ خاص جبریل سے کہتا ہے کہ میں فلاں بندہ کو پیار کرتا ہوں تم بھی اس کو پیار کرو تو جبریل بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور پھر زمین میں اس کو ہر دلعزیزی اور حسن قبول بخشا جاتا ہے۔[2]

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے راوی ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "بندہ اپنی اطاعتوں سے میری قربت کو تلاش کرتا رہتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اس کا وہ کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی وہ آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور وہ پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے[3] یہ دولت یہ نعمت یہ سعادت آستانہ محمدی کے سوا کہیں اور نہیں بٹتی۔

امام بزار نے مسند میں حضرت ابو سعیدؓ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نبی ہیں اور نہ شہید ہیں لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیاء اور شہداء بھی رشک کریں گے یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیار کرتا ہے وہ اچھی باتیں بتاتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔"[4] یہ قابل رشک رتبہ محمد رسول اللہ ﷺ کے سوا اور کس کے ذریعہ عطا ہوا۔

امام مالک نے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ "ان کو پیار کرنا مجھ پر لازم ہے جو آپس میں ایک دوسرے کو میری محبت کے سبب سے پیار کرتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے کے لئے اپنی جان و مال وقف کرتے ہیں"۔[5]

یہ محبت الٰہی کی نیرنگیاں اسلام ہی کے پردہ میں نظر آتی ہیں۔

ترمذی میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا "لوگو! خدا سے محبت کرو کہ وہ تمہیں اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے اور خدا کی محبت کے سبب مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کے سبب میرے اہل بیت سے محبت کرو"[6] یہ عشق و محبت کی دعوت محبوب ازل کے سوا اور کون دے سکتا ہے؟

عام مسلمانوں میں پیغمبر اسلام کا لقب حبیب خدا ہے، دیکھو کہ حبیب و محبوب میں خلت و محبت کے کیا کیا ناز و

---

[1] مسلم کتاب الادب باب المرء مع من احب، بخاری کتاب الادب باب ماجاء فی قول الرجل ویلک۔

[2] مسلم کتاب الادب باب اذا احب اللہ عبدا احبہ لعبادہ۔

[3] بخاری کتاب الرقاق باب التواضع۔

[4] اس کی ہم معنی حدیثیں ترمذی، مالک اور شعب الایمان بیہقی میں بھی ہیں، دیکھو مشکوۃ کتاب الاداب فی حب اللہ، فصل ثانی۔

[5] مشکوۃ باب مذکور۔

[6] مشکوۃ مناقب اہلبیت بروایت ترمذی۔

نیاز ہیں۔ آپ خشوع وخضوع کی دعاؤں میں اور خلوت وتنہائی کی روحانی ملاقاتوں میں کیا ڈھونڈھتے اور کیا مانگتے تھے؟ کیا چاہتے اور کیا سوال کرتے تھے؟ امام احمد اور بزار نے اپنی اپنی مسندوں میں' ترمذی نے جامع میں' حاکم نے مستدرک میں اور طبرانی نے معجم میں متعدد صحابیوں سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی دعاؤں میں محبت الٰہی کی دولت مانگا کرتے تھے۔ انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جان ہے۔ لیکن محبوب خدا کی نگاہ میں یہ چیزیں ہیچ تھیں۔ دعا فرماتے تھے، خداوندا

﴿ اسئل حبك و حب من يحبك و حب عمل يقرب الى حبك ﴾ (احمد، ترمذی، حاکم)

میں تیری محبت مانگتا ہوں اور جو تجھ سے محبت کرتا ہے اس کی محبت اور اس کام کی محبت جو تیری محبت سے قریب کردے۔

﴿ اللّٰهم اجعل حبك احب الى من نفسى و اهلى و من الماء البارد ﴾ (ترمذی وحاکم)

الٰہی تو اپنی محبت کو میری جان سے' اہل وعیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بنا۔

عرب میں ٹھنڈا پانی دنیا کی تمام دولتوں اور نعمتوں سے زیادہ گراں اور قیمتی ہے۔ لیکن حضور کی پیاس اس مادی پانی کی خنکی سے نہیں سیر ہوتی تھی۔ وہ صرف محبت الٰہی کا زلال خالص تھا جو اس تشنگی کو تسکین دے سکتا تھا۔ عام انسان روٹی سے جیتے ہیں مگر ایک عاشق الٰہی (مسیحؑ) کا قول ہے کہ ''انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا'' پھر وہ کون سی روٹی ہے جس کو کھا کر انسان پھر کبھی بھوکا نہیں ہوتا، حضورؐ دعا فرماتے ہیں:

﴿ اللّٰهم ارزقنى حبك و حب من ينفعنى فى حبك ﴾ (ترمذی)

خداوند! تو اپنی محبت اور اس کی محبت جو تیری محبت کی راہ میں نافع ہے مجھے روزی عطا کر

عام ایمان خدا اور رسول پر یقین کرنا ہے مگر جانتے ہو کہ اس راہ کی آخری منزل کیا ہے' صحیحین میں ہے۔

﴿ ما كان الله و رسوله احب اليه مما سواهما ﴾ [1]

یہ کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے تمام ماسوا کی محبتیں ہیچ ہوجائیں۔

بعض مذاہب کو اپنی اس تعلیم پر ناز ہے کہ وہ انسانوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ اپنے خدا کو ماں باپ سمجھیں اور اس سے اسی طرح محبت کریں جس طرح وہ اپنے والدین سے کرتے ہیں اور چونکہ اسلام نے اس طریقہ تعبیر کو اس بنا پر کہ وہ شرک کا راستہ ہے ممنوع قرار دیا ہے اس لئے ان مذاہب کے بہت سے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم محبت الٰہی کے مقدس جذبات سے محروم ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کہ یہ دعویٰ سرتاپا بے بنیاد ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تعلیم محمدی کی بلندی نظر اور محبت کا علوئے معیار ان مذاہب کے پیش کردہ نظر و معیار سے بہت بالاتر ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت پاک بھی اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کی جاچکی ہے۔

﴿ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ﴾ (بقرہ-۲۵)

تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بہت زیادہ یاد کرو۔

لیکن احادیث سے ہمارا یہ دعویٰ اور بھی زیادہ واضح ہوجاتا ہے' لڑائی کا میدان ہے' دشمنوں میں بھاگ دوڑ مچی

---

[1] مسلم کتاب الایمان باب بیان خصال من اتصف بھن وجدہ حلاوۃ الایمان' بخاری الایمان باب حلاوۃ الایمان۔

ہے‘ جس کو جہاں امن کا گوشہ نظر آتا ہے اپنی جان بچا رہا ہے۔ بھائی بھائی سے، ماں بچہ سے، بچہ ماں سے الگ ہے۔ اسی حال میں ایک عورت آتی ہے جس کا بچہ میدان جنگ میں گم ہو گیا ہے۔ محبت کی دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ جو بچہ بھی اس کے سامنے آ جاتا ہے اپنے بچہ کے جوش محبت میں اس کو چھاتی سے لگا لیتی ہے، اور اس کو دودھ پلا دیتی ہے۔ دفعۃً رحمۃ للعالمین کی نظر پڑتی ہے۔ صحابہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں ”کیا یہ ممکن ہے یہ عورت خود اپنے بچہ کو اپنے ہاتھ سے دہکتی آگ میں ڈال دے“ لوگوں نے عرض کی ”ہرگز نہیں“ فرمایا ”تو جتنی محبت ماں کو اپنے بچہ سے ہے خدا کو اپنے بندوں سے اس سے کہیں زیادہ محبت ہے“ [1]

ایک دفعہ ایک غزوہ سے آپ واپس تشریف لا رہے ہیں۔ ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لے کر سامنے آتی ہے اور عرض کرتی ہے یا رسول اللہ! ایک ماں کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہوتی ہے، کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے؟ فرمایا، ہاں بے شک اس سے زیادہ ہے‘ بولی ”تو کوئی ماں تو اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارا نہ کرے گی“۔ یہ سن کر فرط اثر سے آپ پر گریہ طاری ہو گیا‘ پھر سر اٹھا کر فرمایا‘ خدا صرف اس بندہ کو عذاب دیتا ہے جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے۔ [2]

آپ ایک مجلس میں تشریف فرما ہیں‘ ایک صحابی چادر میں ایک پرند کو مع اس کے بچوں کے باندھ کر لاتے ہیں اور واقعہ عرض کرتے ہیں کہ ”یا رسول اللہ میں نے ایک جھاڑی سے ان بچوں کو اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا‘ ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی‘ میں نے ذرا کپڑے کو کھول دیا تو وہ فوراً آ کر میرے ہاتھ پر بچوں پر گر پڑی‘ ارشاد ہوا ”کیا بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے‘ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا‘ جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے‘ خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے“۔ [3]

ایک صاحب ایک چھوٹے بچہ کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوتے ہیں‘ محبت کا یہ حال تھا کہ وہ بار بار اس کو گلے سے لگائے جاتے تھے‘ آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا تم کو اس بچہ سے محبت ہے، انہوں نے کہا ہاں‘ فرمایا ”تو اللہ کو تم سے اس سے زیادہ محبت ہے‘ جتنی تم کو اس بچہ سے ہے‘ وہ سب رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے“۔ [4]

جمال حقیقت کا پہلا مشتاق اور مستور ازل کے زیر نقاب چہرہ کا پہلا بند کشا‘ زندگی کے آخری مرحلوں میں ہے‘ مرض کی شدت ہے‘ بدن بخار سے جل رہا ہے‘ اٹھ کر چل نہیں سکتا‘ لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلان خاص کی طاقت پاتا ہے‘ مسجد نبوی میں جان نثار حاضر ہوتے ہیں‘ سب کی نظریں حضور کی طرف لگی ہیں‘ نبوت کے آخری پیغام کے سننے کی آرزو ہے‘ دفعۃً لب مبارک ہلتے ہیں تو یہ آواز آتی ہے ”لوگو! میں خدا کے سامنے اس بات کی برأت کرتا ہوں کہ انسانوں

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب‘ باب رحمۃ الولد۔

[2] سنن نسائی‘ باب ما یرجی من الرحمۃ۔

[3] مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد کتاب الاسماء باب رحمۃ اللہ وغضبہ۔

[4] ادب المفرد امام بخاری باب رحمۃ العیال ص ۷۵‘ مصر۔

میں میرا کوئی دوست ہے، مجھ کو خدا نے اپنا پیارا بنایا ہے، جیسے ابراہیم کو اس نے اپنا پیارا بنایا تھا"۔ [۱] یہ تو وفات سے پہلے کا اعلان تھا، عین حالت نزع میں زبان مبارک پر یہ کلمہ تھا "خداوندا! اے بہترین رفیق"۔ [۲]

اللہ تعالیٰ کی کریمی و رحیمی، اس کی بیچارہ نوازی، عاجزوں اور درماندوں کی دستگیری اور اپنے گنہگار بندوں کے ساتھ اس کی شان بخشش کا ترانہ خود محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے کانوں سے سنا اور نادم و متاسف سیہ کاروں تک اس مژدہ کو پہنچا کر ان کے شکستہ اور زخمی دلوں پر مرہم رکھا، حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ حضرت رحمۃ للعالمینؐ نے یہ پیام ربانی ہم کو سنایا۔

"میرے بندو! میں نے اپنے اوپر بھی اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کیا ہے، تو ایک دوسرے پر تم ظلم نہ کیا کرو، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک گمراہ تھا، لیکن جس کو میں نے راہ دکھائی، تو مجھ سے راستہ پوچھو میں بتاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک بھوکا تھا، لیکن جس کو میں نے کھلایا، تو مجھ سے کھانا مانگو میں تم کو کھلاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک پیاسا تھا، لیکن جس کو میں نے پلایا، تو مجھ سے پانی مانگو میں تم کو پلاؤں گا۔ اے میرے بندو! تم میں ہر ایک ننگا تھا، لیکن جس کو میں نے پہنایا، تو مجھ سے کپڑا مانگو میں تم کو پہناؤں گا، اے میرے بندو! تم دن رات گناہ کرتے ہو، اور میں سب گناہوں کو معاف کرتا ہوں، تم مجھ سے معافی مانگو، میں تم کو معاف کروں گا، اے میرے بندو! مجھے نقصان پہنچانا تمہاری طاقت میں نہیں، اور نہ مجھے نفع پہنچانا تمہاری قدرت میں ہے، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے، جن اور انس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت، دنیا کے سب سے بڑے پرہیزگار کے دل کے برابر ہو جائیں تو میری شہنشاہی میں ایک ذرہ اضافہ نہ ہوگا۔ اور اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے، جن و انس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت سب دنیا کے سب سے بڑے گنہگار کے برابر ہو جائیں، تو بھی میری شہنشاہی میں ایک ذرہ برابر کمی نہ ہوگی، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے اور جن و انس، سب کسی ایک زمین میں کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں سب کے سوال کو پورا کروں، تو میرے خزانہ میں کچھ کمی نہ ہوگی، لیکن اتنی جتنی ایک سوئی سمندر کے پانی میں ڈال کر نکالی جائے، اے میرے بندو! تمہارے ہی عمل ہوں گے جن کو میں گن گن کر تم کو واپس کروں گا اور پورا کروں گا، تو جس کو بھلائی ملے وہ خدا کا شکر ادا کرے، اور جس کو برائی ملے وہ خود اپنے ہی کو ملامت کرے۔" [۳]

یہ محبت کا نغمہ ازل دنیا نے محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی زبان مبارک سے سنا، یہ تسلی و تشفی کا پیام آپ ہی کے مبارک لبوں سے ادا ہوا، یہ عفو و کرم کے بحر بیکراں کا یہ ساحل امید آپ ہی کے دکھانے سے ہم کو نظر آیا، اور گنہگاروں کو "میرے بندو" کہہ کر پکارے جانے کی عزت آپ کے وسیلہ سے ملی، ﷺ۔

---

[۱] صحیح مسلم کتاب المساجد۔

[۲] صحیح بخاری، ذکر وفات نبوی۔

[۳] مسلم و ترمذی کتاب الزہد و مسند احمد بن حنبل جلد ۵، صفحہ ۱۶۰ و صفحہ ۱۷۷، و ادب المفرد امام بخاری، باب الظلم ص ۹۵، مصر، میں نے صحیح مسلم کی بروایت سامنے رکھی ہے، لیکن بعض الفاظ مسند سے لے کر بڑھا دیئے ہیں، اس کے بعض بعض ٹکڑے انجیل میں بھی ملتے ہیں (دیکھو متی ۲۵۔۴۵) مگر دونوں کے ملانے سے ناقص و کامل کا فرق نمایاں ہوتا ہے جو ناقص اور کامل میں ہونا چاہئے۔

فرشتوں پر ایمان

وَمَلٰٓئِكَتِهٖ

ملائکہ کا لفظ جمع ہے‘ اس کا واحد ملک ملاک اور مالک تین طرح سے مستعمل ہے اس کے لغوی معنی قاصد اور رسول کے ہیں اسی لئے قرآن پاک میں ملائکہ کے لئے رسل کا لفظ بھی آیا ہے جس کے معنی قاصد اور پیام رساں کے ہیں‘ ان سے مراد وہ غیر مادی مگر مخلوق نیک ہستیاں یا ارواح ہیں‘ جو اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق عالم اور اس کے اسباب وعلل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں‘ اگر یہ عالم ایک مشین ہے تو ملائکہ اس کے انجن اور اس کے کل پرزوں کو حرکت دینے والی قوتیں ہیں جو خدا کے مقررہ احکام اور قوانین کے مطابق ان کو حرکت دے رہے ہیں‘ اور چلا رہے ہیں۔ یعنی وہ خالق اور اس کے مخلوقات کے درمیان اس حیثیت سے پیام رسانی اور سفارت کی خدمت انجام دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القاء کرتا ہے‘ اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اس کو مخلوقات میں جاری اور نافذ کرتے ہیں ان کو خود نہ کوئی ذاتی اختیار ہے اور نہ ان کا کوئی ذاتی ارادہ ہے۔ وہ سرتاپا اطاعت ہیں اور خدا کے حکم سے ایک سرمو تجاوز نہیں کرتے‘ گویا ان کی خلقت ہی صرف اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے کی گئی ہے‘ دنیا پر رحمت یا عتاب جو کچھ نازل ہوتا ہے‘ وہ انہیں کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور خدا انبیاء پر اپنے جو احکام اتارتا ہے‘ یا ان سے ہم کلام ہوتا ہے‘ وہ انہیں کی وساطت سے کرتا ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب‘ بلکہ قدیم یونانی مصری فلسفہ میں بھی اس قسم کی ہستیوں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے‘ صابی مذہب میں یہ ستاروں اور سیاروں کی صورت میں مانے گئے ہیں یونانی‘ مصری (سکندری) فلسفہ میں ان کا نام ”عقول عشرہ“ (دس عقلیں) رکھا گیا ہے‘ اور ساتھ ہی نو آسمانوں میں بھی الگ الگ ذی ارادہ نفوس تسلیم کئے گئے ہیں‘ بلکہ خالص یونانی فلسفہ میں بھی بعض غیر مادی ارواح مجردہ کا پتہ لگتا ہے‘ جن میں سب سے اہم لوگس کا تخیل ہے‘ جس سے مقصود وہ اولین ہستی ہے جس کو خدا نے تمام کائنات کی خلق کا ذریعہ اور واسطہ قرار دیا ہے‘ اور جس کو اہل فلسفہ عقل اول سے تعبیر کرتے ہیں‘ پارسیوں میں ان ہستیوں کا نام ”امشاسپند“ ہے‘ اور ان کی بے شمار تعداد قرار دی گئی ہے‘ یہودی ان کو ”وبیم“ کہتے ہیں‘ اور ان میں سے خاص خاص کے نام جبریل اور میکائیل وغیرہ رکھے ہیں‘ عیسائی بھی ان کو انہیں ناموں سے یاد کرتے ہیں‘ اور جبریل وروح القدس وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں‘ ہندوؤں میں وہ دیوتاؤں اور دیویوں کے نام سے روشناس ہیں‘ جاہل عرب ان کو خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے تھے‘ بہر حال یہ تمام مختلف صحیح اور غلط نام اور تعبیریں ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں‘ اور وہ جس سے مراد وہ روحانی وسائط ہیں جو صانع ومصنوعات اور خالق ومخلوقات کے درمیان اس کے حکم سے عمل پیرا اور کارفرما ہیں۔

مذاہب سابقہ میں ان غیر مادی ذی روح مخلوق ہستیوں کی حیثیت نہایت مشتبہ تھی‘ وہ کبھی مخلوق کہی جاتی تھیں‘ اور کبھی وہ خدائی کے مرتبہ تک بھی بلند کر دی جاتی تھیں‘ ہندوؤں کے دیوتاؤں اور دیویوں کی یہی صورت تھی‘ پارسیوں میں امشاسپند کا بھی یہی حال تھا کہ کبھی ان کی حیثیت فرشتوں کی تھی‘ کبھی وہ خدا کے مقابل بن جاتی تھیں‘ اور کبھی خدا امشاسپندوں میں سے ایک ہو جاتا تھا‘ ہندوؤں کی طرح پارسیوں میں بھی وہ قابل پرستش سمجھی جاتی تھیں‘ ان کے نزدیک

سب سے عالی رتبہ امشاسپند تھے‘ اور ان کے تحت میں ۳۳‘ پھر ان میں سے ہر ایک کے ماتحت ہزاروں تھے‘ اور چونکہ وہ نیکی اور بدی کے دو متقابل خداؤں کے قائل تھے‘ اس لئے دونوں کے ماتحت اچھے اور برے فرشتوں کی بے شمار تعداد تھی‘ نیکی کے فرشتے براہ راست نیکی کی چیزوں کو اور برائی کے فرشتے مصیبتوں‘ ہلاکتوں اور بدیوں کو دنیا میں پیدا کرتے تھے‘ اور اپنے اپنے خدا کی طرف سے وہ ان اشیاء پر حاکم سمجھے جاتے تھے‘ اور دونوں خدا اپنی اپنی فوجوں اور لشکروں کے پروں کو لے کر باہم نبرد آزما رہتے تھے‘ یہ بھی ان کا اعتقاد تھا کہ ہر امشاسپند یا نر فرشتہ کے ساتھ ایک یزد یعنی مادہ فرشتہ بھی ہوتی تھی‘ جو اس کی بیوی ہوتی تھی‘ ہندوؤں میں نر دیوتاؤں اور مادہ دیویوں کا تصور تھا‘ مگر ان نر و مادہ ہستیوں میں کسی نر کو کسی مادہ سے خصوصیت خاص نہ تھی‘ بلکہ ہر ایک جنس کا ہر فرد دوسری جنس کے ہر فرد سے لطف اندوز ہو سکتا تھا‘ یہودیوں میں ان فرشتوں کی حیثیت ایسی تھی کہ ان کی بلندی و ثنا و صفت خدا سے مشتبہ ہو جاتی تھی‘ نظر آنے والے فرشتہ کی تعظیم کی جاتی تھی‘ اس کے آگے جھکا جاتا تھا‘ اور اس کو خداوند کہہ کر اس طرح خطاب کیا جاتا تھا کہ کہیں کہیں یہ مشتبہ ہو جاتا ہے کہ یہ خدا کا بیان ہے یا فرشتہ کا (تکوین ۱۶۔۱۳ و ۱۸۔۲۔۳۔۲۲) وہ کبھی کبھی خدا کے بیٹے بھی کہے جاتے تھے (تکوین ۶۔۲) عیسائیوں میں ان میں سے بعض مثلاً روح القدس خدا کا ایک جزو تسلیم ہو کر تثلیث کا رکن ہے۔

صائبیوں میں ان فرشتوں کی قربانی کی جاتی تھی‘ ان کے ہیکل بنائے جاتے تھے‘ ان کو مظہر خدا تسلیم کیا جاتا تھا‘ عربوں میں فرشتے مادہ سمجھے جاتے تھے‘ وہ خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارے جاتے تھے اور ان کی پرستش ہوتی تھی‘ اور سمجھا جاتا تھا کہ وہ خدا کے دربار میں سفارشی ہونگے‘ یونانیوں میں عقل اول اور عقول عشرہ تمام عالم کے خالق و کارفرما و مرجع کل مانے گئے اور خدا کو معطل ٹھہرایا گیا۔

اسلام نے آ کر ان تمام عقائد کو مٹا دیا‘ خدائی اور ربوبیت کی ہر صفت سے وہ محروم بنائے گئے‘ ان کی پرستش و عبادت قطعاً ناجائز کی گئی‘ نر و مادہ کی مادی جنسیت سے پاک کئے گئے‘ اور انسانوں کو ان پاک مخلوقات کی غلامی و بندگی سے آزاد کیا گیا‘ ان کی تعداد و شمار و درجات بندی کا کوئی تخیل باقی نہیں رکھا گیا‘ ان کی ہستی خدائے تعالیٰ کے سامنے ایک سراپا مطیع و فرمانبردار غلام کی قرار دی گئی جس کا شب و روز کام صرف آقا کا حکم بجا لانا ہے‘ عالم میں ان کا کسی قسم کا تصرف نہیں مانا گیا‘ اور نہ نیکی و بدی کی دو تقسیمیں کی گئیں‘ نہ وہ الگ الگ جنس مخلوقات کے حاکم و منتظم قرار دیئے گئے‘ قرآن میں ان کی ہستی صرف اس حیثیت سے تسلیم کی گئی کہ یہ غیر مادی ذی روح مخلوقات ہیں‘ جن کا کام خدا کی حمد و ثنا‘ اطاعت و فرمانبرداری ہے‘ اور خالق اور اس کی مخلوقات کے درمیان وہ پیغام رسانی کا ذریعہ ہیں‘ اور اس کے حکم کے مطابق وہ اس کی مخلوقات کے کارخانہ کو چلا رہے ہیں‘ لیکن اس چلانے میں خود ان کی ذاتی مرضی اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے‘ اسی لئے قرآن پاک نے ان کا خطاب یہودیوں کی طرح ’’خداوند‘‘ نہیں مقرر کیا‘ نہ پارسیوں کی طرح ان کو ’’قابل پرستش‘‘ کے لقب سے ملقب کیا‘ نہ ہندوؤں کی طرح دیو اور دیوتا اور دیوی کہا‘ بلکہ صرف ’’ملک‘‘ اور ’’رسول‘‘ کے الفاظ استعمال کیے جن کے لفظی معنی فرستادہ‘ قاصد‘ پیغام رساں اور ایلچی کے ہیں‘ بلکہ قرآن نے آغاز خلقت انسانی کے قصہ میں یہ حقیقت واضح کر دی کہ ملائکہ اس لائق نہیں ہیں کہ آدم ان کو سجدہ کرے‘ بلکہ آدم میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ملائکہ کا مسجود بنے‘ اور وہ مرتبہ علم میں ان سے فوق ٹھہرایا گیا‘ خدا کی جس تسبیح و تقدیس کا ان کو دعوی تھا‘ اس کے باوجود جب انسان کا جوہر حقیقت انہوں نے پہچانا تو یہ

تسلیم کرنا پڑا کہ

﴿ سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ﴾ (بقرہ۔۳۲)

تو پاک ہے ہم کو کوئی علم نہیں، لیکن وہ جو تو نے ہم کو سکھایا، بے شک تو جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اس قصہ نے شروع ہی میں یہ واضح کر دیا کہ وہ ہستیاں جن کو دوسرے مذاہب نے انسانوں کا دیوتا، انسانوں کا خداوند اور کبھی خدا کا ہمسر اور متصرف مطلق قرار دیا تھا، اسلام میں ان کی حیثیت انسان کے مقابلہ میں کیا ہے؟ انسان اور فرشتے خدا کے سامنے برابر کے مخلوق اور بندے اور یکساں عاجز و درماندہ ہیں، انسانوں کو مادی اشیاء پر حکومت خاص بخشی گئی، کہ اپنے نفع و نقصان کے لئے ان سے کام لے سکیں، اور ملائکہ کو اپنے حضور میں متعین فرمایا کہ وہ آسمان و زمین اور پوری مملکت الٰہی میں اس کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کریں۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اسباب و علل کا ایک سلسلہ پیدا کیا ہے جو ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے لوگ انہیں ظاہری اسباب و علل کو دیکھ کر دھوکا کھاتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں، مثلاً آگ جلاتی اور روشن کرتی ہے، اس کو دیکھ کر آتش پرست اور مادہ پرست یقین کرتے ہیں کہ خود اس آگ میں جلانے کی طاقت ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ آتش پرست اس کے آگے سجدہ میں گر پڑتے ہیں، مادہ پرست گو اپنا سر اس کے آگے نہیں جھکاتے مگر ان کا دل جھک جاتا ہے اور یہ ایمان رکھتے ہیں کہ یہ طاقت خود اسی آگ کے اندر ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ جلانے کی طاقت آگ میں نہیں بلکہ اس کا ایک مستقل دیوتا یا فرشتہ ہے جو اس پر حکمران ہے، اور وہ اس آگ کے فرمانروا کے سامنے جھک جاتے ہیں، اسلام کے نظریہ توحید نے اس شرک کو بھی مٹایا، اور بتایا کہ آگ اور آگ کا اگر کوئی فرشتہ ہے تو وہ کل کے کل اسی ایک رب العالمین اور فرمانروائے ارض و سما کے حکم کے تابع ہیں، اسی کے آگے جھکنا چاہئے اور اسی کی بندگی کرنی چاہئے۔

اسلام میں فرشتوں کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب ان نصوص سے مل سکتا ہے، جو ان کے کاموں کے متعلق قرآن میں مذکور ہیں، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے مراد وہ غیر مادی ذی روح ہستیاں ہیں جو احکام اور پیغام الٰہی کو دنیائے خلق تک پہنچاتے اور نافذ کرتے ہیں اور ان اسباب و علل کو جن کو مادہ پرست ذاتی طور پر موثر جانتے ہیں، اور جن کو بت پرستؔ دیوتاؤں کا کرشمہ سمجھتے ہیں، ان کو فرشتے احکام الٰہی کے مطابق کام میں لگاتے ہیں، اور مرضی الٰہی کو پورا کرتے ہیں۔

عقلی حیثیت سے یہ عقیدہ بھی اسی طرح قبول اور انکار کے قابل ہے، جس طرح عقلیات کے دوسرے عقائد اور نظریئے ہیں، جن کی تصدیق یا تکذیب عقل کی دسترس سے باہر ہے، اس لئے اس عقیدہ کو یہ کہہ کر کوئی رد کرنے کی جرات نہیں کر سکتا کہ یہ خلاف عقل ہے، بلکہ جس طرح قیاسات اور عقلی نکتہ پردازی سے دوسرے عقلی مباحث کا فیصلہ کیا جاتا ہے، وہی یہاں بھی کارگر ہے، اشیاء میں خصائص اور لوازم کے وجود اور ان کے اسباب و علل کا مسئلہ عقلاء میں ہمیشہ اختلافات کا دنگل رہا ہے، اور یہ معمہ آج بھی اسی طرح لاینحل ہے، جس طرح پہلے دن تھا، اس کا حل سائنس کی مادی تحقیقات اور تجربوں کی طاقت سے باہر ہے، اور فلسفہ بھی اس کی گتھی کے سلجھانے سے عاجز ہے، اس لئے اگر حکمائے ملحدین کی شاہراہ سے الگ ہٹ کر اس کے حل کی کوئی صورت ارباب مذاہب نے نکالی ہے تو وہ محل اعتراض نہیں ہو سکتی اور نہ وہ خلاف عقل کہی جا سکتی ہے، کائنات کے حوادث میں جس طرح مادی علل و اسباب کارفرما ہیں، اسی طرح ان سے بالاتر روحانی علل و اسباب بھی

ساتھ ساتھ کارفرما ہیں، ان دونوں قسم کے توافق سے حوادث کا وجود ہوتا ہے، یہی سبب ہے کہ انسان اکثر مادی علل واسباب موجود ہونے یا نہ ہونے کے باوجود اسباب کے کامیاب یا ناکام ہوتا ہے، اور اس کا نام ”بخت واتفاق“ رکھتا ہے، حالانکہ مسئلہ علل واسباب کو ماننے کے بعد بخت واتفاق کوئی چیز نہیں، ان روحانی علل واسباب کا سررشتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے ان فرشتوں کو سپرد کیا ہے، جو فرمانبردار چاکروں کی حیثیت سے اس نظامِ عالم کو چلا رہے ہیں، ہمارے اور دوسرے متکلمین اور حکماء کے درمیان فرق یہ ہے کہ وہ ملائکہ کی تعبیر اسباب وعلل کے ”قوائے طبعی“ سے کرتے ہیں، اور ہم ”قوائے روحانی“ سے۔

اس تقریر کا یہ منشا نہیں ہے کہ اشیاء میں خواص اور طبائع اور اس مادہ کی ملکیت میں مقررہ طبعی اصول وقوانین موجود نہیں ہے اور نہ یہ منشا ہے کہ خود اشیا اور مادہ کے ذرات کے اندر کوئی خواص وطبائع اور مادہ کے اجزائے عنصری کے اندر بالطبع کوئی اصول ودیعت نہیں، بلکہ یہ مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی اندازہ (تقدیر) کے مطابق ہر چیز کے خصائص وطبائع اور اصول وقانون مقرر کر کے ملائکہ کو حکم دیا ہے کہ وہ ان کو انہیں اصول وطبائع مقررہ کے مطابق چلاتے رہیں۔

سمجھنے کے لئے اس کی صحیح مثال خود انسان بلکہ ہر جاندار ہستی ہے، مخلوقات کی دو قسمیں ہیں، ذی روح اور غیر ذی روح، ذی روح مخلوقات کے اکثر افعال وحرکات اس کی روح کی ارادی قوت کی وساطت سے انجام پاتے ہیں، وہی روح اس کے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضاء بلکہ ہر عضو کے ایک ایک رگ وریشہ پر حکمران اور مسلط ہے، بایں ہمہ وہ روح اصول مقررہ کے تحت ہی ان اعضاء سے کام لیتی ہے، اور ان اصول سے باہر نہیں جاتی، اسی طرح غیر ذی روح اشیاء پر ابر وباد سے لے کر دریا پہاڑ سورج اور چاند تک پر بھی ارواح مقرر ہیں، جو ان اشیاء سے خدا کے اصول مقررہ کے اندر یکساں افعال وحرکات کا صدور کراتی ہیں، جس طرح ہماری روح اپنے اعضاء اور اعضاء کے ذریعہ سے مادہ میں جو تغیرات پیدا کرتی ہے، وہ اشیاء کے مقررہ خواص وطبائع ہی کے سہارے کرتی ہے، اسی طرح ملائکہ بھی انہیں مقررہ خواص وطبائع کے ذریعہ ہی اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتے ہیں۔

الغرض جس طرح ہمارے ارادی افعال اور حکم الٰہی کے درمیان ہماری انسانی ارواح ونفوس واسطہ ہیں، اسی طرح تمام عالم مخلوقات اور کائنات کے افعال اور حکم الٰہی کے درمیان یہ ملکوتی ارواح اور نفوس مجردہ واسطہ ہیں، اور جس طرح ہماری انسانی ارواح کی اس وساطت سے خدا کی حکومت علی الاطلاق پر کوئی اعتراض نہیں واقع ہوتا، اسی طرح ان ملکوتی رواح کی وساطت سے بھی خدا کی علی الاطلاق حکومت میں کوئی نقص نہیں واقع ہوتا، یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے ارادی افعال میں اختلافات کی اتنی نیرنگیاں نظر آتی ہیں، مگر ہمارے اور عالم کائنات کے تمام نوعی افعال میں اختلافات اور نیرنگیوں کے بجائے یکسانی، ہم رنگی اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے، کیونکہ انسان نے ارادہ پا کر کسی قدر ذاتی اختیار پا لیا ہے، اور یہی ذاتی اختیار اس کے افعال اختیاری کی ذمہ داری، باز پرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے، اور جس کی بنا پر وہ اپنی اطاعت کے ذریعہ سے ثواب اور عصیان کر کے عتاب کا مستحق ہو جاتا ہے، مگر دنیا کی یہ ملکوتی ارواح مجردہ یعنی یہ ملائکہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے تمام تر محروم ہو کر صرف اطاعت، فرمانبرداری اور انقیاد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، اس لئے ان میں عصیان، تمرد، سرکشی اور حکم الٰہی سے انحراف کی کوئی صلاحیت نہیں ہے، اسی بنا پر اشیاء کے افعال وحرکات وخصائص میں

یکسانی، ہم رنگی اور عدم اختلاف پایا جاتا ہے، اور یہی فطرت، طبیعت اور نوعی خاصیت کی اصطلاحات کی صورت میں ہمارے لئے دھوکے اور اشتباہ کا باعث بن جاتا ہے۔

۱۔ اب ہم کو تعلیماتِ نبوی یعنی آیات واحادیث سے ملائکہ کی حقیقت کو روشن کرنا چاہئے، ملائکہ کی سفارت و پیام رسانی، یعنی خالق کے احکام اور مرضی کو مخلوقات تک پہنچانا اور ان میں ان کا بے اختیار ہونا، ان دو آیتوں سے ثابت ہوتا ہے

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾ (الحج۔۷۵۔۷۶)

خدا ہی ہے جو فرشتوں اور آدمیوں میں سے پیام رساں اور قاصد منتخب کرتا ہے، بے شک خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے، اور ان کے آگے اور پیچھے کا حال جانتا ہے، اور تمام کاموں کا مرجع خدا ہی ہے۔

یعنی پیام رسانی اور سفارت کے سوا ان کو اصل حکم میں کوئی دخل نہیں، اختیارات سب خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہی تمام امور وانتظامات کا مرجع کل ہے، دوسری جگہ ہے۔

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِىْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ؕ يَزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْ بَعْدِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ (فاطر۔۱۔۲)

حمد ہو اس خدا کی جو آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، اور فرشتوں کو دو دو تین تین اور چار چار شہپر بازوؤں والے پیام رساں بنانے والا ہے، وہ پیدائش میں جو چاہے بڑھا دے، وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ لوگوں کے لئے رحمت کھولے تو کوئی اس کا روکنے والا نہیں، اور جو روک دے تو اس کے سوا کوئی چھوڑنے والا نہیں، اور وہ غالب و دانا ہے۔

اس آیت پاک میں بھی یہی حقیقت ظاہر کی گئی ہے کہ یہ ملائکہ سفارت اور درمیانگی کے علاوہ اور کوئی اختیار نہیں رکھتے، رحمت کے دروازوں کا کھولنے والا اور بند کرنے والا صرف خدا ہی ہے، یہ تعلیم اس غلط عقیدہ کی تردید میں ہے کہ ان فرشتوں و دنیا کی حکمرانی اور انتظامات میں کوئی ذاتی دخل ہے، یا ان میں الوہیت اور ربوبیت کا کوئی شائبہ بھی ہے، یا وہ پرستش کے قابل بھی ہیں، یا ان کی دہائی بھی پکارنی چاہئے۔

۲۔ ملائکہ خدا کے احکام کو دنیا میں جاری کرتے ہیں، سورہ انفال میں ہے۔

﴿ اِذْ يُوْحِىْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّىْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ (انفال)

یاد کر جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو

﴿ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ ﴾ (قدر)

اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے ہر کام کو لے کر نیچے اترتے ہیں۔

وہ جس طرح احکام لے کر اترتے ہیں، اسی طرح دربار الٰہی تک عروج بھی کرتے ہیں۔

﴿ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ ﴾ (معارج) فرشتے اور روح اس تک چڑھتے ہیں۔

موت کے وقت روح کا قبض کرنا انہی سے متعلق ہے۔

﴿ قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِىْ وُكِّلَ بِكُمْ ﴾ (سجدہ)

کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے، وہ تم پر موت طاری کرے گا۔

﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰۤئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ﴾ (انعام-۹۴)

اور اگر دیکھو تم جب گنہگار موت کے سکرات میں ہوں اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوں کہ نکالو اپنی جانوں کو۔

﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰۤئِكَةُ ﴾ (انفال-۷)

اور اگر دیکھو جب فرشتے کافروں کو موت دے رہے ہوں۔

اس کے ہم معانی اور بھی کئی آیتیں ہیں، ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ حکم الٰہی کے مطابق موت و فنا کی تدبیر علل و اسباب کی انہی روحانی ہستیوں سے متعلق ہے۔

دنیا میں کسی شے کے وجود و انقلاب و فنا کے لئے کسی ایک علت و سبب کا وجود کافی نہیں ہے، بلکہ ضروری ہے کہ اس کے متعلقہ علل و اسباب کی تمام کڑیاں باہم پیوستہ اور ایک دوسرے کی معاون ہوں اور موانع اور عوائق معدوم ہوں، یہ متعلقہ علل و اسباب کا توافق اور موانع کا انسداد تدبیر ہے، یہ تدبیر بحکم الٰہی ان ملائکہ کے سپرد ہے[1] اسی لئے کبھی اس تدبیر کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے، یدبر الامر (وہ کام کی تدبیر کرتا ہے) اور کبھی اس کو ملائکہ کی طرح منسوب کرتا ہے۔

﴿ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۝ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۝ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۝ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ﴾ (نازعات ۵-۱)

ڈوب کر (روحوں کے) کھینچنے والوں کی قسم ہے (رگوں کی) گرہوں کو کھولنے والوں کی قسم ہے (اس فضائے آسمانی میں) تیرنے والوں کی، پھر دوڑ کر (مادی اسباب و علل پر) آگے بڑھ جانے والوں کی، پھر کام کی تدبیر کرنے والوں کی

۳۔ یہی ملائکہ خدا اور رسولوں کے درمیان بھی سفیر ہیں۔

﴿ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِىَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ﴾ (شوریٰ)

یا خدا آدمی سے اس طرح باتیں کرتا ہے، کہ اپنا ایک سفیر بھیجتا ہے، تو وہ اس (خدا) کی اجازت سے جو وہ (خدا) چاہتا ہے، وحی کرتا ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

﴿ يُنَزِّلُ الْمَلٰۤئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ ﴾ (نحل)

خدا روح کے ساتھ فرشتوں کو اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے۔

خاص آنحضرتؐ کے متعلق ہے۔

﴿ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (بقرہ)

---

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق باب ذکر الملائکۃ میں ہے کہ رحم نسوانی پر ایک فرشتہ مقرر ہے، جو بچہ کی نسبت قضائے الٰہی کو تحریر کرتا ہے۔

جبریل فرشتہ نے اس قرآن کو خدا کے حکم سے تمہارے دل پر اتارا

۴۔ یہ لوگوں پر بشارت اور عذاب لے کر بھی اترتے ہیں۔

﴿ وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَا اِبْرَاهِيْمَ بِالْبُشْرٰی ﴾ (ہود)

ہمارے سفیر ابراہیم کے پاس بشارت لے کر اترے۔

اسی طرح حضرت زکریا اور مریم علیہما السلام کو انہوں نے بشارت دی۔

﴿ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا ﴾ (مریم)

میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں کہ تجھے ایک پاک لڑکا بخشوں۔

حضرت لوطؑ کے پاس ان کی قوم کی بربادی کے لئے آئے اور

﴿ قَالُوْ يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ ﴾ (ہود)

انہوں نے کہا، اے لوط، ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔

اس کے بعد یہ فرشتے حضرت لوطؑ کی قوم پر کوہ آتش فشاں کا منہ کھول دیتے ہیں، اور تمام قوم برباد ہو جاتی ہے، یہ کام اگرچہ فرشتوں نے انجام دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ فرشتوں کے اس فعل کو خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے کہ وہ فرشتوں کے ذاتی اختیار کے بجائے خدا ہی کے حکم سے ہوا تھا۔

﴿ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ﴾ (ہود)

جب ہمارا حکم آیا، تو ہم نے اس کے اوپر کو نیچے اور نیچے کو اوپر کر دیا (یعنی زمین الٹ دی) اور اس پر تہ بہ تہ پتھروں کی بارش کی۔

۵۔ فرشتے انسانوں کے اعمال کی نگہبانی اور نگرانی کرتے ہیں، اور ان کے ثواب اور گناہ کے کاموں کو محفوظ رکھتے ہیں۔

﴿ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ○ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ○ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴾ (انفطار)

بے شک تم پر نگہبان ہیں جو بزرگ ہیں، لکھنے والے ہیں، جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس کو جانتے ہیں۔

﴿ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴾ (ق)

کوئی بات منہ سے نہیں نکالتا، لیکن اس کے پاس ایک نگہبان حاضر ہے۔

﴿ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ ○ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ (رعد۔۱۱)

تم میں سے کوئی بات چھپا کر کہے، یا زور سے کہے، یا وہ رات میں چھپے، یا دن کو کرے، خدا کے تعاقب کرنے والے اس کے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے خدا کے حکم سے اس کی نگرانی کرتے ہیں۔

﴿ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴾ (انعام۔۶۱)

اور وہ خدا تم پر نگران بھیجتا ہے، یہاں تک کہ تم میں سے جب کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے قاصد اس کی عمر پوری کرتے ہیں، اور وہ کمی نہیں کرتے۔

۶۔ وہ انسانوں کے اعمال کے مطابق ان پر خدا کی رحمت یا لعنت کے نزول کا ذریعہ اور واسطہ ہیں۔

﴿ لَایَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَرُ وَتَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ ط هٰذَا یَوْمُکُمُ الَّذِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴾ (انبیاء۔۷)

نیکوکاروں کو وہ بڑی گھبراہٹ (قیامت) غمگین نہ کرے گی، اور فرشتے ان کا آگے بڑھ کر استقبال کریں گے، کہ یہی وہ دن ہے، جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ﴾ (فصلت)

جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے یہ کہتے ہوئے اتریں گے کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو، اور اس جنت کی خوشخبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، ہم ہیں جو تمہاری پہلی اور دوسری زندگی میں تمہارے رفیق ہیں۔

﴿ هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُهٗ ﴾ (احزاب)

وہی خدا تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ﴾ (احزاب)

اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔

﴿ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ ﴾ (شوریٰ)

اور جو زمین میں ہیں، ان کے لئے وہ خدا سے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔

اسی طرح وہ بدکاروں پر لعنت بھی کرتے ہیں۔

﴿ اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَیْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴾ (آل عمران۔۸۷)

ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴾ (بقرہ)

جو کفر کی حالت میں مر گئے، ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔

۷۔ جنت اور دوزخ کا کاروبار بھی ملائکہ کے زیر اہتمام ہوگا۔

﴿ وَسِیْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِلٰی جَهَنَّمَ زُمَرًا ط حَتّٰٓی اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ ﴾ (زمر)

اور کفر کرنے والے گروہ در گروہ کر کے دوزخ کی طرف لے جائیں گے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچیں گے، تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے، اور اس کے چوکیدار (فرشتے) کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تمہیں میں سے پیغمبر نہیں آئے۔

﴿ وَسِیْقَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَی الْجَنَّةِ زُمَرًا ط حَتّٰٓی اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِیْنَ ﴾ (زمر)

اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے تھے وہ گروہ در گروہ جنت میں لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے

پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے پاسبان کہیں گے، تم پر سلامتی ہو، خوش خوش جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ۔

﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ (رعد)

جنتیوں پر فرشتے ہر دروازہ سے داخل ہو ہو کر کہیں گے، تم پر سلامتی ہو، یہ تمہارے صبر کا بدلہ ہے، یہ کیسا اچھا عاقبت کا گھر ہے۔

﴿ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ ﴾ (تحریم)

دوزخ پر سخت دل طاقتور فرشتے مقرر ہیں۔

﴿ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ﴾ (مدثر)

ہم نے دوزخ کا اہل کار فرشتوں ہی کو بنایا ہے۔

۸۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ قدس کے حاضر باش ہیں۔

﴿ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ﴾ (زمر)

اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے اردگرد احاطہ کئے ہوئے اپنے پروردگار کی حمد و ثناء میں مصروف ہونگے۔

﴿ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى ﴾ (صافات)

اعلیٰ اہل دربار کی باتیں شیاطین نہیں سن سکتے۔

﴿ مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴾ (ص)

مجھے خدا کے بلند درباریوں کا علم نہیں جب وہ باتیں کرتے ہیں۔

قیامت کے دن بھی یہ تخت الٰہی کے حامل اور اس بارگاہ کے حاضر باش ہونگے، جو ہر وقت اس کے ہر حکم کو بجا لانے کے لئے تیار رہیں گے۔

﴿ وَالْمَلَكُ عَلٰى اَرْجَآئِهَا وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴾ (حاقہ)

اور فرشتے زمین کے کناروں پر کھڑے ہونگے اور تیرے پروردگار کے تخت کو آٹھ (فرشتے) اس دن اپنے اوپر اٹھائے ہوں گے۔

﴿ كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴾ (فجر۔۱)

ہرگز نہیں، جب زمین ریزہ ریزہ کر دی جائے گی، اور تیرا رب تشریف فرما ہوگا، اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے۔

﴿ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ﴾ (نباء۔۳۸)

جس دن روح اور فرشتے صف باندھے کھڑے ہونگے۔

۹۔ فرشتے خدا سے سرکشی اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے، اور ہمیشہ اس کی تہلیل و تقدیس، اور حمد و ثناء میں مصروف رہتے ہیں، اور اس کے جلال و جبروت سے ڈرتے اور کانپتے رہتے ہیں اور خدا کے حضور میں اہل زمین کے لئے عموماً اور نیکوکاروں کے لئے خصوصاً مغفرت کی دعا مانگا کرتے ہیں۔

﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ (شوریٰ۔۵)

اور فرشتے حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، اور زمین والوں کی بخشایش کی دعا مانگا کرتے ہیں، ہشیار کہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا خدا ہی ہے۔

یعنی یہ دھوکا نہ ہو کہ ان کی دعا ہی رحمت و برکت کا ذاتی سبب ہے، بلکہ بخشش اور رحمت کرنے والا صرف وہی خدائے واحد ہے، اور یہ بخشش و رحمت اسی کے دست اختیار میں ہے۔

﴿ اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ﴾ (مومن)

جو (فرشتے) عرش کو اٹھائے ہیں، اور جو اس کے پاس ہیں، وہ سب اپنے پروردگار کی حمد اور تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور ایمان لانے والوں کی بخشایش کی دعا کرتے ہیں۔

﴿ وَلَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا یَسْتَحْسِرُوْنَ ۝ یُسَبِّحُوْنَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ لَا یَفْتُرُوْنَ ﴾ (انبیاء۔۲۰)

آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے، اور جو اس کے پاس ہیں (یعنی فرشتے) وہ اسکے سامنے اپنی عبودیت کے اظہار سے غرور نہیں کرتے، اور نہ اسکی عبادت سے تھکتے ہیں، وہ رات دن خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں، اور سست نہیں پڑتے۔

﴿ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ ۝ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَهُمْ مِّنْ خَشْیَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ﴾ (انبیاء۔۲۸۔۲۶)

بلکہ وہ بزرگ بندے ہیں، جو بات میں اس (خدا) پر پیش دستی نہیں کرتے، اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں .... اور وہ اسکے خوف سے ترساں رہتے ہیں۔

﴿ لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ﴾ (تحریم)

خدا ان کو جس بات کا حکم دیتا ہے، وہ اس میں خدا کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے

﴿ وَیُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِیْفَتِهٖ ﴾ (رعد)

اور بجلی کی کڑک اور فرشتے خدا کے ڈر سے اس کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔

﴿ وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ یَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ﴾ (نحل۔۵۰۔۴۹)

اور آسمانوں میں اور زمین میں جو چارپائے اور فرشتے ہیں، وہ سب خدا کو سجدہ کرتے ہیں، اور اس کے سامنے اپنی بڑائی نہیں کرتے، وہ اپنے مالک سے جو ان کے اوپر ہے ڈرتے رہتے ہیں، اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے

گزر چکا ہے کہ ملائکہ کا اعتقاد دنیا کے تمام مذاہب اور قوموں میں کسی نہ کسی طرح رہا ہے، لیکن ان کے اس اعتقاد میں بہت سی باتیں ایسی داخل تھیں جو توحید کامل کے منافی تھیں، اسکندریہ کے نو افلاطونی فلسفہ کی رو سے عقل اوّل کی اضطراری پیدائش اور وجود کے بعد خدا کو معطل ٹھہرا کر فرشتوں کو عقول کی صورت میں اصلی کارفرما قرار دیا گیا تھا، عراق کے صابی اجرام سماوی کی شکل میں ان کی پرستش کرتے تھے، اور انہیں کو عالم کا فرمانروا جانتے تھے، یہود بھی ان کو کسی قدر

صاحب اختیار تصور کرتے تھے اور ان کو کبھی کبھی خداؤں کا درجہ دے دیتے تھے، جیسا کہ توراۃ (صحیفہ تکوین ۱۶۔۱۳ و ۱۸۔۲ و ۳ و ۲۲) کے قصوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے، ان کو وہ "خدا کے بیٹوں" کے خطاب سے بھی کبھی کبھی یاد کرتے تھے (تکوین ۶۔۲) ہندوؤں میں وہ دیوتا اور دیوی بن کر ایک طرف انسانی خصائص سے ملوث تھے، اور دوسری طرف وہ اپنے ذاتی اختیارات کے لحاظ سے "چھوٹے خداؤں" کے مرتبہ پر بھی فائز تھے، عیسائی ان میں سے بعض مثلاً روح القدس کو خدا کا ایک جز تسلیم کرتے تھے اور یہ تثلیث کا ایک رکن تھا، عربوں میں فرشتے خدا کی بیٹیوں کا درجہ رکھتے تھے، وہ ان کی پوجا کرتے تھے، اور ان کو اپنے گناہوں کا شفیع سمجھتے تھے، تعلیم محمدی نے ان تمام عقائد باطلہ کو مٹا دیا، اور ایک ایک کر کے ان میں سے ہر عقیدہ کی تردید کر دی، اور بتایا کہ فرشتے بھی خدا کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہیں، ان کو خدائی کا کوئی اختیار حاصل نہیں، وہ صرف خدا کی اطاعت اور عبادت اور اسی کے احکام کی بجا آوری میں مصروف رہتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کو جو کام سپرد ہے، وہ اسی کو انجام دیتا ہے، وہ ہماری ہی طرح بندۂ محض ہیں، وہ نہ عبادت کے مستحق ہیں، اور نہ خدا کے بے اذن وہ شفاعت کا ایک حرف زبان سے نکال سکتے ہیں، اور نہ خدا کے سامنے وہ کچھ عرض کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں، یہودی ان کو خدا کے بیٹے اور عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، قرآن نے ان دونوں کی تردید کی، اور بتایا کہ وہ انسانی خصائص اور میلانات سے پاک ہیں، نہ وہ مرد ہیں نہ عورت ہیں، نہ وہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، نہ وہ خدائی کا دعویٰ کر سکتے ہیں، وہ خدا کے خوف سے ہمیشہ کانپتے اور لرزتے رہتے ہیں۔

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِى الظّٰلِمِيْنَ﴾ (انبیاء، ۲۹۔۲۶)

مشرکوں نے کہا کہ مہربان خدا نے اپنا لڑکا بنایا ہے، وہ اس سے پاک ہے، بلکہ یہ (فرشتے) اس کے معزز بندے ہیں، جو بات میں اس پر پیش دستی نہیں کرتے، اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں، خدا اس سے جو ان کے آگے اور پیچھے ہوتا ہے، واقف ہے، وہ شفاعت نہیں کرتے، لیکن اسی کی جس کے لئے خدا پسند کرتا ہے، اور وہ خدا کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں، ان میں سے جو یہ کہے کہ میں خدا ہوں تو اس کو بھی اسی طرح ہم جہنم کی سزا دیں گے ایسی ہی ہم ظالموں کو سزا دیتے ہیں۔

﴿اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۗ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا﴾ (نساء، ۱۷۲۔۱۷۱)

خدا تو ایک ہی ہے وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے کوئی اولاد ہو، آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اس کی ملکیت ہے، اور خدا کافی وکیل ہے، مسیح کو اس سے عار نہ ہوگا کہ وہ خدا کا بندہ ہے، اور نہ مقرب فرشتوں کو اس سے عار ہے، اور جو لوگ اس کی عبادت سے عار اور غرور کریں گے تو ان سب کو وہ اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔

﴿ وَلَا يَأْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ط اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ (آل عمران)

خدا اس کا حکم تم کو نہیں دیتا کہ تم فرشتوں کو اور پیغمبروں کو خدا بناؤ، کیا تم کو مسلمان ہونے کے بعد کفر کرنے کا حکم دے گا۔

﴿ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴾ (سبا۔۴۱۔۴۰)

اور جس دن وہ سب کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ مشرکین تمہیں کو پوجتے تھے، وہ کہیں گے پاک ہے تو، تو ہمارا والی ہے، وہ نہیں ہیں، بلکہ وہ جنوں کو پوجتے تھے، اکثر انہیں جنوں پر ایمان لائے ہیں۔

﴿ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴾ (نباء)

جس دن روح اور فرشتے صف بستہ خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے، تو کچھ نہ بول سکیں گے لیکن وہ جس کو وہ مہربان اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے۔

﴿ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ﴾ (نجم)

آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، لیکن اس کے بعد کہ خدا جس کو اجازت دے اور پسند کرے۔

﴿ اَفَاَصْفٰكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ط اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ○ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ط وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ○ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ○ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ○ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ﴾ (اسرائیل ۴۴، ۴۰)

کیا تمہارے لئے خدا نے بیٹوں کو پسند کیا، اور خود فرشتوں میں سے لڑکیاں اپنے لئے پسند کیں، تم یقیناً بہت بڑی بات منہ سے نکالتے ہو، اور ہم نے قرآن میں پھیر پھیر کر سمجھنے کی باتیں بیان کی ہیں، لیکن یہ ان کی نفرت کو اور بڑھاتا ہے، کہہ دو اے پیغمبر کہ اگر اس ایک خدائے برحق کے ساتھ اور بھی چند خدا ہوتے، تو اس تخت والے خدا کی طرف وہ راستہ ڈھونڈھتے (کہ اس کے ہاتھ سے حکومت چھین کر خود قبضہ کرلیں) یہ مشرک جو کہتے ہیں خدا اس سے بلند و برتر ہے ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے، وہ اس کی تسبیح پڑھتے ہیں۔

﴿ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ط اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ ○ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ط مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ﴾ (زخرف ۲۰۔۱۹)

اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں، عورتیں بنا دیا، کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے، ہم ان کی گواہی لکھیں گے، اور ان سے اس کی بازپرس کی جائے گی، اور انہوں نے کہا کہ اگر خدا چاہتا تو ہم ان فرشتوں کو نہ پوجتے انہیں اس کا تحقیقی علم نہیں، وہ صرف اٹکل لگاتے ہیں۔

قرآن پاک میں اس مفہوم کی اور بہت سی آیتیں ہیں، مگر یہاں استقصاء مقصود نہیں۔

یہودیوں کا خیال تھا کہ فرشتے کھاتے پیتے بھی ہیں، چنانچہ توراۃ میں جہاں حضرت ابراہیمؑ کے پاس فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے، یہ بھی مذکور ہے کہ ابراہیمؑ نے ان کے لئے دعوت کا سامان کیا اور انہوں نے کھایا (تکوین ۱۸، ۸) لیکن قرآن پاک نے اسی قصہ کو دہرا کر یہ تصریح کر دی کہ وہ ان انسانی ضرورتوں سے پاک ہیں، حضرت ابراہیمؑ نے ان کے لئے دعوت کا سامان کیا، مگر

﴿ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيۡدِيَهُمۡ لَا تَصِلُ اِلَيۡهِ نَكِرَهُمۡ وَاَوۡجَسَ مِنۡهُمۡ خِيۡفَةً ؕ قَالُوۡا لَا تَخَفۡ اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰى قَوۡمِ لُوۡطٍ ﴾ (ہود)

جب ابراہیم نے دیکھا کہ وہ کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے، تو اس کو وہ انجان معلوم ہوئے اور دل میں ڈرا، انہوں نے کہا ڈر نہیں، ہم لوط کی قوم کی طرف (ان کے تباہ کرنے کے لئے) بھیجے گئے ہیں۔

کفار قریش کا مطالبہ تھا، کہ انسان کے بجائے کوئی فرشتہ پیغمبر بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا، اس کے جواب میں کہا گیا

﴿ وَلَوۡ جَعَلۡنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلۡنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسۡنَا عَلَيۡهِمۡ مَّا يَلۡبِسُوۡنَ ﴾ (انعام۔۹)

اگر ہم پیغمبر فرشتہ بنا کر بھیجتے تو (آدمیوں کے لئے) اس کو آدمی ہی بناتے، تو جس شبہ میں اب ہم نے ان کو ڈالا ہے اسی میں وہ پھر بھی پڑتے رہتے، (یعنی یہی کہتے کہ تم فرشتہ نہیں ہو بلکہ آدمی ہو)

اس آیت اور دوسری آیتوں میں سے ملکوتیت اور بشریت کی قوتوں کا اختلاف ظاہر ہے، تاہم وہ کبھی کبھی عارضی طور سے انسان کے مثالی لباس میں بھی جلوہ گر ہوتے ہیں، جیسا کہ حضرت مریمؑ وغیرہ کے قصوں میں ہے۔

﴿ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴾ (مریم)

وہ فرشتہ ایک اچھے خاصے بشر کی مثالی صورت میں ظاہر ہوا۔

اور یہی وہ صورت تھی جس میں حضرت ابراہیمؑ کو ان کے انسان ہونے کا دھوکا ہوا، اور ان کے لئے دعوت کا سامان کیا، مگر یہ دھوکا جلد دفع ہو گیا کہ وہ انسان کی مثالی صورت میں فرشتے ہیں۔

ان تمام تفصیلات کے بعد یہ غور کرنا ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانے سے اسلام کا کیا مقصود ہے؟ حقیقت میں اس سے دو باتیں مقصود ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ اسلام سے پہلے بت پرست اقوام اور دوسرے اہل مذاہب میں ان فرشتوں کو خدائی کا جو مرتبہ دیا گیا تھا، اس غلط عقیدہ کو مٹا کر یہ حقیقت ظاہر کی جائے کہ ان کی حیثیت بے اختیار محکوم بندہ کی ہے، جب تک اس کی تصریح نہ ہوئی، کلمۂ توحید کی تکمیل ممکن نہ تھی۔

۲۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ مادہ کے خواص و طبائع کو دیکھ کر مادہ پرست انہیں مادی خواص و طبائع کی بالذات کارفرمائی کا یقین کرتے ہیں، اس کا ازالہ کیا جائے کیونکہ یہی پتھر ان کی ٹھوکر کا باعث ہوتا ہے، اور بالآخر خدا کے انکار تک ان کو لے جاتا ہے، درحقیقت ان مادی خواص و طبائع پر روحانی اسباب مسلط ہیں، جو خدا کے حکم سے اس کے مقررہ اصول کے مطابق نظام عالم اس کو چلا رہے ہیں، مادہ اور اس کے خواص بالذات موثر نہیں، بلکہ کوئی دوسرا ہے جو اپنے ارواح مجردہ کے ذریعہ ان کو موثر بناتا ہے، اس عقیدہ سے مادیت کا بت ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جاتا ہے، غرض منزہ خالق اور مادی مخلوق کے درمیان احکام و شرائع کا نزول اور قدرت الٰہی کے افعال کا صدور ان محکوم ارواح مجردہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔

رسولوں پر ایمان

وَرُسُلِهٖ

یہ عقیدہ اسلام کی ان خصوصیات میں سے ہے جن کی تکمیل صرف اسی کے ذریعہ سے انجام کو پہنچتی ہے آنحضرت ﷺ کے وجود مبارک سے پہلے دنیا کی ہر قوم کو بجائے خود یہ خیال تھا کہ وہی اللہ تعالیٰ کی خاص محبوب اور پیاری ہے تمام دنیا کی قوموں میں ہدایت ربانی کے لئے وہی منتخب کی گئی ہے' اور اس کے علاوہ دنیا کی تمام قومیں اس فیض سے قطعاً محروم ہیں اور رہیں گی اسی کی سرزمین دیوتاؤں اور دیویوں کا مسکن اور اسی کی زبان خدا کی خاص مقدس زبان ہے بابل و نینوا ہو یا مصر و یونان' ایران ہو یا آریہ ورت ہندوستان، ہر ملک اور ہر قوم کے لوگوں کو بجائے خود تنہا خدا کی مقدس اور برگزیدہ مخلوق ہونے کا دعویٰ تھا اور وہ صرف اپنے ہی کو خدا کے پیغام اور خطاب سے مشرف ہونے کی مستحق جانتی تھی لیکن تعلیم محمدی نے تنگ خیالی کے اس محدود دائرہ کو دنیا کی عظیم الشان وسعت میں بدل دیا آپ نے یہ سکھایا کہ دنیا کی تمام قومیں خدا کی نظر میں یکساں ہیں۔ نہ عرب کو عجم پر اور نہ عجم کو عرب پر فضیلت ہے اور نہ کالے کو گورے پر اور نہ گورے کو کالے پر کوئی تقدم حاصل ہے [1] ساری زمین خدا کی ہے اور تمام قومیں ایک خدا کی مخلوق ہیں آپ نے فرمایا ''لوگو! تم سب ایک ہی باپ (آدم) کی اولاد ہو اور وہ مٹی سے پیدا ہوا تھا [2] اسی طرح یہ بھی تعلیم دی کہ انسانوں اور قوموں کا امتیاز رنگ روپ، ملک و مرز بوم اور زبان سے نہیں ہے بلکہ صرف تقویٰ اور نیکوکاری سے ہے۔ [3]

اس تعلیم کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ قوموں اور ملکوں کی فطری فضیلت کی پرانی داستان فراموش ہوگئی' دنیا کی تمام قومیں ایک سطح پر آ گئیں اور مساوات انسانی کا راستہ صاف ہوگیا' بنی اسرائیل جن کو اپنے خدا کا کنبہ ہونے پر ناز تھا وحی محمدی نے ان کی اس حیثیت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا۔

﴿ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ﴾ (مائدہ)

بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے بشر ہو۔

بنی اسرائیل کو دعویٰ تھا کہ نبوت اور پیغمبری صرف ہمارے ہی خاندان کا ورثہ ہے جس طرح اس آریہ ورت کا دعویٰ ہے کہ خدا کی بولی صرف یہیں کے رشیوں اور نبیوں نے سنی اور وہ صرف وید کے اوراق میں محفوظ ہے اسی طرح دوسری قوموں کو بھی اپنی جگہ یہی خیال تھا اسلام نے اس تخصیص کو خدا کے انصاف' عدل و کرم اور اس کی رحمت عام کے منافی قرار دیا اور کہہ دیا۔

﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾ (جمعہ۔۴)

یہ نبوت اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہے دے' اور اللہ بڑی مہربانی والا ہے۔

---

[1] مسند احمد ابن حنبل' از ابو نصر تابعی۔

[2] جامع ترمذی' آخر کتاب المناقب۔

[3] قرآن ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔

﴿ قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَى اللَّهِ أَنْ يُؤْتَىٰ أَحَدٌ مِّثْلَ مَا أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ ط وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴾ (آل عمران ۸۴_۸۳)

کہہ دو کہ ہدایت اللہ کی ہے (اسرائیلی علماء اپنے ہم مذہبوں سے کہتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ) جیسا دین تم کو دیا گیا ہے کسی اور کو دیا جائے یا یہ نئے دین والے تم سے خدا کے آگے جھگڑ سکیں کہہ دو کہ یہ (نبوت کا فضل) اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے اس سے نوازتا ہے اور اللہ کی رحمت سب پر عام ہے اور وہ اپنی مصلحتوں کو اچھی طرح جانتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ مخصوص کرتا ہے، وہ بڑا فضل والا ہے۔

﴿ مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَّشَاءُ ط وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴾ (بقرہ۔۱۰۵)

اہل کتاب میں جو منکر ہیں وہ یہ نہیں پسند کرتے اور نہ مشرکین پسند کرتے ہیں کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو، اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے مخصوص کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

اس نے یہ تعلیم دی کہ روئے زمین کی ہر آبادی، میں ہر قوم میں اور ہر زبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی راہ دکھانے والے، اس کی آواز پہنچانے والے اور انسانوں کو ان کی غفلت سے چونکانے والے پیغمبر یا نائب پیغمبر بن کر آئے اور یہ سلسلہ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک برابر جاری رہا۔

بعثت محمدی سے پہلے دنیا کی کل آبادی مختلف گھرانوں میں بٹی ہوئی اور ایک دوسرے سے ناآشنا تھی ہندوستان کے رشیوں اور نبیوں نے آریہ ورت سے باہر کی دنیا کو خدا کی آواز سننے کا کبھی مستحق نہ سمجھا ان کے نزدیک پرمیشور صرف آریہ ورت کی ہدایت اور رہنمائی کا خواہاں تھا۔ زردشت نے پاک نژادان ایران کے سوا سب کو یزداں کے جلوہ نورانی سے محروم یقین کیا بنی اسرائیل اپنے خانوادہ کے سوا کہیں اور کسی نبی یا رسول کی بعثت کا تصور بھی نہیں کرتے تھے عیسائی صرف اپنے کو خدا کی فرزندی کا مستحق سمجھتے تھے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے آکر بتایا کہ خدا کی ہدایت اور رہنمائی کے ظہور کے لئے کسی ملک قوم اور زبان کی تخصیص نہیں اس کی نگاہ میں عرب وعجم اور شام و ہند سب برابر ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ کی ہمہ بین آنکھوں نے پورب، پچھم، اتر، دکھن ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کا نور دیکھا اور ہر زبان میں اس کی آواز سنی۔

﴿ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ ﴾ (یونس)

اور ہر قوم کے لئے ایک رسول ہے۔

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا ﴾ (نحل)

اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا۔

﴿ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ ﴾ (روم)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کتنے رسول ان کی اپنی قوم میں بھیجے۔

﴿ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾ (رعد)

اوھر ہر قوم کے لئے ایک رہنما آیا۔

﴿ وَاِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ ﴾ (فاطر)

کوئی قوم نہیں جس میں ایک ہشیار کرنے والا نہ آیا ہو۔

﴿ وَ کَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ لِیُبَیِّنَ لَھُمْ ﴾ (ابراہیم)

اور ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی بولی میں بھیجا تا کہ وہ ان کو بتا سکے۔

اس آخری آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول کی یہ تعلیم الٰہی تشریح و بیان کے لئے مامور ہیں۔

ایک یہود کے لئے حضرت موسٰیؑ کے سوا کسی اور کو پیغمبر ماننا ضروری نہیں ایک عیسائی تمام دوسرے پیغمبروں کا انکار کر کے بھی عیسائی رہ سکتا ہے ایک ہندو تمام دنیا کو ملیچھ، شودر اور چنڈال کہہ کر بھی پکا ہندو رہ سکتا ہے ایک زردشتی تمام عالم کو بحرِ ظلمات کہہ کر بھی نورانی رہ سکتا ہے اور وہ ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو نعوذ باللہ جھوٹا کہہ کر بھی دینداری کا دعویٰ کر سکتا ہے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ ناممکن کر دیا ہے کہ کوئی ان کی پیروی کا دعوی کر کے ان سے پہلے کے کسی پیغمبر کا انکار کر سکے آنحضرت ﷺ تہجد میں جو دعا پڑھتے تھے، اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا ﴿ وَ النَّبِیُّوْنَ حَقٌّ وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ ﴾[۱] (سب نبی برحق تھے اور محمد بھی برحق ہے) غرض کوئی شخص اس وقت تک محمدی نہیں ہو سکتا جب تک اس سے پہلے وہ موسوی، عیسوی، سلیمانی اور داؤدی نہ بن لے اور کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ دنیا کے تمام پیغمبروں کی یکساں صداقت، حقانیت، راست بازی اور معصومیت کا اقرار نہ کرے اور یہ یقین نہ کرے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عرب کی طرح ہر قوم کو اپنی ہدایت اور رہنمائی سے سرفراز کیا ہے، ان کا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا خدا کا ماننا۔

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا ۝ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا ۝ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ اُولٰٓئِکَ سَوْفَ یُؤْتِیْھِمْ اُجُوْرَھُمْ ۚ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴾ (نساء۔۲۱)

بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانیں گے اور بعض کو نہیں مانیں گے اور چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ بیچ میں کوئی راستہ نکالیں وہی حقیقت میں کافر ہیں اور کافروں کے لئے ہم نے اہانت والا عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان رسولوں میں سے کسی کو الگ نہیں کیا وہ ان کی مزدوری ان کو دے گا اور اللہ بخشنے والا رحمت والا ہے۔

﴿ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ﴾ (بقرہ)

فرشتوں پر، کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لانا نیکی ہے۔

﴿ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا ۢ بَعِیْدًا ﴾ (نساء)

---

[۱] صحیح بخاری باب التہجد۔

اور جس نے خدا کا، اور اس کے فرشتوں کا، اور اس کی کتابوں کا، اور اس کے رسولوں، اور قیامت کا انکار کیا، وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔

بقرہ کے خاتمہ میں ہے۔

﴿ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ﴾ (بقرہ)

ہر ایک خدا پر، اور اس کے فرشتوں پر، اور اس کی کتابوں پر، اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا ہم خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

﴿ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ﴾ (بقرہ۔۱۲۶)

ہم ان پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

پیغمبروں میں تفریق کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ان میں سے بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں، اسلام نے اس کی ممانعت کی اور عام حکم دیا کہ دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں خدا کا رسول صادق اور راست باز تسلیم کیا جائے۔

یہودی حضرت عیسیٰؑ کو نعوذ باللہ جھوٹا اور کاذب سمجھتے تھے اور ان پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے اور اب بھی ان کا یہی عقیدہ ہے یہودیت اور اسلام میں جو اشتراک ہے وہ مسیحیت سے زیادہ ہے اس لئے اگر اسلام کی راہ میں حضرت مسیحؑ کا نام نہ آئے تو بہت سے یہود مسلمان ہونے کو تیار ہو جائیں، مگر اسلام نے کبھی یہ ننگ گوارا نہیں کیا اور جب تک کسی یہودی سے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت معصومیت اور تقدس کا اقرار نہیں لے لیا، اسکو اپنے دائرہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی، چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بہت سے یہود آپ کی رسالت اور شریعت پر ایمان لانے کو تیار تھے، مگر حضرت عیسیٰؑ کو ماننے کے لئے تیار نہ تھے آنحضرت ﷺ نے ان کی دوستی کے عظیم الشان فائدوں سے محرومی قبول کی مگر مسیحؑ کی سچائی سے محرومی قبول نہ فرمائی[۱] اور ان سے صاف کہا۔

﴿ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴾ (مائدہ)

اے یہود! کیا بیر ہے تم کو ہم سے مگر یہی کہ ہم خدا پر اور جو ہماری طرف اتارا گیا ہے اور جو پہلے اتارا گیا اس پر ایمان رکھتے ہیں تم میں اکثر بے حکم ہیں۔

خود قریش کا یہ حال تھا کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے نام سے چڑھتے تھے مگر ان کی خاطر حضرت عیسیٰؑ کی نبوت، تقدس اور معصومیت سے انکار نہیں کیا گیا، قرآن نے کہا۔

﴿ وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ۝ وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ط بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ ﴾ (زخرف ۵۸۔۵۹)

اور جب مریم کے بیٹے کی کہاوت بیان کی گئی تو تیری قوم اس سے چلانے لگتی ہے اور بولی کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ، یہ نام جو تجھ پر دھرتے ہیں صرف جھگڑنے کو بلکہ وہ جھگڑالو ہیں، وہ تو ایک بندہ ہے جس پر ہم نے فضل کیا۔

قریش کو معلوم تھا کہ اسلام عیسیٰؑ ابن مریم کو بندہ اور رسول مانتا ہے خدا نہیں، باوجود اس کے عیسائیوں کی طرح

---

[۱] تفسیر ابن جریر طبری جلد ہشتم ص ۱۶۷، مصر۔

مسلمانوں کو بھی حضرت عیسیٰؑ کے ماننے کی وجہ سے عیسیٰ پرست تصور کر کے الزام دھرتے تھے‘ قرآن نے ان کے اس بے معنی اعتراض کی تردید کی۔

اسلام میں پیغمبروں کی کوئی تعداد محدود نہیں‘ طبرانی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء مبعوث ہوئے ایک دوسری روایت میں اس سے کم تعداد بھی مروی ہے قرآن پاک میں نام کے ساتھ صرف انہیں انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے جن سے عرب مانوس تھے یا ان کے ہمسایہ یہود و نصاریٰ کے صحیفوں میں جن کے تذکرے تھے قرآن میں بعض ایسے انبیاء بھی مذکور ہیں جن سے صرف عرب واقف تھے مگر یہود و نصاریٰ بے خبر تھے مثلاً حضرت ہودؑ اور حضرت شعیبؑ بعض ایسے ہیں جن کو وہ جانتے تھے لیکن ان کو پیغمبر تسلیم نہیں کرتے تھے‘ مثلاً حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ وحی محمدی نے ان سب کو پیغمبر تسلیم کیا اور ان کی صداقت و عظمت کا اقرار کیا۔

اسی سلسلہ میں ایک اور واقعہ کی طرف اشارہ کر دینا مناسب ہے اسلام سے پہلے نبوت رسالت اور پیغمبری کی کوئی خاص واضح اور غیر مشتبہ حقیقت دنیا کے سامنے نہ تھی۔ یہود کے ہاں نبوت کے معنی صرف پیشین گوئی کرنے کے تھے اور نبی پیشین گو کو کہتے تھے اور جس کے متعلق یقین رکھتے تھے کہ اس کی دعا یا بددعا فوراً قبول ہو جاتی ہے [۱] اسی لئے حضرت ابراہیمؑ حضرت لوطؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کی نبوت اور رسالت کا محض دھندلا سا خاکہ ان کے ہاں موجود ہے بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے مقابلہ میں شام کے کاہن مالک کی پیغمبرانہ شان ان کے نزدیک زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے [۲] حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کی حیثیت ان کے ہاں صرف بادشاہ کی ہے اور ان کے زمانہ کے پیشین گوئی کرنے والے پیغمبر اور ہیں یہی سبب ہے کہ یہود کے قصوں اور کتابوں میں اسرائیلی پیغمبروں کی طرف نہایت سخیف باتیں بے تامل منسوب کی گئی ہیں اسی طرح عیسائیوں میں بھی رسالت اور نبوت کی کوئی واضح حقیقت نہیں ورنہ یہ نہ کہا جاتا کہ ”مجھ سے پہلے جو آئے وہ چور اور ڈاکو تھے“ [۳] موجودہ انجیلوں میں نہ خدا کے رسولوں کی تعریف ہے نہ ان کے تذکرے ہیں نہ ان کی سچائی اور صداقت کی گواہی ہے۔ حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ جن کے تذکرے انجیل میں ہیں وہ بھی پیغمبرانہ شان کے ساتھ ان کے ہاں مسلم نہیں لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے آ کر اس جلیل القدر منصب کی حقیقت ظاہر کی اور اس کے فرائض بتائے اور اس کی خصوصیات کا اظہار کیا اور ان سب پر ایمان لانا نجات کا ضروری ذریعہ قرار دیا، آپ ﷺ نے بتایا کہ نبوت و رسالت خاص خاص انسانوں کو خدا کا بخشا ہوا ایک منصب ہے جس کو دے کر وہ دنیا میں اس غرض سے بھیجے گئے ہیں کہ وہ خدا کے احکام لوگوں کو بتائیں اور سچائی اور نیکی کا راستہ ان کو دکھائیں۔ وہ ہادی (رہنما) نذیر (ہشیار کرنے والے) داعی (خدا کی طرف بلانے والے) مبشر (خوش خبری سنانے والے) معلم (سکھانے والے) مبلغ (خدا کے احکام پہنچانے والے) اور نور (روشنی) تھے خدا ان سے ہم کلام ہوتا تھا اور اپنی باتوں سے ان کو مطلع کرتا تھا اور وہ ان سے دوسرے انسانوں کو آگاہ کرتے تھے‘ وہ گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ تھے‘ وہ خدا کے نیک اور مقبول

---

[۱] دیکھو تورات صحیفہ تکوین باب ۱۶۔ ۷

[۲] تکوین ۱۴۔ ۱۸۔

[۳] انجیل۔

بندے تھے اور اپنے عہد کے سب سے بہترین انسان تھے‘ ان کے سب کام خدا کے لئے تھے اور خدا ان کے لئے تھا۔ یہ ہستیاں اپنے فرائض کو انجام دینے کے لئے ہر قوم میں پیدا ہوئیں جنہوں نے ان کو مانا انہوں نے نجات پائی اور جنہوں نے جھٹلایا، ہلاک و برباد ہوئے‘ قرآن پاک نے ان کی زندگی کی سوانح، ان کی تبلیغ کی روداد، ان کے اخلاق کی بلند مثالیں اور ان کی خدا پرستی کا اخلاص اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کے پڑھنے اور سننے سے ان کی پیروی کا جذبہ ان کی اتباع کا شوق اور ان کی صداقت کا یقین دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ان کی طرف شان نبوت کے خلاف جو غلط باتیں دوسرے صحیفوں میں منسوب تھیں ان کو چھوڑ دیا ہے یا ان کی تردید کر دی ہے۔

الغرض نبوت اور رسالت کی سب سے اہم خصوصیت اسلام نے جو یہ قرار دی کہ نبی و رسول گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں بنی اسرائیل کو نبوت اور رسالت کے اس بلند تخیل کی ہوا بھی نہیں لگی تھی اس لئے انہوں نے نہایت بے باکی سے اپنے پیغمبروں کی طرف ہر قسم کے گناہ منسوب کر دیئے‘ عیسائی ایک حضرت عیسیٰؑ کو تو معصوم کہتے ہیں باقی سب کی گنہگاری کے قائل ہیں لیکن اسلام نے دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کی عظمت کی ایک ہی سطح قائم کی ہے اس کے نزدیک گناہوں سے پاکی اور عصمت تمام انبیاء اور مرسلین کا مشترکہ وصف ہے کہ جو خود گنہگار ہے وہ گنہگاروں کی رہنمائی کا مستحق نہیں کہ اندھا اندھے کو راہ نہیں دکھا سکتا‘ اس بناء پر محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی و تعلیم نے خدا کے تمام معصوم رسولوں کی عظمت و جلالت دنیا میں قائم کی اور جن کور باطنوں نے ان کی عصمت و بے گناہی کے دامن پر اپنے وہم و نادانی سے داغ لگائے تھے ان کو دھو کر پاک و صاف کیا اور یہ رسالت محمدی کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

خود انجیل کی طرف سے ظاہر تھا کہ حضرت عیسیٰؑ احکام عشرہ کے برخلاف اپنی ماں کی عزت نہیں کرتے تھے تو قرآن نے اس کی تردید کی اور خود حضرت عیسیٰ کی زبان سے کہلوایا۔

﴿ وَبَرًّاۢ بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ﴾ (مریم۔۳۲)

اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرنے والا اور مجھ کو خدا نے جبار و بد بخت نہیں بنایا۔

کیونکہ احکام عشرہ کے مطابق ماں باپ کا ادب نہ کرنا بد بختی تھی‘ اسی طرح موجودہ انجیل نے حضرت عیسیٰؑ پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ نماز روزہ کی پرواہ نہ کرتے تھے‘ قرآن نے ان کی زبان سے کہلوایا۔

﴿ وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِیْنَ ﴾ (تحریم۔۱۲)

اور مریم بنت عمران جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے اپنے پروردگار کی باتوں اور اس کی کتابوں کو سچ جانا اور وہ بندگی کرنے والوں میں تھی۔

یہود حضرت سلیمانؑ کو گنڈہ‘ تعویذ اور عملیات وغیرہ کا موجد سمجھتے تھے‘ حالانکہ سحر و جادو وغیرہ توراۃ میں شرک قرار دیا جا چکا تھا قرآن نے اعلانیہ یہودیوں کے اس الزام کی تردید کی۔

﴿ وَمَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّیٰطِیْنَ كَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ﴾ (بقرہ۔۱۲)

اور سلیمان نے کفر کا کام نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے کیا‘ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔

اسی طرح حضرت لوط پر بدکاری کا جو الزام یہود لگاتے ہیں، اس کی تردید کی۔

اوپر گذر چکا ہے کہ قرآن نے یا آنحضرت ﷺ نے دنیا کے تمام پیغمبروں کے نام نہیں لئے ہیں کہ صرف ناموں کی فہرست یا نامعلوم اشخاص کے نام لینے سے دلوں میں جوش عقیدت پیدا نہیں ہوسکتا، تاہم معلوم تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی صدائے دعوت ایک دن دنیا کے کناروں تک پہنچے گی اور بہت سی غیر قومیں اور دوسرے انبیاءؑ کی امتیں اس حلقہ میں داخل ہونگی اور اپنے اپنے انبیاءؑ کا نام ونشان صحیفہ محمدی میں تلاش کریں گی اس لئے ایک جامع آیت میں تمام انبیاء کا تذکرہ کر دیا گیا اور ان کی صداقت کی پہچان بتا دی گئی، فرمایا

﴿اِنَّـآ اَوۡحَيۡنَـآ اِلَيۡكَ كَمَآ اَوۡحَيۡنَآ اِلٰى نُوۡحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ‌ۚ وَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰۤى اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَعِيۡسٰى وَاَيُّوۡبَ وَيُوۡنُسَ وَهٰرُوۡنَ وَسُلَيۡمٰنَ‌ۚ وَاٰتَيۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا ۝ وَرُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰهُمۡ عَلَيۡكَ مِنۡ قَبۡلُ وَرُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ عَلَيۡكَ‌ؕ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰى تَكۡلِيۡمًا ۝ رُسُلًا مُّبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ لِئَلَّا يَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ‌ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيۡزًا حَكِيۡمًا﴾ (نساء۔۱۶۴۔۱۶۳)

ہم نے (اے محمد ﷺ) تمہارے پاس وحی بھیجی جس طرح نوحؑ اور ان کے بعد کے پیغمبروں کو بھیجی، ہم نے ابراہیمؑ کو، اور اسماعیلؑ کو، اور اسحاقؑ کو، اور یعقوبؑ کو، اور ان کے خاندان کو، اور عیسیٰؑ کو، اور ایوبؑ کو، اور یونسؑ کو، اور ہارونؑ کو، اور سلیمانؑ کو وحی بھیجی اور داؤد کو زبور عطا کی، اور دوسرے رسولوں کو بھیجا جن کا حال تم سے ہم نے پہلے بیان کیا ہے اور ان رسولوں کو جن کا حال ہم نے تم سے بیان نہیں کیا اور خدا نے موسیٰ سے بات کی اور ان رسولوں کو خوشخبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا تا کہ لوگوں کو رسولوں کے آ جانے کے بعد خدا کے آگے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور خدا غالب اور دانا ہے۔

انبیاء کے متعلق یہی حقیقت سورۂ مومن میں دوبارہ بیان کی گئی ہے۔

﴿وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلًا مِّنۡ قَبۡلِكَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ قَصَصۡنَا عَلَيۡكَ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ لَّمۡ نَقۡصُصۡ عَلَيۡكَ﴾ (مومن)

اور ہم نے یقیناً تم سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے، ان میں کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان کیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان نہیں کیا۔

تعلیم محمدی کے اصول کے مطابق یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قوموں اور ملکوں میں جیسے چین، ایران اور ہندوستان میں بھی آنحضرت ﷺ سے پہلے خدا کے انبیاء مبعوث ہو چکے ہیں اس لئے یہ تمام قومیں اپنے جن بزرگوں کی عزت وعظمت کرتی ہیں اور اپنے دین ومذہب کو ان کی طرف منسوب کرتی ہیں ان کی صداقت اور راست بازی کا قطعی انکار کوئی مسلمان نہیں کر سکتا، اسی بناء پر بعض علماء نے ہندوستان کے کرشن [1] اور رام کو بلکہ ایران کے زردشت [2] کو بھی اور بعض صاحبوں نے تو بودھ تک کو بھی پیغمبر کہا ہے، بہرحال امکان میں تو شک ہی نہیں لیکن یقین کے ساتھ ان ناموں کی تعیین بھی حد سے تجاوز کرنا ہے، اصل یہ ہے کہ قرآن نے انبیاء کی دو قسمیں کی ہیں ایک وہ جن کے ناموں کی اس

---

[1] کلماتِ طیبات حضرت شاہ مرزا مظہر جان جاناںؒ۔

[2] ملل ونحل ابن حزم۔

نے تصریح کی ہے اور دوسرے وہ جن کے نام اس نے بیان نہیں کئے' اس لئے صحیح یہ ہے کہ جن انبیاءؑ کے نام مذکور ہیں تمام مسلمانوں کو ان پر نام بنام ایمان لانا چاہیے اور جن کے نام مذکور نہیں ان کی نسبت صرف یہ اجمالی ایمان کافی ہے کہ ان قوموں میں بھی خدا کے فرستادہ اور پیغمبر آئے لیکن یہ تخصیص ان کے نام نہیں معلوم ہیں، وہ قومیں جن کا نام لیتی ہیں ان کی زندگی اور ان کی تعلیم نبوت اور رسالت کی شان کے مطابق ہے تو ان کی نبوت اور رسالت کی طرف رجحان اور میلان بلکہ قرینہ غالب ہوسکتا ہے لیکن یقین اس لئے نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے پاس ان باتوں پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف وحی محمدی ہے اور وہ اس تخصیص و تعین سے خاموش ہے۔

اس قسم کے انبیاءؑ جن کے نام گو قرآن میں مذکور نہیں مگر وہ آنحضرت ﷺ کے پہلے گذر چکے ہیں اور ان کے پیروان کو اپنے ہاں نبوت و رسالت کا یہ درجہ دیتے ہیں' ان کی شناخت اور پہچان کا ایک اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دی ہے۔

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّۃٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ (نحل)

اور ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی پرستش کرو' اور جھوٹے معبود سے بچے رہو۔

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْہِ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ (انبیاء۔۲۵)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں بھیجا لیکن اس کو یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں' مجھی کو پوجو۔

اس لئے وہ تمام قدیم رہبران انسانی اور رہنمایان عالم جو دنیا میں کسی مذہب کو لائے ہوں اور جن کی تبلیغ اور تعلیم توحید کی دعوت اور بت پرستی سے اجتناب تھی اور ان کی زندگی اس تعلیم کے شایان شان تھی ان کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اپنی قوم کے رسول اور پیغمبر نہ تھے کہ اتنی بڑی بڑی قومیں خود قرآن کے اصول کی بناء پر انبیاء اور رسولوں کے وجود سے خالی نہیں رہ سکتی تھیں اس بناء پر اسلام کی ان تلقینات میں سے جن کے تسلیم کئے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا ایک یہ ہے کہ وہ تمام ملکوں کے پیغمبروں اور تمام قوموں کے رسولوں کو جو حضرت خاتم نبوت ﷺ کے زمانے سے پہلے پیدا ہوئے یکساں صداقت کے ساتھ تسلیم کرے' ان سب نے تمام دنیا کو ایک ہی تعلیم دی ہے اور وہ توحید ہے البتہ ان انبیاءؑ میں سے ایک کو دوسرے پر بعض بعض حیثیتوں سے ترجیح ہے۔

﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ ۘ مِنْھُمْ مَّنْ کَلَّمَ اللّٰہُ وَرَفَعَ بَعْضَھُمْ دَرَجٰتٍ ط
وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَاَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ﴾ (بقرہ۔۲۵۳)

ان رسولوں میں سے ہم نے کسی کو کسی پر فضیلت دی' ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام کیا اور کسی کے بہت درجے بڑھائے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو نشانیاں دیں اور سچائی کی روح سے ہم نے اس کی تائید کی۔

آپ نے دوسرے انبیاءؑ کی جائز تعظیم و تکریم یہاں تک کی کہ ان کے مقابلہ میں کبھی کبھی اپنی ہستی بھی فراموش ~~کردی ہے ایک دفعہ ایک صحابی نے آپ کو خیر البریۃ~~ اے بہترین خلق! کہہ کر خطاب کیا۔ فرمایا وہ تو ابراہیم[1] تھے۔ ایک دفعہ ایک صاحب نے دریافت کیا کہ سب سے بزرگ عالی خاندان کون سا تھا' فرمایا یوسفؑ بن پیغمبر بن پیغمبر بن

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۱ صفحہ ۱۵۳۔

خلیل اللہ[1] ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک یہودی مدینہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰؑ کو بشر پر فضیلت دی ایک مسلمان کھڑے یہ سن رہے تھے ان کو غصہ آیا کہ ہمارے پیغمبر کی موجودگی میں تم یہ کہہ رہے ہو اور اس کو ایک تھپڑ کھینچ مارا اس نے دربار نبوی میں جا کر شکایت کی آپ نے ان صحابی کو بلا بھیجا اور مقدمہ کی روداد سنی اور نہایت برہم ہو کر فرمایا کہ پیغمبروں میں باہم ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو [2] یعنی ایسی فضیلت نہ دو جس سے کسی دوسرے نبی کی تنقیص ہوتی ہو۔

یہی وہ تعلیمات محمدی ہیں جن کے ذریعہ سے دنیا میں وحدت مذاہب، روحانی مساوات، انسانی اخوت اور تمام انبیاءؑ اور پیغمبروں کے ادب و احترام کے جذبات پیدا ہوئے، بنی اسرائیل کے وہ پیغمبر جن کو ماننے والے تمام دنیا میں چند لاکھوں سے زیادہ نہ تھے، محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ان کی عظمت، جلالت اور ادب و احترام کرنے والے چالیس کروڑ سے زیادہ ہو گئے وہ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ جو چھ سو برس تک یہودیوں کی جھوٹی تہمت سہتے رہے، محمد رسول اللہ ﷺ نے آ کر اس کو مٹایا اور ان کی پاکی کی گواہی دی، جس کی بدولت آج چالیس کروڑ زبانیں ان کی عصمت کی شہادت دے رہی ہیں ہندوستان، ایران، چین جن کے سچے رہنماؤں کا ان کے ملک سے باہر کوئی ادب نہ تھا، جہاں جہاں مسلمان گئے ان کے جائز ادب و احترام کو اپنے ساتھ لے گئے۔

وہ عرب جو پیغمبروں کے ناموں تک سے ناواقف تھے، جو نبوت اور رسالت کے خصائص کے علم سے محروم تھے جو انبیاءؑ اور رسولوں کی سیرتوں سے ناآشنا تھے جو ان کے ادب و احترام اور تصدیق و اعتراف سے بیگانہ تھے اور جن کو اپنے دیوتاؤں کے سامنے عیسیٰ بن مریمؑ پر تحقیرانہ ہنسی آتی تھی، [3] اور جو حضرت موسیٰؑ کی فضیلت کا ذکر سن کر اپنے غصہ کو ضبط نہ کر سکتے تھے [4] محمد رسول اللہ کی تعلیم سے ان کا یہ حال ہوا کہ وہ ایک ایک پیغمبر کے نام و نشان اور تاریخ و سیرت سے واقف ہوئے۔ تبرکاً ان کے ناموں پر اپنی اولادوں کے نام رکھے اور آج تمام مسلمانوں میں وہ نام شائع اور ذائع ہیں ان کی صداقت اور سچائی کی گواہی دی اور ان کے ادب و احترام کو اپنے سینوں میں جگہ دی ان کی تعظیم و تکریم کو اپنے دین و ایمان کا جز بنا لیا، دنیا کی کسی قوم میں یہ رواج نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے نام ادب سے لئے جائیں، مگر ایک مسلمانوں کے لئے لازم ہے کہ جب کسی پیغمبر کا نام لے تو ادب سے لے اور ان پر درود و سلام پڑھے۔

* * *

---

[1] صحیح بخاری مناقب حضرت یوسفؑ صفحہ ۴۷۹۔

[2] صحیح بخاری مناقب حضرت موسیٰؑ صفحہ ۴۸۵۔

[3] قرآن پاک سورۂ زخرف رکوع ۶۔

[4] صحیح بخاری مناقب حضرت موسیٰؑ۔

کتب الٰہی پر ایمان

وَكُتُبِهٖ

ایک مسلمان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے صحیفہ وحی پر ایمان لائے۔ ہر چند یہ عقیدہ پچھلے عقیدہ رسالت کا لازمی نتیجہ ہے یعنی رسول کو رسول مان لینا اس کی تعلیمات کو وحی کو مان لینے کے مترادف ہے تاہم یہ تصریح اس لئے کی گئی ہے تاکہ پوری طرح صاف اور واضح ہو جائے کہ رسول کو رسول مان لینے کے بعد اس کے صحیفہ وحی کو مان کر اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں سچے مومنوں کی تعریف میں کہا گیا ہے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ﴾ (بقرہ۔۱)

اور جو اس (کتاب یا وحی) پر ایمان رکھتے ہیں جو تجھ پر (اے محمد) اتاری گئی۔

کتاب الٰہی پر ایمان لانے سے مقصود ان تمام صداقتوں اور حکموں کو بہ جان و دل قبول کرنا ہے جو اس میں مذکور ہیں یہ گویا پوری شریعت مطہرہ کے قبول کر لینے کا مختصر ترین طریقہ تعبیر ہے اس لئے ایمانیات کی بہت سی دوسری باتیں جن کی تفصیل ہر موقع پر ضروری نہیں اس ایک فقرہ کے تحت میں آ جاتی ہے اس لئے قرآن پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام مذکور ہیں ان سب کو بے کم و کاست ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر کوئی سرے سے ان کو تسلیم ہی نہیں کرتا تو ان کی تعمیل و پیروی کا اس سے کیونکر مطالبہ ہو سکتا ہے اسی بناء پر اس کی تشریح آنحضرت ﷺ نے کبھی ان الفاظ میں فرمائی کہ بما جئت به جو کچھ میں لے کر آیا اس پر ایمان لاؤ قرآن نے کہا۔

﴿ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ ﴾ (محمد۔۲)

اور جو ایمان لائے اس پر جو محمد پر اتارا گیا۔

لیکن قرآن اگر اتنا ہی کہتا کہ میرے پیرو صرف مجھ پر ایمان لائیں تو یہ کوئی اہم بات نہ ہوتی کہ ہر صاحب مذہب کی یہی تعلیم ہوتی ہے، قرآن نے اپنے عقائد کی اس دفعہ میں بھی اپنے تکمیلی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے اور قرار دیا کہ اہل قرآن، قرآن کے ساتھ ہی دوسری آسمانوں کتابوں کی صداقت کو بھی تسلیم کریں یعنی کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک صحیفہ محمدی کے ساتھ ساتھ دوسروں پیغمبروں کے صحیفوں کو بھی من جانب اللہ تسلیم نہ کرے چنانچہ سورۂ بقرہ کے شروع والی مذکورہ آیت کے ساتھ یہ بھی فرمایا۔

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ﴾ (بقرہ)

اور جو ایمان لائے اس پر جو تجھ پر اترا اور جو تجھ سے پہلے اترا

پھر اسی سورہ کے آخر میں فرمایا۔

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ ﴾ (بقرہ)

رسول ایمان لایا اس پر جو خدا کی طرف سے اس پر اترا، اور اہل ایمان بھی، ہر ایک خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اور اس کی کتابوں پر ایمان لایا۔

بقرہ کی آیتوں میں بعض انبیاء علیہم السلام کا تفصیلی درجہ اور بقیہ تمام انبیاءؑ کا اجمالی ذکر کر کے ان کی کتابوں اور وحیوں کی تصدیق کا حکم دیا گیا ہے۔

﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ (بقرہ۔)

(اے مسلمانو!) تم کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور خاندان یعقوب کی طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر اور جو کچھ سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، ہم ان سب پر ایمان لائے۔

آل عمران میں کسی قدر اور تفصیل ہے۔

﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ (ال عمران۔۸۴)

کہہ کہ ہم خدا پر، اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا اس پر، اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور خاندان یعقوب پر اتارا گیا اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر، اور دوسرے سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے جو کچھ دیا گیا ہم ان سب پر ایمان لائے۔

سورۂ نساء میں اس پر ایمان لانے کے حکم کے ساتھ اس کے انکار کو کفر قرار دیا گیا۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا﴾ (نساء۔۱۳۶)

اے وہ لوگو جو ایمان لاچکے ہو، ایمان لاؤ خدا پر اس کے رسول پر اور اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا انکار کیا وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔

سورۂ مومن میں ان منکروں کو عذاب کی بھی دھمکی دی گئی ہے جو کسی پیغمبر کے پیغام کی بھی تکذیب کریں

﴿اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ﴾ (مومن)

جن لوگوں نے کتاب کو اور جو پیغام دے کر ہم نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا، ان کو جھٹلایا وہ عنقریب جانیں گے جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہونگی اور وہ کھینچے جائیں گے۔

نام کی تخصیص کے ساتھ قرآن پاک میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے۔ توراۃ جس کو ایک جگہ صحف موسیٰ بھی کہا گیا ہے اور حضرت داؤدؑ کی زبور اور حضرت عیسیٰ کی انجیل اور خود قرآن ان کے علاوہ ایک موقع پر صحف ابراہیم کا بھی تذکرہ ہے۔

﴿اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى﴾ (اعلیٰ)

یہ باتیں گذشتہ صحیفوں میں بھی ہیں، ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

ان کے ماسوا اجمال کے ساتھ دو موقعوں پر گذشتہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے الفاظ ہیں۔

﴿ اَوَلَمۡ تَاۡتِهِمۡ بَيِّنَةُ مَا فِى الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰى ﴾ (طٰہٰ)

کیا اگلے صحیفوں میں جو کچھ ہے اس کی گواہی ان کو نہیں پہنچی؟

﴿ وَاِنَّهٗ لَفِىۡ زُبُرِ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴾ (شعراء)

اور بے شبہ یہ پہلوں کی کتابوں میں مذکور ہے۔

اس بناء پر انبیاءؑ کی طرح ان کتابوں پر بھی اسی طرح تفصیلی اور اجمالی ایمان ہر مسلمان کا ہے جن کتابوں کے نام مذکور ہیں، ان ناموں کے ساتھ اور جن کے نام مذکور نہیں، ان پر بالا جمال ایمان ضروری ہے کسی قوم میں اگر کوئی ایسی آسمانی کتاب ہے جس کا وجود قرآن سے پہلے ہے لیکن اس کا تصریحی نام قرآن میں مذکور نہیں ہے اور اس میں توحید کی دعوت اور طاغوت سے بچنے کی نصیحت ہے تو اگرچہ ہم اس کو بتصریح خدا کی کتاب قبول نہیں کر سکتے تاہم بالتصریح اس کو رد بھی نہیں کر سکتے اسی بناء پر آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ ''اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب''[1] یہی حال دوسری مشکوک کتابوں کا ہے۔

یہود توراۃ کے سوا کچھ نہیں مانتے، عیسائی توراۃ کے احکام نہیں مانتے، لیکن اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں، مگر انجیل سے پہلے کی دوسری زبانوں اور ملکوں کی آسمانی کتابوں کی نسبت مسلمانوں کی طرح ادب اور احتیاط کا پہلو بھی اختیار نہیں کرتے' پارسی اوستا کے باہر خدا کے کلام ہونے کا شبہ بھی نہیں کر سکتے اور برہمن ویدوں کے باہر خدا کے فیضان کا تصور بھی نہیں کر سکتے' لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے کہ صحیفہ ابراہیم، توراۃ، زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں یقین کرے اور دوسری پیشتر کی آسمانی کتابوں کی جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں تکذیب نہ کرے کہ ان کا کتب الٰہی ہونا ممکن ہے۔

حقیقت میں اسلام کی یہ تعلیم دنیا کے مہتم بالشان تعلیمات میں سے ہے' جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہ تھا۔ یہ رواداری بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے' یہود اپنی کتاب کو چھوڑ کر تمام دوسری آسمانی کتابوں سے انکار کر کے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے عیسائی توراۃ اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کر کے بھی آسمانی بادشاہی کا متوقع ہو سکتا ہے' پارسی اوستا کے سوا دوسری ربانی کتابوں کو باطل مان کر بھی مینو (جنت) کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے ہندو اپنے ویدوں کے سوا دنیا کی ہر آسمانی کتاب کو دجل وفریب مان کر بھی آواگون سے نجات حاصل کر سکتا ہے بودھ مت والے اپنے سوا تمام دنیا کی وحیوں کا انکار کر کے بھی نروان کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں' مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دنیا کی آسمانی کتابوں کو منجانب اللہ نہ تسلیم کریں جنت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

یہ تعلیم صرف نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ عملاً اس پر اسلامی حکومت کے قوانین اور احکام مبنی ہیں' یہودیوں کی نظر میں دنیا میں صرف دو ہی قومیں ہیں بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل یا اسرائیل کا گھرانہ اور غیر قومیں یا مختون اور غیر مختون' اور ان ہی دونوں تقسیموں پر ان کے قانون کی بنیاد ہے عیسائیوں میں مذہبی حیثیت سے مسیحی یہود اور بت پرست

---

[1] صحیح بخاری کتاب التوحید و حدیث الافک و تفسیر سورۂ بقرہ۔

گو تین قومیں مانیں جاتی ہیں مگر چونکہ ان کے مذہب میں قانون نہیں، اس لئے وہ اکثر امور میں رومن لا کے ماتحت رہے ہیں لیکن رومن عیسائیوں میں بھی ملکی حیثیت سے دو ہی تقسیمیں ہیں رومی اور غیر رومی۔ ایک رومی ملک میں غیر رومی کا کوئی حق نہیں کہ رومی حکومت کے لئے اور غیر رومی غلامی کے لئے پیدا ہوا ہے پارسیوں میں پاک نژادان ایران اور بیرونی لوگ دنیا کی دو ہی حیثیتیں ہیں ہندوؤں میں اونچی ذاتیں اور اچھوت اور ملیچھ قوموں کی دو ہی صورتیں ہیں۔

مگر اسلام کے گزشتہ عقیدہ کی بناء پر آنحضرت ﷺ نے قانون کی حیثیت سے دنیا کی قوموں کو چار حصوں میں تقسیم فرمایا اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق قرار دیئے اور اسلام کی تیرہ صدیوں میں ان پر برابر عمل ہوتا۔ رہا یہ تقسیمیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مسلمان:

جو قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں کو کتاب الٰہی یقین کرتے ہیں، ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بھائی اور ہر اچھائی اور برائی میں وہ ایک دوسرے کا شریک ہے وہ آپس میں ایک دوسرے سے شادی بیاہ کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں اور اسلام کی سلطنت میں ان کے حقوق یکساں ہیں۔

۲۔ اہل کتاب:

یعنی ان کتابوں کے پیرو جن کے نام قرآن میں مذکور ہیں، یا یوں کہو کہ جو قرآن کو گو آسمانی کتاب نہیں مانتے مگر ان کتابوں میں سے جن کا نام قرآن میں مذکور ہے کسی کو وہ آسمانی کتاب مانتے ہیں وہ اپنی حفاظت کا مالی ٹیکس (جزیہ) ادا کر کے اسلامی حکومتوں کی حدود میں رہ سکتے ہیں ان کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رہیں گی ان کو اپنے مذہب کے بدلنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا ان کی جان و مال اور عزت کے مسلمان محافظ رہیں گے ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں اور ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں ان کا جائز کھانا ہم کھا سکتے ہیں اور ہم اپنا کھانا ان کو کھلا سکتے ہیں۔

۳۔ شبہ اہل کتاب:

یعنی وہ لوگ جو قرآن اور توراۃ اور انجیل و زبور کو نہیں مانتے مگر وہ خود اپنے لئے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں جیسے صابئی جو ایک آسمانی کتاب کے دعویٰ کے باوجود ستاروں کو پوجتے تھے اور مجوس یعنی پارسی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعویٰ کرتے تھے اور ساتھ ہی سورج اور آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں، ترکستان اور سندھ کی فتح کے موقع پر علمائے اسلام نے انہیں پر قیاس کر کے ہندوؤں اور بودھوں وغیرہ کو بھی اس صف میں داخل کیا مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے اور ان کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے۔ ان دو باتوں کے علاوہ اہل کتاب کے بقیہ تمام حقوق آنحضرت ﷺ نے ان کو عطا کئے اور وہ اسلامی حکومتوں میں ادائے جزیہ کے بعد ہر قسم کے ملکی حقوق میں شریک ہیں اور ان کی جان و مال و آبرو اور ان کے معبدوں کی حفاظت اسلامی حکومتوں کا فرض ہے۔

۴۔ کفار اور مشرکین:

یعنی وہ لوگ جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ کسی دین الٰہی کی طرف منسوب ہیں ان کو چند شرائط

کے ساتھ امن دیا جاسکتا ہے' لیکن حقوق کے حصول کے لئے ان کو کہا جائے گا کہ وہ کسی نہ کسی آسمانی دین کے اندر اپنے کو داخل کرلیں جیسا کہ ابتدائی عباسیوں کے زمانہ میں خرانی عراقیوں نے اپنے کو صائبیوں میں داخل کر کے اپنے حقوق حاصل کر لئے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوسکتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی اس تعلیم نے دنیا میں امن وامان اور مسلمانوں میں مذہبی رواداری کے پیدا کرنے میں کتنا عظیم الشان حصہ لیا ہے یہی وہ نظریہ تھا جس نے مسلمانوں کو اپنے مذہبی عقائد و شریعت کی سخت پیروی کے باوجود دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ مشارکت اور میل جول کے لئے آمادہ کیا اور مجوسیوں اور صائبیوں اور یہودیوں عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مختلف ملکوں میں ان ملکوں کے مناسب مختلف تمدنوں کی بنیاد رکھنے کی قوت پیدا کی۔

وحدۃ الادیان:

تمام رسولوں اور ان کے صحیفوں کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہو کہ آدمؑ سے لے کر محمد علیہم السلام تک جتنے سچے مذہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے چنانچہ درحقیقت آپ کی تعلیم یہی تھی اسلام اسی ایک مذہب کا نام ہے جو آدمؑ سے محمد علیہم السلام تک باری باری پیغمبروں کے ذریعہ آتا رہا اور انسانوں کو اس کی تعلیم دی جاتی رہی۔

صحیفہ محمدی نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کئے ہیں ایک دین اور دوسرا شرعہ، منسک اور منہاج۔ شرعہ اور منہاج کے معنی راستہ کے ہیں اور منسک کے معنی طریق عبادت کے ہیں دنیا میں یہ راز سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب پاک پر منکشف ہوا کہ دین الٰہی ہمیشہ ایک تھا، ایک رہا، اور ایک رہے گا' نور معرفت ایک ہے خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکل و رنگ کی قندیلوں میں روشن ہوا، اصل دین میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی ایک ہی دین تھا جس کو لے کر اول سے آخر تک تمام انبیاء آتے رہے اس میں زمان ومکان کے تغیر کو کوئی دخل نہیں اور نہ قوم وملک کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف پیدا ہوا۔ وہ ہر زمانہ اور ہر مقام میں یکساں آیا اور وہاں کے پیغمبروں نے اس کی یکساں تعلیم دی۔

یہ دائمی حقیقت اور یکساں تعلیم کیا ہے؟ یہ مذہب کے اصل اصول ہیں' یعنی خدا کی ہستی اور اس کی توحید' اس کے صفات کاملہ انبیاء اور مرسلین کی بعثت خدا کی خالص عبادت' حقوق انسانی اور اخلاق فاضلہ اور اچھے اور برے اعمال کی باز پرس اور جزاوسزا یہ تمام مذاہب کے وہ بنیادی امور ہیں جن پر جملہ مذاہب حقہ کا اتفاق ہے۔ اگر ان میں سے کسی جہت سے کوئی اختلاف ہے تو یا تو طریقہ تعبیر کی غلطی اور یا باہر سے آ کر اس تعلیم میں کوئی نقص پیدا ہوگیا ہے۔

دوسری چیز جس کو آنحضرت ﷺ کی زبان وحی ترجمان نے شرعہ منہاج اور منسک کہا ہے وہ جزئیات احکام اور متفقہ حصول مقصد کے جدا جدا راستے ہیں جو ہر قوم ومذہب کی زمانی ومکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہے ہیں مثلاً عبادت الٰہی ہر مذہب کا جزو لازم ہے لیکن طریق عبادت میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہر مذہب میں موجود ہے عبادت کی کوئی خاص سمت ہر مذہب میں ہے مگر وہ سمت ہر مذہب نے اپنی اپنی مصلحت سے الگ مقرر کی ہے اسی طرح اعمال فاسدہ کا انسداد ہر مذہب کا متفقہ نصب العین ہے مگر اس انسداد کے راستے اور طریقے جدا جدا ہیں غرض یہ راستے اور طریقے مختلف

پیغمبروں کے زمانوں میں اگر اصلاح اور تبدیل کے قابل پائے گئے تو بدلتے رہے، مگر اصل دین ازلی سچائی اور ابدی صداقت ہے، ناقابل تبدیل اور ناقابل تغیر رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا دنیا میں وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا کہ وہ اسی ازلی و ابدی صداقت کو ہمیشہ اہل دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے اور دین کو اپنے اصل مرکز پر ہمیشہ قائم رکھا اور ساتھ ہی اپنی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے مطابق خاص خاص احکام اور جزئیات جو ان کے لئے مناسب حال ہوں وہ ان کو بتائیں اور سکھائیں۔

انبیاءؑ کے سوانح پر نظر کرنے سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے ایک صاحب شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحب شریعت نبی اسی وقت مبعوث ہوا ہے جب اس کا صحیفہ وحی دین و شریعت کا محافظ تھا کھو گیا یا انسانی ہاتھوں کے دست برد سے ایسا بدل گیا کہ اصلیت مشتبہ ہوگئی، صحیفہ ابراہیم کے گم ہو جانے کے بعد جس کا نہایت ناقص خلاصہ توراۃ کے سفر تکوین میں ہے صحیفۂ موسیٰ نازل ہوا صحیفۂ موسیٰ کے نو پیدا اختلاف کو دور کرنے کے لئے زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے، پھر اس کی تکمیل کے لئے انجیل آئی اور انجیل میں انسانی تصرفات کے راہ پانے کے بعد قرآن آیا۔ چونکہ قرآن دنیا کے آخر تک کے لئے آیا اس لئے ہر تحریف اور انسانی تصرف سے اس کی حفاظت کی گئی اور قیامت تک کی جائے گی، اسی لئے اس کے بعد کسی اور صحیفہ کی ضرورت نہیں اور نہ کسی پیغمبر کی بعثت کی حاجت ہے، البتہ اس کے معانی صحیح تشریح اور بدعات و احداثات کے انسداد کے لئے آئمہ، خلفاء، مجددین، محدثین اور علمائے راسخین پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے اور ان کی اصلاح کی صداقت کی پہچان سنت محمدی کا احیاء اور بدعات کا قلع و قمع ہے۔

اب ہم کو پھر اوپر سے چلنا ہے اور اپنے ایک ایک دعویٰ کو وحی محمدی کی روشنی میں دیکھنا ہے۔

”وحدت دین“ کی حقیقت کو وحی اسلامی کے آخری ترجمان نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

﴿ شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴾ (شوریٰ۔۱۵۔۱۳)

اس نے دین میں تمہارے لئے وہی راہ مقرر کی جو نوح سے کہی تھی، اور جو ہم نے حکم بھیجا تم کو، اور جو کہہ دیا ہم نے ابراہیم کو، اور موسیٰ کو، اور عیسیٰ سے یہ کہ دین کو قائم رکھو، اس میں تفرقہ نہ ڈالو، مشرکوں کو جدھر تو بلاتا ہے وہ ان پر گراں گزرتا ہے، اور خدا اپنی طرف جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے اور اپنی طرف اسکو راہ دیتا ہے جو (اسکی طرف) رجوع ہوتا ہے اور یہ تفرقے انہوں نے وحی کا علم حقیقی ملنے کے بعد آپس کی ضد اور تعصب سے پیدا کیے ہیں، اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات وقت مقررہ تک کے لئے نہ ہو چکی ہوتی تو (کشف حقیقت کر کے) ان کے اختلافات کا

فیصلہ کر دیا جاتا اور جن کو ان اگلوں کے بعد کتاب وراثت میں ملی وہ اس امر حق کی طرف سے ایسے شک میں ہیں جو ان کو چین نہیں لینے دیتا، سو تو سب کو اسی حقیقت کی طرف بلا اور اسی پر استواری سے قائم رہ، جیسا کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے اور ان تفرقہ اندازوں کی غلط خواہشوں کی پیروی نہ کر اور کہہ کہ میں ایمان لایا ہر اس کتاب پر جو خدا نے اتاری اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمھارے بیچ میں انصاف کروں، ہمارا رب اور تمھارا رب وہی ایک اللہ ہے' ہم کو ہمارے کام کا بدلہ ملے گا اور تم کو تمھارے کام کا' ہم میں تم میں کچھ جھگڑا نہیں، اللہ ہم سب کو اکٹھا کریگا اور اسی کی طرف پھر جانا ہے۔

ان آیات مبارکہ میں کس خوبی کے ساتھ اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہی ایک دین ہے جو نوح کو، ابراہیم کو، موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو اور تم کو اے محمد ﷺ عطا کیا گیا ہے' اگلوں کے بعد پچھلوں نے جن کو یہ کتاب ملی اپنے ذہنی تحریفات اور ذہنی تصرفات سے اس میں تفرقے پیدا کیے اور آپس کی ضد اور تعصبات سے الگ الگ فرقہ واری کی راہیں نکالیں' پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس وحدت دین کی حقیقت کا یقین اہل کتاب کو نہیں ہے حالانکہ وہ شکوک و شبہات کے دلدل میں پھنسے ہیں، پھر حکم ہوتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ تو اس حقیقت کی طرف لوگوں کو بلا اور استواری کے ساتھ اپنی اس دعوت اور دعویٰ پر قائم رہ اور یہ اعلان کر دے کہ میرا مسلک یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کتاب بھی دنیا میں آئی ہے میں اسکی صداقت کو تسلیم کرتا ہوں اور تم سے اے اہل کتاب جو مختلف فرقوں اور مذہبوں میں بٹ گئے ہو ان کے ساتھ انصاف کروں یعنی جس میں جو سچائی ہے اسکو قبول کروں یا معاملات میں ان کے ساتھ عدل و انصاف کروں، پھر فرمایا ہمارا اور تمھارا خدا ایک ہی ہے دو نہیں' اگر اتحاد چاہو تو اس نقطہ پر ہم تم متحد ہو سکتے ہیں البتہ ہمارے اور تمھارے راستوں میں جو اختلاف ہے' اس کے ذمہ دار ہم اور تم خود ہیں، ہمارے کام کے تم جوابدہ نہیں اور تمھارے کام کے ہم جوابدہ نہیں' اب ہمارے تمھارے درمیان یہاں کوئی جھگڑا نہیں۔

اسی وحدت کی دعوت محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی نے ایک اور آیت میں دی ہے

﴿ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْـًٔا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴾ (آل عمران)

اے ایمان والو! آؤ ہم تم ایک بات پر جو ہمارے تمھارے درمیان یکساں ہے' متفق ہو جائیں' وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک بنائیں اور نہ آپس میں ایک خدا کو چھوڑ کر رب بنائیں' اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو کہہ دے کہ تم گواہ رہو کہ ہم حکم الٰہی کے تابع (مسلم) ہیں۔

یہود و نصاریٰ جنہوں نے اپنی فرقہ واریوں سے اصل دین میں تحریفیں پیدا کر دی تھیں' ان کی طرف اشارہ کر کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴾ (انعام)

بے شک وہ جنہوں نے اپنے دین میں الگ الگ راہیں نکالیں اور کئی فرقے ہو گئے' تجھ کو ان سے کوئی کام نہیں' ان کا کام اللہ کے حوالے ہے' وہی ان کو جتا دے گا جیسا کچھ وہ کرتے تھے۔

پھر دونوں کو اس کے بعد ہی اصل ''دین قیم'' کی جو ابراہیم کا تھا، دعوت دی گئی۔

﴿ قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰنِیْ رَبِّیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴾ (انعام)

کہہ دے کہ میرے خدا نے اس سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کی جو دین صحیح ہے، ابراہیم کی ملت اور وہ (ابراہیم) مشرکوں میں سے نہ تھا۔

غرض اسلام وہ ''دین قیم'' ہے جو ہمیشہ سے انبیاء کا دین رہا اور موجودہ دین اسلام یہود و نصاریٰ کی تحریفات اور تصرفات اور فرقہ پروریوں کو مٹا کر اسی ایک متحدہ دین کی پکار ہے، جس کی طرف انبیاؑ اپنے اپنے زمانوں میں ہمیشہ لوگوں کو پکارتے رہے، اسی لئے اکثر انبیاء علیہم السلام کے ناموں کو گنانے کے بعد محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ ہدایت فرمائی گئی۔

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ﴾ (انعام)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی، سو تو انہیں کی راہ پر چل۔

بعض اسلامی حدود و شرائع کے بعد فرمایا گیا۔

﴿ یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُبَیِّنَ لَكُمْ وَیَهْدِیَكُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ (نساء)

خدا چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے بیان کرے اور تم کو ان کے راستے دکھائے جو تم سے آگے تھے۔

اس کے بعد معلوم ہوا کہ اسلام اپنے حدود و شرائع میں بھی اگلے پیغمبروں کی تعلیمات کے ساتھ اتحاد رکھتا ہے اور یہ امر واقعہ ہے، جو لوگ قرآن کا اس لئے انکار کرتے تھے کہ یہ کوئی الگ صحیفہ ہے، ان سے یہ کہا گیا۔

﴿ اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی ﴾ (اعلیٰ)

بے شبہ یہ بات اگلے صحیفوں میں بھی تھی، یعنی ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔

ایک اور آیت میں کہا گیا:

﴿ وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ﴾ (شعراء)

اور یہی پہلے پیغمبروں کی کتابوں میں تھا۔

ایک مقام پر یہ فرمایا گیا۔

﴿ مَا یُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِیْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ﴾ (حم السجدہ)

(اے محمد) تجھ سے (اس کتاب میں) وہی کہا گیا ہے جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا

اس اعلان میں یہ ظاہر کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو وہی کہا گیا جو اگلے پیغمبروں سے کہا جا چکا تھا، ان معنوں میں قرآن کوئی نئی دعوت لے کر نہیں آیا، بلکہ اسی پرانی دعوت کی یہ تکرار ہے، جس کی آواز دنیا سے گم ہو چکی تھی یا دب گئی تھی، اگر فرق ہے تو اجمال و تفصیل یا نقص و تکمیل کا کہ اسلام گذشتہ اجمال کی تفصیل اور دین سابق کی تکمیل ہے۔

اس لئے اسلام یہ ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ وحی کے آغاز سے آخر تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا اور ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا اور ایک ہی حقیقت تھی جو دہرائی جاتی رہی، لیکن وہ بار بار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرف

وتحریف سے بدلتی اور گم ہوتی رہی اور آخری دفعہ دنیا کے کمال بلوغ کے زمانے میں وہ پوری طاقت کے وعدہ کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے مفصل اور کامل ہو کر نازل ہوئی اور وہ قیامت تک محفوظ اور باقی رہے گی۔

دوسری چیز جس کی مذہب میں ثانوی حیثیت ہے اور جو اصل مقصد نہیں ذریعہ ہے، وہ بدلتی رہتی ہے اور عہد محمدی تک بدلتی رہی ہے، اس کا نام شرعۃ، منہاج اور منسک ہے، یہودیوں کو آنحضرت ﷺ پر اعتراض تھا کہ وہ یہودی شریعت کے جزئیات میں کیوں تبدیلی کرتے ہیں، قرآن نے اس کے جواب میں ہمیشہ یہی کہا کہ یہ مقصود نہیں، ذرائع ہیں، اصول نہیں فروع ہیں، ہر قوم کی مناسبت سے ان میں تغیر ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اس کی ایک مثال قبلہ ہے کہ مقصود اصلی نماز ہے اور سمت کا تعین ایک فرعی اور ثانوی چیز ہے، حضرت داؤد کی اولاد بنی اسرائیل کو اپنی آبائی مسجد (بیت المقدس) سے گرویدگی تھی، وہ ان کا قبلہ ہوئی، ابراہیمی عربوں کو اپنی مرکزی مسجد (کعبہ) سے وہی وابستگی اور لگاؤ تھا، اس لئے یہ ان کا قبلہ بنی چنانچہ قرآن نے تعیین قبلہ کے موقع پر کہا۔

﴿ وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ﴾ (بقرہ)

اور ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے جدھر وہ منہ کرتا ہے، سو تم نیکیوں کی طرف سبقت کرو۔

یعنی سمتوں اور جہتوں کی تعیین کو اہمیت کی چیز نہ سمجھو، بلکہ نیکیوں کو اصلی اہمیت دو۔ اسی لئے فرمایا:

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ﴾ (بقرہ)

نیکی یہی نہیں ہے کہ تم پورب یا پچھم کی طرف رخ کرو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو ایمان لائے (اور دوسرے نیک کام کرے)

اسی طرح خانہ کعبہ کا حج یہودیوں میں نہ تھا، اسلام نے جب اس کو رائج کیا تو کہا ہر مذہب نے اپنے لئے عام مذہبی اجتماع اور قومی عبادت کے لئے کوئی نہ کوئی طریقہ مقرر کیا ہے، اسلام نے خانہ کعبہ کے حج کو اس کے لئے متعین کیا۔

﴿ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ط اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَاِنْ جَادَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴾ (حج ۶۸۔۶۷)

ہر قوم کے لئے ہم نے عبادت کا ایک طریقہ بنایا کہ اس قوم کے لوگ اس طرح بندگی ادا کرتے ہیں سو اس بات میں وہ تجھ سے جھگڑا نہ کریں، تو اپنے رب کی طرف بلائے جا، تو بے شک سوجھ کی سیدھی راہ پر ہے اور اگر وہ تجھ سے جھگڑنے لگیں تو کہہ دے کہ اللہ بہتر جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔

سورہ مائدہ میں عدل و انصاف اور قانونی جزا و سزا کے طریقوں کے ضمن میں ان یہودیوں اور عیسائیوں کو جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا یہی کہا گیا کہ وہ اپنی اپنی کتابوں ہی کے احکام پر عمل کریں، جن کو وہ چھوڑ بیٹھے ہیں۔

پہلے یہودیوں کو کہا۔

﴿ اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ﴾ (مائدہ)

ہم نے تورات اتاری، اس میں ہدایت اور روشنی تھی، پیغمبر جو حکم بردار تھے وہ یہود کا فیصلہ کرتے، اور ان کے عالم اور فقیہ کہ اللہ کی کتاب پر وہ نگہبان تھے، اور وہ تھے اس پر خبردار۔

پھر عیسائی شریعت کی نسبت کہا:

﴿ وَقَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ﴾ (مائدہ۔۴۷۔۴۶)

اور ہم نے ان پیغمبروں کے پیچھے مریم کے بیٹے عیسیٰؑ کو بھیجا سچ بتاتا ہوا اسکو جو اس کے پہلے تھا یعنی تورات، اور ہم نے انجیل دی، اس میں ہدائت اور روشنی اور تصدیق کرتی ہوئی اپنے سے پہلے کی یعنی تورات کی، اور ہدایت اور نصیحت پرہیزگاروں کے لیے، اور چاہئے کہ انجیل والے اس کا حکم دیں جو اس میں خدا نے اتارا۔

اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے کہا:

﴿ وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ﴾ (مائدہ۔۴۸)

اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب سچائی کے ساتھ اتاری، جو اپنے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے، اور امانت کے ساتھ اس پر شامل ہے، سو تو ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر جو خدا نے اتارا، اور تیرے پاس جو سچائی آئی ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔

دیکھ کہ کس خوبی کے ساتھ صحیفہ محمدی نے اگلی کتابوں کی تصدیق اور مدح و تعریف کی اور ان اہل مذاہب کو جو اسلام پر ایمان نہیں لائے اپنی اپنی کتب منزلہ پر عمل کرنے کی دعوت دی اور پھر یہ دعویٰ کیا کہ قرآن تمام گذشتہ کتابوں پر امین و محافظ بن کر آیا ہے اور اس میں ان سب کتابوں کی سچائیاں یکجا ہیں، لیکن ان لوگوں نے اپنی اپنی کتابوں کو چھوڑ کر اہواء (غلط خواہشوں) کی پیروی شروع کر دی۔ یہ اہواء کیا ہیں، کتاب الٰہی میں تحریف و تصرف کر کے آسانیاں پیدا کرنا اور احکام الٰہی کے مقابلہ میں انسانی اجتہادات کی آمیزش۔

﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾ (بقرہ)

افسوس ہے ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب بناتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔

آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ اپنی شریعت الٰہی کو چھوڑ کر ان اہل کتاب کی اہواء کی پیروی نہ کر، اس کے بعد حدود اور جزاوسزا میں ان خفیف اختلافات اور تبدیلیوں کو جو تورات انجیل اور قرآن میں ہیں غیر اہم بتایا گیا فرمایا:

﴿ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ﴾ (مائدہ)

ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک دستور اور ایک راستہ بنا دیا۔

انہی اختلافات کی بنا پر یہود اور نصاریٰ دونوں ایک دوسرے کو برسر باطل کہتے تھے:

﴿ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ﴾ (بقرہ)

اور یہود نے کہا نصاریٰ کچھ راہ پر نہیں، اور نصاریٰ نے کہا یہود کچھ حق پر نہیں، حالانکہ وہ دونوں خدا کی کتاب پڑھتے ہیں

دونوں مل کر مسلمانوں سے کہتے تھے۔

﴿ وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ﴾ (بقرہ)

اورانہوں نے کہا کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔

ارشاد ہوا کہ تم دونوں اپنے الگ الگ راستوں کو چھوڑ کر آ ؤ اور اصل دین ابراہیمی پر متفق ہو جاؤ۔

﴿ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِىْ شِقَاقٍ ﴾ (بقرہ)

کہہ بلکہ ابراہیمؑ کے دین کی پیروی کرو، جو موحد تھا مشرک نہ تھا اور کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اترا اور جو ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور جو سب نبیوں کو ان کے خدا کی طرف سے دیا گیا، سب پر ایمان لائے ہم ان رسولوں میں فرق نہیں کرتے اور ہم اس ایک خدا کے تابع ہیں تو اگر یہ بھی اسی طرح ایمان لائیں، جس طرح تم ایمان لائے تو انہوں نے ہدایت پائی اور اگر روگردانی کریں تو وہی ہیں ضد اور مخالفت پر۔

یہود و نصاریٰ کو یہ دعویٰ تھا:

﴿ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ﴾ (بقرہ)

یہود اور نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا۔

جواب دیا گیا۔

﴿ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ﴾ (بقرہ)

یہ ان کی باطل آرزوئیں ہیں۔

بلکہ ﴿ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۱۱۲)

ہاں جس نے بھی اپنے کو خدا کا مطیع بنایا اور وہ نیکوکار ہے، تو اس کی مزدوری اس کے خدا کے پاس ہے نہ ان کو خوف ہو گا اور نہ غم۔

تمام اہل مذاہب کو یکساں خطاب کر کے فرمایا۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۶۲)

بے شک جو ایمان لائے (یعنی مسلمان) اور جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابیٔ جو بھی خدا پر اور آخری دن پر ایمان لایا اور نیک عمل کیا تو ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس ہے نہ ان پر خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اب جو ایمان لائے یعنی مسلمان اور جو یہودی ہے، اور نصاریٰ اور صابئین ان میں سے جو بھی اپنے اپنے دور

نبوت میں خدا کی توحید پر روز آخر کی صداقت پر ایمان لایا اور اچھے عمل کئے ان کو اپنے کام کا پورا پورا ثواب ملے گا۔ یعنی جس نے بھی اپنے اپنے پیغمبر کی اصلی تعلیم اور سچی شریعت کے مطابق جو شرک و کفر و بت پرستی سے یقیناً پاک تھی عمل کیا اس کو اس کا ثواب ملے گا' خدا کی توحید اور روزِ آخر کی صداقت پر ایمان لانا اور اچھے کام کرنا صرف عقل کی ہدایت سے نہیں ہوسکتا' بلکہ کسی رسول کی تعلیم ہی سے ہوسکتا ہے' جیسا کہ تمام اہل مذاہب کا متفقہ مسئلہ ہے' اس لئے رسالت کی تصدیق بھی اس کے ضمن میں داخل ہے کہ

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا ۝ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکَافِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا ۝ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ اُولٰٓئِکَ سَوْفَ یُؤْتِیْھِمْ اُجُوْرَھُمْ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴾ (نساء)

بے شک جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں جدائی کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں کہ وہ اس میں درمیان کا راستہ اختیار کریں' وہی حقیقی کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لئے اہانت کرنے والا عذاب تیار کیا ہے' اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کا بھی انکار نہیں کیا' یہ وہ ہیں جن کو ان کی مزدوریاں خدا دے گا' اور خدا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

دوسری آیت میں ہے۔

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ﴾ (نور)

مومن وہی ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔

اس بنا پر ان آیتوں سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ قبول عمل کے لئے ایمان شرط ہے اور دوسرے یہ کہ ایمان و عمل کے علم کے لئے نبی کی تصدیق ضروری ہے' اسی لئے اوپر جن چار فرقوں کا ذکر ہوا ہے وہ چاروں وہ ہیں جو کسی نہ کسی پیغمبر کو ماننے والے ہیں، اس بناء پر کامل اسلام یہ ہے کہ تمام رسولوں کو صادق مانا جائے چنانچہ اس کی تفصیل سورۂ مائدہ میں ہے۔

﴿ قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰی شَیْءٍ حَتّٰی تُقِیْمُوا التَّوْرٰۃَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَیَزِیْدَنَّ کَثِیْرًا مِّنْھُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ طُغْیَانًا وَّکُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا وَالصَّابِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴾ (مائدہ۔ ۶۹۔ ۶۸)

کہہ دے اے کتاب والو! تم کچھ نہیں جب تک تم توراۃ اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف اتارا گیا اس کو قائم نہ کرو اور (اے پیغمبر) جو تیری طرف اُترا ہے وہ ان کی سرکشی اور انکار کو اور بڑھائے گا' تو ان منکروں کا غم نہ کر، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہوئے اور صابئ اور عیسائی جو خدا پر اور روز قیامت پر ایمان لایا اور اچھے کام کئے تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس کے بعد ہی اس کا ذکر ہے کہ یہودیوں نے ہمیشہ رسولوں کا انکار کیا' اور نصاریٰ توحید کو چھوڑ کر تثلیث اور الوہیت مسیح میں مبتلا ہو گئے اس لئے اصل اسلام سے یہ دونوں ہٹ گئے فرمایا۔

﴿ لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ط كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ ۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ○ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ط وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ ۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ○ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ط وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ○ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ م وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ط وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (مائدہ۔۷۳۔۷۰)

بے شک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا' اور ان کی طرف کئی رسول بھیجے، جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی نفسانی خواہشوں کے خلاف احکام لے کر آیا تو کتنوں کو جھٹلایا اور کتنوں کا خون کرنے لگے اور خیال کیا کہ اس سے کچھ خرابی نہ ہوگی سو اندھے ہو گئے اور بہرے' پھر خدا ان پر رجوع ہوا اور ان میں بہتیرے اندھے اور بہرے ہوئے اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں' بے شبہ وہ کافر ہوئے جنہوں نے یہ کہا کہ مریم کا بیٹا مسیحؑ ہی اللہ ہے مسیحؑ نے تو یہ کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کو پوجو جو میرا اور تمہارا رب ہے بے شک جو اللہ کو شریک بنائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی' اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور گنہگاروں کی کوئی مدد کرنے والا نہیں، بے شبہ وہ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں تیسرا ہے' حالانکہ کوئی اللہ نہیں مگر وہی ایک' اگر وہ اپنے اس قول سے باز نہ آئے تو ان میں سے کافروں کو یقیناً دردناک عذاب چھوئے گا۔

یہ تو ان یہود و نصاریٰ کے ایمان کا حال تھا اس کے بعد اسی رکوع میں ان کے "حسن عمل" کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے بعد ہی ان سے کہا گیا ہے۔

﴿ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴾ (مائدہ۔۱۸)

اور اگر اللہ اور اس نبی پر اور جو اس نبی پر اترا اس پر یہ ایمان لے آتے' تو ان مشرکوں کو وہ اپنا دوست نہ بناتے لیکن ان میں اکثر نافرمان ہیں۔

اسلام یعنی تمام نبیوں اور رسولوں کے واحد مشترک دین کا اصل الاصول دو باتیں ہیں توحید کامل اور رسالت عمومی' یعنی اللہ تعالیٰ کو توحید کی تمام صفتوں میں کامل بلاشریک ماننا اور اس کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں صادق اور راست باز تسلیم کرنا چنانچہ فرمایا:

﴿ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ○ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ

وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰی وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّھِمْ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ ○ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴾ (آل عمران۔۸۳تا۸۵)

کیا وہ دین الٰہی کے سوا اور کوئی دین چاہتے ہیں، حالانکہ جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خوشی سے یا مجبوراً خدا کا مسلم یعنی فرمانبردار ہے اور اسی کی طرف سب لوٹائیں جائیں گے (اے پیغمبر) کہہ کہ ہم اللہ پر اور جو اس نے ہم پر اتارا اور جو ابراہیم اور اسمٰعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور ان کی اولادوں پر اُترا، اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور سب پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے ملا، ہم سب کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں، ان میں سے کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے، اور ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے گا تو وہ اس سے قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔

اسی آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا پر اور تمام رسولوں پر ایمان لانا دین اللہ ہے اور اسی کا نام اسلام ہے۔ جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا آل عمران میں ہے کہ یہود و نصاریٰ تاویلات باطلہ اور اتباع متشابہات کی وجہ سے گمراہ ہوگئے، یعنی دین اسلام سے روگرداں ہوگئے اور اختلافات میں پڑ گئے، فرمایا

﴿ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْیًاۢ بَیْنَھُمْ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ○ فَاِنْ حَآجُّوْکَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْھِیَ لِلّٰہِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ﴾ (آل عمران۔۲۰۔۱۹)

بے شک دین خدا کے نزدیک اسلام ہے، اور جن کو کتاب دی گئی انہوں نے علم آنے کے بعد اس میں آپس کی ضد کے سبب سے اختلاف کیا اور جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرے گا تو اللہ جلد حساب لینے والا ہے، تو اگر اے پیغمبر یہ تجھ سے پھر کج بحثی کریں، تو کہہ دے کہ میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اپنے کو خدا کا تابع فرمان (مسلم) کر دیا ہے

اسی کے بعد آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ سے سوال کریں کہ وہ اس اسلام کو قبول کرتے ہیں یا نہیں؟

﴿ وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اھْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ وَاللّٰہُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴾ (آل عمران)

اور اے پیغمبر، ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ دے کہ کیا تم نے بھی اسلام قبول کیا، اگر کیا تو انہوں نے سیدھی راہ پائی، اور اگر انکار کیا تو تجھ پر صرف پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کو دیکھتا ہے۔

یہود و نصاریٰ کو اس اسلام کے قبول کرنے پر ہدایت نامہ ملنے کی بشارت ہوتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ''ہدایت نامہ'' ہے کہ وہ دین اسلام جس کو یہود و نصاریٰ اور تمام اہل مذاہب نے جو کسی گذشتہ پیغمبر کی اُمت ہوں کھو دیا تھا اور اب جس کو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ دوبارہ دنیا میں پیش کیا گیا ہے اس لئے جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی وہ ناقص تھی اور اسلام جس کو لے کر آیا وہ کامل ہے نیز یہ معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ اب جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور نصرانی اور صابئ جو بھی خدا اور یوم آخر پر ایمان لایا اور اس نے نیک کام کیا اس کو خوف و غم نہ ہوگا ان میں خدا پر ایمان لانے سے مقصود ''توحید کامل'' ہے اور اس کا یہ منشاء نہیں کہ یہود و نصاریٰ اور صابئ وغیرہ اپنے موجودہ گمراہ

عقیدوں کے ساتھ نجات کلی کے مستحق ہیں یہود و نصاریٰ کیا، مسلمان بھی اس توحید کامل کے بغیر نجات کلی کے مستحق نہیں جب تک ایمان اور عمل صالح ٹھیک اس تعلیم کے مطابق نہ ہوں جو ان کے رسول کے ذریعہ دنیا میں آئی ہے یہ اصول ہر ایک کے لئے ہے خواہ وہ مسلمان ہو، یا یہودی ہو، یا عیسائی ہو یا صابی ہو غرض کسی نبی کی پیروی کا مدعی ہو۔

نبوت محمدی کا دعویٰ یہ نہیں کہ وہی ایک ہدایت ہے اور اس کے سوا سب ضلالت ہے، بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہی ایک کامل ہدایت ہے اور بقیہ مذاہب سابقہ موجودہ حالات میں سب ناقص ہیں یعنی وہ ابدی کامل ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں سب نبی لے کر آتے رہے اور ان کے پیرو اپنے تاویلات، تحریفات، تصرفات اور اختلافات سے اس کو برباد کر چکے تھے اسی کو لے کر آخری دفعہ محمد رسول اللہ ﷺ آئے اور اب وہ ہدایت ہمیشہ کامل رہے گی، پھر کبھی ناقص نہ ہوگی کہ اس کا صحیفہ ہدایت (قرآن) تحریف واختلاف وتصرف سے محفوظ و پاک رہے گا۔

یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو نبوت محمدی کی دعوت جہاں دی گئی ہے، ہدایت کی بشارت سنائی گئی ہے چنانچہ اسی آیت میں جو ابھی اوپر گذری یہ ہے۔

﴿ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ﴾ (آل عمران۔۲۰)

اور اے پیغمبر! ان سے جن کو کتاب دی گئی، اور عرب کے جاہلوں سے کہہ کیا وہ اسلام لائے اگر اسلام لائے، تو انہوں نے سیدھی راہ پائی۔

سورۂ بقرہ میں ہے۔

﴿ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ﴾ (بقرہ۔۱۳۷۔۱۳۶)

(اے مسلمانو!) کہو کہ ہم اللہ پر اور جو ہم پر اترا اور جو ابراہیم پر اور اسمٰعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور ان کی اولاد پر اترا اور جو موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، سب پر ایمان لائے اور ہم ان میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے، اور ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں، تو اگر یہ بھی اسی طرح مانیں جس طرح تم نے مانا تو انہوں نے سیدھی راہ پائی اور اگر وہ اس سے باز رہیں تو وہ محض ضد میں ہیں۔

یہود و نصاریٰ اور اہل کتاب کو تعلیم محمدی کی طرف دعوت اسی ''ہدایت'' کے پانے کے لئے ہے جو اسلام یعنی انبیاء کے دین ازلی سے عبارت ہے اور جس کو لے کر محمد رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے اور فلاح ونجات کامل اب اسی کے ماننے میں منحصر ہے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۙ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۵۔۴)

جو اس کو جو تیری طرف (اے پیغمبر!) اترا، اور جو تجھ سے پہلے اترا دونوں کو مانتے ہیں اور پچھلی زندگی پر یقین رکھتے ہیں وہی اپنے پروردگار کی ہدایت پر ہیں، اور وہی کامیاب ہیں۔

حضرت موسیٰؑ کے قصہ کے بعد فرمایا کہ رحمت الٰہی گو عام ہے مگر یہ نعمت خاص طور سے ان کا حصہ ہے جو تعلیم محمدی کو قبول کریں اور وہی نجات کامل کے مستحق ہیں۔

﴿ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ فَسَاَکْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ۞ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَکْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞ قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعَا ۨ الَّذِیْ لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَکَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ (اعراف۔ ۱۵۶۔۱۵۸)

اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہے پھر اس رحمت کو میں ان کے لئے لکھ دوں گا جو پرہیز گار ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور جو ہمارے حکموں کو مانتے ہیں، جو اس ان پڑھ فرستادہ پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں، جس کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں جو ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے باز رکھتا ہے اچھی چیزوں کو ان کے لئے حلال کرتا ہے اور بری چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان کے بندھن کو اور ان زنجیروں کو جو ان پر پڑی تھیں اتارتا ہے تو جنہوں نے اس پیغمبر کو مانا اور اس کی تائید کی اور اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے چلے جو اس کے ساتھ اُتری وہی کامیاب ہیں کہہ دے (اے پیغمبر) کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں جس کی آسمانوں اور زمین کی شہنشاہی ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں، وہی جلاتا اور وہی مارتا ہے، سو اللہ اور اس کے اس ان پڑھ پیغام رساں رسول پر ایمان لاؤ جو اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے' اور اس رسول کی پیروی کرو تا کہ تم سیدھی راہ پاؤ۔

ان آیات میں صاف ظاہر کر دیا گیا کہ گذشتہ مذاہب کے پیروؤں کو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا اس لئے ضروری ہے کہ وہ دین خالص جو انسانی تصرفات اور آمیزشوں سے مکدر ہو گیا تھا وہ صحف الٰہی کی پیشین گوئیوں کے مطابق آپ کے ذریعہ پھر نکھارا گیا ہے اور جن اضافوں اور جزئیات احکام کی سختیوں کو انسانوں نے اس میں شامل کر دیا تھا وہ آپ کے ذریعہ دور کی گئیں' اور نیز آپ عالمگیر پیغمبر بن کر مبعوث ہوئے' اس لئے ہدایت نامہ نبوت عمومی اور نجات کامل اور فلاح عام اب وحی محمدی کے اندر محدود ہے۔

الغرض دین محمدی کو قبول کرنا اس لئے تمام انسانوں پر ضروری ہے کہ وہ دین ازلی جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو اس کے پیروؤں کی تحریف و تصرف سے برباد ہو گیا تھا اسی کو صحیفہ محمدی لے کر آیا اور اب وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا کیونکہ اس کا نبی خاتم النبیین' اس کا دین کامل دین اور اس کا صحیفہ تمام صحف الٰہی پر مہیمن اور حاوی ہے اور قیامت تک خدا کی طرف سے اس کی پوری حفاظت اور بقا کا وعدہ کیا گیا ہے' یہ چاروں دعوے تکمیل دین' قران کا مہیمن ہونا' قیامت تک اس کا محفوظ و

باقی رکھنا اور ختم نبوت حسب ذیل دلائل سے ثابت ہیں۔

تکمیلِ دین:

قرآن کے سوا کسی اور صحیفہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مکمل ہے اور اس کے ذریعہ دین الٰہی اپنے تمام اصول اور فروع (مناسک و مناہج و شرائع) کی حیثیت سے تکمیل کو پہنچ گیا، بلکہ گذشتہ مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے وقت میں یہی کہا کہ اس کے بعد ایک اور نبوت آئے گی، جو اس کے کام کی تکمیل کرے گی خدا نے حضرت موسیٰ سے فرمایا۔

''میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا، اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا'' (استثنا ۱۸۔۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد ان کے مانند ایک اور نبی آنے والا تھا جس کے منہ میں اللہ تعالیٰ خود اپنا کلام ڈالے گا، اس سے ثابت ہوا کہ موسیٰؑ کی طرح ایک اور صاحب شریعت نبی خدا کے نئے کلام کے ساتھ آئے گا اسی طرح حضرت عیسیٰؑ نے بھی کہا۔

''لیکن وہ فارقلیط (احمد) پاکیزگی کی روح ہے جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں، تمہیں یاد دلائے گا'' (یوحنا ۱۴۔۲۶)

''اور وہ فارقلیط (احمد) آکر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے قصوروار ٹھہرائے گا، گناہ اس لئے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے، میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں، پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے، لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی، اس لئے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ وہ سنے گی، سو کہے گی، میری بزرگی کرے گی۔ (یوحنا ۱۶۔۸)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی اپنے کلام کو ہنوز نا تمام ہی فرمایا اور ایک آئندہ آنے والے کا پتہ دیا جو اس کی تکمیل کرے گا۔

آخر وہ موعود الامم ﷺ آیا اور دعویٰ کیا کہ میں موسیٰ کے مانند بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے آیا ہوں اور میرے منہ میں خدا نے اپنی بولی ڈالی ہے اور یہ دعوی کیا کہ میں ہی وہ سچائی کی روح ہوں، جو مسیح کی اصلی بڑائی ظاہر کرنے، سچائی کی راہ بتانے اور مسیح کی ادھوری بات کو کامل کرنے کے لئے آیا ہوں، میں اپنی نہیں کہتا بلکہ وہی کہتا ہوں جو اوپر سے سنتا ہوں اور آخر منصب نبوت کے ختم پر وحی الٰہی نے آپ کی زبان سے یہ اعلان عام کیا۔

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (مائدہ۔۳)

آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا، اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی، اور تمہارے لئے اسلام کا دین پسند کیا۔

اسی تکمیل کا یہ اثر تھا کہ اس نے یہود کے بعض سخت فقہی احکام جو ان کی سخت گیری کے لئے ان پر عائد تھے، اور اصل دین ابراہیمی میں داخل نہ تھے [1] یا انسانوں کے اضافے اور تصرفات تھے بدل کر ایسے مناسب اور آسان احکام

---

[1] دیکھو آیت كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ الایہ (آل عمران۔۱۰)

نازل کئے جو ہر زمانہ کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں اسی لیے قرآن نے کسی اپنے بعد میں آنے والے پیغمبر کی پیشین گوئی نہیں کی نہ کسی کلام کے نزول کی خبر دی نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا کہ تکمیل کے بعد اب کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کا موقع کہاں؟ اور اسی بنا پر قرآن نے ہر جگہ ﴿وَمَآ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ﴾ (جو محمد سے پہلے نازل کیا گیا) پر ایمان لانے کی تاکید کی، لیکن ﴿وَمَآ اُنۡزِلَ مِنۡ بَعۡدِكَ﴾ کے قبول کرنے کا کہیں اشارہ تک بھی نہیں۔

قرآن مہیمن کتب ہے:

اس دین کامل کا صحیفہ تمام اگلی کتابوں کا مصدق ہے۔

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ﴾ (مائدہ۔۷)

اپنے آگے کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا۔

وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہے اس لیے جو کوئی اس صحیفہ کو قبول کرتا، ہے وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کو قبول کر لیتا ہے یہ حیثیت قرآن کے سوا کسی دوسرے صحیفہ کو حاصل نہیں، فرمایا:

﴿وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَيۡمِنًا عَلَيۡهِ﴾ (مائدہ)

اور ہم نے (اے محمد) تیری طرف سچائی کے ساتھ یہ کتاب اتاری جو اپنے سے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے، اور اس پر شاہد و حاوی ہے۔

لفظ مہیمن کی تفسیر اہل زبان مفسروں نے یہ کی ہے۔

ابن عباسؓ : شاہد اور امین قرآن، اپنے پہلے کی ہر کتاب کا امین ہے۔

قتادہ: قرآن سے پہلے جو کتابیں بھی تھیں، قرآن ان کا امین اور شاہد ہے۔

غرض قرآن اگلی کتابوں کی صداقتوں اور سچی تعلیموں کی امانت اپنے اندر رکھتا ہے۔

قرآن محفوظ ہے اور رہے گا:

پیغمبر کی تعلیم کی حفاظت اس کے صحیفہ الٰہی کی حفاظت پر موقوف ہے، قرآن سے پہلے کوئی کتاب الٰہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے تمام تر بری نہیں رہی۔ لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں، اور جو باقی ہے وہ فنا ہو کر نئے نئے قالب میں بدلتا رہا ہے تورات جل جل کر خاک ہوئی اور پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر ہوئی پھر ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی، انجیل میں تحریف وجعل تو اسی زمانہ میں شروع ہو چکا تھا پھر مترجموں کی کثرت بیونت نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی زردشت کا صحیفہ سکندر کے نذر ہوا اور اب صرف گاتھا کا ایک حصہ بچا کھچا رہ گیا ہے ان کتابوں کا یہ حال اس لیے ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دائمی اور آخری مذہب بنا کر نہیں بھیجا تھا اسی بنا پر ان کی دائمی حفاظت کا وعدہ نہ تھا، لیکن قرآن کی نسبت یہ وعدہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے باقی اور محفوظ رہے گا اس کی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی اور فرمایا اور کس وثوق سے فرمایا

﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾ (حجر)

ہم نے اس نصیحت کی کتاب کو اتارا، اور بے شبہ ہم ہیں اسکی حفاظت کرنے والے۔

یہ وعدہ الٰہی ایک اور دوسری آیت میں ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے

﴿ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ ﴾ (قیامہ)

بے شک ہمارے ذمہ ہے اس قرآن کو سمیٹ کر رکھنا، اور اس کا پڑھنا، پھر جب ہم پڑھیں تو تو اس کے پڑھنے کے ساتھ رہ، پھر بے شبہ ہم پر ہے اس کو کھول کر بتانا۔

اس آیت میں قرآن کی قراءت یعنی لفظ وعبارت اور بیان یعنی معنی دونوں کی ذمہ داری خدائے تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے ایک تیسری آیت میں اس کی تصریح ہے کہ اس حق میں باطل کی آمیزش کبھی راہ نہ پا سکے گی، فرمایا

﴿ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِیْزٌ ۝ لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَكِیْمٍ حَمِیْدٍ ﴾ (حم السجدہ۔۴۲۔۴۱)

اور بے شک یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو غالب ہے، باطل نہ اس کے سامنے سے اور نہ اس کے پیچھے سے اس کے پاس آئے گا، ایک حکمت والے اور خوبیوں والے کی طرف سے اُترا۔

اس کتاب کو غالب فرمایا گیا ہے یعنی جو اپنے ہر حریف کو اپنے دلائل کے زور سے پست کرے گی باطل نہ اس کے سامنے سے اس میں مل سکتا ہے اور نہ پیچھے سے یعنی نہ لفظ وعبارت کی طرف سے اور نہ حقیقت ومعنی کی جہت سے، کیونکہ وہ ایک حکمت والے کی طرف سے اتری ہے، اس لئے وہ اپنی حکمت ودانائی کی تعلیم سے غالب رہے گی، اور چونکہ وہ ایک سراسر خوبیوں والے کی جانب سے عطا ہوئی ہے اس لئے یہ بھی ہر باطل کے عیب سے پاک رہے گی۔

یہ قرآن کا اپنا دعویٰ ہے اور ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔

ختم نبوت:

مقدمات بالا کا نتیجہ گو خود یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی نبی کی، قرآن کے بعد کسی صحیفہ کی اور اسلام کے بعد کسی دین کی ضرورت نہ ہو، لیکن وحی محمدی نے ہر شک کے ازالہ کے لئے آگے بڑھ کر یہ تصریح بھی کر دی کہ اب نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اب آپ کے بعد کسی نبی کی حاجت نہیں، کہ دین کامل اور صحیفہ الٰہی محفوظ ہو چکا اور ہدایت ربانی کے دروازہ کے بند ہونے کا خطرہ دور ہو گیا اور خود تاریخ انسانی گواہ ہے کہ بعثت محمدی کے بعد سے دنیا کی حالت بدل گئی متفرق قومیں پیوستہ ہو گئیں زمین کے کونے ایک دوسرے سے مل گئے اور توحید کامل کا غلغلہ عرش سے فرش تک بلند ہو گیا اور خدا کے تمام رسولوں کو سچا اور صادق ماننے کا ولولہ آہستہ آہستہ ترقی پانے لگا یہاں تک کہ ان قوموں نے بھی جو مسلمان نہیں ہوئیں ان دونوں صداقتوں کو اصولاً تسلیم کر لیا۔

وحدت ادیان اور دین اسلام:

تفصیل بالا کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ وحدت ادیان کا منشاء کیا ہے یعنی یہ کہ اصل میں ایک ہی دین ہے جو تمام انبیاء کا مذہب رہا لیکن وہ بعد کو ان کے پیروؤں کے صحائف میں تحریف وتصرف کے سبب سے بگڑتا رہا اسی دین ازلی کو لے

کر محمد رسول اللہ ﷺ آئے اور اسی کا نام اسلام ہے جو اپنے صحیفہ کی بقا اور حفاظت اور دین کی تکمیل اور نبوت کے اتمام کے سبب سے ہمیشہ قائم و باقی رہے گا' اگر تمام مذاہب سابقہ اپنے اپنے اس اصل دین پر آ جائیں جس کی تعلیم ان کے پیغمبروں نے دی تھی تو وہ وہی دین ازلی ہوگا جس کا نام اسلام ہے اور نوحی، ابراہیمی، موسوی، عیسوی اور محمدی دینوں میں سوائے اجمال و تفصیل کے کوئی فرق نہ رہے گا اسی لئے فرمایا گیا۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ﴾ (نساء۔۴۷)

اے وہ لوگو جن کو پہلے کتاب دی گئی' اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور ان کو پیٹھ کی طرف پھیر دیں یا سبت کے گنہگاروں پر جس طرح لعنت کی تھی ہم ان پر لعنت کریں' اس وحی پر ایمان لاؤ جو ہم نے اب اتاری قرآن (جو) ان تعلیمات کی جو تمہارے پاس ہیں' تصدیق کرتی ہے۔

مشرکین عرب سے زیادہ اہل کتاب ہی کو اس حقیقت کے سمجھنے کا زیادہ استحقاق تھا اس لئے انہی کو سب سے پہلے اس کا منکر نہ ہونا چاہئے۔

﴿ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ﴾ (بقرہ)

اور جو کتاب ہم نے اب اتاری جو تمہارے پاس والی کتاب کو سچا بتاتی ہے' اس پر ایمان لاؤ اور تم ہی پہلے کافر نہ بنو

لیکن ان کی حالت یہ ہوئی کہ

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ﴾ (بقرہ۔۹۱)

اور جب ان سے کہا گیا کہ خدا نے جو بھی اتارا اس پر ایمان لاؤ' تو جواب دیا کہ جو ہم پر اترا ہم اس کو مانتے ہیں' اور وہ اس کے سوا کا انکار کرتے ہیں حالانکہ یہی قرآن حق ہے اور جو ان کے پاس ہے اس کی تصدیق کرتا ہے۔

اس کے برخلاف محمد رسول اللہ ﷺ نے جس دین کو پیش کیا اس کی بنیاد تمام اگلی نبوتوں اور کتابوں کی صداقت کے تسلیم کرنے پر رکھی گئی' یہی سبب ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی مسلمان کے مسلمان ہونے کے لئے صرف یہی نہیں فرمایا کہ وہ تنہا آپ کی نبوت پر ایمان لائے' بلکہ یہ بھی فرمایا کہ وہ تمام نبوتوں اور صحیفوں پر ایمان لائے، چنانچہ خود قرآن کی شہادت ہے کہ آنحضرت ﷺ کو صرف اسی کی تکلیف نہ تھی کہ آپ کے ہم وطن آپ کے صحیفہ کو نہیں مانتے بلکہ اس کی بھی تھی کہ وہ اگلے صحیفوں کو بھی نہیں مانتے۔

سورۂ سباء میں ہے:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾ (سباء)

اور منکروں نے کہا کہ ہم اس قرآن پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے اور نہ اس سے اگلی کتاب پر (یعنی تورات پر)

اور اسی لئے آنحضرت ﷺ نے تصریح کے ساتھ یہ فرمایا کہ جو میری عبودیت اور رسالت کے ساتھ عیسیٰؑ بن مریمؑ کو بھی خدا کا بندہ اور اس کا رسول اور کلمہ اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی روح تسلیم کرے گا وہ جنت میں جائے گا

(بخاری کتاب الانبیا ذکر عیسیٰؑ) الغرض وہ ازلی وابدی دین صرف ایک ہی تھا، اور تمام انبیاء علیہم السلام اسی ایک پیغام کو لے کر دنیا میں آئے یہی وحدت دین کی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے اپنے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّىْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝ فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴾ (مومنون۔ ۵۳۔ ۵۰)

اے پیغمبرو! ستھری چیزیں کھاؤ اور بھلا کام کرو میں تمہارے کاموں سے آگاہ ہوں، اور بے شک تم سب کی امت ایک امت ہے، اور میں تم سب کا (ایک) پروردگار ہوں تو مجھ سے ڈرتے رہو تو ان کے پیرووں نے اپنے مذہب کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، ہر فرقہ اپنے پاس کے خیال پر نازاں ہے۔

اس حقیقت کی مزید تشریح آنحضرت ﷺ نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی

﴿ اَلْاَنْبِيَآءُ اِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ اُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَدِيْنُهُمْ وَاحِدٌ ﴾ (بخاری کتاب الانبیاء۔ ذکر عیسیٰ)

تمام انبیاء ایسے بھائی ہیں، جن کا باپ ایک ہے اور مائیں مختلف ہیں، اور ان کا دین ایک ہے۔

* * *

پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان

﴿وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (بقرہ۔۲۲) .... وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ﴾ (بقرہ۔۱)

اسلام کے سلسلہ ایمانیات کی آخری کڑی [۱] ایک پچھلے دن اور پچھلی زندگی یا پچھلی دنیا پر ایمان کرنا ہے، سورہ بقرہ کے پہلے ہی رکوع میں ہدایت یاب اور کامیاب انسانوں کے ایمانیات کی آخری دفعہ یہ بیان کی گئی ہے۔

﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ﴾ (بقرہ)

اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (توبہ)

جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لایا۔

﴿اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾

جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں۔

”آخرہ“ کے معنی پچھلی کے ہیں اور یہ لفظاً صفت ہے، عربی میں وصاف کو موصوف کا قائم مقام کر کے اکثر موصوف کو حذف کر دیتے ہیں، مثلاً ”دنیا“ کے لفظی معنی ”قریب ترین“ کے ہیں اور یہ صفت ہے، اسکا موصوف الحیاۃ (زندگی) یا الدّار (گھر) ہے اس لیے الدنیا کا مفہوم الحیاۃ الدنیا قریب ترین زندگی یعنی اس عالم کی موجودہ زندگی یا اَلدَّارُ الدُّنْیَا (قریب ترین گھر یعنی موجود عالم ہے) اسی طرح (الاٰخر) اور (الاٰخرۃ) کا مفہوم (اَلْیَوْمُ الْاٰخِرُ وَ الْحَیٰوةُ الْاٰخِرَةُ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ) (پچھلا بدن اور پچھلی زندگی اور پچھلا آنے والا گھر ہے) یعنی موجودہ زندگی کے بعد آنے والی دوسری دنیا کی زندگی اور گھر اور قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنوں میں ایک سو تیرہ مقام پر آیا ہے، اور ہر جگہ اس کا محذوف موصوف حیاۃ (زندگی یا دار گھر) ہے۔

چنانچہ حسب ذیل آیتوں کے پڑھنے سے یہ حقیقت منکشف ہوگی۔

﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ﴾ (عنکبوت)

بے شک آخری گھر اصلی زندگی ہے۔

﴿وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ﴾ (انعام)

اور بے شک آخری گھر بہتر ہے۔

ان دونوں آیتوں میں (دار) یعنی گھر کا لفظ موجود ہے۔

﴿اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِ﴾ (توبہ)

کیا پچھلی زندگی کو چھوڑ کر اس موجودہ زندگی پر تم راضی ہو گئے۔

﴿اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ کَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾ (مومنون۔۳)

جنہوں نے انکار کیا اور پچھلی زندگی کی ملاقات کو جھٹلایا، اور ہم نے موجودہ زندگی میں ان کو نعمت دی۔

---

[۱] قرآن پاک میں جہاں جہاں ایمان کے تفصیلات ذکر کیے گئے وہاں وہاں یوم آخرت پر ایمان سب سے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔

ان آیتوں میں ''الحیاۃ الدنیا ''یعنی موجودہ دنیا کے تقابل سے ظاہر ہے کہ ''الاخرۃ'' سے مراد ''الحیاۃ الْاٰخِرَۃ ''یعنی پچھلی زندگی ہے۔[۱] اور اس لفظ کے عموم میں وہ تمام منازل و مقامات داخل ہیں جو ابتدائے موت سے لے کر حشر و نشر اور اسکے بعد پیش آتے ہیں' یا آئیں گے' چنانچہ احادیث سے ثابت ہے کہ اس آیت میں:

﴿ یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ﴾ (ابراہیم)

جو ایمان لائے ان کو اللہ حیاتِ دنیا میں اور آخرت میں اس کی پکی بات (کلمہ توحید) پر مضبوط رکھے گا۔

اس آیت میں ''آخرت سے مراد' عالم برزخ'' ہے اور قرائن بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ قیامت میں قولِ ثابت پر قائم رہنا کونسی بڑی بات ہوگی' جبکہ ہر چیز اس وقت واضح اور نمایاں ہوگی۔ اس لئے اس آیت میں ''آخرۃ'' سے مراد عالم برزخ کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتا' ایک اور حدیث میں تصریحاً بیان ہے کہ ''قبر (یعنی برزخ) آخرت کی منزلوں میں سب سے پہلی منزل ہے''[۲]

یومِ آخر اور حیات آخر ایمان' اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے' اور قرآن پاک میں ایمان باللہ کے بعد اسی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے' کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آئندہ دنیا کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے' اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمال انسانی کے نتائج کا ریشہ ریشہ بیخ و بن سے اکھڑ جائے' اسی لئے تمام مذاہب نے کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی اصطلاح میں دوسری زندگی کو محققاً تسلیم کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے اس آئندہ زندگی کو دو دوروں میں تقسیم کیا ہے' ایک موت سے لے کر قیامت تک اور دوسرا قیامت سے لے کر ابد (ہمیشہ) تک جس میں پھر موت و فنا نہیں' پہلے دور کا نام ''برزخ'' اور دوسرے کا نام ''بعث'' یا حشر و نشر اور قیامت ہے' اور ان سب کے معنی جی اُٹھنے' اکٹھے کیے جانے اور کھڑے ہونے کے ہیں۔ لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمہ کے بعد دوسری دنیا کی زندگی ہے اور اسی لیے اس دوسری زندگی یا اس عالم کا نام قرآن میں ﴿الدَّارُ الْاٰخِرَةُ اور عُقْبَى الدَّارِ﴾ وغیرہ ہے جس کے معنی دوسرے یا پچھلے گھر کے ہیں۔

---

[۱] دنیا اور آخرت کا یہ تقابل قرآن پاک کے بے شمار آیتوں میں مذکور ہے حضرت عیسیٰ کے متعلق ہے وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ (آل عمران۔۵) دنیا اور آخرت میں معزز' سلسلہ دعا میں ہے۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (بقرہ) پروردگار ہم کو دنیا میں نیکی اور آخرت میں نیکی دے

کفار کے بطلانِ عمل کے ذکر میں ہے حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ (بقرہ) ان کے عمل دنیا اور آخرت میں گر گئے۔

اِسْتَحَبُّوا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَى الْاٰخِرَةِ (نحل) انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی

نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ (حم السجدہ) ہم ہیں تمہاری قریب کی زندگی اور پچھلی زندگی کے دوست۔

اور کبھی دنیا کے بجائے ''اولیٰ'' (پہلی زندگی) کا لفظ اختیار کیا گیا ہے فرمایا۔

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى (نازعات۔۲۵) تو خدا نے اس کو پچھلی زندگی اور پہلی زندگی کی سزا بنایا۔

وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى (لیل۔۱۳) اور ہمارے ہی لئے پچھلی اور پہلی زندگی

[۲] ابن ماجہ و حاکم بحوالہ کنز العمال جلد ۸ ص ۹۵ حیدر آباد۔

توراۃ وانجیل میں برزخ وقیامت کی تفصیل نیز یہ کہ مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے انسان کی روح کس حالت اور کیفیت میں رہے گی، مذکور نہیں ہے، لیکن اسلام میں یہاں بھی گنجلک اور ابہام نہیں، بلکہ اس نے اس کی پوری تفصیل کی ہے اور بتایا ہے کہ موجودہ عالم کے علاوہ عالم برزخ اور میدان قیامت ہمارے سزا و جزا کے دو مقام ہیں شخصی موت کے بعد ہر شخص عالم برزخ میں داخل ہو جاتا ہے اور وہاں اس کے معاملات شروع ہو جاتے ہیں، پھر اپنے مقررہ وقت پر جس کو خدا نے اپنی مصلحتوں اور حکمتوں کے لحاظ سے طے کر لیا ہے، سلسلہ خلق کے خاتمہ پر جب موجودہ دنیا پر عام موت اور فنا طاری ہوگی دوسری زندگی کی دنیا شروع ہو جائے گی جو تمام تر ہماری پہلی دنیا میں ہمارے اچھے یا بُرے اعمال کا سراپا عکس اور ظل ہوگی، چنانچہ سورہ توبہ کی حسب ذیل آیت میں ہمارے ان تینوں دور ہائے حیات کا ذکر ہے۔

﴿ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴾ (توبہ)

ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

عذاب کی یہ تین منزلیں دنیا، برزخ اور قیامت ہیں۔

ان تینوں عالموں میں جو فرق ہے، وہ یہ ہے کہ اس موجودہ دنیا میں جسم (مادہ) نمایاں اور روح پوشیدہ ہے، اور روح کو جو کچھ مسرت و تکلیف یہاں پہنچتی ہے، وہ صرف اس مادی جسم کے واسطے سے پہنچتی ہے، ورنہ درحقیقت اس کی براہ راست راحت و لذت کا اس مادی دنیا میں کوئی امکان نہیں، دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہا گیا ہے، روح نمایاں ہوگی اور جسم چھپ جائے گا وہاں جو راحت و تکلیف پہنچے گی، وہ دراصل روح کو پہنچے گی اور جسم اس کی تبعیت میں ضمناً اس سے متاثر ہوگا، لیکن اس تیسرے عالم میں جہاں سے حقیقی اور غیر فانی زندگی شروع ہوتی ہے، روح اور جسم دونوں نمایاں ہوں گے اور دونوں کی لذت و تکلیف کے مظاہر بالکل الگ الگ ہوں گے۔

* * *

برزخ

''برزخ'' کا لفظ قرآن پاک میں تین دفعہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے دو چیزوں کے درمیان کا پردہ حاجب اور حائل مراد ہے، چنانچہ سورہ رحمان میں دو دریاؤں کا ذکر ہے جن میں ایک میٹھا اور دوسرا کھاری ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ حائل ہے جو ان کو آپس میں ملنے نہیں دیتا۔

﴿ بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ ﴾

ان دونوں کے بیچ میں ایک پردہ ہے جس سے ایک دوسرے پر بڑھ کر نہیں جاتا۔

اسی عجیب وغریب بحری منظر کا ذکر سورہ فرقان میں ہے اور وہاں بھی یہی لفظ واقع ہے۔

﴿ وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ط وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴾ (فرقان)

اور اسی نے دو دریاؤں کو ملا کے چلایا اور یہ میٹھا اور پیاس بجھاتا ہے اور وہ کھاری کڑوا ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ اور روکی ہوئی اوٹ بنائی ہے۔

اسی بناء پر موجود زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان جو مقام حائل اور حاجب ہے اس کا نام ''برزخ'' ہے۔ سورۃ مومنون میں نزع کے وقت کے بیان میں ہے کہ:

﴿ وَمِنْ وَّرَآءِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴾ (مومنون۔٦)

اور ان مرنے والوں کے پیچھے ایک پردہ ہے اس دن تک جب کہ وہ (قیامت میں) اٹھائے جائیں گے۔

عربوں بلکہ کل سامی قوموں کے رسم ورواج اور مشاہدات کی بناء پر اسی درمیانی منزل (برزخ) کا نام ''قبر'' ہے خواہ وہ خاک کے اندر ہو یا قعر دریا میں یا کسی درندہ یا پرندہ کے پیٹ میں، اس لئے فرمایا:

﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ ﴾ (حج)

بے شبہ اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں اٹھائے گا۔

اب ظاہر ہے کہ یہ ''بعث'' صرف انہی مردوں کے لئے مخصوص نہیں جو تودہ خاک کے اندر دفن ہوں بلکہ ہر میت کے لئے ہے خواہ وہ کسی حالت اور کسی عالم میں ہو، اسی لئے قبر سے مقصود ہر وہ مقام ہے، جہاں مرنے کے بعد جسم خاکی نے جگہ حاصل کی۔

موت وحیات کی منزلیں:

قرآن پاک میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر ہے، ایک جگہ دوزخیوں کی زبان سے کیا ہے۔

﴿ رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَیْنِ وَاَحْیَیْتَنَا اثْنَتَیْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰی خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِیْلٍ ﴾ (مومنون)

ہمارے پروردگار تو نے ہم کو دو دفعہ مارا اور دو دفعہ جلایا ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا پھر کیا نکلنے کی کوئی راہ ہے۔

ان دو موتوں اور دو حیاتوں کی تفصیل خود اللہ نے سورۃ بقرہ میں فرمائی ہے۔

﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴾

کیسے تم اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم پہلے مردہ تھے پھر تم کو اس نے زندہ کیا (انسان بنا کر پیدا کیا) پھر تم کو مار دے گا پھر تم کو جلائے گا' پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

پہلی موت تو ہر انسان کی خلقت سے پہلے کی ہے جب وہ مادہ یا عنصر کی صورت میں تھا' پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں پیدا ہوا یہ اس کی پہلی زندگی ہے پھر موت آئی روح نے مفارقت کی اور جسم اپنی اگلی مادی صورت میں منتقل ہو گیا یہ دوسری موت ہوئی پھر خدا اس کی روح کو جسم سے ملا کر زندہ کرے گا یہ اس کی دوسری زندگی ہوئی جس کے بعد پھر موت نہیں قرآن پاک میں خود رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا گیا۔

﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴾ (زمر)

بیشک تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں پھر تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کے سامنے دعویٰ پیش کرو گے

﴿ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴾ (مومنون)

پھر تم اس کے بعد مر جانے والے ہو پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

اب سوال یہ ہے کہ برزخ کے عالم میں کیا کیفیت ہوگی' اس کے سمجھنے کے لئے ایک مختصری تمہید کی ضرورت ہے

نیند اور موت کی مشابہت:

اللہ تعالیٰ نے اس مادی دنیا میں روحانی عالم کی باتوں کے سمجھنے کے لئے اپنی عجیب وغریب قدرت سے ہم کو ایک چیز عنایت کی ہے جس کو ہم نیند کہتے ہیں۔ روح کو اپنے جسم سے دو قسم کا تعلق ہے ایک ادراک واحساس کا اور دوسرے تدبیر تغذیہ کا' نیند کا وہ عالم جس میں ہمارے تمام آلات ادراک واحساس اس دنیا سے بے خبر ہو کر اپنے گردوپیش کی مادی دنیا سے یکسر بیگانہ بن جاتے ہیں تاہم ہمارے نفس یا روح کا تعلق ہمارے جسم سے باقی رہتا ہے اور وہ اس حالت میں بھی جسم کی مادی زندگی' نشوونما اور بقاء کی تدبیروں اور دل ودماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ کے غذارسانی اور خون کے دوران میں مصروف رہتی ہے اسی کا نام روح کا جسم سے تدبیری تعلق ہے۔ اب نیند اور موت میں فرق ہے تو یہ ہے کہ نیند کی حالت میں جسم سے نفس کا تدبیری تعلق قائم رہتا ہے اس لئے جسم باقی اور زندہ رہتا ہے لیکن موت کی حالت میں جسم سے روح کا تدبیری تعلق بھی اکثر منقطع ہو جاتا ہے اس لئے جسم کے اجزاء کچھ دنوں میں منتشر ہو جاتے ہیں' موت اور نیند کی یہی مشابہت ہے۔ جس کی بناء پر تمام انسانوں کی زبانوں میں موت کو نیند سے تشبیہ دیتے ہیں اور دنیا بھر کی زبانوں کا یہ توافق الہام طبعی کی خبر دیتا ہے قرآن پاک میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰى اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴾ (انعام)

اور وہی ہے جو تم کو رات میں مارتا ہے اور جلاتا ہے جو تم نے دن میں کمایا پھر تم کو دن میں جلاتا ہے' تاکہ مقررہ وقت پورا کیا جائے۔

اس سے زیادہ تفصیل سورۃ زمر میں ہے۔

﴿ اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ﴾ (زمر)

وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو ان کی موت کے وقت وفات دیتا ہے اور جو نہیں مری ہیں ان کو ان کی نیند میں وفات دیتا ہے تو جس پر موت کا حکم اس نے جاری کیا اس کو روک لیتا ہے اور دوسری روح کو جس پر موت کا حکم نہیں (یعنی نیند والی کو) ایک مدت معینہ کے لئے چھوڑ دیتا ہے بیشک اس میں سوچنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی نے ''برزخ'' کی زندگی کو نیند کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، قرآن پاک میں ہے کہ قیامت میں جب لوگ دوسری زندگی پا کر قبروں سے اٹھیں گے تو گنہگاروں کی زبانوں پر یہ فقرہ ہوگا۔

﴿ یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ﴾ (یٰسین)

اے ہماری خرابی کس نے ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے اٹھا دیا۔

غزوہ احد کے موقع پر ہے کہ جن کو مرنا تھا، ان کی موت ٹل نہیں سکتی تھی، اگر وہ میدان جنگ کے بجائے گھروں میں بھی ہوتے تو نکل کر اپنے مقتل میں خود آ جاتے، اس مفہوم کو قرآن نے یوں ادا کیا ہے۔

﴿ قُلْ لَّوْ کُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِکُمْ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ کُتِبَ عَلَیْھِمُ الْقَتْلُ اِلٰی مَضَاجِعِھِمْ ﴾ (آل عمران)

کہہ دے کہ اگر وہ گھروں میں بھی ہوتے تو جن کے لئے مارا جانا لکھا گیا تھا وہ خود نکل کر اپنی سونے کی جگہوں میں چلے آتے۔

اسی لئے قرآن پاک میں دوسری زندگی کے لئے اکثر ''بعث'' لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی جگانے اور بیدار کرنے کے بھی ہیں [1] جیسا کہ اوپر کی اس آیت میں ہے۔

﴿ وَھُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّھَارِ ثُمَّ یَبْعَثُکُمْ فِیْہِ ﴾ (انعام)

اور وہی ہے جو تم کو رات میں موت دیتا ہے اور دن کو جو تم کرتے ہو اس کو جانتا ہے پھر تم کو دن میں جگاتا ہے۔

﴿ وَاَنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ مَنْ فِی الْقُبُوْرِ ﴾ (حج)

اور بیشک اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں، جگا لے گا۔

احادیث میں ہے کہ قبر میں سوال و جواب کے بعد نیکوکاروں سے کہا جاتا ہے کہ ﴿ نَمْ کَنَوْمِ الْعُرُوْسِ ﴾ دلہن کی نیند سو جاؤ جس کو وہی جگاتا ہے جو اس کو سب سے زیادہ محبوب ہے یہاں تک کہ خدا اس کو اس خواب سے اٹھائے گا [2]

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ برزخ کی زندگی جس میں روح جسم سے الگ ہوتی ہے روح کی ایک طویل و عمیق [3]

---

[1] صحیح بخاری (باب تہجد) میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ سے نماز تہجد کے لئے اس وقت تک بیدار نہ ہونے پر سوال فرمایا، تو حضرت ممدوح نے ان لفظوں میں معذرت پیش کی کہ یا رسول اللہ انفسنا بیداللہ فاذا شاءَ ان یبعثنا (ہماری روحیں خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جب جگانا چاہتا ہے جگاتا ہے) اس حدیث میں بھی بعث جگانے کے معنوں میں آیا ہے۔

[2] جامع ترمذی کتاب الجنائز باب عذاب القبر ص ۱۸ حدیث حسن غریب۔

[3] شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں فھذا المبتلی فی الرویا غیر انہ رویا لا یقظہ منھا الی یوم القیمہ (باب اختلاف احوال الناس فی البرزخ) یعنی یہ عذاب قبر کا گرفتار خواب میں ہے لیکن یہ کہ یہ ایسا خواب ہے جس سے قیامت تک جاگنا نہیں ہے۔

نیند کے مشابہ ہے۔

خواب میں لذت والم:

انسان جب سوتا ہے تو اس کے ادراک واحساس کے آلات اپنی مادی دنیا سے عارضی طور پر بے خبر ہو جاتے ہیں مگر اس کے ادراک واحساس کی تخیلی، تمثالی یا ذہنی دنیا اس کے سامنے بالکل اسی مادی دنیا کی طرح متشکل ہو جاتی ہے اس میں وہ خود اپنے جسم سے الگ مگر ہو بہو وہی جسم دیکھتا ہے جو آتا جاتا، چلتا پھرتا اور دیکھتا سنتا ہے سب کچھ ہے۔ اس کے سامنے کھانے پینے اور لطف انگیزی کے سب سامان ہوتے ہیں نیز اس میں درد ورنج اور تکلیف کی تمام وہی صورتیں ہوتی ہیں جو مادی دنیا میں ہیں۔ اس کے خیالی جسم کو اگر اس عالم میں تکلیف ہوتی ہے تو وہ خود چیخ اٹھتا ہے، اور اگر اس میں لذت ملتی ہے تو لطف اندوز ہوتا ہے اور ان دونوں کے اثرات اس کو اپنے مادی جسم میں جاگنے کے بعد بھی نظر آتے ہیں غرض عالم خواب کی خیالی دنیا اور اس کی شادی ورنج اور لذت والم اور اس مادی دنیا کے جسمانی ومادی، شادی ورنج اور لذت والم میں فرق نہیں ہوتا اگر کچھ فرق ہے تو یہ ہے کہ عالم خواب کی لذت وتکلیف بیداری کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور مادی بیداری والی لذت وتکلیف احساس وادراک کے وجود تک قائم رہتی ہے اور جس طرح مادی بیداری والی لذت وتکلیف خواب میں معدوم ہو جاتی ہے، اسی طرح خواب والی لذت وتکلیف بیداری میں رخصت ہو جاتی ہے۔

خواب والے لذائذ وآلام کے مختلف مناظر کے حقائق اور اسباب وعلل پر اگر فلسفیانہ حیثیت سے غور کیا جائے تو عجیب وغریب معاملات سامنے آتے ہیں، کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام احساسات ومعلومات جو کبھی بھی ذہن انسانی میں آئے ہوں اور ان کو بحالت بیداری مادی دنیا کے مشاغل اور زمانہ کے امتداد کے سبب سے انسان کتنا ہی فراموش کر چکا ہو، وہ خواب میں مادی گراں باری سے آزادی کے بعد سامنے مجسم شکلوں میں نمودار ہو جاتے ہیں اور بیچ کی کڑیوں کے بھول جانے کی وجہ سے وہ اس کو بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ انسان جن چیزوں کو بھول جاتا ہے وہ اس کے حافظہ سے حقیقت میں معدوم نہیں ہو جاتیں، بلکہ دماغی حجرہ (ذہن) کے منتشر اسباب کے ذخیرہ (معلومات) میں چھپ کر گم ہو جاتی ہیں اور پھر بعد کو مل جاتی ہیں اس لئے وہ تمام اچھے اور برے اعمال جو انسان نے عمر بھر کیے ہیں خواہ وہ ان کو آج بھول گیا ہو مگر ان کی یاد ذہن کے گوشوں میں پڑی ہے، معدوم ومفقود نہیں ہوگئی۔

خواب کی عجیب وغریب صورت وہ ہے جس کو تمثیلی کہتے ہیں، جیسے ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے فرزند کے خدمت کعبہ پر وقف کرنے کو قربانی کی شکل میں، اور حضرت یوسفؑ نے والدین کو سورج اور چاند اور گیارہ بھائیوں کو گیارہ ستاروں کی صورت میں دیکھا، شاہ مصر کے سولی پانے والے مصاحب نے اپنے سولی پانے کو اس رنگ میں دیکھا کہ اسکے سر پر خوان ہے اور بڑے بڑے پرندے اس میں چونچ مار مار کر کھاتے ہیں، شاہ مصر نے مصر کی ہفت سالہ قحط سالی کو سات دبلی گایوں کی صورت میں دیکھا[1] آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کو اس شکل میں دیکھا کہ مسلمان سر منڈوائے اور بال ترشوائے حج کر رہے ہیں مسیلمہ اور اسود عنسی دو کذابوں کو سونے کے دو کنگنوں کی صورت میں دیکھا شہدائے اُحد کو موٹی گائے کی صورت میں ملاحظہ کیا، مدینہ کی وباء ایک پریشان موالی عورت کی صورت میں نظر آئی، خلافت کو ڈول کھینچنے کی اور حضرت عمرؓ

---

[1] یہ کل تمثیلی خواب قرآن پاک میں مذکور ہیں۔

کے علم کو دودھ کی اور ان کی دینداری کو لمبی قمیص کی شکل میں دیکھا[1] ان کے علاوہ ہر شخص کے ذاتی تجربوں سے بھی اس کی بے شمار مثالیں فراہم کی جاسکتی ہیں۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ انسان کے جسم میں اگر کسی قسم کا مادہ بڑھ جاتا ہے تو خواب میں اس کے مناسب مجسم شکلیں نظر آتی ہیں مثلاً اگر بلغم کی زیادتی ہو تو پانی، دریا اور سمندر نظر آئیں گے اگر سودا بڑھ جائے تو ہاتھی اور کالی عورتیں نظر آئیں گی اس طرح دوسرے تغیرات خلطی بھی اپنے مناسب جسمانی ہیئت میں خواب میں مجسم اور متشکل ہو کر دکھائی دیتے ہیں[2]

اسی طرح اعمال جو جسم و مادہ سے بالکل الگ ہیں' خواب میں اپنے مناسب قالب میں مجسم ہو جاتے ہیں اگر کسی بھائی کا حق واجب کسی نے ادا نہیں کیا تو خواب میں اس کو نظر آئے گا کہ وہ اس کا گلا کاٹ رہا ہے اگر کسی کی غیبت کی ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ مردار کھا رہا ہے۔ سونے چاندی کے خزانوں کو جمع کر کے اگر بخل کا اژدہا ان کی حفاظت میں بٹھایا ہے تو سانپ بن کر وہ اس کی گردن میں لپٹتا اور کاٹتا ہے' ذلت اور خواری کتے کی، حماقت گدھے کی اور شجاعت شیر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے' شب معراج میں آنحضرت ﷺ کے سامنے فطرت دودھ کی اور غیر فطرت شراب کی شکل میں پیش ہوئی اس طرح کہن سال دنیا ایک بڑھیا کی شکل میں نظر آئی۔

اس قسم کی تمثیلات قرآن مجید میں بھی آئی ہیں' مثلاً غیبت کی نسبت فرمایا:

﴿وَلَا یَغْتَبْ بَعْضُکُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ﴾ (حجرات)

اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو برا نہ کہے کیا تم میں سے کوئی پسند کرسکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کی بوٹی نوچ نوچ کر کھائے سو گھن آئے تم کو۔

سود کھانے کو جنون اور پاگل پن کی شکل میں ظاہر کیا۔

﴿اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَایَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ﴾ (بقرہ)

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھتے (یا نہیں اٹھیں گے) لیکن جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے حواس شیطان نے چھو کر کھو دیئے ہوں۔

یتیموں کا مال ناجائز طریق سے کھانے کو پیٹ میں آگ بھرنا فرمایا۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَّسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا﴾ (نساء)

وہ لوگ جو یتیموں کا مال ظلم کر کے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور جہنم کی آگ میں داخل ہوں گے

وہ خود غرض لوگ جو بیکسوں کے کام نہیں آتے' قیامت میں ان کے بھی کوئی کام نہ آئے گا اور جو خود سیر ہو کر کھاتے ہیں اور غریبوں کے درد گرسنگی سے بے خبر رہ کر اپنے مال کا میل کچیل (زکوٰۃ) بھی ان کو کھانے کو نہیں دیتے دوزخ میں ان کو زخموں کا دھوون کھانے کو ملے گا' فرمایا:

﴿اِنَّهٗ کَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِیْمِ ۝ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ ۝ فَلَیْسَ لَهُ الْیَوْمَ هٰهُنَا

---

[1] ان خوابوں کو صحیح بخاری کتاب التعبیر میں دیکھو۔

[2] حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہؒ ذکر برزخ۔

حَمِيْمٌ ۝ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۝ لَّا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ (حاقہ۔۱)

بے شک وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا تھا، اور مسکین کو کھانا کھلانے پر آمادہ نہیں کرتا تھا، تو آج اس کا بھی یہاں کوئی دوست نہیں اور نہ زخموں کے دھوون کے سوا کوئی کھانا ہے، اسکو وہی گنہگار کھائیں گے۔

بے لوث مخلصانہ فیاضی کی تمثیل سرسبز و شاداب باغ سے دی۔

﴿ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ ﴾ (بقرہ)

اور ان کی مثال جو اپنی دولت خدا کی خوشنودی چاہنے اور اپنے دلوں کی مضبوطی کے لئے خرچ کرتے ہیں ایک باغ کی ہے جو ایک ٹیلہ پر ہے۔

خدا کی راہ میں جان دینے والوں اور مر جانے والوں کو جان نو اور حیات جاوداں کی خوش خبری دی گئی فرمایا۔

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ ﴾

جو خدا کی راہ میں مارا جائے اس کو مردہ نہ کہو وہ لوگ زندہ ہیں۔

اسی طرح یہ ہے کہ جو خدا کو قرض دے گا خدا اس کو بڑھا کر دے گا، جو دوسروں کو معاف کرے گا خدا اس کو معاف کرے گا، جو دوسروں کی عیب پوشی کرے گا اللہ اس کی ستاری کرے گا، قرآن و احادیث اس قسم کی بالمعاوضہ جزا اور سزا کے ذکر سے لبریز ہیں۔

جو لوگ راہ خدا میں اپنا مال نہیں دیتے ان کی نسبت فرمایا۔

﴿ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ (آل عمران)

جس مال کا بخل کیا تھا قیامت میں اس کا ان کے گلے میں طوق پڑے گا۔

﴿ يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴾ (توبہ۔۳۵)

جس دن اس سونے اور چاندی کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر ان سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لئے گاڑ رکھا تھا تو اب تم اس کا مزہ چکھو جس کو تم گاڑ کر رکھتے تھے۔

دنیا میں اللہ کے نور بصیرت سے روگردانی آخرت میں ظاہری نابینائی کی صورت میں رونما ہوگی اور اسی طرح جو خدا کو یہاں بھولے گا، خدا اس کو وہاں بھلائے گا، چنانچہ حضرت آدمؑ سے جنت سے نکلتے وقت یہ فرمایا گیا تھا۔

﴿ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْۤ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴾ (طٰہٰ)

اور جس نے میری یاد سے روگردانی کی تو اس کے لئے تنگ گذران اور ہم قیامت کے دن اس کو اندھا اٹھائیں گے وہ کہے گا میرے پروردگار تو نے مجھے اندھا بنا کر کیوں اٹھایا میں تو دنیا میں آنکھوں والا تھا خدا کہے گا اسی طرح تیرے پاس ہماری نشانیاں آتی رہیں تو ان کو تو نے بھلا دیا اور اسی طرح آج تو بھلایا جائے گا۔

یہی مفہوم اور زیادہ اختصار کے ساتھ اس آیت میں ہے۔

﴿ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴾

جو کوئی دنیا میں (دل کا) اندھا تھا وہ آخرت میں اندھا ہے اور راستہ سے بہت بھٹکا ہوا۔

اس باب میں سب سے زیادہ صریح وہ حدیث صحیح ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ بخیل کا مال سانپ کی صورت میں گلے کا ہار ہو کر نظر آئے گا یعنی وہ مال سونے اور چاندی کے سانپ کی صورت میں ہوگا۔

﴿قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم من اتاهُ اللّٰهُ مالا فلم یؤد زکاته مثل له ماله شجاعا اقرع له زبیبتان یطوقه یوم القیامة یاخذ بلهز متیه ای شدقیه یقول انا مال انا کنزك﴾

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کو اللہ نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوۃ ادا نہیں کی تو اس کا مال اس کو اچھل کرڈسنے والے سانپ کی صورت میں دکھایا جائے گا، جس کا سر زہر کی شدت سے گنجا ہوگا اور اس کے منہ میں دو دانت ہوں گے وہ اس کے گلے میں قیامت کے دن پڑا ہوگا اور وہ اس کے دونوں جبڑوں کو کاٹے گا اور کہے گا میں ہوں تیرا مال، میں ہوں تیرا خزانہ۔

اسی طرح دو حدیثیں ہیں جن میں مختلف اعمال کا مختلف شکلوں میں آنا بیان کیا گیا ہے، مثلاً یہ کہ مرنے کے بعد قبر میں نماز روزہ وغیرہ اعمال عذاب سے بچنے کے لئے ڈھال بن کر داہنے بائیں سے نمودار ہوں[1] گے۔ یہ بھی حدیث میں ہے کہ مرنے کے بعد جب ایک دفعہ فرشتہ الٰہی مردہ کو بیدار کرتا ہے تو اس کو آفتاب ڈوبتا ہوا دکھایا جاتا ہے ﴿مثلت الشمس عند غروبها﴾ نیک مرد مسلمان اس تنگ وقت کو دیکھ کر نماز کی تیاری کرنا چاہتا ہے[2] یہ ظاہر ہے کہ دنیا والا آفتاب وہاں نہیں بلکہ اس کی تمثیل ہوتی ہے جیسا کہ حدیث کے الفاظ میں ہے یعنی یہ کہ اس مردہ کو ایسا نظر آتا ہے اور وہ درحقیقت آفتاب نہیں بلکہ آفتاب کی مثالی صورت ہوتی ہے۔

گناہوں کی تمثیلی سزائیں:

اوپر کے بیانات سے ہویدا ہے کہ غیر مجسم اعمال اور معانی اپنے جن تمثیلی پیکروں میں نظر آتے ہیں وہ درحقیقت ان اعمال و معانی سے تمثیلی مشابہت رکھتے ہیں، مثلاً ایک صحیح حدیث میں ہے کہ مشہور صحابی حضرت عثمانؓ بن مظعونؓ کی وفات کے بعد ایک صحابی نے خواب میں دیکھا کہ ان کے لئے ایک نہر بہہ رہی ہے اور جب اس کا ذکر آنحضرت ﷺ سے کیا تو آپؐ نے اس کی تعبیر میں فرمایا۔

﴿ذلكَ عمله﴾ (بخاری کتاب التعبیر)

یہ نہر ان کا (نیک) عمل ہے۔

اس تمہید کے بعد آنحضرت ﷺ کے اس رویائے صادقہ پر غور کرو، جو ظاہر ہے کہ قیامت کا نہیں کہ ابھی وہ آئی نہیں بلکہ برزخ ہی کا مرقع پیش کرتا ہے جو اب بھی قائم ہے، آپؐ نے ایک صبح کو فرمایا کہ رات میں نے دیکھا کہ دو آنے والے آئے اور انہوں نے مجھے جگا دیا میں ان کے ساتھ چل کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی لیٹا ہے اور دوسرا اس

---

[1] ابن حنبل۔

[2] سنن ابن ماجہ ذکر القبر ص ۳۶۶۔

کے سر پر ایک بڑا پتھر لئے کھڑا ہے اور وہ اس پتھر کو اس کے سر پر اس طرح دے مارتا ہے کہ اس کا سر چکنا چور ہو جاتا ہے اور پتھر لڑھکنے لگتا ہے وہ اس کے پیچھے جا کر اس کو اٹھا لاتا ہے اور اتنی دیر میں اس کا سر درست ہو جاتا ہے اور پھر وہ مارتا ہے اور پھر وہی صورت پیش آتی ہے ہم آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۲) ایک شخص اوندھا پڑا ہے اور دوسرا لوہے کا ایک آنکس لئے کھڑا ہے اور وہ اس سے اس کے جبڑے کو، پھر نتھنے کو، پھر آنکھوں کو گدی تک چیر ڈالتا ہے۔ پہلے ایک طرف بعد ازیں دوسری طرف پھر آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۳) تنور کی قسم کی ایک چیز دہک رہی ہے اور کچھ مرد اور عورت اس میں ننگے پڑے ہیں اور اس کے شعلے بھڑک بھڑک کر ان تک پہنچتے ہیں' اور وہ چیختے ہیں آگے بڑھے تو نظر آیا کہ (۴) ایک خون کی جیسی سرخ نہر بہہ رہی ہے اور ایک آدمی اس میں تیر رہا ہے۔ نہر کے کنارے ایک آدمی کھڑا ہے۔ جس کے پاس بہت سے پتھر رکھے ہیں' وہ تیرنے والا آدمی تیر کر جب اس شخص کے قریب آتا ہے تو یہ ایک پتھر اٹھا کر اس زور سے مارتا ہے کہ وہ پتھر اس کے منہ میں جا کر پیٹ میں اتر جاتا ہے۔

اس کے بعد ہم آگے بڑھے تو ایک سرسبز و شاداب چمن نظر آیا جس میں بہار کی ہر کلی کھل رہی تھی' باغ کے سامنے ایک دراز قد آدمی کو دیکھا جس کا سر آسمان میں تھا اور اس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے بچے تھے آگے بڑھے تو ایک بہت بڑا باغ دیکھا جس سے زیادہ بڑا اور خوبصورت باغ میں نے نہیں دیکھا تھا' یہاں پہنچ کر اپنے دونوں ہمراہیوں کے کہنے سے اوپر چڑھا تو ایک شہر ملا جس کی دیوار میں سونے کی ایک ایک اور چاندی کی ایک ایک اینٹ لگی تھی ہم لوگ دروازہ کے پھاٹک پر پہنچے، دروازہ کھلوایا' دروازہ کھلا تو اس کے اندر گھسے' تو اس میں کچھ لوگ ملے جن کا آدھا دھڑ نہایت ہی خوبصورت اور آدھا بہت ہی بدصورت تھا، میرے ہمراہیوں نے ان سے ایک نہر کی طرف جو بیچ میں نہایت صاف و شفاف بہہ رہی تھی اشارہ کر کے کہا کہ اس میں جا کر غوطہ لگاؤ، وہ غوطہ لگا کر آئے تو ان کی بدصورتی کا حصہ جاتا رہا اور وہ پورے دھڑ سے خوبصورت ہو گئے میرے ہمراہیوں نے مجھ سے کہا کہ یہ جنت عدن ہے اور وہ آپ کا دولت خانہ ہے میں نے نظر اٹھا کر دیکھا' سپید لکۂ ابر کی طرح ایک محل دکھائی دیا۔

پھر میں نے ان ہمراہیوں سے کہا کہ آج تو میں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں، تو بتاؤ میں نے کیا کیا دیکھا انہوں نے جواب دیا کہ پہلا شخص جس کا سر پتھر سے کچلا جا رہا تھا وہ ہے جو قرآن پڑھ کر اس کی تعمیل سے انکار کرتا ہے اور صبح کی مفروضہ نماز سے غافل ہو کر سو رہتا ہے، اور دوسرا شخص جس کے کلپھڑے اور نتھنے اور آنکھیں پھاڑی جاتی تھیں وہ ہے جو جھوٹ بول کر تمام دنیا میں اس کو پھیلاتا ہے اور تنور میں جو مرد اور عورتیں ننگی جل رہی تھیں وہ بدکار مرد اور عورتیں ہیں اور جو شخص خون کی نہر میں تیر رہا تھا اور منہ سے پتھر نگلتا تھا وہ سود خوار ہے، اور اس سدا بہار چمن میں جو دراز قد آدمی آپ نے دیکھا وہ ابراہیمؑ تھے اور ان کے گرد جو بچے تھے وہ ننھے اور کمسن بچے تھے جو فطرت پر مرے تھے، کسی صحابی نے پوچھا یا رسول اللہ! مشرکوں کے بچے؟ فرمایا اور مشرکوں کے بچے بھی' وہ لوگ جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا وہ ہیں جنہوں نے کچھ اچھے کام بھی کئے تھے' تو خدا نے ان کے گناہ دھو دیئے۔ [1]

برزخ کی ان تمام سزاؤں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کی نوعیت اور کیفیت ان کے اعمال کے بالکل

---

[1] صحیح بخاری کتاب التعبیر ملخصاً۔

مناسب اور مشابہ قرار دی گئی ہے، نماز صبح سے غافل ہو کر بالین راحت سے سر نہ اٹھانے والے سر کا کچلا جانا، جھوٹے کا گلپھڑا پھاڑا جانا، زانی اور زانیہ کا برہنہ تنور کی آگ میں جلنا، خون چوسنے والے سود خوار کا انسانوں کے خون کے دریا میں تیرنا، اپنا دو بالشت کا پیٹ بھرنے کے لئے سارے غریبوں کی روزی چھین چھین کر جمع کرنے والے کا پتھر کے لقمے کھانا، سراسر ان کے دنیاوی اعمال کی تمثیل وتصویر ہے اور آخر میں نصف حسن عمل سے آدھے دھڑ کی خوبصورتی اور نصف سوءِ عمل سے آدھے دھڑ کی بدصورتی پوری مشابہ ہے اور صاف وشفاف نہر کی صورت میں رحمت ومغفرت الٰہی کا ظہور بھی اسی قیاس پر ہے۔[1]

ابھی تک دنیا نے جو کچھ ترقی کی ہے وہ نفس سے باہر ''آفاقی''یعنی اپنے سے باہر کی بیرونی مادی دنیا کی اشیاء کے خواص وصفات کے جاننے میں کی ہے جن سے سائنس کی ایجادات واختراعات کا تعلق ہے لیکن ابھی اس سے بھی زیادہ ایک وسیع دنیا اپنے اندر کی پڑی ہے جس کو قرآن نے انفس کہا ہے ان انفس یا ارواح کے اوصاف وخصائص کا ابھی تک بہت کم علم ہوا ہے ہماری سائیکالوجی (علم النفس) ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے اور اسپریچولیزم (علم ارواح) ابھی طلسم وفریب کے عجائبات میں اسی طرح گرفتار ہے، جس طرح موجودہ عہد سے پہلے آج کے معمولی سائنٹفک تجربے سحر وجادو کے نقش ونگار بنے ہوئے تھے بہرحال ابھی تک علم نفس وروح کے عجائبات پر پردے پڑے ہوئے ہیں، ایک یہی مسلمہ شے کے یقین اور اسکے خارجی وجود میں کیا تعلق ہے؟ ایک معما ہے بہت سے ہندو اہل فلسفہ اور بعض مسلمان صوفیوں اور موجودہ زمانہ کے مشہور فلاسفر برکلے کے نزدیک تو کسی شے کے یقین اور وجود یا یوں کہو کہ ذہنی اور خارجی وجود میں بہت کم فرق ہے، بلکہ گویا نہیں ہے۔

بہرحال نفس انسان کے اندرونی قویٰ کا علم گو ابھی بہت کچھ محتاج تکمیل ہے تاہم اتنا ثابت ہے کہ کسی شے کے تصوری یقین اور خارجی وجود میں بہت ہی شدید تعلق ہے، مسمریزم نے جو سراسر اسی اصول پر مبنی ہے، اس حقیقت کو کس قدر واضح کر دیا ہے اسی سے معلوم ہوگا کہ مذاہب نے سب سے زیادہ ایمان پر جو یقین ہی کا دوسرا نام ہے اس قدر زور بے سبب نہیں دیا ہے۔

قرآن پاک نے یقین کی دو قسمیں کی ہیں، علم الیقین اور عین الیقین۔ کسی شے کی دلیلوں کو سن کر یا بعض علامتوں کو دیکھ کر اس کے وجود کا اقرار کرلو تو یہ علم الیقین (یقین جاننا) ہے اور اگر وہ شے خود تمہارے احساس اور مشاہدہ کے سامنے آجائے جس میں پھر شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہوسکتی تو وہ عین الیقین (خود یقین) ہے قرآن پاک نے یقین کی ان دونوں صورتوں کو سورۃ التکاثر میں بیان کیا ہے۔

﴿ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝
كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ﴾ (تکاثر)

تم کو دولت ونعمت کی بہتات نے غفلت میں مبتلا کر دیا یہاں تک کہ تم نے قبروں کو جا دیکھا ابھی نہیں تم آگے جان لو گے پھر ابھی نہیں تم آگے جان لوگے ہرگز نہیں اگر تم یقین کا جاننا جانتے تو البتہ دوزخ کو دیکھ لیتے پھر البتہ عین الیقین

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ذکر واقعات حشر۔

سے اس کو دیکھ لو گے۔

بنابریں اگر انسان اپنے اندر علم یقین حاصل کرلے جو کمال ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے تو وہ اپنے باطن کی آنکھوں سے اپنی دوزخ یہیں دیکھ لے۔

﴿ کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْیَقِیْنِ۔ لَتَرَوُنَّ الْجَحِیْمَ ﴾ (تکاثر)
نہیں یہ بات نہیں اگر تم کو علم یقین ہو تو دوزخ کو بے شبہ دیکھ لو گے۔

کفار آنحضرت ﷺ سے عذاب کے عینی مشاہدہ کا فوری مطالبہ کرتے تھے وحی الٰہی نے اس کے جواب میں کہا

﴿ یَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِیْطَةٌ بِالْکٰفِرِیْنَ ﴾ (توبہ)
وہ تجھ سے جلد عذاب مانگتے ہیں، حالانکہ دوزخ گھیر رہی ہے منکروں کو۔

ایک دوسری آیت میں ہے کہ منافقین بزعم خود آزمائش کے ڈر سے جہاد کی شرکت سے عذر کرتے ہیں اس کے جواب میں ان سے فرمایا گیا کہ وہ تو ابھی آزمائش میں مبتلا ہیں اور دوزخ ان کو گھیرے ہوئے ہے۔

﴿ وَمِنْهُمْ مَنْ یَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّیْ وَلَا تَفْتِنِّیْ اَلَا فِی الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ط وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِیْطَةٌ بِالْکٰفِرِیْنَ ﴾
اور ان کا کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ مجھے (جہاد میں عدم شرکت کی) اجازت دیجئے اور آزمائش میں نہ ڈالئے ہاں وہ تو آزمائش میں پڑ چکے اور دوزخ منکروں کو گھیر رہی ہے۔

لیکن یہ علم الیقین جس کے حصول کا ذریعہ صرف ایمان ہے، ہر شخص اس سے اس دنیا میں بہرہ ور نہیں ہوتا بلکہ بہتیرے اس کے منکر ہیں اس لئے ان کو یہ اپنے پاس کی دوزخ اس وقت نظر نہیں آتی، لیکن موت جس کا آنا ایک دن یقینی ہے جب وہ آئے گی تو مادہ کا یہ حجاب جو آنکھوں پر پڑا ہے اٹھ جائے گا اس وقت اس عالم غیب کے کچھ اسرار ان پر منکشف ہو جائیں گے، اور اعمال کے تمثیلی نتائج اور ثواب و عذاب اور جنت و دوزخ کے بعض مناظر ان کے سامنے آجائیں گے، اور اسی وقت وہ اپنے یقین کی آنکھوں سے کسی قدر واقعات کا مشاہدہ کرلیں گے۔

﴿ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَیْنَ الْیَقِیْنِ ﴾ (تکاثر۔۱)
پھر تم دوزخ کو عین یقین سے دیکھ لو گے۔

یہ موت کے بعد کا سماں ہوگا جس کو برزخ کا عالم کہتے ہیں اس کے بعد جب قیامت آئے گی تو ہر راز فاش ہو جائے گا۔

﴿ یَوْمَ تُبْلَی السَّرَآئِرُ ﴾ (جس دن تمام بھید کھل جائیں گے) اور بہشت و دوزخ اپنی ظاہری صورتوں میں اس طرح سامنے آجائیں گی کہ پھر شک و شبہ کا شائبہ بھی باقی نہ رہے گا وہ علم حقیقی اور یقین تحقیقی کا دن ہوگا، قرآن میں قیامت کے موقع پر ہے۔

﴿ وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ ذٰلِکَ یَوْمُ الْوَعِیْدِ۔ فَکَشَفْنَا عَنْکَ غِطَآءَکَ فَبَصَرُکَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ ﴾ (ق)
اور نرسنگا پھونکا گیا، یہ ہے ڈر کا دن۔ تو ہم نے تیرا پردہ تجھ سے کھول دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔

اس پردہ کے ہٹتے ہی اس دن انسان کے تمام اعمال ایک ایک کر کے اس کے سامنے آ جائیں گے اور دوزخ منظر عام پر آ جائے گی، فرمایا۔

﴿ فَاِذا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْکُبْرٰی ○ یَوْمَ یَتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ مَاسَعٰی ○ وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِمَنْ یَّرٰی ﴾ (نازعات۔۲)

جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا جس دن انسان کو جو کچھ اس نے کیا ہے یاد آ جائے گا اور دوزخ دیکھنے والے کے سامنے باہر لائی جائے گی۔

احوال برزخ کا عین الیقین:

ایک طرف شاعر (ابوالعتاہیہ) نے حیرت کے عالم میں کیا خوب کہا ہے۔

﴿ الموت باب و کل الناس یدخله یلیت شعری بعدالباب ماالدار ﴾

موت کا ایک دروازہ ہے اور تمام انسان اس دروازہ میں داخل ہوں گے کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اس دروازہ کے بعد کون گھر ہے۔

یہ علم جس کی حسرت اس شاعر نے ظاہر کی ہے، اس زندگی میں صرف علم الیقین کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے البتہ موت کے وقت جب وہ دوسرے عالم کے دروازہ پر کھڑا ہو گا تو اس کو پس پردہ کا نظارہ تھوڑا بہت ہو جائے گا اور وہی برزخ کا عالم ہے فرمایا۔

﴿ حَتّٰی اِذَاجَآءَ اَحَدَھُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ○ لَعَلِّیْ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَکْتُ کَلَّاط اِنَّھَا کَلِمَةٌ ھُوَقَآئِلُھَا وَمِنْ وَّرَآئِھِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴾ (مؤمنون۔۱۰۰)

جب ان گنہگاروں میں سے کسی ایک کو موت آتی ہے تو وہ زندگی کے پس پردہ کے بعض مناظر کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار مجھے ایک بار اور دنیا میں لوٹا دے تا کہ دنیا میں جو مال چھوڑ کر آیا ہوں اس سے شاید کوئی نیک کام کروں ہرگز نہیں یہ بات ہی بات ہے۔

جو وہ کہتا ہے اور اب ان گنہگاروں کے پیچھے اس دن تک ایک پردہ (برزخ) ہے جب وہ موت کے بستر سے جگا کر اٹھائے جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ اگر موت کے وقت اور بعد کوئی نئی غیبی کیفیت اس کے مشاہدہ میں نہیں آ جاتی، تو اس کا شک وشبہ دفعتہً یقین سے کیسے بدل جاتا ہے، فرمایا۔

﴿ وَجَآءَتْ سَکْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَاکُنْتَ مِنْهُ تَحِیْدُ ﴾ (ق۔۱)

اور موت کی بے ہوشی حقیقت کو لے کر آ گئی، یہی ہے وہ جس سے تو ہٹا کرتا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ سکرات کے وقت ''حقیقت'' کا کوئی منظر سامنے ضرور آ جاتا ہے، اہل تفسیر نے بھی اس آیت سے یہی سمجھا ہے، ابن جریر طبری لکھتے ہیں۔

لے تفسیر ابن جریر طبری جلد ۲۶ ص ۹۱۔

﴿ بالحق من امر الاخرة فتبينه للانسان حتى تثبته وعرفه[1] ﴾
حق یعنی آخرت کا کچھ حال تو موت کی سکرات انسان پر کھول دیتی ہے یہاں تک کہ انسان اسکو یقین کر لیتا ہے اور جان لیتا ہے۔

حافظ ابن کثیر محدث اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

﴿ يقول عزوجل وجاء ت ايها الانسان سكرة الموت بالحق كشفته لك عن اليقين الذى كنت تمترى فيه ﴾[1]

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے انسان موت کی بے ہوشی حق کو لے کر آ گئی یعنی تیرے اس یقین کے پردہ کو کھول دیا جس میں تو شک کرتا تھا۔

قاضی شوکانی محدث کی تفسیر میں ہے۔

﴿ ومعنى بالحق انه عند الموت يتضح له الحق ويظهر له صدق ماجاء ت به الرسل من الاخبار بالبعث والوعد والوعيد ﴾ (ج۵ص۷۳)

اور حق لے کر آنے کے معنی یہ ہیں کہ موت کے وقت حق بات کھل جاتی ہے اور پیغمبر جس قیامت اور جزاء وسزا کی خبریں لے کر آئے تھے ان کی سچائی ہویدا ہو جاتی ہے۔

مفتی آلوسی حنفی کی تفسیر کی عبارت یہ ہے۔

﴿ والمعنى احضرت سكرة الموت حقيقة الامر الذى نطقت به كتب اللّٰه تعالى ورسله عليهم السلام ﴾

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ موت کی مدہوشی اس حقیقت امر کو سامنے کر دیتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور اس کے رسولوں نے بیان کیا ہے۔

زمخشری معتزلی کی تفسیر (کشاف ج۲ص۱۴۰۲، کلکتہ) اور ابوحیان اندلسی مالکی کی تفسیر (بحرمحیط ج۸ص۱۲۴مصر) میں بھی یہی ہے۔

یہ مفسرین مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان سب کی متفقہ تفسیر یہی ہے اس تفسیر کی صحت کی مزید دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد ہی قیامت کے ذکر میں ہے۔

﴿ فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴾ (ق۔۲۲)

ہم نے آج تجھ سے تیرا پردہ کھول دیا تو آج تیری نظر تیز ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ موت کے وقت کسی قدر انکشاف ہوتا ہے اور قیامت کے دن انکشاف تام ہو جاتا ہے لیکن بہر حال موت کے وقت یقین کا پردہ بالکل کھل جاتا ہے۔

موت کے بعد خدا کی طرف روح کی بازگشت:

موت کے لئے قرآن میں اکثر ”خدا کی طرف بازگشت“ یعنی اللہ کی طرف لوٹ جانے کی اصطلاح اختیار کی

---

[1] تفسیر ابن کثیر بر فتح البیان ج۹ص ۱۹۸۔

گئی ہے۔

﴿ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (جمعہ۔۸)

کہہ دو بیشک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو اس سے ملنا ہی ہے پھر تم اس (خدا) کے پاس لوٹائے جاؤ گے جو حاضر وغائب کا جاننے والا ہے۔ تو وہ تم کو تمہارے کرتوت بتائے گا۔

﴿ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ (البقرہ)

ہم سب خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے

﴿ اِلَی اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِیْعًا﴾ (مائدہ۔۱۴)

تم سب کو خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

یہ طرز ادا بیسویں آیتوں میں اختیار کیا گیا ہے۔ یہ بالکل بدیہی ہے کہ ہر رجوع و بازگشت کے مفہوم میں ورود اور آمد داخل ہے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ارواح انسانی خدا کے یہاں سے اس جسم و قالب کی قید میں آئی ہیں، اور موت کے وقت اس عناصر کی چہار دیواری سے نکل کر پھر ان کو وہیں واپس جانا ہے جہاں سے آئی تھیں اس بازگشت کے سفر میں ان کا زادراہ صرف وہی ہوگا جو اس دنیا سے دارالعمل میں انہوں نے کمایا ہے یعنی ان کے اندرونی و بیرونی اعمال، اور اس کے بعد جو زندگی ہوگی وہ ان کے ان ہی اعمال کی نوعیت پر منحصر ہوگی۔

﴿ وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ لِیُقْضٰۤی اَجَلٌ مُّسَمًّی ثُمَّ اِلَیْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ یُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (انعام۔۷)

اور وہی (خدا) ہے جو تمہیں رات کو موت (نیند) دیتا ہے اور دن کو جو کما چکے اس کو جانتا ہے پھر تم کو دن میں جگا اٹھاتا ہے تاکہ مقررہ وقت (اصلی موت) پورا ہو، پھر اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تم کو تمہارے اعمال جتائے گا۔

ایک اور آیت میں ہے۔

﴿ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُكُمْ عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (یونس۔۳)

اے انسانو! تمہاری بغاوت کا نتیجہ تمہیں پر ہے، دنیا کی زندگی سے کچھ فائدہ اٹھانا پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے تو ہم تم کو تمہارے اعمال جتائیں گے۔

اس میں دنیا کی زندگی کے بعد ہی خدا نے اپنی طرف واپس آ جانے کی اطلاع دی ہے اور اہل تفسیر نے بھی اس رجوع الی اللہ سے موت ہی کے معنی سمجھے ہیں (طبری جلد ۱۱ص ۶۴ مصر) اب ہم ایک ایسی آیت پیش کرتے ہیں جس میں موت کا پورا نقشہ ہے اور اس کے بعد بیان ہے کہ اس دن مرنے کے بعد ہی خدا کے ہاں ہنکا کر لائے جاؤ گے گویا جس طرح جانور ہنکا کر لائے جاتے ہیں، ویسے ہی گنہگاروں کی روحیں موت کے بعد نکال کر لائی جاتی ہیں، فرمایا۔

﴿ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِیَ وَقِیْلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ۝ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَئِذِنِ الْمَسَاقُ ﴾ (قیامہ۔۱)

ہرگز نہیں جب روح ہانس (ہنسلی) تک آ پہنچے اور لوگ کہیں اب کون ہے جھاڑ پھونک کر کے بچانے والا اور سمجھا کہ اب جدائی کا وقت آ گیا اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ گئی اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے ہانکا جانا۔

لیکن سعید اور نیکوکار روحوں کو موت کے وقت یہ محبت بھری صدائے غیب سنائی دیتی ہے۔

﴿ يَآيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴾ (فجر۔۲۸۔۲۷)

اے مطمئن روح تو اپنے مالک سے خوش اور تیرا مالک تجھ سے خوش، تو اپنی مالک کے پاس چلی جا۔

یہ کیسی دلآویز صدا اور کیسی واپسی ہوگی۔

اس وقت کا سماں:

وہ لمحہ جب اس روح کی مہلت کا زمانہ اور عمل کی فہرست ختم ہوتی ہے، کتنا دردناک ہے، اس وقت سے اس کی زندگی صرف اس کے گذشتہ اعمال کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے، ہر عمل کی صورت اس کو اپنے سامنے کھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور غیب کی کارکن صورتیں چلتی پھرتی دکھائی اور بولتی چالتی سنائی دیتی ہیں۔

﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ط اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ﴾ (انعام۹۵۔۹۴)

اور کبھی تو دیکھے جس وقت گنہگار موت کی بیہوشی میں ہوں اور فرشتے ہاتھ کھولے ہوں کہ نکالو (اپنے جسموں کے اندر سے) اپنی روحوں کو آج تم کو اس پر ذلت کی سزا ملے گی کہ تم خدا کی شان میں جھوٹی باتیں کہتے تھے اور اس کے حکموں کے ماننے سے غرور کرتے تھے اور تم ایک ایک کر کے (تنہا) جیسے ہم نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا، ہمارے پاس آئے اور جو سامان و اسباب تم کو دیا تھا جس نے تم کو مغرور بنایا تھا اس کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ موت کے وقت کس طرح فرشتے سامنے آتے ہیں اور روح جسم سے جس وقت الگ ہوتی ہے اس کے گناہوں کی سزا کا دور شروع ہو جاتا ہے، یہی بات ایک اور موقع پر مذکور ہے۔

﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾ (انفال۔۷)

اور کبھی تو دیکھے جس وقت فرشتے کافروں کی جان لیتے ہیں ان کے منہ پر اور پیچھے مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو یہ تمہارے ہاتھوں کے پہلے کئے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے، اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اس سے واضح ہے کہ یہ سزا موت ہی کے عالم سے شروع ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ سزا نعوذ باللہ کسی انتقام کے سبب سے نہیں دیتا بلکہ وہ درحقیقت قانون عمل کے مطابق خود انسان کے کاموں کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔

نیکوکاروں کا نقشہ اس سے بالکل الگ ہے۔ ان کو ہر طرف سے بشارتیں سنائی دیتی ہیں اور ہر سمت خوشی و شادمانی کا سماں سامنے ہوتا ہے۔

﴿ فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ○ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ○ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ○ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ○ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ○ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ○ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحَابِ الْيَمِيْنِ ○ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ○ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ○ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ○ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴾ (واقعہ ۹۵_۸۳)

پھر کیوں نہیں جس وقت روح حلق تک پہنچ جاتی ہے اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو، اور ہم اس سے تمہاری نسبت زیادہ تر نزدیک ہوتے ہیں لیکن تم کو دکھائی نہیں دیتا تو اگر تم کسی اور کے حکم کے نیچے نہیں ہو تو کیوں نہیں اس روح کو پھر پلٹا دیتے ہو اگر تم اپنے انکار و تکذیب میں سچے ہو تو اگر وہ (مرنے والا) مقرب بندوں میں سے ہوا تو خوشی و آرام اور نعمت کی بہشت ہے اور اگر وہ اس سے کچھ کم درجہ رہنے والوں میں ہوا تو تجھ پر سلامتی رہنے والوں میں سے اور اگر وہ حق کو جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہوا تو گرم پانی کی مہمانی اور دوزخ میں بیٹھنا ہے بے شبہ یہ بات یقین کے لائق ہے۔

یہ تمام سماں موت کے بعد اور عالم برزخ ہی کے مناظر ہیں۔

برزخ کا عذاب وراحت:

اوپر کی آیتوں سے پوری طرح ہویدا ہے کہ روح و جسم کی مفارقت کے بعد اچھی روحوں کے سامنے رحمت کے اور بری روحوں کے روبرو عذاب کے منظر گزرتے ہیں، قرآن پاک میں کچھ اور آیتیں ہیں جن سے ثابت ہے کہ یہ منظر نہ صرف روح کے سامنے ہی سے گذرتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی وہ اپنے اعمال کے مدارج کے مطابق رحمت یا زحمت کے اندر بھی داخل کر دی جاتی ہے، منافقین کی نسبت قرآن میں ہے۔

﴿ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴾ (توبہ_۱۳)

ہم ان کو دو دو دفعہ عذاب دیں گے، پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

عَذَابٍ عَظِيْمٍ سے ظاہر ہے کہ دوزخ کا عذاب مراد ہے اب اس عذاب دوزخ سے پہلے عذاب کے دو دوران پر اور گذر چکے ہوں گے، ایک تو یہ دنیاوی عذاب ہے اور دوسرا موت کے بعد ہی کا ہو سکتا ہے قرآن میں آل فرعون کے ذکر میں ہے۔

﴿ وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۚ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ○ وَيَوْمَ تَقُوْمُ ~~السَّاعَةُ ۚ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ~~ ﴾ (مؤمن_۴۶_۴۵)

اور فرعون والوں پر بری طرح عذاب الٹ پڑا، آگ کہ اس پر وہ صبح اور شام پیش کئے جاتے ہیں اور جس دن قیامت کی گھڑی ہوگی (ندا ہوگی کہ) فرعون والوں کو پہلے سے بھی بڑھ کر عذاب میں ڈالو۔

اس سے ظاہر ہوا کہ گنہگاروں کو قیامت سے پہلے برزخ کے عالم میں بھی عذاب کا کچھ نہ کچھ مزا چکھایا جاتا ہے ایسا ہی نیکوکاروں کو بہشت کے عیش و آرام کا منظر دکھایا جاتا ہے اسی آیت پاک کی تشریح میں گویا آنحضرت ﷺ نے فرمایا

ہے تم میں سے جب کوئی مرتا ہے تو اس پر صبح و شام اس کا اصلی مقام پیش کیا جاتا ہے اگر وہ اہل جنت میں سے ہوتا ہے تو جنت اور اہل دوزخ سے ہوتا ہے تو دوزخ پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیرا مقام' اس وقت تک کے لئے کہ جب تو قیامت کے دن اٹھایا جائے [۱] ایک اور صحیح حدیث میں ہے کہ جنتی مردہ کے سامنے جنت و دوزخ دونوں کے منظر سامنے کر کے کہتے ہیں کہ اگر تو اچھے عمل نہ کرتا تو تیرا یہ مقام نہ ہوتا مگر تیرے نیک عمل کے سبب سے اب یہ جنت تیرا مقام ہے [۲] اور اس دن تک کے لئے کہ لوگ اٹھائے جائیں اس پر سرسبزی بھر دی جاتی ہے۔ [۳]

مشرکوں اور قیامت کے منکروں کا سوال تھا کہ اگر یہ پیغام الٰہی سچ ہے تم ہم کو فرشتے یا خدا نظر کیوں نہیں آتے جواب میں کہا گیا کہ فرشتے جس دن نظر آئیں گے اس دن ایمان بالغیب کہاں؟ اور اوپر آیتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ فرشتے موت کے وقت نظر آتے ہیں یا پھر قیامت میں نظر آئیں گے۔ اس لئے ارشاد ہے۔

﴿ یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓئِکَةَ لَا بُشْرٰی یَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ وَیَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ○ وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ○ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یَوْمَئِذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِیْلًا ○ وَیَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِکَةُ تَنْزِیْلًا ○ اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذِ ٍۨ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ وَکَانَ یَوْمًا عَلَی الْکٰفِرِیْنَ عَسِیْرًا ﴾ (فرقان۔۲۶۔۲۲)

جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن ان گنہگاروں کو کوئی خوشخبری نہیں اور کہیں گے کہ یہ ڈراؤنا منظر جو ہم کو نظر آ رہا ہے اب اوٹ میں روکا جائے اور ہمارا خدا فرماتا ہے ہم ان کے کئے ہوئے کاموں کے پاس پہنچے اور ان کو اڑتا غبار بنا دیا (یعنی بیکار و بے سود معدوم) جنت والے لوگ (یعنی جنت جن کو ملنے والی ہے) اس دن ان کے لئے خوب ٹھکانا اور دوپہر کے سونے کا مقام ہوگا اور جس دن آسمان بادل سے پھٹ جائے گا اور فرشتے آہستہ آہستہ اتارے جائیں گے اس دن راج سچے خدا کا ہوگا اور وہ دن کافروں پر سخت ہوگا۔

کھلی بات ہے کہ آسمان کا بادل سے پھٹنا اور فرشتوں کا اترنا قیامت کا نقشہ ہے اب اس سے پہلے فرشتوں کے دکھائی دینے کا وہ دن جس میں گنہگاروں کے لئے خوشخبری نہیں' اور وہ کہیں گے کہ کاش یہ ڈراؤنا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے نہ ہوتا' اور جنت کے مستحقین کو ایک اچھا مستقر (قرارگاہ) اور دوپہر کی دھوپ سے بچانے والی خوابگاہ بنی ہوگی، قیامت سے پہلے اور موت کے بعد ہی کی کیفیت ہے۔

سورہ محمد میں موت کے وقت کا حال بیان ہوتا ہے کہ جب فرشتے ان گنہگاروں کی روحوں کو قبض کرتے ہیں تو ان کے چہروں پر اور پیٹھوں پر ضرب لگاتے ہیں فرمایا۔

﴿ فَکَیْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ○ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَکَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴾ (محمد۔۲۸۔۲۷)

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الجنة والنار باب عرض مقعد المیت جلد۲ ص۸۸ مصر و جامع ترمذی کتاب الجنائز باب عذاب القبر حدیث حسن صحیح و صحیح بخاری کتاب الجنائز باب عذاب القبر ص۱۸۴ و سکرات الموت ص۹۶۴۔

[۲] صحیح بخاری کتاب الجنائز ص۳۸۴۔

[۳] صحیح مسلم باب عرض مقعد المیت ص۴۹۶' مصر۔

پھر کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کو وفات دیں گے ان کے چہروں اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے یہ اس لئے کہ انہوں نے اس کی پیروی کی جس نے خدا کو ان سے ناخوش کر دیا اور جنہوں نے خدا کی خوشنودی کو پسند نہ کیا تو خدا نے ان کے کاموں کو بے نتیجہ کر دیا۔

یہ غیبی ضرب خواہ اسی مادی جسم پر پڑتی ہو یا اس کے مثالی جسم پر یا روح پر جو بھی کہئے، بہر حال اس سے یہ ثابت ہے کہ گنہگار مردہ پر موت کے وقت ہی سے عذاب کا ایک رنگ شروع ہوتا ہے۔

سورہ انعام میں اس سے زیادہ ہے۔

﴿ وَلَوْ تَرٰی اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ بَاسِطُوْٓا اَیْدِیْھِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَکُمْ ط اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْھُوْنِ ﴾ (انعام۔۹۴)

اور اگر تو دیکھے جب گنہگار موت کی سکرات میں ہوں اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوں کہ نکالو اپنے جسم کے اندر سے اپنی روحوں کو، آج تم کو ذلت کی سزا ملے گی۔

جس کے معنی آج کے ہیں، ظاہر ہے کہ اس سے وہی زمانہ مراد ہے جس وقت سے فرشتے بدن سے روح نکالتے ہیں، اس آج سے مقصود ہمارا دنیاوی آج نہیں ہے جو ۲۴ گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے، بلکہ برزخ کا پورا زمانہ ہے (دیکھو فتح القدیر شوکانی و تفسیر ابو السعود، و تفسیر روح المعانی آلوسی)

قوم نوح کے غرق ہونے کے بعد ہی دوزخ میں جانے کا حکم ہے۔

﴿ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا فَلَمْ یَجِدُوْا لَھُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْصَارًا ﴾ (نوح۔۲۵)

وہ ڈبو دیے گئے، پھر وہ آگ میں داخل کیے گئے، تو انہوں نے خدا کے سوا مددگار نہیں پائے

حضرت لوطؑ اور حضرت نوحؑ کی کافر بیویوں کی موت کے بعد ہی عذاب کا ذکر ہے۔

﴿ وَقِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ ﴾ (تحریم۔۲)

اور کہا گیا کہ داخل ہونے والوں کے ساتھ تم دونوں بھی آگ میں داخل ہو جاؤ۔

یہ قیامت سے پہلے اور دنیا کے عذاب ہلاکت کے بعد کے واقعات ہیں اور اسی وقفہ کا نام برزخ ہے۔

سورہ یٰسین میں ایک خیر خواہ قوم کا ذکر ہے جو عمر بھر اپنی قوم کو حق کی تبلیغ کرتا رہا تھا، اور پھر وہ غالباً اسی حق کی راہ میں شہید ہوا مرنے کے بعد جب اس کو بہشت ملی، تو اس نے بڑی حسرت سے کہا کہ کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ مرنے کے بعد خدا نے کس طرح مجھے معاف فرمایا، اور عزت بخشی تا کہ وہ بھی ایمان سے میری طرح بہرہ ور ہو کر اس مغفرت اور عزت سے سرفراز ہوتی۔

﴿ قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّۃَ ط قَالَ یٰلَیْتَ قَوْمِیْ یَعْلَمُوْنَ o بِمَا غَفَرَلِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ o وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی قَوْمِہٖ مِنْۢ بَعْدِہٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا کُنَّا مُنْزِلِیْنَ ﴾ (یٰسین)

کہا گیا جنت میں داخل ہو، اس نے کہا اے کاش میری قوم کو یہ معلوم ہوتا کہ میرے پروردگار نے میری مغفرت کی اور مجھے عزت والوں میں سے بنایا اور ہم نے اس کے مرنے کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی فوج نہیں اتاری اور نہ

ہم اتارا کرتے ہیں۔

شہیدوں کی نسبت تو خاص طور پر ہے۔

﴿ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ ﴾ (آل عمران۔۱۷)

بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ شہداء کو برزخ ہی میں کامل زندگی کے ساتھ جنت کی روزی ملتی ہے اور عام نیکوکاروں کا یہ حال ہے کہ ان کو فرشتے اس وقت سلامتی اور جنت کی خوشخبری سناتے ہیں' فرمایا۔

﴿ اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ یَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَیْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (نحل۔۳۲)

جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک وصاف حالت میں وفات دیتے ہیں کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلہ جنت میں چلے جاؤ۔

قبر کی اصطلاح:

سطور بالا میں عالم برزخ کے وہ مناظر دکھائے گئے ہیں' جو قرآن کی آیتوں میں نظر آتے ہیں اور احادیث صحیحہ میں اس عالم کے حالات کی جو تفصیلیں مذکور ہیں[1] وہ عموماً قبر کی اصطلاح کے ساتھ بیان ہوئی ہیں لیکن اس لفظ ''قبر'' سے درحقیقت مقصود وہ خاک کا تودہ نہیں جس کے نیچے کسی مردہ کی ہڈیاں پڑی رہتی ہیں بلکہ وہ عالم ہے جس میں یہ مناظر پیش آتے ہیں' اور وہ ارواح ونفوس کی دنیا ہے' مادی عناصر کی نہیں' اسی لیے قرآن پاک نے اس عالم کے تعلق سے ہمیشہ نفس اور نفوس کو خطاب کیا ہے اور ان ہی کے عذاب وثواب اور رحمت ولعنت کا ذکر ہے اس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے وہ مرنے والوں کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے جو ہو بہو اس کے خاکی جسم کا مثنی ہوتا ہے تم نیند میں ہو اور تمہارا نیم مردہ بے حس جسم بستر پر دراز ہے مگر تم خواب میں دیکھ رہے ہو کہ بعینہ تمہارا جسم آگ میں جل رہا ہے یا باغ و بہار کی لذتوں میں مصروف ہے اور تم کو اس سے وہی تکلیف اور راحت مل رہی ہے جو بیداری میں اپنے بستر پر پڑے ہوئے جسم کی تکلیف وراحت سے مل سکتی ہے اس خواب میں جس طرح تمہارے مادی جسم کے علاوہ تم کو اپنا ایک خیالی جسم نظر آتا ہے جو ہو بہو تمہارا مادی جسم ہے اسی طرح موت کے خواب میں بھی تم کو اپنا ایک مثالی جسم نظر آئے گا جو اکثر حالتوں میں ہو بہو تمہارے اس خاکی جسم کے مطابق ہوگا[2] اور تمہاری روح اسی جسم مثالی کے عذاب وراحت سے متاثر ہوگی کہ اعمال کی اصل ذمہ دار روح انسانی ہے' جسم خاکی نہیں، فرمایا ﴿ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ ﴾ (مدثر۔۲) یعنی ہر روح اور

---

[1] بعض معتزلہ عذاب قبر کے قائل نہ تھے' اور ان کی دلیل یہ تھی کہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں، یہ غلط فہمی ان کو اس لئے پیش آئی کہ قرآن میں لفظ قبر وقبور کے ساتھ عذاب کا ذکر نہیں لیکن اگر وہ دیکھتے کہ قرآن میں بعد موت اور قبل قیامت ارواح انسانی کے عذاب وثواب اور رحمت ولعنت کا ذکر موجود ہے تو ان کو اس انکار کی جرأت نہ ہوتی اور قرآن میں اس قسم کی متعدد آیتیں موجود ہیں۔

[2] اس سے اس شبہ کا ازالہ ہوتا ہے کہ ہم کو مردہ کا جسم سامنے پڑا نظر آتا ہے' لیکن اس پر عذاب کا کوئی نشان نظر نہیں آتا' اور نیز اس شبہ کا بھی ازالہ ہوتا ہے کہ قبر میں جب جسم سڑ گل جاتا ہے تو پھر عذاب وثواب کا احساس اس کو کیسے ہوتا ہے۔

جان اپنے اعمال کے ہاتھوں گرو ہوگی۔ اس لئے اصل مکلف روح ہے جسم نہیں، جسم صرف بمنزلہ آلہ کے ہے۔ دنیا میں اس کا ایک جسم خاکی تھا برزخ میں اس کا ایک اور جسم ہوگا جو مادہ یا مادیات سے پاک و بری ہوگا تاہم اس کو اپنے خاکی جسم سے ایک قسم کی نسبت حاصل ہوگی اور اتنی ہی نسبت کی بناء پر قبر کی اصطلاح عام بول چال میں جاری ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے مسلمان مردوں کو اسی قبر میں جاتے دیکھتے ہیں، قرآن پاک کی یہ آیت اوپر گذر چکی ہے۔

﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰۤئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴾ (انفال۔ ۵۰)

اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں، مارتے ہیں ان کے منہ پر اور پیٹھ پر، اور کہتے ہیں چکھو جلنے کا مزہ۔

اس آیت سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ گنہگاروں پر موت کے بعد ہی سے عذاب شروع ہو جاتا ہے، وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مار ان کے منہ اور پیٹھ پر پڑتی ہے مگر یہ منہ اور یہ پیٹھ وہ نہیں ہے جو بے جان لاشہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے، بلکہ اس آیت میں کافر کی روح کو جانور سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح جانور کو تیز ہنکاتے وقت کبھی آگے (منہ) پر اور کبھی پیچھے (پیٹھ پر) مارتے ہیں اسی طرح گویا کافر روح کو زبردستی فرشتے مارتے ہوئے اور ہنکاتے ہوئے لے چلیں گے، اور کہیں گے کہ چلو عذاب کا مزہ چکھو، یہی مفہوم صاف لفظوں میں اس آیت میں ہے۔

﴿ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۨ الْمَسَاقُ ﴾ (قیامہ)

اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے ہنکایا جانا۔

بعض ایسی سعید روحیں بھی ہوتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس برزخ میں ان کے جسم خاکی کی شکل و صورت کی قید سے بھی آزاد کر کے دوسرا مناسب مثالی جسم عطا کرتا ہے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ "مومن کامل کی روح پرندوں کی شکل میں جنت میں اڑتی پھرتی ہے"[1] اور خصوصاً شہداء کے متعلق آیا ہے کہ وہ سبز پرندوں کی شکل میں ہوں گے اور عرش الٰہی کی قندیلیں ان کا آشیانہ ہوں گی۔ اسی طرح دوزخ و بہشت سے متعلق آنحضرت ﷺ کا جو رویائے صادقہ پہلے گزرا ہے اس میں جن جسمانی قالبوں میں گنہگاروں کی سزا و تکلیف کی صورتیں دکھائی گئی ہیں وہ تمام تر مثالی ہیں، ظاہر ہے کہ مومن سعید اور شہداء کے وہ مثالی قالب اور ان گنہگاروں کے یہ مثالی اجسام ان کے وہ قالب و اجسام نہیں ہیں جو ان کی قبروں میں گل سڑ کر فنا ہو گئے یا وہ آگ میں جل کر خاکستر ہوئے اور ذرے ہوا میں اُڑ کر منتشر ہو گئے، یا کسی جانور کے پیٹ میں جا کر اس کے جزو بدن بن گئے۔

بعض حدیثوں میں آنحضرت ﷺ سے ان مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات و مسموعات کا تذکرہ ہے تو ظاہر ہے کہ مادی زبان و منظر میں ان قوموں کے نزدیک جو مردوں کو گاڑتی ہیں اس میت کی یادگار اس دنیا میں اس کے اس مٹی کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہے، جس کی طرف اشارہ کیا جا سکے، ایک صحیح حدیث میں اس نیک مرد کا ذکر ہے جس نے خدا کے خوف سے یہ وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کا جسم جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی جائے، تاکہ وہ خدا کے سامنے حاضر

---

[1] سنن ابن ماجہ کتاب الجنائز۔

[2] صحیح بخاری جلد دوم ص ۹۵۹ کتاب الرقاق باب الخوف من اللہ۔

نہ کیا جا سکے، مگر قدرت الٰہی نے اس کو مجسم کر کے کھڑا کر دیا اور اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں سے نوازا۔ [۲]

سوال و جواب:

احادیث صحیحہ میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں اور وہ مردوں سے توحید و رسالت کی نسبت سوال و جواب کرتے ہیں۔

اس کی تصدیق قرآن پاک کی ان آیتوں سے بھی ہوتی ہے۔

﴿ اَلَّذِیۡنَ تَتَوَفّٰهُمُ الۡمَلٰٓئِکَةُ طَیِّبِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ سَلٰمٌ عَلَیۡکُمُ ادۡخُلُوا الۡجَنَّةَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴾

جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک وصاف حالت میں وفات دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلہ جنت میں چلے جاؤ۔

﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَفّٰهُمُ الۡمَلٰٓئِکَةُ ظَالِمِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَالُوۡا فِیۡمَ کُنۡتُمۡ قَالُوۡا کُنَّا مُسۡتَضۡعَفِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ قَالُوۡۤا اَلَمۡ تَکُنۡ اَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوۡا فِیۡهَا فَاُولٰٓئِکَ مَاۡوٰٮهُمۡ جَهَنَّمُ ﴾

بیشک فرشتوں نے جن کی روحوں کو اس حالت میں قبض کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے، وہ ان سے کہتے ہیں، تم کس بات میں تھے وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم ملک میں بے یار و مددگار تھے وہ فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اپنا وطن چھوڑ کر باہر چلے جاتے۔

ایک اور آیت ہے۔

﴿ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُنَا یَتَوَفَّوۡنَهُمۡ قَالُوۡۤا اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ قَالُوۡا ضَلُّوۡا عَنَّا وَشَهِدُوۡا عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ اَنَّهُمۡ کَانُوۡا کٰفِرِیۡنَ ○ قَالَ ادۡخُلُوۡا فِیۡۤ اُمَمٍ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ مِّنَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ فِی النَّارِ ﴾ (اعراف۔۴)

یہاں تک کہ جب ان جھٹلانے والوں کے پاس ہمارے فرشتے ان کی روحوں کو قبض کرنے آئیں گے اور کہیں گے کہاں ہیں وہ جن کو تم خدا کے علاوہ پکارتے تھے (اس وقت وہ مشرک) کہیں گے کہ ہمارے وہ دیوتا ہم سے کنارہ کش ہو گئے، اور انہوں نے اپنے اوپر آپ گواہی دی کہ وہ کافر تھے، تب خدا فرمائے گا کہ تم بھی ان لوگوں میں جا ملو جو جن وانس میں سے تم سے پہلے آگ میں جا چکے ہیں۔

پہلی آیت میں عدم ہجرت کے گناہ کے مرتکب مسلمانوں کا اور دوسری میں کافروں کا حال بیان کیا ہے کہ ان سے ان کی موت کے بعد ہی یہ سوال کیا جائے گا، بہر حال یہ تو خاص خاص گناہوں کے مجرموں کا حال تھا، اب عام لوگوں سے جو سوال ہو سکتا ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے، یعنی توحید و رسالت کی معرفت کا ان سے سوال ہوگا۔

قرآن پاک میں ایک جگہ کلمہ طیبہ (اچھی بات یعنی کلمہ توحید) اور کلمہ خبیثہ (بری بات یعنی کلمہ کفر) کی ایک ایک مثال ہے، کلمہ طیبہ کی مثال اس درخت کی ہے جس کی جڑیں زمین میں مضبوط گڑی ہیں، اس کی شاخیں آسمانوں تک پھیلی ہیں، اس میں سدا بہار میوے لگے ہیں، اور کلمہ خبیثہ کی مثال اس درخت کی ہے جس کی جڑ زمین سے اکھڑی پڑی ہے، وہ اب گرا اور تب گرا، اس کے بعد قرآن میں ہے۔

﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (ابراہیم)

اللہ ایمان والوں کو پکی بات پر اس دنیا میں مضبوط رکھے گا اور آخرت میں بھی' اور اللہ ظالموں کو بچلاتا ہے۔

اس کی تفسیر صحیح حدیثوں میں یہ ہے کہ یہ برزخ کے اسی سوال و جواب سے متعلق ہے کہ صاحب ایمان جس طرح اپنی اس زندگی میں ایمان کی بات پر قائم تھا' اسی طرح برزخ میں بھی اس پر قائم رہے گا' اور جو کافر و مشرک یہاں اس پر قائم نہ تھا' وہ وہاں بھی قائم نہ رہے گا اور بہک جائے گا۔

ہر چند کہ رسول پاک ﷺ سے صحیح تفسیر کے ہوتے ہوئے کسی اور استدلال کی حاجت نہیں' تاہم تائیداً یہ عرض ہے کہ اس آیت میں اہل ایمان کے آخرت میں بھی ''قول ثابت'' پر ثابت قدم رکھے جانے کی بشارت ہے' ظاہر ہے کہ اس آخرت سے قیامت اور بہشت و دوزخ کا دن تو مراد نہیں ہو سکتا کہ وہ تو کشف راز کا دن ہے' اس دن تو کافر بھی اس قول ثابت سے پلٹنے کی جرأت نہیں کر سکتا' پھر یہ اہل ایمان کے لئے کوئی خاص بشارت نہ ہو گی' اور نہ یہ اس اظہار احسان کا مناسب وقت ہو سکتا ہے' البتہ اس بشارت اور احسان کا اعلان و اظہار آخرت کے اس حصہ میں موزوں ہو سکتا تھا' جہاں ہنوز اسرار پس پردہ کی پوری نقاب کشائی نہیں ہوتی' اور وہ برزخ کا عالم ہے۔

اس آیت پاک کی اس تفسیر سے جو احادیث صحیحہ پر مبنی ہے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آخرت کی وسعت مفہوم میں برزخ کا میدان بھی داخل ہے۔

حقیقت میں اس عالم برزخ کا سوال و جواب کوئی نیا واقعہ نہ ہو گا' بلکہ ہر روح کی پہلی زندگی کی ایمانی کیفیت اقرار و انکار کی مثال ہو گی' یا یوں کہو کہ آج کے آئینہ میں کل کا عکس نمایاں ہو گا' یعنی اقرار و انکار کی جس کیفیت پر زندگی کا خاتمہ ہوا ہو گا' وہی بعد کو سوال و جواب میں نمایاں ہو گی۔

برزخ میں ارواح کا مسکن:

آخری سوال یہ ہے کہ موت اور قیامت کی اس بیچ کی منزل (برزخ) میں ارواح انسانی کا مسکن کہاں ہو گا؟ قرآن پاک میں اس کا جواب متعدد آیتوں میں ملتا ہے' سب سے پہلی آیت تو ان مذکورہ بالا آیات کے بعد ہے' جس میں ذکر ہے کہ فرشتے جب منکرین سے سوال و جواب کر چکیں گے تو خدا ان کی روحوں کو حکم دے گا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عذاب کی آگ میں داخل ہو جائیں' اس کے بعد ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِىْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ (اعراف۔۵)

بے شک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا' اور ان کے ماننے سے غرور کیا' ان کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے' اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے' تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے (یعنی کبھی نہیں)

اس سے معلوم ہوا کہ آیات الٰہی کے منکروں اور جھٹلانے والوں کی روحیں مرنے کے بعد آسمانی بادشاہی کے حدود میں قدم نہ رکھ سکیں گی اور وہ فضائے زمین میں آوارہ پھریں گی یا اپنے جسم خاکی کے لگاؤ سے جہاں وہ سپرد خاک ہوئے ہوں منڈلاتی رہیں گی اور وہیں سے دوزخ کا منظر دیکھیں گی اور تکلیف اٹھائیں گی۔

اس کے برخلاف ہمہ تن پاکباز مومن روح کا یہ حال ہوتا ہے کہ موت ہی کے وقت رحمت الٰہی کا فرشتہ بلکہ خود زبان رحمت اس کے کانوں میں صدا دیتی ہے۔

﴿ يَاۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴾ (فجر)

اے مطمئن روح! اپنے پروردگار کے پاس واپس چلی جاؤ، تیرا پروردگار تجھ سے خوش اور تو اپنے پروردگار سے خوش، تو میرے بندوں میں شامل، اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔

ان سے بڑھ کر وہ پاکباز روحیں ہیں جنہوں نے اپنے خاکی جسموں، فانی زندگیوں، مادی خوشیوں اور زوال پذیر عشرتوں کو خدا کی راہ میں قربان کیا تو ان کو خدا کی طرف سے ایک تمثالی جسم، غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و مسرت کی لازوال دولت اسی وقت عنایت کر دی جاتی ہے فرمایا

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۱۹)

جو خدا کی راہ میں مارے جائیں، ان کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں کر سکتے۔

یہ پر مسرت زندگی کیسی ہوگی اس کی تفصیل دوسری سورہ میں ہے

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَاۤ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾

(آل عمران۔۱۷۱۔۱۶۹)

اور تو ان کو جو خدا کی راہ میں مارے گئے، مردہ نہ گمان کر بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، ان کو روزی دی جاتی ہے خدا نے اپنی مہربانی سے ان کو جو دیا ہے اس پر خوش ہیں، اور جو ابھی ان کے پیچھے سے ان تک نہیں پہنچے ہیں ان کی طرف سے بھی خوش ہیں کہ ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے وہ اللہ کے مہر و کرم سے مسرور ہیں، اور اللہ ایمان والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔

یہ پر مسرت زندگی شہداء کو ملے گی اس زندگی کا مقام ''خدا کے پاس'' بتایا گیا ہے، احادیث صحیحہ میں ہے کہ ان زندہ شہیدوں کی روحیں قفس عنصری سے پرواز کر کے جب اڑتی ہیں تو وہ سبز پرندوں کی صورت میں جنت کی سیر کرتی ہیں، اور عرش الٰہی کی قندیلیں ان کا نشیمن بنتی ہیں اس کے بعد غالباً اتنا ہر ذی عقل تسلیم کرے گا کہ انبیاء علیہم السلام کے روحانی مدارج و مراتب شہداء سے بہرحال اعلیٰ اور برتر ہیں اس لئے ان کا مقام بھی اسی احاطہ قدس کے اندر ہوگا، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے سیر معراج اور اپنے رویائے صادقہ میں بعض پیغمبروں کو آسمان اور بہشت کے مختلف مدارج میں دیکھا۔

بعض وہ سعید روحیں ہونگی جو یہاں سے نکل کر فرشتوں کی صف میں داخل ہو جائیں گی جیسا کہ حضرت جعفر طیارؓ کے متعلق احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ وہ شہادت کے بعد اپنے دونوں بازوؤں سے فرشتوں کے ساتھ عالم ملکوت میں اڑ رہے تھے، عالم برزخ کے یہ دو اڑنے والے بازو درحقیقت ان کے دونوں جسمانی بازوؤں کی مثال ہیں جو اس جنگ میں

ان کے جسم سے کٹ کر گر گئے تھے‘ اور وہ اس پر بھی اسلام کے علم کو اپنے بقیہ کٹے ہوئے بازو اور گردن کے سہارے سے پکڑے تھے‘ عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیت ایسے ہی لوگوں کی شان میں ہو۔

﴿ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ○ نَحْنُ أَوْلِيَآؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ﴾ (حم السجدہ۔۴)

بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے‘ پھر ثابت قدم رہے ان پر فرشتے یہ خوشخبری لے کر اترتے ہیں کہ خوف نہ کھاؤ اور غمگین نہ ہو اور اس جنت کی بشارت سنو جس کا تم سے وعدہ کیا تھا‘ ہم دنیا کی زندگی میں تمہارے رفیق ہیں اور آخرت میں بھی۔

یہ آوازۂ بشارت اور فرشتوں کی رفاقت اسی برزخ کا دلکش سماں ہو سکتا ہے۔

* * *

۲۔ آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل

قیامت اور جزائے اعمال

موت تو افراد کا معاملہ ہے' ایک مرتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ پیدا ہوتا ہے تو قومیں بھی باری باری اس بازی گاہ کے تختہ پر آتی ہیں اور ایک قوم اپنا کھیل ختم کر کے کسی دوسری کے لئے جگہ خالی کر جاتی ہے یہ سلسلہ ازل سے قائم ہے اور اب تک چل رہا ہے کائنات جس نظام پر پیدا ہوئی تھی وہ بعینہ قائم ہے اور اس محفل کی جو رونق اول روز تھی وہ اب تک اسی طرح باقی ہے غرض

ع ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی است

لیکن کیا کوئی ایسا دن بھی آئے گا جب یہ ساری بساط ہستی الٹ جائے گی کائنات کی یہ مجلس درہم برہم ہو جائے گی اور آسمان و زمین کے کرے ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گی اور پھر وہ خلاق عالم اپنی صفت خلق واحسان و جزا کے نئے منظر دکھائے گا اور نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو کر ایک اور عالم کسی نئے نظام پر وجود پذیر ہوگا۔

دنیا کے وہ تمام لوگ جو حال کو دیکھ کر مستقبل کا پتہ لگاتے ہیں کسی نہ کسی طرح اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح یہ افراد آتے اور فنا ہوتے ہیں اسی طرح ایک دن آئے گا جب اس پوری دنیائے حیات پر موت طاری ہوگی' سب سے زیادہ اس سوال کے جواب میں کرید بلکہ انکار کا حق فلسفہ اور سائنس کے محققوں (سائنٹسٹوں) کو ہو سکتا ہے مگر اہل فلسفہ کا بڑا گروہ بھی اس امکان پر یقین رکھتا ہے اور اہل سائنس بھی اس امکان کو بہر حال محال نہیں سمجھتے بلکہ طبیعیات و ہیئت جدید کے مختلف محققوں کے خیالات اس باب میں امکان سے آگے بڑھ کر وقوع کی سرحد تک پہنچ چکے ہیں اور اس ہولناک دن کی آمد کے متعلق اپنے علم کے زور سے پیشین گوئیاں کرتے رہتے ہیں اور اس عالمگیر موت کے مختلف اسباب ظاہر کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے اس نظام عالم کی پوری گاڑی جس انجن سے چل رہی ہے وہ یہ گرم آفتاب ہے اور اس کی یہ گرمی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے آخر ایک دن آئے گا جب یہ انجن بالکل ٹھنڈا ہو جائے گا اور ساری گاڑی ٹوٹ پھوٹ جائے گی، ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پورا نظام کائنات جذب و کشش کے ستون پر قائم ہے اور فضائے ہستی کے یہ تمام سیارے روز بروز کھنچتے چلے آتے ہیں تو ایک دن وہ بھی آئے گا جب یہ باہمی توازن باقی نہ رہے گا اور اس وقت تمام کرے ایک دوسرے سے قریب ہو کر ٹکرا جائیں گے اور یہ تصادم ان کو چور چور کر دے گا۔

ایک اور خیال یہ ہے کہ اس فضا میں کروڑوں ستارے تیر رہے ہیں' ان میں سے بہت کم کا علم ہم کو ہوا ہے' بہت ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں ہماری زمین کسی نئے ستارے سے ٹکرا کر چور چور ہو جائے اور اس کی ساری آبادی ہباء منثورا ہو کر رہ جائے۔

بہر حال اسباب طبعی کچھ ہوں مگر ایسا ہونا اہل سائنس کے نزدیک بھی امکان بلکہ وقوع کی امید سے خالی نہیں

اہل مذہب میں یہ عقیدہ کسی نہ کسی نوع سے ہر جگہ موجود ہے اور اس کا مجمل تذکرہ تمام آسمانی کتابوں میں ہے' تورات میں اس کے اشارے پائے جاتے ہیں' زبور میں اس کی تصریحات موجود ہیں اور اس میں اس کو "عدالت کا دن"

کہا گیا ہے۔[1] حضرت مسیحؑ کے زمانہ میں یہود کے دو فرقے تھے ایک صدوقی جو یونانیوں کے اثر سے آزاد خیال ہو گیا تھا اور قیامت کا منکر تھا مگر دوسرا فرقہ جو فریسی کہلاتا تھا بدستور اپنے پرانے عقیدہ پر قائم تھا[2] آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بھی جو یہود تھے وہ قیامت اور حشر و نشر اور بہشت و دوزخ کے قائل تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ جب قیامت آئے گی تو اللہ تعالیٰ ایک انگلی پر آسمانوں کو، دوسری پر زمینوں کو اور تیسری پر درختوں کو، چوتھی پر پانی کو اور اندر کی نرم مٹی کو، اور پانچویں پر تمام مخلوقات کو رکھے گا اور ندا دے گا کہ "میں ہوں بادشاہ"[3] انجیل میں یہ عقیدہ پوری تصریح کے ساتھ مذکور ہے اور حضرت عیسیٰؑ نے صدوقیوں کے مقابلہ میں تورات کی ایک آیت سے حیات اخروی کا ثبوت پیش کیا ہے[4] اور مکاشفات یوحنا میں قیامت کے احوال و اہوال کی پوری تفصیل و تشریح مذکور ہے۔ ہندو پرلے کے نام سے اس عقیدہ (فنائے عالم) پر یقین رکھتے لیکن اس حقیقت کی کامل تشریح خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے۔

قیامت کے نام:

کسی شے کی حقیقت کی اولین گرہ کشائی اس کے ناموں کی تشریح سے ہوتی ہے قران پاک میں قیامت کو بیسیوں ناموں سے یاد کیا گیا ہے، اور ان میں سے ہر ایک نام اس کے ایک خاص پہلو کو نمایاں اور ظاہر کرتا ہے قرآن میں اس کا سب سے پہلا نام جو قرآن کی سب سے پہلی سورہ میں ہے وہ یوم الدین ہے یعنی جزا کا دن جس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ عمومی جزا اور ربانی عدالت کا دن ہوگا اس کے علاوہ اس کے اور بھی بہت سے نام قرآن میں جابجا آئے ہیں۔

اَلسَّاعَۃُ:	وہ گھڑی (وہ مقررہ وقت)۔
یَوْمُ الْقِیَامَۃِ	کھڑے ہونے کا دن (مردوں کے کھڑے ہونے کا دن)۔
اَلْیَوْمُ الْحَقُّ	سچا دن (جس کے آنے میں نہ کوئی شک ہے اور نہ جس کے فیصلہ میں کوئی غلطی ہوگی)۔
یَوْمٌ مَّعْلُوْمٌ	جانا ہوا دن یا مقررہ دن۔
اَلْوَقْتُ الْمَعْلُوْمُ	جانا ہوا وقت یا مقررہ وقت۔
اَلْیَوْمُ الْمَوْعُوْدُ	موعودہ دن۔
اَلْیَوْمُ الْاٰخِرُ	پچھلا دن۔
یَوْمُ الْاٰزِفَۃُ	قریب آنے والی مصیبت کا دن۔
یَوْمٌ عَسِیْرٌ	ایک سخت دن۔

---

[1] زبور۹‘۱۶‘۱۷‘و۲۲‘۲۷وباب۴۹و۵۰۔

[2] انجیل مرقس۱۲‘۲۴واعمال۲۳۔

[3] صحیح بخاری تفسیر سورہ زمر۔

[4] متی۲۲‘۳۱‘۳۲‘لوقا۲۰۔۲۷‘مرقس۱۲۔۱۸۔

یَوْمٌ عَظِیْمٌ	ایک بڑا دن۔
یَوْمٌ عَصِیْبٌ	سخت دن۔
یَوْمُ الْبَعْثِ	جی اٹھنے کا دن۔
یَوْمُ التَّلَاق	باہم ملنے کا دن۔
یَوْمُ التَّنَادِ	پکار کا دن۔
یَوْمُ الْجَمْعِ	اکٹھے ہونے کا دن۔
یَوْمُ الْحِسَابِ	حساب کا دن۔
یَوْمُ الْحَسْرَۃِ	حسرت کا دن۔
یَوْمُ الْخُرُوْجِ	قبروں سے نکلنے کا دن۔
یَوْمُ الْفَصْلِ	فیصلہ کا دن۔
اَلْقَارِعَۃُ	کھڑکھڑانے والی۔
اَلْغَاشِیَۃُ	چھا جانے والی۔
اَلطَّآمَّۃُ الْکُبْرٰی	بڑی مصیبت۔
اَلنَّبَاُ الْعَظِیْمُ	بڑی خبر۔
اَلْحَاقَّۃُ	ضرور آنے والی گھڑی۔
اَلْوَعْدُ	وعدہ۔
اَلْوَاقِعَۃُ	وقوع پذیر۔
اَمْرُ اللّٰہِ	خدا کی بات۔
اَلصَّآخَّۃُ	بہرا کرنے والی گھڑی۔

قیامت کے اوصاف:

یہ تو وہ نام ہیں جو اسم مفرد یا اضافت یا صفت کی صورت میں ہیں ان کے علاوہ فقروں اور جملوں کی ترکیبوں کے ساتھ اس کے اور بھی بکثرت نام قرآن میں آئے ہیں مثلاً

﴿ یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ ﴾ (انعام و نحل و طہٰ)
جس دن نرسنگھا پھونکا جائے۔

﴿ یَوْمَ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُھُمْ ﴾ (مائدہ۔۱۶)
جس دن سچوں کو ان کی سچائی کام دے گی۔

﴿ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴾ (شعراء۔۵)
جس دن نہ مال کام آئے گا نہ اولاد۔

﴿ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ ﴾ (فرقان ۔۳)

جس دن گنہگار اپنے دونوں ہاتھ چبائے گا۔

﴿ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ ﴾ (فرقان ۔۳)

جس دن آسمان پھٹے گا۔

﴿ يَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ (مومن ۔۶)

اور جس دن گواہ کھڑے ہونگے۔

﴿ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ (آل عمران ۔۳۱)

جس دن میں کوئی شک نہیں۔

﴿ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا ﴾ (نمل ۔۷)

جس دن ہر قوم سے ایک گروہ کو اکٹھا کریں گے۔

﴿ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (مطففین ۔۱)

جس دن لوگ جہاں کے پروردگار کے لئے کھڑے ہونگے۔

﴿ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ ﴾ (قمر ۔۱)

جس دن لوگ قبروں سے نکلیں گے۔

﴿ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴾ (عبس ۔۱)

جس دن آدمی اپنے بھائی اور ماں اور باپ اور بیوی اور بیٹوں سے بھاگے گا۔

﴿ يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا ﴾ (بقرہ ۔۱۵)

جس دن کوئی شخص کسی کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔

﴿ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ ﴾ (نور ۔۳)

جس دن ان کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی۔

﴿ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ﴾ (انفطار ۔۱)

جس دن کوئی کسی دوسرے کے لئے کچھ بھلا نہ کر سکے گا۔

﴿ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْئًا ﴾ (دخان ۔۲)

جس دن کوئی دوست کسی دوسرے دوست کو فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔

الغرض یہ اور اسی قسم کے اور دوسرے اوصاف اس ہولناک دن کے بیان کئے گئے ہیں جن سے اس عظیم الشان دن میں انسان کی بے کسی، عاجزی اور اپنے اعمال کے سوا کسی دوسری چیز کے کام آنے سے قطعی مایوسی ظاہر کی گئی ہے۔

قیامت میں فساد نظام ہوگا:

قیامت کے متعلق بعض متکلمین کو یہ شبہ ہوا ہے کہ وہ مادہ کے فنائے محض یا عدم محض کا نام ہے حالانکہ یہ بات

قرآنی تصریحات کے خلاف ہے قرآن پاک کی بیسیوں آیتوں میں قیامت کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ تمام تر فنائے حیات ورآسمان وزمین کے نظام کی برہمی اور ان کی تباہی کے خاکہ کے سوا کچھ اور نہیں ہے چنانچہ حسب ذیل آیات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ خود بخود سامنے آجائے گا۔

﴿ اَلْقَارِعَةُ ○ مَاالْقَارِعَةُ ○ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْقَارِعَةُ ○ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ○ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ﴾ (قارعہ)

متنبہ کرنے والی اور کیا چیز ہے متنبہ کرنے والی، اور تم کو کس نے بتایا کہ کیا چیز ہے متنبہ کرنے والی، یہ وہ دن ہے جب لوگ پریشان پروانوں کی طرح اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہونگے۔

﴿ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ○ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ○ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا ○ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ﴾ (زلزال۔۱)

جب زمین خوب ہلائی جائے گی، اور وہ اپنا بوجھ نکالے گی اور انسان کہے گا، زمین کو کیا ہوا، اس دن وہ اپنی حالت بیان کرے گی۔

﴿ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ○ وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ○ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ○ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ﴾ (انشقاق۔۱)

جب آسمان پھٹ جائیں گے، اور وہ اپنے مالک کی فرمانبرداری کریں گے، اور وہ فرمانبرداری کے لائق ہیں، جب زمین پھیلائی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے اس کو ڈال دے گی، اور وہ خالی ہو جائے گی۔

﴿ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ○ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ○ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ○ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ○ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ﴾ (انفطار۔۱)

جب آسمان پھٹ جائیں گے، اور جب ستارے بکھر جائیں گے، اور جب دریا چلائے جائیں گے، اور جب قبر کے لوگ زندہ کئے جائیں گے، روحوں نے جو پہلے اور پیچھے بھیجا ہے اس وقت جان لیں گی۔

﴿ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ○ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ○ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ﴾ (تکویر۔۱)

جب آفتاب اندھیرا کیا جائے گا جب ستارے تاریک ہو جائیں گے جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔

﴿ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ○ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ○ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ○ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ﴾ (مرسلات۔۱)

جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ یقیناً ہونے والا ہے، جب ستارے ماند کر دیئے جائیں گے، جب آسمان کھول دیا جائے گا جب پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے۔

﴿ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ○ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ○ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴾ (قیامہ۔۱)

جب نگاہ ماند ہو جائے گی، جب ماہتاب بے نور ہو جائے گا، اور آفتاب و ماہتاب اکٹھے کر دیئے جائیں گے۔

﴿ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ○ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ﴾ (معارج۔۱)

جب آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح اور جب پہاڑ روئی کے گالوں کی مانند ہو جائیں گے۔

﴿ فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۞ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۞ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۞ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِیَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ﴾ (الحاقہ۔۱)

جب صور میں ایک پھونک پھونکی جائے گی، جب زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے اور دونوں ٹکڑے ہو جائیں گے اس دن ہونے والی بات ہو جائے گی اور آسمان پھٹ جائے گا اور اس دن کمزور ہو جائے گا۔

﴿ يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا .... فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبَا ۞ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴾ (مزمل۔۱)

جب زمین اور پہاڑوں میں لرزہ ہو گا، اور پہاڑ پگھلا ہوا تانبا ہو جائے گا............ کیونکر متقی ہو سکتے ہیں جب اس دن کا انکار کرتے ہو جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا آسمان اس دن پھٹ جائے گا اور خدا کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔

﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ ﴾ (ابراہیم۔۷)

جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی۔

﴿ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴾ (رحمٰن۔۲)

جب آسمان پھٹ جائیں گے اور سرخ تلچھٹ کی طرح ہو جائیں گے۔

﴿ اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۞ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۞ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۞ اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۞ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۞ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْبَثًّا ﴾ (واقعہ۔۱)

جب ہونے والی بات ہو جائے گی، جس کے ہونے میں جھوٹ نہیں ہے، زیر وزبر کر دینے والی، جب زمین خوب ہلائی جائے گی، اور پہاڑ پراگندہ کئے جائیں گے، اس وقت وہ پریشان ذرات کی طرح ہو جائیں گے۔

﴿ وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۞ وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴾ (نبا۔۱)

اور آسمان کھول دیئے جائیں گے، اور وہ دروازے ہو جائیں گے اور پہاڑ چلائے جائیں گے، تو وہ سراب ہو جائیں گے۔

غرض اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت صرف نظام عالم کی درہمی اور دنیا کی حیات موجودہ کی تباہی کا نام ہے جس کے بعد ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان بنے گا اور پچھلی دنیا کے اعمال کے نتائج پر اس دنیا کی حکومت کا قانون جاری ہوگا۔

﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ (ابراہیم۔۷)

جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی، اور آسمان بھی بدل دیئے جائیں گے اور سب لوگ اس ایک سب پر قابو رکھنے والے خدا کے سامنے نکل کر آئیں گے۔

قیامت کی حقیقت:

اگرچہ قرآن پاک میں متفرق طور پر اس ہولناک دن کے احوال و کیفیات کا ذکر گونا گوں طریقوں سے کیا گیا ہے تاہم ایک خاص سورہ بھی اس نام سے اس میں موجود ہے جس میں نہایت اختصار و ایجاز کے باوجود انتہائی بلیغانہ

وسعت ہے چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑے سے بڑے اور اہم سے اہم مطالب کو اس طرح بیان کیا ہے کہ عقل ساکت اور قلب مطمئن ہو جاتا ہے اس سورہ کا آغاز ان آیتوں سے ہوتا ہے۔

﴿ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝ يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۝ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ۝ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِۨ الْمُسْتَقَرُّ ۝ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ۝ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ﴾ (قیامہ۔۱)

میں قیامت کے دن کی اور ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں' کیا وہ (انسان) سمجھتا ہے کہ ہم اس کے مرنے کے بعد اس کی ہڈیوں کو اکٹھا نہیں کر سکتے' کیوں نہیں ہم تو اس کے پوروں کو درست کر سکتے ہیں' یہ نہیں بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ انسان چاہتا یہ ہے کہ خدا کے سامنے ڈھٹائی کرے' پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہے؟ تو جب نگاہ چوندھانے لگے اور چاند بے نور ہو جائے اور سورج اور چاند ایک جگہ کر دیئے جائیں' انسان اس دن کہے گا' اب کہاں ہے بھاگنے کی جگہ' ہرگز نہیں' کہیں بچاؤ نہیں' اس دن تیرے رب کے پاس ہے جا ٹھہرنا' اس دن انسان کو جو آگے بھیجا (عمل) اور جو پیچھے چھوڑا (مال و دولت) وہ بتایا جائے گا بلکہ انسان اپنے حال کو آپ دیکھتا ہے اگرچہ وہ زبان سے بہانے تراشا کرے۔

ان میں سے پہلی ہی آیت اللہ تعالیٰ نے روزِ قیامت اور نفس لوامہ کی یکے بعد دیگرے قسم کھائی ہے' نفس لوامہ یعنی ملامت کرنے والے نفس سے مقصود انسان کے اندر کا ضمیر ہے جو انسان کے ہر برے کام کے وقت اندر سے غمگین و نادم ہوتا ہے' اور اس کو اس کے اس کام پر ملامت کرتا ہے آخری آیت میں اسی کیفیت ضمیر کو ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے کہ ''بلکہ انسان اپنے حال کو آپ ہی خوب جانتا ہے اگرچہ وہ زبان سے اپنی برائیوں اور کوتاہیوں کے لئے سینکڑوں بہانے تراشے'' انسان کی اسی قلبی کیفیت کا نام نفس لوامہ ہے۔

(۱) اجتماعیات کے عالم اچھی طرح جانتے ہے کہ فرد اور جماعت کے احوال میں ایک خاص قسم کی مناسبت ہے جس طرح آدمی پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہے، بیمار ہوتا ہے، تندرست ہوتا ہے، گنہگار ہوتا ہے، نیکوکار ہوتا ہے' پشیمان ہوتا ہے' محنت کرتا ہے، نیکو نام ہوتا ہے، بدنام ہوتا ہے، خاص طبعی قوانین کی مطابقت سے وہ قوت حاصل کرتا ہے، اور ان کی مخالفت سے وہ بیمار اور کمزور ہوتا ہے، اور پھر ایک خاص عمر کو پہنچ کر رفتہ رفتہ اس کے قوائے عمل سرد پڑ جاتے ہیں اور وہ مر جاتا ہے، بعینہٖ یہی تمام احوال جماعتوں اور قوموں کو بھی پیش آتے ہیں وہ بھی پیدا ہوتی ہیں، بڑھتی ہیں، تندرست ہوتی ہیں، کمزور ہو جاتی ہیں، گنہگار ہوتی ہیں، نیکوکار بنتی ہیں، اور ایک خاص وقت اور عمر کو پہنچ کر ان کے عملی قویٰ کمزور و مضمحل ہو جاتے ہیں' اور وہ فنا ہو جاتی ہیں۔

دنیا میں اسی اصول پر ہزاروں قومیں پیدا ہو کر فنا ہو چکی ہیں' جن کے نام بھی تاریخ کے صفحوں پر اب موجود نہیں ہیں تو جس اصول پر اشخاص اور اشخاص کا مجموعہ جماعتیں اور جماعتوں کا مجموعہ اقوام پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہیں' کیا اسی

اصول پر تمام اقوام عالم کا مجموعہ جو پیدا ہوتا' بڑھتا اور ترقی کرتا چلا جاتا ہے' وہ ایک دن فنائے محض کے آغوش میں جا کر سو نہ جائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے قیامت کے ثبوت میں اکثر عاد و ثمود و آل فرعون وغیرہ کی تباہی سے قیامت کی عمومی تباہی پر استدلال کیا ہے' اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

بہرحال اب جس طرح شخص کے اندر ایک نفس لوامہ یا ضمیر یا احساس ہے جو اس کے ہر برے فعل کے وقت اس کو ملامت کرتا ہے اور اس کو گنہگار ٹھہراتا ہے اور جب کبھی وہ اپنے تمام مجموعی کارناموں پر نگاہ ڈالتا ہے تو اپنے کو قصور وار جانتا ہے اور گنہگار ٹھہراتا ہے اسی طرح قوموں کا ضمیر بھی اپنے گناہوں پر پچھتاتا اور اپنی تقصیروں پر نادم اور اپنی کوتاہیوں سے شرمندہ ہوتا ہے اور ٹھیک اسی طرح یہ پوری انسانیت بھی ایک دن اپنے افراد کے مجموعی کارناموں پر نادم و پشیمان ہوگی اور اس کا ضمیر و نفس لوامہ اس کو ملامت کرے گا کائنات انسانی سے بڑھ کر خود کائنات ہستی بھی اس پر جو اس کے اندر کیا گیا اپنے خالق کے سامنے اپنی پشیمانی و ندامت کا اظہار کرے گی اسی عمومی اعتراف قصور اور کلی ندامت و پشیمانی کا نام قیامت ہے اور اسی مناسبت سے اس سورۂ بالا میں نفس لوامہ اور قیامت کو باہم ایک قسم میں یعنی شہادت میں یکجا کیا گیا ہے اب اس تفصیل کی روشنی میں سورہ مذکور کی آیتوں کو دوبارہ پڑھئے۔ [1]

(۲) اس عالم کی ہر چیز پر اگر غور سے نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ وہ متضاد عناصر و قویٰ کا مجموعہ ہے اس میں سردی و گرمی' بیماری و تندرستی، بقا و فنا اور دیگر ہر قسم کی متضاد قوتیں ودیعت کی گئی ہیں' ان متضاد قوتوں میں جب تک اعتدال قائم رہتا ہے وہ زندہ رہتی ہیں اور جس وقت یہ اعتدال جاتا رہتا ہے اسی لمحہ وہ فنا ہو جاتی ہیں ایک درخت میں ایک پھول کھلا' سردی و گرمی اور موسم کی تاثیر نے اس پر عمل کیا جب تک ان متضاد تاثیرات و استعدادات میں اعتدال کی کیفیت رہی وہ پھول شگفتہ رہا جس آن میں کسی قوت نے شکست کھائی پھول کی ہستی معرض فنا میں آ گئی' یہی حال دنیا کی ہر چیز کا ہے اور اسی اصول پر افراد' خاندان' جماعتیں' قومیں بلکہ حیوانات، شجر حجر غرض دنیا کی ہر چیز چل رہی ہے۔

پوری کائنات ہستی کو لیجئے اس کو خلاق عالم نے انہیں متضاد عناصر و اخلاط کے اصول پر قائم فرمایا ہے دن رات' روشنی تاریکی، سردی اور گرمی، پانی اور آگ، بہار و خزاں' تندرستی اور بیماری، دولت اور افلاس' حیات اور موت' آسمان و زمین، نیکی و بدی' خیر و شر' غرض جدھر بھی دیکھو یہی معلوم ہوگا کہ یہ اربع عناصر کی چہار دیواری' انہیں متضاد قویٰ اور حالات کی بنیادوں پر قائم ہے ان میں جب تک اعتدال قائم ہے یہ دنیا کی ہستی چل رہی ہے۔ جس دن ان کے اعتدال میں فرق آئے گا وہی دن اس کی فنا کا ہوگا۔

لیکن جس طرح افراد و اشخاص میں جہاں بیماری کے بعد تندرستی اور تندرستی کے بعد بیماری کی صلاحیت موجود ہے اسی طرح اس نظام کائنات میں بھی تندرستی کے بعد بیماری اور بیماری کے بعد تندرستی کی صلاحیتیں موجود ہیں' کتنی دفعہ یہ واقعہ پیش آیا کہ دنیا ظلم و جور سے لبریز ہو گئی اور کشت و خون کے سیلاب نے اس کے امن و امان کو غرق کر دیا کہ دفعتاً وہ پھر ابھری اور اس کا غرق شدہ امن و امان کشتی نوح بن کر کرۂ ارضی کو بچا لے گیا، بارہا اس باغ ہستی میں خزاں آئی اور پھر بہار کا موسم اس پر چھا گیا اجرام سماوی کی باہمی مسابقت میں ہماری زمین کئی دفعہ ٹکرانے کے قریب پہنچی اور پھر بال بال بچ گئی

---

[1] مستفاد از تفسیر سورہ قیامہ مولانا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ۔

یہ کرے اپنی رفتار میں بسا اوقات گرنے کے قریب پہنچے کہ پھر سنبھل گئے مگر فساد و صلاح کا یہ اصول اسی وقت تک چل رہا ہے جب تک ان متضاد قویٰ اور کائنات کے استعدادات میں یہ اعتدال قائم ہے، جس دن یہ اعتدال فنا ہوگا نظام ارضی کا یہ پورا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا اور اس وقت زمین اپنی عمر کی پوری تاریخ اور کارناموں کے ساتھ اپنے خالق کے سامنے کھڑی ہوگی اور اپنے اوپر کی ہر کوتاہی و قصور کی شہادت اپنی زبان سے سنائے گی۔

﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ (زلزال۔۱)

جس وقت پوری زمین ہلائی جائے گی، اور جب زمین اپنے اندر کے بوجھوں کو اگل دے گی، اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے اس دن وہ اپنی باتیں بیان کرے گی کہ اس کے پروردگار نے حکم دیا ہے، اس دن لوگ لوٹیں گے کہ اپنے عمل دیکھیں، تو جس کسی نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا، اور جس نے ذرہ برابر اگر بدی کی ہے تو اس کو بھی دیکھ لے گا۔

صور قیامت:

قرآن میں قیامت کے ذکر میں صور پھونکنے کا بار بار ذکر آیا ہے ﴿فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ﴾ ”پھر جب صور پھونکا جائے گا“ صور کے لفظی معنی نرسنگھا کے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ قدیم الایام میں بابلیوں، کنعانیوں، آرامیوں اور عبرانیوں وغیرہ تمام پرانی قوموں میں بادشاہی جلال و جلوس اور اعلان جنگ کے موقعوں پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا اس لئے نرسنگھا پھونکنے کے معنی شاہی جلال کے اظہار اور غیر معمولی خطرہ کا اعلان ہے چنانچہ توراۃ میں یہ محاورہ بکثرت استعمال کیا گیا ہے قرآن میں ہے کہ اس دن ندا ہوگی ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ ”آج کس کی بادشاہی ہے“ پھر اللہ تعالیٰ خود ہی جواب دے گا ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ ”اس ایک سب پر غالب آنے والے کی“ غرض وہ دن آسمان و زمین اور نظم کائنات کے شہنشاہ مطلق کے اظہار جلال اور شدید خطرہ جنگ کے اعلان کا ہوگا اس لئے اس کے لئے نفخ صور اور نرسنگھا پھونکنے کا قدیم محاورہ استعمال کیا گیا ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ لفظی معنوں میں بھی اس دن اپنی شہنشاہی کے نرسنگھا پھونکنے کا حکم دے اور اس کی تعمیل ہو۔

عربوں کا انکار:

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ قیامت اپنے اندر کتنی عظیم الشان حقیقت رکھتی ہے لیکن اہل عرب کو توحید کے بعد جس عقیدہ سے شدت کے ساتھ انکار تھا اور جس کے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے تھے اور جو ان کی عقل میں کسی طرح نہیں سماتا تھا وہ یہی قیامت اور حشر و نشر کا مسئلہ ہے جاہلی عرب حیات بعد الموت اور خدا کے آگے اپنے اعمال کے مواخذہ اور پرستش اور جزا و سزا سے قطعاً لاعلم تھے اور اس لئے ان میں اعمال کے خیر و شر اور نیکی بدی کی وہ تمیز نہ تھی جن پر تمام اخلاق و معاملات کا دارومدار ہے، عرب کا شاعر آنحضرتؐ کی اس تعلیم کو سن کر تعجب سے کہتا ہے۔ ﴿اموت ثم بعث ثم حشر حديث خرافة يا ام عمر﴾ کیا موت ہے پھر جی اٹھنا ہے پھر اکٹھا ہونا ہے اے ام عمر! (شاعر کی بیوی کا نام) یہ سب خرافات باتیں ہیں۔ قریش کے ایک دوسرے شاعر[۱] کہتا ہے ﴿يُحَدِّثُنَا النَّبِيُّ بِاَنْ سَنُحْيٰى وَكَيْفَ

---

[۱] صحیح بخاری جلد اول باب الہجرۃ ص ۵۵۸۔

حیاۃ اصداء وھام ﴾ نبی ہم سے کہتا ہے کہ ہم پھر زندہ کئے جائیں گے حالانکہ صدا اور ہام ہوکر پھر زندگی کیسی؟

ان کا عقیدہ تھا کہ انسان مر کر پرندہ ہو جاتا ہے اور آواز دیتا پھرتا ہے اسی کا نام ان کے ہاں صدٰی اور ہام تھا

قرآن مجید میں بھی ان کے یہ اقوال بکثرت نقل کئے گئے ہیں، مثلاً

﴿ ءَاِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ ﴾ (ق۔۱۷)

کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے، یہ لوٹنا بہت دور ہے۔

﴿ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ۝ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ﴾ (النازعات۔۱)

کیا ہم دوبارہ الٹے پاؤں لوٹائے جائیں گے، کیا جب ہم سڑی ہوئی ہڈیاں ہو جائیں گے۔

﴿ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴾ (اسرائیل۔۵۔۱۰)

کیا جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو ہم نئے بنا کر پھر اٹھائے جانے والے ہیں۔

﴿ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴾ (یٰسین۔۵)

ان سڑی گلی ہڈیوں کو کون جلائے گا۔

ان میں بعضوں کا عقیدہ دہریوں کی طرح تھا کہ یہ دنیا اسی طرح قائم رہے گی، موت و حیات کا بھی سلسلہ اسی طرح برابر جاری رہے گا اور اس دنیاوی زندگی کے علاوہ کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔

﴿ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ﴾ (جاثیہ۔۳)

انہوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے، دوسری نہیں، مرتے اور جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو مارتا ہے۔

﴿ وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴾ (انعام۔۳)

اور انہوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے، ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔

انہیں اپنے اعمال کے حساب و مواخذہ کا بھی یقین نہ تھا۔

﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴾ (نبا۔۱)

وہ حساب کی امید نہیں رکھتے تھے۔

خباب بن الارتؓ ابتدائی مسلمانوں میں ہیں، یہ لوہاری کا پیشہ کرتے تھے، ان کے کچھ دام قریش کے ایک رئیس عاص بن وائل پر واجب الادا تھے وہ جب جا کر تقاضا کرتے تو عاص کہتا ”جب تک تم محمد کا انکار نہ کرو گے میں تم کو کچھ نہ دوں گا“ انہوں نے کہا کہ ”یہ اس وقت نہیں ہو سکتا جب تک تم مر کر پھر جیو نہیں“ اس نے کہا ”کیا مر کر مجھے پھر جینا ہے“ انہوں نے کہا ”بے شک“ اس نے مذاق سے کہا ”اچھا تو پھر وہیں میرا مال و دولت اور سر و سامان ہوگا وہیں تم دام بھی لے لینا“[۱] اس سے اندازہ ہوگا کہ اس بارہ میں ان کا کفر کتنا شدید تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے ان کے سامنے توحید کے بعد جس عقیدہ کو سب سے زیادہ شدت کے ساتھ پیش کیا وہ یہی تھا قرآن مجید کی مکی سورتوں میں سب سے زیادہ اسی مضمون کو مختلف تعبیروں اور موثر طریقوں سے روزمرہ کے عینی مشاہدات اور دلائل کے ساتھ بتکرار بیان کیا گیا ہے ان میں ہیبت الٰہی، ہنگامہ قیامت اور حشر و نشر کے رستخیز کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ سننے والا سرتاپا اثر ہو جائے انسان کے عجز عقل کے قصور

---

[۱] صحیح بخاری تفسیر کھیعص صفحہ ۶۶۱۔

خدا کی عظمت وقدرت اور کائنات کی حیرت انگیز خلقت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سامع ہر قدم پر لرزہ براندام ہو جاتا ہے پھر ایک طرف حیات ابدی، نعیم جنت اور بہشت کی مسرتوں کا اور دوسری طرف موت کی بے بسی، دنیا کی فنا، دوزخ کی دہشت اور عذاب الٰہی کی تہدید کا ایسا ہولناک نقشہ کھینچا ہے کہ نفس انسانی اپنے تاثر کو چھپانے پر قادر نہیں رہتا۔

وحی الٰہی نے قیامت اور بہشت و دوزخ کے حالات و مناظر کو سب سے پہلے جن اسباب سے پیش کیا ہے ان سے اہل نظر صحابہؓ ناواقف نہ تھے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں پہلے ایک بڑی سورت نازل ہوئی جس میں جنت و دوزخ کا بیان ہے یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے تب حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے اور اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ شراب نہ پیو، بدکاری نہ کرو تو لوگ نہ مانتے یہ آیت کہ ﴿ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰی وَاَمَرُّ ﴾ (بلکہ ان کے وعدہ کا وقت قیامت کی گھڑی ہے اور قیامت کی گھڑی نہایت مصیبت کی اور تلخ ہوگی) مکہ معظمہ میں اتری اور میں اس وقت کمسن بچی تھی، کھیلتی تھی، بقرہ اور نساء کی سورتیں جن میں احکام ہیں اس وقت اتریں جب میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ [1]

اس تشریح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم محمدی نے اس حقیقت کو ایمان کے اصول و اساس میں کیوں داخل کیا ہے کہ اگر یہ تعلیم عقائد میں شامل نہ ہوتی تو دلوں میں اعمال کی جزاء و سزا کی ہیبت اور عظمت نہ بیٹھتی اور نہ احکام الٰہی کی تعمیل میں دلی رجحان اور میلان پیدا ہوتا اور یہودیوں کی طرح جن کے صحیفوں میں زیادہ تر دنیاوی ہی جزا و سزا کا ذکر باقی ہے دوسرے اہل ایمان کے دل بھی سخت اور تاثر سے خالی ہو جاتے، چنانچہ اس فلسفہ کو خود قرآن نے بیان کیا ہے۔

﴿ فَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ (نحل۔۳)

تو جو لوگ آخرت کا یقین نہیں کرتے، ان کے دل نہیں مانتے اور وہ غرور میں مبتلا ہیں۔

اس لئے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ تلاوت کریں، جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے مالك یوم الدین ”روز جزاء کا مالک“ اسلام چاہتا ہے کہ یہ حقیقت اس کے پیروؤں کے دلوں میں پوری طرح گھر کر لے۔

قیامت پر قرآنی دلائل:

قرآن نے قیامت کی ضرورت پر تمام دوسری دلیلوں سے قطع نظر کر کے عموماً دو باتوں سے استدلال کیا ہے اول یہ کہ انسان بے کار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا گیا اگر اس کے اعمال کا مواخذہ اور جزا و سزا نہ ہوتی تو خیر و شر اور نیکی و بدی کا فطری امتیاز لغو اور انسانی زندگی تمام تر بے مقصد اور اس کے تمام کام بے نتیجہ ہو جائیں۔

﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴾ (مومنون۔۱۱۵)

(اے لوگو!) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے۔

﴿ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَكَ سُدًی ﴾ (قیامہ۔۲)

کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔

دوسری بات جو روز جزاء کی ضرورت کے ثبوت میں قرآن نے پیش کی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا عادل اور منصف ہونا

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۷۴۸ باب تالیف القرآن۔

ہے، اگر اچھے برے انسانوں کے اعمال کی جزا وسزا نہ ہو تو دونوں کا درجہ برابر ہو جائے اور نیکی و بدی اور گناہ وثواب کے کوئی معنی نہ رہیں، بلکہ نعوذ باللہ خدا ظالم اور غیر منصف قرار پائے، اس موجودہ مادی دنیا میں بھی انسانوں کو اپنے اعمال کی کچھ نہ کچھ جزاء ملتی ہے، تاہم یہ صاف نظر آتا ہے کہ بہت سے گنہگار سیہ کار اور ظالم یہاں آرام اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور بہت سے نیکوکار، پرہیزگار اور اچھے لوگ مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلتے ہیں، اس لئے یقیناً یہ موجودہ زندگی اعمال کی جزاء وسزا کی اصلی جگہ نہیں ہو سکتی، اس بناء پر دوسری زندگی کا ماننا ضروری ہے جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا نتیجہ مل سکے، اس موجودہ دنیا میں دنیاوی حکام اپنے ناقص علم کے مطابق اچھوں اور بروں کو ان کے اعمال کی جزا وسزا دیتے رہتے ہیں پھر کتنا ضروری ہے کہ پوری دنیا کا عالم الغیب حاکم اپنے صحیح علم کے مطابق لوگوں کو جزاء وسزا دے کر اپنے عدل وانصاف کا ثبوت دے۔ سورۂ والتین میں اسی استدلال کی طرف اشارہ ہے۔

﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ۝ فَمَا یُکَذِّبُكَ بَعۡدُ بِالدِّیۡنِ ۝ اَلَیۡسَ اللّٰهُ بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ﴾ (التین۔۱)

لیکن جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کئے، ان کے لئے نہ ختم ہونے والا اجر ہے، پھر اس کے بعد تجھ کو کیا چیز جزاء پر یقین لانے نہیں دیتی، کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم نہیں (تمام فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا نہیں)

اسی لئے قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ نیک و بد کا نتیجہ عمل یکساں نہیں ہو سکتا، ایک جگہ خدا فرماتا ہے۔

﴿اَمۡ نَجۡعَلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالۡمُفۡسِدِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ اَمۡ نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِیۡنَ کَالۡفُجَّارِ﴾ (ص۔۳)

کیا ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان کی طرح کر دیں جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کر دیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا۔

﴿اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ نَّجۡعَلَهُمۡ کَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحۡیَاهُمۡ وَمَمَاتُهُمۡ سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ﴾ (جاثیہ۔۲)

کیا انہوں نے جنہوں نے گناہ کمایا یہ خیال کیا کہ ہم ان کو ان کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک کام کئے، ان دونوں کی زندگی اور موت برابر ہوگی؟ ان کا یہ خیال برا ہے۔

لوگوں کو روز جزاء اور قیامت پر یقین کرنے سے جو وہم مانع تھا وہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر کوئی جیتا نہیں، تو قیامت کے دن کیونکر جلائے جائیں گے، یہ حقیقت میں استبعادی شبہ ہے یعنی چونکہ مر کر دوبارہ جینا اب تک انسان کے تجربہ میں نہیں آیا، اس لئے اس کو دوبارہ زندگی کا خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے، ورنہ اس کے ان ہونی اور محال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے، وحی محمدی نے اس گتھی کو اس طرح سلجھایا کہ کفار کے اس استبعاد کے وہم کو حسب ذیل مختلف طریقوں سے دور کر دیا۔

۱۔ مر کر جینے کی بعض تاریخی مثالیں پیش کیں جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت عزیرؑ اور اصحاب کہف کے قصوں میں مذکور ہیں اور ان سے استدلال کیا کہ جب چند آدمی یا پرند مر کر جی سکتے ہیں تو پوری دنیا بھی مر کر جی سکتی ہے۔

۲۔ جس طرح زمین گرمیوں میں خشک اور بے حیات ہو جاتی ہے اور پھر دفعۃً بارش کے ایک چھینٹے سے اس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے سبزے نکل آتے ہیں، کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں، اسی طرح قدرت الٰہی کی ایک بارش زمین سے انسانی دفینوں کو اگلوا دے گی ﴿ وَاَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا ﴾ (اور زمین اپنے اندر کے بوجھوں کو باہر نکال دے گی اور دوبارہ نئی زندگی پیدا کر دے گی)

۳۔ دوبارہ زندگی پر تعجب اور استبعاد اس لئے ہے کہ خدا کے دائرہ قدرت کی پوری وسعت ہماری سمجھ میں نہیں آئی جس نے آسمان بنائے، زمین بنائی، آسمان سے پانی برسایا، مردہ زمین سے زندہ کھیتیاں سبزے اور درخت اگائے اور پانی کے ایک قطرہ سے انسان بنایا، کیا وہ ان کی فنا کے بعد دوبارہ ان کی ایجاد پر قادر نہیں؟

۴۔ حیات کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست و معدوم تھا خدا نے اس کو ہست و موجود کیا پھر رفتہ رفتہ اس کو معدوم کر دیا، تو جس نے پہلے بغیر کسی مثال کے اس کارخانہ کو پیدا کیا وہ کیا دوبارہ اس کو پیدا نہیں کر سکتا۔ جس نے نقش اول بنایا کیا نقش ثانی کھینچنے پر اس کو قدرت نہیں؟

۵۔ دنیا میں باری باری بہت سی قومیں وجود میں آئیں اور قوانین الٰہی کے مطابق انہوں نے جسمانی زور و طاقت، مالی وسعت، اجتماعی اور تمدنی عظمت اور سیاسی قوت حاصل کی، بڑی بڑی عمارتیں بنائیں، عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالی، قوموں کو اپنا محکوم بنا کر حکومت و سلطنت قائم کی، پھر جب انہوں نے غرور و نخوت، ظلم و ستم اور دوسرے قوانین الٰہی کی جو قوموں کی ہستی اور عظمت کی بقاء کے لئے ضروری ہیں، مخالفت کی تو وہ فنا کر دی گئیں اور ان کا نام و نشان بھی صفحہ ہستی سے مٹ گیا، عربوں سے سوال کیا کہ تمہارے عاد و ثمود جو کبھی بنو سام کے ممالک عراق و شام و مصر و عرب پر چھائے ہوئے تھے، کیا ہوئے؟ سباء اور تبع کی عظیم الشان حکومتیں کیا ہوئیں؟ فرعون اور اس کی سلطنت کا کیا حال ہوا؟ قومِ لوط اور قومِ مدین کو زمین کیونکر نگل گئی؟ قرآن نے اہل عرب سے خطاب کر کے کہا۔

﴿ اَوَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَيَنۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ كَانُوۡا مِنۡ قَبۡلِهِمۡ كَانُوۡا هُمۡ اَشَدَّ مِنۡهُمۡ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِى الۡاَرۡضِ ﴾ (مومن۔۳)

کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان سے پہلوں کا کیسا انجام ہوا، جو ان سے قوت اور زمین میں یادگاروں کے لحاظ سے کہیں بڑھ کر تھے۔

﴿ اَلَمۡ يَاۡتِكُمۡ نَبَؤُا الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوۡدَ ؕ وَالَّذِيۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ ؕ لَا يَعۡلَمُهُمۡ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ (ابراہیم۔۲)

کیا نوح کی قوم، اور عاد و ثمود کی اور جو ان کے بعد آئے، جن کو خدا ہی جانتا ہے، ان کی خبر تم کو معلوم نہ ہوئی۔

یہ تو وہ قومیں ہیں جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ دنیا کی تاریخ میں کتنی قوموں کے عروج و فنا کی داستانیں محفوظ ہیں، بابلی، اسیر، اکادی اور مصری قومیں جو کبھی روئے زمین پر کوس لِمَنِ الۡمُلۡكُ بجاتی تھیں ہزار ہا سال سے

بے نشان ہیں نارمن جیسے فاتح کیا ہوئے' یونانی اور رومی جو کبھی دنیا کے تنہا مالک بن گئے تھے اب ان کا کہیں وجود ہے؟ مجوس جو رومیوں کے مقابل صدیوں تک برسر پیکار رہے ان ان کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں رہی' امریکہ کے قدیم باشندے جو کبھی اس براعظم کے واحد مالک تھے اب فنا کے قریب ہیں۔

الغرض جس طرح افراد جی کر مر جاتے ہیں جماعتیں وجود میں آ کر مٹ جاتی ہیں' قومیں پیدا ہو کر فنا ہو جاتی ہیں اسی طرح پوری دنیائے مخلوقات میں بھی ایک دن آئے گا جب قانون الٰہی کے مطابق معدوم ہو جائے گی۔

جس طرح عوام جو قوموں کی تاریخ سے واقف نہیں' صرف افراد کو جیتے اور مرتے دیکھتے ہیں وہ گو افراد کی فناء کا یقین رکھتے ہیں لیکن قوموں کی فناء کے مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے اور اس میں شک کرتے ہیں اسی طرح جن کی نظر دنیائے خلق کی تاریخ پر نہیں وہ اس کے فنائے کامل پر اپنی جہالت اور نادانی سے اعتبار نہیں کرتے حالانکہ ایک دن وہ آئے گا جب پوری دنیا اپنے وجود کی صلاحیت سے معرا ہو کر فنا ہو جائے گی اور کائنات کا یہ نظام بدل جائے گا اور اس میں موجود عالم کا قانون طبعی ایک دوسرے طبعی قانون سے منسوخ ہو جائے گا اور جیسا کہ سائنس کہتی ہے اور قرآن نے نقشہ کھینچا ہے' آفتاب و ماہتاب اور ستارے اور تمام اجرام فلکی ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے' اور پوری دنیا کی عدالت قائم ہو کر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا۔

﴿ یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّارِ ﴾ (ابراہیم۔ ۷)

جس دن یہ زمین اور زمین سے بدل جائے گی' اور آسمان بھی اور مخلوق اکیلے زبردست خدا کے سامنے نکل کھڑی ہو گی

سورۂ ق میں قیامت پر استدلال ان ہی دلیلوں سے کیا گیا ہے۔

﴿ قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ۝ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَھُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْھُمْ فَقَالَ الْکٰفِرُوْنَ ھٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَکُنَّا تُرَابًا ذٰلِکَ رَجْعٌ بَعِیْدٌ ۝ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْھُمْ وَعِنْدَنَا کِتٰبٌ حَفِیْظٌ ۝ بَلْ کَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَھُمْ فَھُمْ فِیْٓ اَمْرٍ مَّرِیْجٍ ۝ اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَھُمْ کَیْفَ بَنَیْنٰھَا وَزَیَّنّٰھَا وَمَا لَھَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰھَا وَاَلْقَیْنَا فِیْھَا رَوَاسِیَ وَاَنْۢبَتْنَا فِیْھَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍۭ بَھِیْجٍ ۝ تَبْصِرَۃً وَّذِکْرٰی لِکُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ ۝ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَکًا فَاَنْۢبَتْنَا بِہٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِیْدِ ۝ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّھَا طَلْعٌ نَّضِیْدٌ ۝ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْیَیْنَا بِہٖ بَلْدَۃً مَّیْتًا ط کَذٰلِکَ الْخُرُوْجُ ۝ کَذَّبَتْ قَبْلَھُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ۝ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ۝ وَّاَصْحٰبُ الْاَیْکَۃِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ط کُلٌّ کَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِیْدِ ۝ اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ ھُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ﴾ (ق۔ ۱)

قسم ہے اس بڑی شان والے قرآن کی (جو مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے ان کافروں کو عقلی انکار نہیں ہے) بلکہ ان کو اس سے تعجب ہے کہ ان میں کا ایک آدمی آ کر ان کو (قیامت کا) ڈرسناتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تعجب کی بات ہے کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو پھر زندہ ہوں گے) یہ دوبارہ لوٹنا تو دور از عقل ہے' (خدا کہتا ہے یہ تعجب کی کیا بات ہے) ہم کو معلوم ہے کہ زمین ان مردہ جسموں میں جو کمی کرتی ہے اور ہمارے پاس محفوظ ہے بلکہ بات یہ ہے کہ ان کافروں نے سچائی جھٹلا دی جب وہ ان کے پاس آئی انہوں نے جھٹلا دیا تو وہ الجھی باتوں میں پڑ

گئے کیا انہوں نے اپنے اوپر کے آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسا بنایا اور کس طرح اس کو سجایا ہے کہ اس میں کہیں سوراخ نہیں اور زمین کو پھیلایا ہے اور اس میں پہاڑ کے لنگر ڈالے اور اس میں قسم قسم کی رونق کی چیزیں اُگائیں کہ ہر رجوع ہونے والے بندہ کو اس سے سوجھ ہو اور یاد آئے اور آسمان سے برکت کا پانی برسایا، پھر اس سے باغ اور کٹتے کھیت کے اناج اُگائے، اور کھجوروں کے لمبے درخت جن کے خوشے اوپر تلے ہیں' یہ بندوں کو روزی پہنچانے کے لئے ہے اور اس پانی سے مردہ آبادی کو ہم زندہ کرتے ہیں، اسی طرح قبروں سے نکلنا ہے' ان کافروں سے پہلے نوح کی قوم' رس والے اور ثمود اور عاد اور فرعون اور لوط کے بھائیوں نے اور جنگل والوں نے، اور تبع کی قوم نے اس کو جھٹلایا (ان میں سے ہر ایک نے پیغمبروں کو جھٹلایا) تو میری دھمکی پوری اتری' کیا ہم پہلے پیدا کر کے تھک گئے جو دوبارہ پیدا نہیں کر سکتے' بات یہ ہے کہ ان کافروں کو از سر نو پیدائش میں شک ہے۔

سورۂ قیامہ میں بھی اس کا بیان ہے اس کی آخری آیتیں یہ ہیں۔

﴿ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی ○ اَلَمْ یَکُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی ○ ثُمَّ کَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ○ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَیْنِ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی ○ اَلَیْسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِۦَ الْمَوْتٰی ﴾ (قیامہ۔۲)

کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یونہی بیکار چھوڑ دیا جائے گا' کیا وہ پانی کی ایک ٹپکی ہوئی بوند نہ تھا' پھر وہ بندھا ہوا خون ہوا' پھر خدا نے اس کو بنایا اور اس کو ٹھیک کیا' پھر اس کو جوڑا' یعنی نر اور مادہ کیا وہ خدا اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ جلائے؟

﴿ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا کُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِیْدًا ○ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ﴾ (بنی اسرائیل۔۱۱)

اور وہ بولے کہ جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے' تو کیا پھر نئے بنا کر اٹھائے جائیں گے؟ کیا یہ نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں کو اور زمین کو بنایا وہ ان لوگوں کے مثل کو دوبارہ بھی بنا سکتا ہے۔

ایک اور جگہ فرمایا۔

﴿ وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَیْهِ ﴾ (روم۔۳)

اور خدا وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے' پھر اس کو دوبارہ خلق کرے گا' یہ دوبارہ خلق کرنا اس کے لئے بہت آسان ہے۔

﴿ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ﴾ (حج۔۱)

(لوگو) اگر تم کو دوبارہ زندگی میں شک ہے تو (پہلے) تم کو اسی مردہ مٹی سے پیدا کر چکے ہیں (پھر دوبارہ کیوں نہیں پیدا کر سکتے)

قیامت کے متعلق تمام دور دراز طول طویل شکوک و شبہات کا کتنا مختصر جواب ہے۔

﴿ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ ○ قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ﴾ (یٰسین۔۵)

وہ بولا کہ کون ان سڑی کھوکھلی ہڈیوں کو جلائے گا' کہہ دے وہی جس نے پہلی دفعہ ان کو بنایا۔

غرض وحی محمدی نے ہر پہلو سے کفار کے اس استعجاب اور استبعاد کو دور کیا اور ان کو دوبارہ زندگی کا یقین دلایا۔

حشر جسمانی :

اس بحث پر لوگوں نے قیامت برپا کر رکھی ہے کہ یہ دوبارہ زندگی آیا اسی گوشت پوست کے ساتھ ہوگی یا صرف روحانی ہوگی جہاں جسم و جسمانیت کا مطلق گذر نہ ہوگا گو قرآن پاک کی مختلف آیتیں مختلف پہلوؤں کو پیش کرتی ہیں جن میں اشارۃً ہر قسم کی باتیں آجاتی ہیں تاہم قیامت کے متعلق اوپر کی آیتوں میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو کفار کو تعجب ہے کہ کیا ہمارا یہ جسم مر کر پھر جئے گا کیا ہماری ان سڑی گلی ہڈیوں میں دوبارہ جان پڑے گی اور ہم قبروں سے نکل کر پھر اٹھ کھڑے ہونگے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی زندگی کے علاوہ زندگی کا کوئی دوسرا مفہوم ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا، مگر اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم تعجب نہ کرو اور انکار پر آمادہ نہ ہو کہ تمہارے یہ فنا شدہ جسم نہیں اٹھائے جائیں گے اور نہ تمہاری ان بوسیدہ ہڈیوں میں روح پھونکی جائے گی بلکہ وہ تو سراسر روحانی زندگی ہوگی کیونکہ جب دوبارہ جسمانی زندگی کا تخیل ان کے لئے ناقابل فہم تھا تو خالص روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی ان کے فہم سے دور تھا اور اب بھی ہے کہ ہم اس مادی زندگی کے جاننے والے سرتاپا روحانی زندگی کے تصور سے بالکل عاجز ہیں اس لئے مصلحت الٰہی اسی کی مقتضی تھی کہ وہ اصل واقعہ پر زور دے اور کیسے اور کیوں سے تعرض نہ کرے، اور صاحب فہم کو اس کے فہم کے مطابق اس راز کو سمجھنے دے، چنانچہ قرآن پاک کے اس اسلوب بیان کو اگر سمجھنا ہے تو ان آیتوں پر غور کرنا چاہئے۔

﴿ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ؕ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ﴾ (سجدہ۔۱)

اور انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم زمین میں کھو جائیں گے کیا ہم نئی پیدائش میں پھر ہونگے (خدا فرماتا ہے یہ کچھ نہیں بلکہ یہ اپنے پروردگار کی ملاقات کے منکر ہیں۔

غور کرو کہ ان کی مادی معدومیت کے بعد مادی پیدائش کے پُر تعجب انکار پر اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا کہ یہ شکوک و شبہات اس لئے ان کو پیش آتے ہیں کہ مرنے کے بعد خدا کی ملاقات اور اس کے سامنے ہونے سے ان کو انکار ہے اور حواشی کو چھوڑ کر اصل مقصود یہی ہے کہ موت کے بعد اور آخرت میں خدا کے سامنے ہونے پر یقین رکھا جائے، اس سے ان کو کیا مطلب کہ وہ کس طرح ہوگا، چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا۔

﴿ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴾ (سجدہ۔۱۱)

جواب میں کہہ دے کہ ملک الموت جو تم پر متعین ہے وہ تم کو موت دے گا، پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹا دیئے جاؤ گے۔

یہی ملاقات اور رجوع الی اللہ اس عقیدۂ حشر کی اصلی روح ہے۔

بات یہ ہے کہ ہم انہی باتوں کو سمجھ بوجھ سکتے ہیں جن کی مثالیں اور نظیریں اس مادی دنیا میں ہماری نگاہوں سے گذرتی رہتی ہیں اور وہ عالم جو نگاہوں سے مستور بلکہ تصور سے بھی دور ہے اس کی باتوں کو اس طرح سمجھنا کہ ہر سوال اور تکرار سوال ہم وہ بے نیاز ہو جائیں، تقریباً ناممکن ہے۔ اس کے متعلق جو کچھ کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس دیدہ شہرستان وجود یعنی دنیا کے قیاس پر اس نادیدہ شہرستان بقا کا ہر نقشہ اور خاکہ بتایا اور سمجھایا جائے، اور یہی محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے کیا ہے۔

جولوگ کہ اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی قدرت پر یقین رکھتے ہیں ان سے تو کچھ کہنا ہی نہیں، لیکن اگر کوئی شخص جسمانی حشر کا تصور اس لئے محال سمجھتا ہے کہ عام انسانوں نے کسی مردہ جسم کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا تو اس کے نزدیک تنہا روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی زیادہ محال ہوتا ہے کیونکہ کسی انسان نے آج تک کسی انسان کو روحانی وجود میں نہیں دیکھا ہے، بلکہ وہ اس کا تصور تک بھی نہیں کرسکا ہے وہ جب انسانی زندگی کا تصور کرے گا تو جسم وشکل واعضاء کے ساتھ ہی کرے گا، ان سے مجرد ہوکر نہیں کرے گا۔

موت جسم سے روح کی مفارقت کا نام ہے اس لئے اگر یہ سچ ہے کہ قیامت میں نئی زندگی ملے گی، تو ظاہر ہے کہ موت کے بعد کیفیت اور صورت سے کوئی الگ صورت وکیفیت ہوگی جس کا نام حیات ثانیہ رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ روح کا دوبارہ تعلق جسم سے تسلیم کیا جائے ورنہ غیر جسمانی زندگی تو قیامت کے پہلے بھی تھی اب نئی بات کیا بڑھ گئی، جس کا نام حیات ثانیہ رکھا دیا گیا۔

گو روح انسانی جسم کے اندر ہر فعل کی فاعل ہے مگر ہر فاعل کے فاعل بننے کے لئے آلات واوزار کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جن کے بغیر وہ اپنے فعل کے بجالانے سے مجبور رہتا ہے اسی طرح روح اپنے فعل لذت والم کے انجام دینے کے لئے جسمانی آلات اور اوزار کی محتاج ہے کہ لذت والم کا کوئی روحانی احساس جسمانیت کے شائبہ سے مبرا ہوکر ہو ہی نہیں سکتا، اس بناء پر روح محض کا جنت کی لذتوں سے متمتع یا دوزخ کی تکلیفوں سے متالم ہونا کسی جسمانی وساطت کے بغیر تصور میں نہیں آتا، خواب میں دیکھو کہ روح کو جو لذت یا تکلیف پہنچتی ہے اس میں بھی جسمانی پیکر وہیکل کی صورت نمودار ہوتی ہے۔

جسم وجسد:

حشر جسمانی کے ماننے کے بعد یہ بحث بے سود ہے کہ آیا وہی جسم دوبارہ زندہ کرکے اٹھایا جائے گا جس کے قالب میں وہ روح پہلے دنیا میں رہی تھی یا کسی دوسرے نئے جسمانی پیکر میں وہ روح پھونکی جائے گی یا یہ کہ آئندہ جسم اپنی مادیت اور ترکیب میں اس دنیاوی جسم کے مماثل ہوگا، جب کہ یہ حقیقت ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اعمال کی ذمہ داری روح پر ہے، جسم پر نہیں اور اسی طرح جزا وسزا کی راحت وتکلیف کا اصلی مورد روح ہے، جسم نہیں تو پھر اب وہ کسی قالب میں بھی ہو اور کسی رنگ میں بھی ہو روح پر مواخذہ اور ثواب وعذاب کی لذت والم کا احساس یکساں ہوگا البتہ یہ ضروری ہے کہ جو جسم ہم کو دوسری دنیا میں ملے گا، اسکی خصوصیات ولوازم اس خاکی جسم کے خصوصیات ولوازم سے بالکل الگ ہونگے چنانچہ خود ہمارے تخیل اور تصور اور نیز خواب ورویا میں جو جسم ہم کو نظر آتا ہے وہ جسم ہوکر نظر آنے کے باوجود مادی جسمانیت سے سراسر پاک ہوتا ہے اس لئے لفظ جسم کے بولنے سے انہیں خصوصیات کا جسم سمجھ لینا ضروری نہیں ہے، اور نہ اس جسم پر قیاس کرکے اس جسم پر اشکالات پیش کئے جاسکتے ہیں۔

خلق جدید:

چنانچہ جو جسم قیامت میں عنایت ہوگا وہ نئی خلقت اور نئی آفرینش کا ممنون ہوگا، اسی لئے قرآن نے منکروں کے جواب میں یہ کہا ہے کہ:

﴿ بَلۡ هُمۡ فِیۡ لَبۡسٍ مِّنۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ﴾ (ق-۱)

بلکہ یہ لوگ نئی آفرینش سے شک میں ہیں۔

منکرین کی زبان سے کہلوایا

﴿ ءَاِنَّا لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ خَلۡقًا جَدِیۡدًا ﴾ (اسراء-۵)

کیا ہم درحقیقت نئی آفرینش کر کے اٹھائے جائیں گے۔

ایک دوسری سورۃ میں یہ تلقین ہے کہ

﴿ اِنَّکُمۡ لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ﴾ (سبا-۱)

بے شک تم ایک نئی آفرینش میں ہونے والے ہو۔

پھر تمثیل دے کر فرمایا۔

﴿ کَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِیۡدُهٗ ﴾ (انبیاء-۷)

جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کا آغاز کیا اسی طرح ہم اس کو دوبارہ بنائیں گے۔

اسی لئے اس عالم کی اس نئی خلقت و پیدائش والے جسم کو بعینہٖ اسی جسم کے مطابق سمجھنا صحیح نہیں ہے، اور نہ اس خاکی جسم کی تمام خصوصیات کا بعینہٖ اس جسم میں ہونا ضروری ہے اس کو اگر اس عالم کے لفظ جسم سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس لئے کہ ہماری زبان میں روح کے خلاف وقالب کے لئے جسم سے بہتر، قریب تر اور مشابہ تر کوئی دوسرا لفظ نہیں۔

یہ بات کہ حشر میں بعینہٖ گذشتہ گوشت و پوست کا ہونا اس لئے ضروری سمجھا جائے کہ وہ بھی عذاب وثواب میں شریک ہو، تصریح قرآنی پر اضافہ ہے، قرآن میں تو یہ تصریح ہے کہ:

﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا سَوۡفَ نُصۡلِیۡهِمۡ نَارًا ؕ کُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُهُمۡ بَدَّلۡنٰهُمۡ جُلُوۡدًا غَیۡرَهَا لِیَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَزِیۡزًا حَکِیۡمًا ﴾ (نسا-۵۶)

بے شبہ جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہوئے، ہم ان کو آگ میں ڈالیں گے، جب ان کی کھالیں پک جائیں گی، ہم ان کو اور کھالیں دیں گے، جو پہلی کھالوں کی غیر ہوں گی، تا کہ وہ عذاب چکھیں، بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

جب کھالیں یکے بعد دیگرے بدلتی جائیں گی تو وہ پہلا اصلی حصہ جسم جو گناہ میں شریک تھا، کہاں باقی رہا، اسی طرح یہ تصریح ہے کہ انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھالیں اس کے اعمال کی شہادت دیں گی، اس سے معلوم ہوگا کہ وہ اصلی مجرم جو ان اعمال کا ذمہ دار اور اس مقدمہ کا مدعا علیہ ہے ان جسمانی اعضاء کے علاوہ ہے، اور وہ روح انسانی ہے۔

ذمہ داری روح پر ہے:

یہی سبب ہے کہ موت وحیات، عذاب وثواب اور اعمال کے مواخذہ کا اسلام نے جس سے تعلق بتایا وہ نفس یعنی روح ہے

﴿ اَنۡ تَقُوۡلَ نَفۡسٌ یّٰحَسۡرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطۡتُّ فِیۡ جَنۡۢبِ اللّٰهِ ﴾ (زمر-۶)

تو (قیامت میں) کوئی نفس یہ کہنے لگے کہ اے افسوس اس پر کہ میں نے اللہ کے پہلو میں کمی کی۔

﴿ وَلۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ لِغَدٍ ﴾ (حشر-۳)

اور چاہئے کہ ہر نفس دیکھے کہ اس نے کل (قیامت) کے لئے کیا آگے بھیجا۔

﴿ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّاۤ اَحۡضَرَتۡ ﴾ (تکویر۔۱)

(اس دن) ہر نفس جان لے گا جو اس نے حاضر کیا۔

﴿ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَاَخَّرَتۡ ﴾ (انفطار۔۱)

اس دن ہر نفس جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا۔

﴿ فَلَا تُظۡلَمُ نَفۡسٌ شَیۡـًٔا ﴾ (انبیاء۔۴)

تو اس دن کسی نفس پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔

جنت کی نسبت ہے۔

﴿ فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَهُمۡ مِّنۡ قُرَّةِ اَعۡیُنٍ ﴾ (سجدہ۔۲)

کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کے لئے (جنت میں) کیا آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔

ان آیتوں میں دیکھو کہ عمل کی ذمہ داری اور اس کے اچھے اور برے نتیجوں کا بار جسم پر نہیں، بلکہ روح اور نفس پر ڈالا گیا اور اسی کو تکلیف ولذت سے آشنا کیا گیا ہے، جنت میں داخلہ کی خوشخبری بھی اسی کو دی گئی ہے۔

﴿ فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ ۝ وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ ﴾ (فجر۔۱)

اے مطمئن روح! میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہوجا۔

دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے:

غرض اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی ذمہ دار اور جنت ودوزخ کی لذت والم کی اصل احساس کرنے والی ہستی صرف روح ہے اور جسم کی حیثیت صرف ایک لباس وآلہ احساس کی ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں جسم لاکھ بار بدلے مگر روح اگر وہی ہے تو وہ انسان وہی ہے اور اسی کو اپنی ذمہ داری کی جزا وسزا مل رہی ہے۔

لوگ اپنی ظاہر بینی سے اصل زور جسم پر دیتے ہیں حالانکہ اس مٹی کے ڈھیر میں اگر روح کا خزانہ نہ چھپا ہو تو اس مشت خاک میں دھرا کیا ہے، دیکھو کہ انسان بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہی ایک شخص ہے جو پہلے تھا، حالانکہ اس کی جسمانی ہیئت اور اس کے جسم کا مادہ ہر آن اور ہر لحہ فنا ہو کر بدلتا رہتا ہے اور بیماریوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا پھر تندرستی کے بعد نئے ذرات داخل ہو کر لہلہائے، تم غلطی سے یہ سمجھتے ہو کہ ہر حال میں وہی جسم یکساں طور پر قائم ہے حالانکہ حکیم سے پوچھو تو وہ بتائے گا کہ اس کے ذرے کیونکر ہر آن میں جھڑتے اور گھستے رہے اور جو خوراک وہ کھاتا ہے وہ خون ہو کر کیونکر بدل ما یتحلل بن کر ان کی جگہ لیتی رہی پھر کیا ایسے ہر آن فنا ہوتے رہنے والے اور چند سال کے بعد بالکل بدل جانے والے کو دائم الوجود اعمال کا ذمہ دار اور ان کے نیک وبد کی اصلی جزا یا سزا پانے کا مستحق ٹھہرایا جا سکتا ہے، لیکن جس طرح دنیا میں اگر کوئی مجرم آج بھاگ گیا اور چند سال کے بعد پکڑ کر جب لایا گیا تو وہ یہ عذر نہیں کر سکتا کہ چونکہ وہ ہاتھ جس سے اس نے چوری کی تھی اور وہ پاؤں جن سے وہ مال لے کر بھاگا تھا اس عرصہ دراز میں بدل گئے ہیں اس لئے وہ لائق تعزیر نہیں، کیونکہ وہ روح جس نے اپنے ارادہ ونیت سے اس کام کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے ذریعہ کرایا تھا وہ جس طرح کل

تھی بعینہٖ آج بھی ہے اور جو تکلیف اس کو اپنے جسم کے ذریعے کل پہنچ سکتی تھی آج بھی بعینہٖ وہی اس کو پہنچ سکتی ہے اور اس جسمانی تغیر سے اس کی روحانی شخصیت میں اصلاً کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا اس لئے پہلے ہی جسم کے ضروری ہونے پر زور دینا بے سود ہے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ جسم اگر بدل بھی جائے تو اعضاء کی شہادت کا مسئلہ اپنی جگہ پر صحیح ہوگا جسم کے اجزاء دنیا میں بدلتے جاتے ہیں، مگر جو بیماری اگلے اجزاء میں پیدا ہوگئی تھی وہ ان کے فناء ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتی ہے مٹ نہیں جاتی، بلکہ وہی ان کے بعد کے آنے والے اجزاء میں برابر سرایت کرتی رہتی ہے۔

اخروی جسم کیسا ہوگا:

روحوں کو آخرت میں جو جسم ملیں گے وہ حقیت میں ان کے اعمال ہی کے ظل وعکس ہوں گے، یعنی جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی ان کو جسم عنایت ہوں گے چنانچہ اس دنیا کے جسمانی رنگ کے لحاظ سے خواہ کوئی کالا ہو یا گورا مگر اس دنیا میں اس کا یہ کالا پن اور گورا پن اعمال کی سیاہی وسپیدی کی صورت میں بدل جائے گا خدا نے فرمایا:

﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴾ (عبس۔۱)

کتنے چہرے اس دن روشن ہنستے اور شاد ہوں گے، اور کتنے چہروں پر اس دن کدورت ہوگی ان پر سیاہی چھائی ہوگی۔

﴿ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ (آل عمران۔۱۱)

جس دن کتنے چہرے سپید ہوں گے، اور کتنے کالے، لیکن جن کے چہرے کالے ہوئے کیا تم وہ ہو جو ایمان کے بعد پھر کافر ہوگئے تھے، تو اپنے کفر کرنے کے بدلہ عذاب کا مزہ چکھو، اور جن کے چہرے سپید ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اسی میں سدا رہیں گے۔

صحیح حدیثوں میں ہے کہ جنت میں سب لوگ جوان بن کر داخل ہوں گے اور جسم پر کبھی بڑھاپا نہیں آئے گا، ان کا قد حضرت آدمؑ کے اولین بہشتی قد کے مطابق ہوگا، دوزخیوں میں سے کسی کا سر پہاڑ کے برابر ہوگا کسی کا ایک پہلو مفلوج ہوگا، کسی کے ہونٹ لٹکے ہوں گے دل کے اندھے آنکھوں کے اندھے بن کر اٹھیں گے، سزاؤں کے بعد جب ان کے جسم چور چور ہو جائیں گے، تو پھر ان کے جسم صحیح وسالم نمودار ہوں گے، پھر ان کی وہی کیفیت ہوگی، یہ بھی آیا ہے کہ جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں وہ چیونٹی بن کر قیامت میں اٹھیں گے، ان تمام شواہد سے ہویدا ہے کہ اس دنیا کے جسمانی قالب ہمارے اس دنیاوی جسم کے مطابق نہیں بلکہ ہمارے دنیاوی اعمال کے مطابق ہوں گے۔

جزا اور سزا

''یوم آخر'' یا ''یوم دین'' پر ایمان لانے سے اسلام کا حقیقی منشاء یہ ہے کہ لوگ اس کا یقین کریں کہ ان کے ہر عمل کا بدلہ ہے کچھ اس دنیا میں اور پورا دوسری دنیا میں۔ اسی کا نام جزا وسزا ہے دنیا کے دوسرے مذاہب بھی اس مسئلہ میں اسلام کے ہم نوا ہیں۔

جزا وسزا دیگر مذاہب میں:

درحقیقت مذاہب کا حقیقی تعلق اسی عقیدہ سے ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے' اور اچھا یا برا جیسا کام اس سے صادر ہوتا ہے' اس کے مطابق اس کا اچھا یا برا معاوضہ اس کو دوسری دنیا میں ضرور ملے گا' اس عقیدہ کا نشان مصر و بابل جیسی دنیا کی قدیم قوموں میں بھی ملتا ہے' ہندوستان کے مذاہب میں اس دوسری دنیا کو دوسرے جنم سے تعبیر کیا گیا ہے' ان کا خیال یہ ہے کہ انسان جب مرتا ہے تو اس کے اچھے یا برے کاموں کے مطابق اس کی روح کسی جانور یا گھاس پھوس یا درخت کے قالب میں جا کر اپنے عمل کا نتیجہ بھگتتی ہے اور پھر انسانوں کے قالب میں لائی جاتی ہے اور کام کرتی ہے اس کے بعد جس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اس کو یم لوگ میں جانا پڑتا ہے جہاں نرگ (دوزخ) ہیں وہاں وہ ہر قسم کی سزا بھگتتی ہے بعد ازیں اپنے بعض اچھے کاموں کی بدولت چندرلوک (چاند کی دنیا) میں جاتی ہے، جس روح کے کچھ کام اب بھی باقی ہیں وہ اس دنیا میں ہوا' بادل اور بارش کے ذریعہ سے زمین میں دوبارہ آتی ہے اور اپنے کام کے مطابق حیوانات یا نباتات کے روپ میں سزا پاتی ہے، اور پھر چھوٹ کر انسان بنتی ہے، یہاں تک کہ اس کے کام اتنے اچھے ہو جائیں کہ وہ سزا کے قابل قرار نہ پائے اس وقت وہ مادی قالبوں کی قید سے نجات پا کر سورج لوک اور چندرلوک وغیرہ اجرام سماوی کی دنیاؤں میں جا کر آرام کرتی ہے اور پھر اپنے علم وعمل کی کسی کمی کے سبب سے بادل، ہوا، اناج یا کسی دوسرے مخلوقات کے قالب میں ہو کر اس کو اس دنیا میں پھر آنا پڑتا ہے، اور پھر وہی عمل شروع ہوتا ہے یعنی وہ نئے نئے جنموں میں پیدا ہو کر سزا بھگتی ہے اور اس وقت تک اس آمد ورفت اور آواگون کے چکروں میں پھنسی رہتی ہے جب تک اس سے اچھے یا برے کاموں کا صدور ہوتا رہتا ہے اس لئے کامل اور دائمی نجات کی صورت یہ ہے کہ انسان سے اچھا یا برا کوئی کام ہی صادر نہ ہو یہی ترک عمل روح کو مادہ کی قید سے آزاد کر کے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا (موکش) دلاتا ہے یہاں تک کہ یہ موجودہ مادی دنیا پرلے (قیامت) کے بعد جب پھر نئے سرے سے بنے گی تو پھر وہی عمل اور سزا اور جنم کے آواگون کا چکر شروع ہوگا اور پھر اسی طرح چھٹکارا پائے گی اور پھر دوسری پرلے کے بعد نیا دور اسی طرح شروع ہوگا۔ یہ چکر اسی طرح ہمیشہ جاری رہے گا۔

یہ وہ چکر ہے جس سے انسان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا الا یہ کہ ہمالہ کی چوٹی یا غار میں بیٹھ کر ترک عمل کے ذریعہ خود اپنے وجود سے ہاتھ دھو لیا جائے' لیکن اگر اس اصول نجات پر دنیا عمل کرے تو یہ بہارستان دم کے دم میں خارستان بن جائے اور ہر قسم کا کاروبار معطل ہو کر یوں بھی دنیا فنا کے قریب آ جائے اور بدی کے ساتھ نیکی کا وجود بھی دنیا سے مٹ جائے اور بایں ہمہ دائمی وابدی نجات میسر نہ ہو کیونکہ ہر پرلے کے بعد وہی جنم اور کرم اور آواگون پھر شروع ہوتا ہے۔ [1]

---

[1] تناسخ کے رد میں الندوہ مئی' جون ۱۹۰۶ء میں ایک مضمون ہے۔

لیکن دنیا کے دوسرے مذاہب نے اس چکر اور بے عملی سے انسانوں کو نجات دلائی ہے' انہوں نے اس موجودہ دنیا کے بعد ایک ہی دنیا اور تسلیم کی ہے جس میں انسانوں کو اپنے اچھے اور برے اعمال کی پوری پوری جزا ملے گی' مختلف زردشتی فرقوں نے آرین نسل ہونے کے باوجود ہندوؤں کے تناسخ کے بجائے مختلف سامی مذاہب کے خیالات کی نقالی کی ہے' اور خصوصاً بعد والوں نے اسلام کے عقائد کو "ارواے ویراف" کے عجیب و غریب مشاہدات کا رنگ دے کر اور اس کی کتاب کو اسلام سے بھی پہلے کی قرار دے کر تمام تر قبول کر لیا ہے۔[1]

صحیفہ ابراہیم یعنی سفر تکوین میں دنیا کی محنت و مشقت اٹھانے کے بعد پھر جنت میں داخلہ کا اشارہ ہے (تکوین ۲۔۱۹) علی ہذا حضرت موسیٰؑ کے صحیفوں میں اخروی جزا و سزا کے اصول مذکور ہیں نیکوکاروں کے لئے ایک "ستھری آبادی" کا ذکر ہے جس میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں مذکور ہے اور بدکاروں کے لئے ہلاکت اور بربادی اور دردناک عذابوں کی بھی خبر ہے مگر مترجموں نے ہر جگہ اس کو دنیاوی ثواب و عذاب بلکہ ارض موعودہ کی ظاہری سلطنت کے معنوں میں کر کے دکھایا ہے حالانکہ بعض مقامات میں یہ بے جوڑ سی بات ہو کر رہ گئی ہے حضرت آدمؑ کی جنت عدن اور اس کے چار دریاؤں کا ذکر تکوین کے دوسرے باب میں ہے' علاوہ ازیں تورات میں موت کے بعد کی زندگی کی تصریح ملتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ (پیدائش ۲۵۔۱۸) اور یعقوبؑ (پیدائش ۴۹۔۳۳) کی موت کی تعبیر ان لفظوں میں کی گئی ہے کہ "جان بحق ہوا اور وہ اپنے لوگوں میں جاملا ساتھ ہی ہمیشہ کی بھلائی (استثناء ۶۔۲۴) کا بھی تذکرہ ہے اور جہنم کی آگ (استثناء ۳۲۔۲۲) کا بھی بیان ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دیئے جانے کی بھی تصریح ہے (یرمیاہ ۱۷۔۱۱) روح کی بقا اور آسمان پر چڑھنے کی تعلیم بھی ان کے صحیفوں میں موجود ہے (واعظ ۳۔۲۱) مرنے کے بعد روح کے خدا کے پاس واپس پھر جانے کا بھی ذکر ہے (واعظ ۱۲۔۷) اور انسان کے اپنے ابدی مکان میں جانے کا بھی تذکرہ ہے آخر میں خدا سے ڈر اور اس کے حکموں کو مان کہ انسان کا فرض کلی یہی ہے کیونکہ خدا ہر ایک فعل کو ہر ایک پوشیدہ چیز کے ساتھ خواہ بھلی ہو خواہ بری عدالت میں لائے گا۔ (واعظ ۱۲۔۱۳۔۱۴) زبور میں خدا کی عدالت کے دن کی تصریحات بار بار ہیں اور امثال سلیمانی میں ہے کہ "انسان کی راہیں خداوند کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور وہ اس کی ساری روشوں کو جانتا ہے شریر کی بدکاریاں اس کو پکڑ لیں گی اور وہ اپنے ہی گناہوں کی رسیوں سے جکڑا جائے گا' وہ بے تربیت پائے مر جائے گا اور اپنی جہالت کی شدت میں بھٹکتا پھرے گا (۵۔۲۱) دانیال میں ہے کہ اس وقت بہتیرے جو زمین میں خاک پر سو رہے ہیں جاگ اٹھیں گے' بعضے حیات ابدی کے لئے اور بعضے رسوائی اور ذلت کے لئے (۱۲۔۲) حزقیال (۲۸) جنت کی طلائی اور جواہرات کی بنی ہوئی عمارتوں کے اشارات ہیں۔

حضرت مسیح سے پہلے یہودیوں میں صدوقی نام ایک فرقہ پیدا ہوا جس نے حکمران یونانیوں کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ان کی بعض باتیں قبول کر کے یہودی تعلیم میں شامل کیں[2] منجملہ ان کے وہ قیامت اور حیات اخروی کا بھی منکر ہوا' مگر اس کے مقابل کا دوسرا فرقہ جس نے اپنے کو فریسی (علیحدہ رہنے والا) کہا اپنے پرانے عقیدہ پر قائم رہا اور

---

[1] دبستان المذاہب کا مصنف جو زردشتی مذہب سے پوری واقفیت رکھتا تھا' اس نے اپنی کتاب میں اس کی پوری تفصیل درج کی ہے۔

[2] برٹش انسائیکلوپیڈیا مضمون صدوقیت و صدوکیز۔

قیامت، حیات اخروی اور جنت و دوزخ کے عقائد کو بدستور مانتا رہا۔ حضرت عیسٰیؑ کے زمانے میں فریسی یہی اعتقاد رکھتے تھے کہ جنت مادی ہوگی اور وہاں بہشتیوں کو ان کی بیویاں واپس ملیں گی (مرقس ۱۲۔۲۴) یہودیوں کی پچھلی کتابوں میں جزاء و سزا کی تفصیل موجود ہے، چنانچہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب کے یہودی اس پر ایمان رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہود کیسے ہی گنہگار ہوں، مگر چندروز سے زیادہ وہ دوزخ میں نہیں رہیں گے (بقرہ۔۵۸ آل عمران۔۳) یہ چندروز باختلاف روایت تین روز، چالیس روز[1] یا گیارہ مہینے[2] ہیں۔

حضرت عیسٰیؑ کے عہد میں یہودیوں کے ان دونوں فرقوں کے درمیان سخت اختلافات برپا تھے اور دونوں ایک دوسرے کی تردید و ابطال میں مصروف تھے حضرت عیسٰیؑ نے آ کر صدوقیوں کے اس عقیدے کی تردید کی اور قیامت اور جزاء و سزا پر ایمان لانے کی تعلیم دی حضرت عیسٰیؑ کے ایک حواری یوحنا نے اپنے مکاشفہ میں جنت اور دوزخ کی پوری تصویر کھینچی۔

حضرت عیسٰیؑ کے اس جواب سے جو انہوں نے ایک صدوقی کے سوال کا دیا کہ اُس دنیا میں لوگ شادی اور بیاہ نہیں کریں گے بلکہ فرشتوں کے مانند رہیں گے ایسا سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ نے جنت کو صرف روحانی وجود بخشا ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے حضرت عیسٰیؑ اپنی زندگی کی آخری شب میں اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھ کر جب انگور کا افشردہ پیتے ہیں تو کہتے ہیں۔

”میں تم سے کہتا ہوں کہ انگور کے پھل کا رس پھر نہ پیوں گا، اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہت میں نیا نہ پیوں“۔ (متی۔۲۶۔۲۹)

حضرت عیسٰیؑ یہودی علماء کو خطاب کر کے فرماتے ہیں:

”اے سانپو! اور اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے“ (متی۔۲۳، ۳۳)

حضرت عیسٰیؑ اپنے ایک وعظ میں دوزخ کا ایک منظر دکھاتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

”اس نے دوزخ کے درمیان عذاب میں ہو کے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور ابراہام (حضرت ابراہیمؑ) کو دور سے دیکھا اور اس کی گود میں یعزر کو، اور اس نے پکار کر کہا اے باپ ابراہام مجھ پر رحم کر اور یعزر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا پانی سے بھگو کر میری زبان ٹھنڈی کرے، کیونکہ میں اس لو میں تڑپتا ہوں“ (لوقا۔۱۶۔۲۳)

مکاشفات یوحنا میں دوزخ کو ”آگ اور گندھک“ کہا گیا ہے (۱۴۔۱۰) اور متی کی انجیل میں اس کے دروازے بھی بتائے گئے ہیں (متی ۱۶۔۱۸) اسی طرح جنت اور اس کی طلائی و جواہراتی تعمیر اور نہر آب حیات کا ذکر مکاشفات کے اکیسویں باب میں ہے، اور وہاں کے انگوری افشردہ کا بیان متی میں ہے (متی ۲۶۔۱۹) وہاں کے آب سرد کا ذکر بھی انجیل میں آتا ہے (لوقا۔۱۶۔۲۳)

اسی طرح ہر ایک کے عمل کا حساب لئے جانے اور عمل کے مطابق بدلہ ملنے کا ذکر بھی حواریوں کے خطوط میں

---

[1] کتب سیر میں ان آیتوں کی تفسیر دیکھو۔

[2] سیل کا ترجمہ قرآن حاشیہ زیر ترجمہ آیت بقرہ رکوع ۸۔

موجود ہے۔

”مبارک وہ مرد ہے جس کے گناہوں کا حساب خداوند نہ لے گا“ (رومیوں ۴۔۸)

”سو ہر ایک ہم میں سے خدا کو اپنا حساب آپ دے گا“ (رومیوں ۱۴۔۱۶)

”لیکن وہ اس کو جو زندوں اور مردوں کا انصاف کرنے پر تیار ہے حساب دیں گے“ (اول پطرس ۴۔۵)

اس باب میں اسلام کا تکمیلی پہلو یہ ہے کہ اس نے اس عقیدہ کو نہ صرف پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہی کیا، بلکہ اس کے تمام ضروری اجزاء فراہم کئے۔ گذشتہ مذاہب کے تشنہ بیانات پر سیر حاصل بحثیں کی، اور ان کے نقائص کی تکمیل کی اور سزا و جزا کے اصول اس طرح بیان کئے کہ اس عقیدہ کا ہر پہلو شکوک و شبہات سے پاک ہو گیا۔

آئندہ مباحث کے سمجھنے کے لئے پہلے چند اصول ذہن نشین کر لینے چاہئیں۔

عالم آخرت کا فہم و ادراک:

اس عالم آخر میں جو کچھ ہو گا وہ اگرچہ ہمارے اس زیر تجربہ و زیر مشاہدہ مادی عالم سے بالکل الگ ہو گا تاہم چونکہ انسانی فہم کی مجبوری کی وجہ سے وہ اسی زبان و محاورات میں ادا کیا گیا ہے، جو اس مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے ان الفاظ کے ساتھ جو مادی خصائص و لوازم مستلزم ہو گئے ہیں ہم ان کے دیکھنے اور سننے کے اس دنیا میں عادی ہو گئے ہیں ان لفظوں کو سن کر ہم بعینہٖ وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو اس دنیا میں ان لفظوں سے سمجھتے رہے ہیں اور اسی سبب سے بعض کم فہم وہاں کے وقائع و احوال کا بیان سن کر ان میں سے بعض امور کو محال اور ناممکن کہہ اٹھتے ہیں، اور بعضے ان کی تشریح و تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ لفظ و معنی میں ادنیٰ اشتراک بھی باقی نہیں رہتا، یہ دونوں راستے سخت خطرناک ہیں، اسی لئے وحی محمدی نے ان نازک و دقیق اسرار کے بیان میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کا پورا لحاظ کیا ہے، اس نے نہ تو یہودیوں کی طرح ان واقعات کو سرتاپا مادی کہہ کر اس عالم آخرت کو بھی سرتاپا عالم آب و گل بنا دیا ہے اور نہ عقل و خرد کے بعض نادان مدعیوں کی طرح ان کو مادہ سے اتنا بلند و برتر کیا ہے کہ ان کا وجود ہی موہوم و فرضی ہو گیا ہے بلکہ انسانی عقلوں کے اختلاف مراتب کا لحاظ کر کے بزم کے اہل نظر اور تماشائیوں دونوں کی تشفی اور تسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

ان اخروی وقائع کے مختلف مفہوموں اور مصداقوں کا لحاظ کر کے وحی محمدی نے ایسے بجے تلے الفاظ اختیار کئے ہیں جن سے ایک فلسفی بھی بہرہ یاب ہو سکتا ہے، اور ایک عامی بھی اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے ایمان کا لطف اٹھا سکتے ہیں اور ایک ایسے مذہب کے لئے جو سارے انسانی طبقوں کو اپنا مخاطب بنانے کا دعویٰ کرتا ہے ایسی ہی وسعت کی ضرورت تھی تاکہ وہ سب کے لئے اپنی اپنی جگہ پر تشفی کا باعث ہو سکے ان تمام اخروی واقعات کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ ظاہر ہے کہ طبعاً وہی الفاظ ہو سکتے ہیں جن کے چاروں طرف اس دنیا کے تمام تر مادی احوال، مادی مفہوم و مصداق اور جسمانی تخیلات ہر چار طرف سے لپٹے ہیں، ان لفظوں کے سننے کے ساتھ جو مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ سرتاپا انہی مادی قیود و لوازم کے ساتھ آتا ہے، ہم جب ”آگ“ کا لفظ سنتے ہیں تو معاً اس دنیاوی آگ کا مفہوم ذہن میں آتا ہے، جس کو ہم یہاں دیکھتے ہیں جو انسانوں اور درختوں کو اور ہر چیز کو جو اس کے اندر ہوتی ہے بلاتمیز یکساں جلا دیتی ہے مگر اخروی آگ ایسی نہ ہو گی۔ اس کے اندر بعض درخت ہوں گے جو نہیں جلیں گے وہ صرف گنہگار انسانوں کو جلائے گی، کسی کے پاؤں

چھوئے گی، کسی کی کمر تک آئے گی، کسی کے گلے تک پہنچے گی، وہ ایسی تیز و گرم ہوگی کہ یہ دنیاوی آگ اس کے مقابلہ میں ٹھنڈک ہے ''وزن'' کا لفظ سننے کے ساتھ ہمارے سامنے اس عالم میں تولنے کی ساری خصوصیتیں آجاتی ہیں ترازو، پاسنگ، پلے، ڈنڈی اور تولی جانے والی چیز میں جسمیت اور ثقل کا ہونا، اسی طرح نامہ عمل کے لکھنے کا مفہوم جب ہم سمجھنا چاہیں گے تو کاتب کی انگلیاں، قلم، دوات، سیاہی، کاغذ اور حروف کی ساری قیدیں ہمارے ذہن میں آئیں گی اس بناء پر ان الفاظ کے سراسر لغوی معنوں اور اس کے قریب الفہم مجازی معنوں کے سمجھنے میں اختلاف آراء کی بڑی گنجائش ہے اس لئے حق تو یہ ہے کہ ان پر بلا مزید تشریح اس طرح ایمان لایا جائے کہ ہماری تشریح سے ان کے الفاظ کے مفہوم کی وسعت تنگ نہ ہو جائے بایں ہمہ ان لوگوں کو بھی دائرہ سے خارج نہ کیا جائے جو ان الفاظ سے وہ مفہوم سمجھ کر تسلی پانا چاہتے ہیں، جن کے وہ الفاظ متحمل ہو سکتے ہیں۔ اگر مراد الٰہی یہی تنگی ہوتی تو اللہ تعالیٰ انسانی عقلوں کے اس اختلاف مراتب کا لحاظ کئے بغیر اپنے مفہوم کو اس وسعت کے بجائے تنگ سے تنگ الفاظ میں ظاہر فرما سکتا تھا مگر ایسا نہیں کیا تا کہ اسلام تمام مختلف العقول انسانوں کے لئے عالم گیر ثابت ہو سکے۔

ایک دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ عالم آخرت کے وقائع اور حالات کے سمجھنے میں اشکالات و اعتراضات اس لئے پیش آتے ہیں کہ ہم وجود اور اس کے موجودہ تمام قوانین فطرت کو اس طرح لازم و ملزوم سمجھتے ہیں کہ جب کسی شے کے وجود کا تذکرہ کیا جائے گا، تو معاً اس کے وہی خصوصیات و لوازم سامنے آئیں گے جن کے دیکھنے کے ہم اس دنیا میں عادی ہیں حالانکہ ارباب عقل نے یہ طے کر دیا ہے کہ اس موجودہ دنیا کے معلومات و مسببات اور ان کے موجودہ علل و اسباب میں جو لزوم ہے وہ محض عادی ہیں یعنی اس لئے ایسا ہے کہ ہم ایسا دیکھتے ہیں، یہ نہیں کہ اس لئے ایسا ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہئے۔

اس بناء پر اگر صرف اتنی سی بات ذہن نشین کر لی جائے کہ موجودہ مادی دنیا میں جو قوانین فطرت اور علل و اسباب اور ان کے نتائج کارفرما ہیں وہ صرف اسی عالم اور موجودہ دنیا کے قوانین ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کوئی نئی دنیا بنائے یا نیا عالم خلق کرے تو ضروری نہیں کہ یہی موجودہ قوانین فطرت وہاں بھی کارفرما ہوں، بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اس نئے عالم میں نئے قوانین پر عمل رہے، نئی خصوصیات کے جسم ہوں، نئی قسم کی زندگیاں ہوں، نئی قسم کی آگ ہو، نئی قسم کے باغ اور ان کے پھل ہوں، نئی قسم کے موجودات و مخلوقات ہوں، نئے علل و اسباب ہوں اور نئے قوانین فطرت ہوں، وحی محمدی نے اسی نئے عالم کے متعلق کہا ہے۔

﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ ﴾ (ابراہیم۔۷)

جس دن یہ زمین نئی زمین سے بدل جائے گی اور آسمان (نئے آسمان سے)

تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس نئی زمین اور نئے آسمان میں بھی وہی مادی قانون جاری ہوں گے جو اس موجودہ زمین و آسمان میں جاری تھے اس بناء پر جسمانیت و مادیت کے وہ تمام اعتراضات اور آئندہ حیات کے متعلق اشکالات جو اس دنیا اور اس کے قوانین کی بناء پر پیدا ہوتے ہیں بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں۔

اس ضروری تمہید کے بعد جزا و سزا کی اسلامی تشریحات کی جانب قدم اٹھایا جاتا ہے، وھو الھاوی الصواب۔

اصول جزا:

اللہ تعالیٰ نے جس طرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے‘ جس کو اہل فلسفہ قانونِ قدرت اور اہل مذہب تقدیر اور اندازۂ الٰہی کہتے ہیں‘ اسی طرح اس نے اپنے ہر عالم کے لئے ایک نظام اور تقدیر قائم کی ہے‘ جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار انجام پاتا ہے‘ انسان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ اصولِ فطرت صرف مادیات تک محدود ہیں‘ حالانکہ مادیات ہوں یا روحانیات، ذہنیات ہوں یا عملیات، ہر ایک میں یہ یکساں جاری و ساری ہیں جس طرح یہ قانون فطرت ہے کہ زہر کھانے سے انسان کا جسم مرجاتا ہے اسی طرح یہ بھی اصول فطرت ہے کہ گناہ سے اس کی روح مرجاتی ہے، اور جس طرح اِصولِ حفظانِ صحت کی عدم پیروی سے انسان بیمار ہو جاتا ہے، اسی طرح اصول تزکیہ نفس کی عدم متابعت سے بھی وہ مریض ہو جاتا ہے، پھر جس طرح دوا اصول حفظان صحت کی پابندی سے وہ اپنی جسمانی بیماری کے آلام سے نجات پاتا ہے، ایسا ہی روحانی تدابیر علاج کے ذریعہ سے وہ شفایاب بھی ہوتا ہے۔

اعمال کے لوازم ونتائج:

غرض جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص وآثار بھی پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات واعمال کے بھی کچھ آثار ولوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ غرور اور خاکساری، بخل اور فیاضی، انتقام اور عفو، شجاعت اور بزدلی، تقویٰ اور فسق، ایمان اور کفر، ہر ایک کا ایک اثر ونتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص ولوازم ہیں‘ جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح سنکھیا سے سمیت‘ شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی اور ان معنوی روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی مادی اور طبیعیاتی اشیاء میں ہے۔

اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری اور افراد کی سعادت وشقاوت کے جو اصول ہیں وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح وفساد اور سعادت وشقاوت پر بھی حاوی ہیں‘ جس طرح ایک سائنٹسٹ (حکیم) کا کام ان مادی (فزیکل) اصولوں کو جاننا اور بتانا ہے اور اس کی اس تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں حکمت (سائنس) ہے، اسی طرح ان روحانی اسباب وعلل اور آثار ونتائج کو جاننا اور بتانا انبیاء علیہم السلام کا کام ہے اور ان کی اس تعلیم کا نام شریعت ہے‘ انبیاءؑ کی اس تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے روحانی آثار ونتائج کے متعلق وہی یقین ہونا چاہئے جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی اشیاء کے خواص اور آثار کے متعلق ہوتا ہے‘ سایکالوجی (علم النفس) اور سوشیالوجی (علم الاجتماع) کی وسعت تحقیق نے اس مفہوم کے سمجھنے میں اب بہت کچھ سہولت پیدا کر دی ہے۔

عقاب وثواب رد عمل ہے:

الغرض یہ مادی وجسمانی دنیا علت ومعلول اور عمل ورد عمل کے جس اصول پر مبنی ہے اس کی وسعت کے دائرہ میں انسان کا ہر قول اور انسان کا ہر عمل شامل اور داخل ہے، یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام اسلام میں عقاب اور اعمال صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے، قرآن نے انہیں دونوں اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے عقاب کا لفظ

عقب سے نکلا ہے جس کے معنی پیچھے کے ہیں اس لئے عقاب اس اثر کا نام ہے جو کسی فعل کے کرنے کے بعد لازم آ جاتا ہے اور ثواب کا لفظ ثوب سے لیا گیا ہے جس کے معنی لوٹنے کے ہیں، اس لئے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے کے نتیجہ اور جزاء کے معنی میں بولا گیا ہے۔

اسی ایک مسئلہ کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو جزا اور سزا کے شرعی اصول کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو، چنانچہ قرآن پاک میں یہ کئی دفعہ فرمایا گیا ہے۔

﴿ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (جاثیہ۔۱)

جو تم کرتے تھے' آج وہی بدلہ پاؤ گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ جزا وسزا ہمارے ہی اعمال کے رد عمل (ری ایکشن) کا نام ہے، ایک اور جگہ ہے:

﴿ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ﴾ (طہ۔۱)

تا کہ ہر جان کو اس کا بدلہ دیا جائے' جو وہ کرتی تھی۔

ان آیتوں میں یہ صاف تصریح ہے کہ یہ جزا وسزا تمام تر ہمارے دنیاوی اعمال کے آثار ولوازم ہیں۔

﴿ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ (نحل۔۴)

تو ان کے برے کام ان پر پڑے' اور ان کا ٹھٹھا کرنا ان پر الٹ پڑا

غرض جزا وسزا انہیں اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے گویا اسی اصول کی تشریح میں یہ اشارہ فرمایا کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہیں جو میں تم کو لوٹا کر یہاں دے رہا ہوں' تو جو کوئی جزائے خیر پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے وہ خود کو ملامت کرے۔ [۱]

حصول راحت کا اصول:

یہ فطری قانون ہے کہ ہم کسی بڑی تکلیف سے اسی وقت بچ سکتے ہیں جب اس کی خاطر ہم اس سے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو برداشت کریں اور کسی بڑی خوشی کے حصول کے لئے ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو قربان کرتے رہیں عاجلہ یعنی موجودہ اور آخرہ یعنی آئندہ ان دونوں کا جب کبھی تقابل پیش آتا ہے تو دون ہمت اور پست خیال لوگ عموماً موجودہ (عاجلہ) راحت کو پسند کر کے آئندہ راحت کی فکر نہیں کرتے کہ ان کی نگاہ میں موجودہ راحت گو چھوٹی مگر نقد ہے اور آئندہ کی راحت گو بڑی اور خوش آئند ہو، مگر وہ نسیہ ہے اور ان کا اصول یہ ہے کہ "نقد را بہ نسیہ مگذار" لیکن بلند ہمت اور عالی حوصلہ طبائع کا طریق عمل اس کے بالکل برخلاف ہے۔ فاتح اور کشور کشا آج اپنی جانوں کو جوکھم میں ڈالتے ہیں تا کہ کل سلطنت ان کے ہاتھ آئے۔ تاجر اور سوداگر آج اپنے سرمایہ کو بازار کے سپرد کر دیتے ہیں تا کہ دولت فردا سے وہ بہرہ مند ہوں۔ ہر مہذب انسان اپنے بچہ کو بیس پچیس برس تک تعلیم وتربیت اور مشق وامتحان کی مصیبتوں کی آگ میں بے تامل جھونک دیتا ہے تا کہ اس کی آئندہ کی زندگی راحت ومسرت میں بسر ہو۔ لوگ اپنے سرمایہ عزیز کو

---

[۱] صحیح مسلم وترمذی کتاب الزہد ومسند ابن حنبل ج ۵ صفحہ ۵۴ وصفحہ ۱۶۰ و ۱۶۵ و ادب المفرد و بخاری باب الظلم۔

تکلیفیں اٹھا اٹھا کر جمع کرتے جاتے ہیں تا کہ کل اس سے زیادہ ضروری موقع پر اس کو کام میں لاسکیں اور تنگ دستی کی بڑی تکلیف سے بچ سکیں۔

غرض اگر انسانوں کی تمام کوششوں پر ایک غائر نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ کامیابی کے حصول کا یہی اصول ان کے اندر جاری وساری ہے کہ تھوڑی سی تکلیف کو اس لئے برداشت کرلیا جائے کہ کسی بڑی تکلیف سے رہائی ملے اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اس لئے برباد کردیا جائے کہ کوئی بڑی خوشی حاصل ہو اور عارضی کامیابیوں کو اس غرض سے قربان کیا جائے کہ کوئی پائیدار اور دائمی کامیابی نصیب ہو مگر یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ آئندہ کی خوشی و کامیابی کی فراوانی اور اس کے دوام و پائیداری کا ہم کو یقین ہو کہ اگر ایسا یقین نہ ہو تو ہم کبھی اس ایثار و قربانی پر آمادہ نہ ہوں اسی لئے ایمان کی ضرورت ہے تا کہ ہمارے اندر یہ یقین پیدا ہو جائے اور ہم اس ایثار و قربانی کو خوشی خوشی گوارا کرلیں جن لوگوں میں یہ یقین پیدا نہ ہوگا ان سے یہ عظیم الشان قربانی بھی نہیں ہوسکتی اسی لئے گنہگار انسانوں کی یہ کیفیت قرآن نے بیان کی ہے۔

﴿ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴾ (قیامہ۔۱)

ہرگز نہیں بات یہ ہے کہ تم موجودہ زندگی سے محبت رکھتے ہو اور آئندہ زندگی کو چھوڑتے ہو۔

حالانکہ انسان اسی اصول کار کو اگر دنیا کی طرح آخرت کے معاملات میں بھی برتے تو اس کی کامیابی میں کوئی شک نہ رہے، آئندہ کا خیال کر کے موجودہ سے دست بردار ہو جانا یہی کامیابی کی کنجی ہے اور اسی اصول کے تحت میں دین و دنیا کی تمام نیکیوں اور کامیابیوں کا راز پوشیدہ ہے، موجودہ عارضی لذت کو آئندہ کی دائمی لذت پر اور حال کی معمولی راحت کو مستقبل کی دیرپا راحت پر قربان کردینا وہ سچائی ہے جس کے تسلیم کرنے سے کوئی انحراف نہیں کرسکتا، تم صبح خیزی کی معمولی تکلیف کو صحت کی دیرپا راحت کی خاطر قربان کرتے ہو، ورزش اور دوڑ دھوپ کی محنت کو اس لئے قبول کرتے ہو کہ کل کی پیری اور بیماری کی تکلیف سے تم کو وہ بچائے، غرض آج کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو اٹھاؤ گے تو کل کی بڑی تکلیف سے تم کو نجات مل سکے گی اور آج کی عارضی خوشیوں کو قربان کرو گے تو کل کی دائمی خوشی نصیب ہوگی یہی وہ فلسفہ ہے جس کو قرآن نے اس آیت میں ادا کیا ہے۔

﴿ وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ﴾ (دہر۔۱)

اور خدا نے ان کے صبر کرنے پر ان کو باغ اور ریشم کے کپڑے اور مزدوری دی۔

یہ صبر کیا تھا؟ دنیا کی عارضی خوشیوں کی قربانی تا کہ آخرت کی بڑی تکلیف سے نجات ملے۔ یہی سبب ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ ﴿حفت الجنة بالمکاره وحفت النارُ بالشهوات﴾ یعنی جنت دنیاوی تکلیفوں سے اور دوزخ دنیا کی معمولی خوشیوں سے گھری ہوئی ہے' نادان تقویٰ اور نیکی کی ان معمولی قیدوں سے گھبراتے ہیں اور گناہ کی عارضی و فانی لذتوں کے طلب گار ہوتے ہیں اس لئے آخرت کی بڑی تکلیف میں گرفتار ہوں گے اور وہاں کی ابدی لذت سے محروم رہیں گے اور جو دین و دیانت اور نیکی و تقویٰ کی ان معمولی تکلیفوں کو گوارا کریں گے اور گناہ کی عارضی لذتوں سے بچیں گے وہ آخرت کی لاانتہاء لذتوں سے شادکام ہوں گے، یہی فلسفہ قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے۔

﴿ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴾ (نازعات۔۲)

لیکن جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو ناجائز لذتوں اور خوشیوں سے باز رکھا، تو جنت اس کا ٹھکانا ہے۔

نامۂ عمل:

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جو چیز بھی ایک دفعہ پیدا ہو جاتی ہے پھر وہ بے حکم خدا فنا نہیں ہوتی۔ اسی طرح افعال و اعمال بھی جو انسان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ فنا نہیں ہوتے۔ موجودہ سائنس جس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ دنیا میں کوئی حرکت بھی پیدا ہو کر فنا نہیں ہوتی یہاں تک کہ فضا میں ہر آواز اور ہر صدا بھی جو کبھی بلند ہوئی ہے، آج موجود ہے، اور ہمیشہ رہے گی اور ہم اس کو پکڑ پائیں تو سن سکتے ہیں، وہ اعمال و افعال کے دوام وجود کے اسلامی عقیدہ کے قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کر سکتی، دنیا کے ریکارڈ میں انسان کا ہر عمل و فعل ہمیشہ کے لئے گویا بھرا ہوا ہے۔

قرآن پاک نے اسی اصول کو اپنی ان آیتوں میں بیان کیا ہے۔

﴿ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ ﴾ (یونس۔۳)

اس وقت ہر جان جو اس نے پہلے کیا اس کو آزمالے گی۔

﴿ كُلُّ امْرِیٍٔ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴾ (طور۔۱)

ہر آدمی اپنے عمل کے بدلہ گرو ہے۔

﴿ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴾ (مدثر۔۲)

ہر جان اپنے عمل کے بدلہ گرو ہے۔

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴾ (زلزال)

تو جو کوئی ایک چیونٹی بھر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھے گا، اور جو چیونٹی برابر بدی کرے گا وہ اس کو بھی دیکھے گا۔

﴿ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ﴾ (آل عمران۔۳)

جس دن ہر جان جو اس نے اچھے کام کئے، ان کو موجود پائے گی، اور جو برے کام کئے وہ بھی۔

یہ بات کہ انسان کا ہر عمل و فعل صحیفہ عالم پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو جاتا ہے اس کو قرآن نے کئی طریقوں سے ادا کیا ہے۔

ایک اس طرح کہ انسان کی زبان سے جب کبھی کوئی لفظ نکلتا ہے خواہ وہ کتنا ہی تنہائی میں بولا جائے، خدائی شاہد اس کے سننے کو موجود رہتے ہیں، اور وہ اس کو سن کر محفوظ کر لیتے ہیں۔

﴿ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ○ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴾ (ق۔۲)

جب دو لینے والے داہنے اور بائیں بیٹھے لیتے جاتے ہیں، کوئی بات وہ نہیں بولتا مگر ایک نگران اس کے پاس حاضر رہتا ہے۔

کبھی اس کو اعمال کی تحریر کردہ کتابت کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے۔

﴿ اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰهُمْ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ ﴾ (زخرف۔۷)

کیا یہ منکر سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور ان کی کانا پھوسی نہیں سنتے، کیوں نہیں، بلکہ ہمارے فرستادہ ان کے پاس اعمال لکھتے ہیں۔

﴿ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴾ (یونس۔۳)

بے شک ہمارے فرستادہ تمہاری چالوں کو لکھتے رہتے ہیں۔

کبھی اللہ تعالیٰ ہر عمل کے موقع پر خود اپنی حاضری اور دائمی علم و شہادت کو ظاہر کرتا ہے۔

﴿ وَمَا تَكُوْنُ فِىْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ﴾ (یونس۔۷)

اور تو کسی کام میں نہیں ہوتا اور نہ قرآن سے کچھ پڑھتا ہے، اور نہ تم لوگ کوئی کام کرتے ہو، لیکن ہم موجود ہوتے ہیں، جب تم اس میں لگے ہوتے ہو۔

کبھی یہ کہا کہ ہر انسان کا نامۂ عمل اس کی گردن میں لٹکا ہے، قیامت کے دن وہی فردِ عمل کی صورت میں انسان کے سامنے پھیلا دیا جائے گا کہ اپنا اعمال نامہ تم خود پڑھ لو، فرمایا:

﴿ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِىْ عُنُقِهٖ ط وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ط كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴾ (بنی اسرائیل۔۲)

اور ہم نے ہر انسان کا نتیجہ عمل اس کی گردن میں چپکا دیا ہے، اور قیامت کے دن ہم اس کو دفتر کر کے نکالیں گے، جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا، اپنا دفتر پڑھ لے، آج تیرا نفس خود ہی محاسب ہو تو کافی ہے۔

اس آیت کا ایسا محمل ہے کہ نامۂ عمل کو اگر کوئی واقعی کاغذ کا دفتر یا حساب و کتاب کا رجسٹر نہ سمجھے تو سمجھ سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ یہ تعبیر اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ جس طرح کاغذ اور رجسٹر میں قلم بند حساب کوئی بھول نہیں سکتا اور ایک ایک چیز اس میں درج ہوتی ہے اسی طرح یہ اعمالِ انسانی فراموش نہ ہوں گے بلکہ لکھے ہوئے رجسٹر کی طرح محفوظ رہیں گے، فرمایا:

﴿ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ط وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴾ (کہف۔۶)

اور نامۂ عمل رکھا جائے گا تو تو دیکھے گا گنہگاروں کو، اس میں جو لکھا ہے اس سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے کہ ہائے افسوس کہ اس کاغذ کو کیا ہے کہ کوئی چھوٹی بڑی بات نہیں چھوڑتا، لیکن اس کو شمار کر لیا ہے اور جو کچھ انہوں نے زندگی میں کیا اس کو سامنے پائیں گے اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہ کرے گا۔

بایں ہمہ اگر کوئی ٹھیٹ لفظوں کا پابند ہو کر نامہ اعمال کو واقعی کاغذوں کا دفتر سمجھتا ہے تو اس میں شک نہیں کہ الفاظ کے ظاہری معنی اس کی تائید کریں گے مگر کون سمجھتا ہے کہ یہ کیونکر ہوگا اسی لئے اس پر بحث فضول ہے کہ یہ کیونکر ہوگا۔ چاہے یہ ہو یا وہ، بہرحال ہمارے اعمال کا ایک ایک نقطہ محفوظ رہے گا، اور وہ خدا کے سامنے پیش ہوگا اور یہی اس عقیدہ کا اصل مقصد ہے۔

اعضاء کی شہادت:

انسان کا ہر عمل اپنے پیچھے اپنے کرنے والے کے اندر اپنا اچھا یا برا اثر چھوڑ جاتا ہے، اگر دل کا آئینہ صاف ہو تو اس کو اپنے عمل کا چہرہ اس میں صاف دکھائی دے، فرمایا:

﴿ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ ۝ وَلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ ﴾ (قیامہ۔۱)

بلکہ انسان کو اپنے نفس کا حال آپ دکھائی دیتا ہے، اگرچہ وہ اپنے عذر تراشتا ہے۔

یہی وہ آئینہ ہے جو گناہ کے میل سے زنگ آلود ہو جاتا ہے۔

﴿ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ ﴾ (تطفیف)

نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

اسی آیت کی تفسیر میں گویا آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ جب انسان پہلے پہل گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے اور اگر وہ توبہ وانابت کرتا ہے اور آئندہ اس سے باز رہتا ہے تو وہ مٹ جاتا ہے اور اگر اسی طرح گناہ کئے جاتا ہے تو اس نقطہ کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک دن پورے دل پر چھا جاتا ہے۔[1]

اسی طرح سے وہ اپنے اعضاء جن سے جو برا کام کرتا ہے اس کا اثر ان پر چھا جاتا ہے، یہاں تک کہ چہروں پر اس اثر کے نقوش ابھر آتے ہیں آنکھوں میں اس کی لکیریں پڑ جاتی ہیں، اور ہاتھ پاؤں پر اس کے نشان نمایاں ہو جاتے ہیں، عالم غیب کو چھوڑ، اسی عالم ظاہر میں تاڑنے والوں کی نگاہیں انسانوں کے چہروں، آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کے عنوان بیان سے انسان کے اندر کی تحریریں پڑھ لیتی ہیں، اسی طرح قیامت میں ان کے اعمال کے آثار ونتائج ان کے ایک ایک عضو سے نمایاں ہوں گے۔

﴿ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمَاهُمْ ﴾ (رحمان۔۲)

گنہگار اپنی پیشانی سے پہچان لئے جائیں گے۔

ایسی حالت میں اس وقت جب انسان کی زبان قال پر خداوند عدالت کے رعب وجلال سے مہر سکوت پڑ جائے گی، اگر انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھال تک نفس انسانی کے اعمال بد پر گواہی دے دیں تو تعجب کی کیا بات ہے، فرمایا۔

﴿ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ .... اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ (یٰسین۔۶۵۔۵۹)

اے گنہگارو! آج نیکوکاروں سے الگ ہو کر پہچان میں آ جاؤ........ آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے، اور ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے، اور ان کے پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔

﴿ وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝ حَتّٰٓی اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَیْءٍ ﴾ (حم السجدہ۔۲۱۔۱۹)

---

[1] ترمذی۔

اور جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے اور وہ درجہ بدرجہ بانٹے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو ان کے کانوں، ان کی آنکھوں، اور ان کی کھالوں نے ان پر ان کے کرتوتوں کی گواہی دی اور انہوں نے کہا تم نے ہم پر کیوں گواہی دی کہا کہ جس خدا نے ہر چیز کو گویا کیا اسی نے ہم کو بھی گویا کیا۔

اس لئے ان اعضاء کی گویائی بھی اسی نوع کی ہوگی جس نوع کی گویائی دنیا کی ہر چیز کو حاصل ہے، لیکن اس گویائی سے اگر کوئی حقیقی زبان کی گویائی مراد لے کر تشفی پاتا ہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے۔

میزان:

اکثر انسانوں کے اچھے یا برے دونوں قسم کے اعمال ہوتے ہیں، ایک قسم کا عمل کم ہوگا اور دوسرا زیادہ یا دونوں برابر، دو مادی چیزوں کے درمیان تفاصل اور گھٹ بڑھ کا علم ہم کو تولنے یا گننے سے ہوتا ہے، اس لئے وزن اور حساب سے عموماً عدل وانصاف، حق اور ٹھیک ٹھیک کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے اعمال انسانی کے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ انسان کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ ملے گا، فرمایا۔

﴿ جَزَآءً وِّفَاقًا ﴾ (نباء۔۱)

پورا پورا بدلہ۔

اس برابری اور کمال عدل وانصاف کے مفہوم کو ترازو کی ناپ اور عدالت کی میزان کے استعارہ سے ادا کیا، فرمایا۔

﴿ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيۡهِمۡ بِعِلۡمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيۡنَ ○ وَالۡوَزۡنُ يَوۡمَئِذِ ۨالۡحَقُّ ۚ فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ○ وَمَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ خَسِرُوۡٓا اَنۡفُسَهُمۡ ﴾ (اعراف۔۱)

پھر ہم احوال سنائیں گے، اور ہم کہیں غائب نہ تھے، اور وزن اس دن حق ہے، پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں تو وہ ہیں جن کا بھلا ہوا، اور جس کی تولیں ہلکی پڑیں سو وہی ہیں جو اپنی جانیں ہار بیٹھے۔

﴿ فَاَمَّا مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ ○ فَهُوَ فِيۡ عِيۡشَةٍ رَّاضِيَةٍ ○ وَاَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ ○ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ﴾ (قارعہ)

تو جس کی تول بھاری ہوئی، تو وہ خوش خوش عیش میں ہوگا، اور جس کی تول ہلکی ہوئی تو اس کی ماں دوزخ ہوگی۔

ان دونوں آیتوں میں تول کے بھاری اور ہلکے ہونے سے مقصود اعمال خیر کی کمی وبیشی ہے پہلی آیت میں اس کا اشارہ موجود ہے کہ وزن سے مراد حق وعدل ہے اور یہ کہ انسان کا ہر عمل علم الٰہی میں موجود ہوگا اور وہ کسی طرح بیش وکم نہ ہوگا۔

اس مفہوم میں یہ استعارہ قرآن میں بکثرت مستعمل ہوا ہے، ایک جگہ ہے۔

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيۡٓ اَنۡزَلَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ وَالۡمِيۡزَانَ ﴾ (شوریٰ۔۲)

وہ اللہ جس نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا اور میزان کو۔

یعنی کتاب الٰہی حقانیت کے ساتھ اُتری ہے اور اسی کے ساتھ میزان بھی، جس سے مراد عدل ہے (طبری تفسیر آیت مذکورہ) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام کائنات کی ہر چیز میں جو اعتدال کامل رکھا ہے اس کو بھی میزان ہی کے لفظ سے ادا فرمایا ہے۔

﴿ وَوَضَعَ الۡمِيۡزَانَ ﴾ (رحمان)

اور خدا نے ترازو رکھی ہے۔

حساب:

کمی بیشی کے علم کا دوسرا طریقہ حساب کرنے کا ہے، دوسری آسمانی کتابوں کی طرح قرآن میں بھی یہ استعارہ استعمال ہوا ہے اور بار بار فرمایا ہے کہ ہم قیامت میں تمہارے عمل کا حساب لیں گے، مگر اس حساب سے بھی وہی مقصود ہے جو وزن سے ہے چنانچہ سورۂ انبیاءؑ میں یہ مفہوم مزید تصریح کے ساتھ مذکور ہے اور جس سے میزان کی حقیقت بھی پوری طرح سمجھ میں آتی ہے، فرمایا۔

﴿ وَنَضَعُ الۡمَوَازِيۡنَ الۡقِسۡطَ لِيَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ فَلَا تُظۡلَمُ نَفۡسٌ شَيۡئًا وَّاِنۡ كَانَ مِثۡقَالَ حَبَّةٍ مِّنۡ خَرۡدَلٍ اَتَيۡنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيۡنَ ﴾ (انبیاء۔۴)

اور ہم قیامت کے دن کے لئے ترازوئیں یعنی انصاف رکھیں گے، پھر کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا، اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کچھ ہوگا، تو ہم لے آئیں گے اور ہم کافی ہیں حساب کرنے والے۔

اس آیت سے دو باتیں سمجھی جاسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ وزن سے مقصود انصاف اور عدم ظلم ہے، اور دوسری یہ کہ حساب سے مقصود یہ ہے کہ عمل انسانی کا کوئی ذرہ بھی معاوضہ میں چھوٹنے نہ پائے گا اور نہ وہ خدا کے علم سے غائب ہے، لیکن بہرحال وزن وحساب کے مادی ہی مفہوموں کو اگر کوئی صحیح باور کرتا ہے تو وہ بھی حق پر ہے۔

جنت ودوزخ:

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اعمال کی تکلیف اور ذمہ داری سے مقصود الٰہی کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ ارواح انسانی کو سعادت ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی عطا کی جائیں مگر اس سعادت وترقی کی بنیاد خدا نے اعمال نیک کے حصول اور اعمال بد سے پرہیز پر رکھی ہے اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ خلقت انسانی کی غرض یہ ہے کہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل کرے تاکہ وہ اپنی مقررہ سعادت اور موعودہ ترقی کو حاصل کرے اور اسی عالم کا نام جہاں یہ سعادت ابدی اور ترقیات غیر متناہی ملتی ہے ''بہشت'' ہے، اور اس عالم کا نام جہاں جاکر دنیاوی کمیوں کی تلافی اور گذشتہ حیات فانی کے اعمال بد کے نتائج سے پاکی حاصل ہوگی دوزخ ہے، اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ جنت ہی انسان کا اصلی گھر ہے مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

جنت انسان کی وراثت ہے:

حضرت آدمؑ کا قصہ جو توراۃ اور قرآن پاک میں مذکور ہے، وہ آغاز خلقت کی محض تاریخ نہیں بلکہ وہ حقیقت انسانی کی سچی اور حقیقی تفسیر ہے، عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اپنے فضل سے جس جنت میں جگہ دی تھی وہ پہلے ان کو اور ان کی نسل کو ہمیشہ کے لئے دے دی گئی تھی مگر چونکہ اتفاقاً ان سے گناہ سرزد ہوا اس لئے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دیئے گئے، مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آدمؑ کا زمین میں آنا تو ان کی پیدائش سے پہلے ہی مقرر

ہو چکا تھا' کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی خلقت سے پہلے ہی فرشتوں پر یہ ظاہر کر چکا تھا کہ

﴿ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً ﴾ (بقرہ)

میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

حضرت آدمؑ کا زمین میں خلیفہ ہونا ان کے زمین میں سکونت پذیر ہونے کی پیشین گوئی ہے' مگر زمین میں بھیجنے سے پہلے ان کو جنت میں رکھنا پھر گناہ کے بعد وہاں سے ان کو نکال کر زمین میں بھیجنا یہ اشارہ رکھتا ہے کہ آدم اور ان کی نسل کی اصلی جگہ یہی جنت ہے' مگر اس سے دُوری اس کے گناہ کی وجہ سے ہے' اور اس کا حصول خدا کی اطاعت اور نیکوکاری کے ذریعہ ہوگا' چنانچہ ان کے زمین میں اترتے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرما دیا۔

﴿ قُلۡنَا اہۡبِطُوۡا مِنۡہَا جَمِیۡعًا ۚ فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ ہُدًی فَمَنۡ تَبِعَ ہُدَایَ فَلَاخَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ۝ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴾ (بقرہ۔۴)

ہم نے کہا تم سب اس جنت سے اترو' پھر کبھی تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو اس کو نہ ڈر ہوگا نہ غم اور جنہوں نے نہ مانا اور ہمارے حکموں کو جھٹلایا تو وہی ہیں دوزخ والے' اور وہ اس میں رہا کریں گے۔

﴿ قَالَ اہۡبِطَا مِنۡہَا جَمِیۡعًا ۢ بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ ہُدًی ۬ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ ہُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشۡقٰی ۝ وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِکۡرِیۡ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیۡشَۃً ضَنۡکًا وَّنَحۡشُرُہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اَعۡمٰی ﴾ (طہ۔۱۲۳۔۱۲۴)

خدا نے کہا کہ اس جنت سے تم دونوں ایک ساتھ اتر جاؤ' تم ایک دوسرے کے دشمن ہو' اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی' تو وہ گمراہ نہ ہوگا اور نہ بدبخت ہوگا اور جس نے میری یاد سے منہ پھیرا' تو اس کے لئے تنگ معاش ہوگی' اور قیامت میں ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔

تورات میں ہے کہ جنت میں دو درخت تھے ایک نیک و بد کی پہچان کا اور دوسرا زندگی جاوید کا' توراۃ کی رو سے آدم کو اسی نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا ہے لیکن آدم نے اس کو کھا لیا اور اس کی وجہ سے سب سے پہلے ان کو اپنی برہنگی کا علم ہوا' آخر خدا نے ان کو جنت سے نکال دیا کہ وہ زندگی کے درخت کا پھل کھا کر خدائی کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں' جب وہ جنت سے نکالے گئے' تو ان سے کہا گیا

''اور اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھ سے حکم کیا کہ اس سے مت کھانا' زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائے گا اور وہ تیرے لئے کانٹے اور اونٹ کٹارے اگائے گی اور تو کھیت کی نبات کھائے گا اور تو اپنے منہ کے پسینہ کی روٹی کھائے گا' جب تک کہ زمین میں پھر نہ جائے'' (سفر تکوین۔۲)

قرآن پاک میں اس درخت کا نام جس کا پھل کھانے سے آدم کو روکا گیا تھا تصریحاً مذکور نہیں' لیکن ایک آیت سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک و بد کی شناخت کا درخت تھا اور شیطان نے یہ کہہ کر ان کو کھلایا کہ ''یہ حیات جاوید اور ملک جاوداں کا درخت ہے'' مگر اس کے کھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو ''برہنگی کا علم'' ہو گیا جو نیک و بد کی تمیز کا نتیجہ ہے۔

﴿ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطَانُ قَالَ يٰاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۝ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا ﴾ (طہ۔۱۲۱)

فرمایا شیطان نے آدم کو وسوسہ دیا اور کہا اے آدم! کیا میں تجھے حیات جاودانی اور سلطنت غیر فانی کا درخت بتاؤں تو (آدم اور حوا) دونوں نے اس درخت کا پھل کھایا تو ان کی بری چیزیں ان پر کھل گئیں

اب سوال یہ ہے کہ ”حیاتِ جاوداں“ اور غیر فانی بادشاہی سے مقصود کیا ہے، ظاہر ہے کہ جنت ہے‘ شیطان کا مقصود یہ تھا کہ اس جنت میں جس میں تم اب ہو بے دردسر ہمیشہ رہنے کا نسخہ تم کو بتاؤں؟ انسان نے خواہش کی تو اس نے نیک و بد کی تمیز کے درخت کا پھل بتا دیا‘ یہ بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نیک و بد کی تمیز ہی پر انسان کی شرعی تکلیف اور مؤاخذہ کی بنیاد ہے ہر وہ مخلوق بلکہ ہر وہ انسان جو اس ادراک سے خالی ہے وہ شرعی تکلیف اور مواخذہ سے بھی گرانبار نہیں ہے‘ غرض اس خیر و شر کی معرفت کا لازمی نتیجہ شریعت کی تکلیف تھی‘ چنانچہ وہ اس کے سر ڈالی گئی اور پھر نسل آدم میں یہ نیک و بد کی تمیز فطری الہام کے ذریعہ عنایت ہوئی‘ فرمایا۔

﴿ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ﴾ (الشمس)

اور نفس اور اس کی بناوٹ کی قسم‘ پھر نفس میں اسکی بدی اور اس کی نیکی کو الہام کیا۔

عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیتیں اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ (احزاب۔۷۳۔۷۲)

ہم نے اپنی امانت (تکلیف شرعی) آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا‘ اور انسان نے اس کو اٹھا لیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا‘ تا کہ اللہ نفاق والوں اور نفاق والیوں‘ شرک والوں اور شرک والیوں کو سزا دے اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر رجوع ہو اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

انسان نے اپنی جہالت سے اس تکلیف شرعی کی امانت کو اٹھا لیا جو نیک و بد کی معرفت کا لازمی نتیجہ تھا اور اس تکلیف شرعی کا لازمی نتیجہ جزا اور سزا تھی لیکن خدا کی رضامندی یہی تھی کہ اس کے سب بندے اس کی رحمت اور مغفرت کے مستحق ٹھہریں کہ اس کی رحمت و شفقت کا اقتضاء یہی ہے کہ گنہگاروں کو معاف کرے اور نیکوکاروں پر اپنی خاص رحمت نازل کرے لیکن اگر کاشت کار اپنے کھیتوں کو ابر رحمت سے مستفید ہونے کے قابل نہ بنائے تو وہ اس کی برکت سے مستفید نہ ہوگا اسی طرح جو بندہ شرک و نفاق میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو اس کی رحمت کے قابل نہ بنائے تو وہ بھی اس کی رحمت کی بارش سے سیراب نہ ہو سکے گا۔

غرض اس طرح وہ مصلحت الٰہی جو انسان کی پیدائش سے تھی پوری ہوئی اور وہ حیات جاوید اور غیر فانی بادشاہی جس کا حصول قضائے الٰہی نے انسان کی محنت‘ جدوجہد اور سعی و عمل پر موقوف رکھا تھا اور جسے شیطان نے آدم کو بلا سعی و محنت محض بخت و اتفاق سے دلوا دینا چاہا تھا بالآخر اس کا ملنا تقدیر الٰہی اور نظام ربانی کے مطابق شریعت کی پیروی و جدوجہد

اوراس کے مطابق سعی وعمل کے ذریعہ سے مقرر ہوا جیسا کہ پہلے سے طے شدہ تھا' فرمان آیا:

﴿ اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۴)

یہاں سے تم سب اترو پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی رہنمائی آئے تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی' توان کو نہ ڈر ہوگا نہ غم۔

﴿ اِهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۢ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنِ تَّبَعَ هُدَاىَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴾ (طہ۔۱۲۳)

تم دونوں یہاں سے نیچے اترو' تم ایک دوسرے کے دشمن ہو' پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے رہنمائی آئے' تو جس نے میری رہنمائی کی پیروی کی' تو وہ گمراہ نہ ہوگا اور نہ بدبخت۔

جب انسان کا اصل مقام وہی حیات جاوید اور مملکت ابد ہے تو اسی کا حصول اس کی تمام کوششوں کا محور ہونا چاہئے اور اسی حیاتِ فانی اور لازوال بادشاہی کی دولت کو اپنی اس فانی زندگی اور زوال پذیر بادشاہی کے تمام کاموں کے مزدومعاوضہ میں حاصل کرنا چاہئے تا کہ وہ اپنے باپ کی اس آسمانی بادشاہی کو پالے جس کی صفت یہ ہے

﴿ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ۝ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴾ (طہ۱۱۹۔۱۱۷)

تو شیطان تم کو جنت سے باہر نہ کردے تو پھر تم مشقت میں پڑ جاؤ' اور جنت میں تجھ کو یہ ملا ہے کہ اس میں تو نہ بھوکا ہوگا نہ ننگا نہ پیاسا ہوگا' اور نہ دھوپ کی تپش اٹھائے گا۔

آدمؑ اس جنت سے نکلے تو ان کو بھوک بھی لگی اور ننگے بھی ہوئے، پیاس بھی ان کو معلوم ہوئی اور دھوپ کی تپش کی بھی تکلیف ہوئی اور زمین میں آ کر انہیں چار چیزوں کی مشقت میں گرفتار ہوئے کھانا، پینا' پہننا' رہنا۔ یہی انسان کی چار مختصر ضروریات ہیں اور انہیں کو اپنی ہوا وہوس سے پھیلا کر اس نے ضروریات کا ایک عالم پیدا کرلیا اور انہیں کے تیار کرنے ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور عمدہ بنانے میں اپنی موجودہ زندگی کی تمام تر توجہ کو مصروف کردیا اور اصل جنت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا، یہیں سے شریعت کی تکلیف عائد ہوئی اور جائز اُکل' جائز شرب' جائز لباس اور جائز مسکن کے حصول کے طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے احتراز کا حکم ہوا' اسی سے شریعت کے اصول معاملات اور اخلاق انسانی کی ذمہ داریاں پیدا ہوئیں اور پھر اس لئے تا کہ اس حیات فانی میں پھنس کر حیات غیر فانی کی طلب کو بھول نہ جائے' عرفان الٰہی (عقائد صحیحہ) اور عبادت واطاعت الٰہی کی تلقین ہوئی' جو جنت کی اصلی غذا اور روزی ہے۔

﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ (مومنون۔۱)

یہی وہ میراث لینے والے ہیں' جو سایہ دار باغ کے وارث ہوں گے' اور وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

لیکن یہ وراثت انسان کو اپنے اعمال خیر ہی کے ذریعہ ملے گی چنانچہ اہل جنت کو جنت کے داخلہ کے وقت یہ بشارت ... لے گا۔

﴿ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ وَاَنْتُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِىْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (زخرف۔۷)

اور اس جنت میں وہ کچھ ہے، جس کو دل چاہے، اور آنکھوں کو لطف ملے، اور تم کو اس میں ہمیشہ رہنا ہے اور یہی وہ جنت ہے جس کے تم اپنے کاموں کے بدلہ میں جن کو تم کرتے تھے، وارث بنائے گئے۔

اور ان ہی کو منادی غیب یہ ندا دے گا۔

﴿ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (اعراف۔۵)

اور ان کو پکار کر کہے گا کہ یہی وہ جنت ہے جس کے تم اپنے ان کاموں کے بدلہ میں جو تم کرتے تھے، وارث بنائے گئے۔

ملت توحید کے مبلغ اعظم حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں کا ایک فقرہ یہ بھی تھا:

﴿ وَاجْعَلْنِىْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴾ (شعراء۔۵)

اور مجھے باغ نعمت کے وارثوں میں کر۔

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام نے انسان کا اصلی مقام وہی قرار دیا ہے جہاں نہ بھوک ہے، نہ پیاس، نہ برہنگی ہے، نہ دھوپ کی تکلیف، جہاں کی بادشاہی لازوال اور جہاں کی زندگی غیر فانی ہے، لیکن اس کے حصول کا ذریعہ صرف انسان کا نیک عمل اور صحیح عرفان ہے، جن کے مجموعہ کا نام ''تقویٰ'' ہے۔

﴿ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِىْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴾ (مریم۔۴)

یہ وہ بہشت ہے، جس کا وارث اپنے بندوں میں سے ہم اس کو بنائیں گے، جو تقویٰ والا ہوگا۔

انسانی جزاء وسزا کے تین گھر:

انسان کے تین گھر ہیں، ایک موجودہ فانی عالم جس کو دنیا کہتے ہیں اور دوسرا درمیانی عالم موت یا عالم قبر جس کا نام برزخ ہے اور تیسرا اس غیر فانی زندگی کا گھر جس کو دار آخرت کہتے ہیں، یہودیوں کے یہاں اصلی زور اسی دنیا کی جزا و سزا پر ہے، ان کے ہاں تیسرے کا ذکر بہت کم، اور دوسرے کا مطلق نہیں، اور عیسائیوں میں پورا زور تیسری منزل کی سزا و جزا پر ہے، اور پہلی اور دوسری منزلوں کے ذکر سے خاموشی ہے لیکن وحی محمدی کی تکمیل نے ان تینوں گھروں کو انسانی سزا و جزاء کا مقام قرار دیا ہے، انسان کو اپنے اعمال کی پہلی جزا و سزا تو اسی دنیا میں کامیابی و ناکامی کی صورت میں ملتی ہے گو اس کامیابی و ناکامی کے سمجھنے کا معیار مختلف ہو، اس کے بعد جب انسانی روح دوسری منزل میں قدم رکھتی ہے تو یہاں بھی وہ اپنے اعمال کی تھوڑی بہت جزا و سزا کا منظر دیکھ لیتی ہے اس کے بعد جب موجودہ دنیا کے پورے کاروبار کا خاتمہ ہو کر اس فانی کائنات کا ہر نقش و نگار مٹ جائے گا اور پھر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا تو فانی انسانوں کو دائمی زندگی کے لئے پیدا کیا جائے گا اور اس وقت وہ اپنے اعمال کی پوری جزا و سزا پائیں گے۔

انسان کا پہلا دار الجزاء:

انسان کا پہلا دار الجزاء یہی دنیا ہے۔ گو انسان کے ہر نیک و بد فعل کی پوری جزا تو دوسری دنیا کی زندگی میں ملتی

ہے، لیکن اس کے نیک و بد فعل کے مماثل اس موجودہ دنیا کی زندگی میں بھی اس کو کچھ نہ کچھ جزا ملا کرتی ہے۔ انسان کی عزت‘ شہرت، ناموری‘ ہردلعزیزی‘ محبوبیت‘ تسکین‘ اطمینان‘ سرور‘ فارغ البالی‘ حکومت یہ تمام اس زندگی کے اعمال خیر کے نتائج ہیں‘ ان کے برخلاف ذلت‘ رسوائی، بے عزتی کسمپرسی، پریشان حالی‘ بے اطمینانی‘ غم‘ خوف، محکومیت ہمارے اعمال بد کے اثرات ہیں۔

یہودیوں کی تورات میں اعمال کے نتائج میں زیادہ اہمیت اسی دنیاوی دارالجزاء کو دی گئی ہے‘ بلکہ یہی خیال توراۃ میں سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ خدا کی فرمانبرداری اور نافرمانی کی جزا اسی دنیا کی رنج و راحت کی صورت میں اسی زندگی میں ملتی ہے مثلاً خدا کے حکموں پر عمل کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری کھیتیاں سرسبز ہوں گی‘ تمہاری اولادیں برومند ہوں گی‘ تمہارے جانور جنیں گے، تمہارے درخت پھل دیں گے اور تمہارے دشمن مغلوب ہوں گے اور اگر خدا کی نافرمانی کرو گے تو تم پر وبائیں آئیں گی‘ قحط پڑیں گے‘ تمہاری اولادیں جیتی نہ رہیں گی، تمہارے جانور مر جائیں گے تمہارے شہر تباہ ہو جائیں گے‘ تمہارے باغ پھل نہ دیں گے اور تمہارے دشمن تم پر چھا جائیں گے۔ عیسائیت نے اس کے بالمقابل سارا زور زمین کی مملکت پر نہیں بلکہ آسمان کی بادشاہت پر دیا ہے اور اس ظاہری زندگی کے فوز و فلاح کو اپنے مقصد سے خارج قرار دیا ہے‘ آنحضرت ﷺ جس دعوت کو لے کر آئے وہ یہودیت و عیسائیت کی اس افراط و تفریط دونوں سے پاک ہے۔ اس نے ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ اس دنیا کی بادشاہی بھی قرار دی اور اس دنیا کی بھی‘ زمین کی حکومت بھی اور آسمان کی جنت بھی‘ یہاں کی سرسبزی و شادابی بھی اور وہاں کے باغ و بہار بھی‘ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نیکوکار مسلمانوں کے ذکر میں فرمایا:

﴿ فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾ (آل عمران۔۱۵)

تو خدا نے ان کو دنیا کا بدلہ بھی دیا اور آخرت کے ثواب کی خوبی بھی اور اللہ نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

ایمان اور عمل صالح والوں سے یہ وعدہ تھا کہ

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ (فتح۔۴)

خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے‘ گناہوں کی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا۔

یہ بھی انہیں سے وعدہ ہے۔

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾ (نور۔۷)

خدا نے ان سے جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کئے‘ وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو ملک میں حاکم بنائے گا‘ جس طرح ان سے اگلوں کو حاکم بنایا تھا۔

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جس طرح اس دنیا کی فانی زندگی سے اس دنیا کی باقی زندگی زیادہ پائیدار ہے‘ اسی طرح اس دنیا کے ثواب سے اس دنیا کے ثواب کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہے اور اسی دنیا کے حسن عمل کی کوشش سے اس دنیا کی بہتری بھی ملتی ہے‘ فرمایا:

﴿ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ط وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ط وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (نحل۔۳۰)

جنہوں نے نیک کام کئے اس دنیا میں ان کے لئے بھلائی ہے اور بے شبہ آخرت کا گھر بہتر ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیا اچھا ہے۔

اسی طرح بدکاروں کی جزا جہاں اس دنیا کی دوزخ اور آگ کے عذاب کو فرمایا اسی طرح اس دنیا کی ذلت و خواری اور رسوائی کو بھی فرمایا

﴿ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ﴾ (حج۔۲)

اس نے دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا۔

﴿ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ (بقرہ۔۱۴)

ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑی مار ہے۔

﴿ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ﴾ (بقرہ۔۲۷)

ان کے کام دنیا اور آخرت میں برباد ہوئے۔

اور ان کے متعلق یہ بھی فرمایا۔

﴿ فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ﴾ (آل عمران۔۶)

تو میں ان کو دنیا اور آخرت میں سخت سزا دوں گا۔

تنگی اور بدحالی کی سزا بھی یہیں ملتی ہے

﴿ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴾ (طہ۔۱۲۴)

اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو اس کے لئے تنگ گذران ہے اور قیامت میں اس کو اندھا اٹھاؤں گا کہ دنیا میں وہ دل کا اندھا بنا تھا۔

انتہا یہ ہے کہ خود صحابہ کو جنگ احد میں جو فتح نہیں ملی اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی ان کی بعض فروگذاشتوں کا ثمرہ بتایا

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ﴾ (آل عمران۔۱۶)

تم میں سے بعض لوگ اس دن جب دونوں فوجیں بھڑیں جو پیچھے ہٹے ان کے بعض کاموں کی وجہ سے شیطان نے ان کو پھسلا دیا۔

ایک اور مقام پر عام طور سے فرمایا گیا۔

﴿ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴾ (شوریٰ۔۴)

جو مصیبت تم کو پہنچی وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوتوں کے باعث اور وہ بہت سی باتوں سے درگذر کرتا ہے۔

یہود کے ذکر میں قرآن نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا ہے عذاب کے موقع پر فرمایا۔

﴿ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْآ اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ط ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴾ (آل عمران۔۱۱۲)

ان پر ذلت ماری گئی جہاں پائے گئے' لیکن (جہاں عزت حاصل ہے) وہ خدا کے ذریعہ اور لوگوں کے سہارے' اور اللہ کا غصہ کما لائے اور ان پر (قومی) محتاجی ماری گئی' یہ اس لئے کہ وہ خدا کے حکموں کا انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو مار ڈالتے تھے' یہ اس لئے کہ وہ نافرمان ہیں اور حدود الٰہی سے آگے بڑھتے ہیں۔

اس کے بالمقابل عام اہل کتاب سے کہا گیا۔

﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَ كَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ﴾ (مائدہ۔۹)

اور اگر یہ تورات اور انجیل کو اور جو ان کی طرف ان کے پروردگار کی طرف سے (اب) اتارا گیا اس کو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر (برکاتِ آسمانی) سے کھاتے اور اپنے پاؤں کے نیچے (ارضی خیر و برکت) سے کھاتے۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہے۔

﴿ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ (اعراف۔۱۲)

اور ان آبادیوں کے رہنے والے ایمان لاتے' اور پرہیزگاری کے کام کرتے تو ہم ان پر آسمان سے اور زمین سے برکتوں کو کھولتے لیکن انہوں نے خدا کے احکام کو جھٹلایا تو ہم نے ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا۔

مگر یہ دار الجزاء فانی ہے:

لیکن یہاں ایک لغزش گاہ بھی ہے جس سے اہل ہوش کو باخبر رہنا چاہئے' اس دنیا میں گو انسان کو اعمال کی جزا و سزا کسی نہ کسی رنگ میں ضرور ملتی ہے' مگر اس نکتہ کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ کیا شخصی زندگی اور کیا جماعتی حیات کے لحاظ سے یہ دار الجزاء جس کا نام دنیا ہے عارضی اور فانی ہے' یہاں کا غم بھی فانی اور یہاں کی خوشی بھی عارضی ہے اس لئے صرف اسی دنیا کی کامیابی کو اپنی زندگی کا اصل مطلوب و مقصود اور غایت و منتہا نہیں بنانا چاہئے بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ اس سے بھی زیادہ ایک اور وسیع آسمانی مملکت اور لازوال ربانی سلطنت ہے جو فنا و زوال کے ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے اور جہاں کی نعمتیں اس دنیا کی نعمتوں سے کہیں زیادہ بہتر اور غیر فانی ہیں اس لئے اس فانی دنیا کی لذتوں میں پڑ کر اس کو نہ بھول جانا چاہئے' اس مسافر کی عقل سلیم کی داد کون دے گا جو راستہ کی عارضی خوش منظریوں اور سفر کی فانی دلچسپیوں میں پڑ کر اپنے خوش سواد اور سدا بہار وطن کو فراموش کر بیٹھے۔

﴿ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴾ (اعلے۔۱)

بلکہ تم دنیاوی زندگی کو بڑھ کر چاہتے ہو حالانکہ آخرت کی زندگی اس سے بہتر اور اس سے زیادہ پائیدار ہے۔

﴿ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ﴾ (یوسف۔۷)

اور بے شک آخرت کی مزدوری (یہاں کی مزدوری سے) بہتر ہے

اور اسی طرح گنہگاروں کے لئے یہاں کی ذلت و رسوائی سے بڑھ کر ایک اور ذلت و رسوائی کا مقام ہے

﴿ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ط لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (زمر۔۳)

تو خدا نے ان کو اس دنیاوی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا اور شبہ نہیں کہ آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑا ہے اگر وہ جانتے
اس دنیا کی ذلت و رسوائی تو شاید سہہ لی جائے مگر وہاں کے عذاب کی سختی کو کون سہہ سکتا ہے کہ

﴿ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴾ (طٰہٰ۔۷)

آخرت کا عذاب البتہ زیادہ سخت اور زیادہ دیر رہنے والا ہے۔

اس لئے اس فانی دنیا میں انسان کو اپنے حسن عمل کی بدولت جو زور و قوت، جاہ و جلال، نعمت و مال اور حکومت و سروری ملے ان کو بھی آخرت کی لازوال نعمتوں اور وہاں کی غیر فانی بادشاہی کے حصول میں صرف کرنا چاہئے کہ اس سے خود ان دنیاوی نعمتوں کو بھی بقاء اور پائیداری حاصل ہوگی۔ اسی فلسفہ کو محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی حقیقت طراز نے قارون کی نصیحت کے ضمن میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے۔

﴿ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ﴾ (قصص۔۷۷)

اور خدا نے جو تجھ کو دیا ہے اس سے آخرت کا گھر تلاش کر اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول اور جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی (خدا کے بندوں پر) احسان کر اور اس دولت سے زمین میں خرابی نہ چاہ۔

چنانچہ ناخلف یہود پر تباہی اسی لئے آئی کہ وہ دنیاوی زندگی کی دولت و جائداد کی محبت میں ایسے پھنسے کہ ان کو اپنے کاروبار میں آخرت کے سودا کا خیال بھول کر بھی نہ آیا۔

﴿ فَخَلَفَ مِنْ ۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴾ (اعراف۔۱۶۹)

تو ان کے بعد کچھ ناخلف کتاب کے وارث ہوئے، جو اس دنیا کے سامان و اسباب کو لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف ہوگا اور اگر ویسا ہی سامان و اسباب پھر آئے تو پھر لیں، کیا ان سے کتاب کے حق میں یہ عہد نہیں لیا گیا کہ وہ خدا پر حق کے سوا کچھ اور نہ بولیں، حالانکہ جو اس میں ہے وہ اس کو پڑھ چکے ہیں اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لئے بہتر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں۔

یہ دارالجزاء دارالاصلاح بھی ہے:

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و شفقت سے انسان کو پیدا کیا، اور اسے ہمیشہ کی زندگی کا مقام بھی دکھایا اور بتایا کہ اس مقام کا دائمی و ابدی استحقاق خود تمہارے عمل سے تم کو ہو سکتا ہے اور یہ دنیاوی زندگی اسی لئے اس کو دی گئی کہ وہ اس زمانہ میں اس سدا بہار سرزمین کی ملکیت کو اپنے عمل کی قیمت سے خرید سکے مگر چونکہ انسان دوسری مصلحتوں کے لحاظ سے طبعاً کمزور، زود فراموش اور بھولنے والا بھی پیدا ہوا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی اسی مستعار زندگی میں بار بار اپنے سنبھلنے سدھرنے اور کامیاب بننے کے مواقع عنایت کئے اور رسولوں کی بعثت، معلموں کی آمد، شریعت کی تعلیم، پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ اور گناہوں پر جسمانی سزا و تعزیر اور عمل خیر پر روحانی لذت اور عمل شر پر روحانی غبار و کدورت کے

لوازم اسی لئے مقرر ہوئے کہ اس کو ہر قدم پر اپنے اعمال پر تنبیہ اور اپنی غلط روی کا احساس ہو اور ان سب کے علاوہ اس نے اپنی غایت رحمت سے انسانوں کی تنبیہ اور اصلاح کے لئے حسب ذیل مراتب مقرر کئے۔

۱۔ نیکی سے برائی کا کفارہ، چونکہ انسان کتنی ہی کوشش کرے، اپنی فطری کمزوریوں کی حد سے باہر نہیں نکل سکتا، اس لئے جس طرح اس دنیا میں اس نے انسانوں کے دلوں میں یہ فطری اصول ودیعت کر دیا ہے کہ جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہو اس کی معمولی برائیوں سے چشم پوشی کی جاتی ہے یا یہ کہ آخر میں اس کا کوئی ایک نیک کام اتنا زبردست ہو جاتا ہے کہ اس سے اس کی تمام اگلی برائیوں کی فرد دھل جاتی ہے اسی کا نام کفارۂ عمل ہے چنانچہ وحی محمدی نے اصولی طور پر یہ حقیقت ان الفاظ میں تلقین کی کہ:

﴿ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ﴾ (ھود۔۱۰)

بے شبہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں

اس آیت کا یہ بھی منشاء ہے کہ نیکیوں کی تدریجی ترقی بالآخر برائیوں کو کم کرتی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ پورا نیکوکار انسان بن جاتا ہے اور یہ بھی خوشخبری اس میں پوشیدہ ہے کہ یہی نیکیاں اس کی پہلی برائیوں کے نتیجہ کو بھی انشاءاللہ مٹا دیں گی، اس معنی کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں۔

﴿ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴾ (نسا۔۵)

تم کو جن باتوں سے منع کیا گیا ہے، اگر ان میں کی بڑی باتوں سے تم بچتے رہو گے تو ہم تمہاری تقصیریں تم سے اتار دیں گے اور تم کو عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔

﴿ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ (مائدہ۔۳)

البتہ اگر تم نماز کھڑی کرو، اور زکوۃ دو، اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ، اور ان کی مدد کرو گے اور اللہ کو اچھی طرح قرض دو گے، تو میں تمہارے گناہوں کو اتار دوں گا اور تم کو ان جنتوں میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ﴾ (احقاف۔۱۶)

یہ وہ ہیں جن کے اچھے عمل کو ہم قبول، اور ان کی برائیوں سے درگذر کریں گے اور یہی ہیں رہنے والے جنت کے۔

۲۔ توبہ کفارہ ہے، انسان کے تمام کاروبار میں اصل شے اس کا دل ہے۔ اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے ناپاک بنتا ہے انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فروگذاشتوں پر اس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہو کر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہو کر آئندہ کے لئے نیکوکاری کا خدا سے مستحکم وعدہ کر لے تو اس کا نام توبہ ہے، یہ توبہ سے گنہگار انسان کو بھی خدا کے آغوش محبت میں لا کر ڈال دیتی ہے، آدمؑ کا قصور اور پھر ان کی توبہ اور رحمت الٰہی کے رجوع کے واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک مثالی صورت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آغوش رحمت کس طرح گنہگار انسان کو واپس لینے کے لئے ہمیشہ وا رہتی ہے، رحمت الٰہی کے اس پر جوش نظارہ کی جو کیفیت محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفہ وحی اور پیام نبوت میں نظر آتی ہے اس سے ہندوستان کا ہرمت اور دھرم قطعاً محروم، تورات خاموش، زبور کی

سریلی آواز مدھم، اور انجیل کی خوشخبری مبہم ہے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے پیام ربانی میں اس کی کیفیات اور اصول و شرائط کو جس شرح وبسط کے ساتھ بیان فرمایا وہ گویا رب العلمین کی طرف سے رحمۃ للعالمین کا خاص حصہ تھا، فرمایا

﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا ﴾ (مریم۔۴)

مگر جس نے توبہ کی، اور ایمان لایا، اور نیک کام کئے، تو وہ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا۔

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک توبہ کی بھلائی اس کے گناہوں کے سارے دفتر دھو کر ان کی جگہ آپ لے لے گی

﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ (فرقان۔۶)

مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کئے تو یہ وہ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بخشنے والا رحم والا ہے۔

اور یہی اسکی شانِ رحمت کا اقتضا ہے یہاں تک کہ چور اور ڈاکو بھی اپنے گناہوں سے توبہ کریں، تو ان کو بھی بشارت ہے۔

﴿ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ (مائدہ۔۶)

تو جس نے اپنے پر ظلم کرنے کے بعد توبہ کی اور اپنے کو سدھارا، تو بے شک اللہ اس پر رجوع ہو گا کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے، کیا تجھے نہیں معلوم کہ آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ جس کو چاہے سزا دے اور جس کو چاہے معاف کرے، اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قطعی اصول ظاہر فرما دیا کہ:

﴿ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴾ (طٰہٰ۔۴)

اور بے شک میں اس کو بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی اور ایمان لایا، اور نیک کام کئے اور پھر راہ پر چلا۔

لیکن یہ توبہ کس لئے ہے اور کس شرط کے ساتھ ہے۔

﴿ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ﴾ (نساء۔۱۷۔۱۸)

اللہ کو ان کی توبہ قبول ضرور کرنی ہے جو نادانی سے برا کام کرتے ہیں، پھر جلد توبہ کرتے ہیں، تو یہی وہ ہیں جن کو اللہ معاف کرتا ہے اور اللہ سب جانتا ہے اور حکمت والا ہے اور ان کی توبہ نہیں ہے جو برے کام کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئی تو اس نے کہا کہ اب میں نے توبہ کی، اور نہ ان کی توبہ ہے جو کافر ہو کر مریں۔

مقصود یہ ہے کہ توبہ کے بعد اس بندہ کے دل میں آئندہ تلافی اور تدارک کا احساس بھی موجود ہو اور ظاہر ہے کہ موت کے وقت یہ احساس ممکن ہی نہیں، ہاں اگر وہ توبہ اپنے احساس کے اثر سے کرے اور اس کے بعد اتفاقاً موت آ جائے

تو یقیناً رحمت الٰہی اس کے قبول کرنے میں تامل نہ کرے گی۔

﴿ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾

(اعراف۔۱۹)

اور جنہوں نے برے کام کئے' پھر اس کے بعد باز آئے (توبہ کی) اور یقین کیا' تو بے شک تیرا پروردگار اس کے بعد اس کو بخشنے والا اور اس پر رحم کرنے والا ہے۔

﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ (نساء۔۱۶)

اور جو کوئی برا کام کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے پھر اللہ سے اپنے گناہ کی معافی چاہے' تو وہ اللہ کو بخشش والا رحم کرنے والا پائے گا۔

۳۔ مصائب کی تنبیہ اور کفارہ:

دنیا میں مصائب سے زیادہ بری اور تکلیف دہ چیز انسان کو کوئی دوسری نہیں معلوم ہوتی' لیکن یہ حقیقت بھلانے کے لائق نہیں کہ افراد بلکہ جماعتیں اور قومیں بھی مصائب ہی کی تنبیہ اور سرزنش سے متنبہ اور ہوشیار ہو کر آمادۂ اصلاح ہوتی ہیں' چنانچہ اکثر اخلاقی محاسن کے جوہر کو مصیبتوں ہی کی آگ نکھار کر کندن بناتی ہے۔ صبر' استقلال' تواضع' شکر' محبت اور رحم ان تمام اخلاقی فضائل کی تربیت انہیں مصائب کے زیر سایہ ہوتی ہے۔ مغرور سے مغرور انسان بھی جب کسی اتفاقی مصیبت کی ٹھوکر کھاتا ہے تو سنبھل جاتا ہے' اس لئے غافل انسانوں اور خود فراموش سرمستوں کو ہوش میں لانے کے لئے کبھی کبھی کی مصیبتوں سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہیں کہ ان کی بدولت ملحد سے ملحد انسان بھی ایک دفعہ بے قرار ہو کر خدا کا نام لے ہی لیتا ہے۔

دولت ونعمت اور کامیابی ومسرت شراب ہے جس کے نشہ کا اتار اتفاقی مصائب ہی کی ترشی سے ہو سکتا ہے' انسان خدا کو کتنا ہی بھولا ہوا اور اپنی دولت وثروت پر کتنا ہی نازاں ہو لیکن جب وہ کسی افتاد سے دوچار ہوتا ہے تو دفعۃً اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں' بیماری' تنگ دستی' عزیزوں کی موت' آرزوؤں کی ناکامی ان میں سے ہر چیز وہ ٹھوکر ہے جس کو کھا کر سرمست سے سرمست راہگیر بھی ایک دفعہ چونک کر ہشیار ہو جاتا ہے اور اس کو اپنے راستہ کی غلطی معلوم ہو جاتی ہے اس لئے ان مصائب میں انسانوں کے اعمال بد اور گناہوں کا کفارہ بننے کی صلاحیت پوری طرح موجود ہے کہ اس تھوڑی سے تکلیف سے بندہ میں جو روحانی احساس پیدا ہوتا ہے وہ بڑی بیش قیمت چیز ہے۔

قرآن پاک نے اس نکتہ کو جا بجا بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہگاروں کو' اس سے پہلے کہ ان کو ہلاک کرے' مصائب کی آزمائشوں میں ڈالتا ہے' تاکہ شاید وہ اپنے بھولے ہوئے مالک کو یاد کریں اور اپنی غلط روی پر متنبہ ہو کر اپنی ہدایت وصلاح کی فکر کریں' فرمایا۔

﴿ وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴾ (اعراف۔۱۳۰)

اور بے شک ہم نے فرعون والوں کو قحطوں اور پھلوں کی کمی کی مصیبت میں گرفتار کیا تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

بنی اسرائیل کے متعلق ہے۔

﴿ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ (اعراف۔۲۱)

اور ہم نے ان کو نعمتوں اور مصیبتوں کے ساتھ آزمایا تا کہ وہ شاید باز آئیں۔

اسی سورہ میں ایک اور جگہ اس اصول کو ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا۔

﴿ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّبِیٍّ اِلَّآ اَخَذۡنَآ اَہۡلَہَا بِالۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّہُمۡ یَضَّرَّعُوۡنَ ﴾ (اعراف۔۱۲)

اور ہم نے کسی آبادی میں کوئی نبی نہیں بھیجا' لیکن وہاں کے رہنے والوں کو سختیوں اور مصیبتوں میں گرفتار کیا تا کہ شاید وہ گڑگڑائیں۔

مسلمانوں سے فرمایا گیا۔

﴿ وَلَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ۝ الَّذِیۡنَ اِذَآ اَصَابَتۡہُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ قَالُوۡٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ۝ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَرَحۡمَۃٌ ط وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُہۡتَدُوۡنَ ﴾ (بقرہ۔۱۹)

اور البتہ ہم تم کو تھوڑے خوف' بھوک اور دولت کی اور جانوں کی اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے اور ان صابروں کو خوشخبری سنا کہ جن کو جب کوئی مصیبت ستاتی ہے تو کہتے ہیں ہم خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں' یہ وہ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی برکتیں اور رحمتیں ہوں گی' اور یہی سیدھی راہ پائے ہوئے ہیں۔

اسی اصول کے تحت احادیث صحیحہ میں آنحضرت ﷺ نے اس کے متعدد جزئیات بیان فرمائے ہیں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری ﴿ مَنۡ یَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا یُّجۡزَ بِہٖ ﴾ (نساء۔۱۸) (جو کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ اس کو دیا جائے گا) تو میں نے آنحضرت ﷺ سے اس کا مطلب پوچھا، فرمایا کہ ''یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے عتاب ہے اس کا بدلہ دنیا میں بندہ کی ہر تکلیف سے پورا ہو جاتا ہے' جیسے اس کو بخار آ جائے یا وہ کسی مصیبت سے دوچار ہو جائے یہاں تک کہ جیب میں کوئی چیز رکھ کر بھول جائے اور اس سے جو تکلیف اس کو پہنچے وہ تکلیف بھی کفارہ بن جاتی ہے یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے اس طرح صاف ستھرا ہو کر نکلتا ہے جیسے بھٹی سے سونا [1] دوسری حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مسلمان کو کوئی مصیبت پیش نہیں آتی لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے یہاں تک کہ اگر اس کے کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی کفارہ بن جاتا ہے'' تیسری روایت مین ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''مسلمان کو کوئی تکلیف یا بیماری یا غم یا اذیت نہیں پہنچتی لیکن یہ کہ وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے' یہاں تک کہ اگر اس کے کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی'' چوتھی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''کسی مسلمان کو کوئی تکلیف کانٹا چبھنے سے لے کر اوپر تک جتنی بھی پہنچے' اللہ تعالیٰ اس سے اس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتا ہے جیسے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ پانچویں روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''دنیا میں جو مسلمان کسی جرم کا مرتکب ہوا اور اس کی سزا اس کو یہیں مل گئی تو وہ اس کے لئے کفارہ اور اس کو اس گناہ سے پاک و صاف بنانے والی ہے۔'' [2]

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ کوئی انسان جو اقرار توحید کے بعد گناہ میں ملوث ہو گیا ہو دنیا میں توبہ' اعمال نیک اور مصائب پر صبر و شکر کے ذریعہ سے نجات پا سکتا ہے اور اس دنیا سے اسی طرح پاک و صاف ہو کر نکل سکتا ہے کہ موت کے

---

[1] یہ اور اس کی ہم معنی حدیثیں اکثر کتب حدیث میں ہیں مثلاً ترمذی تفسیر آخر النساء، سنن ابی داؤد اوائل کتاب الجنائز۔

[2] صحیح بخاری اوائل کتاب المرضیٰ میں یہ تینوں روایتیں ہیں۔

بعد اس کو کسی نئے کفارہ گناہ کی ضرورت پیش نہ آئے۔

اسی لئے قرآن پاک میں ہے۔

﴿ وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ (سجدہ۔۲)

اور ہم البتہ ان کو بڑے عذاب سے پہلے ادنیٰ عذاب کا کچھ مزہ چکھاتے ہیں تاکہ وہ اب بھی باز آئیں۔

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ عذاب الٰہی کا مقصد انتقام اور نفس سزا اور عقوبت نہیں بلکہ شریر نفس کو راہ راست پر لانا ہے، اسی لئے ایک اور آیت میں فرمایا۔

﴿ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ط وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴾ (نساء۔۲۱)

اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ خدا (نیکیوں) کا قبول کرنے والا اور (تمہارے ہر عمل کو) جاننے والا ہے۔

الغرض یہ عذاب اس دنیا میں آئندہ گناہوں سے بچانے اور گذشتہ گناہوں سے پاک کرنے کے لئے ہوتا ہے اور عالم برزخ اور عالم بعث میں چونکہ نئے عمل کے محل نہیں، اس لئے ان دونوں مقاموں میں آئندہ کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوسکتا، صرف گذشتہ بداعمالیوں کی سزا بھگت کر ان کے نتائج سے نجات مل سکتی ہے اور یہی عالم برزخ اور عالم بعث کے عذابوں کا مقصد ہے الا یہ کہ پروردگار عالم خود اپنی رحمت سے نوازے اور معاف فرمائے۔

عذاب برزخ بھی کفارہ ہے:

لیکن اگر کسی انسان کے اندر گناہوں کی ناپاکیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اس کی دنیاوی زندگی کے تمام کفارے بھی اس کو دھو کر پاک وصاف نہ بنا سکے تو اس کو اپنے مرنے کے بعد بھی برزخ کے عالم میں اپنے اعمال بد کی مناسب سزاؤں کی صورتوں میں تکلیفیں اٹھا کر پاک وصاف بننا پڑے گا، یہی عالم برزخ کا عذاب ہے، اس سے ظاہر ہوگا کہ عالم برزخ کی یہ سزائیں اس لئے ہیں کہ ہم نے دنیا میں اپنی ناپاک خواہشوں اور ناپاک کاموں سے احتراز کرنے کی جو زحمت نہیں اٹھائی اور اچھے کاموں کے کرنے میں جو تھوڑی تکلیف پیش آتی ہے اس کو برداشت کر کے اچھے کام جو نہیں کئے، ان دونوں کے معاوضہ میں عالم برزخ میں آ کر عذاب کی تکلیفیں اٹھائیں تاکہ حیات ثانی کے دروازہ پر پہنچ کر بھی اگر ہم ان سزاؤں کے ذریعہ پاک وصاف ہوسکیں تو پاک وصاف ہو کر اپنی موروثی بہشت کے قابل بن سکیں، جو صرف پاکوں اور بے گناہوں کی جگہ ہے، یعنی ان کی جگہ ہے جو سرے سے کسی گناہ کے مرتکب نہ ہوئے ہوں یا یہ کہ گناہ کے مرتکب ہوئے مگر اعمال نیک، توبہ اور مصائب میں صبر وشکر کر کے یا برزخ میں سزا پا کر وہ گناہوں کے داغ سے نجات پاسکے۔

یہ بات کہ عذاب برزخ بھی ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے، قرآن پاک کی متعدد آیتوں سے نکلتی ہے اور یہ اسلام کے اس اصول سے مترشح ہے کہ ایک مسلمان کی ہر تکلیف اس کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ ہے، اس بناء پر عذاب برزخ بھی اس کے گناہ کا کفارہ ہوگا، قرآن پاک کی اس آیت سے بھی یہ بات کنایۃً نکلتی ہے۔ گنہگار حشر کے دن کہیں گے

﴿ وَبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِیْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ﴾ (انعام۔۱۵)

اور ہم مقررہ وقت جس کو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا پہنچ چکے۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حشر سے پہلے عذاب کے ایک دورے کو ختم کر چکے۔

بعض حدیثوں میں بھی اس کنایہ کی تصریح ملتی ہے۔ کنز العمال میں ایک حدیث ہے:

عن ابن عمرؓ ان طول مقام امتی فی قبورھم تمحیص الذ نوبھم (کنز العمال باب عذاب القبر جلد ۸ ص ۹۶)

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میری امت کے لوگوں کا اپنی قبروں میں طول قیام ان کو گناہوں سے خالص کرتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے۔

﴿ الضمته فی قبر کفارة لکل مومن لکل ذ نب بقی علیه ولم یغفرله ﴾ (ایضاً)

یعنی قبر کی تنگی مومن کے گناہ کا کفارہ ہے

اسی لئے ایک اور حدیث میں آیا ہے

﴿ اَکْثَرُ عذ اب امتی فی قبورھم ﴾ [1]

میری امت (کے لوگوں) کو زیادہ تر عذاب ان کی قبروں میں ہوگا۔

اس حدیث کا (اگر وہ ثابت ہو تو) منشا یہ ہے کہ امت محمدیہ کے اکثر افراد اسی برزخ کے محدود زمانہ عذاب میں نکھر کر اور پاک وصاف ہو کر جنت کے قابل ہو جائیں گے اور عذاب دوزخ کی ضرورت ان کو پیش نہ آئے گی حافظ ابن القیم ایک موقع پر لکھتے ہیں۔

﴿ فان وفت بالخلاص منها فی هذ ه الدار ولا ففی البرزخ فان وفی بالخلاص والّا ففی موقف القیامة واھوالھا ما یخلصھم من تلك البقیة ﴾ [2]

اگر ان بیماریوں کا یہ علاج اس دنیا میں نجات کے لئے پورا ہو گیا تو خیر ورنہ برزخ کی سزا سے اس کا علاج کیا جائے گا تو اگر یہ نجات کے لئے کافی ہو گیا تو خیر ورنہ پھر قیامت کا مقام اور اس کی ہولناکیاں باقی بیماریوں سے نجات دلوائیں گی۔

رویائے برزخ کی حدیث میں جو پہلے مفصل گذر چکی ہے، وہ منظر بھی دکھایا گیا ہے جس میں گنہگار عذاب کے دور سے نکل کر اور نہر حیات میں نئی زندگی پا کر بہشت کے مستحق قرار پائے ہیں [3] غالباً انہیں نجات پانے والے مومنوں کو دیکھ کر مشرکین بھی قیامت میں یہ کہیں گے۔

﴿ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ﴾ (انعام-۱۵)

اور جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا اے گروہ جن، تم نے بہت سے انسانوں کو اپنا بنا لیا، اور ان کے دوست

---

[1] اس حدیث کو شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ باب الوقائع الحشریہ میں نقل کیا ہے، لیکن مجھے اس کا اصل مآخذ معلوم نہ ہو سکا۔

[2] شفاء العلیل ابن القیم مطبعہ حسینیہ مصر ص ۲۲۴۔

[3] حسب تفسیر ابن عباسؓ، ابن جریر طبری ج ۸ صفحہ ۲۴ مصر۔

انسان کہیں گے کہ ہمارے پروردگار ہم میں سے ایک نے دوسرے سے کام نکالا اور ہم مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لئے ٹھہرایا تھا، پہنچ چکے۔

یہ الفاظ کہ ''ہم اپنے مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا، پہنچ چکے'' یہ معنی رکھتے ہیں کہ عالم برزخ کا مقررہ دورۂ عذاب ہم ختم کر چکے اور اب حشر ونشر کے عذاب کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے اس لئے بعض دوسرے نیک بختوں کی طرح ہم کو بھی اب چھٹکارا ملے، جواب ملے گا

﴿ قَالَ النَّارُ مَثْوٰكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ ط اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴾ (انعام۔۵)

فرمائے گا آتش دوزخ تمہارا ٹھکانا ہوا اس میں سدا رہو گے لیکن یہ کہ جو اللہ چاہے بے شک تیرا رب حکمت والا اور علم والا ہے۔

اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تمہارا دورۂ عذاب ختم نہیں ہوا ہے اور تمہاری پاکیزگی ابھی تمام نہیں ہوئی اس لئے ابھی اس دوسرے عالم کا عذاب بھی تم کو سہنا ہے پھر جب خدا چاہے گا تم کو اس سے نجات دے گا۔ اس کا ہر کام علم وحکمت پر مبنی ہے۔ اس کے علم وحکمت اور مشیت کا جب تقاضا ہو گا تم کو نجات ملے گی۔

عذاب دوزخ کفارۂ گناہ ہے:

ابھی یہ آیت اوپر گذر چکی ہے کہ

﴿ مَايَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ط وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴾ (نساء۔۲۱)

خدا کو تمہارے عذاب سے کیا کام، اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ خدا تمہاری شکر گذاری کو قبول کرنے والا (اور تمہارے دلوں کے حال کو) جاننے والا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ گنہگار کو جو عذاب ملے گا اس میں اللہ کو کوئی خوشی نہیں حاصل ہوتی نہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے گنہگار بندے اس عذاب میں مبتلا ہوں لیکن ازل سے اس نے اپنے جو قانون مقرر کر دیئے ہیں وہ ان کو توڑتا بھی نہیں جس وقت آدمؑ کو جنت کی سرزمین سے نکال کر اس دنیا میں اس لئے بھیجا گیا کہ وہ اپنے عمل کے استحقاق سے اس جنت کو دوبارہ ہمیشہ کے لئے حاصل کریں اسی وقت یہ قانون بھی ان کو سنا دیا گیا تھا۔

﴿ اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ o وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۴)

یہاں سے تم سب اُترو تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت اترے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے، اور جنہوں نے ناشکری کی اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو وہی دوزخ والے ہوں گے۔

اس آیت میں مستحق دوزخ ہونے کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک کفران اور دوسری تکذیب۔ دیکھو کہ اوپر کی نساء والی آیت میں عذاب دوزخ سے نجات پانے کی دو شرطیں شکر اور ایمان ان کے بالمقابل ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ شکر اور ایمان استحقاق جنت کی شرطیں اور کفران اور تکذیب استحقاق دوزخ کے اسباب ہیں بقیہ تمام نیکیاں شکر اور ایمان کے فروع اور تمام برائیاں کفران اور تکذیب کی شاخیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس لئے نہیں بنایا کہ وہ ان کو پیدا کر کے دوزخ کا ایندھن بنائے بلکہ اس نے تو ان کو اپنی رحمت کے ظہور کے لئے پیدا کیا غیظ و غضب کے اظہار کے لئے نہیں، فرمایا:

﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ط وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ (احزاب۔۹)

ہم نے یہ امانت آسمانوں پر زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی، تو ان سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا، کہ وہ ظالم اور نادان تھا، تا کہ اللہ نفاق کرنے والوں اور نفاق کرنے والیوں اور شرک کرنے والوں اور شرک کرنے والیوں کو سزا دے اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر وہ اپنی رحمت کے ساتھ رجوع ہو اور اللہ تو بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔

اس آیت پاک سے ہویدا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اصلی صفت یہی ہے کہ وہ غفور و رحیم ہے یعنی بخشش و رحمت اس کی صفتِ ذاتی ہے، اب اگر کوئی اپنے آپ پر ظلم کر کے گناہ کرتا ہے اور اس لئے وہ اپنے کو رحمت الٰہی سے دور کر لیتا ہے تو یہ خود انسان کا فعل ہے۔

﴿ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾ (توبہ۔۹)

اللہ نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا، لیکن وہ اپنی جانوں پر آپ ظلم کرتے ہیں۔

﴿ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴾ (مومن۔۴)

اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔

غرض جو کچھ ہے وہ اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔

﴿ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ﴾ (طہ۔۱)

کہ ہر جان کو اپنے ہی کیے کا بدلہ دیا جائے گا۔

اس لئے بہشت ہو یا دوزخ، جو کچھ ہے انسان کے اپنے ہی عمل کا لازمی نتیجہ ہے، جس طرح دنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے مثلاً کھانے کا نتیجہ شکم سیری، پینے کا نتیجہ سیرابی، بھوک کا نتیجہ تکلیف، بیماری کا نتیجہ بے آرامی، گرنے کا نتیجہ چوٹ، زہر کا نتیجہ موت، شہد کا نتیجہ مٹھاس، غرض ہر اچھے یا برے فعل کا ایک لازمی جسمانی نتیجہ ہے جو دنیا میں ہمارے عمل کے بعد ہم کو ملتا رہتا ہے اسی طرح ہم کو اپنے اعمال کا ایک اور روحانی نتیجہ بھی لازمی ملنے والا ہے جو ہم کو اس دوسرے عالم میں ملے گا، تو جس طرح زہر کھا کر مرنے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر کیوں مر گئے یا گرنے سے ہم کو چوٹ کیوں آئی، اسی طرح ہم یہ سوال بھی نہیں کر سکتے کہ ہم کو ان اعمال کے بعد دوزخ کی سزا کیوں ملی کہ دونوں یکساں ہمارے اعمال کے لازمی نتیجے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی غایت رحمت سے ہم کو اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع فرما دیا تھا۔ ہم کو اس نے نیک و بد کی تمیز کا احساس بخشا، عقل عنایت کی، ضمیر عطا کیا، پھر نبی اور رسول بھیجے، شریعت دی، کتاب مرحمت فرمائی، اس پر بھی اگر

ہم باز نہ آئے اور ان اعمال کا ارتکاب کیا تو اب ہم کو ان اعمال کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے۔

﴿ رُسُلاً مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ﴾ (نسا۔۲۳)

یہ رسول بھیجے، نیکوں کو خوشخبری سنانے والے اور بدکاروں کو ہشیار کرنے والے تاکہ خدا پر انسان کی حجت باقی نہ رہے۔

پھر اپنی رحمت سے سب سے آخر میں اپنی رحمت کے کامل مظہر کو دنیا میں بھیجا۔

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴾ (انبیاء۔۷)

ہم نے تجھ کو (اے پیغمبر) ساری دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا۔

لیکن ظالم و نادان انسانوں نے اس رحمت کے قبول کرنے سے انکار کیا اور طرح طرح کی بداعتقادیوں اور بد اعمالیوں سے اپنے کو برباد کیا اور جس غرض سے خدا نے ان کو پیدا کیا تھا اس سے اعراض کیا اور اپنے کو خود اپنے ہاتھوں سے ہلاکت و بربادی میں مبتلا کیا۔

﴿ وَمَا کَانَ رَبُّكَ لِیُهْلِكَ الْقُرٰی بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ، وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ ، اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ﴾ (ہود۔۱۱۷۔۱۱۹)

اور نہ تھا تیرا رب جو آبادیوں کو ظلم سے ہلاک و برباد کرتا اور درآنحالیکہ ان کے رہنے والے نیکوکار ہوتے، اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو (زبردستی) ایک راہ پر کر دیتا (لیکن وہ ایسی زبردستی نہیں کرتا) اور وہ یوں ہی ہمیشہ اختلافات میں رہتے ہیں، مگر جن پر تیرے رب کا رحم ہو اور اسی واسطے ان کو پیدا کیا تھا۔

اس آیت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو رحمت کی خاطر بنایا ہے عذاب کے لئے نہیں، لیکن وہ خود انسان ہے جو اپنے عمل سے خدا کی رحمت کے بجائے اس کے عذاب کا اپنے کو سزاوار ٹھہرا لیتا ہے، اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔

﴿ لِلرَّحْمَةِ خَلَقَهُمْ وَلَمْ یَخْلُقْهُمْ لِلْعَذَابِ ﴾ (طبری ج ۱۲ ص ۸۱ مصر)

خدا نے انسانوں کو رحمت کے لئے پیدا کیا، عذاب کے لئے نہیں۔

لیکن اگر ظالم و نادان انسان نے خدا کی ان پے در پے رحمتوں کے باوجود اپنے کو اس کی رحمت کا مستحق نہ بنایا تو کیا وہ خدائے رحمان و رحیم جس کا یہ اعلان ہے

﴿ کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾ (انعام۔۲)

اس (خدا) نے (مخلوقات پر) رحمت کو اپنے اوپر واجب کر لیا۔

﴿ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾ (انعام۔۶)

تم پر سلامتی ہو، تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر فرض ٹھہرا لیا ہے۔

﴿ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ﴾ (اعراف۔۱۹)

اور میری رحمت نے ہر چیز کو سما لیا ہے۔

﴿ وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُوا الرَّحْمَةِ ﴾ (کہف۔۸)

اور تیرا پروردگار بخشنے والا رحمت والا ہے۔

﴿ وَرَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ ﴾ (صحیح بخاری)

اور میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی۔

وہ اپنے گنہگار و سیہ کار بندوں سے ہمیشہ کے لئے اپنا منہ موڑ لے گا؟ حالانکہ اس کی رحمت کسی غرض سے نہیں بلکہ بے غرض ہے‘ فرمایا

﴿ وَرَبُّكَ الْغَنِیُّ ذُوا الرَّحْمَةِ ﴾ (انعام۔۱۶)

اور تیرا رب بے نیاز رحمت والا ہے۔

اور تسلی دی ہے۔

﴿ يٰعِبَادِیَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴾ (زمر۔۶)

اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا ہے‘ خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو‘ خدا سب گناہوں کو معاف کرتا ہے‘ بے شک وہی بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔

اس کی رحمت کا ظہور جس طرح اس دنیا میں ہوا ہے‘ اس دنیا میں بھی ہوگا‘ اور وہاں اس کی رحمت کا سب سے بڑا مظہر اس کے مقام لعنت (دوزخ) سے دوری اور اس کے مقام رحمت (بہشت) سے قرب ہے‘ فرمایا۔

﴿ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴾ (انعام۔۲)

جس سے خدا کا عذاب ہٹایا گیا تو وہ وہی ہے جس پر اس نے اپنی رحمت کی‘ اور اس کی رحمت کا یہ حصول ہی کھلی کامیابی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ان پے در پے رحمتوں کا تقاضا ہے کہ وہ گنہگاروں کو زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان کے نتائج عمل کے بھگت لینے کے بعد بالآخر اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے، اور ان کو اپنی بخششوں سے سرفراز فرمائے۔

دوزخ قیدخانہ نہیں، شفاخانہ ہے:

انسان جب عدم حفظ صحت کی غلط کاریوں کے سبب سے بیمار ہو جاتا ہے تو اکثر یہی سمجھا جاتا ہے کہ فطرت نے اس کو ان کے معاوضہ میں بیماری کی تکالیف کی سزائیں دی ہیں‘ مگر واقعہ یہ نہیں ہے‘ واقعہ یہ ہے کہ ان غلط کاریوں کے جو نتائج بد انسان کے جسم کے اندر پیدا ہو گئے ہیں ان کو دور کرنے کے لئے جسم انسانی جدوجہد کرتا ہے اور اس کی اس لڑائی کا نام بیماری ہے اور اس لڑائی کی کشمکش کا نام بیماری کی تکالیف و آلام ہے جن کو ہم دردسر‘ دردشکم‘ اعضاشکنی‘ بےخوابی وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں‘ یہی روحانی بیماریوں کا حال ہے جن کو ہم اصطلاح میں ’’گناہ‘‘ کہتے ہیں اور ان کے نتائج بد کا نام اصطلاح شرعی میں گناہ اور جن کے نتائج بد کو عذاب کہتے ہیں‘ اور یہ نتائج جو آتش دوزخ اور اس کے شدائد و آلام کی صورت میں ظاہر ہوں گے اور جن کا منشا یہ ہوگا کہ روح انسانی اپنی غلط کاریوں کے نتائج بد کو دور کرنے کے لئے جدوجہد

میں مصروف ہوگی، اور جونہی وہ ان سے عہدہ برآ ہوگی، خدا کی رحمت سے سرفرازی پا کر اس عذاب سے نکل کر اپنی موروثی بہشت میں داخل ہوگی۔

اس تمہید سے یہ ظاہر ہے کہ دوزخ کی مثال یہ نہیں ہے کہ وہ مجرموں کے لئے قید خانہ ہے‘ بلکہ یہ ہے کہ وہ بیماروں کے لئے شفا خانہ ہے‘ بیمار کو شفا خانہ کے اندر بھی ہر قسم کی تکلیفیں محسوس ہوتی ہیں درد‘ اعضا شکنی‘ شدت تشنگی، سوزش جسم‘ اس کو وہاں کڑوی سے کڑوی دوا پلائی جاتی ہے، بدمزہ سے بدمزہ کھانا کھلایا جاتا ہے‘ ضرورت ہوتی ہے تو اس کو نشتر دیا جاتا ہے‘ اس کا کوئی عضو کاٹا جاتا ہے، کوئی داغا جاتا ہے‘ اور ان سب کی تکلیفیں اس کو اٹھانی پڑتی ہیں مگر یہ ساری ایذا رسانی کسی انتقام اور تکلیف دہی کی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے عدم صحت کی غلط کاریوں کے نتائج بد سے اس کے جسم کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کی جاتی ہے اور جو تکلیفیں اس کو وہاں محسوس ہوتی ہیں وہ گو شفا خانہ کے اندر ہی محسوس ہوتی ہیں مگر ان کا سبب شفا خانہ نہیں‘ بلکہ خود اس بیمار کا اصول صحت سے دانستہ یا نادانستہ انحراف کرنا اور اس کی وجہ سے ان بیماریوں میں مبتلا ہونا ہے۔

یہ اصول ان آیات اور ان احادیث صحیحہ سے پوری طرح سمجھ میں آتا ہے جن میں بالآخر عذاب دوزخ سے نجات پانے کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ دنیاوی آلام و تکالیف کی نسبت قرآن نے یہ اصول پیش کیا ہے۔

﴿ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِيْنَ ﴾ (آل عمران۔۱۴)

اور تاکہ خدا ایمان والوں کو پاک و خالص کرے اور کافروں کو مٹائے۔

یہی اصول عذاب اخروی پر صادق آتا ہے کہ اس سے بھی مقصود گنہگار اہل ایمان کی پاکی و صفائی ہے‘ چنانچہ حدیث صحیح میں ہے کہ حقوق عباد کے بعد ﴿حَتّٰى اِذَا هُذِّبُوْا وَنُقُّوْا اُذِنَ لَهُمْ فِيْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ﴾ (صحیح بخاری باب القصاص یوم القیامۃ ص ۹۶۷) یہاں تک کہ جب گنہگار چھٹ جائیں گے اور پاک و صاف ہو جائیں گے تب ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملے گی۔

اس حدیث میں یہ دو لفظ ﴿هُذِّبُوْا وَنُقُّوْا﴾ ذرا تشریح طلب ہیں ﴿هُذِّبُوْا﴾ کا مصدر تہذیب ہے‘ تہذیب کے لغوی معنی یہ ہیں کہ درختوں کی خراب شاخیں اس لئے چھانٹ دی جائیں تاکہ درخت میں سرسبزی و شادابی پیدا ہو کر ترقی کی نئی زندگی اس کو مل جائے اور ﴿ نُقُّوْا ﴾ کا مصدر تنقیہ ہے تنقیہ کے اصلی معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے اندر سے خراب و فاسد مادہ کو الگ کر دیا جائے تاکہ وہ پوری طرح نکھر جائے۔ اس تشریح سے صاف کھل گیا کہ گنہگاروں کو جنت کے داخلہ کے لئے کیا درکار ہے؟ اسی لئے قرآن پاک میں ہے کہ اہل جنت جب جنت کے قریب پہنچیں گے تو ندا آئے گی۔

﴿ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ﴾ (زمر۔۸)

تم پاک و صاف ہو چکے تو جنت میں ہمیشہ کے لئے آ جاؤ۔

الغرض جب اس طیب و پاکیزگی کا دور آئے گا تو گنہگاروں کو بھی نجات ملے گی‘ اسی لئے ہر گنہگار کے لئے دوزخ سے نکلنے کی مدت خواہ کتنی ہی طویل ہو مگر بہرحال اس کی انتہا ہے‘ فرمایا۔

﴿ لٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ﴾ (نبا)

دوزخ میں وہ صدہا سال تک پڑے رہیں گے۔

لیکن بالآخران صدہا سال کا بھی ایک دن خاتمہ ہوگا اور خدا نے چاہا تو ان کو نجات ملے گی۔

حدیث رویائے برزخ میں ہے کہ ”آپ ﷺ نے دوزخ میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جنہوں نے کچھ اچھے اور کچھ برے کام کئے تھے' ان کا آدھا دھڑ تو نہایت خوبصورت اور آدھا سخت بدصورت تھا' جب ان کی سزا کی مدت ختم ہوئی تو فرشتوں نے ان سے کہا کہ جاؤ اور اس نہر میں جا کر پڑ جاؤ' سامنے وہ نہر تھی جس میں خالص سفید پانی بہہ رہا تھا وہ اس میں جا کر پڑ گئے' پھر نکل آئے تو ان کی بدصورتی جاتی رہی اور نہایت خوبصورت ہو گئے (صحیح بخاری کتاب التعبیر) اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت کیونکر گنہگاروں کو سرفراز فرمائے گی۔

کیا دوزخ بھی ایک نعمت ہے؟

اس تفصیل کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ قیامت اور دوزخ کی ہولناکیاں اور سزائیں بھی گنہگاروں کے لئے اللہ تعالیٰ کی اسی طرح نعمت ہیں جس طرح اس دنیا میں شفا خانوں کا وجود بیماروں کے لئے نعمت ہے' اگر دوزخ نہ ہوتی تو گنہگاروں کی پاکیزگی اور پاکوں کی جنت میں ان کے داخل ہونے کی کوئی صورت نہ تھی، اس رحمان ورحیم کی رحمت وکرم نے گوارا نہ کیا کہ ان بدبختوں کو ان کی نافرمانیوں کے باوجود ہمیشہ کے لئے محروم رکھا جائے اس لئے ان کی صفائی کے لئے پہلے برزخ کا حمام مقرر کیا' اور جو اس سے بھی پاک نہ ہو سکیں ان کے لئے دوزخ کی آگ مقرر کی کہ وہ اپنی ہر قسم کی بداعمالیوں کے میل کچیل کو جلا کر نکھر کر پاک ہو جائیں اور کندن بن کر بالآخر اپنی آبائی اور فطری وراثت (جنت) پائیں اس نظریہ کو پیش نظر رکھ کر قرآن پاک کی ان آیتوں کو پڑھیے جن میں قیامت اور دوزخ کی ہولناکیوں اور مصیبتوں کو بھی نعمت سے تعبیر کیا گیا ہے' فرمایا:

﴿ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴾ (رحمان۔۳۵۔۴۵)

تم پر آگ کے صاف اور دھواں ملے شعلے چھوٹیں گے' پھر کوئی تمہاری مدد نہ کر سکے گا' تو تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے' پھر جب آسمان پھٹ کر تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا' تو تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے' پھر اس دن کسی انس وجن سے اس کے گناہ کی نسبت نہ پوچھا جائے گا' تو تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے گنہگار اپنی نشانیوں سے پہچان لئے جائیں گے' پھر وہ اپنی پیشانیوں کے بال اور پاؤں سے پکڑے جائیں گے تو تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ یہ وہ دوزخ ہے جس کو گنہگار جھٹلاتے ہیں وہ اس دوزخ اور گرم پانی کے بیچ میں گشت کریں گے تو تم اپنے پروردگار کی کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔

ان آیتوں کی تفسیر کسی بھی پہلو سے کیجئے یہ بات بہرحال ماننی پڑے گی کہ قیامت اور دوزخ کے ہولناک احوال مجرموں۔ کے حق میں نعمت ہیں اس لئے بھی کہ دنیا میں وہ ان کے ڈر سے برائیوں کو چھوڑ کر راہ راست پر آتے ہیں اور اس

لئے بھی کہ آخرت میں وہ انہیں کے ذریعہ سے اپنے گناہوں کے نتائج بد سے بری ہو کر بہشت ربانی کے لائق بن سکیں گے۔

دوزخ میں رحمت الٰہی کا ظہور اور نجات:

انسان اور وہ بھی اللہ کی توحید کا اور رسول کی صداقت کا معترف خواہ کسی قدر گمراہ اور گنہگار ہو، تاہم اس کے نامہ اعمال میں کچھ نہ کچھ نیکیاں ضرور ہوں گی' قیامت گو اللہ تعالیٰ کے عتاب وجلال کا روز ہوگا' جس میں ہر گنہگار کو اپنی گنہگاری کا ملزم ہونا پڑے گا مگر بالآخر اس رحمان ورحیم کی شان رحیمی کا ظہور ہوگا اور "رحمتی سبقت غضبی" (اور میرے غصہ سے میری رحمت سبقت لے گئی ہے) کے اعلان کے مصداق شفاعت کی صورت میں جلوہ گر ہوگا اور گنہگاروں کو اس کی بدولت گناہوں کے داغ سے پاک وصاف کر کے پاکوں کو بہشت میں داخلہ کی اجازت ملے گی' فرمایا:

﴿ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ (تغابن۔۹)

اور جو اللہ پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے، اس سے اس کی برائیاں جھاڑ دے گا' اور اس کو جنت میں داخل کرے گا۔

﴿ وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ط عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ط اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (توبہ۔۱۳)

اور دوسرے لوگ جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا' اور ملایا ایک کام نیک اور دوسرا بد' شاید اللہ ان کو معاف کرے' بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم والا ہے۔

اس معافی کی دو صورتیں ہیں' ایک تو یہ کہ وہ بالکلیہ یعنی عذاب کے بغیر ہی معاف کر دے، دوسری یہ کہ وہ دوزخ میں کچھ دن جا کر خدا کی معافی سے سرفراز ہو کر اس سے نکلیں' فرمایا:

﴿ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝ ثُمَّ نُنَجِّى الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴾

اور تم میں کوئی نہیں جو جہنم میں وارد نہ ہو، تیرے رب کا یہ ضروری فیصلہ ہے' پھر ہم ان کو جو خدا سے ڈرے نجات دیں گے اور مشرکوں اور کافروں کو ہم اس میں گھٹنے کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔

احادیث صحیحہ میں اس کے متعلق آنحضرت ﷺ کی حسب ذیل تصریحات مذکور ہیں۔

۱۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "شفاعت کے ذریعہ لوگ دوزخ سے چھوٹی ککڑیوں کے مانند نکلیں گے" (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۲۔ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "دوزخ سے کچھ لوگ اس کی جھلس کھا کر نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے"۔ (ایضا)

۳۔ حضرت ابوسعیدؓ خدری سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو خدا فرمائے گا جس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو تو وہ کوئلے ہو کر نکلیں گے، پھر وہ نہر حیات میں ڈال دیئے جائیں گے' تو وہ اس طرح اگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے"۔ (صحیح بخاری کتاب الشفاعۃ)

۴۔ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے قیامت کے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا ''پھر میں سجدہ میں گر پڑوں گا اور پڑا رہوں گا، تو آواز آئے گی اے محمد! سر اٹھا! مانگ' دیا جائے گا، تو میں سر اٹھاؤں گا، اور اس حمد سے جو خدا مجھے سکھائے گا' اس کی حمد کروں گا اور سفارش کروں گا' تو خدا ایک حد مقرر فرمائے گا تو میں ان کو دوزخ سے نکالوں گا، اور جنت میں داخل کروں گا' پھر لوٹ کر آؤں گا اور سجدہ میں گر پڑوں گا، پھر وہ کچھ لوگوں کو بخش دے گا اسی طرح تیسری پھر چوتھی بار کروں گا' یہاں تک کہ دوزخ میں پھر وہی رہ جائے گا جس کو قرآن نے روک رکھا ہے''۔

۵۔ حضرت عمرانؓ بن حصین سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''محمد کی شفاعت سے کچھ ایسے لوگ دوزخ سے نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے جن کا نام جہنم والے ہوگا'' (ایضاً)

۶۔ حضرت ابوہریرہؓ کے سوال پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میری سفارش سے سرفراز ہونے کی خوش قسمتی اس کو حاصل ہوگی جس نے خلوص قلب سے اللہ کی توحید کا اقرار کیا ہو''۔ (ایضاً)

۷۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ''جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فیصلہ سے فراغت پائے گا اور چاہے گا کہ ان کو جنہوں نے اس کی توحید کی گواہی دی تھی دوزخ سے نکالے، تو فرشتوں کو ان کے نکالنے کا حکم دے گا' فرشتے ان توحید والوں کو اس علامت سے پہچانیں گے کہ ان کی پیشانیوں میں سجدہ کے نشان ہوں گے، کہ خدا نے آدم کے بیٹے کی پیشانی کے نشان سجدہ کو دوزخ کی آگ پر حرام کر دیا ہے' تو وہ ان کو جلا نہ سکے گی' فرشتے جب ان کو نکالیں گے تو وہ جلے جھلسے ہوں گے پھر ان پر آبِ حیات چھڑکا جائے گا تو وہ اس طرح اگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے۔

۸۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جنت والے جنت اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ دیکھو جس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو تو وہ جل کر کوئلہ ہو کر نکلیں گے پھر وہ نہر حیات میں ڈال دیئے جائیں گے تو اس طرح وہ اگیں گے جس طرح سیل آب کے کنارے جنگلی دانہ اگتا ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الایمان)

۹۔ حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ اہل دوزخ جو دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے وہ اس میں نہ مریں گے اور نہ جئیں گے' لیکن وہ لوگ جن کو دوزخ کی آگ بعض گناہوں کی وجہ سے چھوئے گی' تو وہ اس میں کچھ دیر کے لئے مر جائیں گے' یہاں تک کہ وہ جل جائیں گے' پھر ان کے حق میں شفاعت کی اجازت ہوگی تو وہ تھوڑے تھوڑے کر کے آئیں گے اور جنت کی نہروں میں پھیل جائیں گے اور اہل جنت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی بہاؤ تو وہ اس طرح اگیں گے جیسے سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانے'' (ایضاً)

۱۰۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''سب سے آخر میں جو شخص جنت سے نجات پا کر نکلے گا وہ گھسٹتا ہوا نکلے گا اور اس کو جنت بھری معلوم ہوگی''۔ (ایضاً)

۱۱۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے صحیحین میں روایت ہے کہ ''خدا فرمائے گا کہ ملائکہ نے سفارش کی اور پیغمبروں نے سفارش کی اور اہل ایمان نے سفارش کی اور اب صرف وہ رہ گیا جو تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے' یعنی خود وہ رحمان و رحیم تو وہ دوزخ سے مٹھی بھر کر ان لوگوں کو نکالے گا جنہوں نے کبھی کوئی بھلائی نہیں کی''۔ (صحیحین)

۱۲۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ "حکم ہوگا کہ جس نے ﴿لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ کہا ہو اور اس کے دل میں جو برابر بھی نیکی رہی ہو، اس کو دوزخ سے باہر کرو، جس نے ﴿لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ کہا ہو اور گیہوں کے دانہ کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو اور جس نے ﴿لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ کہا ہو اور جوار کے دانہ کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو اس کو دوزخ سے الگ کرو۔ (ترمذی صفۃ النار، حدیث حسن صحیح)

احادیث کی کتابوں میں ان معنوں کی اور بہت سی حدیثیں ہیں جن کا استقصا یہاں مقصود نہیں، ان تمام حدیثوں میں قرآن پاک کی اس اہم آیت کا جلوہ موجود ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ (نساء۔۱۸)

بے شک اللہ اس کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا جو گناہ ہے وہ اس کو جس کے لئے چاہے گا معاف کر دے گا۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ شرک کے علاوہ ہر گناہ کے نتیجہ سے براءت کی جا سکتی ہے مگر شرک وہ بیماری ہے جس کے نتائج سے عہدہ برآمد ہونا ممکن نہیں اس لئے اس کے نتائج بد بھگتے بغیر نجات کا تصور بھی خدا کے قانون ابدی کے خلاف ہے۔

شرک و کفر کی بخشائش نہیں:

احکام الٰہی اور شریعت ربانی کی کھلی ہوئی دو قسمیں ہیں۔ ایک کا تعلق دل اور قلب سے ہے جو بمنزلہ اصل کے ہے، اس کو مذہب کی زبان میں ایمان، فلسفہ کی اصطلاح میں علم، اور تصوف کی بولی میں عرفان کہتے ہیں، اور دوسری قسم وہ ہے جو اس عقیدۂ اول کی فرع اور نتیجہ ہے اور جس کا تعلق اعضاء اور جوارح سے ہے، اس کو ہم مختصراً عمل اور تفصیلاً عبادات و معاملات اور اخلاق کہتے ہیں، شرک و کفر کے گناہ کا تعلق قسم اول سے، اور دوسرے گناہوں کا تعلق قسم دوم سے ہے، دلوں میں ایمان و عمل و عرفان کی اگر ایک کرن بھی ہو تو اس ظلمت کدہ میں روشنی کی امید کس طرح کی جا سکتی ہے، مگر جس کاشانہ دل میں اس نور کا ایک ذرہ بھی نہ ہو اس کی روشنی سے ہمیشہ کے لئے ناامیدی ہے، اسی لئے ایمان کے بغیر اعمال بھی کالعدم ہو جاتے ہیں اور جہاں ایمان کچھ بھی موجود ہے اعمال خیر کا کچھ نہ کچھ وجود ضروری ہے، البتہ اعمال شر کا بھی ساتھ ساتھ وجود ہے جن کی دوزخ کے عذاب اور رحمت الٰہی سے تلافی ہو کر نجات مل سکتی ہے۔ ایمان و علم و عرفان جس کی حقیقت ایمان بالغیب ہے، اس کا حصول موت کے بعد جب حقائق خود بخود ہمارے سامنے آتے جاتے ہیں، ہماری وسعت کا نتیجہ بلکہ خود ان حقائق کے ظہور کا نتیجہ ہوگا اس بناء پر شرک و کفر کے گناہ کی مغفرت کی امید قانون الٰہی میں ناممکن ہے، البتہ عمل کی کمی کی تلافی جو دوسری قسم کا گناہ ہے، خدا کی رحمت سے بعید نہیں ہے۔

سمجھنے کے لئے ان دونوں کی کھلی ہوئی مثال یہ ہے کہ دنیا میں تعلیمی امتحان کے لئے ۳۳ نمبر کم از کم فرض کیا گیا ہے۔ اب اگر کسی کا پرچہ بالکل سادہ ہے، اور اس لئے اس کا نمبر صفر محض ہے تو رحم دل سے رحم دل ممتحن کے لئے بھی یہ ناممکن ہے کہ اس کو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی کامیاب کر سکے، لیکن جس نے کچھ جوابات لکھے ہیں اور کچھ چھوڑ دیئے ہیں اور کچھ غلط لکھے ہیں تو اگر وہ ۲۹، ۳۰ کے قریب بھی پہنچ گیا ہے تو رحم دل ممتحن ۳۳ تک اس کو پہنچا کر ادنیٰ درجہ میں کامیاب

بنا سکتا ہے۔

الغرض ایمان وعلم وعرفان کے مجرم جن کا نام مشرک وکافر ہے' اپنے ناقابل تلافی نتیجہ کے بھگتنے بغیر عذاب دوزخ سے رہائی کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کی دنیاوی زندگی کا عرفانی فقدان رحمتِ الٰہی کو اپنی طرف جذب کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا' مگر کیا شرک وکفر کے گنہگاروں کے لئے شرک وکفر کے دورۂ عذاب کے طے کر لینے کے بعد بھی رہائی کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب آئندہ سطروں میں ملے گا۔

کیا دوزخ کی انتہا ہے؟

دوزخ جو عتابِ الٰہی کا گھر ہے' کیا ہمیشہ آباد رہے گا؟ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عمومی کے قائلوں کے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے [۱] ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ مدتِ دراز کے بعد ایک دن آئے گا جب جہنم کی آگ رحمت الٰہی کے چھینٹوں سے بالآخر سرد ہو جائے گی' حدیث صحیح میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''جنت میری رحمت اور دوزخ میرا عذاب ہے'' [۲] اسی کے ساتھ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کا فیصلہ کیا اسی وقت اس نے اپنے

---

[۱] ابتدائی اسلامی فرقوں میں جہنم کی ابدیت اور غیر ابدیت پر بہت سے مناظرے ہو چکے ہیں جن کی تفصیل ملل ونحل کی کتابوں میں موجود ہے' ایک دو کو چھوڑ کر اس پر تو بے شبہ قطعیت کے ساتھ سب کا اتفاق ہے کہ جنت کا وجود دائمی اور ابدی ہے' لیکن جہنم کے دوام اور ابدیت میں کسی قدر اختلاف ہے' عام اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ جہنم اور جنت دونوں کا وجود دائمی اور ابدی ہے، گنہگار مومن اپنے گناہ کے بقدر عذاب اٹھا کر یا خدا کی رحمت سے معاف ہو کر بالآخر جنت میں داخل کئے جائیں گے لیکن مشرک وکافر کے گناہ کبھی معاف نہ ہوں گے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں جلیں گے، فقہا اور محدثین کا ایک گروہ جو مرجیہ کہلاتا ہے اس بات کا قائل ہے کہ جو مومن ہوگا وہ گنہگار بھی ہوگا تو بھی دوزخ میں نہ جائے گا بلکہ معافی سے سرفراز ہو کر شروع ہی سے جنت میں داخل ہوگا اس کے برخلاف خوارج اور معتزلہ کا یہ عقیدہ ہے کہ مومن بھی اگر گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا، تو وہ بھی کفار کی طرح ہمیشہ دوزخ میں ہی رہے گا۔ اور بھی اس بارہ میں لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔ ع شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا۔

اہل سنت کے ایک مختصر گروہ کا جس میں صحابہ کرامؓ اور تابعین کے نام بھی ہیں اور متاخرین میں جن کے پرجوش حامی حافظ ابن قیم ہیں، نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ جب گنہگار اپنے اپنے گناہوں کے بقدر عذاب پا چکیں گے تو جہنم فنا کر دی جائے گی، حافظ ابن قیم نے اپنی دو کتابوں شفاء العلیل اور حاوی الارواح میں (دونوں مطبوعہ ہیں' حاوی الارواح اعلام الموقعین کے ساتھ چھپی ہے) قرآن، احادیث، آثار اور عقل کی پچیس دلیلوں سے اپنے مسلک کو مبرہن کیا ہے (دیکھو شفاء العلیل از ص ۲۵۲ تا ۲۶۴ حسینیہ مصر اور حاوی الارواح ابن قیم ج ۲ ازص ۱۶۷ا۲۳۵ مطبعۂ جدیدہ مصر) علامہ ابن تیمیہؒ نے بھی اس نظریہ کو لف اہل سنت کے ایک فریق کا خیال تسلیم کیا ہے (حاوی الارواح ابن قیم جلد دوم ص ۱۶۷) ایک زیدی یمنی عالم شیخ مقبل نے بھی اس کو قبول کیا ہے (العلم الشامخ فی بشار الحق علی الاباء والمشائخ ص ۱۲۲) صوفیہ میں شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کے متبعین یہ فرماتے ہیں کہ کافر ومشرک جن پر خلود نار کا حکم ہے وہ بالآخر دوزخ میں رہتے رہتے ایسے ہو جائیں گے کہ ان کو اسی دوزخ میں راحت اور لذت معلوم ہونے لگے گی جیسے بعض کیڑے غلاظتوں ہی کو پسند کرتے ہیں اور انہیں میں لطف اٹھاتے ہیں' میں نے اس باب کو بہت ڈرتے ڈرتے لکھا ہے کہ اس میں اجمال الٰہی کی تصریح کا جرم عائد ہوتا ہے۔ اگر یہ اختیار کردہ پہلو حق نہ ہو تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے اور توبہ کی توفیق بخشے اور اپنی مراد کا دروازہ مجھ پر کھولے۔

[۲] صحیح بخاری باب رحمۃ اللہ جلد دوم ص ۱۱۱۰ و صحیح مسلم۔

عرش کے اوپر یہ لکھ دیا کہ ﴿ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ ﴾[ل] ”میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی ہے۔“

اب اگر دوزخ جو اس کے غضب کا مظہر ہے، اس کی جنت ہی کی طرح دائمی و ابدی ہو تو اس کا غضب اس کی رحمت پر سبقت لے جاتا ہے یا برابر ہو جاتا ہے اور اس کا تخیل بھی اس رحمان و رحیم کی نسبت نہیں ہو سکتا، اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصوں میں سے صرف ایک حصہ دنیا میں اتارا اور ننانوے حصے قیامت کے دن کے لئے رکھے ہیں (صحیح مسلم باب سعة رحمة الله) اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ ایک دن آئے گا جب اس کے غضب پر اس کی رحمت غالب آ جائے گی اور اس کی رحمت کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور یہ وہ دن ہوگا جب گنہگار اپنے گناہوں کی ناپاکیوں اور نجاستوں سے اپنے اپنے مقررہ وقت پر پاک ہو کر اس کی رحمت کی سرفرازی کے قابل بن جائیں گے۔

اسلام کی رو سے سب سے بڑے مجرم مشرک و کافر ہیں اور جو اس وقت تک نجات نہ پا سکیں گے جب تک دوزخ کے تنور میں ایک گرم کوئلہ بھی باقی ہے، تاہم ان کے عذاب کی مدت کی نسبت قرآن میں حسب ذیل تین تصریحات ہیں

﴿ لٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا ﴾ (نبا۔۱)

وہ دوزخ میں صدہا ہزارہا سال ٹھہریں گے۔

صدہا ہزارہا سال کی مدت کسی قدر بڑی ہو پھر بھی ایک دن اس کا خاتمہ ہے، دوسری آیت جو صریحاً کفار و مشرکین کے حق میں ہے، یہ ہے:

﴿ اَلنَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ ﴾ (انعام۔۱۵)

دوزخ ہے تمہارا ٹھکانا، اس میں تم سدا رہنے والے ہو، لیکن یہ کہ اللہ جو چاہے، بے شک تیرا رب حکیم و علیم ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ شرک و کفر کی سزا تو اصل میں قانوناً یہی ہے کہ دوزخ میں دائمی سزا دی جاتی رہے مگر اس کی رحمت کا اقتضا کچھ اور ہے، لیکن وہ حکیم و علیم ہے، اس لئے وہ اپنا ہر کام اپنی حکمت و مصلحت اور علم کے مطابق کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس کے حق میں کیا کرنا چاہئے اور کب کرنا چاہئے۔

تیسری آیت میں ہے۔

﴿ خَالِدِیْنَ فِیْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّامَاشَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ﴾ (هود۔۹)

وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، جب تک آسمان و زمین قائم ہیں، لیکن یہ کہ جو تیرا رب چاہے، بے شک تیرا رب جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔

دوسری اور تیسری دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں اپنی مشیت کو عذاب کی انتہا بتایا ہے اور اپنے کو ”رب“ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس سے اشارہ نکلتا ہے کے اس کی مشیت سے بالآخر اس عذاب کا ختم ہونا اس کی ربوبیت کا اقتضاء ہے، قرآن پاک میں کوئی ایسی صاف و صریح آیت موجود نہیں ہے جس سے دوزخ کی بقائے دوام، عدم انتہاء اور تسلسل وجود پر بتصریح استدلال کیا جا سکے، حالانکہ اس کے برخلاف بہشت کی ہمیشگی و بقا اور عدم انقطاع و عدم فنا کی

[ل] صحیح بخاری باب ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین جلد دوم صفحہ ۱۱۱۰ و صحیح مسلم باب سعة رحمة الله۔

بیسیوں آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں، چنانچہ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس اوپر والی آیت کو ہم تمام وکمال یہاں نقل کرتے ہیں' فرمایا:

﴿ فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّشَهِیْقٌ o خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ ط اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ o وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّامَاشَآءَ رَبُّكَ ط عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ ﴾ (ہود۔۱)

تو لیکن جو بد بخت ہوئے وہ دوزخ میں ہوں گے' اس میں ان کو گدھوں کی طرح چلانا اور رینگنا ہے، جب تک آسمان اور زمین ہیں وہ اس دوزخ میں رہیں گے' مگر جو چاہے تیرا رب' بے شک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے اور لیکن وہ جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت میں ہوں گے' ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان وزمین قائم رہیں' مگر جو چاہے تیرا رب' یہ غیر منقطع بخشش ہوگی۔

دیکھو کہ اہل جنت اور اہل دوزخ دونوں کے لئے خلود و دوام فرمایا' پھر ان دونوں میں اس کے بعد اپنی مشیت سے استثنا فرمایا' مگر اہل دوزخ کے دوام کے ذکر میں فرمایا کہ "مگر جو چاہے تیرا رب، بے شک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے" اس سے معلوم ہوا کہ وہ چاہے تو دوزخ کے عذاب کو ختم کردے اور چاہے تو قائم رکھے' لیکن اہل جنت کے دوام کے ذکر میں بتصریح فرمایا "مگر جو چاہے تیرا رب یہ غیر منقطع بخشش ہوگی" اس سے معلوم ہوا کہ اہل جنت کے حق میں اس کی مشیت یہی ہوگی کہ وہ بے انقطاع اور غیر منتہی دوام وتسلسل کے ساتھ ہمیشہ قائم و باقی رہے۔ اس آیت کی تفسیر میں متعدد آئمہ سلف مثلاً ابن زید اور شعبی وغیرہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے بارہ میں تو اپنی مشیت ظاہر فرمادی کہ وہ مسلسل اور غیر منقطع ہے' لیکن اہل دوزخ کی نسبت اپنی مشیت کو کسی مصلحت سے مخفی رکھا ہے۔ [1]

ایک اور مقام پر خاص طور پر کفار و مشرکین کا نام لے کر اس طرح فرمایا گیا ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِیْنَ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ط اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِیَّةِ o اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ o جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ﴾ (بینہ)

بے شک اہل کتاب اور مشرکوں میں سے جنہوں نے کفر کیا' وہ جہنم کی آگ میں (خالد) پڑے رہیں' یہ بدترین لوگ ہیں' بے شک جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ بہترین لوگ ہیں' ان کی جزاء ان کے پروردگار کے نزدیک بسنے کے باغ ہیں' جن میں نہریں بہتی ہوں وہ اس میں ہمیشہ (خالد) رہیں گے۔

غور سے دیکھو کہ اس میں اہل دوزخ کے مقابلہ میں اہل جنت کے دوام میں کتنی تاکید پر تاکید ہے' پہلے عدن فرمایا' جس کے معنی "قیام" اور "بسنے" کے ہیں' پھر "خالدین" کہا کہ وہ اس میں رہا کریں گے' بعد ازیں "ابدا" فرمایا کہ وہ جنت میں ابدی طور سے قیام کریں گے۔

اسی طرح ایک اور سورہ میں ہے

﴿ وَیُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ط ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ o

---

[1] تفسیر طبری ودر منثور سیوطی تفسیر آیات ہود، رکوع ۹ وانعام رکوع ۱۵۔

وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا وَ بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴾ (تغابن، ۹۔۱۰)

اور اس کو ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے، اور وہی بڑی کامیابی ہے اور جنہوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں، وہ اس میں رہا کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔

دیکھو کہ تقابلاً دونوں میں خالدین (رہا کریں گے) اور ﴿خَالِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ﴾ (ہمیشہ رہا کریں گے) کا فرق کتنا نمایاں ہے، کہیں یہ کہا گیا ہے کہ کفار کے عذاب میں مدت کے تعین سے سرے سے خاموشی برتی گئی ہے اور جنت میں خلود کی تصریح فرمادی گئی ہے، مثلاً

﴿ یَوۡمَ تَبۡیَضُّ وُجُوۡہٌ وَّ تَسۡوَدُّ وُجُوۡہٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اسۡوَدَّتۡ وُجُوۡہُہُمۡ ۟ اَکَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ اِیۡمَانِکُمۡ فَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَکۡفُرُوۡنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِیۡنَ ابۡیَضَّتۡ وُجُوۡہُہُمۡ فَفِیۡ رَحۡمَۃِ اللّٰہِ ؕ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴾ (آل عمران)

جس دن کچھ منہ سفید ہوں گے اور کچھ سیاہ، تو جو سیاہ ہوئے تو کیا ایمان کے بعد کافر ہو گئے تھے، تو اپنے کفر کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو، اور جن کے منہ سفید ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور اس رحمت میں سدا رہیں گے۔

آیت بالا میں عذاب کے ذکر میں مدت کی تصریح سے سراسر خاموشی ہے اور رحمت کے ذکر میں خلود کی تصریح تام ہے۔

انہیں آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ اور بعض صحابہ کرامؓ سے روایتیں ہیں کہ ایک دن آئے گا جب دوزخ کے میدان میں ہُو کا عالم ہوگا اور کوئی ایک متنفس بھی وہاں نظر نہیں آئے گا، چنانچہ:

۱۔ طبرانی میں حضرت ابوامامہ صحابیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”جہنم پر ایک ایسا دن آئے گا جب وہ خزاں رسیدہ پتے کے مانند ہو جائے گا اور اس کے دروازے کھل جائیں گے“

۲۔ حضرت جابرؓ یا کسی اور صحابی سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ”جہنم پر ایک دن ایسا آئے گا جس میں اس کے دروازے کھل جائیں گے اور اس میں کوئی نہ ہوگا“

۳۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں جو کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہنم پر ایک دن آئے گا جب اس میں کوئی نہ ہوگا

۴۔ تفسیر عبد بن حمید میں حضرت عمرؓ سے روایت کی گئی ہے کہ ”انہوں نے فرمایا کہ اہل دوزخ ریگستانِ عالج کے ذرات کے شمار کے بقدر بھی دوزخ میں رہیں، پھر بھی ایک دن آئے گا جب وہ اس سے نکلیں گے“

۵۔ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ ”جہنم پر ایک دن آئے گا کہ جب اس کے خالی دروازے بھڑ بھڑائیں گے، اور اس میں کوئی نہ ہوگا اور یہ اس وقت ہوگا جب لوگ اس میں صدہا ہزار سال (احقاب) کی مدت پوری کرلیں گے“۔

۶۔ عبدالرزاق، ابن منذر، طبرانی اور بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات میں ہے کہ حضرت جابرؓ بن عبداللہ صحابی یا ابوسعید خدریؓ صحابی یا کسی اور صحابی نے یہ فرمایا کہ ”اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّکَ“ کا استثنا پورے قرآن پر حاوی ہے، یعنی جہاں جہاں

قرآن میں خَالِدِیْنَ فِیْهَا (سدا اس میں رہیں گے) وہاں یہ مشیت الٰہی کا استثناء قائم ہے۔

۷۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ دوزخ پر ایک زمانہ آئے گا جب اس کے خالی دروازے کھڑکھڑائیں گے۔[1]

دفعِ شبہ:

قرآن پاک میں ایسی بھی چند آیتیں ہیں جن سے لوگوں کو دوزخ کے دوام کا خیال ہوا ہے، مثلاً وہ تین آیتیں جن میں کفار کو "خالد ین فیھا ابداً" ہمیشہ کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔

۱۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكَافِرِيْنَ وَاَعَدَّلَهُمْ سَعِيْرًا ط خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴾ (احزاب۔۸)

بے شک خدا نے کافروں پر لعنت کی، اور ان کے لئے وہ آگ مہیا کی جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں۔

۲۔ ﴿ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴾ (جن۔۲)

اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، تو اس کے لئے جہنم کی وہ آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں۔

۳۔ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَلَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ٥ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴾ (نساء۔۱۶۹۔۱۶۸)

بے شک جنہوں نے کفر کیا اور حد سے آگے بڑھے، نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشے، اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے لیکن جہنم کی راہ جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں۔

ان تینوں آیتوں میں ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴾ (دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے) کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جن کے حق میں یہ آیتیں آئی ہیں وہ اس وقت دوزخ میں ہمیشہ قائم رہیں گے جب تک حسب مشیت الٰہی دوزخ کے خاتمہ کا دور نہیں آئے گا۔

باقی چند آیتوں میں اَبَدًا (ہمیشہ) کے بغیر صرف خَالِدًا ہے جیسے ﴿هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ وہ اس میں "خالد" رہیں گے۔ یا ایک جگہ ہے:

﴿ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (سجدہ۔۲)

اور "خلود" کے عذاب کا مزہ چکھو۔

تو یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہئے کہ خلود کے دو معنی ہیں، ایک حقیقی دوام اور دوسرے قیام طویل، ان دو میں سے کسی ایک معنی کی تخصیص قرینہ سے ہوگی، اسی دوسرے معنی کے اعتبار سے عربی اشعار میں پہاڑوں اور بدویانہ چوکھوں کے پتھروں کے لئے خوالد اور خالدات کے لفظ صفت میں آتے ہیں، کیونکہ وہ تادیر اور زمانہ دراز تک باقی رہنے والے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ تنہا ﴿خالدین ﴾ کا لفظ ابدیت کے مفہوم میں صریح نہیں جب تک اس کے ساتھ کوئی اور قرینہ قائم نہ

---

[1] حافظ ابن القیم نے شفاء العلیل (ص ۲۵۸) میں ان روایات کو غیر مطبوعہ کتب تفسیر وحدیث سے نقل کیا ہے، ان میں سے بعض ابن جریر طبری میں بھی آیات مذکور کی تفسیر میں خصوصاً تفسیر سورۂ ہود جلد ۱۲ ص ۶۶ میں مذکور ہیں اور حافظ جلال الدین سیوطی نے بھی تفسیر درمنثور تفسیر سورۂ ہود، جلد ثالث ص ۳۵۰ میں زیر آیت مذکورۂ ہود ذکر کیا ہے اور کتاب الاسماء والصفات بیہقی ص ۱۲۳ مطبوعہ الہ آباد میں میں چھٹی روایت ہے۔

ہو جو دوام کے معنی کی تخصیص کر دے جیسا کہ یہ قرینہ ان آیتوں میں ہے جہاں اہل جنت کو خلدین کہا گیا ہے کہ تقریباً بیس آیتوں میں اس خلود کے معنی دوام اور عدم انقطاع کے بتائے گئے ہیں اس لئے جنت کے سلسلہ میں جہاں صرف خلدین بھی ہے وہاں ہمیشگی اور دوام ہی کے معنی لئے جائیں گے برخلاف اس کے جہاں دوزخ کے ساتھ خلدین کا لفظ ہے وہاں دوام کے مفہوم کے لئے کوئی قرینہ موجود نہیں اس لئے دوزخ والی آیتوں میں خلود سے مقصود یہ ہے کہ گنہگار زمانہ دراز تک دوزخ میں رہیں گے، غالباً یہی وجہ ہے کہ گنہگار اہل ایمان کی سزا میں کبھی خلدین کے ساتھ ابداً استعمال نہیں کیا گیا ہے، گنہگار اہل ایمان میں سے سب سے بڑی دھمکی اس کو دی گئی ہے جس نے کسی مسلمان کا خون بے سبب بہایا ہو مگر اس کے لیے بھی خلدین کے ساتھ ابداً استعمال نہیں کیا گیا، فرمایا ﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا﴾ (نساء۔۱۳) اور جو کوئی کسی باایمان کو قصداً قتل کر دے گا تو اس کا بدلہ دوزخ ہے، جس میں وہ خَالِدًا (یعنی مدت دراز تک) پڑا رہے گا۔

یہی سبب ہے کہ معتزلہ اور خوارج کے سوا تمام اہل اسلام اس بے گناہ مسلمان مقتول کے قاتل کی بالآخر بخشائش کے قائل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان آیتوں میں ''خلود'' سے مراد ہمیشگی نہیں ہے بلکہ زمانہ دراز ہے کہ اہل توحید کی بالآخر نجات قرآن و حدیث کی متفقہ تعلیم ہے اور اس لئے مؤمن کے لئے اس کے کسی جرم کی سزا میں ہمیشگی کا مفہوم داخل ہی نہیں ہو سکتا، بنابریں ان آیتوں میں خلود کے معنی منطقی دوام نہیں، بلکہ عرفی دوام یعنی مدت دراز کے ہیں۔ ہم عام طور سے مجرم کے لیے حبس دوام کی قانونی اصطلاح بولتے ہیں جس سے مراد کبھی ابد تک کیا، قیامت تک کا زمانہ بھی نہیں ہو سکتا بلکہ عمر بھر بھی نہیں بلکہ صرف اس سے قانونی قید کی دراز ترین مدت مراد ہے جس کا قانونی اندازہ بیس سال کیا گیا ہے۔ کتنے مجرم ہیں جو اس مدت کو کاٹ کر آزادی حاصل کرتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو کسی شاہی عفو عام کے سلسلہ میں قبل از مدت رہائی پا جاتے ہیں۔

دو چار آیتیں ایسی بھی ہیں جن میں مذکور ہے کہ یہ گنہگار دوزخ سے الگ نہ ہوں گے، چنانچہ وہ آیتیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) ﴿اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۝ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ۝ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ﴾ (انفطار)

بے شک گنہگار دوزخ میں ہیں، وہ انصاف کے دن اس میں داخل ہوں گے اور وہ اس سے چھپے نہیں رہ سکتے۔

(۲) ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ط كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ﴾ (بقرہ۔۲۰)

اور کہیں گے کہ کاش ہم کو دوبارہ دنیا کی زندگی ملتی تو ہم اپنے پیشواؤں سے ہی الگ ہو جاتے، جیسے وہ ہم سے یہاں الگ ہو گئے، اللہ ان کے کاموں کو ایسے ہی حسرتیں بنا کر ان کو دکھائے گا اور وہ دوزخ سے نکلنے والے نہیں۔

(۳) ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ﴾ (مائدہ۔۱۳۷۔۱۳۶)

بے شک جنہوں نے کفر کیا اگر ان کی ملکیت میں کل روئے زمین ہو اور اتنا ہی اور ہوتا کہ اس کو فدیہ دے کر قیامت کے عذاب سے رہائی پائیں تو وہ ان کی طرف سے قبول نہ ہو اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں، لیکن وہ اس سے نکلنے والے نہیں اور ان کے لئے قائم عذاب ہے۔

(۴) ﴿ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴾ (حج۔۲)

وہ جب چاہیں کہ اس دوزخ سے غم کی وجہ سے نکل پڑیں وہ اس میں لوٹا دیئے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ جلنے کی سزا چکھو۔

(۵) ﴿ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ط كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴾ (سجدہ۔۲)

اور لیکن جنہوں نے نافرمانی کی تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، جب وہ چاہیں گے کہ وہ اس سے نکل جائیں، اس میں لوٹا دیئے جائیں گے، اور کہا جائے گا کہ دوزخ کی اس مار کا مزہ چکھو جس کو تم جھٹلاتے تھے۔

یہ وہ پانچ آیتیں ہیں جن سے بعضوں کو عذاب دوزخ کے دوام اور غیر منقطع بقا کا خیال پیدا ہوا ہے، مگر ان میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو تو ان کے خیال کی غلطی فوراً معلوم ہو جائے گی، پہلی آیت کا منشاء اسی قدر ہے کہ کوئی گنہگار اگر یہ سمجھے کہ وہ کسی جگہ چھپ کر دوزخ کے عذاب سے بچ جائے گا تو یہ محال ہے کہ خدا سے چھپ کر بچ جانا کسی طرح ممکن نہیں دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ دوزخی کہیں گے کہ ہم کو دوزخ سے نکل کر دوبارہ دنیا میں جانے دیا جائے تو اب کی بار ہم نیکی کے کام کریں گے، اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اب یہاں سے نکل کر دنیا میں دوبارہ جانا نہیں، تیسری آیت میں ہے کہ پورے روئے زمین کی دولت دے کر بھی آخرت میں نجات خریدی نہیں جا سکتی اور نہ وہاں سے کوئی نکل کر بھاگ سکتا ہے، چوتھی اور پانچویں آیت کا صریح مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی دوزخی دوزخ کے عذاب سے گھبرا کر اس سے نکل بھاگنا چاہے گا تو وہ پکڑ کر پھر اسی میں ڈال دیا جائے گا، ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ گنہگار از خود دوزخ سے نکل نہ سکیں گے اور نہ مدت عذاب کے اندر وہ خلاصی پا سکتے ہیں، مگر اس سے خدا تعالیٰ کے حکم و اجازت سے بالآخر اس سے نجات پانے کی نفی نہیں نکلتی اور نہ اس کی کہ بقدر گناہ عذاب کی مدت بسر کرنے کے بعد بھی نجات نہیں مل سکتی، اور نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بہشت کی طرح دوزخ کو بھی غیر متناہی دوام بخشا گیا ہے۔

یہی وہ آیتیں ہیں جن سے گنہگاروں کے لئے دوام عذاب کا مفہوم نکالا جا سکتا ہے، مگر ایک ایک آیت کو غور سے پڑھو کہ ان میں سے کسی میں بھی دوزخ کے دوام بقا اور عدم فنا یا اس کے عذاب کے عدم انتہاء کی تصریح ہے؟ حالانکہ اس کے بالمقابل جنت کی بقائے دوام اور عدم انقطاع کی تصریح بار بار اور بتکرار ہے۔

ایک اور نکتہ لحاظ کے قابل ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خدا نے گنہگاروں کو عذابِ دوزخ کی ابدیت اور دوام کی دھمکی دی ہے، تاہم اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے کہ نیکی کا بدلہ نہ دینا یقیناً برائی ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کی قدوسیت کا دامن تمام تر پاک ہے کہ ﴿اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ﴾ (آل عمران۔۲۰) ”تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا“ ﴿اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا﴾ (مریم۔۱۴) ”اس کا وعدۂ جنت پورا ہی ہوگا“ لیکن اگر برائی کا بدلہ حسب تہدید سابق برائی کے ساتھ نہ دیا جائے تو یہ حقیقت میں خلاف وعدگی نہیں جو قابل ملامت ہو بلکہ اس کا نام مغفرت، کرم، عطا اور عفو ہے جس کا

اہل اس رحمان ورحیم اور عفوو غفور سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں' اس لئے گنہگاروں کے ساتھ جیسا کہ اس نے فرمایا اپنی حکمت و مصلحت کی بناء پر وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ چنانچہ مسند ابویعلیٰ میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''خدا نے کسی نیک کام پر جس ثواب کا وعدہ فرمایا ہے وہ اس کو ضرور ہی پورا کرے گا لیکن جس کسی کو اس نے کسی کام پر عذاب کی دھمکی دی ہے تو اس کو اختیار حاصل ہے''۔[1]

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر بالآخر گناہوں کی مغفرت اور خدا کی رحمت میں یہ وسعت اور عموم ہے کہ بڑے سے بڑے گنہگار بھی دوزخ کی آگ میں جل کر بالآخر پاک وصاف اور جنت میں داخل ہونے کے قابل ہو جائیں گے تو اشارات وکنایات کے بجائے ان کی معافی کی صریح تصریح کیوں نہیں کر دی گئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ ان مجرموں اور گنہگاروں کے حق میں اچھا نہ ہوتا کہ اس سے ان کے نادم وتائب ہونے کے بجائے ان میں اور خودسری' گستاخی اور شوخی پیدا ہوتی اور ان میں آئندہ کے نتائج بد سے نڈرپن اور بے خوفی آ جاتی اور ایسا نہ ہونا یہ تنبیہ واصلاح و تدارک کی مصلحتوں کے سراسر منافی ہوتا اس لئے ان کی قانونی سزا تو دائمی عقاب مقرر فرمائی اور بالآخر ان کی نجات کو اپنی مشیت اور علم و مصلحت کے سپرد فرما کر ان کو ایک گونہ اپنے سے ناامید بھی نہیں ہونے دیا اور امید وبیم کی حالت میں رکھ کر اپنے سامنے جھکنے اور محبت کرنے کا جذبہ بھی پیدا کر دیا اور یہ اس باب میں وہ عظیم الشان اصلاح ہے جس کو ایک طرف عیسائیوں نے کفارہ کی اور دوسری طرف ہندو مذاہب نے کرم کی تعلیم دے کر غارت کر دیا تھا۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے مصلوب ہو کر جی اٹھنے پر ایمان لانے سے تمام گناہ دفعۃً معاف ہو جاتے ہیں' اس تعلیم نے اعمال کو غیر ضروری چیز ٹھہرا دیا تھا۔ اس کے برخلاف ہندو مذہب نے تو خدا کو اتنا بے اختیار ٹھہرایا کہ اعمال بد کے نتائج جن کو کرم کہتے ہیں' خدا چاہے بھی تو وہ کبھی معاف نہیں ہو سکتے لیکن اسلام نے آ کر ترازو کے ان دونوں پلوں کو برابر کر دیا۔ ایک طرف فرمایا ﴿ كُلُّ نَفْسٍ ۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ﴾ ''ہر نفس اپنے عمل کے ہاتھ میں گرو ہے'' (مدثر۔۲) اور دوسری طرف فرمایا ﴿ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ ''خدا جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے'' (مائدہ۔۳) یعنی قانوناً ہر انسان اپنے عمل کے نتائج کا یقیناً پابند ہے' مگر خدا تعالیٰ کی قدرت اور رحمت اس قانون کے باوجود جو چاہے کر سکتی ہے۔ جس طرح اس دنیا کا حال ہے کہ گو خدا کے بنائے ہوئے قانون یہاں جاری ہیں' جن کو آپ قانون فطرت کہتے ہیں مگر بایں ہمہ اس حکم اور اس کی خواہش اور مصلحت ان پر بھی حاکم ہے اور وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس تعلیم نے ایک طرف اعمال کو غیر ضروری ہونے سے بچا لیا اور دوسری طرف خدا کی قدرت تام اور رحمت کا دروازہ بھی کھلا رکھا۔

عذابِ طویل کا سبب:

بعض کم فہم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کا گناہ جو ایک لمحہ کا کام ہے اس کا عقاب اتنا طویل کیوں رکھا گیا ہے' اسی طرح سال دو سال یا عمر بھر کے گناہ کی سزا صدہا اور ہزار ہا سال کے عقاب سے دینا مناسب نہیں' حالانکہ یہ لوگ

---

[1] بحوالہ شفاء العلیل ابن قیم صفحہ ۲۲۲' مصر۔

اگر دنیاوی ہی واقعات پر غور کرتے تو وہ ان کی تسکین کے لئے کافی ہوتے' دنیا کا ہر بڑے سے بڑا قانونی گناہ ایک لمحہ میں انجام پاتا ہے' چوری' عمل خلافِ قانون یا کسی کو قتل کرتے کتنی دیر لگتی ہے مگر اس کے معاوضہ میں سالہا سال کی قید ہم خود اپنی انسانی عدالت گاہوں میں تجویز کرتے ہیں اور اس کو خلاف عقل نہیں کہتے۔

دوسری صحیح تر مثال یہ ہے کہ انسان کو دیکھو کہ ذرا سی جسمانی بد پرہیزی اور اصول صحت کی معمولی سی غلطی کی پاداش میں وہ کبھی ہفتوں مہینوں بلکہ سالہا سال بیمار رہتا ہے اور ایک مدت دراز میں جا کر کہیں ان چند لمحوں کی غلطی کی تلافی کر پاتا ہے اور کبھی اس معمولی غلطی کی بدولت عمر بھر اس کے روگ میں مبتلا رہتا ہے اور آخر میں جان دے دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور اس کی تلافی کی مدت یکساں نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ غلطی کی مدت کے مقابلہ میں اس کی تلافی کی مدت صدہا اور ہزار ہا گنا زیادہ ہوتی ہے کیونکہ طبیعت پر جو اثر پڑ جاتا ہے اس کی تلافی کی مدت غلطی کی نوعیت' طبیعت کی صلاحیت اور خلاق عالم کی مصلحت کی بناء پر کی جاسکتی ہے اسی لئے عقاب طویل سے رہائی یا شفایابی کی مدت بھی ہر گنہگار کے لئے یکساں نہیں ہوتی ﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِحَقِيْقَةِ الْحَالِ﴾

مشرک وکافر کا آخر انجام:

اگر یہ صحیح ہے کہ بالآخر ایک دن جہنم کی آگ سرد ہو جائے گی' تو کیا اہل کفر و شرک بھی اپنے گناہوں سے پاک ہو کر رحم و کرم کے سزاوار ہو جائیں گے جواب یہ ہے کہ

قرآن پاک میں اس کی تصریح موجود ہے کہ شرک و کفر کا گناہ معاف نہ ہوگا' یعنی اس کے اخروی نتائج کی پاداش ضروری ہے اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ شرک و کفر کی جزاء دوام عذاب اور خلود نار ﴿خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا﴾ ہے یعنی جب تک دوزخ قائم ہے اس سے ان کو نجات نہیں مل سکتی مگر جب حسب مشیت الٰہی وہ دن آئے کہ خود دوزخ کی مدت حیات ختم ہو جائے تو اس وقت عجب نہیں کہ ان کو بھی اس سے رہائی مل سکے۔

چنانچہ مشرکین وکافرین کے ذکر میں خدا فرماتا ہے۔

﴿قَالَ النَّارُ مَثْوٰكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ﴾ (انعام۔۱۵)

فرمائے گا' دوزخ کی آگ تمہارا ٹھکانا ہے' اس میں ہمیشہ رہو گے' مگر یہ کہ جو چاہے اللہ، بے شک تیرا پروردگار حکمت اور علم والا ہے۔

اس آیت کا آخری ٹکڑا خاص طور سے قابل ذکر ہے "تیرا رب حکمت اور علم والا" ہے اس موقع پر خدا کے لئے خاص طور پر "رب" کا لفظ لانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی شان ربوبیت اگر چاہے گی اور اس کے غیر محدود علم و حکمت کا اقتضا ہوگا تو دوزخ کے خاتمہ پر ان کو رہائی مل سکے گی۔

لیکن اس میں شک ہے کہ آیا اس کے بعد بھی وہ جنت میں داخل ہو سکیں گے' کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے قرآن میں یہ تصریح الٰہی ہے۔

﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰهُ النَّارُ﴾ (مائدہ۔۱)

یہ کہ بے شبہ اللہ کا جو شریک بنائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

نیز ایک اور آیت میں ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ اسۡتَکۡبَرُوۡا عَنۡهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمۡ اَبۡوَابُ السَّمَآءِ وَ لَا یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ حَتّٰی یَلِجَ الۡجَمَلُ فِیۡ سَمِّ الۡخِیَاطِ ﴾ (اعراف۔۵)

بے شک جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا' اوران کے ماننے سے غرور کیا تو ان کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے' اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے' تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو جائے۔

الغرض خدا کے اعلان کردہ قانون جزاء کا اقتضا تو یہی ہے کہ گو ان کے لئے کبھی دوزخ کا خاتمہ بھی ہو جائے مگر پھر بھی جنت کے احاطہ میں ان کا گذر نہ ہو لیکن اس کی رحمت و مغفرت کا دائرہ اس سے بڑھ کر ہے جیسا کہ خود اس نے اہل دوزخ کی نسبت کہا ہے کہ:

﴿ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّکَ ؕ اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ ﴾ (ھود۔۹)

وہ سدا دوزخ میں رہیں گے' لیکن تیرا رب جو چاہے' بے شک تیرا رب جو چاہے کر گذرتا ہے۔

اس دائرہ کی وسعت کو کون کم کر سکتا ہے؟ پھر اس کا یہ بھی اعلان ہے کہ

﴿ وَ رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ ﴾ (اعراف۔۱۹)

اور میری رحمت ہر شے کو اپنی گنجائش میں لئے ہے۔

اس رحمت عام کی وسعت سے آسمان و زمین کا کون گوشہ محروم ہے؟ اس سے بڑھ کر یہ کہ پیغمبر کے جھٹلانے والوں کو کہا جاتا ہے کہ

﴿ فَاِنۡ کَذَّبُوۡکَ فَقُلۡ رَّبُّکُمۡ ذُوۡ رَحۡمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَ لَا یُرَدُّ بَاۡسُهٗ عَنِ الۡقَوۡمِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴾ (انعام۔۱۸)

اے پیغمبر اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے کہ تمہارا پروردگار وسیع رحمت والا ہے' اور اس کا عذاب گنہگاروں سے لوٹایا نہیں جا سکتا۔

یعنی کسی دوسرے میں یہ طاقت نہیں کہ اس کے بھیجے ہوئے عذاب کو گنہگاروں کے سر سے ٹال دے لیکن خود اس کی رحمت بڑی وسیع ہے' وہ چاہے تو ان کو دنیا ہی میں ہدایت دے کر جنت نصیب کرے یا آخرت میں عذاب دینے کے بعد درگذر کر دے اور اس کی اصلی رحمت کا محل وہی ہے جہاں کسی دوسری رحمت کا وجود نہ ہو گا' فرمایا:

﴿ مَنۡ یُّصۡرَفۡ عَنۡهُ یَوۡمَئِذٍ فَقَدۡ رَحِمَهٗ ﴾ (انعام۔۲)

جس سے اس دن عذاب ہٹایا گیا' تو خدا نے اس پر رحم کیا۔

صحیح بخاری و مسلم و ترمذی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر مومن کو معلوم ہو کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے کہ تو وہ جنت سے مایوس ہو جائے اور اگر کافر کو یہ معلوم ہو کہ اس کی رحمت کتنی وسیع ہے تو وہ بھی جنت سے ناامید نہ ہو' مصلح الدین سعدی شیرازی نے غالباً اسی حقیقت کو اپنے دو شعروں میں ادا کیا ہے۔

بہ تہدید اگر برکشد تیغ حکم　　بمانند کروبیان صم و بکم
وگر در دہد یک صلائے کرم　　عزازیل گوید نصیبے برم

خود اس رحمان و رحیم کا ارشاد ہے کہ جس کی بادشاہی آسمان و زمین کو محیط ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔

﴿ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا وَاِلَیْهِ الْمَصِیْرُ ﴾ (مائدہ۔۳)

جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جس کو چاہے عذاب دیتا ہے، اور آسمانوں کی اور زمین کی اور ان کے بیچ کی بادشاہی اللہ کے لئے ہے، اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

لیکن یہ اس کی مشیت جیسا کہ اس نے (انعام رکوع ۱۵) میں فرمایا ہے کہ اس کی وسیع حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، وہ جو چاہے کرسکتا ہے مگر کرتا وہی ہے جو اس کی مصلحت وحکمت کا تقاضا ہے۔

اس سے زیادہ اس باب میں کچھ اور کہنا حد سے آگے بڑھنا ہے کہ جس کی تصریح خود خدائے تعالیٰ نے نہیں فرمائی اس کی تصریح کا حق کسی کو کیا ہے اس لئے مشرک و کافر کے آخر انجام کے سوال کا جواب صرف مشیت الٰہی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔

﴿ اَلنَّارُ مَثْوٰکُمْ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَکِیْمٌ عَلِیْمٌ ﴾ (انعام۔۱۵)

دوزخ تمہارا ٹھکانا ہے، اس میں سدا رہو گے، لیکن جو چاہے اللہ۔ بے شک تیرا پروردگار حکمت والا اور علم والا ہے۔

جمہور کا مسلک خلود نار:

جو کچھ کہا گیا وہ اس جماعت کا خیال ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت عمومی کی معتقد ہے، جمہور کا مسلک اس سے کچھ مختلف ہے، اس کے نزدیک بہشت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ باقی رہے گی اور ان لوگوں کو جو شرک اور کفر کے مرتکب ہوں گے، کبھی دوزخ سے نجات نہیں ملے گی۔

اس عقیدہ کے مطابق گنہگاروں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو گنہگار تھے مگر ایمان رکھتے تھے، ایسے لوگ عذاب کے بغیر ہی یا عذاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے عفو وکرم سے سرفراز ہو کر بالآخر جنت میں داخل ہوں گے، دوسرے وہ جو ہمیشہ شرک وکفر میں مبتلا رہے اور اس سے توبہ کئے اور ایمان لائے بغیر مر گئے، ایسے لوگوں کی بخشش کبھی نہ ہوگی اور وہ ہمیشہ کے لئے جہنم میں داخل کر دیئے جائیں گے، ان کی گنہگاری اس درجہ ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف کسی طرح جذب نہ کرسکیں گے، یہ وہ زمین شور ہوں گے جس میں اس رحمت عام کی بارش بھی کوئی روئیدگی پیدا نہ کرسکے گی۔

رحمت عمومی کے معتقدین گذشتہ آیتوں سے جو معنی نکالتے ہیں، وہ جمہور کے نزدیک صحیح نہیں، وہ ان کے بیان کردہ مطالب کو تاویلات کا درجہ دیتے اور ان کی پیش کردہ روایات کو صحت اور قوت سے خالی جانتے اور قرآن مجید کی حسب ذیل آیتوں سے اپنے دعویٰ پر استدلال کرتے ہیں۔

۱۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْکٰفِرِیْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِیْرًا خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ﴾ (احزاب۔۸)

بے شک خدا نے کافروں پر لعنت کی، اور ان کے لئے وہ آگ مہیا کی جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں۔

۲۔ ﴿ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ﴾ (جن۔۲)

اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، تو اس کے لئے جہنم کی آگ ہے، اس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔

۳۔ ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ یَکُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِیَهْدِیَهُمْ طَرِیْقًا ۝ اِلَّا طَرِیْقَ

جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا﴾ (نساء۔۲۲)

بے شک جنہوں نے کفر کیا اور حد سے آگے بڑھے، نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے، لیکن جہنم کی راہ، اس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ ان پر ہمیشہ عذاب ہوگا، اور جب عذاب ہمیشہ ہوگا تو عذاب کی جگہ یعنی دوزخ بھی ہمیشہ قائم رہے گی۔

ان آیتوں کے علاوہ اور بھی دوسری آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کا عذاب کافر سے کبھی دور نہ ہوگا۔

۱۔﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴾ (مائدہ۔۶)

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، اگر بالفرض ان کے پاس ساری زمین کا خزانہ ہو، اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور کہ وہ اس کو فدیہ دے کر قیامت کے دن اس عذاب سے چھٹ جائیں تو ان سے یہ فدیہ قبول نہ کیا جائے گا، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے، چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں، اور وہ اس سے نہیں نکل سکیں گے اور ان کے لئے قائم رہنے والا عذاب ہے۔

۲۔﴿ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴾ (بقرہ۔۲۰)

وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے۔

قیامت کے منکروں کی نسبت فرمایا۔

۳۔﴿ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴾ (جاثیہ۔۳۵)

تو آج اس دوزخ سے وہ نہیں نکالے جائیں گے اور نہ ان کا عذر سنا جائے گا۔

۴۔﴿ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِىْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴾ (شوریٰ۔۵)

ہاں کافر اور مشرک قائم رہنے والے عذاب میں ہوں گے۔

ظلم کا اطلاق قرآن میں شرک پر کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل شرک کا عذاب قائم رہے گا۔

۵۔﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴾ (بقرہ۔۱۹)

بے شک جنہوں نے کفر کیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے، ان پر اللہ کی فرشتوں کی اور آدمیوں کی، سب کی لعنت ہے، اس میں وہ سدا رہیں گے، ان کے عذاب میں کمی نہیں کی جائے گی اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔

۶۔﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ﴾ (فاطر۔۳۴)

اور ان کے لئے جنہوں نے کفر کیا، جہنم کی آگ ہے، نہ تو ان کا فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ سزا میں کچھ کمی کی

جائے گی۔

شرک وکفر والوں کی مغفرت کسی حال میں نہ ہوگی' فرمایا:

۷۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَایَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ ﴾ (نساء۔۱۸)

بے شک اللہ اس کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔

۸۔ ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ﴾ (محمد۔۴)

بے شبہ جنہوں نے کفر کیا اور خدا کے راستے سے روکا اور اسی کفر کی حالت میں وہ مر گئے' تو ان کو ہرگز معاف نہ کیا جائے گا۔

ان کے لئے جنت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہے۔

۹۔ ﴿ اِنَّهٗ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰهُ النَّارُ ﴾ (مائدہ۔۱۰)

یقیناً جو خدا کے ساتھ شرک کرے گا' تو اللہ نے اس پر جنت حرام کردی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

۱۰۔ ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ ﴾ (اعراف۔۵)

بے شک جنہوں نے ہمارے حکموں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے سرکشی کی' ان کے لئے آسمان کے دروازے کھولے نہ جائیں گے اور نہ جنت میں وہ داخل ہوں گے' تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے۔

۱۱۔ ﴿ وَلَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَنْ یَّضُرُّوا اللّٰهَ شَیْئًا یُرِیْدُ اللّٰهُ اَلَّا یَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِی الْاٰخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴾ (آل عمران۔۱۷۶)

اور اے پیغمبر تجھے وہ لوگ جو کفر میں جلدی کرتے ہیں غم میں نہ ڈالیں' وہ ہرگز خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے' خدا چاہتا ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ بنائے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ مرتے دم تک شرک وکفر میں مبتلا رہے اور توبہ نہیں کی ان کا گناہ بخشا نہ جائے گا اور وہ جنت میں کبھی داخل نہ ہوسکیں گے' بلکہ ہمیشہ دوزخ کے عذاب میں پڑے رہیں گے' جہاں نہ ان کے عذاب میں کبھی تخفیف ہوگی اور نہ ان کو موت آئے گی۔

تصویر کے دونوں رخ آپ کے سامنے آگئے۔

ع بیا کیں داوریہا را بہ پیش داور اندازیم

بہشت ودوزخ کی جزاء وسزا بھی تمثیلی ہے:

اوپر عالم برزخ کے ذکر میں ہم بہ تفصیل بتا چکے ہیں کہ آخرت میں جزاوسزا تمام تر تمثیلی ہوگی۔ اس تمثیلی کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ جیسا عمل ہوگا اسی کے مناسب ومشابہ اس کی جزا یا سزا ہوگی' مثلاً قرآن میں ہے کہ جو زکوٰۃ یعنی اپنے مال کا میل کچیل (حدیث میں ہے کہ زکوٰۃ مسلمانوں کا میل ہے) مستحقین کو کھانے کے لئے نہ دے گا تو اس کو دوزخ میں زخموں کا دھوون کھانے کو ملے گا یا یہ کہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان دے گا مرنے کے بعد اس کو جان تازہ اور حیات نوبخشی

جائے گی، وہ دولت مند جس کو دھوپ کی تپش سے بچنے کے لئے قصر و محل اور پینے کے لئے ٹھنڈے سے ٹھنڈا پانی اور عزت کی جگہ عنایت کی گئی تھی اگر اس نے دنیا میں ان نعمتوں کے ملنے کا حق اس دنیا میں ادا نہ کیا تو دوسری دنیا میں اس کو یہ سامان ملے گا۔

﴿ فِیْ سَمُوْمٍ وَّ حَمِیْمٍ ۝ وَّظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ ۝ لَا بَارِدٍ وَّلَا کَرِیْمٍ ۝ اِنَّھُمْ کَانُوْا قَبْلَ ذٰلِکَ مُتْرَفِیْنَ ﴾ (واقعہ۔۲)

وہ لو اور کھولتے پانی میں، دھوئیں کے سایہ میں، نہ ٹھنڈا نہ باعزت، بے شک وہ پہلے ناز و نعمت میں تھے۔

رویائے برزخ کی حدیث میں ہے کہ آپ نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا، یہ وہ تھے جن کے کچھ کام اچھے اور کچھ برے تھے (صحیح بخاری کتاب التعبیر) اس لئے بداعمالی بدصورتی اور نیکی خوبصورتی کے رنگ میں نمایاں ہوئی، صریح طور سے یہ اصول ان حدیثوں سے مستنبط ہوتا ہے۔

۱۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ جو مومن خود بھوکا رہ کر کسی دوسرے بھوکے مومن کو کھلائے گا، تو خدا اس کو جنت کے پھل کھلائے گا، اور جو پیاسا ہو کر کسی دوسرے پیاسے کو پلائے گا، تو خدا اس کو جنت میں شراب طہور پلائے گا اور جو کوئی کپڑوں کا حاجت مند ہو کر ننگے کو پہنائے گا، تو خدا اس کو جنت کے سبز جوڑے پہنائے گا۔ (ترمذی کتاب الزھد والرقاق ص ۴۰۴)

۲۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو کوئی کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیف دور فرمائے گا، اور جو کوئی کسی نادار کو یہاں کسی مصیبت میں پھنسائے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کو مصیبت میں مبتلا فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی ستر پوشی کرے گا تو خدا دنیا و آخرت میں اس کی ستر پوشی کرے گا اور جو کوئی اپنے بھائی کی مدد میں جب تک رہے گا، خدا اس وقت تک اس کی مدد میں رہے گا۔ (ترمذی ص ۳۲۳)

۳۔ جو انسانوں پر رحم کرے گا، خدا اس پر رحم فرمائے گا (ترمذی)

تمثیل کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ جو امور معنوی اور غیر مجسم ہیں، وہ اپنی مثالی شکل و صورت میں ظاہر ہوں گے مثلاً

۱۔ قرآن میں ہے کہ جو اس دنیا میں حقیقت بینی سے اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا، دیکھو کہ دنیا کی معنوی و قلبی نابینائی دوسرے عالم میں ظاہری و جسمانی نابینائی کی شکل میں ظاہر ہوگی۔

۲۔ حدیث میں ہے کہ اہل تکبر قیامت کے دن چیونٹیاں بنا کر اٹھائے جائیں گے، جن پر ہر طرف سے ذلت و خواری چھائی پھرے گی[1] دیکھو کہ تکبر کی جزا ذلت و خواری سے ملے گی اور چونٹیوں سے زیادہ حقیر و ذلیل کوئی ہستی نہیں، اس لئے ان کی بڑائی اور تکبر کا معاوضہ یہ ہوگا کہ وہ چیونٹی بن کر اٹھیں۔

۳۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ جو بخل کرے گا، قیامت میں اس کا مال سانپ بن کر اس کو ڈسے گا۔[2]

---

[1] ترمذی کتاب الزہد والرقاق ص ۴۱۰۔

[2] صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں مثل له مَالُهٗ شجاعًا اقرع ۔

صفتِ بخل اس کے حق میں اسی سانپ کی صورت اختیار کر کے اس کی تکلیف کا باعث ہوگی' آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص بلا وجہ بھیک مانگ کر اپنی آبروریزی کرتا ہے' قیامت میں وہ اٹھے گا تو اس کے منہ پر گوشت نہ ہوگا' دیکھو کہ دنیاوی بے شرمی و بے حیائی بے گوشت چہرہ کی صورت میں ظاہر ہوگی، اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ دو بیبیوں کا وہ شوہر جو ایک کا حق ادا کرتا اور دوسری سے غفلت برتتا تھا' قیامت میں اس طرح آئے گا کہ اس کا ایک پہلو (گویا مفلوج ہوکر) جھک گیا ہوگا [۱] ایک پہلو کا عدم ادائی حق اپنی تمثیلی صورت ایک پہلو کی مفلوج کیفیت میں نمودار ہوگا' یہ چند حوالے ذکر کئے گئے ہیں' انہیں پر جزا و سزا کے اور دوسرے جزئیات کو قیاس کرنا چاہئے' اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے حسب ذیل آیتوں پر غور کرنا چاہئے۔

> ﴿ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِىْۤ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴾ (طہ۔۷)
>
> جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اس کو تنگ گذران ملتی ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے' وہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟ میں تو دیکھتا تھا' فرمائے گا اسی طرح میری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے ان کو بھلا دیا ایسے ہی آج تو بھلایا جائے گا۔

دیکھو کہ دل کی نابینائی، قیامت میں ظاہری نابینائی، اور یہاں خدا کو بھولنا اور اس کے احکام کو یاد نہ کرنا' وہاں رحمت الٰہی کی یاد سے بھول کی شکل میں نمودار ہوگا۔

دوزخ کی جسمانی سزائیں:

دوزخ میں جسمانی اور روحانی دونوں سزائیں ملیں گی' قرآن پاک میں جن جسمانی سزاؤں کا ذکر ہے' وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ آتش دوزخ اور اسکی سوزش کا ذکر بار بار آیا ہے بلکہ اَلنَّارُ یعنی آگ گویا دوزخ کا دوسرا نام ہے' انہیں معنوں میں اَلسَّعِیْرُ یعنی جلتی آگ بھی بارہا مستعمل ہوا ہے اور عَذَابَ الْحَرِيْقِ جلن کا عذاب بھی دو چار جگہ کہا گیا ہے اور ایک جگہ یہ بھی ہے کہ

> ﴿ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ ﴾ (مومنون۔۶)
>
> ان کے چہروں کو دوزخ کی آگ جھلس دے گی اور ان کی صورتیں بگڑ جائیں گی۔

دوزخ کا ایک اور نام سقر ہے' جس کے متعلق یہ ہے کہ:

> ﴿ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا سَقَرُ ۝ لَا تُبْقِىْ وَلَا تَذَرُ ۝ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴾ (مدثر۔۱)
>
> اور تمہیں کیا معلوم' سقر کیا ہے نہ وہ رحم کھائے گی' نہ چھوڑے گی' چہروں کو جھلس دینے والی۔
>
> ﴿ كَلَّآ اِنَّهَا لَظٰى ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ﴾ (معارج۔۱)

---

[۱] ترمذی۔

ہرگز نہیں! وہ شعلہ والی آگ ہے، منہ کی کھال ادھیڑنے والی۔

﴿ اِنَّھَا تَرۡمِیۡ بِشَرَرٍ کَالۡقَصۡرِ ۝ کَاَنَّہٗ جِمٰلَتٌ صُفۡرٌ ﴾ (مرسلات۔۳۳۔۳۲)

دوزخ محل کے برابر اونچی چنگاریاں اتنی بڑی پھینکے گی جیسے زرد رنگ کے اونٹ۔

۲۔ وہاں سایہ نہ ہوگا، بلکہ یہ حکم ہوگا۔

﴿ اِنۡطَلِقُوۡٓا اِلٰی ظِلٍّ ذِیۡ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝ لَّا ظَلِیۡلٍ وَّلَا یُغۡنِیۡ مِنَ اللَّھَبِ ﴾ (مرسلات۔۳۰۔۳۱)

چلو ایک چھاؤں کی طرف جس کی تین پھانکیں ہوں گی، نہ گھنی چھاؤں اور نہ تپش میں کام آ سکے۔

۳۔ وہاں ٹھنڈک نہ ہوگی۔

﴿ لَا یَذُوۡقُوۡنَ فِیۡھَا بَرۡدًا وَّلَا شَرَابًا ﴾ (نبا۔۱)

اس میں وہ نہ ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ کسی پینے کی چیز کا۔

۴۔ دوزخ میں نہ موت آئے گی کہ چین آ جائے، اور نہ ایسی زندگی ہی ہوگی جس میں کوئی مسرت ہو، دو جگہ فرمایا:

﴿ لَا یَمُوۡتُ فِیۡھَا وَلَا یَحۡیٰی ﴾ (طٰہٰ و اعلیٰ)

وہاں وہ نہ مرے گا نہ جیے گا۔

۵۔ پینے کو گرم پانی ملے گا، جس سے آنتیں نکل پڑیں گی۔

﴿ وَسُقُوۡا مَآءً حَمِیۡمًا فَقَطَّعَ اَمۡعَآءَھُمۡ ﴾ (محمد۔۲)

اور وہ گرم پانی پلائے جائیں گے تو وہ پانی ان کی آنتوں کو ٹکڑے کر دے گا۔

اور پیپ پئیں گے۔

﴿ اِلَّا حَمِیۡمًا وَّغَسَّاقًا ﴾ (نبا۔۱)

لیکن کھولتا پانی اور پیپ۔

۷۔ ان کے اوپر سے گرم پانی چھوڑا جائے گا۔

﴿ یُصَبُّ مِنۡ فَوۡقِ رُءُوۡسِھِمُ الۡحَمِیۡمُ ﴾ (حج۔۲)

ان کے سروں کے اوپر سے گرم پانی ڈالا جائے گا۔

۸۔ کھانے کو سینڈھے کا پھل ملے گا۔

﴿ اَمۡ شَجَرَۃُ الزَّقُّوۡمِ .... اِنَّھَا شَجَرَۃٌ تَخۡرُجُ فِیۡۤ اَصۡلِ الۡجَحِیۡمِ ۝ طَلۡعُھَا کَاَنَّہٗ رُءُوۡسُ الشَّیٰطِیۡنِ ۝ فَاِنَّھُمۡ لَاٰکِلُوۡنَ مِنۡھَا فَمَالِـُٔوۡنَ مِنۡھَا الۡبُطُوۡنَ ۝ ثُمَّ اِنَّ لَھُمۡ عَلَیۡھَا لَشَوۡبًا مِّنۡ حَمِیۡمٍ ﴾ (والصّٰفّٰت: ۶۲-۶۸)

یا سینڈھے کا پھل....... وہ ایک درخت ہے دوزخ کی جڑ میں، اس کے شگوفے جیسے شیطانوں کے سر، تو وہ کھائیں گے اور اس سے پیٹ بھریں گے، پھر اس پر گرم پانی کی ملونی ہوگی۔

﴿ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوۡمِ ۝ طَعَامُ الۡاَثِیۡمِ ۝ کَالۡمُھۡلِ یَغۡلِیۡ فِی الۡبُطُوۡنِ ۝ کَغَلۡیِ الۡحَمِیۡمِ ﴾ (دخان۔۳)

سینڈھے کا درخت گنہگار کی غذا ہے، جیسے پگھلا ہوا تانبا، وہ پیٹوں میں کھولتا ہے جیسے کھولتا پانی۔

۹۔ خارداری جھاڑی کی خوراک ہوگی جس سے بدن کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

﴿ لَیْسَ لَھُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِیْعٍ o لَّا یُسْمِنُ وَلَا یُغْنِیْ مِنْ جُوْعٍ ﴾ (غاشیہ۔۱)

اوران کے لئے کوئی کھانا نہ ہوگا، لیکن خاردار جھاڑی، جو نہ موٹا کرے گی اور نہ بھوک سے بے پروا کرے گی۔

۱۰۔ زخموں کے دھوون کی خوراک ملے گی۔

﴿ وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ ﴾ (حاقہ۔۲)

اور نہ کوئی کھانا، مگر زخموں کا دھوون۔

۱۱۔ کھانا نگلا نہ جائے گا۔

﴿ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ ﴾ (مزمل۔۱)

اور گلے میں اٹکنے والا کھانا۔

۱۲۔ آگ کے کپڑوں کا لباس ہوگا۔

﴿ فَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَھُمْ ثِیَابٌ مِّنْ نَّارٍ ﴾ (حج۔۲)

کافروں کے لئے آگ کے کپڑے قطع ہوں گے۔

۱۳۔ لوہے کے ہتھوڑے پڑیں گے۔

﴿ وَلَھُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِیْدٍ ﴾ (حج۔۲)

اوران کے لئے لوہے کے ہتھوڑے ہیں۔

۱۴۔ گلے میں طوق اور زنجیریں ہوں گی۔

﴿ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْ اَعْنَاقِھِمْ وَالسَّلٰسِلُ یُسْحَبُوْنَ ﴾ (مومن۔۸)

جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی وہ کھینچے جائیں گے۔

﴿ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ سَلٰسِلَا وَاَغْلٰلًا وَّسَعِیْرًا ﴾ (دھر۔۱)

ہم (خدا) نے کافروں کے لئے زنجیریں اور طوق اور آگ تیار رکھی ہے۔

﴿ مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ ﴾ (ابراہیم۔۷)

وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔

دوزخ میں روحانی سزائیں:

ان جسمانی سزاؤں کے ساتھ روحانی سزائیں بھی ہوں گی، جو اہل نظر کی نگاہوں میں ان سے بڑھ کر ہوں گی، چنانچہ دوزخ کی وہ آگ جس کی گرمی اور سوزش کا حال اوپر گذر چکا ہے، وہ دل کو جا کر جھانکے گی، فرمایا۔

﴿ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَةُ o الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ ﴾ (ہمزہ۔۱)

سلگائی ہوئی اللہ کی آگ جو دلوں کو جھانکے گی۔

﴿ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ﴾ (یونس۔۶)

اور جب عذاب کو دیکھیں گے تو اپنی پشیمانی کو چھپائیں گے۔

﴿ یٰحَسۡرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطۡتُّ فِیۡ جَنۡۢبِ اللّٰہِ ﴾ (زمر۔۶)

اے حسرت اس پر کہ میں نے خدا کے پہلو میں کمی کی۔

﴿ کُلَّمَآ اَرَادُوۡۤا اَنۡ یَّخۡرُجُوۡا مِنۡھَا مِنۡ غَمٍّ ﴾ (حج۔۲)

وہ جب دوزخ سے غم کی وجہ سے نکلنا چاہیں گے۔

ذلت کا عذاب:

﴿ فَالۡیَوۡمَ تُجۡزَوۡنَ عَذَابَ الۡھُوۡنِ ﴾ (احقاف۔۲)

تو آج ذلت کے عذاب کا بدلہ دیئے جاؤ گے۔

اس افسوس وحسرت وندامت سے بڑھ کر یہ کہ ان کو معذرت پیش کرنے کی بھی اجازت نہ ہوگی۔

﴿ لَا تَعۡتَذِرُوا الۡیَوۡمَ ﴾ (تحریم۔۱)

آج معذرت نہ پیش کرو۔

اللہ عزوجل سے مکالمہ کا شرف ان کو نہ ملے گا' جب وہ بات کرنا چاہیں گے تو وہ فرمائے گا

﴿ اِخۡسَئُوۡا فِیۡھَا وَلَا تُکَلِّمُوۡنِ ﴾ (مومنون۔۶)

ذلیل ہو اس دوزخ میں' اور مجھ سے بات نہ کرو۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے جلوہ سے محروم رہیں گے۔

﴿ کَلَّاۤ اِنَّھُمۡ عَنۡ رَّبِّھِمۡ یَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ ﴾ (تطفیف)

ہرگز نہیں! وہ اس دن اپنے رب سے پردہ میں ہوں گے۔

اُن میں سے وہ جنہوں نے اس دنیا میں اپنے پروردگار کو بھلا دیا تھا' پروردگار بھی اس دن ان کو اپنی رحمت و شفقت کی یاد سے بھلا دے گا' فرمایا۔

﴿ کَذٰلِکَ اَتَتۡکَ اٰیٰتُنَا فَنَسِیۡتَھَا ۚ وَکَذٰلِکَ الۡیَوۡمَ تُنۡسٰی ﴾ (طہ۔۷)

اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے ان کو بھلا دیا' ایسے ہی آج تو بھی بھلایا جائے گا۔

بلکہ وہ دوزخی بھی ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ کرم سے بھی محروم رہیں گے' وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا اور نہ اُن سے کچھ بات کرے گا اور نہ ان کی اصلاح حال کی کوئی فکر کرے گا' یہ حقیقت میں شفیق ومہربان رب کی انتہائی ناراضی کی تصویر ہے' اس درد کے احساس کو وہی کچھ سمجھ سکتے ہیں جو عشق ومحبت کے زخم خوردہ ہیں' فرمایا۔

﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَشۡتَرُوۡنَ بِعَھۡدِ اللّٰہِ وَاَیۡمَانِھِمۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ط اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَھُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ وَلَا یَنۡظُرُ اِلَیۡھِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیۡھِمۡ ۠ وَلَھُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴾ (آل عمران۔۸)

جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی جھوٹی قسموں کے ذریعہ سے تھوڑی سی دولت خرید اکرتے ہیں' یہ وہ ہیں جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں' اور نہ قیامت میں خدا ان سے بات کرے گا' اور نہ ان کی طرف دیکھے گا' اور نہ ان کو سنوارے گا' اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

* * *

جنت

جنت کے نام:

اس مقام کا نام جو نیکوکار انسانوں کا دائمی گھر ہوگا' قرآن پاک میں عموماً ﴿اَلْجَنَّةُ﴾ (باغ) بتایا گیا ہے اور کبھی کبھی اس کو مناسب اضافتوں کے ساتھ بھی ادا کیا گیا مثلاً ﴿جَنَّةُ النَّعِيمِ﴾ (نعمت کا باغ) ﴿جَنَّةُ الْخُلْدِ﴾ (بقائے دوام کا باغ) ﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ﴾ (دائمی سکونت کے باغ) ﴿جَنَّةُ الْمَاْوٰى﴾ (پناہ کا باغ) ان کے علاوہ اور دوسرے لفظوں سے بھی اس کی تعبیر کی گئی ہے مثلاً ﴿فِرْدَوْسٌ﴾ (باغ) ﴿رَوْضَةٌ﴾ (چمن) ﴿دَارُ الْخُلْدِ﴾ (ہمیشگی کا گھر) ﴿دَارُ الْمَقَامَةِ﴾ (قیام کا گھر) ﴿دَارُ السَّلَامِ﴾ (سلامتی وامن کا گھر)

جنت کا دوام:

اس موجودہ دنیا میں بھی گو لذتیں اور مسرتیں ہیں مگر جو چیز یہاں نہیں ہے وہ بقائے دوام ہے۔ یہاں کی ہر لذت عارضی اور ہر مسرت فانی ہے۔ یہاں خوشی کا کوئی ترانہ نہیں جس کے بعد غم و ماتم کا نالہ نہ ہو' یہاں ہر پھول کے ساتھ کانٹے' ہر روشنی کے ساتھ تاریکی' ہر وجود کے ساتھ فنا' ہر سیری کے بعد بھوک، ہر سیرابی کے بعد پیاس' اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے انسان ہزاروں مشکلیں اٹھانے اور ہزاروں صدمے سہنے کے بعد ایک مسرت کا پیام سنتا اور خوشی کا منظر دیکھتا ہے' مگر ابھی اس سے سیر ہونے کی بھی نوبت نہیں آتی کہ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے غرض اس موجودہ عالم فانی کی ہر شے آنی جانی ہے اور یہی یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے۔

لیکن جنت اس مملکت کا نام ہے جہاں کی لذتیں جاودانی اور جہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں' جہاں حیات ہے مگر موت نہیں' راحت ہے مگر تکلیف نہیں' لذت ہے مگر الم نہیں' مسرت ہے مگر غم نہیں' جہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں' وہ شادمانی ہے جس کے بعد حزن واندوہ نہیں' شیطان نے حضرت آدمؑ کے سامنے جس جنت کا نقشہ کھینچا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔ اس نے کہا' اے آدم!

﴿هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى﴾ (طٰہٰ۔۷)

کیا میں تجھے سدا جینے کا درخت اور وہ بادشاہی بتاؤں جس کو فنا نہیں؟

مگر جنت کا یہ وصف سنا کر ان کو جدھر کا راستہ بتایا، وہ موت کے درخت اور فنا کے ملک کی طرف کا تھا اور یہی وہ فریب تھا جس میں آدم گرفتار ہوئے' چنانچہ اسی جنتی زندگی کی تلاش میں وہ چیز کھالی جو ان کے حق میں زہر تھی یعنی گناہ کا پھل' نتیجہ یہ ہوا کہ جنة الخلد اور غیر فانی ملک سے نکل کر ان کو اس فنا کے ملک میں آنا پڑا اور پھر اس کا استحقاق ان کے اور ان کی نسل کے اعمال کا صلہ قرار پایا' چنانچہ فرمایا۔

﴿اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيْرًا﴾ (فرقان۔۲)

یا ہمیشگی کا باغ جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا جو ان کا صلہ ہوگا' اور واپسی کی جگہ۔

یہ ہمیشگی کا باغ وہ غیر فانی مملکت ہے جہاں کا آرام دائمی اور جہاں کی سلامتی ابدی' جہاں کی لذت بے انتہا'

جہاں کی زندگی غیر منقطع، جہاں کا سرور غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاوداں ہے۔ چنانچہ اس کی تصریح قرآن پاک کی سولہ آیتوں میں مختلف طریقوں سے کی گئی ہے، فرمایا:

(۱) ﴿ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ط وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ط وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا ﴾ (نساء۔۱۲۲)

اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے، ہم ان کو ان باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان میں وہ ہمیشہ کے لئے رہ پڑیں گے، اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی؟

اس تاکید پر تاکید اور پرزور طریقہ تعبیر پر نظر ڈالئے کہ صرف خلود پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی اَبَدًا فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا۔ اس پر بھی بس نہ کی بلکہ یہ بھی اضافہ کیا کہ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور اس پر بھی مزید تاکید کا اضافہ کیا کہ اور اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہوسکتی ہے؟ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خلود جنت اور بقائے غیر فانی کی قطعیت کتنی ہے۔

۲۔ ﴿ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ﴾ (نساء۔۸)

اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کئے، ہم ان کو ان باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔

۳۔ ﴿ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ﴾ (مائدہ۔۱۶)

ان کے لیے وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔

۴۔ ﴿ وَجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِیْهَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ ۝ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ﴾ (توبہ۔۳)

اور (اللہ ان کو خوشخبری دیتا ہے) کہ ان کے لیے وہ باغ ہیں جن میں ہمیشہ کا آرام ہے اور جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔

۵۔ ﴿ وَاَعَدَّلَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا (توبہ۔۳۱)

اور انکے لیے وہ باغ مہیا کیے ہیں، جن کے نیچے نہریں رواں ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔

۶۔ ﴿ وَیُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ﴾ (تغابن۔۱)

اس کو ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔

۷۔ ﴿ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا یُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ط قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ﴾ (طلاق۔۱۱)

اور جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک کام کریں اس کو وہ ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے، اللہ نے اس کو روزی خوب دی۔

۸۔ ﴿ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ﴾ (بینۃ ۔ ۸)

ان کی مزدوری ان کے رب کے حضور میں بسنّے کے وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہا

کریں گے۔

یہ آیتیں وہ ہیں جن میں اہل جنت کو جنت میں خلود ابدی کی قطعی بشارت سنائی گئی ہے' ان کے علاوہ وہ آیتیں ہیں جن میں جنت کی راحتوں اور لذتوں کی ابدیت اور دوام کی خبر دی گئی ہے' فرمایا۔

۹۔ ﴿ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝ مَاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ﴾

(کہف۔۱)

اور ان مومنوں کو بشارت دوں گا جنہوں نے اچھے کام کئے کہ ان کے لئے اچھی مزدوری ہے' جس میں وہ ہمیشہ قیام پذیر رہیں گے۔

سورۂ ص میں جنت کی اکثر نعمتوں کے بیان کے بعد ہے۔

۱۰۔ ﴿ هٰذَا مَاتُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَالَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴾ (ص۔۴)

یہ وہ ہے جس کا حساب کے دن تم کو دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے' بے شبہ یہ ہماری وہ روزی ہوگی جس کو ختم ہونا نہیں ہے

۱۱۔ ﴿ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴾ (ھود۔۱۰۸)

اور لیکن جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت میں رہا کریں گے جب تک آسمان اور زمین ہیں' لیکن جو تیرا رب چاہے وہ بخشش ہوگی جو منقطع نہ ہوگی۔

یعنی خدا کی مشیت کے سوا ان کو اس جنت سے کوئی الگ نہ کر سکے گا لیکن اس کی مشیت یہی ہوگی کہ ان کے لئے اس کی یہ بخشش دائمی اور غیر منقطع طریقہ سے ہمیشہ قائم رہے' پھر جس کے متعلق اس کی مشیت کا یہ اعلان ہے وہ فنا کیونکر ہو سکے گی۔

۱۲۔ ﴿ وَجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴾ (توبہ۔۳)

اور وہ باغ جن میں ان کے لئے قائم رہنے والی نعمت ہوگی۔

۱۳۔ ﴿ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ﴾ (رعد۔۵)

جنت کا میوہ اور اس کا سایہ دائمی ہے۔

۱۴۔ ﴿ وَفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ۝ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ﴾ (واقعہ۔۳۲۔۳۳)

اور بہت سے میوے جن کا نہ انقطاع ہوگا اور نہ جن کی روک ہوگی۔

۱۵۔ ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴾ (التین)

لیکن جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کے لئے وہ مزدوری ہے جس کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔

فنائے راحت اور انقطاع مسرت کی دو صورتیں ہیں' ایک یہ کہ راحت و مسرت کے اسباب کا خاتمہ ہو جائے اور دوسرے یہ کہ خود لذت اٹھانے والے کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے' پہلی صورت کی نفی تو گذشتہ آیتوں میں کر دی گئی ہے کہ راحت و مسرت کے اسباب کا وہاں خاتمہ نہ ہوگا۔ اب رہ گئی دوسری صورت تو گو خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا کہہ کر اس کی نفی بار بار کی جا چکی ہے مگر ایک جگہ بتصریح یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اس احاطہ میں موت کا گذر نہ ہوگا' فرمایا:

۱۶۔﴿ لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰی ﴾(دخان۔۳)
جنت میں جنت والے پہلی موت کے سوا پھر موت کا مزہ نہیں چکھیں گے۔

لیکن ایک تیسری صورت یہ بھی ممکن ہے کہ مسرت کے اسباب بھی قائم رہیں اور اہل جنت کی زندگی بھی دائم ہو مگر کچھ دنوں کے بعد ان کو وہاں سے نکال کر الگ کر دیا جائے تو اس کی تصریح بھی فرما دی کہ یہ بھی ممکن نہ ہوگا کہ کوئی اہل جنت کو ان کے عیش و راحت کی منزل گاہوں سے باہر نکال سکے' فرمایا:

﴿ لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ ﴾ (حجر۔۴)
وہاں ان کو کوئی غم نہ چھوئے گا' اور نہ وہ اس میں سے نکالے جائیں گے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ خود اہل جنت اس سے گھبرا کر نکل آئیں' تو فرمایا کہ ان کی جبلت و فطرت ایسی ہوگی کہ وہ خود بھی اس مہمان خانہ الٰہی سے نکلنا پسند نہیں کریں گے' فرمایا:

﴿ خَالِدِیْنَ فِیْهَا لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴾ (کہف۔۱۲)
سدا رہیں گے اس میں، اس سے منتقل ہونا نہ چاہیں گے۔

دوام و بقا اور تسلسل و عدم انقطاع کی اس تو برتو تاکید اور اصرار سے اندازہ ہوگا کہ اسباب مسرت کی بقاء، راحت کا دوام اور زندگی کا تسلسل جنت کی اصلی خصوصیت ہوگی' یہی وہ حقیقت ہے جس کی لالچ شیطان نے

﴿ وَمُلْكٍ لَّا یَبْلٰی ﴾ (طٰہٰ۔۷)
اور غیر فانی سلطنت۔

کہہ کر آدم کو دلائی تھی' اور اس بہانہ سے اس عالم بقاء سے ان کو اس عالم فنا میں بھجوا دیا' آخر وہ زمانہ آئے گا جب آدم کی اولاد کو ان کے نیک اعمال کی بدولت اس غیر فانی بادشاہی کی وراثت ہمیشہ کے لئے حاصل ہوگی۔

غیر فانی بادشاہی:

دنیا میں شخصی راحت و آرام کا بلند سے بلند تخیل ایک لفظ ''بادشاہی'' کے اندر بخوبی ادا ہو سکتا ہے اگر انسان کو اس کی انتہائی آرزوؤں کے برآنے کی خوشخبری دینے کے لئے کوئی لفظ استعمال ہو سکتا ہے تو یہی ہے گویا بادشاہی اس کیفیت کا نام ہے جس میں انسان کی کوئی آرزو کامیابی سے محروم نہ رہے' سامانِ راحت اور اسباب شادمانی کی فراوانی سے اس کی مسرت میں کسی غم کا شائبہ نہ ہو۔ اونچے اونچے محل' ہرے بھرے باغ' بہتی نہریں' سرسبز و شاداب تختے' سونے چاندی کے اسباب' زر و جواہر کے برتن' زریں کمر غلام و خدام' ریشمی لباس' طلائی تخت' موتیوں کے ہار' سونے کے کنگن' شراب کے زمردیں اور بلوریں پیالے' حسین و مہ جبیں بیگمات' غرض ایک لفظ بادشاہی کے یہ تمام ضروری لوازمے ہیں۔

جنت کی مختصر ترین لیکن سچی تعریف آدم کے دشمن نے آدم کے سامنے کی تھی۔

﴿ وَمُلْكٍ لَّا یَبْلٰی ﴾ (طٰہٰ۔۷)
اور غیر فانی بادشاہی۔

آنے والی زندگی کے اس غیر فانی عیش و مسرت کے لئے مختلف پیغمبروں نے مختلف الفاظ استعمال کئے ہیں

چنانچہ حضرت عیسیٰؑ نے اس کے لئے آسمانی بادشاہی کی اصطلاح قائم فرمائی ہے اور اپنی گفتگو کے تمام استعاروں میں اس مفہوم کو اسی لفظ سے ادا کیا ہے، مگر جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے کہ انسانی لغت کے الفاظ سے جو مادیت کی گودوں میں پلے اور مادیت کے ماحول میں پھلے پھولے ہیں، کسی خالص روحانی مفہوم کی تعبیر ناممکن ہے کہ اس کے ہر لفظ کے مفہوم کو انہیں لوازم اور خیالات کے ساتھ انسان سمجھنے پر مجبور ہے جو ہمیشہ سے اس لفظ کے ساتھ وابستہ چلے آتے ہیں، آپ بادشاہی کو آسمانی کہہ کر کسی قدر مادہ سے بلند کریں، مگر بادشاہی کے مفہوم کے ساتھ جو موروثی خیالات ولوازم وابستہ ہیں وہ دور نہیں ہوسکتے، چنانچہ خود حضرت عیسیٰؑ اپنی زندگی کی آخری شب میں شاگردوں کو جب شراب کا پیالہ بھر کر دیتے ہیں تو آسمانی بادشاہی کے مادی لطف ومسرت کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

’’میں پھر تمہیں کہتا ہوں کہ انگور کا شیرہ پھر نہ پیوں گا اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہی میں اسے نیا نہ پیوں‘‘۔ (متی۔۲۶۔۲۹)

آپ نے دیکھا کہ ’’باپ‘‘ کی ’’آسمانی بادشاہی‘‘ میں بھی انگور ہی کا شیرہ پینے کو ملے گا

اور یوحنا حواری نے جب اس آسمانی بادشاہی کا خواب دیکھا تو وہ اس کو اسی سونے چاندی کے محل، آب حیات کی نہر اور جواہرات کی دیواروں میں نظر آئی (مکاشفات یوحنا باب ۲۱ و ۲۲) اور پھر

’’وہاں رات نہ ہوگی اور وہ چراغ اور سورج کی روشنی کے محتاج نہیں، کیونکہ خداوند ان کو روشن کرتا ہے، اور وہ ابد الآباد بادشاہی کریں گے‘‘ (۲۲۔۵)

لیکن یہ ’’بادشاہی‘‘ عیسوی پیغام میں ہنوز تفسیر کی محتاج ہے، نبوت کے آخری پیغام نے اس اجمال کی تفصیل ان لفظوں میں کی ہے۔

﴿ فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۝ وَجَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝ مُّتَّكِئِيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ۝ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ۝ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا ۝ قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ۝ وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ۝ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ۝ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ۝ وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ۝ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ وَّسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴾ (دھر۔۱)

تو اللہ نے اہل جنت کو اس دن کی تکلیف سے بچالیا، اور ان کو تروتازگی اور شادمانی سے ملایا اور ان کے صبر کے بدلہ میں ان کو رہنے کے لئے باغ اور پہننے کے لیے ریشمی کپڑے دیئے، وہ ان باغوں میں تختوں پر تکیے لگائے ہونگے، ان میں نہ دھوپ ہوگی نہ ٹھنڈ، اور ان کے سائے ان پر جھکے ہونگے، ان کے خوشے پست ہو کر لٹکے ہونگے، چاندی کے برتن اور نقرئی شیشوں کے آبخورے جو ناپ کر بنائے گئے ہیں ان کو لوگ ان کے پاس لیے پھریں گے، اور ان کو وہاں وہ پیالہ پلایا جائے گا جس میں سونٹھ ملی ہوگی، اس میں ایک چشمہ کا نام سلسبیل ہے اور سدا رہنے والے کمسن غلام ان کی

خدمت میں گھوم رہے ہونگے' اور تو انہیں دیکھے تو سمجھے کہ موتی بکھرے ہیں' اور جب تو یہ سب دیکھے تو وہاں نعمت و عیش اور بڑی بادشاہی دیکھے' انکی پوشاک سبز نرم ریشم اور دبیز ریشم ہو' اور ان کو نقرئی کنگن پہنائے جائیں گے' اور ان کا پروردگار ان کو پاک شراب پلائے گا' یہ تمہاری مزدوری ہوگی اور تمہاری محنت کی قدر کی جائے گی۔

یہ پورا نقشہ اس عیش و مسرت کا ہے جو اس دنیا کے شاہانہ محلوں کے متعلق تخیل میں آتا ہے۔ اس بیان کی تائید و تصدیق اس صحیح حدیث سے ہوگی جو جامع ترمذی میں حضرت مغیرہ ؓ صحابی سے مروی ہے' آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''موسیٰ نے اپنے پروردگار سے پوچھا کہ اے پروردگار! جنت والوں میں سب سے کم رتبہ کون ہوگا؟ فرمایا کہ وہ شخص جو جنت والوں کے جنت میں داخل ہو چکنے کے بعد آخر میں آئے گا' تو اس سے کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ، وہ کہے گا کہ اب میں کہاں جاؤں کہ لوگ اپنے اپنے مقام پر جا چکے ہیں اور ربانی نوازشوں پر قابض ہو چکے ہیں اس سے کہا جائے گا کہ کیا تو اس پر راضی ہے کہ تجھے وہ ملے جو دنیا کے بادشاہوں میں سے کسی کے پاس نہ تھا؟ عرض کرے گا خداوندا میں راضی ہوں۔ فرمائے گا، تیرے لئے اتنا اور اس سے دونا اور اس سے تین گنا اور چوگنا ہے' کہے گا خداوند! میں راضی ہو گیا۔ خدا فرمائے گا تیرے لیے وہ اور اس کا دوگنا ہے۔ عرض کرے گا میں راضی ہو گیا۔ فرمائے گا اس کے ساتھ یہ بھی کہ جو تیرا دل آرزو کرے اور جو تیری آنکھ کو لذت بخشے۔'' [1]

باغ کا استعارہ:

آخرت کے خانہ عیش و راحت کے لئے قرآن پاک نے عموماً جنت اور کہیں روضہ کے لفظ کا استعمال کیا ہے' نادان اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ عرب کے شور و بے حاصل اور خشک صحرا کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبز و شاداب باغوں ہی کی ہو سکتی ہے، اس لیے ان کے لیے یہ لفظ اس مقام آخرت کے لیے قرآن نے استعمال کیا ہے' مگر یہ سمجھنا چاہئے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں' بلکہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہے' اس لیے عرب کی تخصیص بے معنی ہے' کیا دنیا کے سرسبز و شاداب ملکوں کے بسنے والوں کے تخیل میں باغ و راغ اور رنگ و گل کی بہار پسندیدہ نہیں ہے' اصل یہ ہے کہ یہاں بیابان و گلستان کی تخصیص نہیں' یہ فطرت انسانی کی تصویر ہے' انسان کسی خطہ ارضی میں آباد ہو' مگر وہ سرسبز و شاداب قطعات' باغ و بہار اور کنارِ آب و نہر کو عیش و مسرت کا مقام سمجھتا ہے اور ان کو دیکھ کر اندر سے اس کی روح وجد کرتی ہے۔

اس استعارہ کے استعمال کا ایک اور نکتہ بھی توجہ کے قابل ہے' انسان کا گھر وہ عیش خانہ ہوتا ہے جس میں حزن و غم کی آمیزش بھی شامل ہوتی ہے' اہل و عیال اور دولت و مال کے متعلق ہر قسم کی فکریں اس کے دل کے دامن سے لپٹی ہوتی ہیں مگر جب انسان سیر و تفریح کے لیے باغ و چمن کا رخ کرتا ہے تو تھوڑی دیر کے لئے وہ ہر غم کو فراموش اور ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہے اور ایسا شاداں و فرحاں بن جاتا ہے کہ غم و الم اس کے ہر گوشہ خاطر سے دور ہو جاتے ہیں' وحی محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے اس لفظ کو اسی لیے استعمال کیا ہے تاکہ اس سے اُخروی عیش و مسرت، شادی و خوشی اور فراغ خاطر کی پوری تصویر کھینچ جائے گی۔

---

[1] جامع ترمذی تفسیر سورۂ سجدہ (حدیث حسن صحیح)۔

سامانِ جنت کے دنیاوی نام:

یہ حقیقت بار بار دہرائی گئی ہے کہ عالم آخرت کی اشیا کو جن دنیاوی الفاظ سے ادا کیا گیا ہے ان سے مقصود بالکل وہی نہیں ہیں جو ان لفظوں سے سمجھنے کے ہم عادی ہیں، بلکہ ان اخروی اشیاء کو ان دنیاوی الفاظ سے اس لیے ادا کیا گیا ہے کہ وہ ان سے خاص مناسبت رکھتی ہیں، ورنہ ازروئے حقیقت ان الفاظ کے لغوی مفہوم و معنی سے اُنکی اخروی حقیقتیں بدرجہا بلند و اتم ہوں گی، چنانچہ قرآن مجید کی ان آیتوں میں۔

﴿ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِىْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْىٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا (بقرہ۔ پارہ۱)

اور ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے یہ خوشخبری سنا کہ ان کے لئے وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی، وہ جب ان باغوں سے کوئی پھل دیئے جائیں گے، کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہم کو دیا گیا تھا اور وہ ان کو ایک دوسرے کے مشابہ دیا جائے گا، اور ان باغوں میں انکی صاف ستھری بیویاں ہونگی اور وہ ان باغوں میں رہا کریں گے۔ بےشبہ خدا اس سے شرمندہ نہیں کہ وہ ایک مچھر کی یا اس سے بھی کم رتبہ چیز کی مثال بیان کرے۔

ان آیتوں کے سیاق و سباق اور نظم و ترتیب پر لحاظ کر کے میرے ذہن میں یہی معنی آتے ہیں کہ ان میں دنیاوی الفاظ اور ان کے اخروی مفہوم کے درمیان تشابہ کا بیان ہے ورنہ حقیقت کی رو سے ان الفاظ کے دنیاوی و لغوی معانی اور اخروی معنوں میں وہی نسبت ہے جو مچھر اور کسی عظیم الجثہ شے کے درمیان ہو سکتی ہے، یہی سبب ہے کہ جنت کی لذتوں اور نعمتوں کی نسبت قرآن نے یہ بھی کہا ہے۔

﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِىَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ (سجدہ۔۲)

تو کسی نفس کو معلوم نہیں کہ ان کے لیے ان کے (اچھے) اعمال کے بدلہ میں آنکھوں کی جو ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔

اس ''آنکھوں کی ٹھنڈک'' یعنی لذت و راحت کی کیفیت دنیاوی تخیل سے چونکہ بہت بلند ہے اس لیے یہ فرمایا گیا کہ جنت کی راحت و لذت کی حقیقت علم و فہم سے پوشیدہ اور مخفی ہے، آنحضرت ﷺ نے اسی مفہوم کو اپنے ان مبارک الفاظ سے واضح فرما دیا۔

﴿ قال اللّٰہ اعددت لعبادی الصلحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر ﴾[1]

خدا فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ مہیا کیا ہے جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال آیا۔

اگر جنت کے باغوں، نہروں، میووں، غلاموں، شرابوں، ریشمی کپڑوں اور طلائی زیوروں کی وہی اخروی حقیقت

---

[1] صحیح بخاری باب کلام الرب، و تفسیر سورۂ سجدہ صحیح مسلم کتاب الجنۃ و ترمذی تفسیر سجدہ۔

ہے جو ان لفظوں سے لغوی طور پر ہم اس دنیا میں سمجھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بہشت کی لذتوں اور مسرتوں کو ایک مخفی حقیقت نہ فرماتا اور نہ آنحضرت ﷺ اس کی توضیح میں اس درجہ بلند کرتے ہیں کہ وہ ایسی چیزیں ہیں جن کو آنکھوں نے دیکھا، نہ کانوں نے سنا، اور نہ کسی انسان کے خیال میں گزریں، مزید تاکید روایت کے دوسرے الفاظ میں ہے،

﴿ بلہ ما اطلعتم علیہ ﴾

جو تم جانتے ہو اس کو چھوڑ دو

صحیح مسلم[1] کی روایت میں یہ الفاظ ہیں ﴿بلہ ما اطلعکم اللہ علیہ﴾ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ "بلکہ خدا نے تم کو اس پر مطلع بھی نہیں کیا ہے" دوسرے یہ کہ "خدا نے اس کا جو حال بتایا ہے، اس سے بھی درگزر کرو" غرض ان لفظوں سے جو بھی تم سمجھ سکتے ہو اس کو چھوڑ کر آگے بڑھو اصحاب تفسیر نے حضرت ابن عباسؓ سے بسند نقل کیا ہے

﴿ وقال السفیان الثوری عن الاعمش عن ابی ظبیان عن ابن عباس لا یشبہ شئی مما فی الجنۃ ما فی الدنیا الا فی الاسماء﴾

سفیان ثوری اعمش سے اور وہ ابوظبیان سے اور وہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ جنت میں جو کچھ ہے وہ دنیا کی چیزوں سے ناموں کے سوا اور کسی بات میں مشابہ نہیں۔

دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں۔

﴿ لیس فی الدنیا مما فی الجنۃ الا الاسماء ﴾[2]

جنت میں جو کچھ ہے وہ ناموں کے سوا دنیا میں نہیں۔

غرض ان الفاظ سے انہی دنیاوی مشاہدات کی چیزوں کو سمجھنا ضروری نہیں بلکہ ان سے بدرجہا بلند لذائذ اور مسرتیں مراد ہیں، جن کی تعبیر کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کسی وجہ مناسب کے سبب سے ان کو ان دنیاوی لفظوں سے ادا کیا جائے اور اس پر بھی مفہوم ادا نہ ہو سکے، اس میں اشکال نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی عدم قدرت کلام کے سبب سے نہیں ہے بلکہ عاجز انسانوں کی ذہنی درماندگی کے سبب سے ہے کہ نادیدہ و ناشنیدہ اور دردل ناخلیدہ مفاہیم کے لئے ان کی زبان ولغت میں کوئی لفظ ہی نہیں۔

جنت کی مسرتیں اعمال کی تمثیل ہیں:

یہ اصول بارہا بیان میں آچکا ہے کہ دوزخ کی تکلیفیں ہوں یا جنت کی مسرتیں، دونوں اعمال انسانی کی تمثیلیں ہیں، اسی لئے قرآن پاک نے بتصریح تمام یہ کہا ہے۔

﴿ اِنَّمَا تُجۡزَوۡنَ مَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴾ (طور۔۱)

وہی بدلہ پاؤ گے جو تم کرتے تھے۔

حدیث میں آتا ہے کہ قیامت میں خدا فرمائے گا "اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی عمل ہیں جو تم کو واپس مل

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا۔

[2] تفسیر ابن جریر طبری آیت مذکورہ وبیہقی فی البعث کما فی الدر المنثور للسیوطی تفسیر آیت مذکورہ۔

رہے ہیں تو جو نیکی پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جو برائی پائے وہ اپنے آپ کو ملامت کرے۔“

مثلاً وہ نیکوکار جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہمیشہ ترساں ولرزاں رہتے تھے، ان کو جنت میں امن وامان اور سلامتی کے ساتھ وہاں کی تمام راحتیں ملیں گی تو

﴿ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ۝ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴾

(طور۔۲۶۔۲۷)

کہیں گے ہم اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرتے تھے، تو خدا نے ہم پر مہربانی فرمائی اور ہم کو دوزخ کی لو کے عذاب سے بچالیا۔

اس آیت سے صاف نمایاں ہے کہ جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر وغضب سے ڈرتے تھے وہ قیامت میں گرم لو کے عذاب سے بچائے جائیں گے قہر وغضب کی تمثیل شعلہ، آتش، لو وغیرہ گرم چیزوں سے ہے، تو جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر وغضب سے ترساں تھے دیکھو کہ قیامت میں ان کو بادسموم یا گرم ہوا کی لو سے بچائے جانے کی بشارت ملی۔

دولت مندی وقوی دست منکرین، کمزور اور غریب مسلمانوں کو دیکھ کر دنیا میں ان پر تحقیرانہ ہنستے تھے قیامت میں اس کا الٹا ہوگا کہ یہ ان پر ہنسیں گے، فرمایا

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ .... فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴾ (تطفیف)

بے شک گنہگار ایمان والوں پر ہنستے تھے.............. تو آج ایمان والے کافروں پر ہنسیں گے

نیکوکاروں کے دنیا کے آنسو یہاں تبسم اور خندہ مسرت میں بدل گئے اور گنہگاروں کی وہاں کی ہنسی یہاں آنسوؤں کا تار بن کر ظاہر ہوئی۔

گنہگار جو دنیا میں اپنی دولت وقوت کے نشہ میں چور اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ خوش اور مسرور رہتے تھے، وہ یہاں غمگین ہونگے اور جو وہاں غمگین تھے وہ یہاں خوش اور مسرور ہونگے۔

﴿ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۝ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝ اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴾ (انشقاق۔۱)

تو وہ موت کو پکارے گا اور دوزخ میں داخل ہوگا کیونکہ وہ اپنے اہل وعیال میں (مغرورانہ) خوش تھا۔

اور غریب ومسکین جو وہاں اہل وعیال میں بیٹھ کر بھی مسرت سے ناآشنا تھے، ان کا یہ حال ہوگا کہ:

﴿ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ﴾ (انشقاق۔۱)

تو اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور وہ خوش خوش اپنے لوگوں کے پاس لوٹے گا۔

قرآن پاک میں بارہا یہ آیتیں یا بعینہ ان ہی معنوں کی آیتیں آئی ہیں۔

﴿ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ (بقرہ۔۳)

اور ایمان والوں اور اچھے کام کرنے والوں کو باغ کی خوشخبری سنا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

ان آیتوں میں ایمان اور عمل صالح کے بالمقابل باغ اور اس کی نہروں کا ذکر پابندی کے ساتھ آتا ہے، اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی خاص تمثیلی تعلق ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ درخت اصلی چیزیں ہیں جن کی ترقی اور

نشو ونما پانی سے ہوتی ہے بعینہٖ اسی طرح ایمان اصل ہے جس کی جڑوں کی سیرابی اعمال کی آبیاری سے ہوتی ہے۔ اگر ایمان ہو اور اعمال صالح نہ ہوں تو وہ ایک ایسا درخت ہوگا جس کی ترقی اور نشو ونما کی امید نہیں اور اگر صرف عمل صالح ہے اور ایمان نہیں تو ریگ میں پانی کی روانی ہے جس کا وجود وعدم یکساں ہے، اس تمثیل کے ذہن میں آنے کے ساتھ قرآن پاک کی یہ آیت سامنے آتی ہے۔

﴿ وَاُدْخِلَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ ○ اَلَمْ تَرَ كَیْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَیِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ ○ تُؤْتِیْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍ ۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَیَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ﴾ (ابراہیم۔۲۳۔۲۵)

اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ ان باغوں میں داخل کئے گئے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ان میں سدا رہیں گے، وہاں سلامتی کی مبارکباد ہے، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے کیسی ایک مثال بیان کی، نیک بات ایک ستھرے درخت کی طرح ہے، جس کی جڑ مضبوط ہو، اور ٹہنی آسمان میں ہو، اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ہمہ وقت پھل لایا کرتا ہے، اور خدا مثالیں بیان کرتا ہے کہ لوگ شاید سوچیں۔

اس آیت میں جنت اور کلمہ طیبہ کے درخت کی پوری تمثیل ہے، یہاں تک تقابل ہے کہ پہلے میں جب یہ کہا گیا کہ ”اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ان باغوں میں سدا رہیں گے“۔ تو دوسرے میں ہے کہ ”وہ درخت اپنے پروردگار کے حکم سے سدا پھل دیتا رہے گا“ کلمہ طیبہ سے یہاں مراد ایمان[1] ہے، جس کی جڑ مضبوط و مستحکم اور اسکی شاخیں آسمان میں اور اس کے پھل سدا پھلنے والے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عثمان بن مظعونؓ صحابی کی وفات کے بعد انکی ایک ہمسایہ صحابیہ نے خواب میں دیکھا کہ ایک نہر بہہ رہی ہے، اور جب یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت عثمان بن مظعونؓ کی ہے، انھوں نے آکر یہ خواب آنحضرت ﷺ سے بیان کیا، آپ نے اسکی تعبیر میں فرمایا ذلك عمله یجری له یعنی یہ نہر اس کا عمل ہے جو اس کے لیے بہہ رہی ہے (بخاری کتاب التعبیر)

ان دونوں سابقہ حوالوں سے یہ ہویدا ہوتا ہے کہ ایمان کی تمثیل سدا بہار درخت ہے، اور عمل کی تمثیل نہر رواں ہے، اس بنا پر اہل جنت کے لئے بار بار جس باغ اور نہر جاری کی بشارت دی گئی ہے، وہ حقیقت میں ان کے ایمان اور عمل صالح کی تمثیلی شکلیں ہونگی، ان کا ایمان خوشنما اور سدا بہار باغ اور ان کے اعمال صالحہ صاف وشفاف نہر کی صورت میں نمایاں ہونگے، اور وہ ان سے لطف ولذت اٹھائیں گے۔

اسی قیاس پر جنت کی دوسری لذتوں اور مسرتوں کی حقیقت کی تشریح کی جاسکتی ہے، علوم نبوی کے ایک بڑے واقف کار اور اسرار شریعت کے ایک بڑے دانائے راز شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں۔

﴿ واكثر الوقائع الحشرية من هذا القبيل ....وبالجملة فتشبحات و تمثلات

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکورہ۔

لماعندها............وتتشبح النعمة بمطعم هنئی و مشرب مريئی و منكح شهی ومبلس رضی و مسكن بهی﴾ (ص۳۶۔ہند)

حشر کے واقعات از قبیل تمثیل ہیں............ حاصل یہ کہ یہ تمام امور معانی کا جسمانی قالبوں میں اور مثالی صورتوں میں ظاہر ہونا ہے............ اللہ تعالیٰ کی عنایت و مہربانی خوش مزہ کھانے، خوشگوار پینے کی چیزوں، رغبت انگیز لذت نکاح، دل پسند لباس اور عمدہ مسکن کی صورتوں میں نمایاں ہوگی۔

ہم نے آیات و احادیث کے حوالوں سے پہلے کئی دفعہ یہ دکھایا ہے کہ اس تمثیل و تشبیہ کے کیا معنی ہیں، اور کیونکر غیر مجسم معانی اپنے مناسب قالبوں میں مجسم ہو کر وجود پذیر ہوتے ہیں۔ دنیا کے تمام اعمال صالحہ کی اگر تحلیل کی جائے تو انکی اولاً دو قسمیں نکلیں گی، خدا پر ایمان اور خلوص دل سے اس کی طاعت، جس کو ''حقوق اللہ'' کہتے ہیں اور دوسری بندگان الٰہی کے ساتھ حسن سلوک، بندگان الٰہی کے ساتھ جو نیک سلوک کیا جاسکتا ہے وہ یہی ہے کہ ان کی عزت و آبرو کا پاس کیا جائے، جس کو عفت و عصمت کہتے ہیں اور ان کی ضروریات زندگی کے مہیا کرنے میں امداد کی جائے اور ضروریات زندگی یہی کھانا، پینا، پہننا اور رہنا ہیں، انہیں کی نسبت ہم ان کے ساتھ حسن سلوک کر سکتے ہیں، اب یہ پانچ قسمیں ہوئیں، جنت کی نعتیں انہیں پانچ قسموں پر منحصر ہیں۔ ایمان و اخلاص اطاعت کی جزا وہ خود اللہ تبارک تعالیٰ ہے، وہ اپنے قرب اور دیدار سے نوازے گا، عفت و عصمت کی جزا حسین و مہ جبیں بیویوں کی صورت میں نمایاں ہوگی، دوسروں کے کھلانے کی جزا جنت کے باغ اور پھل اور قسم قسم کے الوان طعام ہیں، دوسروں کو پلانے کی جزا خوش مزہ و خوشگوار پینے کی مختلف چیزوں کی فراوانی ہے، پہنانے کی جزا ریشم و حریر و دیبا و اطلس اور بہتر سے بہتر خوشنما لباس ہے اور رہنے اور رکھنے میں حسن سلوک کی جزا خوش منظر مکان و قیام گاہ ہے

ایک اور پہلو سے دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی بہشت کی صفت یہ بیان فرمائی ہے۔

﴿ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴾ (طہ۔۱۱۹۔۱۱۸)

بے شک تیرے لیے اس بہشت میں نہ بھوکا ہونا ہے، نہ ننگا اور پیاسا ہونا، نہ دھوپ میں رہنا۔

یہی چار مختصر انسانی ضرورتیں ہیں جو پھیل کر ایک دنیا ہوگئی ہیں، جب آدم کی اولاد کو اپنے اعمال صالحہ کی بدولت نجات ملے گی تو پھر ان کے لئے وہی بہشت ہے، جس میں نہ بھوکا ہونا ہے، نہ پیاسا ہونا ہے، نہ ننگا ہونا، نہ گرمی اور نہ دھوپ کی تکلیف میں گرفتار ہونا، اس حقیقت کی تعبیر دو طرح سے کی جاسکتی ہے، یا تو یہ کہ بہشت میں اہل بہشت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ان تمام انسانی ضرورتوں سے یکسر پاک و بے نیاز ہو جاتے ہیں، اس لئے وہاں نہ کوئی بھوکا ہوگا، نہ پیاسا ہوگا، اور نہ ننگا ہوگا اور نہ دھوپ اور لو کی محنت میں گرفتار، دوسرے یہ کہ بہشت میں اہل بہشت کو کھانے کے لیے ایسے الوان نعمت ملیں گے جن کو کھا کر انسان پھر بھوکا نہ ہوگا اور پینے کے لئے شراب و شربت کی وہ نہریں بہیں گی جن کو پی کر پیاسا نہ ہوگا، اور پہننے کو وہ کپڑے ملیں گے جو پھر نہ میلے ہونگے اور نہ بوسیدہ ہو کر پھٹیں گے اور رہنے کے لیے ایسے ایسے گھنے باغ اور بلند مکانات ملیں گے جہاں دھوپ کا گزر نہ ہوگا۔

یہ اصول پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ دنیا میں انسان کے لئے جو لطف و لذت ہے وہ تھوڑی سی تکلیف کا نتیجہ ہے انسانی اصول یہ ہے کہ بڑی لذت کے حصول کے لئے تھوڑی تکلیف گوارہ کرتا ہے اور بڑی مسرت پر چھوٹی مسرت کو قربان

کرتا ہے' اسی اصول پر اس کے تمام اعمال کی کامیابی و ناکامیابی کی بنا ہے' اعمال صالحہ کے بجالانے میں انسان کو اس دنیا میں چھوٹی چھوٹی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، اور اپنی عارضی خوشیوں اور لذتوں کو ان پر قربان کرنا ہوتا ہے، صبح کے نمازی کو خواب سحر کی لذت کو خیر باد کہنا اور دوپہر کی جلتی دھوپ میں ظہر کے لئے مسجد میں جانا پڑتا ہے' خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانا پڑتا ہے' اور اپنی بہت سی ناجائز مگر بظاہر دلچسپ خوشیوں کا ایثار کرنا پڑتا ہے' اسی طرح پاکیزہ زندگی گذارنے پر اس کو آخرت کی غیر فانی دولت اور ابدی سعادت میسر آتی ہے۔

انسان کو دنیا میں ان اعمال صالحہ کی خاطر جن چیزوں کو قربان کرنا پڑتا ہے ان میں پہلی چیز تو خود اس کی زندگی ہے' پھر انسانی زندگی کی وہ چار قسمیں ہیں جن کا نام کھانا' پینا' پہننا اور رہنا ہے اس لئے آخرت میں ان قربانیوں کی جزاء میں انہیں کی مناسب و مماثل چیزیں جو ملیں گی وہ غیر فانی زندگی الوان طعام' اقسام شراب و شربت' انواع لباس اور بہترین مسکن ہیں' قرآن پاک میں ہے۔

﴿ فَاَمَّا مَنْ طَغٰیo وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَاo فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰیo وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰیo فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی ﴾ (نازعات۔۲)

پس جس نے خدا سے سرکشی کی اور دنیاوی زندگی کے ناجائز لطف آرام کو ترجیح دی تو دوزخ اس کا ٹھکانہ ہے' لیکن جو خدا کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو ناجائز خواہشوں سے روکا تو اس کا ٹھکانہ بہشت ہے۔

گو اس کی جزئی نیکیوں کی جزاء تو وقتاً فوقتاً اس دنیا میں تھوڑی تھوڑی کر کے شہرت' تعریف' ہر دلعزیزی اور دولت کی صورت میں ملتی رہتی ہے' مگر پوری زندگی کی مجموعی جزاء دوسری زندگی ہی میں اس کو ملے گی۔

﴿ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ﴾ (آل عمران۔۱۹)

اور تمہاری مزدوری قیامت کے دن پوری ادا کیا جائے گی۔

لطف و مسرت کا تصور:

مسرت ایک نفسی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو اپنی کسی خواہش کے پورے ہوتے وقت حاصل ہوتی ہے' اس بناء پر مسرت کے وجود کے لئے کسی خواہش کی تکمیل ضروری ہے' اب انسانی خواہشوں کی تحلیل کرو تو بالآخر ان کی انتہاء انہیں باتوں پر ہوگی جن کی طلب اس کی فطرت کے اندر ودیعت کر دی گئی ہے' اب غور کرو کہ وہ کیا چیزیں ہیں یا کیا چیزیں اس کے فہم میں آ سکتی ہیں وہ یہی ہیں باغ و بہار' لباس و طعام' حور و قصور' خدم و حشم' سامان و اسباب اور زر و جواہر' مسرت اور راحت کا جب کبھی تخیل آئے گا اور جب کبھی ہم ان کو سمجھنا چاہیں گے اور کہنا چاہیں گے تو ہم کو انہیں چیزوں کا نقشہ کھینچنا پڑے گا اور ہماری انسانی فطرت انہیں مسرتوں اور خوشیوں کو ڈھونڈنے کی عادی ہے اور انہیں کے حصول کی خاطر دنیا میں ہر طرح کی سیہ کاری اور گنہگاری کی مرتکب ہوتی ہے اس لئے ان سے احتراز کرنے پر جو چیزیں ہم کو وہاں ملیں گی' وہ ہمارے انہیں عادی و مانوس اسباب مسرت کی صورتوں میں ہمارے سامنے پیش ہوں گی اور ہم ان سے لطف اندوز ہوں گے۔

لطف و مسرت کا اعلیٰ ترین تخیل:

اس دنیائے کون و فساد میں ہم ایک عجیب قسم کی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ ہم کو تخیل کے لحاظ سے اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی وسیع اور غیر محدود دنیا بخشی گئی ہے لیکن عملاً اپنی اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے مطابق اپنی دنیا بنالینے پر قدرت نہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم نے صبر و شکر کا دامن نہیں پکڑا تو ہم سے زیادہ اس دنیا میں تصور و تخیل کی تکلیف میں کوئی اور گرفتار نہیں، جنت آخرت کی اس دنیا کا نام ہے جو ہمارے اعلیٰ ترین تخیل اور ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کے مطابق ہوگی۔

﴿ جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِیْهَا مَا یَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ یَجْزِی اللّٰهُ الْمُتَّقِیْنَ ﴾ (نحل۔۳۰)

رہنے کے باغ، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں ان کے لئے ان باغوں میں وہ ہے، جو وہ چاہیں، اللہ اسی طرح پرہیز گاروں کو بدلہ دے گا۔

﴿ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴾ (حم السجدہ۔۴)

اور تمہارے لئے جنت میں وہی ہے جو تمہارے دل چاہیں اور تمہارے لئے اس میں وہ ہے، جو تم مانگو۔

﴿ لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ فِیْهَا وَلَدَیْنَا مَزِیْدٌ ﴾ (ق۔۳)

ان کے لئے جنت میں وہ ہے، جو وہ چاہیں اور ہمارے پاس اس سے بھی بڑھ کر ہے۔

﴿ وَفِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ ﴾ (زخرف۔۷)

اور جنت میں وہ ہے، جس کی دل خواہش کریں اور جو آنکھوں کو لذت دے۔

﴿ لَهُمْ فِیْهَا مَا یَشَآءُوْنَ خٰلِدِیْنَ كَانَ عَلٰی رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴾ (فرقان۔۱۲)

ان کے لئے جنت میں وہ ہے، جو وہ چاہا کریں گے، یہ وعدہ ہے تیرے رب کے ذمہ۔

﴿ لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ (زمر۔۴)

ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس وہ ہے، جو وہ چاہیں گے۔

الغرض جنت وہ مقام ہے جہاں ہم کو وہ کچھ ملے گا جہاں تک ہمارا مرغ خیال اڑ کر پہنچ سکتا ہے، لطف و مسرت کا وہ بلند سے بلند تخیل جو تصور میں آ سکتا ہے وہاں ہمارے لئے مہیا ہوگا۔ صحابہؓ میں ہر قسم کے لوگ تھے جنت کے سامان مسرت کے متعلق وہ اپنی اپنی پسند اور آرزو کے مطابق آپ سے پوچھتے رہتے تھے اور آپ جواب دیتے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ''جنت میں جو سب سے کم رتبہ ہوگا اس کی کیفیت بھی یہ ہوگی کہ خدا تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ تو اپنی انتہائی آرزو دل میں خیال کر، وہ کرے گا تو اللہ فرمائے گا کہ تجھ کو وہ سب دیا گیا جس کی تو نے آرزو کی تھی اور اس کے برابر[1] یہاں تک کہ بازار کا شوق ہوگا تو بازار بھی لگے گا'' لیکن وہ حقیقی خرید و فروخت نہ ہوگی، کہ وہاں کسی چیز کی کمی ہوگی، بلکہ وہ مثالی صورتوں میں ہوگی۔ (الا الصور من الرجال)[2]

---

[1] صحیح مسلم۔

[2] ترمذی، دیکھو مشکوۃ صفۃ الجنۃ۔

کسی کو جنت میں کھیتی کا شوق ہوگا تو دانہ، سبزہ، غلہ اور پھر تیاری یہ سب کام منٹوں میں [1] انجام پا جائے گا، ایک بدوی نے پوچھا "یارسول اللہ وہاں گھوڑے بھی ہوں گے فرمایا کہ "اگر تم کو جنت ملی تو اگر تم یہ بھی چاہو گے کہ سرخ یاقوت کا گھوڑا ہو جو تم کو جہاں چاہو بہشت میں لئے پھرے تو وہ بھی ہوگا" دوسرے نے پوچھا کہ "یارسول اللہ! اونٹ بھی ہوگا" فرمایا "اگر تم جنت میں گئے تو تمہارے لئے وہ سب کچھ ہوگا جو تمہارا دل چاہے گا اور جو تمہاری آنکھیں پسند کریں گی" [2]

جنت میں اہل جنت کے مختلف رتبے ہوں گے اس لئے اعلیٰ کے لباس و سامان کو دیکھ کر ادنیٰ کو اپنی کمی کا خیال ہوگا تو اس کے تصور میں یہ پیدا کر دے گا (حتی یتخیل الیه) کہ خود اس کا لباس و سامان اس سے بہتر ہے، اور یہ اس لئے ہوگا کہ جنت میں کسی کو غم ہونا ممکن نہیں۔ [3]

جنت جہاں کوئی جسمانی وروحانی آزار نہیں:

کسی صاحب دل نے جنت کی یہ تعریف خوب کی ہے کہ

ع بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد

دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی مسرور زندگی بھی ایسی نہیں مل سکتی جس کے پہلو میں مسرت کے پھول کے ساتھ غم کا کوئی کانٹا نہ چبھ رہا ہو، یا تو موجودہ مسرت کے آئندہ ختم ہونے کا خوف ہے اور یا گذشتہ ناکامی کا افسوس ہے، اس بناء پر یہاں کوئی خوشی بھی کامل نہیں، مگر جنت وہ مقام ہوگا جہاں نہ ماضی وحال کا غم ہوگا اور نہ مستقبل کا خوف ہوگا، چنانچہ اہل جنت کے متعلق بار بار ارشاد ہوا۔

﴿ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾

نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اور یہی بہشت کی سب سے بڑی نعمت ہوگی۔ اس میں جسمانی وروحانی ہر قسم کی نعمتیں داخل ہیں۔

دنیا میں کوئی انسان اس وقت تک کوئی لقمہ گلے سے نہیں اتار سکتا اور نہ کوئی چیتھڑا بدن پر رکھ سکتا ہے۔ جب تک اس کے سر کا پسینہ اس کے پاؤں تک نہ آئے، دنیا کی تمام فانی مسرتیں ہماری فانی کوشش کا فانی نتیجہ ہیں، مگر جنت کی خوشیاں بے غم وتکلیف ہماری گذشتہ فانی نیکیوں کا غیر فانی نتیجہ ہیں، اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا رحم وکرم ہے کہ وہاں ہم کو ہماری آسائش کا تمام سامان اس قسم کی ادنیٰ زحمت ومشقت اٹھائے بغیر میسر آئے گا جس کے بغیر دنیا میں کوئی انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا اور جس کی کشمکش سے یہ دنیا ہر انسان کے لئے دوزخ بنی ہے، چنانچہ اہل جنت، جنت میں داخل ہو کر اور شاہانہ تزک واحتشام اور لباس وزیور سے آراستہ ہو کر خدا کی حمد وتعریف کا ترانہ ان لفظوں میں گائیں گے۔

﴿ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا وَّلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ○

---

[1] صحیح بخاری۔

[2] ترمذی۔

[3] ترمذی یہ کل حدیثیں مشکوۃ صفۃ الجنۃ سے لی گئی ہیں۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۝ الَّذِیْ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ﴾ (فاطر۔۳۵۔۳۳)

رہنے کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے اور ان میں وہ سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان کی پوشاک ان میں ریشم ہوگی اور وہ کہیں گے کہ پاک ہے وہ جس نے ہم سے غم دور کر دیا بے شک ہمارا پروردگار گناہوں کا معاف کرنے والا اور نیکیوں کی قدر کرنے والا ہے، وہ جس نے ہم کو اپنی مہربانی سے رہنے کے گھر میں اتارا اور ہم کو وہاں نہ مشقت پہنچی اور نہ اس میں ہم کو تھکنا ہے۔

﴿ لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ ﴾ (حجر۔۴)

اس میں ان کو کوئی آزار نہ ہوگا، اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔

جنت جہاں رشک وحسد نہیں:

موجودہ دنیا خیر و شر کے متضاد عناصر سے بنی ہے، یہاں ثواب کے ساتھ گناہ، رحم دلی کے ساتھ سنگدلی، محبت کے ساتھ کینہ ہے، یہ گناہ و کینہ اور بغض وحسد، وہ آگ ہے جس نے یہاں کے قلبی امن وامان کے خرمن میں آگ لگا رکھی ہے، ہر شخص یہاں دوسروں کو اچھی حالت میں دیکھ کر جلتا ہے، اور دوسروں پر غصہ کے جوش وخروش سے ابلتا ہے، جنت وہ عالم ہے جہاں اس آگ اور سیلاب کا وجود نہ ہوگا۔ ہر قسم کے گناہ، سنگدلی، عداوت اور بغض وحسد کا خاتمہ ہوگا اور خالص محبت و الفت کے دریا موجزن ہوں گے۔ فرمایا۔

﴿ لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ﴾ (مریم۔۴)

اس میں امن وسلامتی کے سوا کوئی بیہودہ بات نہیں سنیں گے۔

﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ﴾ (اعراف۔۵)

اور ہم نے ان کے سینوں سے کینہ کھینچ لیا، ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ﴾ (حجر۔۴)

اور ہم نے ان کے سینے سے کینہ کھینچ لیا، بھائی بھائی بن کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔

اس کی تفسیر میں حدیث صحیح میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ”وہاں نہ دلوں کا اختلاف ہوگا نہ باہم بغض وکینہ۔ سب کے دل ایک دل کی طرح متحد ہوں گے۔[1]

وہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی؟:

بہشت میں زندگی کی جو لذتیں ہوں گی ان کی تعبیر الوانِ نعمت اور انواع شربت وشراب اور دوسرے مادی لذائذ سے ہوسکتی ہے مگر وہ حظ ومسرت اور اطمینان وسکون وسکینت کے علاوہ کسی معنی میں بھی مادی خصوصیات سے آلودہ نہ ہوں گی۔ یہاں ہر کھانے پینے کے ساتھ بول وبراز، پسینہ اور سوء ہضم کی علت لگی ہوئی ہے اور بغیر اس کے انسان یہاں زندہ نہیں رہ سکتا مگر وہاں یہ کچھ نہ ہوگا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”اہل جنت کھائیں گے اور پئیں گے لیکن نہ تھوکیں گے نہ

---

[1] یہ ساری حدیثیں صحیح مسلم صفۃ الجنۃ میں ہیں۔

وہاں بول و براز کی حاجت ہوگی نہ وہاں ناک سے رطوبت نکلے گی نہ بلغم اور کھنکار جیسی گھنونی چیزیں ہوں گی۔ کھانا ایک ڈکار میں ہضم ہوگا، وہاں کے پسینہ میں مشک کی خوشبو ہوگی، جو بہشت میں داخل ہوگا اس کو وہ نعمت ملے گی کہ پھر کبھی تکلیف نہ ہوگی، نہ ان کے کپڑے بوسیدہ ہوں گے اور نہ ان کی جوانی زائل ہوگی۔ وہاں منادی غیب یہ پکار کر کہہ دے گا یہاں وہ تندرستی ہے کہ بیمار نہ پڑو گے، وہ زندگی ہے کہ پھر موت نہ آئے گی، وہ جوانی ہے کہ پھر بوڑھے نہ ہوگے، اور وہ آرام ہے کہ پھر تکلیف نہ پاؤ گے، لوگوں کے چہرے اپنے اپنے اعمال کے مطابق چمکیں گے، کوئی ستارہ کی طرح، کوئی چودھویں کے چاند کی طرح۔ [۱]

غور کرو کہ وہ جسمانی زندگی ہماری موجودہ جسمانی زندگی سے کتنی مختلف ہوگی، اس پر تعجب نہ کرنا چاہئے انسان کبھی شکم مادر میں ایک بچہ کی صورت میں زندہ تھا مگر وہاں اس کی زندگی، اس کی غذا، اس کے فضلۂ غذا، اس کی سانس اور دوسرے لوازمِ حیات بیرون شکم کے دنیاوی اصول حیات وقوانین زندگی سے بالکل مختلف تھے۔ اور جس طرح شکم مادر میں بچہ کا اس بیرونی زندگی کے حکایات کو تعجب کے ساتھ سن کر آمادہ انکار رہنا دانشمندی نہ ہوگی، ایسے ہی اس مادی زندگی کے خوگر اور اس عالم آب وگل کے باشندے اس دوسری زندگی کے اصولِ حیات، طرزِ غذا اور دوسرے لوازم حیات کو سن کر آمادہ انکار ہوں تو ان کا بھی یہ فعل دانش مندی کے خلاف ہوگا۔

جنت ارتقائے روحانی ہے:

مادی وجسمانی خلقت وفطرت کی لاکھوں برس کی تاریخ کے مطالعہ اور تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ مادہ نے لاکھوں برس کے تغیرات کے بعد اس انسانی جسمانیت تک ترقی کی ہے، وہ پہلے جماد بنا، پھر نبات کی شکل میں آیا، پھر حیوان کا قالب اختیار کیا، پھر جسم انسانی کی صورت میں نمودار ہوا، اور یہ مادیت کی معراج ترقی ہے، جمادیت مٹ کر نباتیت پیدا ہوئی، اور نباتیت فنا ہو کر حیوانیت نمودار ہوئی، پھر حیوانیت معدوم ہو کر انسانیت ظہور پذیر ہوئی، اور ارتقاء انسانی کا جسمانی پہلو تکمیل کو پہنچ گیا، لیکن انسانیت کا دوسرا رخ جو روحانیت سے عبارت ہے، ہنوز اپنے آغاز طفولیت میں ہے، کیا اس پر بھی اسی ارتقائی دور کے مدارج نہیں آئیں گے، ایک مادہ پرست صرف بام ارتقا تک زینہ بزینہ چڑھ کر ٹھہر جاتا ہے، لیکن مذہب اس سے بھی آگے لے چلتا ہے، اور یہاں سے وہ اڑ کر سقف آسمان تک پہنچتا ہے، اور ملکوتیت کی سرحد کی ترقی شروع کرتا ہے، قرآن پاک کی ان آیتوں پر غور کرنے سے اس نظریہ کے اشارات نکلتے ہیں۔

> ﴿ اَلَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ﴾ (مومنون۔ ۱۴-۱۱)
>
> جو فردوس کی وراثت پائیں گے، اور وہ اس میں صدا رہیں گے اور ہم (خدا) نے انسان کو مٹی کی کشید سے بنایا، پھر اس کو (رحم نسوانی کے) ایک ٹھہراؤ کی جگہ میں ایک بوند بنایا پھر اس بوند کو بندھا ہوا خون بنایا، پھر اس خون کو لوتھڑا بنایا، پھر ہڈیوں کو گوشت پہنایا، پھر اس کو ایک نئی صورت میں اٹھا کر کھڑا کیا، تو برکت والا ہے سب سے بہتر بنانے والا (خدا)۔

---

[۱] ایضاً۔

لیکن یہ ترقی یہیں تک پہنچ کر رک نہیں جائے گی بلکہ آگے بھی ہوگی اس لئے جس طرح ماں کے پیٹ کی تنگ و تاریک دنیا میں زیست و حیات کے کچھ قواعد تھے پھر عالم کی اس سے بھی وسیع تر دنیا میں اس نے قدم رکھا جہاں ترقی و حیات کے دوسرے ہی اصول ہیں، اسی طرح اس مادی دنیا سے نکل کر اس وسیع تر دنیا میں قدم رکھے گا جہاں ترقی اور سعادت کے اور دوسرے اصول ہوں گے' چنانچہ اس کے بعد فرمایا۔

﴿ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ○ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ﴾ (مومنون۔۱)

پھر بے شک اس کے بعد مرنے والے ہو اور پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔

جس طرح انسانیت سے پہلے لاکھوں برس میں ایک نوع کی کیفیت مٹ کر دوسری نوع کی کیفیتیں پیدا ہوتے ہوتے انسانیت تک نوبت پہنچی' موت کے معنی یہ ہیں کہ اب نوع انسانی کی تمام کیفیتیں مٹ کر ایک بلند تر نوع کی کیفیتوں کی تیاری شروع ہوئی' صدہا ہزارہا سال کے بعد قیامت سے دوسری نوع ملکوتی کا ظہور ہوگا۔

یہاں مسئلہ ارتقاء کا دوسرا اصول سامنے آتا ہے جس کو بقائے اصلح کہتے ہیں کہ ان مدارج ترقی کے اثناء میں ہزاروں وہ نوعیں فنا ہوتی رہتی ہیں جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور وہی باقی رہ جاتی ہیں جن میں آئندہ بقا کی پوری استعداد ہوتی ہے جس طرح پچھلی استعداد سے آئندہ کی استعداد پیدا ہوتی ہے اسی طرح اس دوسری ملکوتی نوع کی استعداد انہی کو ملتی ہے جن کے اندر اپنی پچھلی مادی و جسمانی زندگی میں اس کی استعداد پیدا ہو چکی تھی۔ دوزخ کے درجے ان لوگوں کے مقامات ہیں جو گویا ہنوز جمادی و نباتی و حیوانی منزلوں میں ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اس دار الامتحان میں اپنی کمی استعداد کے بقدر رہ کر آگے کی استعداد پیدا کر لیں اور ملکوتیت کی ترقی حاصل کر سکیں۔

بہشت کے مختلف مدارج ان کی استعدادوں کے مقامات ہیں جو اپنی پہلی زندگی میں اس ترقی کی استعداد پیدا کر چکے تھے' لیکن یہاں پہنچ کر بھی ان کی روحانی ترقی کا دروازہ بند نہ ہوگا' بلکہ وہ بقدر استعداد تکمیل کے مدارج طے کرتے چلے جائیں گے' شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

﴿ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴾ (تین۔۱)

ان بہشتیوں کے لئے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے۔

ایک دوسری آیت میں ہے کہ نشاۃ ثانیہ میں اہل ایمان کے آگے پیچھے داہنے بائیں نور ہوگا پھر بھی دعا کریں گے۔

﴿ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ (تحریم۔۲)

ان کا نور ان کے سامنے اور داہنے دوڑے گا اور وہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے نور کو کامل اور ہم کو معاف کر' تو ہر بات کر سکتا ہے۔

مومنوں کے لبوں پر اللہ کے بخشے ہوئے نور کی مزید تکمیل اور اتمام کی دعا ادھر اشارہ کر رہی ہے کہ ان کے مدارج میں ترقی ہوتی رہے، جس کا اقتضاء خدا کی ربوبیت کا منشاء ہے۔

امن وسلامتی کا گھر:

انسان امن وسلامتی کا بھوکا ہے لیکن وہ اس امن وسلامتی کو اسبابِ راحت کے انبار میں تلاش کرتا ہے اور نہیں پاتا، وہ دنیا میں امن کا گوشہ ڈھونڈھتا ہے، اور وہ اس کو نہیں ملتا لیکن یہاں آ کر اس کو نہ صرف امن کا گوشہ بلکہ امن وسلامتی کی ایک دنیا ملے گی۔ وہ پرندہ جو عمر بھر چار عناصر کے قفس میں گرفتار رہا، یہاں وہ سدرۃ المنتہی کی ہر شاخ پر آزادانہ پرواز کرے گا۔ جنت کے جہاں وحی محمدی نے اور بہت سے نام بتائے ہیں وہاں اس کا ایک نام دارالسلام بھی بتایا ہے، جس کے معنی امن وسلامتی کے گھر کے ہیں۔

اہل جنت کی نسبت ارشاد فرمایا۔

﴿ لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ (انعام۔۱۵)
ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس سلامتی کا گھر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جس شریعت کو دے کر اپنے پیغمبر کو مبعوث فرمایا، وہ حقیقت میں اسی امن وسلامتی کی نوید بشارت ہے اسی لئے فرمایا۔

﴿ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلَامِ ﴾ (یونس۔۳)
اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے امن وسلامتی کے گھر کی دعوت پیش فرمائی، عبداللہ بن سلام جو ایک یہودی عالم تھے، آنحضرت ﷺ کی جس صدائے نبوت نے سب سے پہلے ان کے دل میں گھر کیا وہ یہ تھی ''لوگو! سلامتی پھیلاؤ، بھوکوں کو کھلاؤ، جب دنیا غفلت کی نیند سوئے تو تم اٹھ کر اللہ کی عبادت کرو، امن وسلامتی کے گھر میں رہنا تم کو نصیب ہوگا۔

جنت کے ذکر میں امن وسلامتی کا تذکرہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے درو دیوار سے امن وسلامتی کے ترانے سنائی دیں گے۔

﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ (رعد۔۳)
اور فرشتے ہر دروازہ سے ان کے سامنے یہ کہتے ہوئے آئیں گے کہ تم پر سلامتی ہو کہ تم نے صبر کیا تھا تو کیسا اچھا پچھلا گھر ہے۔

وہاں امن وسلامتی کے سوا کچھ اور سنائی نہ دے گا۔

﴿ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴾ (واقعہ۔۱)
لیکن سلامتی سلامتی کی پکار۔

فرشتے اہل جنت کو یوں کہیں گے۔

﴿ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ط ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ﴾ (ق۔۳)
اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو، یہ زندگی جاوید کا دن ہے۔

﴿ لَا یَسۡمَعُوۡنَ فِیۡهَا لَغۡوًا اِلَّا سَلٰمًا ﴾ (مریم-۴)

اس میں سلامتی کے سوا اور کوئی بے ہودہ بات نہ سنیں گے۔

جنت کا ایک اور نام قرآن میں مقام امین (امن والا مقام) بتایا گیا ہے' فرمایا:

﴿ اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ مَقَامٍ اَمِیۡنٍ ﴾ (دخان-۳)

بے شک پرہیزگار لوگ امن والے مقام میں ہوں گے۔

مقام رحمت:

خدا کی رحمت کب نہیں؟ اور کہاں نہیں؟ مگر دنیا کے فطری قوانین کے بموجب اس دنیا میں ایسے واقعات اور حادثے بھی پیش آ جاتے ہیں جن کو ہم رحمت کے بجائے قہر الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں' پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ خود ہم کو ہمارے اعمال کی بدولت خداوند تعالیٰ کے قہر و غضب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے لیکن ایک عالم وہ ہے جہاں اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر و غضب کا نام و نشان نہ ہوگا' اس کی رحمت اور فیض و کرم کی وہاں بارش ہوگی' اور اسکی رحمت کے سوا وہاں کوئی اور منظر کہیں اور کبھی دکھائی نہ دے گا۔

﴿ یُبَشِّرُهُمۡ رَبُّهُمۡ بِرَحۡمَةٍ مِّنۡهُ وَرِضۡوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمۡ فِیۡهَا نَعِیۡمٌ مُّقِیۡمٌ ﴾ (توبہ-۳)

ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت' خوشنودی اور ان باغوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کیلئے ہمیشہ کا آرام ہے۔

اہل جنت کو جن کے چہرے خوشی سے دمکتے ہوں گے' یہ آواز سنائی دیگی۔

﴿ وَاَمَّا الَّذِیۡنَ ابۡیَضَّتۡ وُجُوۡهُهُمۡ فَفِیۡ رَحۡمَةِ اللّٰهِ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴾ (آل عمران-۱۱)

لیکن جن کے چہرے روشن ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے' اس میں وہ سدا رہیں گے۔

مقام نور:

جنت کا نور وہ مقام ہے' جہاں ظلمت و تاریکی کا نام و نشان نہ ہوگا' جنتیوں کے چہرے روشن ہوں گے' کوئی ستاروں کی طرح چمکے گا اور کوئی چاند کی طرح' ہر طرف ان پر انوار کی بارش ہوگی' آگے پیچھے داہنے بائیں ہر سمت سے نور درخشاں ہوگا' فرمایا:

﴿ نُوۡرُهُمۡ یَسۡعٰی بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَبِاَیۡمَانِهِمۡ ﴾ (تحریم-۲)

ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے دوڑے گا۔

اس دن اہل ایمان کے نور ایمان کی بجلیاں ہر طرف کوندیں گی۔

﴿ یَوۡمَ تَرَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ یَسۡعٰی نُوۡرُهُمۡ بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَبِاَیۡمَانِهِمۡ بُشۡرٰىكُمُ الۡیَوۡمَ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴾ (حدید-۲)

جس دن تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا' کہ ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے چمکے گا' آج تم کو خوشخبری ہو' وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں' ان میں ہمیشہ رہا کرو گے' یہی بڑی کامیابی ہے۔

اس دن اہل نفاق اہل ایمان سے آرزو کریں گے کہ ذرا ٹھہر جائیے کہ ہمارے ظلمت کدہ میں بھی ایک دم کے

لئے روشنی ہو جائے۔

﴿ یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ﴾ (حدید۔۲)
جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں اہل ایمان سے کہیں گی کہ ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی کر لیں۔

مقامِ رضوان:

جنت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز مقامِ رضوان ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے راضی اور خوش ہونا اس کے بعد نہ کبھی وہ اپنے اس بندہ پر عتاب فرمائے گا اور نہ اس سے ناراض ہوگا، بلکہ اس کو اپنی رضامندی اور خوشنودی کی لازوال دولت عطا فرمائے گا، متقیوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں رکھی ہیں ان میں جنت، نہریں، پاک بیویاں اور ان سب کے بعد روح کی مسرت رکھی ہے، لیکن ان سب کے بعد بھی اپنی سب سے آخری نعمت اپنی اسی رضامندی کو ظاہر فرماتا ہے، چنانچہ سورہ توبہ میں رحمت اور رضوان کے بعد جنت کے ذکر کو جگہ دی گئی ہے۔

﴿ یُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِیْهَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ ﴾ (توبہ۔۳)
ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت اور خوشنودی (رضوان) کی خوشخبری دیتا ہے اور ان باغوں کی جن میں نعمت الٰہی قائم رہے گی۔

سورۂ حدید میں بھی اسی طرح مغفرت اور رضائے الٰہی کے بعد بطور تکملہ کے جنت کا ذکر آتا ہے، فرمایا

﴿ وَفِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ط وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ○ سَابِقُوْآ اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ط ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴾ (حدید۔۳)
اور آخرت میں سخت عذاب ہے، اور خدا کی بخشش اور رضامندی بھی ہے، اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے، اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا پھیلاؤ آسمان اور زمین کے پھیلاؤ کے برابر ہے، یہ ان کے لئے بنائی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر یقین رکھتے ہیں، یہ اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، اور اللہ بڑا مہربانی والا ہے۔

سورۂ آل عمران میں جنت کی تمام نعمتوں کو گنا کر ان کا خاتمہ رضوان کی عظیم الشان بشارت پر کیا گیا ہے، فرمایا۔

﴿ لِلَّذِیْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ﴾ (آل عمران۔۲)
جنہوں نے پرہیزگاری کی، ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں وہ سدا رہیں گے اور پاک بیویاں اور اللہ کی خوشنودی۔

سورۂ توبہ میں جنت کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر نعمت رضوان الٰہی کو قرار دیا ہے۔

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ط وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ط ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴾ (توبہ۔۹)

اللہ نے باایمان مردوں اور عورتوں سے ان باغوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں' ان میں سدا رہیں گے' اور رہنے کے ستھرے گھر اور اللہ کی رضا مندی سب سے بڑی ہے، وہی بڑی کامیابی ہے۔

بہشت کی مطمئن روحوں کو اس دنیا سے رخصت ہوتے ہی یہ نوید مسرت سنائی جاتی ہے۔

﴿ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴾ (فجر۔۱)

اے اطمینان والی روح! تو اپنے رب کے پاس اس طرح واپس جا کہ تو اس سے راضی ہو اور وہ تجھ سے راضی ہو

اہل جنت کی یہ صفت آئی ہے۔

﴿ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾ (مائدہ۔۱۶)

خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش۔

انہیں آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے یہ بشارت سنائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت کو آواز دے گا کہ اے جنت والو! وہ جواب دیں گے اے ہمارے رب! ہم حاضر ہیں سب بھلائیاں تیرے پاس ہیں۔ فرمائے گا (جنت کی نعمتیں پا کر) اب تم خوش ہوئے؟ عرض کریں گے پروردگار کیوں خوش نہ ہوں کہ تم نے ہم کو وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا۔ فرمائے گا کہ میں ان تمام گذشتہ نعمتوں سے بڑھ کر جو چیز ہے وہ تم کو نہ دوں؟ کہیں گے اے پروردگار! ان سے بہتر کیا ہے؟ فرمائے گا یہ کہ اپنی رضامندی وخوشی تم پر اتاروں' پھر اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔ [1]

مقام طیّب وطاہر:

موجودہ دنیا کی ہر چیز آلودگیوں اور نجاستوں سے بھری ہے' لیکن بہشت وہ مقام ہے جو پاکی' ستھرائی' لطافت اور طہارت کا مظہر ہے' اس میں وہی داخل ہوں گے جو گناہوں سے پاک ہو چکے ہوں' فرمایا:

﴿ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ﴾ (زمر۔۸)

تم پاک ہو چکے تو جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ'

جو زندگی وہاں ملے گی وہ بھی پاک وصاف اور ستھری اور ہر جسمانی وروحانی آلائش سے بری ہوگی' فرمایا:

﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴾ (نحل۔۱۳)

مرد ہو یا عورت جس نے مومن بن کر اچھے کام کئے، ہم اس کو ایک پاک زندگی دے کر جلائیں گے اور ان کو ہم ان کے سب سے بہتر عمل کے مطابق بدلہ دیں گے۔

جو گھر وہاں ملیں گے' وہ بھی پاک وصاف اور ستھرے ہوں گے۔

﴿ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً ﴾ (صف۔۲)

اور پاک گھر۔

جو بیویاں ملیں گی' وہ پاک ہوں گی۔

---

[1] صحیح بخاری ومسلم صفۃ الجنۃ۔

﴿ وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ﴾ (آل عمران۔۲)

اور پاک بیویاں ۔

وہاں کی جو باتیں ہوں گی وہ بھی پاک ہوں گی۔

﴿ وَهُدُوْآ اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ﴾ (حج۔۳)

اور اہل جنت کو پاکیزہ گفتگو کی طرف رہنمائی کی جائے گی۔

ان کو پینے کی جو چیز ملے گی وہ بھی پاک ہوگی۔

﴿ شَرَابًا طَهُوْرًا ﴾ (دہر۔۱)

پینے کی پاک چیز۔

غرض کہ ہر چیز وہاں پاک وصاف، طیب وطاہر اور تمام روحانی وجسمانی آلودگیوں سے مبرا ہوگی۔

مقام تسبیح وتہلیل:

اس آرام ولطف کے بعد اہل جنت کی روحانی لذت اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور تسبیح وتہلیل ہوگی۔ یہ ان کی روحانی غذا ہوگی وہ عالم جہاں ہر طرف انوار الٰہی برسیں گے، جہاں صفائی اور ستھرائی کے سوا کوئی اور منظر نہ ہو، جہاں قدس ونزاہت کی ہر طرف صورتیں نظر آئیں گی وہاں حمد وثناء کے روح افزاء ترانے بھی ہر طرف سے بلند ہوں گے۔

﴿ دَعْوَاهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ط وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (یونس۔۱)

جنت میں ان کی ندا یہ ہوگی کہ اے میرے اللہ! تیری پاکی، اور ان کی آپس کی دعا سلامتی ہوگی اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ دنیا کے پروردگار اللہ (تعالیٰ) کی حمد ہو۔

جنت کی تمام شاہانہ نعمتوں کے بعد بڑی نعمت یہ ہوگی کہ اللہ کی تسبیح وتہلیل کی نئی نئی پرلطف راہیں وہاں ان پر کھلیں گی، فرمایا۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا وَّلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ○ وَهُدُوْآ اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوْآ اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴾ (حج۔۳)

بے شک اللہ ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے، ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، ان میں ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان کی پوشاک اُن میں ریشم کی ہوگی اور وہ راہ دکھائے جائیں گے اچھی بات کی، اور وہ دکھائے جائیں گے اس سراپا حمد (ذات) کی راہ۔

وہ اپنے ہر سرور اور نعمت کے شکریہ میں فرشتوں کے ساتھ مل کر حمد الٰہی کا سرود سرمدی گائیں گے اور یہ وہ وقت ہوگا جب عالم وجود کے ہر گوشہ سے اس کی حمد کا ترانہ بلند ہوگا، فرمایا۔

﴿ وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ○ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا

وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاۗءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ○ وَتَرَى الْمَلٰۗىِٕكَةَ حَاۗفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (زمر-۸)

جنت کے نگہبان ان سے کہیں گے، تم پر سلامتی ہو تم پاک ہو چکے، تو جنت میں چلے جاؤ، اہل جنت کہیں گے اس اللہ کی حمد ہو جس نے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہم کو اس سرزمین کا مالک کیا کہ جنت میں جہاں چاہیں رہیں تو کام کرنے والوں کی کیسی اچھی مزدوری ہے اور یہ دیکھے گا کہ فرشتے عرش الٰہی کو گھیرے اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر رہے ہوں گے اور سب لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ حمد ہو سارے عالم کے پروردگار کی۔

اہل جنت کے متعلق قرآن پاک میں ایک جگہ ہے۔

﴿ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ○ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴾ (مریم-۴)

وہ نہ سنیں گے وہاں بیکار بات مگر سلام اور ان کی روزی اس میں صبح اور شام ہوگی۔

اس صبح و شام کی روزی سے مقصود کیا جنت کے کھانے کے الوان نعمت ہیں، اگر ایسا ہوتا تو صبح و شام کی تخصیص کیا تھی، وہ تو ہر وقت سامنے ہوں گے، میرا گمان یہ ہے کہ اس روزی سے اللہ کی تسبیح و تہلیل کی روحانی روزی اور ربانی غذا مراد ہے، اور حدیث کے ان لفظوں کو اسی کی تفسیر جانتا ہوں، صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے جنت کی نعمتوں کے سلسلہ میں فرمایا۔

﴿ يُسَبِّحُوْنَ اللّٰهَ بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴾ (صفۃ الجنۃ)

وہ صبح اور شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کریں گے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اہل جنت کو خدا کی تسبیح و تقدیس کا الہام ہوا کرے گا اور شاید قرآن پاک کی اس آیت کے یہی معنی ہوں۔

﴿ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ﴾ (حج-۳)

اور اچھی بات کی طرف ان کی رہنمائی کی جائے گی اور اس سراپا حمد کا راستہ ان کو بتایا جائے گا۔

مقام قرب:

اہل جنت کو جو کچھ نصیب ہوگا، ان سب کے سوا سب سے اعلیٰ مرتبہ قرب خاص کا مقام ہوگا، بندے اپنے پروردگار کی حضوری کا شرف پائیں گے، قرآن پاک میں جا بجا ان کے لئے یہ آتا ہے کہ جَزَاۗؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ "ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس" یہ قرب خاص کے اشارے ہیں اور ایک جگہ یہ اشارہ اس تصریح سے بدل جاتا ہے۔

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ○ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴾ (قمر-۳)

بے شک پرہیزگار باغوں میں اور نہروں میں، سچائی کی نشست گاہ میں، اس بادشاہ کے حضور جس کا سب پر قبضہ ہے۔

دیدار:

جنت کی سب سے آخری لیکن بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی تجلی کا نظارہ ہے، کون ہے جو اس مطلع انوار کے دیدار کی تاب لا سکے، تاہم یا تو یہ آنکھیں اور ہوں گی یا وہ نور مطلق کسی خاص شان میں نمایاں ہوگا۔ اس وقت یہ عالم ہوگا کہ وہ نور کا مرکز بن کر نمودار ہوگا اور اہل جنت کی مشتاق آنکھیں اس کی طرف اٹھی ہوں گی۔

﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴾ (قیامہ۔۱)

کتنے چہرے اس دن تروتازہ اور اپنے پروردگار کی سمت دیکھ رہے ہوں گے۔

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت جریر بن عبداللہؓ صحابی روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ "تم اپنے پروردگار کو بالمشاہدہ دیکھو گے" دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "جیسے چاند کو تم دیکھ رہے ہو، ایسے ہی تم اپنے پروردگار کو دیکھو گے۔ اس دیدار و رویت میں کوئی ایک دوسرے کا مزاحم[1] نہ ہوگا"۔ اس تمثیل سے رسول اللہ ﷺ کے دو مقصود ہیں۔ ایک تو شدت یقین کا اظہار کہ جس طرح تم اس روشن چاند کو بے شک و شبہ دیکھ رہے ہو اسی طرح بے شک و شبہ اپنے پروردگار کو دیکھو گے، دوسرا مقصد یہ ہے کہ جس طرح لاکھوں کا مجمع بھی ہو تو سب لوگ ایک چاند کو یکساں حیثیت سے باطمینان اس طرح دیکھ سکتے ہیں کہ ایک کا دیکھنا دوسرے کے دیکھنے میں عائق نہیں ہوتا' اسی طرح دیدار الٰہی میں کروڑوں کا ہجوم مانع نہ ہوگا' اتنا ہی نہیں بلکہ جس دن جنتی اپنے پروردگار کے حضور میں پیش ہوں گے، ان کی زبان پر سلامتی کی دعا ہوگی۔

﴿ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلَامٌ ﴾ (احزاب۔۶)

ان کی دعا جب وہ اپنے پروردگار سے ملیں گے' سلامتی ہوگی۔

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ سراپا رحمت پروردگار خود اپنے بندہ کو اپنی زبان سے سلامتی کا پیام دے گا۔

﴿ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴾ (یٰس۔۴)

رحمت والے پروردگار کی طرف سے پیام سلامتی ہوگا۔

بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ترجمان کے بغیر خود کلام فرمائے گا[2]۔

یہ روایت کیونکر ہوگی؟ اہل روایت لفظ کے قائل ہیں' اہل عقل زیادتِ ایمان کی تاویل کرتے ہیں' اہل حقیقت اس کو اسماء و صفات کی ناقابل بیان جلوہ انگیزی سے تعبیر کرتے ہیں' لیکن فیصلہ یہ ہے کہ

ع بیا کیں داوری ہا را بہ پیش داور اندازیم

ان تعلیمات کا عملی اثر:

اوپر کے صفحوں میں قیامت' حشر و نشر اور جنت و دوزخ کے پورے مناظر گذر چکے ہیں' یہ ایمان بالغیب مذہب کی حقیقت کا اصلی جوہر ہے اور اسی کے یقین میں مذہب کی اصلی طاقت پوشیدہ ہے' معلوم ہو چکا ہے کہ اہل عرب کو ان حقائق کو تسلیم کرنے سے کس قدر انکار تھا' بلکہ مر کر جی اٹھنا اور اس موت کے بعد دوبارہ زندگی ان کے نزدیک کس قدر مستبعد تھی' قرآن پاک کا بڑا حصہ شرک کے ابطال اور توحید کے اثبات کے بعد اسی حیات بعد الموت کی تلقین اور اس پر ایمان کی دعوت پر مشتمل ہے' آنحضرت ﷺ اپنے اکثر خطبوں میں اس کا حال بیان کیا کرتے تھے اور جمعہ کے خطبوں میں خصوصیت کے ساتھ سورۂ ق کی تلاوت فرماتے تھے' جس میں قیامت کے حالات ہیں۔ مگر دیکھو کہ ۲۳ برس کی مسلسل تعلیم قرآن پاک کی تاثیر اور محمد رسول اللہ ﷺ کے فیض ہدایت سے نہ صرف انکا انکار اقرار سے بدل گیا بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا

---

[1] صحیح بخاری جلد ثانی ص ۱۱۰۵۔

[2] ایضاً باب کلام الرب۔

کہ یہ مناظران کے دل ودماغ کی لوح میں منقوش ہو گئے تھے۔

یاد ہوگا کہ اسلام کے آغاز میں ایک عرب شار نے طنزاً کہا تھا۔[1]

اموت ثُمَّ بَعَثٌ ثُمَّ حَشر　　حدیث خرافة یا ام عمرو
کیا مرنا ہے پھر جینا اور پھر اکٹھا ہونا　　اے عمرو کی ماں یہ خرافات باتیں ہیں۔

لیکن چند ہی سال کے بعد یہ طنز وانکار، رمز یقین سے بدل گیا اور اس وقت عرب کا شاعر یہ کہنے لگا "ہم آسمان تک پہنچ گئے اور اللہ سے امید ہے کہ ہم اس سے بھی اونچے جائیں گے۔

﴿ وانا لنرجو فوقَ ذٰلِكَ مَظْهَرًا ﴾

اور ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ اس سے بھی بلند مقام میں ظہور کریں۔

آنحضرت ﷺ استفسار فرماتے ہیں کہ آسمان سے بھی بلند مقام اور کیا ہے؟ عرض کرتا ہے کہ "جنت یا رسول اللہ!" آپ ﷺ فرماتے ہیں "انشاء اللہ" دیکھو کہ جن کی نظریں زمین سے اونچی نہیں جا پاتی تھیں ان کا تخیل آسمان سے بھی اونچا جانے لگا‘ جن کو مر کر پھر جینا دور از عقل معلوم ہوتا تھا، جن کو آخرت کے مؤاخذہ کا کوئی ڈر نہ تھا، جن کو اپنے اعمال کی جواب دہی کی پرواہ نہ تھی، جو سزا و جزا کے مفہوم سے بیگانہ تھے، جو جنت اور دوزخ کے تخیل سے نا آشنا تھے وہ اس ہولناک منظر سے ڈرنے لگے‘ دوسری زندگی پر ان کو اسی طرح یقین آ گیا جس طرح آج کی زندگی پر تھا‘ آخرت کے مواخذہ سے وہ بید کی طرح کانپنے لگے‘ اعمال کی جوابدہی سے ترساں ولرزاں رہنے لگے‘ سزا و جزا کے خوف سے وہ اپنے ہر عمل کی باز پرس خود کرنے لگے‘ جنت کا اشتیاق ان کو بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ کر دیتا تھا‘ دوزخ کا ڈر ان کے دل کے اندر کے ہر تار کو چھیڑا کرتا تھا، ان کی آنکھوں کو اشکبار رکھتا تھا‘ فرائض اور ذمہ داری کو دیانت داری کے ساتھ ادا کرنے پر ہر لحظہ ان کو آمادہ کرتا رہتا تھا‘ راحت کے خواب اور آرام کے بستر سے ان کو چونکا کر عمل کے میدان میں تنہا لے آتا تھا اور ہر نیک کام اور عمدہ عمل کے لئے ان کو ہمہ تن سرگرم اور سرتاپا مصروف جدوجہد بنا دیتا تھا‘ تنہائی اور تاریکی میں بھی ان کے دل اور بدن کو برائیوں اور بداعمالیوں سے باز رکھتا تھا‘ ان کے ضمیر اور دل کے صفحوں کو ہر وقت پروردگار کی آنکھوں کے سامنے کھلا رکھتا تھا۔

ایک دفعہ دو صحابیوں میں کسی حقیقت کے متعلق جھگڑا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے فریقین کی باتیں سن کر ایک کے حق میں اس کا فیصلہ دے دیا پھر فرمایا "میں بھی ایک آدمی ہوں‘ مدعی اور مدعا علیہ میں سے ممکن ہے کہ کوئی زیادہ اچھا بولنے والا ہو جو اپنے دعویٰ کو خوبی کے ساتھ بیان کرے اور میں اس کے موافق اس کا فیصلہ دوں لیکن درحقیقت وہ چیز اس کی نہ ہو تو گویا میں اس کے گلے میں آگ کا ایک طوق پہنا رہا ہوں" یہ سن کر فریقین پر یہ اثر ہوا کہ دونوں رونے لگے اور ہر ایک اپنا حصہ دوسرے کو دینے لگا۔[2]

حضرت عمرؓ اللہ کے مطیع و فرمانبردار تھے‘ رسول کے عاشق و شیدا تھے‘ نیکیوں سے مالا مال تھے، جنت کی بشارت

---

[1] اصابہ اور استیعاب ذکر نابغہ جعدی۔

[2] سنن ابی داؤد کتاب الاقضیہ۔

سے سرفراز تھے' تاہم آخرت کے مواخذہ اور جوابدہی سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ ایک دفعہ انہوں نے کہا کہ ''اگر وصال نبوی کے بعد میرے اچھے اور برے اعمال برابر رہیں تو میں بھی خوش ہوں۔ اگر جنت نہ ملے تو پروا نہیں مگر الٰہی! دوزخ نہ ملے'' [1] وہ نزع کی حال میں بہت بے چین تھے' بعض صحابہ ان کے اچھے اعمال گنا کر ان کو تسلی دینے لگے تو جواب میں کہا ''اللہ کی قسم اگر کل زمین میرے لئے سونا ہو جاتی تو اس کو دے کر عذاب الٰہی [2] سے بچ سکتا تو میں دے دیتا'' ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کہتی تھیں ''اے کاش! میں جنگل کی گھاس ہوتی [3] اے کاش! میں کچھ نہ ہوتی'' [4]

قیامت کے متعلق قرآن پاک کی یہ عجیب مؤثر آیت:

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَىْءٌ عَظِيمٌ ۝ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُم بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيدٌ ﴾ (حج۔۱)

لوگو! اپنے رب سے ڈرو' قیامت کا بھونچال ایک بڑی چیز ہے' جس دن اس کو دیکھو گے، ہر دودھ پلانے والی عورت اپنے دودھ پیتے بچہ کو بھول جائے گی اور پیٹ والی اپنا پیٹ ڈال دے گی' اور لوگوں کو نشہ میں دیکھو گے' لیکن وہ نشہ میں نہ ہوں گے' بلکہ پروردگار کا سخت عذاب ہوگا۔

جب اتری اور آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو سنایا اور اس کی تفسیر کی تو ان کے چہروں کا رنگ بدل [5] گیا اور آنکھوں سے آنسو جاری [6] ہو گئے' ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے قبر کا ذکر کیا اور موت کے بعد عذاب کا حال بیان کیا تو صحابہ چیخیں مار مار کر رونے [7] لگے' حضرت ابو ہریرہؓ کو ایک بار قیامت کے ایک منظر کے بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اثنائے روایت میں وہ تین دفعہ بے ہوش ہو کر گرے' اور جب امیر معاویہؓ کے سامنے یہ روایت دہرائی گئی تو ان پر بھی گریہ طاری ہو گیا۔ [8]

اس یقین و ایمان کا دوسرا سماں یہ ہے کہ بدر کا میدان جنگ ہے' مشرکین کی ایک ہزار لوہے میں ڈوبی ہوئی فوج کا سیلاب امنڈا آ رہا ہے، ادھر تین سو نہتے مسلمان صف باندھے کھڑے ہیں کہ آپ ﷺ صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرماتے ہیں ''لو اس جنت کا موقع سامنے ہے جس کی وسعت آسمان و زمین کے برابر ہے'' ایک انصاری حیرت سے پوچھتے ہیں کہ ''کیا آسمان و زمین کے برابر؟'' آپ فرماتے ہیں ''ہاں'' وہ خوشی سے واہ واہ کہہ اٹھتے ہیں۔ آپ دریافت

---

[1] صحیح بخاری باب الہجرۃ جلد اوّل صفحہ ۵۵۔

[2] صحیح بخاری فضائل حضرت عمرؓ جلد اوّل صفحہ ۵۲۱۔

[3] ابن سعد جز النساء ص ۵۱۔

[4] صحیح بخاری مناقب عائشہؓ تفسیر سورۂ نور و مستدرک حاکم ترجمہ عائشہؓ و ابن حنبل مسند عائشہؓ۔

[5] صحیح بخاری تفسیر سورۂ حج جلد دوم ص ۶۹۳۔

[6] جامع ترمذی تفسیر سورۂ حج۔

[7] سنن نسائی کتاب الجنائز باب التعوذ من القبر۔

[8] جامع ترمذی ابواب الزہد۔

فرماتے ہیں کہ ''تم نے واہ واہ کیوں کہا'' عرض کی ''اس امید سے کہ شاید میں بھی اس میں ہوں'' فرمایا ''تم اس میں ہو'' یہ سن کر وہ کھجور نکال نکال کر جلدی جلدی کھانے لگے بالآخر جنت کے جانے میں اتنا توقف بھی شاق گذرا۔ بولے ''اتنی دیر بھی کیوں کی جائے'' یہ کہہ کر کھجوریں پھینک دیں اور تلوار کھینچ کر آگے بڑھے اور شہید ہوئے۔

غزوۂ احد میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا۔ احد کے میدان میں دار و گیر کا شور برپا تھا۔ لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں کہ ایک صحابی نے آگے بڑھ کر پوچھا ''یارسول اللہ! اگر اللہ کی راہ میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا؟'' فرمایا ''جنت میں'' وہ کھجور کھا رہے تھے۔ ہاتھ سے کھجوریں پھینک دیں اور لڑ کر جان دے دی' قیس ایک صحابی تھے وہ ایک جہاد میں شریک تھے انہوں نے اسلامی فوج کے سپاہیوں کے سامنے کہا کہ ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جنت کے دروازے تلواروں کے سایہ کے نیچے ہیں'' ایک معمولی سا مسلمان پاس کھڑا تھا اس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ ''کیا آپ نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے؟'' انہوں نے کہا ''ہاں'' یہ سن کر وہ اپنے دوستوں کے پاس آیا اور سلام کر کے رخصت ہوا' میان توڑ کر پھینک دی اور تلوار لے کر دشمن کی صف پر جا پڑا اور شہادت حاصل کی۔[۱]

ان حیرت انگیز واقعات میں سے ہر ایک واقعہ پر غور کرو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے منکرو کافر عرب کے دل و دماغ اور ذہن و اعتقاد کو کس طرح آن کی آن میں بدل دیا اور دم کے دم میں عربوں کے عقائد و اخلاق اور کارناموں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

* * *

---

[۱] یہ تینوں واقعے صحیح مسلم کتاب الجہاد باب ثبوت الجنۃ للشہید میں ہیں' دوسرا واقعہ سنن نسائی میں بھی ہے' کتاب الجہاد باب ثواب من قتل فی سبیل اللہ۔

قضاء وقدر

﴿اِنَّا کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقۡنٰهُ بِقَدَرٍ﴾ (قمر۔۳)

اگرچہ قرآن پاک میں ایمان کے سلسلہ میں اس کا ذکر نہیں آیا مگر اس کا اعادہ بار بار قرآن پاک میں اتنی دفعہ ہوا ہے کہ اسکی اہمیت اسکی مقتضی ہے کہ اس کو بھی ایمانیات کے پہلو میں جگہ دی جائے چنانچہ بعض صحیح حدیثوں [1] میں یہ ایمانیات کی آخری کڑی قرار بھی دی گئی ہے اور سلسلۂ توحید میں اسلام نے اللہ تعالیٰ کی وسعتِ قدرت اور مشیت مطلقہ کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کا لازمی نتیجہ بھی یہی ہونا چاہئے۔

اس عقیدہ کا ماحصل یہ ہے کہ دنیا میں اب تک جو کچھ ہوا ہے جو کچھ اب ہو رہا ہے اور جو کچھ آئندہ ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کے علم سابق اور فیصلۂ ازلی کے مطابق ہوا ہے ہوتا ہے اور ہوگا جس طرح مہندس اور انجینئر مکان بنانے سے پہلے مکان کی تمام جزئیات پر غور کر کے پہلے ہی سے نقشہ تیار کر لیتے ہیں اور اسی مجوزہ نقشہ کے مطابق معمار اور مزدور اس کی تعمیر کو مکمل کرتے ہیں اسی طرح اس مہندس ازل، خالقِ کائنات نے کائنات کی پیدائش سے پہلے اس کے تمام اصول وقواعد اور دوسرے اہم جزئیات طے کر کے ہر چیز کی نسبت فیصلہ کر دیا تھا اب اسی فیصلہ کے مطابق یہ کائنات اور اس کے تمام حوادث وواقعات انجام پا رہے ہیں، موت وحیات، فقر وغنا، کامیابی وناکامی، تکلیف وراحت ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے اور اسی کے مطابق وہ ظہور پذیر ہوتی ہے۔

توراۃ میں حضرت آدم وشیطان اور ہابیل وقابیل کے قصوں میں اس عقیدہ کے اشارات پائے جاتے ہیں۔ حضرت یوسف کا خواب اسی ایک حقیقت کی تعبیر ہے، مگر ان اشارات سے گزر کر زبور میں اسکی کھلی کھلی تعلیم بھی ملتی ہے، زبور ۲۳۸۔۱۴ میں ہے۔

> ''تیرے کام حیرت افزا ہیں، اس کا میرے جی کو بڑا یقین ہے، جبکہ میں پردے میں بنایا جاتا تھا اور زمین کے اسفل میں منقوش ہوتا تھا، تو میرے جسم کی صورت تجھ سے چھپی نہ تھی، تیری آنکھوں نے میرے بے ترتیب مادہ کو دیکھا، اور تیرے دفتر میں یہ سب چیزیں تحریر کی گئیں، اور ان کے دلوں کا حال بھی کہ کب بنیں گی، جب ہنوز ان میں سے کوئی بھی نہ تھی''
>
> اس کے بعد زبور ۱۴۸ کا ترانہ حمد اسی لے میں شروع ہوتا ہے۔
>
> ''............ خداوند کے نام کی ستائش کریں کہ اس (خدا) نے حکم دیا اور وہ (مخلوقات) موجود ہو گئے، اس نے ان کو ابدی پائیداری بخشی اس نے ایک تقدیر مقرر کی جو ٹل نہیں سکتی''

انجیل میں اسکی تعلیم ''خدا کی مرضی'' کے عنوان سے ہے، حضرت عیسیٰؑ زندگی کی آخری شب کی دعا میں فرماتے ہیں ''میری مرضی نہیں تیری مرضی پوری ہو'' (متی ۲۶۔۳۹) اور اسی ''مرضی'' کا ذکر یوحنا (۵۔۳ و ۶۔۳۸) اور خطوط (فلپیون ۲۔۱۳) میں ہے اور رومیوں کے نویں باب میں اس کی پوری تفصیل ہے مگر خاتم النبیین علیہ الصّلوٰۃ والسلام کی تعلیم نے اول یہ کیا کہ اس مسئلہ کی مجمل حقیقت کی توضیح کی اور اسکی حکمت ومصلحت کی تشریح کی اور دوسری بات یہ کی کہ گزشتہ مذاہب کی طرح اپنے دفتر کے کسی ایک گوشہ میں بطور ایک حقیقت ثانیہ کے اس کو کہہ کر خاموشی اختیار نہیں کر لی بلکہ بار بار

---

[1] صحیح مسلم بروایت ابن عمرؓ وابو ہریرہؓ باب الایمان۔

اتنی دفعہ دہرایا کہ سننے والوں کے دلوں میں اس عقیدہ نے گھر پیدا کرلیا اور یہ تلقین یقین کی صورت میں ان کی رگ و ریشہ میں پیوست ہوگئی اور ایسا اس نے اس لیے کیا تاکہ صبر وشکر کی اخلاقی تعلیم صرف نظریہ کی صورت میں نہ رہ جائے بلکہ عملی حیثیت میں اس کے پیرووں کے اندر استقلال وثبات کی روح اور دنیا کے مصائب وحوادث میں تسلی وتشفی کی قوت پیدا کرے، اور اس طرح یہ عقیدہ پہلے کی طرح صرف ایک مذہبی تلقین یا فلسفیانہ نظریہ کی حیثیت میں نہ رہے بلکہ ایک مفید عملی تعلیم کی شکل اختیار کرلے۔

وحی محمدی نے اس اصطلاح کے لیے دو لفظ اختیار کئے ہیں ایک ''قدر'' ہے جس کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں اور دوسرا ''قضا'' جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں۔

﴿ اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴾ (قمر۔۳)

ہم نے ہر چیز کو اندازہ سے پیدا کیا۔

﴿ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ﴾ (انعام۔۱)

وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے بنایا پھر ایک وقت کا فیصلہ کیا۔

یہ دونوں لفظ بجائے خود اس عقیدہ کی اسلامی حقیقت کو پوری طرح واضح کردیتے ہیں مقصود یہ ہے کہ کائنات کی پیدائش سے پہلے کائنات کی ہر چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے اندازہ اور تقدیر سے ہر ایک کا فیصلہ فرمادیا ہے اور متعین کر دیا ہے، اسی کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے اس میں خدا کے حکم کے بغیر ایک ذرہ کا بھی تغیر نہیں ہوسکتا، آسمان کو جس طرح بنایا، آفتاب کو جس طرح روشن کیا، چاند کے متعلق جو اصول مقرر فرمایا، ستاروں کے نکلنے اور ڈوبنے کے جو احکام دے دیئے، موت وحیات، فنا وبقا، اور عروج وزوال، غرض کائنات کی ہر شق اور پہلو کے متعلق جو اصول متعین فرمادیئے انہیں پر وہ چل رہی ہے، قرآن پاک میں کائنات کے بہت سے حالات بیان کرنے کے بعد ہے۔

﴿ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴾ (یٰسین۔۳)

اور سورج اپنے ٹھہراؤ پر چل رہا ہے، یہ ہے غالب اور علم والے کی تقدیر (اندازہ) اور چاند کو ہم نے تقدیر (اندازہ) کر دی ہیں منزلیں، یہاں تک کہ وہ پرانی ٹہنی کی طرح (خمیدہ ہوکر) لوٹتا ہے، نہ تو سورج کی قدرت میں ہے کہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے آگے بڑھے، ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔

یہ تو آسمان کی بات تھی، زمین کے متعلق ارشاد ہوا

﴿ وَقَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا ﴾ (حم سجدہ۔۲)

اور زمین میں اس کی روزیاں اندازہ کردیں۔

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ دنیا کی ہر چیز میں اس نے ایک اندازہ مقرر کردیا۔

﴿ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا ﴾ (طلاق۔۱)

اللہ نے ہر چیز کیلئے ایک اندازہ بنایا ہے۔

موت وحیات بھی اسی اندازہ کے مطابق ہے، فرمایا:

﴿ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ ﴾ (واقعہ۔۲)

ہم نے تمہارے درمیان موت کا اندازہ کر دیا۔

ہر شے میں اللہ نے جو اندازہ لگایا ہے وہ وہی چیز ہے جس کو لوگ قانونِ فطرت کہتے ہیں، اور جس پر دنیا چل رہی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ہر حصہ اور ہر پہلو کے متعلق اپنے احکام متعین فرما دیئے ہیں، جن کی اطاعت اس پر واجب ہے علیٰ ہذا انسانوں کی ترقی وزوال، موت وحیات، بیماری وصحت، دولت وافلاس، آرام وتکلیف، سعادت وشقاوت، ہر ایک کے اصول وقواعد مقرر فرما دیئے ہیں، غرض ان کو آرام وتکلیف جو کچھ بھی پیش آتی ہے، خدا کے علم اور اجازت سے پیش آتی ہے۔

﴿ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (تغابن۔۲)

نہیں پہنچی تم کو کوئی مصیبت، لیکن اللہ کے حکم سے۔

اور چونکہ تقدیر سے کوئی چیز ہٹ نہیں سکتی اس لیے مقدرات کو نوشتہ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں کہ جس طرح لکھی ہوئی بات قائم رہتی ہے مٹتی اور بھولتی نہیں، ایسے ہی یہ باتیں بھی مٹتیں اور بھولتیں نہیں۔

﴿ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ط وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ط اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴾ (فاطر۔۲)

اور کوئی عورت حمل میں نہیں رکھتی اور نہ جنتی ہے، لیکن خدا کے علم سے اور نہ کسی دراز عمر کو عمر کی درازی ملتی ہے، یا اسکی عمر کم ہو جاتی ہے لیکن وہ کتاب میں ہے، بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔

اس آیت پاک میں دو ٹکڑے ہیں ایک یہ کہ جو عورت بھی اپنے پیٹ میں بچہ رکھتی ہے یا جو بچہ جنتی ہے، وہ خدائے پاک کے علم سے ہے، دوسرا ٹکڑا یہ ہے کہ جس کو چھوٹی بڑی عمر بھی ملتی ہے وہ کتاب الٰہی میں پہلے سے لکھی ہوتی ہے، ان دونوں ٹکڑوں کے ملانے سے معلوم ہوگا کہ کتاب الٰہی میں ہونا اور علم الٰہی میں ہونا دونوں ہم معنی ہیں۔

قرآن پاک نے اس کو بھی ظاہر کیا ہے کہ قضا وقدر کے عقیدہ کی فلسفیانہ حقیقت سے زیادہ اس کی نظر اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت پر ہے، انسان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی ناچیز کوشش کی ذراسی کامیابی پر فخر وغرور کے نشہ میں چور ہو جاتا ہے اور ذراسی ناکامی پر وہ دل شکستہ ہو کر ہمت ہار بیٹھتا ہے، یہ دونوں مختلف اخلاقی بیماریاں اس لیے اس کو لاحق ہوتی ہیں کہ وہ اپنے کام کے اچھے یا برے نتیجے کو خود اپنے کام کا لازمی نتیجہ جانتا ہے، اس لئے وہ کبھی اپنے کئے پر مغرور اور کبھی ملول ہوتا ہے اور یہ دونوں کیفیتیں افراد اور اقوام کی متانت، استقلال اور صبر وثبات کے جوہر کو برباد کرتی ہیں، اس لیے ایک ایسے عقیدہ کی ضرورت تھی جو کامیابی کے فخر ومسرت اور ناکامی کے افسوس وحسرت دونوں موقعوں پر عاجز انسانوں کی دست گیری کرے اور وہ یہی عقیدۂ قضا وقدر ہے۔

اس عقیدہ کا منشا یہ ہے کہ ہم کو جو کامیابی ہوتی ہے وہ ہماری کوشش کا براہِ راست نتیجہ نہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے

فضل وکرم کا نتیجہ ہے، اس لیے اس پر ہمارا فخر وغرور کرنا بے جا ہے، اسی طرح ہم کو جو ناکامی پیش آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کسی حکمت ومصلحت کا نتیجہ ہے اور ہمارے کام سے پہلے ہی ہمارے کاموں کے نتیجے اس علام الغیوب کے علم میں مقرر ہو چکے تھے، اس لیے ہم کو دل شکستہ اور مایوس نہ ہونا چاہیے بلکہ اسی جوش وخروش اور سرگرمی سے پھر از سر نو جدو جہد میں مصروف ہو جانا چاہیے۔

اس مسئلہ کی یہ پوری توضیح سورہ حدید میں ان لفظوں میں مذکور ہے

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ط اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَافَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ط وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ (حدید۔۳)

کوئی مصیبت نہیں آتی ملک میں، اور نہ خود تم (اس ملک کے بسنے والوں) میں لیکن یہ کہ وہ ایک کتاب (الٰہی) میں اپنی پیدائش سے پہلے درج ہوتی ہے، یہ اللہ پر آسان ہے، ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ تم اس پر جو تم سے جاتا رہے، غم نہ کھایا کرو، اور جو تم کو (اللہ) دے اس پر اترایا نہ کرو، اور اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے، بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا۔

اس آیت کریمہ نے مسئلہ قضا وقدر کے فلسفہ کو اس خوبی سے واضح کیا ہے کہ اس کی تائید کے لیے کسی مزید تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی، یہ اسی عقیدہ کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرامؓ کی گردنیں عین کامیابی وفتوحات کی حالت میں خداوند قادر مطلق کے آگے جھک جاتی تھیں اور ناکامی کی حالت میں ان کے دل یاس وناامیدی سے دوچار نہیں ہوتے تھے، اور ان کی عملی زندگی کا جو نتیجہ بھی پیش آتا تھا وہ اس کو اپنی طرف سے نہیں بلکہ خداوند عالم کی طرف سے سمجھ کر خاموش رہتے تھے، مالی بے چارگی، سیاسی مصیبت، عزیزوں کی مفارقت، لڑائیوں کی ناکامی کسی موقع پر وہ رحمت الٰہی سے مایوس ہونا نہیں جانتے تھے اور ہر خطرناک سے خطرناک کام کے لیے وہ قدم اٹھا بیٹھتے تھے کہ ان کا یقین تھا کہ موت اپنے وقت پر آئے گی اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا، اسی لئے ان کے دلوں میں وہ عزم ہوتا تھا کہ نہ اس کو پہاڑ روک سکتے تھے نہ سمندر بہا لے جا سکتے تھے نہ حوادث کا طوفان اس کو اکھاڑ سکتا تھا اور نہ بھڑکتی آگ کے شعلے اسکو جلا سکتے تھے۔

﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ط وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ط وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ط فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (آل عمران۔۱۵)

کسی کے اختیار میں نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر مر سکے، یہ لکھا ہوا ہے (انسان کے ہاتھ میں صرف اچھا یا برا ارادہ و نیت ہے، اس نیت کے مطابق کام کا نتیجہ ظاہر ہونا اس کے اختیار میں نہیں) جو کوئی دنیا کا معاوضہ چاہے گا تو ہم اس کو اس میں سے کچھ دینگے اور جو آخرت کا معاوضہ چاہے گا اس میں سے کچھ (یہاں) دینگے اور پورا معاوضہ شکر کرنے والوں کو آئندہ (وہاں) دیں گے۔ کتنے پیغمبر تھے جو لڑے ہیں، ان کے ساتھ بہت سے خدا کے طالب تھے، تو خدا کی راہ میں ان کو جو مصیبت پیش آئی اس کی وجہ سے نہ دل ہارے، نہ سست ہوئے اور نہ دب گئے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

ان آیتوں نے یہ واضح کر دیا کہ قضا و قدر کے عقیدہ کا نتیجہ پستی، سستی اور دون ہمتی نہیں، بلکہ بلندی استقلال، اور صبر و ثبات ہے اور یہی وہ چیز ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کارناموں میں ہر دیکھنے والے کو صاف نظر آتی ہے، ان کو صاحب وحی کی یہ تعلیم تھی کہ وہ دشمنوں سے کہہ دیں کہ ہمیں ڈر نہیں، کیوں کہ:

﴿ لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ (توبہ۔۷)

ہم پر کوئی آفت آ ہی نہیں سکتی، لیکن جو خدا نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے، وہ ہمارا آقا ہے اور اللہ ہی پر چاہئے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔

خطرات اور مشکلات کی ان کو پروا نہیں کہ جن کے لئے موت لکھی ہے وہ میدان جنگ میں بھی مریں گے اور بستر راحت پر بھی اور جن کی موت کا مقررہ وقت نہیں آیا وہ تلواروں کی دھاروں اور سمندروں کے طوفانوں سے بھی سلامت بچ کر نکل آئیں گے۔

﴿ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ﴾ (آل عمران۔۱۶)

منافق کہتے ہیں کہ اگر ہماری بات مان لی جاتی تو ہم یہاں مارے نہ جاتے، کہہ دے کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن پر یہاں مرنا لکھا جا چکا تھا وہ از خود اپنے مقتل میں نکل کر چلے آتے۔

﴿ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ﴾ (نساء۔۱۱)

تم جہاں بھی رہو تم کو موت آ کر پا لے گی اگر چہ تم مضبوط و مستحکم قلعوں میں ہو۔

یہی وہ عقیدہ ہے جو مسلمان کی ناقابل ہزیمت جرأت اور غیر شکست پذیر عزیمت، اور بے خوف بہادری کا راز ہے، کچھ لوگوں نے اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ مسئلہ تقدیر کے ماننے سے انسان کا مجبور محض ہونا لازم آتا ہے اور اس سے یہ تعلیم نکلتی ہے کہ انسان اپنی تقدیر پر صابر و شاکر ہو کر سست و غافل بن کر بیٹھ رہے، حالانکہ اگر یہ صحیح ہوتا تو نہ رسولوں کی بعثت کی ضرورت تھی، نہ ربانی کتابوں کے اترنے کی حاجت ہوتی، نہ تبلیغ و ارشاد کی تاکید ہوتی اور نہ اصلاح و ہدایت کا حکم ہوتا اور خدا کی مخلوق اپنے حال پر چھوڑ دی جاتی، مگر ایسا نہیں کیا گیا، لاکھوں پیغمبر بھیجے گئے، کتنی کتابیں اتریں، کروڑوں مبلغ اور مرشد بنا کر پھیلائے گئے، ہدایت و ارشاد کی تاکید پر تاکید آئی، لوگوں کی دعوت و اصلاح ہر مسلمان کا فرض ٹھہرایا گیا، کوشش و محنت سعی و تلاش اور جد و جہد کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی اور محمد رسول اللہ ﷺ کی جد و جہد سے معمور زندگی ہمارے لئے نمونہ ٹھہرائی گئی اور خلفائے راشدین اور عام صحابہ نے اپنے کارناموں سے اس نمونہ کی کامیابی کی تصدیق کی۔

اب کیا محمد رسول اللہ ﷺ کی تلقین اور آپ کا عمل دو متضاد چیزیں تھیں؟ نہیں، یہ دونوں ایک دوسرے کی مؤید تھیں، اور اس طرح ایک دوسرے کی تصدیق تھیں کہ ﴿ اعملوا فکل میسر لما خلق ﴾ (بخاری) لوگو! اپنے اپنے کام کئے جاؤ کہ تم میں سے ہر شخص سے وہی کام صادر ہونگے جن کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے، کام کرنا انسان کا فرض ہے اور اس کے نتیجہ کے مطابق جزا دینا خدا کا کام ہے اور یہ تقدیر ہے، فرمایا:

﴿ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَمَا

يُغْنِىُ عَنْهُ مَالُهٗ اِذَا تَرَدّٰى ۝ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى ﴾ (لیل۔۱)

بے شبہ تمہاری کوششیں مختلف رُخ کی ہیں تو جس نے دیا اور پرہیز گاری کی اور نیکی کو سچ کر دکھایا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ آسانی کی طرف لے چلیں گے اور جس نے نہ دیا اور بے پروائی برتی اور نیکی کو جھٹلایا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ سختی کی طرف لے چلیں گے اور اسکی دولتمندی اس کو گڑھے میں گرنے سے نہیں بچا سکتی ہے بیشک راہ سوجھانا ہمارا فرض ہے اور آخر اور اول ہمارے لیے ہے۔

یہ ہے قضا و قدر اور سعی و عمل کی باہمی تطبیق جس کی ژولیدگی نے اسلام سے پہلے ایک عالم کو گمراہ رکھا تھا۔ کام کرنا اور عمل کر دکھانا، انسان کا فرض ہے اور اس کے مطابق اس کی جزا کا ملنا جو اس کام کے لیے پہلے سے مقدر ہو چکی ہے خدا کا کام ہے نیکوں کو آہستہ آہستہ نیکی کے مزید راستہ دکھانے کا نام توفیق و ہدایت ہے اور بروں کو خدا کی طرف سے اس توفیق و ہدایت کے نہ ملنے کا نام عدم توفیق و ضلالت ہے اور ان دونوں میں سے ایک کا ملنا انسان کی ابتدائی کوشش ہے، خدا فرماتا ہے۔

﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ﴾ (عنکبوت۔۷)

اور جو ہماری بات میں کوشش کرتے ہیں البتہ ہم ان کو اپنا راستہ سوجھاتے ہیں۔

خدا کی طرف سے توفیق و ضلالت کا ملنا خود انسان کے اچھے یا برے عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔

﴿ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفَاسِقِيْنَ ﴾ (بقرہ۔۳)

اور ہم اس سے گمراہ نہیں بناتے، لیکن انہیں کو جو ہمارا حکم نہیں مانتے۔

غرض پہلے فسق، عدم اطاعت اور نافرمانی ہوتی ہے، تب اس کے نتیجہ کے طور پر خدا کی طرف سے ضلالت کا ظہور ہوتا ہے

﴿ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ﴾ (نجم۔۳)

اور انسان کے لئے نہیں، لیکن وہی جس کی اس نے کوشش کی، اور بے شک اس کی کوشش (خدا کے حضور) دیکھی جائے گی۔

اس کی مثال بالکل بچہ کی سی ہے، بچہ چلنا یا بولنا کیونکر سیکھتا ہے، وہ پہلے چلنے اور بولنے کی خود کچھ کوشش کرتا ہے، تو اس کے والدین اس کو چلنا اور بولنا سکھاتے ہیں، بچہ پاؤں اٹھاتا ہے اور والدین اس کے ہاتھ پکڑ کر اس کو دو چار قدم چلاتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ چلنا سیکھتا ہے۔ وہ پہلے زبان ہلاتا ہے، اور مبہم آوازیں نکالتا ہے تو والدین اسکو با معنی الفاظ کی تلقین کرتے ہیں اور اس طرح دونوں کوششیں مل کر بار آور ہوتی ہیں، اسی طرح تقدیر الٰہی اور عمل انسانی باہم مل کر انسانوں کی عملی تاریخ تیار کرتے ہیں۔

جبر و قدر:

عموماً لوگ اسی موقع پر جبر و قدر کے مسئلہ کو چھیڑتے ہیں یعنی یہ کہ انسان اپنے عمل میں مجبور ہے یا مختار؟ حالانکہ یہ رشتہ کائنات کا وہ عقیدہ ہے جس کا حل نہ صرف یہ کہ مذہب کے ناخن سے نہیں ہوتا بلکہ عقل کے ناخن سے بھی نہیں ہو سکتا جس طرح اہل مذہب ارادہ الٰہی اور ارادہ انسانی کی باہمی تطبیق میں حیران ہیں اسی طرح فلسفہ الٰہیات کے معلم علم الٰہی اور

انسان کی عملی آزادی کے درمیان اور فلسفہ اخلاق والے انسان کی آزادی عمل اور اس کے موروثی اثرات' فطری جذبات اور ماحول کی تاثیرات کی مجبوریوں کے درمیان جو تصادم ہے اس کو بمشکل بچا سکتے ہیں۔

دنیا کے عام مذاہب کا بھی یہی حال تھا۔ ہر دھاگے میں یہ گرہ اسی طرح پڑی ہوئی تھی اور اس کے حل کی صورتیں دو ہی انہوں نے نکالی تھیں، یا تو سرے سے اس سے خاموشی برتی جائے اور دبے پاؤں اس راستہ سے گزر جایا جائے یا بحث چھڑی تو جبر ہی کی طرف ان کا میلان نمایاں تھا چنانچہ یہی جبر ہندو مذاہب میں تناسخ آواگون اور کرم کی صورت میں ہے عیسائیوں میں حضرت آدم کے گناہ اور خدا کی[1] مرضی کے پیرایہ میں ہے اور یہودیوں کے مجموعہ تورات میں حضرت ایوب کا صحیفہ ادھر ہی رہبری کرتا ہے دوسری طرف مجوسی تھے' جنہوں نے انسانی اختیار و آزادی کو یہاں تک بڑھا دیا تھا کہ خود خدا بھی اس کے آگے مجبور تھا خدا کو نہ صرف انسانوں کے بلکہ فرشتوں کے کاموں پر کوئی قابو حاصل نہ تھا[2] غرض آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے مذاہب کی یہی دو نوعتیں تھیں یعنی یا تو ان کو اس مشکل کی خبر ہی نہیں تھی یا تھی تو خدا کی قدرت مطلقہ اور مشیت عامہ کی اس طرح تعبیر کرتے تھے کہ انسان بالکل بے بس اور مجبور نظر آتا تھا یا یہ کہ تناسخ کے چکر میں اس کو پھنسا کر اسکی زندگی کو اس کے پچھلے جنم کے کرموں کے ہاتھوں گرو کر دیتے تھے یا پھر اس سے بچے تو انسان کو کامل خود مختار بنا کر خود خدا کو مجبور بنا دیا۔

تمام انبیاء میں آنحضرت ﷺ ہی کی شخصیت وہ نمایاں شخصیت ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس دیرینہ راز کے چہرہ سے پردہ ہٹایا' حقیقت یہ ہے کہ یہ دو صداقتیں ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا اور اس کے ذرہ ذرہ پر قدرت مطلقہ رکھتا ہے اور آسمان و زمین بر و بحر اور انسان و حیوان کوئی چیز نہیں' جو اس کے ارادہ اور مشیت کے بغیر حرکت بھی کر سکے اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اس کی قدرت اور مشیت کے ماتحت ہیں یہ وہ عقیدہ ہے جو ہر مذہب کی اور خصوصاً اسلام کی جان ہے' اگر یہ نہ ہو تو مذہب کی قوت بے اثر ہو کر رہ جائے' اور ایک ایسا خدا ماننا لازم آ جائے جس کے اختیارات محدود' جس کی قدرتیں ناقص اور جس کی شہنشاہی ناتمام ہو۔

۲۔ دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ دوسری مخلوقات کو نہ سہی مگر انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح کوئی اختیار ضرور بخشا گیا ہے کہ اگر یہ اختیار نہ تسلیم کیا جائے اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کیا جائے جس طرح دوسری مخلوقات ہیں تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا امتیاز' جزا و سزا' شریعت' کتاب' تعلیم اور انبیاء کی بعثت یہ تمام چیزیں بیکار محض ہو جائیں ظلم و انصاف دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے' انسان کا اپنے کسی فعل پر قابل مدح یا قابل ملامت ہونا بے معنی ہو جائے کسی اچھے کام پر خدا کا اس کو انعام دینا اور بُرے کام پر اس کو عذاب دینا سراسر ظلم بن جائے بلکہ اس دنیا کی عدالت میں بھی وہ اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہ ٹھہرے۔

---

[1] انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی گرفتاری کی رات کو دعا میں فرمایا ''اے خدا اگر تو اس پیالہ کو ہٹا سکتا ہے تو ہٹا دے' لیکن میری نہیں بلکہ تیری مرضی پوری ہو''۔ عیسائیوں کے جبری و قدری فرقوں کی معرکہ آرائی کا حال فرنچ فاضل موسیو دی کانت کی کتاب الاسلام (ترجمہ عربی) صفحہ ۸۷ سے کسی قدر معلوم ہو سکتا ہے۔

[2] شفاء العلیل فی القضاء والقدر والتعلیل حافظ ابن قیمؒ۔

الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیت و ارادہ ہر جزو کل پر حاوی ہے اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کا ذمہ دار بنتا ہے نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا اور بدی کے کاموں پر وہ ملامت کا سزا وار ٹھہرتا ہے‘ اور اسی کی بنا پر وہ اپنی دوسری زندگی میں اپنے فعل کی جزا و سزا پانے کا مستحق ٹھہرے گا‘ اسی پر وہ فطرت کے سامنے دنیا کی عدالت میں اور آخرت میں بھی مواخذہ اور باز پرس کی ذمہ داری میں گرفتار ہے اور اسی کے لئے خدا کی طرف سے اس کے پاس ہدایت کی کتاب اور راستہ دکھانے والے رسول اور نبی آتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا صحیفہ ربانی پہلی اور آخری آسمانی کتاب ہے جس نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر تسلیم کیا ہے اور ان کی تبلیغ کی ہے ایک طرف وہ کہتا ہے کہ ”خدا کی اجازت کے بغیر درخت کا ایک پتہ بھی گر نہیں سکتا“ اور دوسری طرف وہ کہتا ہے ”ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرو ہے“، یعنی خدا کی ہمہ گیر قدرت وسیع اور ناقابلِ رد مشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادہ کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضاء کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی، یہی ارادہ اور اعضاء کو اس کے مطابق حرکت دے سکنے کی محدود قدرت اس کی ذمہ داری‘ تکلیف‘ باز پرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے اور اسی پر اس کے اعمال‘ اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے‘ اس لئے انسان پر اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری قانوناً اور شرعاً نہیں جو اس کے ارادہ اور نیت سے صادر نہ ہوئی ہو بلکہ اس کے کرنے یا نہ کرنے میں وہ مجبور و بے اختیار رہا ﴿انما الاعمال بالنیات﴾ اس تطبیق سے نہ تو خدائے پاک کی قدرت و اختیار کی وسعت میں فرق آتا ہے‘ اور نہ انسان کا تمام تر مجبور ہونا لازم آتا ہے خدا جب چاہے انسان سے اپنے دیئے ہوئے اختیار اور بخشی ہوئی قدرت کو چھین لے مگر ایک وقت مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون اور فرمائے ہوئے وعدہ کے مطابق وہ اس کو اس اختیار اور قدرت سے محروم نہیں کرتا فرمایا:

﴿ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾ (کہف۔۴)

تو جو چاہے مومن بن جائے اور جو چاہے کافر ہو جائے۔

اس لئے ہر انسان اپنی جنت آپ بناتا ہے اور اپنی دوزخ آپ مہیا کرتا ہے

﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ط وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾ (فصلت۔۶)

جس نے نیک کام کیا تو اپنے لیے کیا اور برا کام کیا تو اپنے لئے کیا‘ تیرا پروردگار بندوں پر ظلم نہیں کرتا

کہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ ظلم ہو جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک و برتر ہے‘ چنانچہ آنحضرت ﷺ سے ارشاد ہے

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ط اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ○ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ع اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ○ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴾ (یونس۔۵)

اے پیغمبر! ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمھاری طرف کان لگاتے ہیں‘ تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے‘ اگر چہ وہ سمجھتے نہ ہوں‘ اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف دیکھتے ہیں‘ تو کیا تم اندھوں کو سوجھاؤ گے اگر چہ وہ نہ دیکھیں‘

بیشک اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا' بلکہ لوگ ہیں جو اپنے او پر ظلم کرتے ہیں۔

وہ انسان جو اندھا اور بہرہ بنتا ہے اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے' خدا اس کو اندھا اور بہرا بنا کر پھر اس کو دیکھنے اور سننے کی تکلیف نہیں دیتا کہ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ اس کا ظلم ہوتا' اور ظلم کے ہر شائبہ سے اس کا ہر حکم اور ہر کام بری ہے لوگوں کو قرآن کی ہدایت وضلالت کے الفاظ سے بھی دھوکہ ہوا ہے حالانکہ ہدایت اور ضلالت خدا کا وہ فیضان ہے جو انسان کے اچھے یا برے کام کے جواب میں خدا کی طرف سے ہوتا ہے' ضلالت کی نسبت فرمایا۔

﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡھِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَھُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡھُمۡ لَایُؤۡمِنُوۡنَ ٥ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوۡبِھِمۡ وَعَلٰی سَمۡعِھِمۡ وَعَلٰۤی اَبۡصَارِھِمۡ غِشَاوَةٌ ﴾ (بقرہ۔۱)

بے شک جنہوں نے (اسلام کی تعلیمات کے قبول) سے انکار کیا ان کو تمہارا تنبیہ کرنا یا نہ کرنا دونوں برابر ہیں' وہ ایمان نہ لائیں گے خدا نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی ہے اور آنکھوں پر پردہ ہے۔

دیکھو جب انسان سے کفر کا صدور پہلے ہو چکا تب خدا کی طرف سے ضلالت کا فیضان ہوا اور اس کو تشبیہاً یوں ادا کیا کہ ان کے دلوں پر مہر پڑ گئی کہ سمجھتے نہیں' کانوں پر مہر پڑ گئی کہ سنتے نہیں' اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہے کہ دیکھتے نہیں' دوسری جگہ فرمایا۔

﴿ بَلۡ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیۡھَا بِکُفۡرِھِمۡ ﴾ (نسا۔۲۲)

بلکہ خدا نے ان کے کفر کے سبب سے انکے دلوں پر مہر کر دی۔

یہاں بھی ان کا کفر خدا کی مہر پر مقدم ہے' مقصد یہ ہے کہ جب کفر کا صدور ہوتا رہتا ہے تو دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو جاتا ہے اور یہی خدا کی مہر ہے۔ [۱]

برخلاف اس کے اگر لوگ کانوں سے پیغام حق کے سننے اور آنکھوں سے دیکھنے اور دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ اپنی توفیق وہدایت سے سرفراز فرمائے ارشاد فرمایا۔

﴿ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَھۡدِیۡھِمۡ رَبُّھُمۡ بِاِیۡمَانِھِمۡ ﴾ (یونس۔۱)

بے شک جو ایمان لائے اور نیک کام کئے' ان کو ان کا پروردگار ان کے ایمان کے سبب ہدایت دے گا۔

﴿ وَالَّذِیۡنَ اھۡتَدَوۡا زَادَھُمۡ ھُدًی ﴾ (محمد۔۲)

اور جنہوں نے ہدایت قبول کی' ان کو ہدایت میں اور بڑھایا۔

ایرانی فلسفہ خیر وشر کی آمیزش نے اس مسئلہ کو اور زیادہ اُلجھا دیا' حالانکہ عربی الفاظ خیر وشر کو اعمال کے خیر وشر سے بحث نہیں' عربی میں مطلق خیر کے معنی دولت ونعمت وآرام کے اور شر کے معنی غربت' تکلیف ومصیبت کے ہیں' قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ انہی معنوں میں آئے ہیں البتہ جب ان کے ساتھ لفظ عملِ شریک ہوگا' تو عملِ خیر اور عمل شر کے معنوں میں یہ استعمال ہوگا' جیسے

---

[۱] قرآن پاک میں جہاں خدا کی اس مہر کا یا کسی کو ہدایت نہ دیئے جانے کا ذکر ہے' وہاں اس کے کفر وفسق کی علت ہمیشہ پہلے ذکر کر دی گئی ہے' اس لئے ان آیتوں سے جبر پر استدلال صحیح نہیں۔

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴾ (زلزال۔۱)

تو جو کوئی چیونٹی برابر نیکی کرے گا' اس کو دیکھے گا اور جو برائی کریگا وہ بھی دیکھے گا۔

اس لیے حدیثوں کے ان الفاظ میں:

﴿ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى ﴾

اور اس پر ایمان کہ خیر اور شر کی تقدیر خدا کی طرف سے ہے۔

کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کے اچھے اور برے کام سب خدا کی طرف سے ہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ انسانوں کو راحت و رنج' مسرت و تکلیف' دولت و افلاس اور صحت و مرض وغیرہ اچھائی اور برائی سب خدا کی طرف سے پہنچتی ہے اور اس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟

بعض لوگوں کو صحیح مفہوم کے سمجھنے میں ان آیتوں سے بھی شبہ ہوتا ہے جن میں یہ ذکر ہے کہ ''اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت دے دیتا'' اس سے وہ غلطی سے یہ سمجھے ہیں کہ وہ خود خداوند تعالیٰ ہی ہے جو ان کافروں کو ہدایت سے جبراً روکے ہوئے ہے حالانکہ ان آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ از خود اسلام قبول نہیں کر سکتے الا یہ کہ خود خدا زبردستی ان کو مسلمان بنا دینا چاہے مگر ایسے زبردستی سے مسلمان یا کافر اور نیک یا بد بنا دینا اللہ تعالیٰ کے جاری قانون کے خلاف ہے' چنانچہ ان آیتوں کا یہی مطلب ہے۔

﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾ (دھر۔۲)

تم نہیں چاہو گے الا یہ کہ خود خدا چاہے (اور تم کو زبردستی مسلمان بنا دے)

﴿ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾ (انعام۔۱۳)

وہ نہیں ہیں کہ ایمان لے آئیں الا یہ کہ خدا چاہے۔

﴿ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى ﴾ (انعام۔۴)

اور اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت پر متفق کر دیتا۔

﴿ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ (انعام۔۴)

تو اگر وہ (خدا) چاہتا تو البتہ ان سب کو وہ (خود) ہدایت دے دیتا۔

﴿ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ (نحل۔۱)

اور اگر وہ (خدا) چاہتا البتہ ان سب کو ہدایت دے دیتا۔

مگر اس کی عادت نہیں کہ وہ بندے کے ارادہ اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت دے دے' اس لیے اس مشیت الٰہی کے ساتھ قرآن پاک کی وہ آیتیں مطابق ہوں گی' جن میں بندوں کی مشیت کا بھی اعتبار کیا گیا ہے' فرمایا۔

﴿ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾ (کہف۔۴)

تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔

﴿ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴾ (دھر۔۲' مزمل۔۱)

تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ قبول کرے۔

﴿ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ مَاٰبًا ﴾ (نبا۔۲)

سو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف بازگشت پکڑے۔

﴿ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّہٖ سَبِیْلًا ﴾ (فرقان۔۵)

لیکن جو اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرنا چاہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے گمراہی بھی اترتی ہے، مگر کن کے لیے؛ بتصریح فرمایا

﴿ وَمَا یُضِلُّ بِہٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ﴾ (بقرہ۔۳)

اور اللہ اس سے گمراہ نہیں کرتا، مگر نافرمانوں کو۔

﴿ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴾ (صف۔۱)

جب وہ کج ہوئے تو اللہ نے ان کے دلوں کو کج کر دیا اور اللہ بے حکم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

﴿ بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ﴾ (تطفیف۔۱)

بلکہ ان کے کام ان کے دلوں پر زنگ بن گئے۔

﴿ بَلْ طَبَعَ اللّٰہُ عَلَیْھَا بِکُفْرِھِمْ ﴾ (نساء۔۲۲)

بلکہ ان کے کفر کے سبب سے اللہ نے ان پر مہر کر دی۔

﴿ اِنْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ ﴾ (توبہ۔۱۶)

وہ پھر گئے، اللہ نے ان کے دلوں کو اس لیے پھیر دیا کہ وہ لوگ سمجھتے نہ تھے۔

﴿ کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِ الْکٰفِرِیْنَ ﴾ (اعراف۔۱۳)

اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔

﴿ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا ﴾ (بقرہ۔۲)

ان کے دلوں میں (پہلے سے) (نفاق کی) بیماری تھی تو خدا نے بیماری بڑھا دی۔

ان آیتوں میں سے ہر ایک پر غور کرو۔ ہر ایک سے یہ صاف وصریح معلوم ہوگا کہ انسان کی بداعمالی مقدم ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے ضلالت، گمراہی، زنگ، مہر اور بیماری فرمانا مؤخر ہے اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضلالت، زنگ، مہر اور بیماری کا اترنا علت اور انسانوں کا کفر و گناہ و نفاق معلول نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی انسان کا فسق، کجی، زنگ، کفر، انصراف (پھر جانا) نادانی اور قلب کی بیماری پہلے ہوتی ہے اور خدا کی طرف سے اس کے جواب میں ضلالت وگمراہی اور دل پر مہر بعد کو ہوتی ہے اور یہی طبعی اصول بھی ہے، انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اور غمگین ہوتا ہے، تب آنسو کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ اگر کوئی اس کو الٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی سخت نادانی ہوگی۔

بہر حال اس مسئلہ میں مہبط وحی و رسالت محمد رسول اللہ ﷺ کی عجیب مصلحت بینی یہ ہے کہ آپ نے اپنی امت کو اس پر جس شدت سے ایمان لانے کی تلقین فرمائی اسی شدت سے اس میں بحث و مناقشہ سے منع فرمایا [1] اور در حقیقت اس نظریہ سے اسی طرح فائدہ اٹھانے میں راز ہے، یہ کلی جہاں چٹکی کہ اس کی خوشبو اڑ گئی۔

اس عقیدہ کے تمام وسیع اطراف اور گوشوں کو چھوڑ کر جن کو متکلمین کی مجادلانہ کاوشوں نے پیدا کیا ہے، قرآن حکیم کی صرف اس آیت کو سمجھ لینا کافی ہے۔

﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا ﴾ (فرقان۔۱)

اور خدا کی سلطنت میں اس کا کوئی شریک نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا ایک اندازہ (تقدیر) لگا دیا

* * *

---

[1] مشکوۃ، باب الایمان بالقدر۔

ایمان کے نتائج

گزشتہ صفحوں میں ایمان کی حقیقت اور اسکی چھ شاخوں خدا، فرشتے، رسول، کتاب، یوم آخر اور قدر کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، اور دکھایا گیا ہے کہ ان میں سے ہر عقیدہ کی حقیقت کیا ہے، اس کی صداقت کی دلیلیں کیا ہیں؟ اور اس کی تعلیم میں شارعؑ نے کیا مصلحتیں رکھیں ہیں؟ اور شروع میں یہ بحث بھی کی جاچکی ہے کہ ہر مذہب میں اور خصوصاً مذہب اسلام میں ایمان کو اوّلین اہمیت کیوں دی گئی ہے وہ بحثیں اصول کی تھیں یہاں خاتمہ میں نتائج کی حیثیت سے پھر اسی دعویٰ کی تکرار کی جاتی ہے یعنی یہ کہ درحقیقت ایمانیات اسی لائق ہیں کہ ان کو مذہب میں یہی اولین درجہ دیا جائے، کیونکہ مذہب جن نتائج تک پہنچنا چاہتا ہے وہاں ایمان کی روشنی کے بغیر پہنچنا ممکن ہی نہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم کسی دستور پر عمل کریں، یہ ضروری ہے کہ ہم اس دستور کی خوبی اور سچائی کا یقین کریں کہ اگر ایسا نہ ہو تو ہم اس پر ایمانداری کے ساتھ نہ تو عمل کر سکتے ہیں اور نہ ہمارے نفس وضمیر پر اس کا اثر ہو سکتا ہے یہ حقیقت ہر دلیل سے ثابت ہے کہ ہمارے تمام اعمال ہمارے دل کے تابع ہیں اس لیے جب تک دل نہ بدلے گا ہمارے اعمال میں تغیر نہیں ہو سکتا یعنی ہمارے اعمال کی اصلاح، تمام تر ہمارے دل کی اصلاح کے زیر اثر ہے اور ایمان کا مقصد اسی دل کی اصلاح ہے کہ اگر یہ درست ہو گیا تو سب کچھ درست ہو گیا۔

یہاں ایک خاص نکتہ ہے جس کو سمجھے بغیر آگے نہیں بڑھنا چاہئے، یہودیوں نے سب سے زیادہ اہمیت عملی رسم ورواج کو دی تھی اور عیسائیوں نے اس کے برخلاف صرف ایمان پر نجات وفلاح کا دارومدار رکھا، چنانچہ حواریوں کے خطوط وملفوظات میں اس تعلیم کو بہت کچھ نمایاں کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ عملیات نہیں بلکہ صرف ایمان نجات کا ذریعہ ہے، اسلام کی پہلی تکمیلی شان اس بارہ میں یہ ہے کہ وہ دونوں کی اصلاح کر کے ان دونوں کو جمع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ نجات نہ تنہا ایمان پر اور نہ عمل پر، بلکہ ایمان صحیح اور عمل صالح کی جامعیت پر موقوف ہے ﴿اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ (جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے) دوسری بات یہ ہے کہ وہ ایمان کو محض ایمان کی بناء پر اہمیت نہیں دیتا بلکہ اس لیے اہمیت دیتا ہے کہ وہ عمل صالح کی علت وسبب ہے، یعنی وہ عمل صالح کے لیے راستہ بناتا اور تخم ریزی کے لئے زمین درست کرتا ہے۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اس لیے نخلِ ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل ہی سے ہو سکتی ہے، اب اگر ایسا کوئی شخص تم کو نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے اعمال میں اس ایمان کے مطابق کوئی بہتر تغیر نظر نہیں آتا تو یہی سمجھنا چاہئے کہ ایمان نے اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ وبار پیدا نہیں کیا، یہی سبب ہے کہ قرآن پاک ہر نیکی اور ہر خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومنوں کا وصف لازم بتاتا ہے ہر اہم موقع پر اس نے مسلمانوں کو ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ (اے وہ لوگو جو ایمان لائے) کی ندا سے خطاب کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل کر سکتے ہیں جو ایمان سے متصف ہیں، بہت سے موقعوں پر ہے اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ (اگر تم ایمان والے ہو)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات ایمان والوں ہی کے لیے خاص ہے اور وہی اس کے اہل وسزاوار ہیں، فرمایا

﴿ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ﴾ (بقرہ۔۲)

ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ محبت الٰہی ایمان کی بہت بڑی علامت ہے، ایک اور سورہ میں ہے

﴿ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ (نور۔۷)

ایمان والوں کی بات یہ ہے کہ جب ان کو فیصلہ کرنے کے لئے اللہ اور رسول کی طرف بلایا جائے، تو کہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے مانا اور انہیں لوگوں کا بھلا ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ایمان کا ایک نتیجہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلہ کے آگے سر جھکانا ہے، دوسری آیت میں فرمایا۔

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ﴾ (حجرات۔۱)

ایمان والے تو آپس میں بھائی ہیں۔

اس سے نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں میں باہمی محبت اور شفقت کا ہونا بھی ایمان کی نشانی ہے، ایک اور آیت میں ہے

﴿ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ (آل عمران۔)

اور خدا ہی پر چاہئے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔

معلوم ہوا کہ خدا پر بھروسہ اور توکل اہل ایمان کی شان ہے اور سورۂ مومنون میں اہل ایمان کے اوصاف یہ بتائے گئے ہیں۔

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ .... وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴾ (مومنون۔۱)

بے شبہ اہل ایمان نے بھلائی پائی جو اپنی نماز میں ادب سے جھکے رہتے ہیں، اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں دیتے، اور جو زکوۃ ادا کرتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں............ اور جو اپنی امانتوں اور وعدوں کی نگرانی رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔

ان آیتوں سے اہل ایمان کے ضروری اوصاف یہ معلوم ہوئے، نماز میں خضوع وخشوع، بے کار باتوں سے احتراز، زکوٰۃ وخیرات دینا، عفت و پاکدامنی، امانت، ایفائے عہد، نمازوں کی پابندی، ان آیتوں میں ایک عجیب رمز ہے دیکھو کہ اہل ایمان کے اوصاف کا آغاز بھی نماز سے کیا گیا اور انجام بھی نماز پر رکھا گیا، اس سے اشارہ نکلا کہ نماز ایمان کی اولین وآخرین نشانی ہے اور اسی لئے ایمان کے بعد سب سے زیادہ اس پر زور دیا گیا ہے۔

ہم نے یہ چند آیتیں یہاں مثالاً نقل کی ہیں ورنہ اگر کوئی استقصا کرے تو قرآن میں ایمان کے اثرات ونتائج اور بہت سے ملیں گے، احادیث میں بھی اس مضمون کی کمی نہیں، صحیح حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ایمان کی کچھ

اوپر ستر شاخیں ہیں، حافظ بیہقی نے اپنی کتاب شعب الایمان میں مختلف حدیثوں سے ایمان کی ان ستر شاخوں کو ایک ایک کر کے گنایا ہے اس کتاب کا خلاصہ مختصر شعب الایمان کے نام سے چھپ بھی گیا ہے۔

ایک اور حدیث میں ایمان کی شناخت اخلاق کی پاکیزگی کو بتایا گیا ہے، آپ نے فرمایا۔

﴿ اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا ﴾ (سنن ابی داؤد۔ کتاب السنہ)

مومنوں میں اس کا ایمان سب سے زیادہ کامل ہے، جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔

حسن اخلاق کا اساسی مرکز محبت ہے، یہ محبت سب سے پہلے تو اس ہستی سے ہونی چاہئے جو تمام محبتوں کا مرجع و مرکز ہے یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے بعد اسی محبت الٰہی کے ضمن اور تبعیت میں اس ہستی سے بھی محبت کرنا ضروری ہے جس کی ہدایت اور تعلیم کے وسیلہ سے یہ جوہر ایمانی ہم کو ہاتھ آیا اس محبت کے سامنے دوسری تمام دنیاوی محبتیں اور قرابت اور رشتہ داری کے علائق ہیچ ہیں، فرمایا:

﴿ لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من ولدہ ووالدہ والناس اجمعین ﴾

(مسلم و بخاری کتاب الایمان)

تم میں سے کوئی اس وقت تک ایمان میں کامل نہیں، جب تک کہ اس کے دل میں میری محبت اس کی اولاد اور والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو۔

ایمان کا تیسرا تاثر یہ ہے کہ اس کو ہم اپنی ہم جنس برادری اور پڑوسی سے بھی اسی طرح محبت پیار اور اخلاص ہو جس طرح خود اپنے آپ سے، فرمایا۔

﴿ والذی نفسی بیدہ لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ اولجارہ مایحب لنفسہ ﴾

(بخاری و مسلم کتاب الایمان)

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں جب تک کہ وہ اپنے بھائی یا پڑوسی (راوی کو شک ہے) کے لئے وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔

آپ نے ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا ’’جب تک تم مومن نہ بنو گے جنت میں داخل نہ ہو سکو گے اور مومن نہ بنو گے جب تک تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو گے تمہیں بتاؤں کہ تم میں آپس میں محبت کیونکر ہو سکتی ہے ’’آپس میں سلام پھیلاؤ‘‘ (کتاب الایمان)

یہ محبت کسی نمائش ریا، یا ذاتی نفع و نقصان کے لیے نہ ہو، بلکہ خدا اور صرف خدا کے لیے ہو فرمایا ’’تین باتیں جس میں ہیں اس نے ایمان کا مزہ پالیا اوّل یہ کہ اس کے دل میں خدا اور رسول سے بڑھ کر کسی اور کی محبت نہ ہو، دوسری یہ کہ بندگانِ خدا سے صرف خدا کے لئے محبت کرتا ہو، تیسری یہ کہ کفر سے نجات پانے کے بعد پھر اس میں آلودہ ہونا اسکے لیے اتنا ہی تکلیف دہ ہو جتنا آگ میں ڈالا جانا‘‘ ایک صحابیؓ نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ کامل اسلام کس مسلمان میں ہے فرمایا ’’اس مسلمان میں جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے‘‘ فرمایا ’’ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں جن میں سے ایک شرم و حیا ہے‘‘ یہ بھی تعلیم دی کہ ’’جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہئے کہ زبان سے بات

نکالے تو اچھی ورنہ چپ رہے جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہئے کہ اپنے پڑوسی کو دکھ نہ پہنچائے جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہئے کہ مہمان کی عزت کرے'' ایک صحابی آپ کے اس ارشاد کو نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ''تم میں سے کوئی اگر کوئی برائی دیکھے تو اس کو ہاتھ سے مٹا دے، یہ نہ ہو سکے تو زبان سے ٹوک دے، یہ بھی نہ ہو سکے تو اپنے دل میں اس کو بُرا سمجھے اور یہ ایمان کا آخری درجہ ہے'' [1]

اس کے بالمقابل آپ ﷺ نے متنبہ فرمایا کہ نفاق کی چار نشانیاں ہیں جس میں ان میں سے ایک بھی پائی جائے اس میں اتنا نفاق کا عنصر موجود ہے اگرچہ وہ نماز گذار اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو اور اپنے کو وہ مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو ایک یہ کہ گفتگو کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو توڑ دے، امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے، غصہ آئے تو گالی بکے۔ [2]

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ تمام نیکیاں اور ہر قسم کی بھلائیاں اور خوبیاں جس ایک جڑ کی شاخیں ہیں وہ ایمان ہے، اور اسی لیے وہ مذہب کا اصل الاصول ہے وہ نہ ہو تو انسانی نیکیوں کی ساری عمارت بے بنیاد ہے لیکن اس سے کسی کو یہ شبہہ نہ ہو کہ ایمان کے بعد عمل کی ضرورت نہیں کہ اسلام نے اسی نکتہ کو بار بار ادا کیا ہے کہ نجات کا مدار ایمان اور عمل صالح دونوں پر ہے، اسی لیے اٰمَنُوْا کے ساتھ ساتھ ﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ پر بھی اس نے ہمیشہ زور دیا ہے بلکہ اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ ان دونوں میں ایمان اصل اور عمل اسکی فرع ہے، ایمان ملزوم اور اعمال حسنہ اس کے خصوصیات اور لوازم ہیں، یعنی ان دونوں میں اصل وفرع اور لازم وملزوم کا تعلق ہے جو ایک دوسرے سے الگ اور جدا نہیں ہو سکتے، اس لیے جس طرح ایمان کے بغیر عمل سرسبز نہیں رہ سکتا اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے برگ وبار درخت ہے، جس کا فائدہ کے لحاظ سے عدم ووجود برابر ہے، اس بنا پر جہاں ایمان ہے اس کے عملی نتائج وآثار کا وجود بھی ضروری ہے۔

کاغذ کے ۵۱۶ صفحے سیاہ ہو چکے ہیں، ناظرین کے ہاتھ ان اوراق کی گرانباری سے اور آنکھیں ان سطور کی کم سوادی سے تھک چکی ہوں گی اس لیے بہتر ہے کہ رہروِ قلم کے ساتھ قافلہ نظر کے دوسرے رفقاء بھی کچھ دیر آرام کریں، ہر چند کہ

رہروان را خستگی راہ نیست   عشق ہم راہ است وہم خود منزل است

سلیمان ندوی

دار المصنفین

رمضان ۱۳۵۰ھ

---

[1] یہ تمام روایتیں صحیحین کتاب الایمان میں ہیں۔

[2] صحیح بخاری ومسلم کتاب الایمان پیشِ نظر مسلم ہے۔